ماہنامہ تجلّی دیوبند
ایڈیٹر
پاس وقت سے
یمتی کوئی چیز نہیں ہے
تاریکیوں میں ایک چراغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگر

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پر آپ کی خریداری ختم ہے — یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

چھبیسویں سال کا آٹھواں
شمارہ ۸

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر عامر عثمانی

ماہ جنوری ۱۹۷۵ء

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا سے
بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔
بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔
بحرین افریقہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ
بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔
پاکستان سے۔ پچیس روپے ۲۵/-

سالانہ قیمت
بیس روپے ۲۰/-
اس شمارے کی قیمت
دو روپے ۲/-

احوالِ واقعی

تقدیر کے آگے آدمی بے بس ہے۔ دیوبند میں تجلی کا نظام اب کچھ ایسا ہے کہ سات دن میں چار دن "پاور" کا فیض ملے گا تین دن نہیں ملے گا۔ پاور ہی سے مشینیں چلتی ہیں۔ چار دن میں بھی کئی کئی گھنٹے درمیانی وقفے کے ہیں اور ان متعینہ وقفوں کے علاوہ بلاتعیین جس وقت چاہے مشینوں کے پہیے رک جاتے ہیں۔ یہ تو معمول ہوا۔ دسمبر میں یہ بھی جھیلنا پڑا کہ تین دن تک بجلی کی صورت ہی نظر نہیں آئی۔ کچھ خبر نہیں اس رخ پر نکل گئی یا چادر تان کر سو رہی۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ یہ جان لیوا ادائیں ان تمام پروگراموں سے کیا سلوک کر سکتی ہیں جن کا تعلق مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ سے ہو دسمبر کا شمارہ اعلان سے آٹھ روز بعد منظرِ عام پر آسکا۔ اب یہ شمارہ دسمبر میں پریس جا رہا ہے مگر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تکمیل کو پہنچے گا۔ مایوسی تو کفر ہے کوشش ہم برابر کرتے رہیں گے کہ نظام الاوقات درست ہو جائے لیکن آپ دعا بھی شاید نہیں کر رہے ہیں۔ دعا کے سوا ہم بندوں کا سہارا ہی آخر کیا ہے۔ اسباب تو مشیتِ باری کے غلام ہیں۔

وہ جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب

گرانی نے تجلی کے آمد و خرچ کا بھی توازن بگاڑ دیا ہے کاغذ اور سامانِ طباعت پر جتنے دام بڑھے اس تناسب سے رسالے کی قیمت بڑھانا ممکن نہیں۔ انجام کیا ہوگا یہ اللہ ہی جانے۔ آپ اتنا تعاون ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے حلقۂ تعلق سے نئے خریدار فراہم کریں۔ تجلی اگر آپ کے نزدیک دین و ملت کے لئے مفید ہے تو یہ تعاون باعثِ اجر ہی ہوگا۔ جن حضرات کو اللہ نے استطاعت دی ہے وہ پانسو روپے ادا کر کے "لائف ممبر" بھی بن سکتے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ پھر سر پہ آ پہنچا ہے تفصیل میں جا کر آپ کو بدمزا کرنا نہیں چاہتے۔ دعا کی درخواست ہے۔ یہ منطق مت سوچئے کہ پچھلا کاغذ جب رسالہ کی شکل میں فروخت ہو گیا تو رقم جمع کیوں نہ ہوئی۔ یہ منطق برحق ہو سکتی تھی اگر رسالے کی قیمت میں اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہوتا جتنا کاغذ کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے مگر ابھی عرض ہی کیا جا چکا کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہو سکتا تھا اگر بعض اور رسائل کی طرح صفحات ہم صرف چالیس پچاس کر دیتے اور قیمت وہی رکھتے جو اب ہے لیکن [illegible] صفحات میں وہ دینی و علمی خدمت انجام نہیں دی جا سکتی جسے ناچیز تجلی اپنے [illegible] انجام دے رہا ہے۔ نتیجہ بہرحال یہ ہونا ہی تھا [illegible] بہت کم رقم لوٹی جتنی کاغذ پر صرف ہوئی تھی اور جتنی اگلے کوٹے کو درکار ہے۔ کوئی خاص اپیل پیشِ نظر نہیں۔ البتہ صورتِ حال آپ سے بیان کر کے طبیعت ہلکی کر لی ہے دعا کی درخواست ہے مکرر یہ کہ تر۔

آغازِ سخن

یہ گردان بڑی شدت سے کی جا رہی ہے کہ نزولِ مسیح کا عقیدہ خلافِ قرآن ہے۔ فارقلیط صاحب چاہتے ہیں کہ علماء اس عقیدے سے دستبرداری کا اعلان کردیں، چنانچہ وہ بار بار کف در دہاں ہو کر اس پر اصرار کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے فرمایا:-

"ہمارا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ علماءِ اہلِ سنت اور قادیانی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے ایک تفصیلی شرائط نامہ پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ علماءِ اہلِ سنت اور قادیانی دونوں اس پر دستخط کردیں۔ نہیں کئے تو دونوں ہی ختمِ نبوت کے منکر قرار پائیں گے۔ اس شرائط نامے میں انھوں نے اعتراف کرایا ہے کہ مسیح کی آمد کا عقیدہ ختمِ نبوت کے منافی ہے اور اس سے نبی آخر الزماں کی شان گھٹتی ہے۔

مزید فرمایا گیا:-

"اے علمائے کرام! اگر آپ قادیانی فتنہ کی جڑ مٹانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی جڑ کاٹیں۔ پہلے اپنے عقیدے کی اصلاح کرو پھر دوسروں کی خبر لو۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ قرآنی ہے اس کی حفاظت کے لئے اعلان کرو کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نہ نیا نہ پرانا۔ اگر آئے گا تو اسی کو خاتم النبیین کہا جائے گا۔ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ قادیانیوں کے استاد یہی علماءِ اہلِ سنت ہیں جو ان کی تکفیر کرتے ہیں۔ اگر علماء غلط عقیدے کا سہارا لیکر حضرت مسیح کو آنحضرت کے بعد لانا چاہتے ہیں تو قادیانی بھی ان کی شاگردی میں یہی کہتے ہیں کہ جس مسیح کو علماء دوبارہ لانا چاہتے ہیں وہ آچکا اور ہم نے ان کا انتظار ختم کیا۔ اصل مجرم یہی علماءِ اہلِ سنت ہیں جو آنحضرت صلعم کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو دوبارہ لاتے ہیں اور خاتم النبیین کا تاج ان کے سر پر رکھتے ہیں۔ بیج بویا علماء نے اور جب وہ تناور درخت ہو گیا تو اس کا پھل کھایا مرزا غلام احمد قادیانی نے۔"

دیکھ رہے ہیں اہلِ نظر فارقلیط صاحب کے تیور۔ کیا لب ولہجہ ہے۔ کیا طنطنہ اور تحکم ہے۔ کتنی بیزاری ہے علماءِ اہلِ سنت سے اور اُس عقیدے سے جسے اللہ کے رسولؐ نے خدا کی قسم کھا کھا کر اتنی بار بیان کیا کہ چند گنے چنے عقائد کے علاوہ شاید ہی کسی عقیدے کو اتنی اہمیت سے جتلا جتلا کر بیان کیا ہو۔ علم حدیث کی ابجد بھی اگر فارقلیط صاحب اپنے دماغ عالی کے کسی کونے کھدرے میں محفوظ رکھی ہو تو وہ بھولے نہ ہوں گے کہ صحیح احادیث کی بنیاداً دو قسمیں ہیں۔ خبر واحد اور خبر متواتر۔ پھر خبر واحد کی تین قسمیں ہیں۔ غریب۔ عزیز۔ مشہور۔ ان تینوں قسموں میں اگرچہ احکام کے اعتبار سے تفاوت ہے لیکن بہرحال کوئی شخص کسی خبر واحد کو کسی دلیل سے رد کرے تو اسے گمراہ اور منکر حدیث نہیں کہا جائے گا۔ مثلاً یہی کذباتِ ابراہیمؑ والی حدیث ہے۔ یہ خبر واحد ہے۔ آپ یا کوئی اور اسے درست نہیں سمجھتا تو اگرچہ خبر قبی اعتباً سے ایسا سمجھنا مناسب نہیں لیکن گمراہی کا فتویٰ بہرحال نہ دیا جائے گا۔ کیوں کہ اخبار احاد علم قطعی اور یقین محکم کا فائدہ نہیں دیتیں۔

لیکن خبر متواتر کی حیثیت تو تمام علماءِ حق کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا انکار بددینی اور انکار حدیث اور گمراہی شمار کیا جائے گا۔ وہ درجۂ یقین میں ارشادِ رسولؐ ہیں اور ارشادِ رسولؐ کو جھٹلانا کفر کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

حدیث متواتر کی بنیاداً چار قسمیں ہیں۔ ہم پورا مکتب کھول کر نہیں بیٹھیں گے بلکہ صرف اُس قسم کا ذکر کریں گے جس سے اس وقت بحث ہے۔ اس قسم کا نام ہے متواتر القدر المشترک۔ اس کی تعریف خلاصۃً یہ ہے کہ اتنے زیادہ راوی جن کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا عقلاً بعید ہو کسی روایت کو مختلف الفاظ میں بیان کریں اور بہ اعتبار جزئیات بھی اس کے مضمون میں اختلاف ہو لیکن کچھ باتیں یا کوئی ایک بات ان سب میں بطور قدرِ مشترک

پائی جا رہی ہو۔ مثلاً کچھ کہتے ہیں حاتم طائی نے فلاں شخص کو دس روپے انعام دیئے کچھ لوگ کہتے ہیں بیس روپے۔ کچھ اس سے مختلف تعداد بیان کرتے ہیں۔ نیز کچھ اور لوگ حاتم کی سخاوت کے اور بہت سے قصے سناتے ہیں تو اپنی اپنی جگہ ان میں سے ہر ہر روایت قابلِ اختلاف ہو سکتی ہے۔ اسے رد کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات ان سب روایات میں مشترک ہے کہ حاتم ایک دریادل اور سخی آدمی تھا اسی طرح حضورؐ کے معجزات کا معاملہ ہے۔ کوئی بھی معجزہ تواتر سے ثابت نہیں لیکن معجزات کی تمام حدیثوں میں یہ بات بہرحال مشترک ہے کہ حضورؐ سے کچھ معجزے ظہور میں آئے تھے۔ اسی طرح عہدِ حاضر کی مثال لیجیے کہ دوسری جنگِ عظیم ماضی کا قصہ بن چکی۔ اس کے بے شمار واقعات لوگوں نے زبان اور قلم سے بیان کئے۔ ان میں سے ہر بیان کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہ درست نہ ہو لیکن کیا اس میں بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ واقع ہوئی تھی یا اس جنگ میں جرمنی کا حکمراں ہٹلر تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی باتیں ان سارے بیانوں میں کلی مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں اور عقلاً ہرگز ممکن نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے سازش کر کے جھوٹ موٹ انھیں گھڑ لیا ہو۔

ایسا ہی معاملہ نزولِ مسیح کی خبر کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ بار بار تفصیلاً بیان کرتے ہیں۔ حضرت مسیح کے اوصاف، شکل، رنگ، قد و قامت، ہیئت، لباس، شہر نزول، مقام نزول، وقتِ نزول اور بے شمار دیگر جزئیات۔ ہم بتا ہی چکے کہ ان خبروں پر مشتمل احادیث ۲۷ صحابہؓ سے مروی ہیں اور احادیث کی تعداد ستر سے اوپر ہے۔ کوئی بھی شخص فنی دلائل کی روشنی میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ہر حدیث خبر واحد ہے جو یقین کا فائدہ نہیں دیتی یا فلاں فلاں حدیث میں فلاں راوی ضعیف ہے وغیر ذلک لیکن یہ کہہ دینا کہ نزولِ مسیح ہی سرے سے افسانہ ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہہ دے کہ دوسری جنگِ عظیم ہوئی ہی نہیں

تھی یا ہٹلر اور مسولینی اور چرچل دنیا میں کبھی پیدا ہی
نہیں ہوئے تھے یا رسولؐ نے کبھی مسواک کی ہی نہیں تھی
یا آپ شبِ معراج میں آسمانوں پر تشریف نہیں لے گئے
تھے یا آپ نے کبھی گوشت نہیں کھایا تھا۔

یہ ایک ایسا عقلی استدلال ہے جسے رد نہیں کیا
جاسکتا لیکن بطور اتمام حجت ہم چند ماہرین فن کے ارشادات
بھی نقل کئے دیتے ہیں۔

علامہ آلوسی جن کا تبحرّ فی الحدیث مسلّم ہے تفسیر روح
المعانی میں لکھتے ہیں کہ نزولِ عیسیٰؑ کی خبر تواتر معنوی کو
پہنچی ہوئی ہے لہٰذا اس کا منکر کافر ہے۔

حافظ ابنِ کثیرؒ اپنی تفسیر میں ایک سے زائد جگہ یہ مضمون
دہراتے ہیں کہ قیامت سے پہلے نزولِ عیسیٰؑ کی اطلاع
درجۂ تواتر میں جا پہنچی ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ بھی بعض متقدمین سے اس پر تواتر
نقل کرتے ہیں۔

ایسی خبرِ متواتر کو اس قدر شدومد سے جھوٹا قرار
دینا جس کا مظاہرہ فارقلیط صاحب نے کیا ہے معقولیت سے
تو کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ رہے ان کے دلائل تو انہیں کوئی
جان نہیں۔ انھوں نے علمی دلیل یہ پیش فرمائی ہے:۔

"خاتم النبیین میں الف لام استغراق کا ہے جس کا
مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی نبوت ختمی مآب پر ختم
ہوگئی۔"

یہاں تک تو بات بالکل درست کہی گئی۔ تمام علماءِ
اہلِ سنت بھی یہی مانتے ہیں کہ حضورؐ پر ہر طرح کی نبوت کا
اختتام ہوگیا۔ ان کے بعد کسی شخص کو اللہ یہ منصب عطا
نہیں کرے گا۔ اسی لئے وہ قادیانیوں کو خارج از اسلام
قرار دیتے ہیں کہ یہ لوگ ایک نئے نبی کے قائل ہوئے۔

لیکن اس کے بعد فارقلیط صاحب نے درج ذیل معنی
پیدا کئے ہیں:۔

"آپ کے بعد کوئی بھی نبی خواہ نیا ہو یا پرانا حقیقی
ہو یا مجازی ظلّی ہو یا بروزی تشریعی ہو یا غیر
تشریعی اسرائیلی ہو یا محمدی نہیں آئے گا جو لوگ
کسی پرانے یا نئے نبی کو لاتے ہیں وہ ختم نبوت کے
منکر ہیں اور اپنے ہی فتوے کی رو سے کافر ہیں۔"

تو یہ معنی ان کے اپنے پیدا کردہ ہیں قرآن کا ان سے
کچھ تعلق نہیں۔ نبوت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ
کوئی ایسا منصب نہیں جسے آدمی اپنی محنت اور قابلیت سے
حاصل کرلے بلکہ وہ تو ایک ایسا عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ عطا
کرتا رہا ہے۔ اسی طرح کسی نبی کا پہلے ہونا اور کسی کا بعد میں
ہونا بھی انسان کا اختیاری فعل نہیں تھا۔ حضورؐ آخری نبی
ہیں یہ فیصلہ بھی اللہ ہی کا کیا ہوا ہے۔ خود حضورؐ کے اختیار
میں یہ بات نہیں تھی کہ اپنے آپ کو آخری نبی بنالیں اور
نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیں۔ یہ ایک ایسی
حقیقت ہے جس سے مجالِ انکار کوئی ہوشمند نہیں کرسکتا۔
لہٰذا جب قرآن میں اللہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ محمد خاتم النبیین
ہیں تو اس کا واحد مطلب یہ اعلان ہوا کہ اب ہم کسی بندے
کو منصبِ نبوت عطا نہیں کریں گے۔ عطا کا یہ سلسلہ ذاتِ
محمدی پر ختم کیا جاتا ہے اور قیامت تک کسی بھی نبی کی بعثت
کا خیال تک بندوں کو دل سے نکال دینا چاہئیے۔

فرمائیے کیا یہی مطلب نہیں ہوا؟

جب یہ مطلب ہوا تو کسی ایسے بندے کا دنیا میں آنا
خلافِ قرآن کیسے ہوگیا جسے اللہ نے نبوت حضورؐ سے پہلے عطا
کی تھی بعد میں عطا نہیں کی۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر نبی
کو ماں کے پیٹ سے نبی پیدا نہیں کیا گیا۔ رسول اللہؐ اپنی
عمر کے چالیس سالوں تک نبی نہیں تھے۔ اس کے بعد اللہ نے
باقاعدہ یہ منصب آپ کو عطا فرمایا اور آپ کو وحی سے
اطلاع ملی کہ میں نبی بنادیا گیا ہوں۔ جب یہ بات ہے تو صاف
ظاہر ہے کہ ختم نبوت کا منکر صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو یہ
گمان کرے کہ رسول اللہؐ کے بعد بھی اللہ کسی کو نبی بناسکتا ہے
وہ شخص نہیں ہوسکتا جو حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری کا عقیدہ
رکھے کیونکہ حضرت موصوف کو تو نبوت حضورؐ سے پہلے عطا کی

جا چکی۔ اب وہ نبی بنا کر نہیں بھیجے جا رہے ہیں۔ چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جو ابھی تک آسمانوں پر زندہ موجود ہیں قیامت سے پہلے دنیا میں آئیں گے تو نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے نہ ان پر وحی نازل ہوگی۔ نہ وہ کوئی نیا حکمِ شرعی لے کر آئیں گے۔ چنانچہ نہ تو وہ لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے نہ ان کی کوئی الگ امت بنے گی حالانکہ اللہ کی طرف سے کسی بھی بندے کو نبی کا عہدہ عطا کرنا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ مخلوق کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دے اور جو لوگ اس پر ایمان لے آئیں وہ ایک مستقل امت ہوں۔ حضرت عیسیٰؑ کو جس وقت اللہ نے نبوت دی تھی اس وقت انھوں نے بھی یہی فریضہ ادا کیا تھا پھر اللہ نے اپنی قدرت سے انھیں زندہ آسمان پر اٹھالیا اور دنیا میں ان کے کارِ نبوت کا اختتام ہوگیا۔

اب اگر اللہ انھیں پھر سے دنیا میں بھیجتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی امت ہی کے ایک فرد کی حیثیت سے رسالتِ محمدیؐ کے تابع رہ کر بعض کام انجام دیں تو آخر اس سے حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے میں کیا خلل پڑ گیا اور مضمونِ قرآنی سے ٹکراؤ کیسے لازم آگیا۔ احادیث میں تو یہاں تک صراحت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری کے وقت مسلمانوں کا جو بھی امیر ہوگا وہی بدستور امیر رہے گا۔ موصوف نماز بھی امامِ وقت ہی کے پیچھے پڑھیں گے۔ اس سے عیاں ہے کہ ان کی حیثیت اس وقت کسی ایسے شخص کی نہیں ہوگی جسے حضورؐ کے بعد نبوت دی گئی ہو ورنہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر نبی اپنے دور میں امامِ وقت ہوتا ہے۔ امیر ہوتا ہے۔ صدر و قائد ہوتا ہے۔

زید اپنی ماں کے پیٹ سے پہلے پیدا ہوا اور بکر بعد میں۔ بکر چاہے پہلے مر جائے اور زید چاہے کتنے ہی دنوں زندہ رہے اس امرِ واقعہ میں کبھی فرق واقع نہیں ہوگا کہ زید پہلے پیدا ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ پہلے نبی بنائے گئے حضورؐ بعد میں۔ یہ اللہ کی اپنی مصلحت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو انھوں نے زندہ آسمان پر اٹھایا عمر طویل دی اور قیامت سے پہلے انھیں پھر ایک بار دنیا میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ مگر کیا یہ طولِ عمری یہ معنی رکھے گی کہ حضورؐ کو بعد میں نبی بننے کی جو خصوصیت حاصل تھی وہ ختم ہوگئی اور حضرت عیسیٰؑ آپ کے بعد نبی بنائے گئے؟

ہندوستان کا ایک صدرِ مملکت پانچ سال بعد ریٹائر ہو کر امریکہ چلا جاتا ہے۔ پھر دوسرے صدرِ مملکت کے دور میں ہندوستان واپس آتا ہے اور موجودہ صدرِ مملکت کی ماتحتی میں رہ کر کچھ کام انجام دیتا ہے تو اگرچہ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ وہ پہلے ہندوستان کا صدر رہ چکا ہے لیکن کیا یہ بھی کہیں گے کہ اس کی آمد سے موجودہ صدرِ مملکت کی صدارت پر حرف آگیا اور اس کی آمد نے یہ ثابت کر دیا کہ موجودہ صدر بعد کا صدر نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نبی تھے یہ ماننا تو اب بھی لوازماتِ ایمان میں سے ہے۔ پھر جب یہی عیسیٰ عالمِ بالا سے دنیا میں بھیجے جائیں گے تو ان کی مسلمہ حیثیت کے پیشِ نظر یہی کہا جائے گا کہ عیسیٰؑ نبی تشریف لے آئے مگر اس سے رسول اللہ صلعم کی ختمِ نبوت پر شوشہ کہاں سے نکل آئے گا اور یہ معنی کیسے پیدا ہو جائیں گے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلعم کے بعد بھی کسی نبی کی بعثت مان لی ہے۔

چنانچہ تمام علماءِ سلف و خلف جہاں شدومد سے ختمِ نبوت کے عقیدے کو مدارِ ایمان قرار دیتے آئے ہیں وہیں یہ بھی تشریح کرتے آئے ہیں کہ نزولِ مسیح کا عقیدہ اس عقیدے کے ہرگز خلاف نہیں۔ فارقلیط صاحب یا ان کے دانشوروں کی محض کج بحثی سے تو ایسے دو عقیدوں میں اختلاف مسلم نہیں ہو سکتا جن میں عقلاً اور نقلاً کوئی اختلاف سرے سے ہو ہی نہیں۔ یہ الزام تراشنا کہ قادیانیوں کے استاد علماءِ اہلِ سنت ہی ہیں۔ انھوں نے ہی جھوٹی حدیثوں کو سینے سے لگا کر قادیانیوں کو گمراہی کا بیج فراہم کیا ہے اتنی بڑی جسارت ہے کہ ہمیں فارقلیط صاحب کے ذہنی توازن پر شبہ ہونے لگا ہے۔ قادیانیوں کا حال یہ

ہے کہ قرآن کو جھٹلانے کے بعد — یعنی حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر اٹھالئے جانے اور رسول اللہؐ پر نبوت ختم ہو جانے کے عقائدِ ثابتہ سے منحرف ہونے کے بعد ان تمام حدیثوں کو بھی جھٹلایا جنھیں آپ قادیانیت کا بیج کہہ رہے ہیں۔ ان تمام حدیثوں میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ نازل ہونیوالے وہی عیسیٰؑ ہوں گے جو حضرت مریمؑ کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ابھی تک انھیں وہ موت نہیں آئی جو ہر فردِ بشر کی قسمت ہے۔ لیکن قادیانی حضرات کہتے ہیں کہ وہ عیسیٰ تو انتقال کر چکے اب جو عیسیٰ آئیں گے وہ دراصل صفات میں عیسیٰ کے مشابہ ہوں گے نہ کہ عین عیسیٰ ابن مریمؑ۔ اور آئیں گے کہاں وہ تو آ بھی گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اسی نبوت کا تو دعویٰ لے کر اٹھے تھے اور قادیانی حضرات انھیں مثیلِ مسیح اور مسیح موعود مانتے ہیں۔ فرمایا جائے کہ کیا پھر بھی اس طرح کے طنز و طعن درست ہو سکتے ہیں کہ قادیانیوں کے استاد علمائے اہلِ سنت ہیں اور یہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

شاید فارقلیط صاحب کا خیال یہ ہے کہ علمائے اہلِ سنت نزولِ مسیح کی حدیثوں کو رد کر دیتے تو غلام احمد کو دعوۂ نبوت کا موقع نہ ملتا۔ مگر ہم اس خیال کو بچکانا اور مضحکہ خیز کہیں گے۔ اول تو یوں کہ جیسا ہم عرض کر رہے ہیں یہ حدیثیں قادیانیت کی تکذیب کرتی ہیں نہ کہ تردید۔ ان میں آئی ہوئی کوئی بھی تفصیل مرزا غلام احمد کی ذات شریف سے مشابہت نہیں رکھتی۔ ان میں کسی ایسے بندے کی پیدائش کا ذکر نہیں آیا جسے رسول اللہؐ کے بعد نبوت عطا کی گئی ہو مگر مرزا حضرت مریمؑ کے بطن سے نہیں کسی اور ماں کے پیٹ اور باپ کے نطفے سے پیدا ہوئے۔ انکا دعوۂ نبوت لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ نبوت حضورؐ کے بعد انھیں عطا ہوئی ہے۔ اسی کا نام ہے ختمِ نبوت سے انکار چنانچہ قادیانی حضرات طرح طرح کی ظاہر فریب اور مغالطہ انگیز تاویلات سے سادہ لوح مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبی کی آمد کو ناممکن ماننا رسول اللہؐ کی توہین ہے۔ ان کی شان تو اتنی بڑی ہے کہ ان کے طفیل ان کی امت میں بھی نئے نبی پیدا ہو سکتے ہیں۔

دوسرے یوں کہ اگر اس طرح کے واہی اندیشوں کی بنا پر کسی عقیدۂ ثابتہ کو چھوڑنا عقلمندی شمار کیا جائے تو کل ایک شخص نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ کعبہ آخر ایک اینٹ پتھر کی چھوٹی سی عمارت ہی تو ہے۔ ٹھیک اسی کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنا بت پرستوں کو بت پرستی کا مواد عطا کرتا ہے۔ پھر کیا آپ اس عقیدے کو ترک کر دیں گے کہ نماز لازماً کعبہ ہی کی طرف منھ کر کے پڑھی جائے۔

تیسرے یوں کہ تاریخی حقائق فارقلیط صاحب کے خیال کی تائید نہیں کرتے۔ مرزا غلام احمد پہلے آدمی نہیں ہیں جنھوں نے جھوٹا دعوۂ نبوت کیا ہو۔ ان سے پہلے بھی کتنے ہی مسخرے یہ دعویٰ لے کر اٹھے ہیں اور خائب و خاسر دنیا سے گئے ہیں۔ ان مسخروں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لہٰذا اس مفروضے میں کوئی جان نہیں رہتی کہ اگر مسلمان نزولِ مسیح کا عقیدہ نہ رکھتے تو کسی کو بھی دعوۂ نبوت کی جرأت نہ ہوتی۔ ان دوسرے مسخروں نے مسیح موعود کی حیثیت سے دعوۂ نبوت نہیں کیا تھا جس کا واضح مطلب ہے کہ دعویٰ کرنے والے طالع آزماؤں کو کسی بنیادی سہارے کی حاجت ہوتی ہی نہیں۔ وہ تو جہالتِ عوام سے فائدہ اٹھا کر ایک دعویٰ کر گذرتے ہیں اور بہتیرے سادہ لوح ان کے پیچھے لگ لیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ نزولِ مسیح کے عقیدے کو ختمِ نبوت کے انکار جیسا قرار دینا معقولیت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اور یہ محض چرب زبانی ہے کہ یہ عقیدہ خلافِ قرآن ہے۔

ہم فارقلیط صاحب سے پوچھتے ہیں کیا قرآن کی یہ آیات

کی نظر سے نہیں گذریں۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ (زمین کی ہر چیز فانی ہے اور ہر ذی حیات کو موت کا مزا چکھنا ہے) اگر قرآن سچا ہے تو دوسرے ہر انسان کی طرح حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھی لازماً موت کا ذائقہ چکھنا چاہئے۔ ابھی تک انھیں موت نہیں آئی۔ آپ بھی مانتے ہیں کہ قرآنی اشارت کے مطابق وہ زندہ مع جسم آسمان پر اٹھالئے گئے۔ پھر اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آکر اسی موت سے ہمکنار نہ ہوں جس سے ہمکنار ہونے کا اٹل فیصلہ مشیت الٰہی نے ہر ہر ذی روح کے لئے مقدر کر دیا ہے تو بتائیے قرآن کی سچائی پر حرف آئے گا یا نہیں ؟

وہ سب سے بڑے انسان جنھیں آپ بھی محمدؐ کے نام سے جانتے ہیں وہ تک تو ذائقۂ موت چکھنے سے بچے نہیں پھر حضرت عیسیٰؑ کیسے بچ جائیں گے۔ مذکورہ آیات تقاضا کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو جو زندگی دنیا میں ملی تھی وہ ایک دن دنیا ہی میں موت پر ختم ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے اگر انھیں اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین پر نہ بھیجے۔

مزید ایک مقام قرآنی ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ اور ۱۵۸ میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ یہود حضرت عیسیٰؑ کو نہ قتل کر سکے نہ سولی پر چڑھا سکے بلکہ انھیں اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس کے بعد ۱۵۹ ویں آیت میں فرماتا ہے :۔

وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا ۔

اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ بھی اطلاع دے رہا ہے کہ ہر اہلِ کتاب اپنی موت سے پہلے لازماً حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئے گا اور حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن ان کے حال احوال کی گواہی دیں گے۔

دوسرا یہ کہ ہر اہلِ کتاب حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا۔ دوسرے مطلب کا تعلق اسی عقیدۂ نزولِ مسیح سے ہے یعنی جب حضرت عیسیٰؑ زمین پر بھیجے جائیں گے اور یہاں ان کی طبعی موت واقع ہو گی اس موت سے پہلے ان کے دور کا ہر اہلِ کتاب حقیقت جان لے گا اور ایمان لے آئے گا کہ بے شک مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہوئے تھے بلکہ اب تک زندہ تھے۔

اگلے پچھلے مفسرین میں دونوں ہی مفہوموں کو ممکن قرار دیا گیا ہے اور کسی نے پہلے مفہوم کو ترجیح دی تو کسی نے دوسرے کو مثلاً سلف میں حافظ ابن کثیر دوسرے مفہوم کو ارجح اور بہتر قرار دیتے ہیں۔ عربی تفاسیر تک پہنچنا اگر ہمارے دانشوروں کے لئے دشوار ہو تو ہم اردو تفاسیر کی طرف ان کی رہنمائی کئے دیتے ہیں۔ اردو کے مفسرین میں شاہ عبدالقادرؒ کو درجۂ امامت حاصل ہے۔ پوری دنیائے اسلام میں ان کی عظمت و رفعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کا ترجمہ اور تفسیر یوں ہے :۔

"اور جتنے فرقے ہیں کتاب والوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے ان کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن ہو گا ان کا بتانے والا۔
فائدہ :۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی زندہ ہیں چوتھے آسمان پر۔ جب یہودیوں میں دجال پیدا ہو گا تب اس جہان میں آن کر اسے ماریں گے اور یہود و نصاریٰ سب ان پر ایمان لاویں گے کہ مرے نہ تھے زندہ تھے۔"

مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ یہ ترجمہ فرماتے ہیں :۔

"اور جتنے فرقے ہیں اہلِ کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لائیں گے اس کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن ہو گا ان پر گواہ۔"

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنے تفسیری حاشیے میں اسی مفہوم کو اختیار فرماتے ہیں۔ سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ نے بھی اپنی تفسیر کشف الرحمٰن میں اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے اور مولانا مودودی نے بھی تفہیم القرآن میں اسی کو مقدم رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں نزولِ مسیح کے عقیدے کی تصدیق فرمائی جن صحابہ اور تابعین نے کی ہے ان کے نام یہ ہیں

حضرت ابن عباس۔ حضرت محمد بن علی۔ حضرت حسن بصری۔ حضرت قتادہ۔ حضرت ابن زید۔ حضرت ابو مالک رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور اسی ترجمۂ و تفسیر کو صحیح سمجھیں اور اوّل الذکر ترجمۂ و تفسیر کو غلط۔ انھیں حق ہے کہ بعض اور مفسرین کی پیروی میں اوّل الذکر کو ترجیح دیں لیکن اس دعوے کا حق انھیں نہیں ہے کہ یہ ترجمۂ و تفسیر خلافِ قرآن ہے۔ ایسا دعویٰ یہ معنی رکھتا ہے کہ ابن کثیرؒ شاہ عبد القادرؒ، حضرت شیخ الہند اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے شہرۂ آفاق مفسرین اور اساتذہ فہم قرآن سے اس قدر کورے تھے کہ انھیں یہ تک شعور نہیں ہوا کہ ہم جو مفہوم بیان کر رہے ہیں وہ خلافِ قرآن ہے۔

بڑے سے بڑا مفسر سہو و خطا کا شکار ہو سکتا ہے انبیاء کے سوا کوئی معصوم نہیں مگر خطاؤں کی بھی قسمیں ہیں۔ جو خطا یہ ثابت کرتی ہو کہ مفسر عقائدِ اسلامیہ اور مضامینِ قرآنیہ سے بالکل نابلد ہے ایسی خطا کا انتساب کسی بڑے اور مسلّم مفسر کی طرف کسی معقول آدمی کے نزدیک روا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب ایک مفہوم کو بعض صحابہؓ اور بعض اکابر تابعین نے بھی اختیار کیا ہو تو یہ کہہ دینا کیسے ممکن ہے کہ اس مفہوم کی کوئی گنجائش ہی آیت میں نہیں ہے اور اس مفہوم کو اختیار کرنے والے ختمِ نبوت کے منکر ہیں! العیاذ باللہ۔

زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت سے نزولِ مسیح کا عقیدہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس میں ایک اور مفہوم کی گنجائش موجود ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن اس عقیدے کی تردید کر رہا ہے کیونکہ احتمال بہر حال اس مفہوم کا بھی موجود ہے جس سے نزولِ مسیح کی تصدیق ہوتی ہے۔ تمام دنیا میں یہ بات مسلّم سمجھی گئی ہے کہ اگر ایک قول دو معنوں کا محتمل ہو تو بغیر کسی قوی دلیل کے اس کے کسی ایک ہی معنی کو قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا نہ کسی معنی کو خارج از امکان قرار دے سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے لئے تو ثانی الذکر معنی کو ترجیح دینے کی یہ دلیل بھی موجود ہے کہ ستر سے زیادہ حدیثیں اس کے حق میں جا رہی ہیں مگر کسی اور کے پاس یہ کہنے کی آخر کیا دلیل ہے کہ یہ معنی لازماً غلط ہیں اور اول الذکر معنی کو قطعی سمجھنا چاہئے۔

قرآن میں ایسی بہت سی نظیریں ہیں کہ آیت اپنے مفہوم و مدلول میں صریح نہیں۔ اس کے ایک سے زیادہ مفاہیم ہو سکتے ہیں۔ پھر حدیثِ رسولؐ کے ذریعہ اس کا مفہوم و مدلول متعین کیا گیا۔ آخر رسول اللہؐ سے بڑھ کر قرآنی مطالب سمجھنے والا کون ہوگا کہ ان کی تفسیر موجود ہوتے ہوئے کسی اور طرف جایا جائے۔ وہ بار بار صریح و مبین الفاظ میں قسمیں کھا کھا کر بتا رہے ہیں کہ قیامت سے پہلے عیسیٰؑ دنیا میں آئیں گے اور ان کی عمرِ طویل کا اختتام اسی دنیا میں ہوگا تو پھر کیا مانع ہے اس بات میں کہ آیتِ مذکور میں قبلَ موتِہٖ کی ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھیری جائے جب کہ ماقبل میں انہی کا ذکر چل رہا ہے اور آگے بھی ان ہی کا ذکر ہے۔

دانشوروں کا ایک معارضہ یہ ہے:۔

"قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہمارے لئے نہ تھی۔ صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی وہ ہمارے رسول ہیں مگر ان کی ہدایت اور تعلیم ہمارے لئے نہ تھی پھر نہ معلوم یہ کیوں سمجھ لیا گیا کہ ایک اسرائیلی نبی حضور ختمی مآب صلی اللہ علیہ کے بعد اسلام کا سارا کاروبار سنبھالیں گے اور امت محمدیہ کا کوئی فرد اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی جگہ وہ کام انجام دے جس سے حضورؐ کی شان بڑھے اور ایک اسرائیلی نبی نبی آخر الزماں پر فوقیت نہ لے جائے۔"

اے دوستو! جب آپ نے یہ طے ہی کر لیا ہے کہ بلا تحقیق باتیں کئے چلے جائیں گے تو آپ کو پتا ہی کیسے چلے کہ علماء اہلِ سنت نے کس عقیدے کو کیوں دل میں جگہ دے لی ہے

بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بنی اسرائیل کے لئے تھی ہمارے لئے نہ تھی مگر وہ کب یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نازل ہوکر اسلام کا سارا کاروبار سنبھالیں گے اور ان کی دعوت کا رخ ہماری طرف مڑ جائے گا۔ ہم دکھلا چکے کہ احادیث کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی یہ آمد بحیثیت نبی نہیں ہوگی نہ وہ مسلمانوں کو اپنے پر ایمان لانے کی دعوت دینگے۔ نہ صاحب وحی ہوں گے۔ نہ کوئی امت برپا کریں گے۔ حتیٰ کہ نمازوں کی امامت بھی وہی مسلمان کرتے رہیں گے جو پہلے سے کرتے آ رہے ہیں۔ سیاسی واجتماعی دائروں میں بھی امامت و قیادت کے مناصب ان ہی مسلمانوں کو حاصل رہیں گے جنھیں پہلے سے حاصل ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی حیثیت اس شخص کی سی ہوگی جو دین محمدیؐ کا پیرو اور قیادت محمدیؐ کا تابع رہ کر وہ کارِ خدمت انجام دے گا جو اللہ نے اس کے لئے مقدر کر رکھا ہے یہی عقیدۂ اہل سنت کی تفصیل ہے۔ انھوں نے جو سمجھا ہے یہی سمجھا ہے کہ اللہ کی مصلحتِ تکوینی نے قیامت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کو دنیا میں بھیجنا اور ان سے کچھ خدمت لینا مقدر فرمایا ہے اور یہ اس لئے سمجھا ہے کہ اللہ کا سچا رسول اسکی خبر دے رہا ہے۔ کیا فارقلیط صاحب کو قرآن کی یہ آیت یاد نہیں کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (یہ قرآن ان خدا سے ڈرنے والوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) مستقبل میں نزولِ عیسیٰ کا مسئلہ یا ماضی میں زندہ اٹھائے جانے کا مسئلہ ظاہر ہے کہ غیب کے مسائل میں شامل ہے۔ اللہ کا آخری رسولؐ جس امرِ غیبی کی خبر دے اس پر ایمان لانا تو مسلمانوں کے یہاں اختلافی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اختلاف صرف اس باب میں ہو سکتا ہے کہ کون سے امر غیبی کی خبر واقعتہً اللہ کے رسولؐ نے دی تھی اور واقعتہً نہیں دی تھی۔ تو اس کا فیصلہ آخر اس کے سوا کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ روایات کو عقل ونقل کے قواعد کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ روایات کا حال آپ دیکھ چکے۔ ۲۷ صحابہؓ اور سیکڑوں معتبر راویوں کا ہجوم گواہی دے رہا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے نزولِ عیسیٰ کی خبر دی، قسمیں کھا کھا کر دی۔ جزئیات بیان کر کر کے دی۔ امت کے تمام بڑے بڑے اساتذہ اور اتقیاء اور مجتہدین ومحدثین اس خبر پر آمنا وصدقنا کہتے چلے آ رہے ہیں۔ کل نفس ذائقۃ الموت کی آیت تقاضا کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان سے دنیا میں اتریں اور طبعی موت کا مزا چکھیں۔ اس سب کے باوجود اگر کچھ لوگ سروں پر کلاہِ دانشوری سجا کر یہ چیخ پکار کرتے ہیں کہ نزولِ مسیح کا عقیدہ خلافِ قرآن ہے۔ من گھڑت ہے۔ کافرانہ ہے تو اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ ان حضرات نے ایمان بالغیب سے دست برداری دیدی ہے اور امت کے تمام اساطین واکابر کے مقابلے میں یہ اپنی عقل شریف کو قاضی وامام تصور کرتے ہیں۔ ان حضرات کو قرآن بھی ہدایت نہیں دے سکتا کیونکہ اللہ نے خود ہی اعلان فرما دیا ہے کہ قرآن صرف ایمان بالغیب کے قائلین کو ہدایت دیتا ہے نہ کہ اس سے بھاگنے والوں کو۔

رہا حضورؐ کی شان بڑھنے اور گھٹنے کا مسئلہ تو اول تو یہ مسلّمات میں سے ہے کہ حضورؐ کو دوسرے انبیاء پر فضیلت بہ حیثیت مجموعی ہے۔ بہتیری خصوصیات ایسی ہیں جو دوسرے انبیاء کو ملیں مگر حضورؐ کو نہیں ملیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور اللہ نے ان کی شان دو مرتبہ یہ کہکر بڑھائی کہ اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ سورۂ انبیاء آیت ۹۱۔ سورۂ تحریم آیت ۱۲۔

"یعنی عیسیٰ کی ماں مریم بنتِ عمران وہ پاکباز
عورت ہے جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا
اور ہم نے پھونک دی اس میں اپنی طرف سے
ایک جان۔"

اسی سیاق میں یہ بھی فرمایا گیا:۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

"اور کیا ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو جہان
والوں کے لئے نشانی۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا اور پانی پر حکومت دی گئی۔ حیوانات کی زبان کا شعور عطا کیا گیا۔ یہ خصوصیات حضورؐ کے لئے ثابت نہیں۔ اسی طرح بے شمار جزئیات ہیں جن میں بعض انبیاء منفرد اور یکتا رہے ہیں۔ اگر ان جزئیات سے حضورؐ کے مجموعی فضل و شرف پر کوئی حرف نہیں آتا اور شان نہیں گھٹتی تو آخر حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے یا ان کے کسی کا یہ خدمت سے حضورؐ کی شان میں کیا بٹہ لگ جائے گا۔

پھر عقلِ سلیم استعمال کیجئے تو نزولِ مسیح کا حدیثی عقیدہ حضورؐ کی عظمت کو مزید نکھارتا اور اجاگر کرتا ہے۔ کیا یہ حضورؐ کے فضل و مرتبت کی انتہا نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جیسا جلیل القدر نبی جو اپنے زمانے میں امام وقت اور امیرِ کل تھا حضورؐ کی رسالت کے بعد دنیا میں آئے اور شریعتِ محمدیؐ کا خادم بن کر کام کرے۔ یہ کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے کوئی بہت بڑا بادشاہ ہو پھر اس کی جگہ دوسرا اس سے بھی بڑا بادشاہ آجائے اور یہ پہلا بادشاہ اس دوسرے بادشاہ کا تابع اور ماتحت بن کر خدمات انجام دے۔ ظاہر ہے کہ اس سے دوسرے بادشاہ کے کمالِ عظمت کا ثبوت ملے گا۔ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اس سے دوسرے بادشاہ کی عظمت پر حرف آتا ہے وہ خدا جانے کونسی دنیا کے دانشور ہیں۔

کتنا جارحانہ ہے یہ فقرہ کہ "اور ایک اسرائیلی نبی نبی آخر الزماں پر فوقیت نہ لے جائے"۔

اے دانشورو! اوّل تو کسی بندے کو زیب نہیں دیتا کہ اللہ نے اپنے جس بندے کے لئے جو بھی امتیاز مقدر کر دیا ہے اس پر زبانِ اعتراض دراز کرے۔ اگر بعض انبیاء کو کچھ منفرد خصوصیات عطا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں نبی آخر الزماں پر فوقیت دیدی گئی تو یہ کام بہر حال اللہ کا ہے۔ وہ جسے جو چاہے دے۔

دوسرے یہاں آخر فوقیت مسیحؑ کا سوال ہی کہاں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ تو آپ لوگوں کی دانشوری اُلٹی گنگا بہا رہی ہے۔ ورنہ اسرائیلی نبی کا شریعتِ محمدی کے تابع رہ کر ڈیوٹی انجام دینا صریحاً ذاتِ محمدیؐ کی افضلیت اور فوقیت کا مظہر ہے۔ ہر عقل والا بلا تکلف کہہ دے گا کسی سابق گورنر کا موجودہ گورنر کی ماتحتی میں کام کرنا گورنر کے بڑے پن کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ سابق گورنر کی فوقیت کو۔

فارقلیط صاحب مزید فرماتے ہیں:-

"حضرت عیسیٰؑ اپنی دوبارہ آمد کے بعد جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیں گے وہ صلیبوں کا توڑنا اور خنزیروں کا قتل کرنا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عیسائیت کو باطل کریں گے۔ کیا یہ کام خاتم المرسلین کے غلاموں سے انجام نہیں دیا جا سکتا؟ کہ ایک حقیقی نبی کو ختم نبوت توڑنے کیلئے دوبارہ بلایا جائے؟"

ہم پوچھتے ہیں کہ اللہ نے روحیں قبض کرنے کیلئے فرشتہ کو کیوں متعین کیا جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ جب جس کام کا ارادہ کرے وہ آپ سے آپ ہو جائے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً انبیاء پیدا کرتے رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ بہ آسانی ایک ہی شخص کو عمرِ طویل دے کر ابتدائے عالم انتہائے عالم تک کے لئے نبی بنایا جا سکتا تھا۔ نیز کیوں اللہ اپنے برے بندوں کو یہ طاقت دی کہ انبیاء کو گالیاں دیں قتل کریں۔ ایذائیں پہنچائیں حتیٰ کہ سب سے بڑے رسول اللہ علیہ وسلم پر اوجھڑیاں ڈالیں۔ زخمی کریں۔ جادوگر کہیں۔

ستارے اللہ نے آسمانِ دنیا کی زینت کیلئے بنائے یہ قرآنی بیان ہے۔ ہم پوچھتے ہیں زینت کے لئے تو ستارے کافی تھے جو انسان سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا پھر اربوں کھربوں ایسے ستارے کیوں بنائے جو نظر ہی نہیں آتے اور سائنس داں اعلیٰ ترین دوربینوں کے ذریعہ ان میں سے کچھ کا مشاہدہ کر سکے ہیں۔

اگر اسی طرح سوالات کا سلسلہ دراز کیا جائے تو

...ت نکل آئیں گے جن کا کوئی حتمی اور قطعی جواب انسان
کی دسترس سے باہر ہے۔ اللہ نے عالم کو چھ روز میں پیدا کیا
حالانکہ اس کا صرف ایک حکم ہر شے کو آن کی آن میں پیدا
کر سکتا ہے۔ سات آسمان بنائے حالانکہ اس کی قدرت
چاہتی تو ایک بھی آسمان کے بغیر نظامِ عالم برپا ہو سکتا
تھا۔ قیامت کے عہد میں بیان قرآنی کے مطابق شمس و قمر
بے نور ہو جائیں گے حالانکہ خدا کی قدرت اس کے بغیر بھی
قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں۔

تو اے محترم بزرگ! کوئی سا بھی کام اللہ اگر چاہے
تو غلام ابن غلام بھی انجام دے سکتا ہے لیکن قیامت سے
قبل یہودیت و نصرانیت کی شکستِ کاملہ کا سہرا اگر اللہ
اپنے بندے عیسیٰ ابن مریم کے سر باندھنا چاہتا ہے تو اس
میں ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔

امورِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند

عام آدمی جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں
کی بھی تمام مصالح کا ادراک نہیں کر سکتا تو یہ مطالبہ کوئی
دیوانہ ہی کر سکتا ہے کہ کائنات کے اصل شہنشاہ کے ہر ہر
فعلِ تکوینی کی مصلحت اسے دو اور دو چار کی طرح سمجھا دی
جائے۔ ایمان بالغیب نام ہے تصدیقِ قلبی کا خواہ ہماری
سمجھ میں کسی امرِ غیبی کی مصلحت اور کنہ اور حقیقت آئے یا نہ
آئے۔ کیا ہم نے عرش کی حقیقت سمجھ لی ہے۔ کیا ہم جان
گئے ہیں کہ اصحابِ کہف سالہا سال تک کس طرح سوتے
رہے اور ان کا کھانا کیوں باسی نہ ہوا۔ کیا ہمیں معلوم
ہو چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کے رحم میں کسی انسانی نطفے کے بغیر
عیسیٰ کہاں سے تخلیق پا گئے۔ کیا ہم نے سمجھ لیا ہے کہ خلاؤں
کی ہولناک وسعتوں اور کائنات کی مہیب پہنائیوں کی تخلیق
کا فائدہ کیا ہے؟

اگر لاتعداد مظاہرِ قدرت کی لم اور حکمت کا احاطہ
ہماری دسترس سے باہر ہے تو آخر نزولِ مسیح کو ماننے کے لئے یہ
شرط کیوں کہ اس کا ناگزیر ہونا ثابت کرو۔ یہ مطالبہ کیسا
کہ ایسے دلائل لاؤ جن سے ثابت ہو کہ مسیح کو نازل کئے
بغیر وہ کام ہو ہی نہیں سکتا تھا جسے وہ انجام دیں گے۔
ایسے دلائل تو وہاں بھی فراہم نہیں کئے جا سکتے جہاں کسی
بچے کے حلالی اور حرامی ہونے کی بحث کھڑی ہو۔ ایک
غیر شادی شدہ عورت بچے کو جنم دیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں
یہ بچہ حرامی ہے۔ آپ کہتے ہیں حرامی کیسے مانیں۔ آخر
اسی دنیا میں ایک عورت مریم بنت عمران نے بغیر عملِ جنسی
کے عیسیٰ نامی بچے کو جنم دیا تھا پھر کیا ضروری ہے کہ ایسے ہی
واقعہ کا ظہور دوبارہ نہ ہو۔ پہلے یہ ثابت کرو کہ بچے کی پیدائش
کے لئے عملِ جنسی ناگزیر ہے یا کم سے کم یہ ضروری ہے کہ مرد کا
نطفہ کسی نہ کسی طرح عورت کے رحم میں پہنچے تب ہم اسے حرامی
مانیں گے۔

تو ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص سوائے ڈنڈے کے
اس علم کلام کا جواب نہیں لا سکتا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہودیت
و نصرانیت کی کامل شکست نہ صرف یہ کہ امتِ محمدیؐ کے
کسی فرد کے ہاتھوں ممکن تھی بلکہ خدا چاہتا تو خارش زدہ کتوں
سے بھی یہ کام لے سکتا تھا۔ آخر اس نے اصحابِ فیل کو پرندوں
کے ہاتھوں چھلنی کرایا ہی تھا مگر اسے ہم کیا کریں کہ خدا نے اس
کام کو انجام دینے کا طریقہ ہم سے یا آپ سے مشورہ لے کر طے
نہیں کیا بلکہ آپ سے آپ طے کر ڈالا اور رسول اللہؐ پر وحی کر دی
کہ امت کو اس سے مطلع کر دو۔ حضورؐ نے مطلع کر دیا۔ آپ کہتے
ہیں ہم نہیں مانیں گے۔ ہم کہتے ہیں نہ مانئے ہم جبراً منوا بھی نہیں
سکتے۔ اپنا حساب آپ کو دینا ہے۔ آپ قرآن کو بھی نہ مانیں تو
ہم آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ البتہ ہم تو حضورؐ کی ہر بات
پر آمنّا و صدقنا ضرور کہیں گے چاہے اس کا مفاد ہماری سمجھ
میں آئے یا نہ آئے۔ قرآن نے ہمیں اسی کی ہدایت کی ہے اور
آپ کے لئے بھی ہماری دعا ہے کہ کلامِ نبوت کو ٹھکرانے کی معصیت
سے اللہ آپ کو بچائے۔ آمین ثم آمین۔

ویسے اسباب و علل کی سطح پر غور کیجئے تو اس نتیجے پر پہنچنا
بھی کچھ مشکل نہیں ہے کہ قدرت کو قیامت سے قبل جو عظیم انقلاب
حال مطلوب ہے اس کے لئے عام اسباب و علل کی منطق میں کوئی بنیاد

نہیں لہٰذا غیب ہی سے کوئی ایسی تکنک ظاہر ہونی چاہیئے جس کے بطن سے یہ حیرت ناک اور ہمہ گیر انقلاب جنم لے سکے۔ امتِ محمدیہ نے اِس دنیا میں بڑی سے بڑی جو فتوحات حاصل کی ہیں وہ بھی اس مطلوبہ انقلاب کے سامنے کوتاہ قامت ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوری دنیا پر اسلام چھا گیا ہو۔ جہاں جہاں چھایا ہے وہاں بھی اس طرح نہیں چھایا کہ سارے ہی یہود و نصاریٰ ایمان لے آئے ہوں۔ اور اب تو اسلام کی بساطِ اقتدار اُلٹ ہی چکی ہے اور مادّی دنیا کی ساری پہنائی پر یہود و نصاریٰ قہاری و جباری کا تخت بچھا ہوا ہے۔ مادّی قوت اور وسائل کا کتنا زبردست انبار ہے جو ان کے پاس جمع ہے۔ صنعت و حرفت ان کی لونڈی ہے اور سیاست و ملک گیری ان کی باج گذار۔ سائنس انھیں ہر نئے دن اقتدار و تسلط کے نت نئے حربے اور آلات دیتی جا رہی ہے۔ دس کروڑ عربوں کے عین قلب میں ایک یہودی ریاست قائم کرلی جاتی ہے اور لاکھوں خاندان گھروں سے نکال دیئے جاتے ہیں پھر تلوار کے زور سے عربوں کی مزید زمینیں چھین لی جاتی ہیں عرب سالوں سے مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں لیکن اپنی زمینیں واپس نہ لے سکے۔ وہ مجبور ہیں کہ ہتھیار اور آلات حاصل کرنے کے لئے ان ہی دروں پر صدا لگائیں جن کے مکینوں نے ان کے سینے میں چھرا گھونپا ہے۔

کیا آج کی دنیا میں اسباب کی سطح پر یہ تصور بھی کسی کے دماغ میں آسکتا ہے کہ مستقبل میں ایک دن ایسا آئے گا جب تمام یہود و نصاریٰ عرشِ اقتدار سے گر کر فرشِ مسکنت پر لوٹ رہے ہوں گے۔ جبر و قہر کی ساری مادّی قوتیں گھٹنے ٹیک دیں گی اور کفر کو کہیں پناہ نہ ملے گی۔ ایسے حیرتناک، بالاتر از قیاس اور ہمہ گیر انقلاب کے سلسلہ میں فارقلیط صاحب بڑے اطمینان سے ایسے الفاظ لکھنا جیسے یہ ایک معمولی سا کام ہو جسے کوئی بھی مسلمان بہ آسانی انجام دے سکتا ہو عجیب طرح کی دانشوری ہے۔ انھوں نے شاید سوچا ہی نہیں کہ یہودیت و نصرانیت کی مکمل شکست کس قدر غیر معمولی، ناقابلِ قیاس

اور بے مثال واقعہ ہے۔ اسلام کے ہر قرن میں مجددین، مصلحین، واعظین اور ماہرینِ سیاست نایاب نہیں رہے ہیں۔ دعوتِ اسلام کا سلسلہ کسی نہ کسی سطح پر برابر جاری ہے۔ داعیانِ حق نے قربانیوں میں بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ اسلام کو غالب کرنے کی مساعی بند نہیں ہوئی ہیں۔ اسکے باوجود نتائج جو کچھ ہیں آپ کے سامنے ہیں۔ پھر آخر یہ کیسے خیال کرلیا گیا کہ یہودیت و نصرانیت کی عالمگیر ہزیمت اسی نوع کی کوششوں سے ہو جائے گی جس نوع کی کوششیں جزیرۃ العرب کے علاوہ کسی ایک ملک میں بھی تمام یہود و نصاریٰ کے قبولِ ایمان پر منتج نہیں ہوئیں۔ کوئی مائی کا لال مسلمانوں میں ایسا پیدا نہ ہو سکا جو دنیا کے پانچ فی صد اہلِ کتاب کو بھی تبدیلیِ عقائد پر مائل کر دے تب کونسی منطق ہے جس کی رو سے آپ اہلِ کتاب کی عالمگیر دینی تبدیلی اور مکمل تغیرِ احوال کو خاتم المرسلینؐ کے کسی غلام کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھ رہے ہیں؟ خاتم المرسلین پہ ہمارے ماں باپ قربان! ان کی دعوتِ حق نے بے شک دنیا کو ایک تاریخی موڑ دیا۔ اسلام کا ڈنکا بج گیا۔ اخلاقی قدروں کے چمن کھلے اور ان کی امت میں بڑے بڑے صالحین اور ماہرین اور جنگ آزما سورما پیدا ہوئے۔ مگر یہ سنۃ اللہ اپنی جگہ اٹل رہی کہ اسلام کے پہلو بہ پہلو یہودیت اور نصرانیت بھی نہ صرف زندگی کے سانس لیتی رہے بلکہ موقع پاکر مسلمانوں کی بساطِ اقتدار لپیٹ دے۔ ان پر مسلط ہو جائے۔ انھیں دریوزہ گر بنالے یہ سنۃ اللہ اُس وقت تک قائم رہنی ہے جب تک وہ وقت نہ آجائے جس کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ نظامِ عالم درہم برہم کر دے گا۔ اور مخلوق کو دارالعمل سے نکال کر میدانِ حشر میں لے جائے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا جس کے عرفے سے انسان دیکھ سکے گا کہ اب دنیا کا انجام قریب آگیا۔ اب سنۃ اللہ نئے لباس بدلے گی اور ہنگامہ عجائبات و نوادرات ظہور پائیں گے۔ اب مادّی اسباب کی تُلی بندھی منطق اعجازِ قدرت کے نئے زاویوں اور نئی تکنکوں سے متعارف ہوگی۔ اسی وقت کے لئے اللہ نے

نزولِ مسیح مقدر فرمایا ہے مطلوبہ عالمگیر انقلاب کے لئے مسلمانوں کی عام فطری استعداد میں کوئی بنیاد نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو ایسی مافوق استعداد سے مزین کرکے بھیجا جائے گا جو ان کے لئے اس کارِ عظیم کو ممکن بنا دے اور یہود و نصاریٰ کے لئے یہ ماننا کہ مسیح بے شک مقتول و مصلوب نہیں ہوئے تھے بلکہ زندہ اٹھا لئے گئے تھے انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھ کر ہی ممکن ہوگا۔ وہ جانتے ہیں کہ مُردے زندہ نہیں ہوا کرتے مسیح کا بہ نفسِ نفیس دنیا میں نظر آجانا قطعی ثبوت ہوگا اس بات کا کہ وہ اللہ کی طرف سے طویل زندگی پاکر کائنات کے کسی نہ کسی حصّے میں اب تک بقیدِ حیات رہے ہیں۔ نیز انھیں شریعتِ محمدیؐ کا پیرو اور تابع اور داعی و علمبردار دیکھ کر یہود و نصاریٰ یہ بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ سب سے بڑا پیغمبر اسلام ہی کا پیغمبر ہے۔ اسی کی شریعت جہانگیر ہے۔ اسی کے دیئے ہوئے عقائد حق ہیں۔ مسیح خدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے نہ انھیں کسی اور نوع کی اُلوہیت حاصل ہے اگر ایسی کوئی مافوق عظمت انھیں حاصل ہوتی تو ایک انسان — محمدِ عربیؐ کی ماتحتی ان کے شایانِ شان کیسے ہوتی۔

غرض ایک مومن دہریت اور مادہ پرستانہ ذہنیت سے بلند ہوکر سوچنا چاہے تو نزولِ مسیح کی کچھ جزوی حکمتیں بھی خیال و تصور میں آہی سکتی ہیں لیکن حقیقی مسئلہ حکمت فہمی کا نہیں ایمان بالغیب کا ہے۔ جو اطلاع حضورؐ سے تواتر کے درجے میں ثابت ہے اس سے انکار کرکے دین و ایمان کو سلامت نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا عقل عیار باور کرے نہ کرے، منطق کا معدہ ہضم کرے نہ کرے ہم بہرحال تہِ دل سے اس اطلاع پر ایمان لائیں گے اور ہمیں اطمینان ہوگا کہ ہم نے اسی چیز کو مانا ہے جسے اسلام کے تمام اساطین تمام اساتذہ تمام ماہرین مانتے آئے ہیں۔

نزولِ مسیح کی احادیث کو من گھڑت قرار دینے کے لئے بطورِ استدلال جو کچھ دانشورانِ کرام نے فرمایا ہے آئیے اس پر بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔

علمی و فنی استدلال ان کے پاس کوئی نہیں۔ البتہ کچھ اوہام ہیں جن کا ازالہ تھوڑے سے غور و فکر سے ہو سکتا ہے۔ ہم غور و فکر کی راہ ہموار کرتے ہیں آگے دانشوروں کو اختیار ہے۔

انھوں نے فرمایا:—

> "مسیح کی دوبارہ آمد کا عقیدہ عیسائیوں کے یہاں مسلّم ہے وہ کہتے ہیں کہ "خداوند یسوع مسیح" دوبارہ دنیا میں آکر نیکوں اور بدوں کا فیصلہ کریں گے ابتدائے اسلام میں عیسائیوں نے اسلام کیخلاف سازشیں کیں اور انھوں نے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر محدثین کو دھوکا دیا تاکہ اسلام کی شان گھٹے اور عیسائی مذہب اور ان کے خداوند کی شان بڑھے۔ ایسی گھڑی ہوئی حدیثوں کو محدثین نے "اسرائیلیات" کا نام دیا اور جو حدیثیں زیادہ چھان بین سے رہ گئیں ان سے محدثین دھوکے میں پڑ گئے۔"

اس ارشاد میں بعض سچائیوں کو فاسد اور خام خیالات سے اس طرح جوڑ دیا گیا ہے کہ ساری ہی بات غلط ہوکر رہ گئی ہے۔

کوئی عقیدہ اگر عیسائیوں اور مسلمانوں میں مشترک ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ وہ فی الحقیقت غلط ہے اور عیسائیوں کے فریب میں آکر مسلمانوں نے اسے اپنا لیا ہے خود قرآن نے اہلِ کتاب کو مخاطب کرکے حضورؐ سے کہلوایا تھا کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (ان باتوں کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہیں) انجیل و توریت آسمانی ہی صحائف تو ہیں۔ ان میں کتنی ہی تحریف کر ڈالی گئی ہو مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا کوئی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ ان میں باقی نہیں رہا یہود و نصاریٰ کے صدہا عقائد میں ایک بھی عقیدہ درست

نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جتلانا کہ عیسائی بھی نزولِ مسیح کے قائل ہیں اس عقیدے کے سرتاپا غلط ہونے کا ہرگز ثبوت نہیں اور یہ گمان تو اور بھی بے سروپا ہے کہ نزولِ مسیح والی حدیثیں عیسائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ اس گمان کی غلطی ان حدیثوں کے مضامین ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ دانشور سوچیں۔ اگر عیسائی انھیں گھڑتے تو کیا ان میں وہ عیسائیت کی تکذیب و شکست اور اسلام کی توثیق و فتح کے مضامین سموتے۔ کیا وہ ان میں یسوع مسیح سے حج اور عمرہ کراتے جو خالص اسلامی عبادات ہیں۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ یسوع مسیح اسلام کے سوا جملہ ملتوں کو مٹا ڈالیں گے۔ کیا وہ یہ پسند کرتے کہ ان کے "خداوند" شریعتِ محمدیؐ کے تابع رہ کر کام کریں۔

قواعدِ فن اور عقل و منطق کے رُخ سے خارجی قرائن پر نظر ڈالئے تو محسوس ہوگا کہ اگرچہ شرپسندوں نے حدیثِ رسولؐ کو مشتبہ بنانے کے لئے واقعۃً بے شمار حدیثیں گھڑی تھیں اور ایسی ساقط الاعتبار حدیثوں کو "اسرائیلیات" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ اس شرارت کے ناپاک اثرات کا سدِّ باب کرنے کے لئے ملّت کے اساطین نے فن کی ایک ایسی کسوٹی ایجاد کی جس سے بہتر کسوٹی کا تصور مشکل ہے اور اس پر گھس کر محدثین نے سچ اور جھوٹ کے رُخ سے احادیث کو پہچانا۔ آج بھی یہ کسوٹی موجود ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ کسوٹی درجۂ وحی میں ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ آدمی اپنی امکانی کوششوں کے باوجود سہو و خطا اور فریب خوردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آج بھی بعض ایسی حدیثیں سندِ قبول پائے ہوئے ہیں جن کی صحت مشتبہ ہے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس میں کسوٹی کی خطا کم اور پرکھنے والوں کا قصور زیادہ ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کسوٹی کی موجودگی میں کوئی بھی من گھڑت حدیث تواتر کا درجہ نہیں پا سکتی۔ نزولِ مسیح کی احادیث اگر دو چار ہوتیں تو ریب و شک کا امکان تھا۔ بخاریؒ و مسلمؒ جیسے چوٹی کے ناقدانِ فن نے ان کی تصدیق نہ کی ہوتی تب بھی خیال کر سکتے تھے کہ ممکن ہے یہ ضعیف ہوں۔ مگر ستر سے زیادہ روایات کا موجود ہونا اور کسی بھی استادِ فن کا انھیں غلط یا مشکوک نہ قرار دینا ایک ایسی صورتِ حال ہے جس کے ہوتے ہوئے ان روایات کو من گھڑت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر دیدیں تو یہ معنی پیدا ہوں گے کہ تمام ہی دفترِ حدیث مشتبہ اور ناقابلِ اعتماد ہے۔ کسی بھی حدیث پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ دانشوروں کا یہ تصور کرنا کہ نزولِ مسیح والی حدیثیں زیادہ چھان بین سے رہ گئی ہیں محض ایک خیالی پرواز اور گمانِ بے قرینہ ہے۔ بخاری و مسلم تو آخری درجے کی چھان بین کے بغیر کسی حدیث کو لیتے ہی نہیں اور از راہِ بشریت ان کی چھان بین میں اگر کہیں خامی رہ گئی ہے تو دوسرے ناقدینِ فن نے اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ زیرِ بحث حدیثوں کی چھان بین سے تمام ہی استادانِ فن غافل رہ گئے ہوں۔ کونے میں پڑی ہوئی کوئی ایک آدھ روایت ہوتی تو احتمال بھی ہو سکتا تھا کہ ناقدین اس سے چوک گئے مگر یہ درجنوں کی تعداد میں نزولِ مسیح کی خبر دینے والی روایات آخر نظر انداز کیسے ہو سکتی تھیں۔ کیسے ممکن تھا کہ ان کو جانچے پرکھے بغیر تمام علماءِ سلف تمام مجتہدین تمام متکلمین تمام محدثین و مفسرین نزولِ مسیح کے عقیدے پر جم جائیں۔ پورے ذخیرۂ حدیث سے کوئی ایک نظیر تو ایسی ڈھونڈ کر لائی جائے کہ کسی من گھڑت روایت کے قبول پر ماہرینِ اساتذہ اس طرح متفق اور مجتمع ہو گئے ہوں۔ یا پھر حوالے کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین میں فلاں فلاں محدثین یا مجتہدین نزولِ مسیح کے منکر رہے ہیں۔

ایک پہلو یہ بھی سوچنے کا ہے کہ امام بخاریؒ اور صحابیِ رسولؐ ابو ہریرہؓ کے درمیان کچھ زیادہ راوی نہیں ہیں۔ دو روایتوں میں ان کی تعداد چار چار ہے اور تیسری میں پانچ۔ یہ سب کے سب انتہائی معتمد اور ثقہ ہیں۔ روایتیں مرفوع ہیں یعنی صحابیِ رسولؐ براہِ راست رسول اللہؐ سے سُن کر روایت کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہ نہ کہتے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا بلکہ اپنے طور پر نزولِ مسیح کی خبر دیتے تب یہ

گمان کیا جا سکتا تھا کہ عیسائیوں کا پروپیگنڈہ انھیں غلط فہمی
میں مبتلا کر گیا مگر بحالتِ موجودہ دو ہی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔
یا تو یوں کہئے کہ معاذ اللہ صحابی نے جھوٹ بولا۔ روایت کہیں
اور سے سنی تھی مگر منسوب کر دی حضورؐ کی طرف۔ یا یوں کہئے
کہ خود رسول اللہؐ نے نعوذ باللہ عیسائیوں کی پھیلائی ہوئی من
گھڑت خبر کو غلطی سے درست سمجھ کر دہرا دیا۔ دونوں ہی
باتیں ایسی ہیں جنھیں کوئی مسلمان حاشیۂ خیال تک میں نہیں
لا سکتا۔

صحابی سے تابعی نے سنا اور تابعی سے تبعِ تابعی نے
یہ بیان امام بخاری کی طرف منتقل ہوا اور امام نے اسے
صحیح بخاری میں درج کر دیا۔ گہرا غور و فکر کیا جائے کہ یہاں
عیسائی پروپیگنڈے سے فریب کھا جانے کا سوال ہی کہاں
پیدا ہوا۔ کوئی بھی راوی ادھر ادھر سے سنی ہوئی باتیں نہیں
دہرا رہا ہے۔ اپنی رائے سے بھی نہیں کہہ رہا ہے۔ ان
روایات کو عیسائیوں کی گھڑنت کہنا ایک ہی معنی رکھتا
ہے کہ ان راویوں میں کوئی نہ کوئی جھوٹا ہے۔ اس نے بات
کہیں اور سنی تھی مگر نام لے دیا کسی اور کا۔ یہ بظاہر تو معمولی سی
بات ہے کہ ایک غیر معصوم راوی پر جھوٹ کا الزام آ جائے مگر
اس کے مضمرات و عواقب انتہائی خطرناک ہیں۔ یہ دراصل
کسی ایک راوی کو ملزم قرار دینا نہیں بلکہ ان بخاری والی
تینوں سندوں کے ہر ہر راوی کو ممکنہ ملزم اور دروغ گو قرار
دینا ہے اس کا حاصل صریحاً یہ ہونا ہی چاہئیے کہ اب جتنی بھی
حدیثیں ایسی ہوں جن کی سند میں ان میں سے کوئی راوی موجود
ہو وہ سب غیر معتبر ٹھیر جائیں۔

پھر بات صرف بخاری ہی تک محدود نہیں۔ آپ
دیکھ چکے حدیث کے تمام صحیح مجموعوں میں اور اس کے بعد
کے درجے کی بہتیری کتبِ حدیث میں نزولِ مسیح کی روایات
بکھری ہوئی ہیں۔ ان کی سندوں میں مختلف راوی ہیں صحابہ
ہی کی تعداد ۲۷ ہے۔ تابعین ان سے زیادہ۔ تبع تابعین اور
زیادہ۔ مسلم جلد اول ص ۴۰۳ کی اکیلی روایت دس سندوں سے
منقول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے سو سے زائد ایسے
راویوں کو مشتبہ بنا دیا جن کے ذریعہ امت کو بے شمار ایسی
حدیثیں پہنچی ہیں جن کی صحت و صداقت پر وہ ایمان رکھتی ہے۔
یہ نتیجہ وہی شخص گوارا کر سکتا ہے جس کا ذہن یہ ہو کہ دین میں
حدیثِ رسولؐ کی کوئی ضرورت نہیں اور سارے وہ احکام
اور ضوابط بے معنی ہیں جن کا پتا حدیث سے چلا ہے۔ اگر
فارقلیط صاحب اس نتیجے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں تو ہماری ان
سے کوئی بحث نہیں کیونکہ اب تک ہم یہی سمجھ کر بحث کر رہے
ہیں کہ وہ منکرِ حدیث نہیں ہیں۔

محترم فارقلیط صاحب مذکورہ حدیثوں کو عیسائیوں کی گھڑنت
قرار دے کر عیسائیوں کے مقصد کی وضاحت ان الفاظ میں
کرتے ہیں:۔

> "اول یہ کہ جب مسلمانوں میں حضرت مسیحؑ کی دوبارہ آمد کا
> عقیدہ پھیل جائے گا تو پیغمبرِ اسلام (فداہ ارواحنا)
> کا خاتم النبیین ہونا مشتبہ ہو جائے گا اور چونکہ حضرت
> مسیحؑ آں حضرتؐ کے بعد آئیں گے اس لئے وہی خاتم النبیین
> قرار پائیں گے۔ اس طرح عیسائیوں نے حضور صلی اللہ
> علیہ وسلم کی ختم نبوت پر کاری ضرب لگا دی۔"

ابھی آپ دیکھ چکے کہ داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی
میں کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حدیثیں عیسائیوں کی
وضع کردہ ہیں۔ اس مفروضے کا جو فائدہ اول ان سطور میں
بیان کیا گیا ہے وہ بھی پروازِ خیال سے زیادہ کچھ نہیں۔
سب کے سامنے ہے کہ نزولِ مسیح کا عقیدہ ابتدائے اسلام ہی
سے مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے مگر آنحضرتؐ کے خاتم النبیین ہونے
کا عقیدہ بھی بلا ادنیٰ ریب و شک موجود ہے۔ پہلے عقیدے
نے دوسرے عقیدے میں بال برابر بھی رخنہ پیدا نہیں کیا۔
جن اکابر علماء نے نزولِ مسیح کے عقائد کو اسلامی عقائد کی
فہرست کے ذیل میں بیان کیا ہے انھوں نے ہاتھوں ہاتھ
یہ تنبیہ بھی کر دی ہے کہ اس سے رسول اللہؐ کے ختم نبوت پر
مطلق اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً علامہ سیوطی اپنی شہرۂ آفاق تفسیر
جلالین میں رقم طراز ہیں:۔

"وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا اور حضرت عیسیٰؑ جب دنیا میں بھیجے جائینگے تو رسول اللہ صلعم ہی کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔" (جامع البیان)

علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں:۔

"اگر تو یہ اعتراض اٹھائے کہ محمد رسول اللہ صلعم خاتم الانبیاء کہاں ہوئے جب کہ عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہوں گے تو میں جواب دوں گا کہ رسول اللہ صلعم کا خاتم الانبیاء ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ کے بعد اللہ کسی کو خلعتِ نبوت سے سرفراز نہیں کرے گا۔ حضرت عیسیٰؑ تو ایسے بندے ہیں جنھیں رسول اللہ صلعم سے قبل نبی بنایا جا چکا۔ وہ جب دنیا میں دوبارہ بھیجے جائیں گے تو محمدیؐ شریعت کے تابع اور حضور ہی کے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت میں بھیجے جائیں گے گویا کہ وہ رسول اللہ ہی کی امت کا ایک فرد ہیں۔" (جلد ۲ ص۲۱۵)

امام بیضاوی نے تفسیر انوار التنزیل[1] میں، امام حافظ الدین نسفی نے تفسیر مدارک التنزیل[2] میں، امام اسماعیل حقی نے تفسیر روح البیان[3] میں، علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی[4] پر، امام رازی نے تفسیر کبیر[5] میں اور علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی[6] میں یہی مضمون اپنے اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے ختم نبوت اور نزولِ عیسیٰؑ کے درمیان اہلِ اسلام میں کبھی ایک دن کو بھی تضاد و تخالف نہیں سمجھا گیا اور دوسرے عقیدے نے پہلے عقیدے پر کوئی ضرب نہیں لگائی فارقلیط صاحب اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی ملک اور زمانے کے دس بیس ہی مسلمان ایسے پیش فرما دیں جنھوں نے نزولِ مسیح کا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی حضور صلعم کے ختم نبوت میں شک کیا ہو یا ختم نبوت کی خاطر عقیدۂ نزولِ مسیح کو چھوڑ دیا ہو۔

عیسائیوں کا دوسرا مفروضہ مفاد فارقلیط صاحب کی طرف سے باین الفاظ پیش کیا گیا ہے:۔

"دوسرا مقصد مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ جو کام حضرت مسیح آکر کریں گے اس کو کرنے کی توفیق حضور صلعم کے متبعین اور جاں نثاروں کو کبھی نہ ہوگی۔ گویا قیامت سے پہلے جو کام حضرت مسیحؑ کو کرنا ہوگا وہ حضور صلعم کے غلاموں کے بس کا روگ نہیں۔ یوں اسلام اور مسلمان حضرت مسیحؑ کے محتاج ٹھہرے اور عیسائی کہہ سکیں گے کہ جب آنحضرتؐ کا کوئی متبع وہ کام نہ کر سکے گا جو حضرت مسیحؑ کے سپرد کیا گیا ہے تو آں حضرتؐ کا وجود بے اثر ثابت ہوا اور یہ خیال بھی غلط ٹھیرا کہ آنحضرت صلعم کی پیروی میں نجات ہے۔ افسوس ہے کہ عیسائیوں کا تجربہ کارگر ثابت ہوا اور مسلمان حضرت مسیحؑ کو لاکر حضور صلعم کے آخری نبی ہونے کا انکار کر بیٹھے۔"

منطقی شاعری کی ایسی مثالیں لٹریچر میں کم ہی ملیں گی۔ فارقلیط صاحب رائی کا پہاڑ بناتے ہیں اور حقائق کو اس سے ٹکرا کر اپنی دانست میں پاش پاش کر دیتے ہیں۔

دراصل ان کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ یہودیت و نصرانیت کی عالمی شکست ایک معمولی سا کام ہے جسے بہ آسانی کسی نہ کسی فردِ امت ہی کو انجام دے ڈالنا چاہئیے۔ اسی لئے وہ کسی طرح یہ گوارا کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اس کام کے لئے اللہ حضرت عیسیٰؑ کو بھیجے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مطلوبہ انقلاب کا آجانا بڑی سہولت سے ممکن ہے اگر حضور صلعم کے متبعین کو تھوڑی سی توفیق حاصل ہو جائے۔

ہم ان سے گذارش کریں گے کہ یہ معاملہ توفیق اور بے توفیقی کا نہیں ہے۔ قدرت و صلاحیت کا ہے۔ توفیق اللہ تعالیٰ بقدرِ استعداد ہی دیتا ہے۔ تاریخ کا ایک ایک ورق

---

[1] جلد ۴ ص۱۶۴ [2] ص۲۷۱ [3] جلد ۲۲ ص۱۸۸ [4] ص۹۷
[5] جلد ۳ ص۲۴۳ [6] جلد ۲۲ ص۳۲ ۔

آپ کے سامنے ہے۔ بتائیے کیا امتِ محمدیؐ کے کسی بھی فرد میں بھی ایسی عجیب و غریب صلاحیت پائی گئی ہے کہ کسی شہر و دیار کے سارے ہی اہلِ کتاب اس کی آواز پر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہوں اور کسی بھی کافر کو اپنے کفر پر قائم رہنے کی مجال نہ رہی ہو۔ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو کس بنیاد پر آپ یہ خوش فہمی لئے بیٹھے ہیں کہ غلامانِ محمدؐ میں مطلوبہ عالمگیر انقلاب لانے کی پوری صلاحیت موجود ہے بس توفیق کی دیر ہے۔

رہا عیسائیوں اور یہودیوں کا اسلام پر معترض ہونا۔ تو کیا آج تک انھوں نے بس یہی ایک اعتراض کیا ہے جسے آنجناب سجا بنا کر پیش کر رہے ہیں؟ آپ کو تو خوب معلوم ہے کہ ان کے اعتراضات کی انتہا نہیں۔ کیا مسئلہ جہاد کیا مسئلہ غلامی۔ کیا مسئلہ ازدواج اس طرح کے بیسیوں مسائل میں اسلامی شریعت کے خلاف ان کا معاندانہ پروپیگنڈہ برابر جاری ہے۔ آپ کس کس عقیدے کو ان کے اعتراض کے ڈر سے ترک کریں گے۔ بے شمار دیگر عقائدِ اسلامیہ پر جہاں ان کی زبانِ طعن سنگباری کر رہی ہے وہاں ایک نزولِ مسیح کا عقیدہ اور سہی۔

شریعت کے باب میں مسلمان رسول اللہؐ کے سوا کسی لاحق و سابق نبی کے محتاج نہیں مگر یہودیت و نصرانیت کی ہزیمت کا معاملہ کا جو کارِ خدمت اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے ذمہ رکھا ہے اس کا تعلق احکامِ شرعی سے تو کچھ نہیں وہ تو ایک تکوینی مسئلہ ہے۔ اللہ مختار ہے کہ جو کام جس سے چاہے لے۔ حضورؐ کی پیروی میں نجات کا منحصر ہونا نہ ہونا بھلا اس بات سے کیا تعلق رکھتا ہے کہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں اور ایک ناقابلِ قیاس عظیم انقلاب برپا ہو۔ آپ خواہ مخواہ اس لایعنی خیال میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ عیسائیوں کا حربہ کارگر ثابت ہوا اور مسلمان "حضرت مسیحؑ کو لا کر" حضورؐ کے آخری نبی ہونے کا انکار کر بیٹھے۔ مسلمان تو شروع سے نزولِ مسیح کے قائل ہیں۔ مگر ایک لمحے کو بھی انھوں نے حضورؐ کے ختمِ نبوت میں شک نہیں کیا اور فتنۂ قادیانیت کے فروغ سے قبل ان کے حاشیۂ خیال تک میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ حضورؐ کے ختمِ نبوت کا طے شدہ قطعی مسئلہ موضوعِ بحث بھی بن سکتا ہے۔ بڑی جسارت ہے کہ آپ بار بار اصرار کے ساتھ نزولِ مسیح کے عقیدے کو من گھڑت کہے چلے جا رہے ہیں۔

مزید فرمایا گیا:۔

"ہم نے اوپر کہا ہے کہ عیسائیوں نے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر محدثین کو دھوکا دیا اس کی شہادت میں ہم حضرت امام فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر کا قول پیش کریں گے وہ فرماتے ہیں۔ یہ امت کو معلوم ہے کہ ملحدوں نے غلط حدیثیں گھڑیں اور محدثین کو دھوکا دیا اور محدثین نے سادگی سے اس چال کو نہ پہچانا اور وہ ایسی حدیثوں کو قبول کر بیٹھے۔"

کیا یہ واقعی شہادت ہے؟

اے محترم بزرگ! ایک امام رازیؒ ہی نہیں تمام ائمہ اور محدثین اس حقیقت کا انکشاف کرتے چلے آ رہے ہیں کہ ملحدوں اور زندیقوں اور کم عقلوں نے بہت سی حدیثیں گھڑیں اور پھیلائیں۔ مگر یہی حضرات یہ بھی وضاحت کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اسی لئے ایک ایسا فن ایجاد کرنا پڑا جس کے ذریعہ پتا چلایا جا سکے کہ کس حدیث کی کیا پوزیشن ہے۔ اس فن نے گھڑنت کرنے والوں کا بازار سرد کر دیا اور خود محدثین نے ایسی مستقل کتابیں لکھیں جن میں گھڑی ہوئی حدیثوں کو جمع کر دیا گیا۔ اگر اصلی اور نقلی حدیثوں کی پہچان کا کوئی طریقہ ہاتھ نہ آتا تو پھر یہ بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث دنیا میں موجود ہی نہ ہوتیں۔ ان سے کیا فائدہ تھا اگر یہ اندیشہ جوں کا توں قائم رہتا کہ ان میں خبر نہیں کون کون سی حدیثیں من گھڑت ہیں۔

جن امام رازی کی عبارت آپ نزولِ مسیح کی حدیثوں کو رد کرنے کے لئے لائے ہیں اگر واقعی امام رازی کا مطلب اس عبارت سے یہی ہوتا کہ مذکورہ حدیثوں کو من گھڑت

سمجھا جائے تو پھر لازماً وہ بھی آپ ہی کی طرح نزولِ مسیح کے منکر ہوتے مگر ملاحظہ فرمائیے تفسیر کبیر میں ان کا ارشاد یہ ہے:۔

انتہاء الانبیاء الیٰ مبعث محمد صلے اللہ علیہ وسلم فعند مبعثہ انتہت تلک المدۃ فلا یبعد ان یصیر داعیٰ عیسیٰ ابن مریم) بعد نزولہ تبعاً لمحمدؐ (ج ۳ ص ۳۴۳)

"رسول اللہؐ کی بعثت پر انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے نزول کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تابع ہوں گے۔"

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ امام رازیؒ بھی نزولِ مسیح کے قائل ہیں اور متعلقہ حدیثوں کو من گھڑت نہیں سمجھتے۔ دوسرے یہ کہ اس عقیدے کو حضورؐ کے ختم نبوت سے متصادم سمجھنا ان کے نزدیک بھی لغو ہے۔

فرمائیے کیا اس کے باوجود امام رازیؒ کو اپنے گواہوں کی صف میں کھڑا کر دینا آپ کو ایک مضحکہ خیز اور افسوسناک پوزیشن میں ڈال دیتا ہے یا نہیں۔ جس مرحوم امام کو آپ نے قبر سے نکال کر اپنی بندوق کا بندوقچی بنایا وہ خود ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کا نزول عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

خاتمۂ کلام کے طور پر فارقلیط صاحب نے امام غزالیؒ کی ایک نصیحت بھی درج کی ہے:۔

"میری وصیت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اہلِ قبلہ کی تکفیر سے زبان کو بند رکھو جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہوں بشرطیکہ وہ اس کلمہ کی مخالفت نہ کریں اور مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی عذر یا بغیر عذر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں کیونکہ ایسے لوگوں کی تکفیر خطرے سے خالی نہیں۔ اگر سکوت اختیار کر لیا جائے تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

محترم فارقلیط صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صرف امام غزالیؒ ہی کا مسلک نہیں بلکہ تمام اہلِ سنت کا مسلک ہے۔ مستند علمائے اسلام ہمیشہ سے اس کے قائل اور اس پر عمل پیرا رہے ہیں اور فارقلیط صاحب ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ قادیانیوں کی تکفیر اس مسلک سے انحراف نہیں ہے، بلکہ عین اسی مسلک کا تقاضا اور مطالبہ ہے۔

ایک شخص کہتا ہے پانچ وقت کی نماز فرض نہیں۔ زکوٰۃ کا شرعی نصاب ہر زمانے کی اقتصادیات کی مطابقت سے بلا تکلف بدلا جا سکتا ہے۔ قربانی لاحاصل ہے۔ حج محض ایک قدیم رسم ہے جسے مذہبی فریضہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ فرمائیے کیا اسے آپ مسلمان کہیں گے؟

حالانکہ یہ کلمہ کا انکار نہیں کر رہا ہے لیکن تمام علمائے اسلام اس کے کفر پر متفق ہیں کیونکہ یہ کلمہ کے لازمی تقاضوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ رسول اللہؐ کو جھٹلا رہا ہے۔ اجماع کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ آنجناب نے بھی اپنے الجمعیۃ کے اداریوں میں بارہا ان لوگوں کو منافقین کے زمرے میں لکھا ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قومی دھارے میں غوطے لگانے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے بخیئے اُدھیڑ دینے میں کوشاں ہیں۔

حدیثیں کہتی ہیں کہ قبلِ قیامت عیسیٰ ابن مریمؑ کا نزول ہوگا۔ قادیانی کہتے ہیں نہیں عیسیٰؑ تو مر چکے مثیلِ عیسیٰ کا نزول ہوگا اور وہ بھی ہو چکا۔ ہمارے مرزا غلام احمد قادیانی وہی مسیح موعود ہیں۔ قرآن و حدیث زور دیتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ مرزا غلام احمد کہتے ہیں میں نبی ہوں۔ آنجناب جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مرزا نے اپنی نبوت کو مجازی کہا تھا اس غلط فہمی کو ہم دور کر چکے۔ فی الحقیقت نبوت تو کبھی مجازی یا ظلی یا بروزی ہوتی ہی نہیں یہ اصطلاحیں مرزا صاحب نے اس وقت گھڑی تھیں جب وہ دوسرے اسٹیج میں تھے۔ تیسرے اسٹیج میں یہ تکلف بھی ختم کر دیا گیا۔ پھر فرمائیے کیا یہ تمام کارگزاری خدا اور رسولؐ کو جھٹلانے کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ حد یہ کہ مرزا صاحب قرآن کی متعدد آیات کے بارے میں صاف صاف کہتے ہیں کہ ان میں

خدا نے مجھے مخاطب کیا ہے۔ میں ہی وہ احمد ہوں جس کے آنے کی بشارت دی گئی تھی۔ میرے ہی حق میں فرمایا گیا —
هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ۔[۵۱]
آیت قرآنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ میں محمد رسول اللہ سے مراد میں ہوں[۵۲] "خدا نے پہلے میرا نام مریم رکھا پھر عیسیٰ کی روح مجھ میں پھونکی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا اور آخر کئی مہینے بعد مجھے مریم سے عیسیٰ بنادیا گیا۔ اس طرح میں ہی ابن مریم ٹھیرا۔"[۵۳]

انصاف کیا جائے کہ قرآن سے اس طرح ٹھٹھول اور تمسخر کرنے والا کلمہ کا قائل سمجھا جائے گا یا مخالف؟ امام غزالیؒ کا منقولہ ارشاد ہی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ ایسا شخص اور اس شخص کو مقتدا بنانے والا گروہ اُن اہل قبلہ میں نہیں ہے جن کی تکفیر میں جھجکنا چاہیئے۔ یہ تو کلمۂ توحید ورسالت سے کھلا کھلا انحراف اور استہزاء ہے۔

فارقلیط صاحب اگر ان ہی امام غزالی کی "الاقتصاد فی الاعتقاد" ملاحظہ فرمائیں تو ان پر منکشف ہوگا کہ اجماع امت کو وہ بھی حجت مانتے ہیں اور اجماع کے منکر کو کافر و گمراہ قرار دینا ان کے نزدیک بھی ضروری ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۱۴ پر انھوں نے جو بحث کی ہے وہ تو ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے قادیانی ہی ان کے پیش نظر ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت ممکن ہے تو اسے کافر قرار دینے میں ذرا بھی تامل و توقف نہیں کیا جائے گا۔

کیوں نہیں کیا جائے گا؟ اس کا بھی جواب سن لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ خاتم النبیین اور حدیث کے الفاظ لا نبی بعدی میں کھینچ تان ممکن ہے۔ طرح طرح کی تاویلیں ان میں کی جاسکتی ہیں۔ اور تاویل کرنے والوں کے بارے میں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ وہ قرآن وحدیث کا انکار کر رہے ہیں لیکن چونکہ ان نصوص کے معنی معینہ پر اجماع منعقد ہوچکا ہے اس لئے ان معنی کے علاوہ کوئی معنی کرنا کفر ہے۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ قادیانی حضرات مرزا کی نبوت منوانے کے لئے ان نصوص میں خوب خوب تاویلیں کرکے خلاف اجماع معنی نکالتے ہیں اور نکالنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ مرزا نے حضرت عیسیٰ کو مُردہ قرار دیدیا اور یہ خیال گھڑا کہ حدیثوں میں جس مسیح کے نزول کی خبر دی گئی ہے وہ صرف اوصاف میں مسیح جیسا ہوگا۔ فی الحقیقت عیسیٰ ابن مریم نہ ہوگا۔ جب وہ عیسیٰ ابن مریم نہ ہوگا بلکہ اپنے زمانے کی کسی عورت کے بطن اور کسی مرد کے نطفے سے پیدا شدہ ایک نیا آدمی ہوگا تو ظاہر ہے کہ اسکی نبوت نئی نبوت ہوگی جو رسالت محمدیؐ کے بہت بعد عطا ہوئی لہٰذا اس طے شدہ اجماعی عقیدے کو رد کئے بغیر چارہ نہیں کہ نبوت کا دروازہ رسول اللہؐ پر بند ہوچکا اور آپ کے بعد کسی نبی کی بعثت خارج از امکان ہے۔

تو اے بزرگ محترم! جن امام غزالی کو آپ اپنے وکیل کی حیثیت سے پیش فرما رہے ہیں وہ بھی آپ سے اتفاق نہیں رکھتے اور قادیانی گروہ ان کے نزدیک بھی ایک نہیں متعدد وجوہ سے بلاشبہ کافر ہے۔ ایک وجہ تو یہی کہ اس نے اجماعِ امت کا انکار کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ حدیثوں کو جھٹلاتا ہے تیسری وجہ یہ کہ وہ قرآن سے کھیل کرتا ہے۔ ان متعدد وجوہ میں سے تنہا ایک ہی وجہ کسی شخص یا گروہ کے کفر کو کافی ہے چہ جائیکہ اس میں تینوں وجوہ جمع ہوگئی ہوں۔ آپ نے امام غزالیؒ یا دیگر اساطین کی کتابیں دیکھنے کی طرح نہیں دیکھیں ورنہ بے شمار جگہ ان میں یہ منظر آپ کو نظر آجاتا کہ اہل قبلہ اور کلمہ گو حضرات کی تکفیر میں سخت احتیاط کے باوجود یہ حضرات بڑے خندہ مدے ان فرقوں کی تکفیر کرتے چلے گئے ہیں جنھوں نے کلمہ کا انکار تو نہ کیا اور قبلہ کی سمت بھی نہیں بدلی مگر اجماعی عقائد سے منحرف ہوگئے اور ایسے رشتے چھوڑے جو کلمہ کے تقاضوں سے جوڑ نہیں کھاتے تھے۔

فارقلیط صاحب کا اصل مضمون ختم ہوا۔ اس کے متصل بعد

---

[۵۱] حقیقۃ النبوۃ ص۲۲۔ [۵۲] اخبار الفضل۔ قادیان۔ جلد ۲ نمبر ۱۵۔ ۱۶ جولائی ۱۹۱۵ء۔ [۵۳] کشتی نوح ص ۸۷-۸۸-۸۹

انھوں نے ان تاثرات کا اضافہ کیا ہے جو بقول ان کے دانشوروں میں اس وقت پیدا ہوئے جب پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو باضابطہ کافر قرار دے دیا۔ ہم ان تأثرات کا بھی جائزہ لیتے ہیں تاکہ فارقلیط صاحب کا پھیلایا ہوا کوئی کمزور سے کمزور مغالطہ بھی ایسا باقی نہ رہ جائے جس کے اثر سے برادرانِ اسلام گمراہ ہوں اور قادیانیت کو کمک میسر آئے۔ واللہ المستعان۔

محترم فارقلیط صاحب کے دانشور فرماتے ہیں:۔

● "پاکستان کی قومی اسمبلی نے پاکستان کے چالیس لاکھ احمدیوں کو نماز پڑھتے ہوئے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے غیر مسلم قرار دے دیا'

اس پر ہماری آنکھیں اشک بار ہیں۔"

ہم نے آج تک یہی سُنا اور سمجھا تھا کہ دانشور وہ ہے جو صرف سطحی مطالعہ پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ سطح کو چیر کر تہوں تک اپنی نظر میں پہنچائے اور غیر دانشور وہ ہے جو تہہ تک جانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ مگر آج اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم نے غلط سنا اور سمجھا تھا۔

محترم بزرگ! کیا آپ کو نہیں معلوم کہ دورِ رسالتؐ کے منافقین بھی نمازیں پڑھتے تھے حتیٰ کہ انھوں نے ایک مسجد بھی بنائی تھی۔ اور کیا آپ کو نہیں معلوم کہ خوارج کس قدر عبادت گذار اور زہد پیشہ تھے لیکن نہ تو منافقین کے کفر میں شک کی گنجائش ہے نہ خوارج کی کج فکری میں دو رائے ہیں۔

ایمان کا مدار اعمال پر ہے ہی نہیں۔ وہ تو چند اساسی عقائد سے عبارت ہے۔ ان عقائد کا اجمالی نام ہے ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسالۃ جو کچھ قرآن سے ثابت اور احادیثِ متواترہ سے متحقق ہو اسے تہہ دل سے تسلیم کرنا یہ ہے ایمان کا خلاصہ۔

آپ کے دانشور اگر یہ مانتے ہیں کہ محمد رسول اللہؐ آخری نبی تھے اور ان کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا تو اس گروہ کے کفر میں آپ کو شک کیوں ہے جو ڈنکے کی چوٹ مرزا غلام احمد کو نبی مان رہا ہے۔ یہ گروہ نمازیں اور قرآن پڑھتا ہے یہ فقط عملی مسئلہ ہے۔ ایمان و کفر کا فیصلہ عقائد

کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ عمل۔ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے۔ جوا کھیلتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں انھیں آپ کافر نہیں کہتے کیونکہ یہ فقط اعمال ہیں اور کفر عقیدے کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اگر عقیدۃً ایک شخص یا گروہ کافر ہے تو اس کی نمازوں اور قرآن خوانیوں سے اس میں کیا فرق واقع ہوگا۔ قادیانی گروہ نہ صرف ختم نبوۃ کا منکر ہے بلکہ قرآن میں صریح تحریف کرتا ہے۔ آیات کے الفاظ گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ جتنے نمونے آپ چاہیں ہم پیش کر دیں۔ یہ سب بھی اگر اس کے کفر کا ثبوت نہیں تو پھر آپ شاید یہ رائے رکھتے ہوں کہ کوئی مسلمان کبھی کافر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ رائے قرآنی وضاحتوں کے خلاف ہے۔ اس لئے آپ اگر ایسی رائے رکھیں گے تو آپ بھی ایمان بالکتاب سے گریزاں مانے جائیں گے۔

دانشوروں نے پاکستان کے جسٹس منیر کی دہائی دی ہے اور ان کے ایک فیصلے کا قصیدہ پڑھا ہے۔ ہم کہتے ہیں جسٹس منیر کی حیثیت کیا ہے اسلامی قانون میں۔ وہ برطانوی قانون کے کیسے ہی ماہر ہوں لیکن دین و شریعت کے باب میں انکی آراء خارج از بحث ہیں۔ کل آپ مسٹر چھاگلا اور حمید دلوائی کو مفتی کی حیثیت سے لا کھڑا کریں تو مسخروں کے سوا آپ کو کون قابلِ التفات سمجھے گا۔

دانش وروں کا خیال یہ ہے کہ قادیانیوں کو کافر قرار دے کر ضمیر کی آزادی کچلی گئی ہے اور اسلام کے دامن پر عدم رواداری کا داغ لگایا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں آپ الفاظ کو بے سمجھے بوجھے استعمال کر رہے ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کو ایسی آزاد ضمیری ایک دن بھی عطا نہیں کی تھی کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے صریح فیصلوں میں سے جسے چاہیں قبول کریں اور جسے چاہیں رد کر دیں۔ اگر اس کا نام عدم رواداری ہے تو اسلام کبھی رعادار نہیں رہا۔ قرآن کی صف در صف آیات ہانکے پکارے کہہ رہی ہیں کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو ان کے احکام مانو۔ ہم یہاں صرف ایک آیت نقل کریں گے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا — تیرے رب کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوں گے جب تک اپنے تمام مناقشا

شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا — واختلافات میں تجھی کو منصف نہ مانیں
یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ — اور تو جو فیصلہ کر دے اسکے بارے
حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ — میں اپنے جی میں تنگی محسوس نہ کریں،
وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ — اور قبول کریں خوشی سے۔

(سورۂ نساء آیت ۶۵)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اگر آزادیٔ ضمیر کا وہی مفہوم ہے جو دانشورانِ کرام لے رہے ہیں تو فرمائیے اس سے بڑھ کر غیر روادار اور آزادیٔ ضمیر کی دشمن کونسی آیت ہوگی۔ یہاں صرف یہی مطالبہ نہیں کہ رسولؐ کا ہر فیصلہ مانو بلکہ یہ بھی مطالبہ ہے کہ یہ ماننا بادلِ ناخواستہ نہ ہو بلکہ تہہِ دل سے ہو۔ تمھارا ضمیر اسے ہنسی خوشی قبول کرے۔ تکدر اور بدمزگی نہ ہو۔ حدیثیں تواتر کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ قیامت سے قبل وہی عیسٰی ابن مریم نازل ہوں گے جو محمد رسول اللہ سے قبل نبی بنائے گئے اور زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے مگر قادیانی کہہ رہے ہیں کہ عیسٰی ابن مریم تو مر چکے اور مرزا غلام احمد مسیح موعود ہیں۔ حدیثیں کہہ رہی ہیں کہ محمد رسول اللہؐ آخری نبی ہیں ان کے بعد کسی بھی نبی کی بعثت نہیں ہوگی لیکن قادیانی کہہ رہے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہمارے مرزا صاحب نبی ہیں۔

یہ نکتہ اچھی طرح دماغ میں بٹھا لیجئے کہ عیسٰی ابن مریم کے نزول سے ختم نبوۃ پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ محمد رسول اللہؐ سے پہلے نبی بنائے گئے تھے۔ قبلِ قیامت ان کا نزول ہوگا بعثت نہیں ہوگی۔ کسی بھی اعتبار سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ محمد رسول اللہؐ سے بعد کے نبی ہیں لیکن مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ماننا لازماً ختم نبوۃ سے متصادم ہے کیونکہ وہ عیسٰی ابن مریم نہیں ہیں بلکہ آج کی ایک عورت کے بطن اور مرد کے نطفے سے پیدا شدہ آدمی ہیں جسے نبی ماننا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ نبوت اسے محمد رسول اللہؐ کے بعد ملی۔

دانشوروں نے پاکستان کے مقابلے میں ہندوستانی آئین کے اس پہلو کو بہت سراہا ہے کہ اس میں تمام ہندو فرقوں کو ہندو قرار دے کر ہر قسم کی بحث کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ کوئی ہندو ایشور تک کا منکر ہو وہ بھی ہندو اور قائل ہو وہ بھی ہندو۔

اس پر ہم اس کے سوا کیا کہیں کہ دانشوروں نے خواہ مخواہ مسلمان ہونے کا سوانگ رچایا ہے۔ اگر اسلام اور ہندومت کی پوزیشن ایک ہی ہے اور دونوں کے بارے میں یکساں رویہ ہی قابلِ تعریف ہے تو کیوں وہ اسلام سے بندھے ہوئے ہیں جب کہ اکثریت کا مذہب اختیار کر کے بہت سے دنیاوی منافع بھی کمائے جاسکتے ہیں۔

ہندومت ایک نسلی مذہب ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ نہیں کرتا اس میں اصل اہمیت کلچر کی ہے یعنی رہن سہن کے ڈھنگ کی اور عقائد اس میں محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام کا مطلق کوئی تعلق نسب سے ہے ہی نہیں۔ وہ ایک نظریاتی مذہب ہے۔ عقائد اس کی واحد اساس ہیں۔ اعمال و افعال کو وہ ثانوی درجہ دیتا ہے۔ کلچر کی تصویر وہ عقائد ہی کے قلم سے کھینچتا ہے اور جو لوگ اس کے بنیادی عقائد میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر بیٹھیں انھیں بلا تامل اپنے دائرے سے باہر پھینک دیتا ہے۔ ایسے دو مختلف بلکہ متقابل مذاہب کے بارے میں دانشوروں کا یہ سمجھنا کہ ایک ہی رویہ ان دونوں کے لئے مناسب ہے، دانشوری تو کہلا نہیں سکتی اور جو چاہے کہہ دیجئے۔

روم کے پاپائے اعظم نے عیسائیوں کے سلسلے میں جو روش اختیار کی اس کا بھی تذکرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دانشور صاحبان اسلام کی یکتائی اور امتیاز اور قطعیت کو فراموش کر کے ان خوش فکروں کے ہمنوا ہو گئے ہیں جن کا خیال ہے کہ تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ برحق ہیں اور نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں ہے۔

غور کرنا چاہئے کہ ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔ مغربی ممالک بھی سیکولرازم ہی کے علمبردار ہیں۔ یہاں یا وہاں آئین کے دائرے میں مذہبی امتیازات کو کوئی اہمیت

نہیں کسی کا ہندو یا غیر ہندو ہونا یا کسی کا کیتھولک اور کسی کا پروٹسٹینٹ ہونا ایک ذاتی و نجی معاملہ ہے جو آئین کو متاثر نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ حکومت مذہبی عقائد کی باریکیوں میں پڑے اور مذہبی تشخص کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط برتے۔ لیکن پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ آئین میں اس کا نام اسلامی جمہوریہ رکھا گیا ہے اور صریح الفاظ میں مذہبی امتیاز کو اس درجہ اہمیت دی گئی ہے کہ کوئی غیر مسلم صدرِ مملکت نہیں بن سکتا خواہ کتنا ہی لائق فائق ہو۔ ایسی صورت میں قدرتی بات ہے ــــ اور دانشوری بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ وہاں کی حکومت مذہبی تشخص کو غیر معمولی اہمیت دے اور کسی فرد یا گروہ کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑے کہ وہ غلط طور پر خود کو مسلم کہہ کر وہ خصوصی مفادات حاصل کرے جنھیں آئین میں طے کر دیا گیا ہے۔

دانشور یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں اور مگر مچھ کے آنسو ان کی آنکھوں سے جاری ہیں۔ کاش وہ جانتے کہ قادیانیوں نے کس طرح پاکستان کے بے شمار کلیدی مناصب پر قبضہ کر کے کیسے کیسے گل کھلائے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر ربوہ اسٹیٹ در اسٹیٹ کا نمونہ ہے۔ اس کے حق میں مخصوص ترین قوانین وہ اسی لئے بنوا سکے کہ بہتیری کلیدی مناصب ان کے قبضے میں تھے اور خدا بیزار قسم کے حکمراں انھیں ہر طرح کی رعایات سے نوازتے تھے۔ انھوں نے اسلام کی تبلیغ کے نام پر قادیانیت کی تبلیغ کی۔ اسلام کی جڑیں کھودیں اور اس خدمت کا سارا خرچ اور "انعام" مسلمانوں ہی کے خزانے سے وصول کیا۔

یہ کہنا کہ :-

"کہاں یہ بات کہ دوسروں کو حلقہ بگوش اسلام کیا جائے اور کہاں یہ رجعت کہ چالیس لاکھ مسلمانوں کو جو علی الاعلان اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں بیک بینی و دوگوش اسلام کے دائرے سے نکال کر کفر کی تاریکی میں دھکیل دیا جائے۔"

محض بچکانہ باتیں ہیں۔ کفر کے اندھیرے میں قادیانیوں کو پاکستانی فیصلے یا علماء کے فتووں نے نہیں دھکیلا اس اندھیرے میں تو وہ خود ہی خودکش تھے۔ فیصلے اور فتوے نے صرف نشاندہی کی ہے۔ صرف یہ کیا ہے کہ جس حقیقت پر قادیانی حضرات فریب کا پردہ ڈالے ہوئے تھے اسے کھول دیا ہے۔ دعوۂ نبوت کریں مرزا غلام احمد اور الزام علماء کو دیا جائے کہ انھوں نے مرزا کو کافر اور ان کے متبعین کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا۔ خودکشی کی زید نے اور دانشور اس ڈاکٹر کو مطعون کریں جس نے موت کی تصدیق کی ہے۔ اسی کا نام دانش وری ہے تو اس سے اچھی وہ بے دانشی جو ظاہرداریوں سے دھوکا نہیں کھاتی۔

بڑے مزے کی بات یہ بھی کہی گئی ہے :-

"پاکستان کی قومی اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر دیوبند اور اہل حدیث مسلک کے علماء اور عوام کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اگر بریلوی خیال کے علماء نے پاکستان پر زور ڈالا کہ وہ غیر بریلویوں کو اسی اصول پر غیر مسلم اقلیت قرار دے جس اصول پر احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے تو مکفرین سے طائفہ پر زمین تنگ ہو جائیگی۔"

اسی کا نام ہے احمقوں کی جنت میں رہنا۔ دانشوروں کو آج تک یہ بھی پتا نہیں چلا کہ پاکستان کی قومی اسمبلی تمام علمائے پاکستان کے مسلسل مطالبے ہی پر مجبور ہوئی ہے کہ قادیانیوں کے بارے میں آخری فیصلہ صادر کرے۔ اس نے قادیانی سربراہوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے عقائد کو خود ہی واضح کریں تاکہ منصفانہ طور پر دیکھا جا سکے کہ تمام علماء جن عقائد کی بناء پر ان کی تکفیر کر رہے ہیں وہ واقعتہً ان کے عقائد ہیں بھی یا وہ ان سے برأت ظاہر کرتے ہیں۔ قادیانی سربراہ برأت کیسے ظاہر کرتے جب کہ ان کے وجود کا امتیاز ہی ان عقائد پر مبنی ہے اور یہی عقائد وہ زور و شور سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کرتے آئے ہیں چنانچہ جب انھوں نے اعتراف کیا کہ ہمارے نزدیک مرزا غلام احمد نبی ہیں اور ان کی نبوت کے منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہیں تو قومی اسمبلی مجبور ہو گئی۔ وہ اگر انھیں غیر مسلم قرار نہ دیتی تو پھر ان کے سوا سارے پاکستانی مسلمان غیر مسلم ٹھہرتے

کیونکہ وہ مرزائی نبوت کے منکر ہیں۔

افسوس کہ دانش ورصاحبان بریلوی اور غیر بریلوی علماء کے اختلاف کو اسی نوع کا اختلاف سمجھے بیٹھے ہیں جیسا قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے درمیان ہے حالانکہ یہ پہلے سرے کی بے بصری اور کم عقلی ہے۔ انھیں سمجھنا چاہئے کہ محمد رسول اللہؐ کے بعد کسی امتی کا دعوۂ نبوت ایک انتہا درجہ بھیانک فتنہ ہے جسے کسی دوسرے فتنے سے مماثلت نہیں دی جاسکتی۔ قادیانیوں کے کفر پر بریلوی' دیوبندی' اہلِ حدیث سب متفق ہیں۔ اسی اتفاق کی بنیاد پر پاکستان کی قومی اسمبلی مذکورہ فیصلہ کرسکی ہے اور اس فیصلے کو تمام ملک میں سراہا گیا ہے۔ بریلوی اگر غیر بریلوی کو یا غیر بریلوی بریلویوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کریں تو اسے محض دیوانے کی بڑ قرار دیا جائے گا کیونکہ اس مطالبے پر ملک کے تمام علماء کا اتفاق مہیا نہیں ہوسکتا۔

فارقلیط صاحب کے مضمون پر تو تبصرہ ختم ہوا۔ وہ یا ان کے کوئی حمایتی اگر لوٹ کر آنکھ ملانے کی جرأت کریں گے تو قرآن وحدیث اور ارشاداتِ سلف کا ایک پورا خزانہ ابھی ہمارے پاس بحمد للہ محفوظ ہے۔ نقل اور عقل ہر میدان میں ہم ان تمام ہفوات کا پیچھا کریں گے جن سے دین کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

مزید یہ دلچسپ بات اور کہنی ہے کہ فارقلیط صاحب نے خدا جانے کس عالم میں جو شہ بریلویوں کو دی ہے وہی مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی اپنے صدق جدید میں ذرا مختلف انداز میں اُس وقت دی تھی جب پاکستانی فیصلے پر انھوں نے تبصرہ فرمایا تھا۔ خیر سے ہمارے ایک ذی علم دوست نے رام نگر سے ہمیں مطلع کیا ہے کہ...... مقام پر بریلویوں کی ایک "میٹنگ" ہو بھی گئی ہے جس میں ایک تو یہی تجویز پاس ہوئی ہے کہ غیر بریلویوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ حکومت سے کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ان پر خدا اور رسول کی توہین کا مقدمہ دائر کیا جائے۔

یہ شیخ چلیوں کی سی باتیں سہی مگر کم چھکنے والوں کو مژدہ! مرحبا۔ مبارکباد! بریلویوں سے کچھ بعید نہیں کیونکہ ان کے علم وفکر اور اخلاقی حالت کا جو اندازہ ان کی بے شمار تحریروں سے ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ جہالت اور سفاہت و غباوت کی کوئی قسم ایسی نہیں جس کا صدور ان سے ممکن نہ ہو۔ قرآن حدیث سب سے جاہل۔ منطق، علم کلام' ادب ہر ایک سے ناآشنا۔ خدا کے بجائے مُردوں اور پیروں فقیروں سے مرادیں مانگنے والے۔ دوسروں کی تحریروں کو مسخ کرنے والے۔ افترا پردازی اور ہرزہ سرائی میں طاق۔ اپنے سوا ہر شخص کو دوزخ میں دھکا دینے کے رسیا۔ ڈاکٹر اقبالؒ' مولانا ابوالکلام آزاد' الطاف حسین حالیؒ' علامہ شبلی نعمانیؒ' مولانا گنگوہیؒ سب کو برملا کافر ومرتد قرار دینے والے' مولانا آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کو بلا تکلف "ناپاک کتاب" لکھنے والے۔

ان سے خرافات اور فتنہ پردری اور بوالفضولی کے سوا توقع بھی کسی کارِ خیر کی ہوسکتی ہے۔ ان کے امام الائمہ شیخ الشیوخ مولانا احمد رضا خاں صاحب جب مرنے سے دو گھنٹے پہلے یہ وصیت کرتے ہیں کہ:-

> "اعزّا اگر بطیب خاطر ممکن ہو سکے تو فاتحہ میں ہفتے میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دودھ کا ہو۔ مرغ کی بریانی۔ مرغ پلاؤ۔ خواہ بکری کا شامی کباب۔ پراٹھے اور بالائی۔ فیرنی۔ اُرد کی پھریری دال مع ادرک ولوازم۔ گوشت بھری کچوریاں۔ سیب کا پانی۔ انار کا پانی۔ سوڈے کی بوتل۔ دودھ کا برف۔" (وصایات شریف۔ وصیت نمبر ۱۲۔ بحوالہ بریلوی فتنہ کا نیا روپ)۔

تو خود سوچ لیجئے کہ ایسے شیخ کے شاگردوں اور ایسے مرشد کے مسترشدوں کی عقل سوائے معدے کے اور کس جگہ قیام پذیر ہوگی۔ اگر کبھی بریلوی دانشوروں کے طفیل دیوبندیت اور بریلویت کا کوئی مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہوا تو ہمارا خیال یہ ہے کہ تنہا اسی وصیت کا جج کے آگے رکھ دیا جانا

باور کرادے گا کہ بریلوی مذہب پیٹ پوجا کا دوسرا نام ہے۔ غضب ہے کہ ایک شخص دنیا سے جا رہا ہے مگر اسے یہ چٹخارے سوجھ رہے ہیں۔

بہر حال چاند پر تھوکنے اور آسمان میں سوراخ کرنے کے منصوبے اگر کوئی گانٹھتا ہے تو ہم اور ہمارے ملک کا قانون اس کی قوتِ متخیلہ پر پہرے نہیں بٹھا سکتا لیکن یہ بات فرشتوں نے ضرور نوٹ کر لی ہوگی کہ ایسے منصوبوں کی شہ مولانا دریابادی اور حضرت عثمان فارقلیط جیسے مومن اکابر و مشاہیر کی طرف سے ملی ہے۔ اِنّ ھٰذا لشئی عجاب

ہم نے پچھلے اوراق میں کہیں وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کے خیالات بھی نقل کئے جائیں گے۔ خوش قسمتی سے ہمیں مولانا علی میاں کا ایک مفید تر مضمون مل گیا ہے جس میں دیگر اسباقِ عبرت کے ساتھ ڈاکٹر اقبال کے بھی خیالات شامل ہیں۔ اسے اسی شمارے میں "قادیانیت" کے عنوان سے پڑھیئے۔

قطعات
راہِ وفا میں جب رہ رہ کر پاؤں کے نیچے کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ عزیمت ساتھ ہمارا دیکر پچھتائے
کوئی ذرا ان سے یہ پوچھو راہِ وفا کی آساں کب تھی
اہلِ عزیمت کی راہوں میں دنیا نے کب پھول بچھائے
رات تو کالی تھی ہی لیکن رات گذر کر صبح جو آئی
اور گھٹے کتاب اُجالے اور بڑھے ظلمات کے سائے
اب میں سحر کے نغمے گا کر کب تک خود کو دھوکا دوں گا
ہونٹ بھنچے جاتے ہیں زخمی دل کا یہ عالم بیٹھا جائے
نظر کی جوت بجھ گئی شعورِ دید مٹ گیا
وہاں ہیں ہم جہاں کوئی زمین و آسماں نہیں
بتا ہجومِ بے خودی یہ ہجر ہے کہ وصل ہے
وہ اتنے پاس آگئے کہ میں بھی درمیاں نہیں
شعورِ دید جب نہ ہو کہیں نہیں وہ جلوہ گر
شعورِ دید ہو اگر وہ جلوہ گر کہاں نہیں
رہِ طلب میں ساتھ لے جنوں کو بھی خرد کو بھی
جنوں امام ہی سہی خرد بھی رائیگاں نہیں
عامر عثمانی

نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ باقاعدہ وحی کے ذریعہ بندے کو اس وصف سے نوازتا ہے۔ معجزات ایک امر زائد ہیں جو دلیلِ نبوت اس وقت بنا کرتے ہیں جب ایک بندہ یہ اعلان کر دے کہ میں نبی بنادیا گیا ہوں۔ نبی بنائے جانے سے پہلے اگر اللہ تعالیٰ کسی مصلحت کی بنا پر اپنے کسی بندے سے معجزہ ظاہر کرے تو اس کی بنا پر قیاس تو کیا جا سکتا ہے کہ اس بندے کو اللہ کے یہاں کچھ خصوصیت اور قربت حاصل ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے نبوت مل گئی۔

اب سنئیے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بچپن ہی میں جس معجزے کا اظہار ہوا وہ یہ تھا کہ آپ نہ صرف بول پڑے بلکہ نہایت بلند اور دانش مندانہ کلام آپ کی زبان پر آیا۔ اس کی ضرورت بھی ہر صاحبِ فہم پر ظاہر ہے۔ ان کی والدہ مریم صدیقہؓ ایک کنواری خاتون تھیں۔ عام قانونِ طبعی سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ انھیں کسی مرد کے نطفے کے بغیر لڑکا بچہ عطا کرتا ہے۔ وہ خوف اور اضطراب میں قوم سے منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ آخر کس طرح قوم کو یقین دلایا جا سکے گا کہ میں پاکباز ہوں اور باوجود دوشیزگی کے اللہ کی قدرت سے ماں بن گئی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ لاکھ یقین دلاتیں مگر کوئی بھی یقین نہ کرتا لہٰذا ضرورت ہوئی کہ اللہ ہی اس نکو کار عفیفہ کو ہدفِ ملامت بننے سے بچائے۔ اس کی صورت حکمتِ خداوندی نے یہ تجویز کی کہ دودھ پیتا بچہ فصیح و بلیغ انداز میں بول پڑے تاکہ کسی کو اس بات میں شک نہ رہ جائے کہ یہ دنیا جہان سے نرالا بچہ ہے۔ یہ خدا کے یہاں برگزیدہ ہے۔ اگر یہ ناممکن ممکن بن گیا کہ شیر خوار بچہ فرفر منھ سے بولے تو پھر یہ ناممکن کیوں ممکن نہیں ہو سکتا کہ حضرت آدمؑ کی طرح ایک اور انسان بھی تعلق جنسی کے بغیر تخلیق پا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ قرآن کی سورۂ انبیاء، سورۂ تحریم اور سورۂ مریم میں یہ تفصیلات دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے سوا کوئی ابن آدم بغیر باپ کے نہیں پیدا کیا گیا۔ تمام انبیاء قانونِ فطرت کے مطابق اپنی ماں اور باپ کے تعلقِ جنسی کے نتیجے ہی میں منصۂ شہود پر آئے لہٰذا ان میں سے کسی کو اس کی ضرورت نہیں کہ قوتِ گویائی عطا کر کے اللہ تعالیٰ ان کی ماں کو رسوائی سے بچاتا۔

یہ آپ کے "کیوں" کا جواب ہوا۔ اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ کوئی بھی معجزہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کمتر یا برتر نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے چیونٹی اور مکھی بھی پیدا کی اور ہاتھی اور شیر بھی پیدا کئے۔ ننھے ذرے بھی بنائے اور چاند سورج زمین آسمان بھی تخلیق کئے۔ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ چیونٹی اور ذرے کی تخلیق میں جو وصف کار فرما ہے وہ اس وصف سے کمتر ہے جو ہاتھی اور چاند سورج کی تخلیق میں کار فرما ہے۔ یہ دراصل الگ الگ اوصاف کا ظہور نہیں بلکہ ایک ہی وصف ہے — تخلیق و ابداع اور اختراع و صناعی کا وصف تمام تخلیقات میں کار فرما ہے اسی طرح معجزہ خواہ آگ کے بے اثر ہو جانے کا ہو یا مردے کو زندہ کرنے کا یا بے جان چیزوں کے بول اٹھنے کا یا آسمانوں کے سفر کا ان سب کے پیچھے وہی قدرتِ الٰہی کام کر رہی ہے جو کمتر اور برتر میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ فلاں نبی سے فلاں معجزہ ظاہر ہوا لہٰذا وہ ان نبیوں سے افضل و برتر ہے جن سے اس شان کے معجزے ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے فضیلت اور برتری کا مدار وحی سے حاصل شدہ علمِ قطعی پر ہے۔ وحی کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیتِ مجموعی تمام دوسرے انبیاء و رسل سے افضل ہیں لہٰذا اب کوئی بھی دلیل اور قرینہ اور منطق اور علم کلام اس ثابت شدہ حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔

اقراء کا مطلب

سوال ۲:- (ایضاً)

جب غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو حضرت جبریلؑ کہتے ہیں کہ اے نبی پڑھیئے تو اس وقت حضور جواب

دیتے ہیں کہ میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا ہوں۔ تو اس پڑھنے سے کیا مراد ہے وضاحت کیجئے۔ کیا حضرت جبریلؑ لکھی ہوئی سورۃ لیکر نازل ہوئے تھے؟ اگر لکھی ہوئی سورۃ لے کر نازل ہوئے تھے تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر زبانی بات چیت ہو رہی تھی تو اس پڑھنے سے کیا مراد ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جوابؔ ۲ :۔

اگر آپ تھوڑے سے غور و فکر کی عادت ڈال لیں تو کتنے ہی سوالوں کا جواب آپ کو خود ہی مل جائے۔ اب مثلاً روزمرہ کی بول چال دیکھئے۔ آپ کہتے ہیں :۔

"فلاں شخص نے مشاعرے میں بڑی عمدہ غزل پڑھی۔"

اس وقت آپ کا مطلب لازماً یہ نہیں ہوتا کہ شاعر نے کاغذ یا نوٹ بک دیکھ کر غزل پڑھی تھی۔ اس نے دیکھ کر پڑھی ہو یا محض یادداشت سے پڑھی ہو دونوں ہی صورتوں میں آپ بلا تکلف یہ فقرہ بولتے ہیں اور سننے والے بھی دونوں ہی شکلوں میں اسے درست سمجھتے ہیں۔

نیز آپ کہتے ہیں —— "فلاں امام صاحب نے تو غضب ہی کر دیا۔ مغرب میں پوری سورۃ جمعہ پڑھ ڈالی۔" سوچ لیجئے امام تو قرآن سامنے رکھے بغیر یادداشت سے پڑھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ خود "پڑھنے" کے لفظ کو ایسے محل میں استعمال کرتے ہیں جہاں کسی لکھی ہوئی عبارت کو دیکھ کر پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب لفظ اقرأ کا یہ محاوراتی استعمال سامنے آگیا تو اب خود سوچ لیجئے کہ آپ کا سوال سوائے جلد بازی اور لاپروائی کے اور کیا معنی رکھتا ہے۔ خود آنجناب کو بھی یقیناً معلوم ہوگا کہ نہ تو ہمارے حضورؐ عام معنی میں پڑھے لکھے تھے نہ حضرت جبریلؑ کوئی لکھا لکھایا ورق لائے تھے۔ اِقرأ کے معنی ہیں "پڑھئے"۔ دراصل قرأت کا اطلاق کسی کلام کو سنکر دہرانے پر اس لئے ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی آدمی سنتا ہے وہ کانوں سے داخل ہوکر پہلے حافظے کی لوح پر مرتسم ہو جاتا ہے پھر قدرت کی دی ہوئی ذہنی آنکھ اسے پڑھ کر زبان کی طرف منتقل کرتی ہے۔ حضرت جبریلؑ نے زبان سے آیات ادا کیں۔ یہ حضورؐ کے حافظے کی لوح پر رقم ہوئیں۔ وہاں سے چشمِ دماغ نے انھیں پڑھا اور ارادے کی لہر وں پہ حلقوم کی طرف روانہ کر دیا۔ گویا لفظِ قرأت کے معنی اگر دیکھ کر پڑھنے کے بھی طے کر دیئے جائیں جب بھی کسی بات کو سنکر دہرانا پڑھنے ہی کے مرادف ہوگا۔

قرآن میں اضافے کی بحث

سوالؔ ۳ :۔ (ایضاً)

کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف میں ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہے لیکن قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے لئے جو سہولتیں غیر عرب کے لئے کی گئیں ان کو کیا کہا جائیگا کیا اسکو اضافہ نہیں کہا جائے گا؟

جوابؔ ۳ :۔

اس سوال کا جواب بھی آپ ادنیٰ تأمل سے پا سکتے تھے۔ جو سہولتیں مہیا کی گئی ہیں ان پر اضافے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مثلاً زبر زیر لگائے گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کے لگانے سے پہلے جب قرآن پڑھا جاتا ہوگا تو پڑھنے والے بغیر زبر زیر کے تو نہ پڑھتے ہوں گے۔ زبان بہرحال تمام حرکات و سکنات ادا کرتی ہوگی۔ تو ان حرکات و سکنات کو کاغذ پر لے آنا بس یہ معنی رکھتا ہے کہ جو شے پہلے سے بلا تحریر موجود تھی اسی کو قیدِ تحریر میں لے آیا گیا۔ آپ اُردو میں بھی اکثر الفاظ پر اعراب و سکنات استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے لکھا۔

"میں خوش ہوں"

کاتب نے اسی عبارت کو زبر زیر دے کر یوں لکھ دیا۔

"مَیں خُوشْ ہُوں"

تو کیا آپ یہ کہہ سکیں گے کہ کاتب نے میری بات میں اضافہ کر دیا؟

اسی طرح پاروں کی تقسیم، رکوع کے نشانات، آیات کے نمبر وغیرہ۔ ان میں سے کسی بھی شے پر اضافے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ سو مربع میل زمین میں اگر آپ مسافروں کی سہولت کے لئے جگہ جگہ میلوں کے نشان اور تعارفی بورڈ وغیرہ لگا دیں تو اسے زمین میں اضافہ کون ہوش مند کہے گا۔ زمین وہی سو مربع میل ہے۔ ان سہولتوں نے اس میں نہ اضافہ کیا نہ کمی۔

قرآن کے مخاطب

سوال ۲:۔ (ایضاً)

کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف ساری دنیا کے لئے ہے اور ایسا حقیقت میں بھی ہے لیکن زیادہ تر خطاب عرب ہی والوں سے ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے علاوہ عرب والوں کے نام بھی قرآن شریف میں ہیں جیسے ابولہب، زید، ابو جہل وغیرہ اس کا کیا مطلب ؟

جواب:۔

یہ آپ نے کیسے کہدیا کہ قرآن میں زیادہ تر خطاب عرب والوں ہی سے ہے۔ آپ شروع سے آخر تک قرآن کا جائزہ لیں۔ اس خیال کی غلطی آپ پر واضح ہو جائے گی کم وبیش سو جگہ تو آپ کو خطاب کے یہ الفاظ ملیں گے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُو

اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے

فرمائیے کیا ان میں عربی یا عجمی کی کوئی قید ہے؟ پوری دنیا میں کہیں بھی جو شخص ایمان لے آئے وہی ان الفاظ کا مخاطب ہے۔

تقریباً سترہ اٹھارہ جگہ خطاب کا یہ انداز آپ کے سامنے آئے گا:۔

یا ایُّھا النّاس ــــ اے انسانو!

ظاہر ہے ان میں بھی عرب کی تخصیص نہیں۔

دو جگہ یا ایّھا الانسان ملاحظہ فرمائیں گے اور مزید ایسی آیات جن میں عرب و عجم کی قید کے بغیر پوری نوعِ انسانی کی طرف روئے سخن ہے ساٹھ کے قریب ملیں گی۔ جیسے:۔

اَوَ لَمْ یرالانسان ـ بل یریدُ الانسان ـ لیس للانسان الّا ما سعیٰ ـ واذا انعمنا علی الانسان ـ ان الانسان لفی خسر وغیر ذٰلک ـ

اس کے برخلاف آپ پورے قرآن میں ایک جگہ بھی یَا ایّھا العَرَب نہیں پائیں گے۔

رہا یہ کہ کہیں کہیں براہِ راست عرب ہی مخاطب بن گئے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے میں آنجناب کو جواب دے رہا ہوں تو خواہ میرے جواب میں کتنی ہی اصولی اور عمومی باتیں شامل ہوں مگر خطاب تو آپ ہی سے رہے گا کسی امریکن یا انگریز یا [illegible] جاپانی کو میں مخاطب نہ بنا سکوں گا۔ آپ کو معلوم ہے آسمانی کتابیں افراد ہی پر اتری ہیں وہ افراد جنھیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ ان افراد کو اللہ تعالیٰ دوسروں تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لئے منتخب کرتا ہے۔ یہ ان ہدایات کو براہِ راست اپنے ہی ہم قوموں اور ہم ملکوں کو پہنچا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں تقریباً تین سو بار اللہ تعالیٰ لفظ قُلْ استعمال فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ فلاں بات لوگوں سے کہہ دیجئے۔ اب ظاہر ہے پیغمبر جب عرب میں ہے تو اہلِ عرب ہی کو براہِ راست مخاطب بنا سکے گا لیکن آیات میں چونکہ اصولی وعمومی ہدایات موجود ہیں اس لئے پوری دنیا کے انسان فی الحقیقت مخاطب ہوں گے۔

حضرت موسیٰ ہوں عیسیٰ ہوں ابراہیم ہوں یونس ہوں علیہم السلام ان سب نے اپنی اپنی قوموں کو مخاطب کیا اور یہ خطاب پورے عالم کے لئے نہیں تھا مگر رسول اللہ نے قرآن کے توسط سے جو خطاب فرمایا وہ پوری دنیا کیلئے تھا جیسا کہ خود قرآن میں اللہ نے وضاحت کر دی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ (اے رسول! ہم نے تجھے تمام ہی انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے)

اور دیکھئے۔ جہاں جہاں قرآن میں اچھے اعمال

اور ان کی جزا سزا کا ذکر آتا ہے سراسر ایسے انداز میں آتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی فرد ـــــ مرد ہو یا عورت اس سے مستثنیٰ نہیں رہ جاتا۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اس طرح کی بیسیوں آیات آپ بہ آسانی قرآن میں دیکھ سکتے ہیں۔

اتنی تفصیل ہم نے اس لئے اختیار کی کہ اپنے خط کے آخر میں آپ نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس طرح کے سوالات آپ لوگوں سے کسی غیر مسلم نے کئے ہیں۔ اسے آپ یہ بھی بتایئے کہ قرآن میں نام کسی ایک ہی سرزمین والوں کے نہیں آئے بلکہ بہتیرے پیغمبروں اور قوموں کے آئے ہیں جن کا تعلق مختلف سرزمینوں اور علاقوں سے ہے۔ موسیٰ۔ عیسیٰ۔ آدم۔ نوح۔ یونس۔ ابراہیم۔ لوط۔ یعقوب۔ داؤد۔ سلیمان وغیرہم علیہم السلام۔ یہ حضرات الگ الگ خطوں کے رہنے والے تھے۔

پھر قرآن جس شخص پر اتر ا اس سے متعلق کسی قصّے اور واقعے میں نام کسی روسی یا امریکن یا ہندوستانی کا کیسے آسکتا تھا ان ہی لوگوں کا تو آسکتا تھا جو اس واقعے سے منسلک رہے ہوں۔ مثلاً ایک شخص تھا عبدالعزّیٰ جو ابو لہب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مکہ میں رسول اللہؐ کے گھر کے قریب رہتا تھا۔ رشتہ میں آپ کا چچا تھا۔ اس کی شیطنت اور فتنہ انگیزی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہی وہ نالائق تھا جس نے رسول اللہؐ کی دعوتِ حق کے جواب میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے تھے کہ "تیرا ناس ہو کیا ہمیں تو نے یہی کتھا سنانے کو جمع کیا تھا" (تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا)

اور یہی ملعون تھا جو طرح طرح سے رسولؐ کو تکلیفیں پہنچاتا تھا۔ لعنت پر لعنت یہ کہ اس کی بیوی بھی نہایت خبیث تھی۔ وقتاً فوقتاً رات میں رسولؐ کے دروازے کے سامنے کانٹے ڈال جاتی کہ صبح تڑکے جب وہ باہر نکلیں تو پیر زخمی ہو جائیں۔ علاوہ اس کے اس میں لگائی بجھائی کا بدترین مرض تھا۔ بد مزاج اور بد دماغ تھی۔

قرآن متعدد حکمتوں کے تحت اس ابولہب اور اس کی شریر بیوی کا ذکر مذمّت کے طور پر کرتا ہے۔ ایک حکمت تو یہ ہے کہ دین میں خونی اور نسبی رشتوں کی نہیں اصل اہمیت افکار و اعتقادات کی ہے۔ ابولہب رسولؐ کا چچا تھا مگر اللہ تمام انسانوں کو بتا رہا ہے کہ اس کے ملعون ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے لئے کلمۂ خیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ رسولؐ کے متعدد بدترین دشمنوں میں سے ایک کا نام مثال کے طور پر لے کر اللہ نے دنیا کو بتایا کہ دیکھو کیسے کیسے ظالموں اور فتنہ گروں نے دعوتِ حق کی مخالفت اور پیغمبر کی ایذا رسانی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن ان کے پلّے سوائے ناکامی و رسوائی کے کچھ بھی نہیں پڑا۔ اس طرح یہ مثال تمام انسانوں کیلئے یہ پیغام لائی کہ خبردار دعوتِ حق اور پیغمبرِ خدا سے عداوت رکھنا ورنہ تم بھی ملعون و مردود ہوگے۔ گویا نام آجانے کے باوجود آیت کا فائدہ عام اور ہمہ گیر رہا۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ آپ مثلاً یوں کہتے ہیں :-

"زید بہت ہی برا ہے کہ اس نے غریب ہمسائے سے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

تو اگرچہ آپ نے ایک خاص واقعے اور خاص شخص کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا یہ عمومی فائدہ بطور اصول حاصل ہوا ہے کہ ہمسائے سے اچھا سلوک کرنا چاہئے اور جو شخص اچھا سلوک نہیں کرتا وہ قابلِ مذمت ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں کوئی نام واقعات کی تصریح کے لئے آیا ہے وہاں ہر صاحبِ فہم کو صاف نظر آجاتا ہے کہ واقعات کے ذیل میں اللہ تمام ہی انسانوں کو بعض اصولی و بنیادی ہدایات عطا کر رہا ہے۔ حضرت زید کا نام اس واقعے کے سلسلے میں آیا کہ وہ رسولؐ کے منہ بولے بیٹے تھے اور ان کی مطلقہ سے رسولؐ نے اللہ کی ہدایت کے تحت شادی کر لی تھی۔ نام نہ آتا تو کیا [illegible] تھا کہ بغیر اس کے واقعہ کا بیان تشنہ رہتا مگر اسی بیان کے ذیل میں تمام انسانوں کو یہ ہدایت مل گئی کہ منہ بولے بیٹے کی حیثیت حقیقی بیٹے جیسی نہیں ہے۔ اس کی مطلقہ سے

بلا تکلف نکاح کیا جا سکتا ہے اور وہ حقیقی بیٹوں کی طرح وراثت میں کوئی حصہ نہیں رکھتا۔

کوئی بھی غیر مسلم اگر طالبِ حق اور مخلص ہے تو یہ تفصیلات اس کے لئے کافی شافی ہیں لیکن جسے حق کی طلب نہ ہو اور نیت بس اعتراض کرنے کی ہو اسے کسی طرح بھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

جماعتِ اسلامی کس سلوک کی مستحق ہے؟

سوال :- از۔ محمد عبدالرحیم۔ ورنگل (اے۔پی)

جماعت کے مرتبہ دستور کے مطابق اس کی غرض و غایت اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔

چنانچہ جماعت اپنے قیام کے بعد سے آج تک اس خصوص میں مخلصانہ خاموش طور پر اپنے کثیر لٹریچر اور مطبوعات و اجتماعات اور مخصوص درس گاہوں میں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ جو کوشش کرتی آرہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے لہذا جماعت کی اس اخلاص پر مبنی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ بالکلیہ نہیں تو کچھ نہ کچھ مسلمانانِ ہند میں جہاں اسلامی عملی ذہنی بیداری پیدا ہوئی ہے وہیں اس نے متاثرین و متفقین بھی پیدا کئے ہیں۔ لیکن جماعت اس خصوص میں ایک طویل تاریخ کے باوجود عملی طور پر وہ انقلاب یا وہ کام آج تک انجام نہ دے سکی ہے جس کی وہ مدعی ہے۔ بات یہاں تک ہی ختم نہیں بلکہ مؤرخہ ۸، ۹، ۱۰ نومبر ۵۸ء کو دہلی میں منعقدہ کل ہند پانچواں جماعت اسلامی ہند کے اجتماع میں جماعت کے صدر کا خطبۂ صدارت اور دیگر بیرونی مندوبین کے حالات اور جلسے کی کارروائی و قرار دادیں وغیرہ یہاں کے اخبارات رہنمائے دکن و سیاست میں جو شائع ہوئی ہیں ان کے پڑھنے کے بعد جماعت کے تعلق سے ہر ایک کو مایوسی اور تذبذب سا پیدا ہو گیا ہے۔ اور ہر ایک یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ جماعت خالصۃً للہ عظیم کام چھوڑ کر خواہ مخواہ نظریاتی سیاست کا شکار ہو گئی ہے۔

چنانچہ میرا خود بھی یہ خیال ہے کہ جماعت ملک کی موجودہ سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر بھی اپنے کام کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے عملی طور پر نہایت سرگرمی سے انجام دیتی تو ابنائے وطن جماعت سے روشناس ہو کر خود بخود پاکیزہ سماج کی تشکیل اور انسانی حکمرانوں سے بالاتر مقتدرِ اعلیٰ حکومتِ الٰہیہ کے مطالبہ پر مجبور ہو جاتے۔

جواب :-

عزیز گرامی۔ تخیلات و خواہشات کی دنیا اور عمل کی دنیا میں بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کچھ زیادہ خیال پرست اور رومان پسند واقع ہوئے ہیں یہ صرف ان کی ہی ترجمانی آپ کے ارشادات سے ہو رہی ہے اور برا نہ مانیں تو ہم کہیں کہ آپ ایک ہشت پہلو مسئلے کو ایسی عینک سے دیکھ رہے ہیں جو بس ایک ہی دو پہلو دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سب سے پہلے یہ نوٹ کیجئے کہ جماعت اسلامی کسی بھی شے کی مدعی نہیں ہے بلکہ صرف داعی ہے یعنی دعوت دینے والی۔ دعوے اور دعوت کا فرق آپ جانتے ہی ہونگے۔ "حکومتِ الٰہیہ" کے الفاظ سے چونکہ کم فہموں یا کج فہموں ہی کو نہیں اچھے خاصے فہیم حضرات کو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں اس لئے جماعت اس اصطلاح کو ترک کر چکی ہے۔ لہذا اس کے تعلق سے بحث فضول ہوگی۔ ہاں اقامتِ دین بلاشبہ اس کا نصب العین ہے اور ہونا ہی چاہیئے۔ اس نصب العین کے لئے جتنے دنوں سے وہ کام کر رہی ہے اتنے دنوں میں جو نتائج بر آمد ہو چکے ہیں وہ ہمارے نزدیک تو بہت شاندار اور امید افزا ہیں۔ آپ اس کام کو شاید کسی اینٹ پتھر والی عمارت کی تعمیر جیسا کام خیال فرما رہے ہیں کہ دس بیس سال گذر جائیں تو گویا بہت زیادہ مدت گذر گئی، لیکن فی الحقیقت یہ جس نوعیت کا کام ہے اس کے اعتبار سے یہ مدت کچھ بھی نہیں۔ آپ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کام کتنا سخت، کتنا دیر طلب، کتنا پیچیدہ اور کس درجہ صبر آزما ہے۔ اگر آپ ان حالات، وسائل، موسم اور رکاوٹوں کو نظر میں رکھیں جن کے

ہم میں جماعتِ اسلامی کام کر رہی ہے تو ہمارے نزدیک آپ کو اس نتیجے پر پہنچنا چاہیئے کہ جماعتِ اسلامی نے اللہ کی رحمت سے بہت کم وقت میں بہت سارا کام انجام دے ڈالا ہے اور جو ثمرات ابھی تک حاصل ہوئے ہیں وہ نہایت حوصلہ افزا اور قابلِ شکر ہیں۔

ذرا یوں سوچئے کہ کمزور اور بے وسیلہ افراد کا ایک چھوٹا سا گروہ کسی سنگلاخ زمین پر ایک عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے لیکن ایک طرف تو اس کے پاس سازوسامان اور سرمایہ بہت قلیل ہے دوسری طرف بے شمار لوگ اس کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ یہ لوگ صاحبِ اقتدار بھی ہیں اور صاحبِ رسوخ بھی۔ یہ نہیں چاہتے کہ عمارت بنے۔ ان کی مخالفانہ اور معاندانہ سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔ مزید یہ کہ ہوائیں شدومد سے چل رہی ہیں اور طوفان اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہے ہیں۔ موسم انتہائی ناساز گار ہے۔ پتھریلی زمین معماروں کی کدالیں توڑے دے رہی ہے۔ اور کہیں سے پتھر اکھڑتا ہے تو دلدل نمودار ہو جاتی ہے۔ چار اینٹوں کا جمنا مشکل۔

ان حالات میں حیرت ناک یہ نہیں کہ مذکورہ گروہ عمارت تعمیر نہ کر سکا۔ حیرت ناک اور قابلِ تعریف یہ ہے کہ اتنی زیادہ دشواریوں کے باوجود یہ گروہ ہمت نہیں ہار رہا ہے۔ ارادے سے باز نہیں آیا ہے اور کچھ نہ کچھ ستون اور دیواریں اس نے اٹھا ہی دی ہیں۔ بیس تیس سالوں کی مدت کو اگر آپ اس طرح کے کام کے لئے زیادہ تصور کرتے ہیں تو اس سے بھی جماعتِ اسلامی کی تحسین ہی کا پہلو نکلتا ہے نہ کہ اعتراض اور تحقیر کا۔ اس لئے کہ جو لوگ جتنی زیادہ مدت تک دشواریوں سے نبرد آزما رہیں۔ جتنے زیادہ دنوں تک ثبات و استقلال کا مظاہرہ کریں، جتنی زیادہ جراحتیں اور سختیاں جھیل جائیں اور جتنی دیر تک مایوسی ان پر غالب نہ آنے پائے اتنا ہی زیادہ انھیں قابلِ تعریف سمجھنا چاہیئے۔

جماعتِ اسلامی کے حالیہ پانچویں اجتماع میں ہم بھی تھے۔ ہم نے بھی سب کچھ سنا اور دیکھا ہے۔ ہماری فہم ناقص میں تو یہ بات آئی نہیں کہ اس اجتماع کی کارروائیوں اور قراردادوں میں کیا چیز ایسی تھی جس نے "ہر ایک" کو مایوس و مذبذب کر دیا" ہر ایک" کو ہم یہاں شاعری کہیں گے۔ اپنی اور اپنے محدود حلقے کی رائے اور تاثر کو آپ ساری مخلوق تک محیط نہ کر دیجئے۔ ہم بلا مبالغہ ایسے ہزاروں آدمیوں سے ملے ہیں جن کا تاثر آپ سے مختلف ہے۔

یہ فیصلہ کہ جماعت خالصۃً للہ عظیم کام کو چھوڑ کر خواہ مخواہ نظریاتی سیاست کا شکار ہو گئی ہے ایک ایسا فیصلہ جس میں الفاظ تو ہیں معانی و مصداق نہیں۔ کتنی آسانی سے لوگ دوسروں کی نیت کے بارے میں فیصلے کر ڈالتے ہیں۔ ہمارے بھائی! نیت کا معاملہ تو اللہ اور بندے کے مابین کیا غضب ڈھا دیا ہے جماعتِ اسلامی نے جس کی بنا پر یہ فیصلہ صادر کیا جا رہا ہے۔ کونسا قبلہ ہے جس کی طرف جماعت مڑ گئی ہے۔ ہمارے نزدیک تو جماعت نے اپنے نصب العین سے مطلق انحراف نہیں کیا نہ وہ کسی بے نتیجہ یا ضرر رساں نظریاتی سیاست کا شکار ہوئی۔

آپ نے اپنے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے وہ رومانٹک ضرور ہے کتنی خوبصورت بات کہ ابنائے وطن جماعتِ اسلامی سے روشناس ہوتے جس کے نتیجے میں پاکیزہ سماج تشکیل ہوگا اور اب سارے عوام اٹھ کھڑے ہوتے کہ اے تخت نشینو حکومتِ الٰہیہ قائم کرو۔ مگر پیارے بھائی۔ یہ خواب کی باتیں ہیں۔ بلندیٔ خیال سے اینٹ پتھر کی دنیا میں آیئے تو بات اتنی خوبصورت نہیں رہتی۔ اپنے رسولؐ کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیئے۔ نظریاتی اور حربی اور اقتصادی کونسی سیاست ایسی ہے جس کی وادیوں سے آپؐ نہیں گذرے اور کب حکومتِ الٰہیہ اتنے رومانوی انداز میں قائم ہو گئی۔ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانوں سے لڑنے والوں کو مشورے عطا کرنا بہت آسان ہے لیکن نظریات کے تخیلاتی حسن اور حقائق کی تلخ کامی کا فرق اسی وقت محسوس ہوتا ہے جب آدمی خود طوفانوں میں گھر جائے۔

سچائی اس کے سوا کچھ نہیں کہ جماعتِ اسلامی ہند یا جماعتِ اسلامی پاکستان۔ دونوں جگہ کچھ غیر معصوم انسان ہی اپنی

کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق فلاحِ دین و ملت کے پروگرام بناتے رہتے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی اسکیموں کو نئے رُخ دیتے رہتے ہیں۔ ان سے یقیناً فکر و فہم کی خطائیں بھی ہوں گی۔ لیکن ہم ان کی کسی خطا پر دفعتاً انتہا پسندانہ ریمارک کرنے لگیں تو یہ کھلی زیادتی ہوگی۔ پھٹ سے یہ کہہ دینا کہ جماعت للّٰہیت کو ترک کر بیٹھی ظلم بھی ہے اور نادانی کا مظاہرہ بھی۔

آپ یا کچھ اور لوگ اگر دیانتہً یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں میدان میں جماعت کا کوئی قدم غلط رُخ پر اٹھا ہے تو آپ کی اپنی للّٰہیت اور خلوص کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ جماعت کے ذمہ داروں تک اپنی بات مناسب انداز میں پہنچائیں یہ نہ ہونا چاہیئے کہ دفعتاً بڑے بڑے فیصلے صادر کرنے لگیں۔

ہمیں خود جماعتِ اسلامی ہند سے بعض جزئیات میں اختلاف ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر اختلاف میں ہم ہی برحق ہوں۔ نہ یہ ضروری ہے کہ ہماری نظر مصالح اور مضرات کے ان تمام گوشوں تک پہنچ ہی جائے جن تک جماعت کے اہل الرائے کی پہنچی ہے۔ کتنے ہی گوشے اور زاویئے وہ ہوتے ہیں جن کا ادراک محاذ پر کام کرنے والے ہی کر سکتے ہیں دُور افتادہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اپنے حقِ اختلاف کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم اپنا فریضہ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ خدا کے یہ نحیف بندے جو جماعتِ اسلامی کے نام سے میدانِ جہد و عمل میں اُترے ہوئے ہیں ہماری محبت، دعا، خیر خواہی اور حوصلہ افزائی ہی کے مستحق ہیں نہ کہ ہدفِ ملامت اور موردِ طعن اور نشانۂ اعتراض بنانے کے ۔۔۔ ان میں سے جو شخص نادانستہ طور پر غلطی کرتا ہے وہ بھی انشاء اللہ ایک ثواب کا ضرور مستحق ہوگا کیونکہ اللہ قلوب و اذہان کا حال دیکھتا ہے۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔

اور یہ بھی نظر میں رہے کہ بعض کمزوریوں کا تعلق افراد کی ذاتی سرشت اور مزاج و طبیعت سے بھی ہوا کرتا ہے انھیں جماعتی کمزوریوں کی فہرست میں نہ رکھنا چاہیئے مثلاً موجودہ امیرِ جماعت یا قیّمِ جماعت یا مدیرِ دعوت کسی معاملے میں غلط رویّہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی ذاتی اور جماعتی حیثیات کا لطیف فرق ملحوظ رکھتے ہوئے ہی اس رویّہ پر گرفت کرنی چاہیئے۔

اللہ ہم سب کو دینی اخوّۃ اور ملّی بھائی چارے کے اخلاقی تقاضوں کو سمجھنے کی توفیق اور ان پر عمل کا سلیقہ عطا فرمائے۔ آمین۔

درود اور مولانا مودودی

سوال:۔ از بشیر عالم ایم۔ اے۔ بتیا (چمپارن)

کیا درود شریف مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ یا ایک ہی درود ابراہیمی ہے؟ ایک کتاب "خطبات" میں "نماز میں آپ کیا پڑھتے ہیں" کے عنوان سے ایک مضمون ہے اس میں مولانا مودودی نے درود شریف کو جو نقل کیا ہے تو اس میں اللھم صلّ علٰی کے بعد سیّدنا و مولانا کا اضافہ کیا ہے۔ جو درود ابراہیمی میں نہیں ہے۔ یہاں ایک عالمِ دین سے ہم نے رجوع کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ اضافہ خلافِ اولیٰ ہے مکروہ ہے۔ لہٰذا میں کم پڑھا لکھا ایک تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مہربانی فرما کر آپ اس سلسلے میں تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:۔

نماز میں جو درود پڑھا جاتا ہے بے شک اس میں سیدنا و مولانا کے الفاظ نہیں ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا مودودی اس مقام پر سہواً یہ الفاظ لکھ گئے ہیں۔ تاہم اسے سہو نہ مانیں اور یہ کہیں کہ وہ خود بھی نماز میں ان الفاظ کے ساتھ درود پڑھتے ہوں گے تو اسے "مکروہ" قرار دینے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں جو کچھ علم ہے وہ یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں یہ درود مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ مثلاً مسلم شریف میں حضرت ابو مسعود الانصاریؓ کی روایت سے یہ الفاظ آئے ہیں۔

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی

آلِ ابراہیم و بارک علیٰ محمد و علیٰ آلِ محمد کما بارکت علیٰ آلِ ابراھیم فی العٰلمین انک حمید مجید۔

اس کے بعد حضرت کعبؓ بن عُجرہ کی روایت میں بھی علیٰ ابراھیم نہیں ہے بلکہ صرف علیٰ آلِ ابراہیم ہے اور اس کے بعد انک حمید مجید ہے۔ بقیہ عبارت نہیں ہے۔

اسی روایت کو مسلم نے ایک اور سند سے نقل کیا ہے اس میں لفظ اللھم نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ ازواجہ وذریتہ کما صلیت علیٰ آلِ ابراہیم و بارک علیٰ محمد وعلیٰ ازواجہ وذریتہ کما بارکت علیٰ ابراھیم انک حمید مجید۔

یہ تو مسلم شریف کی روایات کا حال ہوا۔ ابوداؤد شریف میں ایک روایت ان الفاظ میں بھی آئی ہے:۔

اللھم صل علیٰ محمد النبی الاُمّی الخ۔

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

وازواجہ اُمّھات المؤمنین وذُرّیتہ واھل بیتہ۔

ان لفظی امتیازات کے علاوہ مسلم اور ابوداؤد شریف کی کسی بھی روایت میں علیٰ ابراھیم وعلیٰ آلِ ابراھیم کے الفاظ اکٹھے نہیں ہیں حالانکہ جو درود ہم احناف کے یہاں رائج ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

شاید عام روایات کے اسی مطالعے نے حافظ ابن قیم جیسے وسیع العلم کو یہ مغالطہ دیدیا کہ کسی بھی صحیح حدیث میں ابراہیم اور آلِ ابراھیم کے الفاظ اکٹھے نہیں ہوئے ہیں یا تو صرف "ابراہیم" ہے یا صرف "آلِ ابراہیم"۔ یہ بلاشبہ مغالطہ ہے جیسا کہ ابھی ہم وضاحت کریں گے۔ لیکن اس مغالطے کی وجہ یہی تو ہے کہ احادیث میں یہ درود بہ الفاظِ مختلفہ روایت ہوا ہے اور وہ الفاظ جو ہم احناف کے یہاں مروج ہیں نسبتاً نادر و کمیاب ہیں۔

اس تفصیل کا حاصل یہ نکلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعلیم تو یقیناً ثابت ہے کہ نماز میں التحیات کے بعد اُن پر درود بھیجا پسندیدہ ہے مگر جن الفاظ میں بھیجا جائے ان کی روایات مختلف ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تمام روایات یکساں تعین الفاظ کی خبر دے رہی ہوں۔ اسی لئے یہ فتویٰ دینا کہ احناف کے یہاں جو الفاظ اختیار کر لئے گئے ہیں ان میں کسی ایک بھی لفظ کا حذف یا اضافہ مکروہ ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ خصوصاً جب سیدنا و مولانا کے الفاظ فی نفسہٖ کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رکھتے۔ تمام مسلمان اپنے نبی کی اس بجا تعریف و تعظیم پر متفق ہیں اور ان سے درود میں کوئی قابلِ ذکر طول بھی پیدا نہیں ہوتا تو اس اضافہ کی کراہت کا دعویٰ دلیل کا طالب ہے۔ ہمیں ایسی کسی دلیل کا علم نہیں۔ جن عالمِ دین نے کراہت کا حکم لگایا ہے وہ اگر دلیل بھی بتادیں تو ہم جیسے کم علموں کو روشنی ملے۔

ایک بات سوچنے کی ہے۔ نماز میں درود نہ فرض ہے نہ واجب۔ یہ چھوٹ جائے تو بلاشبہ نماز ہو جاتی ہے اس کے برعکس التحیات واجب ہے۔ یہ جب تک پڑھ نہ لی جائے نماز مکمل نہیں ہوتی۔ مگر اس تک کے الفاظ ائمہ کے یہاں مختلف فیہ ہیں۔ ہم احناف جو الفاظ پڑھتے ہیں وہ تو معلوم ہی ہیں۔ مالکیہ کے الفاظِ ابتدائی یہ ہیں:۔

التحیات للّٰہ الزاکیات للّٰہ الطیبات الصلوٰۃ للّٰہ۔

شافعیہ کی التحیات کا آغاز یوں ہے:۔

التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للّٰہ

اور آخر میں شافعیہ یوں پڑھتے ہیں:۔

واشھد اَنّ سیدنا محمد رسول اللّٰہ

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں سے الفاظ کی کوئی بھی ترتیب کسی امتی کی گھڑی ہوئی نہیں بلکہ احادیثِ رسول ہی میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ التحیات اور درود ان چیزوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ نے یہ

گنجائش رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ پر غور و فکر کرنے کے بعد الفاظ کا جو متن کسی مخلص عالمِ دین کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو اختیار کرلے۔ اس پر خطا یا کراہت کا اطلاق نہیں ہوگا مکروہ بھلا وہ چیز کیسے ہوسکتی ہے جسے امام مسلمؒ اور امام ابو داؤدؒ جیسے عظیم محدثین نے عمدہ سندوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہو۔ "سیدنا" کا لفظ تو بہرحال آپ نے شوافع کے تشہد میں دیکھ ہی لیا لیکن یہ لفظ حدیث میں وارد شدہ کسی درود میں آیا ہو ہم اس سے واقف نہیں۔ مذکورہ عالمِ دین بھی ذیل کی کتابوں میں درود کے مختلف متن دیکھ لیں ہمیں ان میں یہ لفظ نظر نہیں آیا۔

بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ مسند امام احمد۔ مسند بزار۔ صحیح ابوعوانہ۔ معجم طبرانی اوسط۔

اگر فقہ شافعی میں "سیدنا" کا اضافہ موجود ہے حالانکہ یہ لفظ احادیثِ درود میں وارد نہیں تو "مولانا" کے لفظ کا اضافہ مکروہات کی فہرست میں کس لئے آگیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں اس لفظ کا استعمال ہم سب کے نزدیک درست ہے۔

یہ توضیحات ہم نے اہلِ علم کے لئے پیش کیں۔ پسندیدہ ہمارے نزدیک بھی یہی ہے کہ احناف اور شوافع وغیرہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق نماز میں وہی الفاظ دہرائیں جو اصح سمجھ لئے گئے ہیں۔ ان میں اضافہ یا کمی نہ کریں۔ غالباً مولانا مودودی کو بھی یہی پسند ہوگا اور جیسا کہ ہم خیال ظاہر کرآئے زیرِ بحث الفاظ اتفاقاً ان کے قلم سے نکل گئے ہوں گے لیکن اگر سوچ سمجھ کر وہ ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں تو اسے بہت سے بہت خلافِ اولیٰ کہا جاسکتا ہے "مکروہ" نہیں۔ ہر خلافِ اولیٰ بات "مکروہ" ہرگز نہیں ہوا کرتی جبکہ فقہ میں لفظِ "مکروہ" ایک متعین مفہوم رکھتا ہے۔

خاتمے پر ہم ابن قیم کے سہو کی توضیح کردیں۔

امام بخاری نے جلد اول کتاب الانبیاء میں کعب بن عجرہؓ کی جو روایت بیان کی ہے اس میں ابراہیم اور آلِ ابراہیم دونوں موجود ہیں۔ نیز طبری نے بھی ابومسعود البدری کی حدیث میں محمد بن اسحاق کے طریق سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔ چنانچہ احناف جو درود نماز میں پڑھتے ہیں اس کا متن ٹھیک ان ہی صحیح احادیث کے مطابق ہے۔ حافظ موصوف کا یہ خیال درست نہیں کہ کسی بھی صحیح حدیث میں ابراہیم اور آلِ ابراہیم کا ساتھ ساتھ ذکر نہیں۔

کچھ قارئین کے قلب میں شاید گمان پیدا ہو کہ ہم نے خواہ مخواہ جواب کو طول دیا۔ مختصراً بھی اپنا مافی الضمیر بیان کرسکتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودی کی کتاب "خطبات" غیر معمولی شہرت پاچکی ہے اور لاکھوں انسانوں کے مطالعہ سے گذرتی ہے۔ ان میں سے جس کسی کو بھی اس طرح کا وسوسہ پیدا ہو وہ مطمئن ہوجائے کہ درودِ مشہور میں یہ دو لفظی اضافہ کراہت کے خانے میں نہیں آتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ویسے مذکورہ عالمِ دین اگر کراہت کے فیصلے پر مصر ہوں تو ان کے لئے تجلی کے صفحات حاضر ہیں۔ عالمانہ انداز میں اپنے فیصلے کی صحت ثابت فرمائیں۔

قارئین یہ ضرور ملحوظ رکھیں کہ یہ بحث نماز کے اندر والے درود سے متعلق ہے۔ خارج از نماز پڑھے جانے والے درود میں سیدنا و مولانا جیسے الفاظ کا شمول خلافِ اولیٰ تو کیا ہوتا انشاء اللہ برکت میں اضافے کا باعث ہوگا صلی اللہ علیہ وسلم۔

وہ جوابات جن کے سوالات حذف کردیئے گئے

بزمِ قادریہ

یہ کتابچے کا نام ہے۔ اسلام آباد (کشمیر) کا مطبوعہ۔ بھیجنے والے مصر ہیں کہ اس پر تفصیلی بحث کی جائے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اس کے ٹائٹل پر چھپے ہوئے قطعہ ہی کو دیکھ کر بدحواس ہوگئے:۔

بادشاہِ ہر دو عالم شاہ عبدالقادر ست
سرورِ اولادِ عالم شاہ عبدالقادر ست
آفتاب و ماہتاب و عرش و کرسی و قلم
نور قلب از نورِ اعظم شاہ عبدالقادر ست

اس کی نسبت کسی خواجہ بزرگ نقشبند مشکلکشا کی طرف
ن گئی ہے۔ کاش وہ زندہ ہوتے تو خود ہی وضاحت فرماتے
۔ وہ کس مقام سے بول رہے ہیں۔ ہم غریب جو قرآن و
دیث پڑھتے ہیں ان سے تو پتا نہیں چلتا کہ اللہ کے کسی
ندے اور رسول کے کسی امتی کے لئے اس طرح کی مبالغہ
رائی توحید و رسالت کے ساتھ کیسے جمع ہوسکتی ہے۔

دونوں عالم کا بادشاہ فی الحقیقت خدا کے سوا کوئی
ہیں۔ اس کے آخری رسول کو بھی بطور تعظیم "سرورِ کونین"
ہدیتے ہیں کیونکہ خدا کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے اور جس
رح دنیا میں آپ انسانوں کے سردار ہیں اسی طرح آخرت
یں بھی آپ تمام مخلوق سے فائق تر ہوں گے۔

مگر کوئی امتی ـــ خواہ وہ قطب ہو، شیخ اکبر ہو کچھ بھی
ہو شاہِ دو عالم اور سرورِ اولادِ آدم کس معنی میں کہلایا جاسکتا
ہے یہ ہمارے علم و عقل سے بالاتر ہے۔ یہ خطاب دیگر تو گویا خاتم
الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شاہ عبدالقادرؒ کو فوقیت دے
ی گئی۔ مزید یہ کہ انھیں "نورِ اعظم" بھی کہا گیا۔ چیستاں نہیں
پھر اسے کس خانے میں رکھیں۔ ہوسکتا ہے کہنے والے نے
ہن میں کوئی تاویل محفوظ رکھی ہو مگر یہ تاویل اسی کیساتھ
بر میں چلی گئی اور اب ہم جیسے منہ پھٹ اس کے سوا کچھ
ہیں کہہ سکتے کہ اس طرح کا کلام شرکِ مبین اور کفرِ صریح
کے خد و خال رکھتا ہے جو شخص بلا تاویل اسے صحیح مانے وہ
رآن و حدیث کا منکر یا پھر قرآن و حدیث سے بالکل بے
بر ہے۔ تاویل کرے تو اگرچہ اس پر کفر کا فتویٰ جلدی نہ
ہیں لگے گا مگر یہ سمجھا جائے گا کہ اس کے دماغ میں خلل واقع
ہوگیا ہے۔ دماغی خلل میں مبتلا لوگوں پر علماء کفر کا فتویٰ
س لئے نہیں لگاتے کہ بے چارے پاگل تو مرفوع القلم ہیں۔
نھیں اپنی ہی خبر نہیں دین و عقائد کی کیا خبر ہوگی۔

کمال یہ ہے کہ بزمِ قادریہ کے کارکنوں کے جو اوصاف
ضروری اس کتابچے میں لکھے گئے ہیں ان میں ایک وصف
بھی ہے کہ "اتباعِ شریعتِ محمدیہ بموجب مذہبِ حنفیہ
رکھتا ہو۔"

معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے موجودہ قرآن کے علاوہ
کوئی قرآن آسمان سے اتار لیا ہے اور احادیثِ رسولؐ
کے علاوہ کچھ حدیثیں کسی سمندر کی تہہ سے نکال لی ہیں۔ ورنہ
موجودہ قرآن و حدیث سے تو ایسی کوئی شریعت نکالی
نہیں جاسکتی جس میں کسی بندے کو وہ مقام حاصل ہو جہاں
مذکورہ قطعے نے شاہ عبدالقادرؒ کو بٹھادیا ہے۔

افسوس ان لوگوں نے مذہبِ حنفی کو بھی رسوا کیا اور
شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بھی مضحکہ
اڑایا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنایا
تھا۔ جاہل اور عجمی صوفیوں نے امت کے بعض اولیاء کو
خدا کا وزیرِ اعظم بلکہ بعض حالتوں میں خدا کا ہمسر بنا ڈالا۔
پرواز خیال کا یہ مقابلہ ایسا ہی مقابلہ ہے جیسے ایک بادشاہ
نے درباری قصہ گویوں سے کہا تھا کہ جو تم میں سب سے
بڑا جھوٹ بولے گا اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔

> تصوف وہ فن ہے جو اللہ کی اطاعت
> میں زیادہ سے زیادہ خلوص پیدا کرنے
> کے لئے وضع ہوا تھا لیکن تصوف کے
> نام پر شرک و بدعت کی دلدل میں جا
> پھنسا اس فن کے منہ پر کالک ملنا ہے۔

بریلی اور بدایوں تو تھا ہی مبالغہ آرائیوں کا گھر۔
شاید کشمیر بھی اس سے پیچھے نہیں ہے مفصل تنقید کی توقع ہم
سے مت رکھئے۔ ایسی لغویات کو ہم اہمیت دینے لگیں تو کسی
بھی اور کام کے نہیں رہ جائیں گے۔

قبوری تصوف

شیخ حمزہ شیخ فلاں، شاہ فلاں خواجہ فلاں ان سب پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ یہ اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے کر دنیا سے جا چکے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا سے جا چکے۔ ان میں جسے تعریف کا کوئی بھی خطاب دیجئے اس خطاب کو شرک و توہم سے پاک ہونا چاہئے۔ سلطان العارفین، امام الاتقیا وغیرہ اچھے خطابات ہیں۔ ان میں کوئی شرک نہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کو سید الابرار، سرورِ انبیاء، محبوبِ خدا، مصطفےٰ وغیرہ کہنا بالکل مناسب بات ہے۔ یہ ان کی صحیح تعریف ہے جس میں مبالغہ نہیں۔

لیکن ان کی قبروں پر میلے لگانا، ان سے مرادیں مانگنا، انھیں غوث اور دستگیر سمجھنا یہ سب شرک کے دروازے اور گمراہی کے راستے ہیں۔ دعاؤں میں وسیلے اور واسطے بھی شریعت نے لازم نہیں کئے۔ اللہ اگر ویسا ہی ہے جیسا قرآن اور حدیث سے پتا چلتا ہے تو پھر بے غبار اور احتیاط سے بھرپور طریقہ یہی ہے کہ براہِ راست اسے پکارو۔ اسے ایسا شفیق و کریم سمجھو کہ واسطوں اور وسیلوں کے بغیر ہی وہ آپ ہر ہر بندے کا مددگار اور پروردگار اور قاضی الحاجات ہے۔

وسیلے اور کراماتِ اولیاء اور شرک و توحید پر مدلل بحثیں ہم بہت کر چکے۔ خلاصہ ان کا وہی ہے جو ہم نے عرض کیا۔ آپ کی سمجھ میں آئے مان لیجئے۔ نہ سمجھ میں آئے تو مزاروں کی کمی نہیں۔ ہر شہر و دیار میں شاہ فلاں اور خواجہ فلاں کا مزار شریف مل جائے گا۔ جی چاہے پیشانی ٹیکئے جی چاہے نذر نیاز دیجئے۔ خدا کے حضور پہنچیں گے تو خود ہی پتا چل جائے گا کہ غلطی پر کون تھا ہم یا آپ!

درودِ تاج، دعائے گنج العرش، حزب البحر ہم کسی سے نہیں روکتے بس اتنی گذارش کرتے ہیں کہ ان کے مضامین کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اگر کوئی بات خلافِ توحید نظر آئے تو ان سے پرہیز بہتر نظر آئے تو پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔

ویسے یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ سب سے زیادہ قبولیت کی امید اس دعا کی ہے جو تڑپ کر دل و دماغ کی تہوں سے نکلی ہو اور جس کے پیچھے یہ یقین و تصور کارفرما ہو کہ اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ کسی میں کچھ قوت نہیں۔ زبان چاہے کشمیری ہو، بنگالی ہو، چینی ہو، جاپانی ہو۔ اللہ ہر زبان سمجھتا ہے اور بے ساختہ دعائیں اپنی ہی مادری زبان میں نکلا کرتی ہیں۔

وظائف و اوراد یقیناً مفید ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہم جو روزی کما رہے ہیں وہ مکمل طور پر حلال ہے یا نہیں اور ہم پر اللہ اور بندوں کے جو حقوق عائد ہیں انھیں ٹھیک طرح ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہماری روزی حلال ہو اور دونوں طرح کے حقوق بھی ادا کر رہے ہوں تو وظائف و اوراد ہمیں ایسا ہی فائدہ دیں گے جیسے ایک صحت مند آدمی کو مقوی دوائیں اور غذائیں اور ٹانک فائدہ دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے رزق میں حرام کی آمیزش ہے یا ہم اللہ اور بندوں کے بعض حقوق تلف کر رہے ہیں تو پھر اوراد و وظائف کا کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے ان سے اسی طرح نقصان پہنچے جس طرح بیمار آدمی کو مقویات کھانے سے دست لگ جاتے ہیں یا جگر خراب ہو جاتا ہے۔

بات بظاہر عجیب سی ہے۔ اوراد و وظائف اور نقصان دہ!

لیکن غور کیجئے تو کچھ بھی عجیب نہیں۔ اللہ اور بندوں کے معروف حقوق ادا کرنا فرائض و واجبات میں داخل ہے اور وظیفے پڑھنا محض نفل ہے۔ جو شخص فرائض و واجبات سے تو غفلت برتے اور نفل میں منہمک رہے وہ گویا نعوذ باللہ خدا کو بے وقوف بنانے کی فکر میں ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص ان احکامات کی تو نافرمانی کرے جو مالک نے واضح الفاظ میں دیئے ہیں لیکن ان کاموں میں سرگرمی دکھلائے جنھیں حکم کی حیثیت حاصل نہیں۔ یا

پھر یوں سمجھئے کہ زید اس زخم کا علاج تو کرتا نہیں جس سے خون جاری ہے لیکن ایسی دواؤں کی فکر میں لگا ہوا ہے جو نیا خون بنائیں حالانکہ نئے خون سے زیادہ ضروری اس خون کا تحفظ ہے جو کھلے زخم سے ضائع ہو رہا ہے۔

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبد الوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبد الوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی بدعت کے دشمن اور دین وملت کے خیرخواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس نام نامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمۂ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ـــــ ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۶۰ پیسے۔

معجزہ کیا ہے؟ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف ـــــ معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم وتفقہ کی روشنی میں گفتگو۔
قیمت مجلد ـــــ ڈھائی روپے۔

جمال مصطفےٰ درد قریشی کی نعتوں کا دلکش مجموعہ۔
قیمت ـــــ ایک روپیہ

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ ان تمام امور پر نہایت وقیع دلچسپ اور مبصرانہ مضامین نظم ونثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔ قیمت ـــــ پانچ روپے ۲۵ پیسے ۵/۲۵۔
(پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے)

شہدائے بدر شہدائے بدر کے مختصر حالات کوائف
قیمت ـــــ ایک روپیہ۔

فنِ اسماء الرّجال از: مولانا تقی الدین مظاہری
علم الحدیث کا مدار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فنِ اسماء الرجال پر منحصر ہے لہٰذا حدیثِ رسولؐ سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔
قیمت ـــــ ایک روپیہ ۷۵ پیسے ۱/۷۵

دین وشریعت اردو ایڈیشن۔ قیمت مجلد ۴/۲۵
انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم ترین بستی ہے۔ اس کی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کروٹیں دیکھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے ـــــ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ صفحات ۵۱۲۔ قیمت مجلد دس روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

آرہا ہے

تجلی کہانی نمبر

ملّا ابن العرب مکی
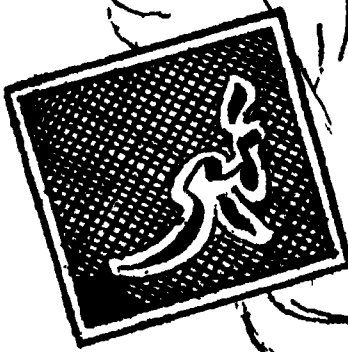
نکیلے قلم سے

مولانا علی میاں

قادیانیت

اسلام اور نبوّت محمدی کے خلاف ایک بغاوت

میں اس مقالہ میں ایک ایسے مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو ہر مسلمان کی توجہ کا مستحق ہے خواہ وہ کسی ملک میں بستا ہو اس لئے کہ اس کا تعلق اسلام کے بعض بالکل بنیادی اصولوں سے ہے اگر مسلمانوں نے اس سے غفلت برتی تو اس کا قوی خطرہ ہے کہ یہ معاملہ ایسی سنگین شکل اختیار کرلے کہ پورے عالم اسلامی اور پورے نظام اسلامی کے لئے شدید خطرہ بن جائے پھر اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔

حال میں کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آئے جنھوں نے پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ کو قادیانیت کے مسئلہ کی طرف پھیر دیا۔ ان حالات نے مسئلہ قادیانیت کی طرف جس کو لوگ بھولتے جا رہے تھے، دوبارہ متوجہ کردیا اور بہت سے تعلیم یافتہ حضرات متعجب ہوکر پوچھنے لگے کہ کیا واقعی یہ مسئلہ اتنا اہم اور اس قدر سنگین ہے کہ مسلمانوں کا مرکز توجہ بن جائے، لیکن کیا کیا جائے مسئلہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے واقعۃً اتنی ہی اہمیت کا مستحق ہے!

اسلامی ذہن کا اس طرف متوجہ ہونا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ مسلمانوں کی ہستی اور اسلام کے مستقبل کے لئے حقیقتاً یہ ایک پریشان کن مسئلہ ہے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مسئلہ کی واقعی اہمیت کیا ہے اور اسلامی زندگی سے اس کا کس قدر گہرا تعلق ہے، یہ کشمکش کسی فرقہ بندی، تنگ خیالی اور مذہبی عصبیت کا شوشہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، بلکہ خالص اسلامی مصالح اور مسلمانوں کی زندگی کا تقاضہ ہے — آئیے اس کو تاریخی اور علمی حقائق کی روشنی میں دیکھیں۔

علمی اور تاریخی حیثیت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ قادیانیت فرنگی سیاست کے بطن سے وجود میں آئی ہے۔ صورت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان کے مشہور و معروف مجاہد حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) نے جو جہاد کی تحریک چلائی، اس سے مسلمانوں میں جہاد اور قربانی کی آگ بھڑک اٹھی، ان کے سینوں میں اسلامی شجاعت اور حوصلہ مندی موجزن ہونے لگی اور وہ ہزاروں کی تعداد میں سر ہتھیلیوں پر لئے ہوئے اس تحریک کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے جس کی سرگرمیاں برطانوی حکومت کے لئے پریشانی اور تشویش کا باعث تھیں، ادھر سوڈان میں شیخ محمد احمد سوڈانی نے جہاد اور مہدیت کا نعرہ بلند کیا جس سے سوڈان میں برطانیہ کا اقتدار تزلزل میں آگیا، اس کو معلوم تھا کہ یہ چنگاری اگر بھڑک اٹھی تو پھر قابو میں نہیں آئے گی اور پھر سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی کو اس نے پھیلتے اور مسلمانوں میں مقبول ہوتے دیکھا، اس نے ان سب خطرات کو محسوس کیا، اس نے مسلمانوں کے مزاج و طبیعت کا گہرا مطالعہ

کیا تھا اور اس کو معلوم تھا کہ ان کا مزاج دینی مزاج ہے، دین ہی انھیں گرماتا ہے، اور دین ہی انھیں سلا سکتا ہے، لہٰذا مسلمانوں پر قابو پانے کی واحد شکل یہ ہے کہ ان کے عقائد پر ایمانیات کے دینی میلانات اور نفسیات پر قابو پایا جائے۔ مسلمانوں کے مزاج میں در خور رسائی حاصل کرنے کے لئے دین کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، اس مقصد کے لئے برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں ہی میں سے کسی شخص کو ایک بہت اونچے دینی منصب کے نام سے ابھارا جائے کہ مسلمان عقیدے کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور وہ انھیں حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کا ایسا سبق پڑھائے کہ پھر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ رہے ـــــ یہ حربہ تھا جو برطانوی حکومت نے اختیار کیا یہ تک مسلمانوں کا مزاج پانے کے لئے کوئی حربہ اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا ـــــ مرزا غلام احمد قادیانی ـــــ ذہنی انتشار کے مریض تھے[1] ...... اور بڑی شدت سے اپنے دل میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ ایک نئے دین کا بانی بنیں، ان کے کچھ متبعین اور مومنین ہوں اور تاریخ میں ان کا ویسا ہی نام اور مقام ہو جیسا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے ـــــ انگریزوں کو اس کام کے لئے موزوں شخص نظر آئے اور گویا انھیں ان کی شخصیت میں ایک ایجنٹ مل گیا جو ان کے اغراض کے لئے مسلمانوں میں کام کرے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی تیزی سے کام شروع کیا پہلے منصب تجدید کا دعویٰ کیا، پھر ترقی کر کے امام مہدی بن گئے، کچھ دن اور گذرے تو مسیح موعود ہونے کی بشارت ہو گئی اور آخر کار نبوت کا تخت بچھا دیا، اور انگریز نے جو چاہا تھا وہ پورا ہو گیا۔ ان بزرگ نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا۔ اور انگریز نے بھی اس تحریک کی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کی اس کی حفاظت بھی کی اور ہر طرح کی سہولتیں اس کام میں بہم پہنچائیں ـــــ

مرزا صاحب نے بھی گورنمنٹ کے ان احسانات کو فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ وہ اس بات کے معترف رہے کہ ان کا خود برطانیہ عظمیٰ کا رہین منت ہے چنانچہ اپنی ایک تحریر[1] میں خود کو حکومت برطانیہ کا "خود کاشتہ پودہ" قرار دیا ہے، اور ایک جگہ اپنی وفاداریوں اور خدمت گذاریوں کو گنواتے ہوئے لکھتے ہیں :ـــ

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گذرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھا کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے[2]"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :ـــ

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیر دوں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں[3]"

اور اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں :ـــ

---

[1] اس مرض میں تین ایسی چیزیں بیک وقت جمع تھیں جنھیں دیکھ کر ایک مؤرخ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں اہم ترین اور حقیقی سبب کسے قرار دیا جائے جس نے اس شخص سے یہ ساری حرکات سرزد کرائیں :ـ (۱) دینی رہنمائی کے منصب پر پہنچا جائے اور شہرت کے نام سے پورے عالم اسلامی پر چھایا جائے ـــ (۲) وہ مالیخولیا جس کے بار بار تذکرے سے اس کی اور اس کے متعلق اس کے ماننے والوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں ـــ (۳) مبہم اور غیر واضح قسم کے سیاسی اغراض، مفادات اور سرکار انگریزی کی خدمت گذاری اور نمک حلالی۔

[1] عرضی بحضور گورنر پنجاب بتاریخ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء تفصیل کے لئے دیکھئے میر قاسم علی کی کتاب "تبلیغ رسالت" کی ساتویں جلد [2] تریاق القلوب از مرزا قادیانی صفحہ ۱۵ [3] ضمیمہ شہادت القرآن از مرزا طبع ششم صفحہ ۱۰

"اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے"[1]

ایک اور جگہ کہتے ہیں:-

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی اور فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے، چنانچہ میں نے یہ کتابیں بصرف زر کثیر چھاپ کر بلاد اسلام میں پہنچائی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک (ہندوستان) پر بھی پڑا ہے، اور جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جاتی ہے کہ جن کے دل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں، ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ پر ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام اس ملک کے لئے بڑی برکت ہیں اور گورنمنٹ کے لئے دلی جان نثار"[2]۔

مرزا غلام احمد صاحب کی اس تحریک اور ان کی اس جماعت نے انگریزی حکومت کے لئے بہترین جاسوس اور بڑے سچے دوست اور جان نثار فراہم کئے۔ اس گروہ کے بعض چیدہ اشخاص نے ہند اور بیرون ہند میں انگریزی حکومت کی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور اس سلسلہ میں جانی قربانی تک سے دریغ نہیں کیا جیسے عبد اللطیف صاحب قادیانی جو افغانستان میں قادیانی مذہب کی تبلیغ اور جہاد کی مخالفت کرتے تھے، ان کو حکومت افغانستان نے قتل کیا کیونکہ انکی دعوت سے اس بات کا خطرہ تھا کہ افغان قوم کا وہ جذبہ جہاد اور حوصلۂ جنگ فنا ہو جائے جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ایسے ہی وہ ملا عبد الحلیم قادیانی اور ملا نور علی قادیانی اسی انگریزی حکومت کے لئے افغانستان میں فنا کے گھاٹ اترے، کیونکہ ان کے پاس سے حکومت افغانستان کو کچھ ایسے خطوط اور کاغذات دستیاب ہوئے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں، اور حکومت افغانستان کے خلاف سازش میں مشغول ہیں جیسا کہ افغانستان کے وزیر داخلہ کے ۱۹۵۲ء کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اور قادیانیوں کے سرکاری اخبار "الفضل" نے اپنی ۳ر مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں اس بیان کو نقل کیا، اور اس قربانی پر بڑے فخریہ انداز میں تبصرہ کیا۔

علی ہذا یہ قادیانی جماعت اپنے دور آغاز سے اب تک برابر قوم پرور وطن دوست تحریکات سے کنارہ کش رہی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نہ مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں اس نے کوئی حصہ لیا اور نہ ان کے بعد! اور صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں کی چودھراہٹ میں یورپی قزاقوں کی ٹولی (مستعمرین) کے ہاتھوں عالم اسلامی پر جو مصائب ٹوٹ رہے تھے وہ ان کے لئے موجب غم نہیں باعث مسرت تھے، انھیں کبھی عام زندگی سے اسلامی مسائل سے یا ان اسلامی تحریکات سے جو اسلامی حمیت یا سیاسی شعور کا نتیجہ تھیں، کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ان کا کام ہمیشہ مذہبی مباحثے اور موشگافیاں تھیں اور ان کی دلچسپیوں کا دائرہ صرف وفات مسیح، حیات مسیح، نزول مسیح، اور نبوت مرزا غلام احمد پر مباحثوں اور مناظروں تک محدود رہا۔

ہندوستان کے علماء اسلام اور ارباب فکر و نظر نے اس قادیانی فتنہ کو بہت اندیشہ کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے زبان و قلم اور علم کے ہتھیاروں سے اس فتنہ کے استیصال کی پوری جد و جہد کی اور ظاہر ہے کہ ایک ایسے سیاسی اقتدار کے ہوتے ہوئے خود اس فتنہ کا مربی اور سرپرست ہو، اس سے

[1] ایضاً　[2] عریضہ بعالی خدمت عالیہ انگریزی بجانب مرزا غلام احمد۔

زیادہ کوئی کوشش ممکن نہ تھی، ان مجاہدین اسلام میں سرفہرست ان چار حضرات کے نام ہیں۔ مولانا محمد حسین بٹالوی۔ مولانا محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء) مولانا ثناء اللہ امرتسری مولانا انور شاہ کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) رحمہم اللہ تعالیٰ اور اسلامی جماعتوں میں سب سے جوش اور سرگرمی سے اس گروہ کے خلاف جنگ کرنے والی جماعت مجلس احرار اسلام رہی جس کے قائد اور روح رواں سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم تھے۔

اس زمرہ میں اسلام کے مایۂ ناز مفکر ڈاکٹر محمد اقبال بھی ہیں جنھوں نے اپنی بعض تصانیف میں بہت صاف صاف لکھا کہ قادیانیت نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت ہی اسلام کے خلاف ایک سازش ہے! ایک مستقل دین ہے! اس کے ماننے والے ایک الگ امت ہیں، اور یہ امت عظیم اسلامی امت کا ہرگز جزو نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اقبال کوئی "دقیانوسی مولوی" نہ تھے۔ ان کا شمار دنیائے اسلام کے نہایت بلند پایہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد میں تھا، اور وہ اتحاد اسلامی کے ان اول درجہ کے داعیوں میں سے تھے جن کی دعوت کا اولین اصول بے تعصبی اور رواداری ہے لیکن چونکہ وہ مرزا غلام احمد کو قریب سے جانتے تھے[۱] اور ان کے مذہب اور ان کے مقاصد و اصول سے گہری واقفیت رکھتے تھے اس لئے وہ بھی اس فتنہ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، اور وہ پہلے شخص تھے جن نے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا خیال پیش کیا۔ یہاں ہم ان کے مقالات اور خطبات کے

بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں:-

علامہ مرحوم نے ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار "اسٹیٹس مین"[۲] کو جس نے ایک بار اس مسئلہ کو اٹھایا تھا ایک مراسلہ بھیجا کہ "قادیانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متوازی ایک علیحدہ نبوت پر ایک نئے گروہ کی بنیاد رکھنے کی منظم کوشش کا نام ہے"[۳] اور اسی زمانہ میں جب ہندوستان کے نامور لیڈر اور سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ سوال کیا کہ مسلمان قادیانیوں کو اسلام سے جدا کرنے پر آخر کیوں اصرار کرتے ہیں جب کہ قادیانی بھی مسلمانوں کے بہت سے فرقوں کی طرح انہی کا ایک فرقہ ہیں[۴] تو علامہ مرحوم ہی نے ان کو جواب دیتے ہوئے کہا (ہم اس بات پر اس لئے مصر ہیں) کہ قادیانی تحریک نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں سے نبی ہندی کی امت کو تراشنے کی کوشش کر رہی ہے" اور کہا کہ "ہندوستان کی حیات اجتماعیہ کے لئے یہ تحریک اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے جتنی یہودی نظام حیات کے لئے یہود کے ایک باغی فلسفی "اسپینوزا" (SPINOZA) کے عقائد ہو سکتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت کے لئے ڈاکٹر اقبال مرحوم کا سینہ کھول دیا تھا اور وہ اس حقیقت سے کما حقہ آشنا تھے کہ یہ عقیدہ ہی اسلام کی حیات اجتماعی اور امت کی شیرازہ بندی کا واحد محافظ ہے اور اس عقیدہ سے بغاوت کسی حال میں رعایت کی مستحق نہیں ہو کیونکہ یہ بغاوت قصر اسلامی کی بنیاد پر تیشہ چلانے کے

---

[۱] یاد رہے کہ بانی قادیانیت اور علامہ موصوف دونوں پنجاب ہی کے رہنے والے تھے [۲] "اسٹیٹس مین"۔ ۱۰ جون ۱۹۳۵ء [۳] ہندوستان کے وطن پرست لیڈر عام طور پر قادیانیت کو پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ اگر پھیلے گی تو ہندوستان کی عظمت و تقدس میں اضافہ ہوگا اور مسلمان اپنا رخ حجاز سے پھیر کر ہندوستان کو اپنا قبلہ اور اپنا روحانی مرکز قرار دے لیں گے ــــ جیسا کہ ان لیڈروں کا خیال ہے ــــ اس سے مسلمانوں کے دلوں میں وطن پرستی کی جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔ جن دنوں پاکستان میں قادیانیت دشمن تحریک چل رہی تھی بعض ہندو اخبارات کو قادیانیوں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ ان اخبارات نے قادیانیوں کی تائید میں مضامین شائع کئے۔ اپنے پڑھنے والوں کو جمہور مسلمانوں کے مقابلہ میں قادیانیوں کا مؤید اور حامی بنانے کی کوشش کی اور یہاں تک لکھ گئے کہ "پاکستان میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی یہ کشمکش دراصل عربی نبوت اور ہندی نبوت کی کشمکش ہے اور ان دو مختلف نبوتوں کے پیروؤں کی کشمکش ہے۔

مرادف ہے، اوپر کی سطروں میں "اسٹیٹس مین" کے جس
مراسلہ کا ذکر کیا گیا ہے اسی میں لکھتے ہیں :۔
" یہ عقیدہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین
ہیں، تنہا یہی وہ عامل (FACTOR) ہے جو
اسلام اور ان ادیان کے درمیان ایک مکمل سرحدی خط
(LINE OF DEMARCATION)
کھینچتا ہے جو توحید میں مسلمانوں کے ہم عقیدہ ہیں
اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی تسلیم کرتے
ہیں لیکن وحی ونبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے قائل
نہیں ہیں جیسے کہ ہندوستان میں برہمو سماج
اور یہی وہ چیز ہے جسے دیکھ کر کسی گروہ پر داخل
اسلام یا خارج اسلام ہونے کا حکم لگایا جاسکتا
ہے، میں تاریخ میں کسی ایسے مسلمان گروہ کا نام
نہیں جانتا جس نے اس خط کو پھاند جانے کی
جرأت کی ہو، ایران کے فرقہ بہائیہ نے ضرور
عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کیا، لیکن انہوں نے
صاف صاف یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ایک الگ جماعت
ہیں، جو عرف عام کے اعتبار سے مسلمان نہیں۔
بے شک ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ
کی طرف سے آیا ہوا دین ہے لیکن اس کا قیام
بحیثیت ایک سوسائٹی یا بحیثیت ایک امت سراسر
حضرت محمد کی شخصیت پر موقوف ہے، اس لئے
قادیانیوں کے سامنے بس دو ہی راستے ہیں، یا تو
وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور خود کو مسلمانوں سے
جدا کرلیں یا ختم نبوت کی انوکھی تفسیر سے بیزار
ہوجائیں ورنہ ان کی سیاسی ڈھب کی تاویلات
ان کے دل کے اس چور کی غمازی کررہی ہیں کہ
یہ لوگ صرف ان فوائد کے لالچ میں مسلمانوں
کے دائرے میں گھسے رہنا چاہتے ہیں جو فوائد
مسلمان کے نام سے وابستہ ہیں، کیونکہ اس کے
بغیر ان فوائد اور منافع میں انھیں کوئی حصہ نہیں
مل سکتا "
موصوف ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔
" ہر وہ گروہ جو معروف و مصطلح اسلام سے انحراف
کرے اور اس کا ذہنی فکر و مزاج ایک نئی نبوت
کی بنیاد پر استوار ہوا ہو، وہ ان تمام مسلمانوں کی
صاف صاف تکفیر کرتا ہو جو اس نئی خانہ ساز
نبوت کی تصدیق نہ کریں وہ گروہ اسلام کی سالمیت
کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے اور مسلمانوں کو اس پر سختی
سے نظر رکھنی چاہئے۔ اسلامی معاشرہ کی وحدت
صرف عقیدۂ ختم نبوت پر منحصر ہے "
یہ تھا اقبال جیسے روشن خیال فاضل کا نظریہ قادیانیت
کے بارے میں، لیکن وقت گذرتا رہا، قادیانی اپنے کام میں
مشغول رہے، فتنے اٹھاتے رہے، مناظرے کرتے رہے
شکوک وشبہات کا روگ لگاتے رہے اور انگریزی سیاست
کی حمایت کرتے رہے۔ ان کا مرکز ضلع گورداس پور (پنجاب)
کا ایک قصبہ قادیان تھا۔ انگریز کے سایۂ عاطفت میں وہ
اپنا کام کررہے تھے۔ لیکن یہ بات کبھی ان کے خواب وخیال
میں بھی نہ آئی تھی کہ کسی وقت کوئی بڑی سیاسی قوت
بھی ان کے قبضہ میں آجائے گی اور کوئی ایسی نئی بنائی
مملکت ہاتھ آجائے گی جس میں ان کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا
کیونکہ اولاً تو انھوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد اور جنگ آزادی
میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اور دوسرے یہ کہ ان کی تعداد بہت
تھوڑی اور مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت سے دبی ہوئی تھی
لیکن ۱۹۴۷ء میں یکایک مملکت پاکستان کی داغ بیل پڑگئی
اور یہ چیز جس کا تصور بھی قادیانی اپنے حالات کے پیش نظر
نہیں کرسکتے تھے، بغیر ایک قطرۂ خون بہائے ہوئے انھیں
مل گئی ۔۔۔ یعنی حکومت واقتدار پر اثر و نفوذ جو انکو پاکستان
کی نوخیز مملکت میں حاصل ہوا۔
مرزا غلام احمد اور ان کے رفقاء نے تصریح کی ہے
کہ جو مسلمان اس نئے دین پر ایمان نہیں رکھتے وہ کافر ہیں
ان کے پیچھے نماز جائز نہیں، ان کو لڑکی دینا جائز نہیں

الغرض ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کرنا چاہیئے۔ مرزا بشیر الدین محمود فرزند مرزا غلام احمد صاحب اپنی کتاب "آئینۂ صداقت" میں لکھتے ہیں :-

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انھوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں[1]"

مرزا بشیر الدین صاحب ایک عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہتے ہیں :-

"ہم چونکہ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور غیر احمدی ان کو نبی نہیں مانتے اس لئے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے غیر احمدی کافر ہیں"۔

ایک تقریر میں اپنے اور مسلمانوں کے اختلافات کے سلسلہ میں مرزا صاحب کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ :-

"اللہ تعالیٰ کی ذات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ غرض ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے[2]"۔

اور حد یہ ہے کہ پاکستان کے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو اپنے عقیدہ کی بنا پر مسٹر ظفر اللہ خاں نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

یہ تھے وہ اسباب جنھوں نے مسلم رہنماؤں کو ایک گہرے تفکر میں ڈبو دیا اور انھیں یہ نظر آنے لگا کہ قصر اسلامی کو اندر ہی اندر ایک گھن لگ رہا ہے اور ہدایت ربانی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ	اے ایمان والو مت بناؤ بھیدی اپنے غیر میں سے وہ کمی نہیں کرتے ہیں تمہاری خرابی میں، ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف پاؤ نکل پڑتی ہے دشمنی ان کی
مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔	زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے بھی سوا ہے۔

(آل عمران — ۱۱۸)

کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔ تب انھوں نے کہا کہ اس مشکل کا حل صرف یہ ہے کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے یہ بعینہ وہی تجویز تھی جو سب سے پہلے ڈاکٹر محمد اقبال نے پیش کی تھی اور اپنے خطبات و مقالات میں بہت شدت و قوت کے ساتھ اسی کی دعوت دیتے رہے تھے۔ انھوں نے صراحت کے ساتھ کہا کہ "قادیانیت اسلام سے اس سے کہیں زیادہ معاندہے جتنے کہ سکھ ہندوؤں سے لیکن انگریزی حکومت نے سکھوں کو غیر ہندو اقلیت قرار دیا حالانکہ دونوں میں بہت سے معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی تعلقات قائم ہیں وہ آپس میں شادی بیاہ تک کرتے ہیں، جبکہ قادیانیت مسلمانوں سے مناکحت ومصاہرت کو قادیانیوں کے لئے حرام ٹھیراتی ہے اور ان کے بانی نے مسلمانوں سے ہر قسم کے تعلقات کو یہ کہہ کر ناجائز قرار دیا ہے کہ مسلمانوں کی مثال خراب شدہ دودھ کی ہے جبکہ ہم تازہ دودھ کی مانند ہیں"۔

افسوس کہ عالم اسلامی نے اب تک قادیانیت کے خطرے کو نہیں سمجھا ہے، عالم اسلامی اب تک اس حقیقت سے پورے طور پر آگاہ نہیں کہ قادیانیت محض ایک عقیدہ یا مذہبی فرقہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے نظم ملی کو درہم برہم کرنے کی ایک منظم سازش ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کے خلاف ایک خطرناک بغاوت ہے۔ قادیانیت کو اس اسلام سے عناد ہے اور ہر ہر معاملہ میں وہ اس کی مزاحم ہے۔ قادیانیت چاہتی ہے کہ عقائد و افکار اور جذبات میں اسلام کی جگہ اسے مل جائے اور بنی آدم کی اطاعت و محبت اور احترام و عقیدت سے جو حصہ داخ اسلام کو ملا ہے وہ اس کی طرف منتقل ہو جائے قادیانیت صاف طور پر اعلان کرتی ہے کہ مرزا صاحب

---

[1] صفحہ ۳۵ [2] بیان مندرجہ اخبار "الفضل" ۲۶ جون ۱۹۲۲ء

[2] الفضل ۱۳ جون ۱۹۳۱ء

نہ صرف صحابۂ کرام اور امت کے جلیل القدر اولیاء و مجددین و ائمہ عظام سے بزرگ تر ہیں، بلکہ بہت سے اولوالعزم انبیاء و رسل (علی نبینا علیہم السلام) سے افضل و اعلیٰ ہیں، قادیانیت کی نظر میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مرزا غلام احمد صاحب کے حواریوں اور اصحاب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مرزا صاحب کا مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر بلکہ شاید کچھ زیادہ ہے۔ ان کے خلفاء، خلفائے راشدین کے ہمسر ہیں، ان کا شہر قادیان شرف و تجلی میں مکہ معظمہ اور مدینۃ الرسول کا ہم پلہ ہے اور قادیان کا حج مکہ مکرمہ کے حج سے کمتر نہیں ہے۔

مرزا بشیر الدین قادیانی خلیفۂ دوم کی "حقیقۃ النبوۃ" دیکھئے! مرزا غلام احمد کے متعلق فرماتے ہیں کہ "وہ بعض اولوالعزم نبیوں سے بھی آگے نکل گئے" (ص ۲۵۷) اخبار الفضل ج ۱۴، ۲۹ اپریل ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ "دیگر انبیاء علیہم السلام میں سے بہت سوں سے آپ بڑے تھے، ممکن ہے سب سے بڑے ہوں" یہی اخبار جلد ۵ مؤرخہ ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں اصحاب نبی اور اصحاب مرزا کو برابر قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔ "پس ان دونوں گروہوں میں تفریق کرنی یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں، یہ دونوں فرقے درحقیقت ایک ہی جماعت ہیں صرف زمانہ کا فرق ہے، وہ بعثت اولیٰ کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ بعثت ثانیہ کے" اخبار الفضل جلد ۳ نمبر ۵ میں ہے کہ "مسیح موعود محمد است و عین محمد است" اور "انوار خلافت" میں میاں محمود احمد صاحب خلیفۂ قادیان لکھتے ہیں" اور میرا ایمان ہے کہ اس آیت (اِسْمُهٗٓ اَحْمَدُ) کے مصداق حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہی ہیں" قادیانیت اسی پر بس نہیں کرتی بلکہ حضور سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی افضلیت کا دعویٰ کرتی ہے مرزا غلام احمد اپنے "خطبۂ الہامیہ" میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے ساتھ ظہور فرمایا، اور وہ زمانہ اس روحانیت کی ترقیات کی انتہا نہ تھا، بلکہ اس کے کمالات کے معراج کے لئے پہلا قدم تھا، پھر اس روحانیت نے چھٹے ہزار میں یعنی اس وقت پوری طرح سے تجلی فرمائی"[1]

اور مرزا یہ بھی کہتے ہیں:۔

لَهٗ خَسَفَ الْقَمَرُ الْمُنِیْرُ وَاِنَّ لِیْ
غَسَا الْقَمَرَانِ الْمُشْرِقَانِ اَتُنْكِرُ؟

(ان کے یعنی نبی کریم کے لئے صرف چاند کے گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں (کے گرہن) کا اب کیا انکار کرے گا۔ ؟[2]

قادیانیت کی نظر میں مرزا صاحب کے مدفن کا بھی وہی مرتبہ ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کا۔ ملاحظہ فرمائیے صیغۂ تربیت قادیان کی طرف سے قادیان جانے والوں کے لئے ہدایت کا اقتباس!

"اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے گنبد خضراء کے انوار کا پورا پورا پرتو اس گنبد بیضاء پر پڑ رہا ہے آپ گویا ان برکات سے حصہ لے سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد منور سے مخصوص ہیں کیا ہی بدقسمت ہے وہ شخص جو احمدیت کے حج اکبر میں اس تمتع سے محروم رہے گا"[3]

علی ہذا قادیانی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اب قادیان تین مقدس و متبرک مقامات میں سے ایک ہے۔ مرزا محمود احمد صاحب خلیفۂ قادیان تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"خدائے تعالیٰ نے ان تینوں مقامات (مکہ، مدینہ اور قادیان) کو مقدس کیا، اور تینوں مقامات کو اپنی تجلیات کے اظہار کے لئے چنا"[4]

---

[1] ص ۱۷۷ [2] اعجاز احمدی ص ۷۱ [3] الفضل جلد ۲۰ نمبر ۱۸، دسمبر ۱۹۲۲ء [4] الفضل ۳ ستمبر ۱۹۳۵ء

پھر ایک قدم اور بڑھا کر قادیانیت بلد حرام اور مسجد اقصیٰ سے متعلق قرآنی آیت کو قادیان پر چسپاں کرتی ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب کا ارشاد ہے کہ "وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا" ان کی مسجد کی صفت میں بیان فرمایا گیا ہے[1]۔

"درثمین" ص۵۲ پر ارشاد ہے ؎

زمین قادیان اب محترم ہے
ہجوم خلق سے ارض حرم ہے

اخبار الفضل قادیان جلد ۲۰ مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۳۲ء میں رقمطراز ہے:۔

"سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ"
کی آیت کریمہ میں مسجد اقصیٰ سے مراد قادیان کی مسجد ہے۔"

اور جب یہ بات ہے کہ قادیان بلد اللہ الحرام کا ہم مرتبہ بلکہ کچھ سوا ہے تو لا محالہ اس کا سفر بھی حج کے برابر یا کچھ فائق تر ہوگا۔ چنانچہ میاں محمود احمد صاحب خطبۂ جمعہ میں فرماتے ہیں:۔

"اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ظلی حج مقرر کیا تاکہ وہ قوم جس سے وہ اسلام کی ترقی کا کام لینا چاہتا ہے اور تاکہ وہ غریب یعنی ہندوستان کے مسلمان اس میں شامل ہو سکیں[2]۔"

اور قادیانی جماعت کے ایک اور بزرگ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ:۔

"جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے وہ خشک اسلام ہے۔ اسی طرح اس حج ظلی کو چھوڑ کر مکہ والا حج بھی خشک رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں پر آجکل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے ہیں[3]۔"

ان باتوں سے اندازہ کیجئے کہ قادیانیت کس طرح ایک عالمی دین بننے کے لئے کوشاں اور امیدوار ہے جس کا خود اپنا ایک نبی ہو، صحابہ اور خلفاء ہوں، مقامات مقدسہ ہوں، اپنی مستقل تاریخ اور شخصیات ہوں، اپنا مستقل ادب اور لٹریچر ہو، اور اپنے متبعین کا رشتہ اسلام کے لافانی ورثہ سے اس کی تاریخ اور شخصیات سے، اس کے اولین سرچشموں اور ماخذوں سے اس کے مقدسات اور روحانی مراکز سے منقطع کر کے کس طرح ان میں سے ہر ایک کے عوض میں ایک نئی چیز اپنے متبعین کے لئے فراہم کرتی ہے، مگر ان چیزوں کا بدل کوئی چیز کہاں بن سکتی ہے، معاذ اللہ عن ذلک ——— اور اس طرح سے انسان نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و طاعت کی سرشاری، آپ کے ذکر کی شیفتگی، آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ اور آپ کے نقش قدم کے اتباع سے برگشتہ ہو کر نبی قادیانی کی محبت میں اور اس کی عظمت و عبقریت کے گن گانے میں، اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے میں اور اس کے نقش قدم پر چلنے میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہ انسان اسلام کی تابناک تاریخ ایمان و جوانمردی کی تاریخ شرافت انسانی کی تاریخ کو چھوڑ کر ایک ایسی تاریخ پر فریفتہ ہو جاتا ہے جو سراسر ذلت و مسکنت کی تاریخ ہے، ظالم حکمرانوں اور جابر حکومتوں کی حاشیہ نشینی کی تاریخ ہے، نجی حضوری اور چاپلوسی کی تاریخ ہے اور جاسوسی اور منافقت کی تاریخ ہے۔

وہ انسان ان اسلامی شخصیتوں سے منہ موڑ کر جو بجا طور پر سرمایۂ انسانیت اور آدمیت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، انسانیت کے ان سپوتوں سے منہ موڑ کر جو فضیلت

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

---

[1] ملخص از حاشیہ در حاشیہ براہین احمدیہ ص۵۵۸۔ [2] الفضل یکم دسمبر ۱۹۳۲ء۔ [3] اخبار پیغام صلح لاہور جلد ۲۱ نمبر ۲۲۔

معترضین کیا فرماتے ہیں!

(۲)

"دوسرا اعتراض" کا عنوان دے کر محترم مولانا حفظ الرحمان نے پہلے تو اجماع سکوتی اور اجماع تقریری کے فنی موضوع کو چھوا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان اصطلاحات کی تعریف موصوف کیا کرتے ہیں۔ ان کی بات اس وقت نتیجہ خیز ہو سکتی تھی جب وہ دونوں اصطلاحوں کی تعریف کرتے۔ پھر بتاتے کہ طلاقِ ثلاث کا مسئلہ کون سی تعریف کے ذیل میں آتا ہے اور پھر یہ بتاتے کہ فلاں فلاں اساتذہ اس قسم کے اجماع کو حجت نہیں مانتے۔ فقط اتنا کہدینا کہ اجماع سکوتی ہے اور امام شافعیؒ کو اجماع سکوتی کے حجت ہونے میں اختلاف ہے کافی شافی نہیں۔ یہ بہرحال طے ہے کہ شوافع ایک وقت کی متعدد طلاقوں کو واقع مانتے ہیں اور یہ تک نہیں کہتے کہ اکٹھی کئی طلاقیں دینا بدعت ہے۔

اس کے متصل بعد محترم نے بدایۃ المجتہد سے ابن رشد کی ایک عبارت نقل کی جس کا مطلب ہے کہ یکجائی تین طلاقوں کو جمہور نے واقع مان لیا ہے لیکن اس سے رجوع کی وہ گنجائش ختم ہو جاتی ہے جو اللہ نے قرآن کی فلاں آیت میں دی ہے۔ اس عبارت سے ابن رشد کا یہ رجحان ظاہر ہوا کہ "تین کو ایک کہنے والا قول ہی اللہ کی رخصت اس کی رحمت سے زیادہ قریب ہے"۔ اس کے بعد موصوف نے بتایا ہے کہ ابن رشد چھٹی صدی ہجری کی شخصیت ہیں اور چوٹی کے علماء میں گنے جاتے ہیں۔

طلاق نمبر کے صفحہ ۱۵۶ پر ہم مختصراً لکھ چکے ہیں کہ "ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں جو کچھ لکھا ہے وہ بجائے خود ناکافی اور کمزور ہے۔ یہاں ہم قدرے تفصیل اختیار کر کے یہ سوال کرتے ہیں کہ ابن رشد کا رجحان کچھ بھی ہو مگر کیا ان کا ایسا کوئی قول دکھلایا جا سکتا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہو کہ انھوں نے مسلکِ جمہور سے ہٹ کر وہ مسلک اختیار کر لیا تھا جس کی وکالت آپ کر رہے ہیں؟

دوسرا سوال یہ کرتے ہیں کہ ابن رشد خواہ کتنے ہی بڑے عالم ہوں مگر کیا ان کا شمار فقہ کے اساتذہ اور ائمہ میں ہے؟ تیسرا سوال یہ کرتے ہیں کہ کیا ابن رشد سے سوجھ بوجھ اور فیصلے کی غلطی ممکن نہیں ہے؟ چوتھا سوال یہ کرتے ہیں کہ جو اجماع شروع کی چار پانچ صدیوں میں واقع ہو چکا اسے چھٹی صدی کا ایک عالم کیسے توڑ سکتا ہے جب کہ یہ دین کا معاملہ ہے سائنس یا ٹکنالوجی کا نہیں۔ دین تو مکمل ہو چکا اجماعی مسائل میں کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی کسی نئی وحی کی روشنی کہاں سے لائے گا؟

ابنِ رشد کی فکری چوک یہ ہے کہ رخصت و گنجائش ختم کرنے کی ذمہ داری انھوں نے غلط طور پر جمہور کے سر ڈال دی حالانکہ اس کا ذمہ دار خود طلاق دینے والا ہے ایسا ہی ہے جیسے زید کسی کو قتل کرے اور ڈاکٹر لاش دیکھنے کے بعد تصدیق کرے کہ مقتول کی روح پرواز کر چکی ہے تو آپ قتل کی ذمہ داری ڈاکٹر کے سر ڈال دیں۔ اللہ نے شوہروں کو رخصت دی تھی کہ ایک یا دو طلاق دے کر وہ رجوع کر سکتے ہیں لیکن شوہر اگر اس رخصت کو ٹھکراتے ہوئے الٹے تین طلاق دے ڈالتا ہے تو جمہور کا یہ کہنا کہ تین طلاقیں پڑ گئیں محض مسئلے

ہے اس نیت کی جسے یہ شوہر خود ظہور میں لایا ہے۔

اور غور کیجیے۔ مولانا محفوظ الرحمان نے اپنے مقالے میں اعتصام پر سوال اول کا جو جواب دیا ہے اس سے بھی اس کی فکری تضاد کا سراغ مل جاتا ہے جس میں وہ مبتلا ہیں سوال تھا کہ کیا محض طلاق کا لفظ تین بار دہرانے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں؟ مولانا جواب دیتے ہیں:-

"طلاق طلاق طلاق تین دفعہ کہدینے سے اگر کہنے والے کی نیت ایک کی ہو اور اس نے محض تاکید کے لئے باقی دو دفعہ مزید کہدیا ہو یا باقی دو سے اس نے کچھ بھی نیت نہ کی ہو نہ تاکید کی نہ عدم تاکید کی تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔"

اس کے بعد اپنی رائے کی تائید میں الفقہ آلوسی اور ابن حزم کو گواہ بنایا ہے۔ ہم کہتے ہیں علمائے احناف میں بھی کتنے ہی علما یہی رائے رکھتے ہیں لیکن اس سے صاف معلوم ہوا کہ شخص مذکور کی نیت اگر تین ہی طلاق دینے کی ہو تو آپ کے نزدیک بھی تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ نہ پڑنے کا قول آپ اس وقت کہتے ہیں جب تین کی نیت نہ ہو۔ بتائیے یہاں کیا خود آپ ہی نے یہ نہیں مان لیا کہ طلاق دینے والے کی نیت اللہ کی دی ہوئی رخصت و گنجائش کو ختم کر سکتی ہے؟ کیوں مان لیا؟ اگر آپ کی ایماندارانہ رائے وہی تھی جسے آپ اب ظاہر کر رہے ہیں اور ابن رشد کو اس کا گواہ بنا کر لاتے ہیں تو آپ کو صاف کہنا چاہیئے تھا کہ شوہر کی نیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن طلاق بس ایک ہی واقع ہوگی۔ اور اللہ کی دی ہوئی رخصت معطل نہ ہو سکے گی۔

دنیا کا ہر معقول آدمی اس بات سے واقف ہے کہ رعایتیں اور رخصتیں زبردستی سر نہیں چپکائی جاتیں۔ ایک شخص خود ہی کسی رعایت و رخصت کو ٹھکرا دیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس پر رحم و کرم کی بارش کی جائے۔

اسی جگہ موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے:-

"دوسری بات حلالہ کا مسئلہ ہے۔ ہم نے اپنے مقالہ میں اس کے متعلق بھی کچھ معروضات پیش کی تھیں مگر حیرت ہے مولانا عامر صاحب نے تحلیل کے مسئلہ پر ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ جس طرح تین طلاق دینے سے تین پڑ جانے کا مسلک جمہور کا ہے اسی طرح بشرط تحلیل کیا ہوا نکاح کرے سے جمہور کے نزدیک نکاح ہی نہیں۔ مولانا مودودی بھی صاف طور سے اس کے منکر ہیں۔ امین احسن اصلاحی بھی اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں اگر تین طلاق کو ایک کہنے کا خیال جمہور کی مخالفت ہے تو بشرط تحلیل کئے ہوئے نکاح کو درست کہنا بھی جمہور کی مخالفت ہے۔" (ص ۱۹۸)

ہم نے تحلیل کے مسئلے کو اس لئے نہیں چھوا کہ یہ بجائے خود ایک تنقیح طلب مسئلہ ہے۔ زیر بحث مسئلہ تین طلاقوں کا تھا۔ وہی اتنا وسیع الذیل ہے کہ سیکڑوں صفحات بھر گئے۔ تحلیل کی بحث جہاں طوالت مزید کا باعث بنتی وہیں قارئین کی توجہ بھی دو طرف بٹ جاتی۔ اس بحث کے بغیر ہی اگر اصل مبحث کا حق ادا ہو گیا ہے تو یہ الزام دینا بے کار ہے کہ مسئلہ تحلیل کو نہیں چھیڑا گیا۔

رہا آپ کا یہ تاثر دینا کہ دونوں مسئلوں کی نوعیت ایک ہے تو یہ محض مغالطہ ہے۔ عام لوگ نہ جانیں تو نہ جانیں مگر کیا آپ بھی نہیں جانتے کہ لفظ "جمہور" کا استعمال ابواب فقہ میں اجماع امت کے مفہوم میں نہیں ہوتا۔ فقہ کی کتابوں میں قدم قدم پر مل جائے گا کہ فلاں مسئلے میں جمہور کی رائے یہ ہے اور ابو حنیفہؒ یا شافعیؒ کی رائے یہ۔ گویا جمہور سے مراد ہیں عام علماء نہ کہ تمام علماء۔ تحلیل کے مسئلہ میں اجماع ہرگز نہیں ہے جب کہ طلاقوں کے مسئلہ میں اجماع متحقق ہے۔ اس مسئلہ پر یہاں ہم مستقل بحث شروع کر کے بات کو طول دینا نہیں چاہتے۔ آپ اگر چاہیں تو کسی اور صحبت میں یہ بحث بھی چھیڑی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم اتنا ہی کہیں گے کہ مولانا مودودی ہوں یا امین احسن اصلاحی ان کی کوئی رائے حرف آخر نہیں مانی جا سکتی جب کہ بعض اساتذہ اور اکابر اس سے مختلف رائے ظاہر کر چکے ہوں۔ تین طلاقوں کے مسئلہ میں

مولانا مودودی کی رائے بالکل درست ہے کیونکہ وہ اجماعِ امت کے مطابق ہے۔

غور طلب یہ ہے کہ حضورؐ نے حلالہ کرنے کرانے والے پر لعنت تو فرمائی مگر کیا یہ بھی فرمایا کہ ایسا نکاح منعقد ہوتا ہی نہیں؟ لعنت کا مطلب یہ تو یقیناً ہے کہ یہ لوگ سخت گناہ گار ہوں مگر یہ نہیں ہے کہ نکاح ہی منعقد نہ ہو۔ محرم مرد و زن میں نکاح اس لئے منعقد نہیں ہوتا کہ قرآن نے صریحاً اس سے روک دیا ہے لیکن حلالہ والا نکاح اس لئے منعقد ہو جاتا ہے کہ قرآن نے اس سے نہیں روکا۔ قرآن بس اتنا کہتا ہے کہ تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر کے لئے اس وقت حلال ہو سکتی ہے جب وہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔ کسی اور مرد سے نکاح اسکیم کے تحت ہو یا قدرتی انداز میں۔ بہر صورت شرطِ قرآنی پوری ہو جاتی ہے۔ قانون اسی کا نام ہے۔ قانون میں نفسِ واقعہ دیکھا جاتا ہے۔ اسی لئے بعض اکابر علمائے احناف نے یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ اسکیم کے تحت حلالہ کرنے کرانے کا کام نہایت نازیبا اور ملعون ہے یہ فتویٰ دیا ہے کہ نکاح بہرحال ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ یہاں کچھ کہنا غیر ضروری ہوگا۔

"تیسرا اعتراض" کا عنوان دے کر جو کچھ ارشاد کیا گیا وہ خاصا دلچسپ ہے۔ ہمارا اعتراض یہ تھا کہ مولانا محفوظ الرحمان نے اپنے مقالہ میں طلاق سے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول نقل کیا اور حوالہ ابوداؤد کا دیا۔ لیکن ابوداؤد میں صراحت موجود ہے کہ یہ قول ابن عباسؓ کا نہیں عکرمہؒ کا ہے۔ گویا امام ابوداؤدؒ تو اس قول کو عکرمہؒ کا قول تصور فرماتے ہیں اور مولانا موصوف اپنے قارئین کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ کے نزدیک یہ قول ابن عباسؓ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ اعتراض خیانتِ نقل اور غلط بیانی کے الزام کا مظہر ہے۔ اس الزام کی صفائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب کہ موصوف یہ ثابت فرما دیتے کہ امام ابوداؤدؒ نے قولِ مذکور کو ابن عباسؓ ہی کے قول کی حیثیت سے درج کتاب کیا ہے عکرمہؒ کے قول کی حیثیت سے نہیں۔ لیکن انھوں نے بحث و نظر کے ذریعہ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام ابوداؤد سے چوک ہوئی۔ وہ پیچیدگی رفع کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان سے دو مختلف روایات کی تطبیق نہ ہو سکی۔

بھلا اس سے ہمارے الزام کی صفائی کیسے ہو گئی؟ تسلیم کہ ابوداؤد سے دس غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ بجا کہ آپ کو ان کی رائے سے اختلاف اور ان پر نقد کرنے کا حق حاصل ہے مگر یہ حق تو حاصل نہیں کہ جس روایت کا ذکر کر کے وہ اس کی تردید کر رہے ہیں اسی روایت کو آپ مقالہ میں پیش فرما کر قارئین کو یہ باور کرائیں کہ یہ روایت ان کے نزدیک صحیح و معتبر ہے۔

رہا بقیہ واحد والا قول اور اس پر آپ کا معارضہ تو اس کی مفصل بحث ہم طلاق نمبر میں صفحہ ۱۴۹ سے صفحہ ۱۵۳ تک کر چکے ہیں۔ اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

"چوتھا اعتراض" حدیث رکانہ سے متعلق ہے۔ اس حدیث پر طلاق نمبر میں ہم نے اس قدر تفصیل سے لکھ دیا ہے کہ اس پر اضافہ وقت کی بربادی ہوگا۔ مولانا محفوظ الرحمان نے الفاظ کے الٹ پھیر سے جو معارضہ قائم کیا ہے وہ ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں۔ اگر کسی صاحب کی سمجھ میں آئے تو وہ ہمیں آگاہ کریں۔

"پانچواں اعتراض" کے زیرِ عنوان مولانا نے پھر وہی تعددِ عمل کے مقصود ہونے نہ ہونے کی بات چھیڑ دی ہے۔ خدا ان پر اور ہم سب پر رحم کرے۔ یہاں انھوں نے ایک اور غضب ڈھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"قرآن و حدیث میں واضح طور سے فرما دیا گیا کہ تین طلاق ایک ساتھ نہ دی جائے بلکہ الگ الگ طہر میں دی جائے۔" (صفحہ ۲۰۳)

شاید قرآن کے وہ پارے انھیں دستیاب ہو گئے ہیں

حضرت شیعہ صاحبان کی دانست میں غائب ہو گئے تھے۔ ان پاروں میں ایسی کوئی صراحت ہو تو ہو ورنہ موجودہ تیس پارو والے قرآن میں ایسی کوئی آیت ہمیں نہیں ملی جس سے مولانا کے دعوے کی تصدیق ہو سکے۔ خود مولانا آگے دوؔ آیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ اور دوسری یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ ان کا ذکر کر کے وہ فرماتے ہیں کہ ان میں "تفریق ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے" (صفحہ ۲۰۴)

چلئے کچھ دیر کو ان کا ارشاد مان لیا گیا مگر کیا اشارہ اور صراحت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ پہلے وہ دعوے کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ مضمون واضح طور پر بیان ہوا مگر چند سطر بعد وہ محض اشارے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ سلامتیٔ فکر کی علامت ہے؟

بہرحال زبان تو کوئی کسی کی بند نہیں کر سکتا۔ پورا مواد اہلِ علم کے سامنے آچکا ہے وہ خود ہی فیصلہ کر لیں گے کہ بات کس کی معقول ہے اور کس کی نامعقول۔

"چھٹا اعتراض" کے تحت شکر ہے کہ مولانا نے اپنی غلطی تسلیم فرمالی۔ ہم نے کہا تھا کہ آپ نے روح المعانی کا مطلب نہیں سمجھا اور اس کی عبارت سے غلط مفہوم اخذ کر لیا مولٰنا فرماتے ہیں کہ "اس میں واقعی غلطی ہوئی ہے۔" (صفحہ ۲۰۴)

اس اعترافِ خطا سے ہمارے دل میں مولٰنا کی عزت بڑھی اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کچھ مختلف طبیعت رکھتے ہیں۔ ساتھیوں سے مراد وہ حضرات ہیں جو اس بحث میں اجماع کے حریف بنے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہمیں کوئی بھی نظر نہیں آتا جس میں اپنے قصور کے اعتراف کی اخلاقی جرأت ہو۔ یہ زندگی بھر کبھی کسی مرحلے میں یہ نہ کہیں گے کہ ہم سے فلاں معاملے میں بے شک چوک ہو گئی۔

ویسے اعترافِ قصور کے بعد مولانا نے پھر ایک مغالطہ پیش کیا ہے جو بے محل ہے۔ ہمارا استدلال یہ ہے ہی نہیں چونکہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقوں کے نفاذ کا اعلان کیا لہٰذا مسئلہ اجماعی بن گیا پھر خواہ اس مفروضے کی بنیاد پر

مزید عمارت اٹھانا چہ معنی دارد؟

"ساتواں اعتراض" کے تحت مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں معقولیت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے طحاوی سے ابن عباس کا قول نقل کیا مگر ادھورا۔ اس کا وہ ٹکڑا چھوڑ دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تین اکٹھی طلاقیں باوجود گناہ ہونے کے پڑ ضرور جاتی ہیں۔ مولانا کا جواب یہ ہے کہ میرا مدعا اس جگہ صرف یہ واضح کرنا تھا کہ تین اکٹھی طلاقیں دینا معصیت ہے لہٰذا حدیث کا اتنا ہی ٹکڑا نقل کیا جس سے یہ مدعا پورا ہو جاتا تھا۔ یہ جواب درست اور شافی ہے لہٰذا ہمارا اعتراض واپس۔ مگر اس واپسی کا اثر نفسِ بحث پر کچھ بھی نہیں پڑتا۔ جن بیسیوں ستونوں پر ہم نے استدلال کی چھت قائم کی ہے ان میں سے ابھی تک تو کوئی ستون اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکا ہے۔ انشاء اللہ جنبش کرے گا بھی نہیں۔ کیونکہ امت کے اساطین کا دامنِ عزت اللہ داغ دار نہیں ہونے دے گا۔

مولانا محفوظ الرحمان کے بعد جناب شمس پیرزادہ نے ہماری مزاج پرسی کی ہے۔ ان کی پہلی گرفت تو وہی ہے جس کے بارے میں ہم تجلی نومبر ۱۹۷۲ء کے "احوالِ واقعی" میں "ہماری ایک بھول" کا عنوان دے کر معاملہ رفع دفع کر چکے ہیں۔ ان سے حوالہ دینے میں سہو ہوا ہم سے احتساب میں۔ قصہ برابر سرابر۔

(۲) دوسری گرفت طلاقِ بتّہ کی بحث سے متعلق ہے۔ ہم نے کہا تھا:۔

> "ابن حجر کو آپ نیک فرشتہ یا پیغمبر نہ سمجھیں ان سے استدلال کی جوہری نوعیت سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد ہم نے بتایا تھا کہ ابن حجر سے کیا چوک ہوئی کیوں چوک ہوئی۔ شمس صاحب لکھتے ہیں:۔

> "سوال یہ ہے کہ اگر ابن حجر سے غلطی ہو سکتی ہے تو ان فقہاء سے کیوں نہیں ہو سکتی جن کی تقلید کو وہ

دانتوں سے پکڑنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

یہ ایک قسم کا غلط بحث بھی ہے اور کج بحثی بھی۔ فرداً فرداً انبیاء کے سوا ہر شخص ارتکابِ خطا کی پوزیشن میں ہے۔ ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ تو کیا ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ تک کو معصوم عن الخطاء نہیں مانا گیا۔ اپنی منفرد حیثیت میں ہر ایک سے بھول، چوک، خطائے اجتہادی اور قصورِ فہم ممکن ہے، مگر وہ لوگ بھی تو آخر معصوم نہیں ہیں جنھیں ہم تقلید کا مشورہ دیتے ہیں۔ خطا ان سے بھی ممکن ہے لہذا کیوں نہ زیادہ اہل لوگوں پر اعتماد کیا جائے کہ جن سے خطاء کا صدور ہماری نسبت کم متوقع ہے۔

بہر حال تقلید کی بحث طلاقِ ثلٰث کی بحث سے الگ ہے۔ یہاں کسی ایک یا دو چار فقہاء کی بات نہیں ہزاروں فقہاء کے اتفاقِ رائے کی بات ہے۔ احادیث اور آثارِ صحابہؓ کی بات ہے۔ صحابہؓ کا کسی رائے پر متفق ہو جانا صورتِ حال کو بدل ڈالتا ہے۔ صحت مند ضمیر کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ صحابہؓ کسی دینی مسئلے میں ایک غلط اور خلافِ قرآن رائے پر کلی اتفاق کر بیٹھے ہوں۔ کیا ہمارے شمس صاحب یہ بات نہیں جانتے کہ وہ تمام احادیث جو تواتر کے درجے تک نہ پہنچی ہوں قطعی اور بنیادِ ایمان نہیں مانی جاتیں مگر متواتر احادیث قطعیت حاصل کر لیتی ہیں اور ان کا منکر خارج از دین ہوتا ہے تو اسی طرح صحابہؓ کی متفقہ آراء کی حیثیت بالیقین ان کی منفرد آراء سے جدا ہے۔

آگے اسی نمبر کے ذیل میں شمس صاحب نے مشکوٰۃ اور ترمذی کی دو عبارتوں سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ طلاقِ بتہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے بارے میں کوئی بات واضح نہیں۔ اس کی کوئی شکل متعین نہیں۔ اس کے بعد ان کا ارشاد ہے:-

"اس کے بعد مدیر تجلی کے اس دعوے کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے کہ طلاقِ بتہ کا محاورہ تین طلاقوں کیلئے مختص"

نوٹ فرما لیجئے اس فقرے میں ہماری طرف کیا بات منسوب کی گئی ہے۔ کچھ آگے انھوں نے کہا:-

"درحقیقت طلاقِ بتہ کے معنی طلاق بائن کے ہیں چنانچہ لغتِ حدیث کی مشہور کتاب نہایہ ابنِ اثیر نے مبتوتہ کے معنی ہی المطلقة طلاقاً بائناً بیان کئے ہیں یعنی وہ مطلقہ جسے طلاقِ بائن دی گئی ہو۔"

اس سے بھی ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مدیر تجلی نے طلاقِ بتہ کے معنی طلاق بائن تسلیم نہیں کئے ہیں بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ طلاقِ بتہ بس تین ہی طلاقوں کو کہتے ہیں۔ اسی لئے شمس صاحب کو لغت کھول کر دکھلانا پڑا کہ طلاقِ بتہ کا مطلب ہے، طلاق بائن اور پھر مزید تشریح یہ کرنی پڑی کہ:-

"اس کا مطلب ہر وہ طلاق ہے جس میں رجوع کا حق باقی نہیں رہتا اور نکاح ٹوٹ جاتا ہے ....
.... اس کو طلاقِ بدعی کے لئے خاص سمجھنا صحیح نہیں۔"

طلاقِ بدعی سے موصوف کی مراد ہے تین اکھٹی طلاقیں۔ یہاں بھی گویا وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ نالائق مدیر تجلی نے طلاقِ بتہ کے واحد معنی "تین طلاق" لے لئے ہیں اور تین طلاقوں کے علاوہ کسی بھی قسم کی بائن طلاق کو اس کا مصداق ماننے کا روادار نہیں ہے۔

اب آیئے تجلی طلاق نمبر کی طرف جو برادرم شمس صاحب کا مرکزِ نگاہ بنا ہوا ہے۔ ص۲۲ پر لفظِ بتہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا تھا:-

"عربی میں ایک لفظ آتا ہے بتہ جس کے متعدد معنی میں سے ایک معنی ہیں کاٹ ڈالنا اس پر الف لام داخل کر کے جب طلاقُ البتہ کہتے ہیں تو اس کا مفہوم ہوتا ہے وہ طلاق جو رشتہ نکاح کو کاٹ ڈالنے والی ہو۔"

کیا شمس صاحب کے الزام کی واضح تردید اس عبارت سے نہیں ہوتی ہے؟ طلاق بائن کا مطلب خود موصوف نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ طلاق جس میں رجوع کا حق باقی نہ رہے اور نکاح ٹوٹ جائے اور یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ بتہ کے معنی ان کی نقل کے مطابق "بائن" کے ہیں۔ پھر ہم نے اس کے خلاف

کیا بات کہدی ہے؟

آگے ہم نے لکھا تھا۔

"ایک اور بھی اصطلاح تھی طلاقِ بتہ۔ اس سے مراد وہی طلاق ہوتی تھی جس سے رجوع ممکن نہ ہو۔ گویا اس نے رشتۂ نکاح کو کاٹ ڈالا۔ اس طرح طلاقِ بائن اور طلاقِ بتہ ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔" (صفحہ ۲۲)

اس کے بعد ہم نے صفحہ ۲۶ پر حدیثِ رکانہ کی بحث میں مزید تصریح کی ہے کہ لفظ بتہ چونکہ طلاقِ مغلظہ (تین طلاق) کے لئے وضع نہیں ہوا اس لئے جب کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے طلاقِ بتہ دی تو عین ممکن ہے کہ اس کی نیت تین طلاقوں کی نہ ہو صرف طلاقِ بائن کی ہو یا صرف ایک طلاق کی ہو۔

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ لفظِ بتہ کی لغوی حیثیت کے بارے میں ہم نے بھی ٹھیک وہی کہا ہے جو شمس صاحب کہہ رہے ہیں۔ البتہ آگے چل کر ہم نے قوی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ عموماً تین طلاقوں کے لئے استعمال ہونے لگا تھا۔ تو اس کی تردید اسی وقت ہو سکتی ہے جب شمس صاحب ان شہادتوں کو ناقابلِ اعتبار ثابت کر دیں۔ اگرچہ ایسا ثابت کر دینے کی صورت میں بھی نفسِ بحث پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اہلِ انصاف اندازہ کریں کہ اس طرح کی بے تہہ بلکہ خلافِ حقیقت گرفتیں آخر اضاعتِ وقت کے سوا اور کیا حاصل رکھتی ہیں۔

(۳) شمس صاحب نے سورۂ طلاق کی ایک آیت کا مفہوم و منشاء اپنے مقالہ میں بیان کیا تھا۔ ہم نے تقریباً ڈھائی صفحات (طلاق نمبر تجلی صفحہ ۱۳۵ تا صفحہ ۱۳۸) میں ثابت کیا کہ موصوف آیت کا مدعا سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب اسکی تردید میں وہ مؤطا امام مالکؒ سے ایک روایت نقل کر کے یہ دکھلاتے ہیں کہ امام مالکؒ چاہے تین اکھٹی طلاقوں کو تین ہی مانتے ہوں مگر یہ بہرحال انھوں نے بھی تسلیم کیا کہ اس آیت کا وہی مطلب ہے جو میں نے (شمس صاحب نے) لیا ہے۔

اس کے جواب میں پہلا سوال تو ہم شمس صاحب سے یہ کریں گے کہ آنجناب بڑے زور سے تقلید پر تبرا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دلائل ہی کی بنیاد پر کوئی بات مانی جائے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ امام مالکؒ کے مجرد ایک قول کو آپ نے حجت قرار دیدیا حالانکہ عام حالات میں آپ ابوحنیفہؒ یا مالکؒ یا شافعیؒ کسی کے بھی قول کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ کیا یہ روش تقلید کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ جب امام مالکؒ کوئی رائے آپ کے مفید مطلب ظاہر کر دیں تو وہ نبی ہو جاتے ہیں!

دوسری بات یہ کہیں گے کہ کسی آیت سے اگر یہ ہدایت نکل بھی رہی ہو کہ تین طلاقیں تین طہروں میں دو تو ہم احناف آخر کب کہتے ہیں کہ اس ہدایت کی خلاف ورزی گناہ نہیں ہے۔ گناہ یقیناً ہے لیکن شوہر صاحب ارتکابِ گناہ کر ہی بیٹھے ہیں تو اب آخر کس اصولِ انصاف سے انھیں یہ رعایت دی جا سکتی ہے کہ مطلقہ کے جسم پر پھر سے متصرف ہو جائیں۔ بیوی بھی گئی۔ گناہگار بھی بنے۔ یہی کھلا انصاف ہے۔ آپ فعلِ گناہ پر انعام دینے کا اصرار کریں تو اسے انصاف کون کہے گا۔

(۴) اس نمبر کے تحت شمس صاحب ہمارے معارضے کا تو کوئی جواب نہ دے سکے البتہ خفگی کے انداز میں یہ فرمایا کہ اسی طرح کی فقہی موشگافیوں نے پوری شریعت کو پیچیدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ان فرضی باتوں کا واقعات سے کیا تعلق ہے"

کاش وہ احساس فرماتے کہ قانون تو ہمیشہ ممکن مفروضات ہی کو سامنے رکھ کر بنا کرتا ہے۔ ہم نے بطور معارضہ جو صورت پیش کی تھی وہ یہ تھی:۔

"زید نے یکم جون ۷۸ء کی صبح چھ بجے بیوی کو ایک طلاق دی۔ دوسری دوپہر کو بارہ بجے دی تیسری شام کو ۷ بجے دی۔ کیا یہ تین مرتبہ میں تین طلاقیں نہیں ہوئیں؟"

ہمارا منشا یہ تھا کہ الطلاق مرتان کا مطلب اگر یہی متعین کر لیا جائے کہ طلاق دو بار ہے تب بھی اس سے فریقِ ثانی کے اس خیال کی دلیل فراہم نہیں ہوتی کہ ہر دو طلاقوں میں ایک ماہ کا فصل ہونا چاہیے ورنہ دو طلاقیں نہیں پڑیں گی۔

اہلِ نظر بتائیں کیا جو مثال اوپر کی عبارت میں ہم نے فرض کی وہ باعتبارِ وقوع کے ناممکن ہے؟ نیز یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ایک ہی دن کی قید اس میں اتفاقی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک طلاق آج دے۔ دوسری چار دن بعد تیسری آٹھ دن بعد تب بھی ہمارا معارضہ جوں کا توں قائم رہتا ہے کیونکہ فریقِ ثانی کا موقف یہ ہے کہ دوسری طلاق اس وقت پڑے گی جب یہ پہلی طلاق کے ایک ماہ بعد دی جائے اور تیسری اس وقت پڑے گی جب اس میں اور دوسری طلاق میں ایک ماہ کا فصل ہو۔ تو کیا اس طرح کی امثلہ محض مفروضات کہلائیں گی؟ شمس صاحب کا ارشاد ہے:-

"راقم الحروف کے پاس آج تک جتنے بھی استفتے تین طلاق کے سلسلے میں آئے ہیں ان میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں تھا کہ کسی نے صبح پہلی، دوپہر میں دوسری اور شام میں تیسری طلاق دی ہو اور نہ اس قسم کا کوئی واقعہ کبھی سننے ہی میں آیا اس لئے تین طلاق کے مسئلہ کو فرضی باتوں میں الجھانے یا بنی اسرائیل کی گائے ثابت کر دکھانے کے بجائے واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینا چاہئے۔" (صفحہ ۲۱۸)

ہمیں نہیں معلوم کہ شمس صاحب باقاعدہ عالم ہیں یا نہیں اور انھیں عرفِ عام میں مولوی کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بہرحال معلوم ہے کہ وہ "مفتی" نہیں سمجھے جاتے۔ پھر کون ان کے پاس استفتے بھیجے گا اور کیوں بھیجے گا۔ مان لیا کہ کچھ استفتے ان کے پاس آتے بھی ہوں لیکن یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ ان معدودے چند استفتوں پر انھوں نے پوری دنیا کے اسلامی معاشرے کو قیاس کر لیا۔

حالانکہ اگر ریسرچ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تین پہروں میں تین طلاقیں دینے والے تو اب نایاب ہیں۔ عموماً یا تو ایک ساتھ تین دی جاتی ہیں یا چند دن کے فصل کے ساتھ۔ بہرحال ہمارے دوست کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قانون ہمیشہ ممکن مفروضات سے متعلق ہوا کرتا ہے۔ جو شخص دین کے اطلاق و انطباق کی باریکیوں کو فقہی موشگافیاں قرار دے کر ناک بھوں چڑھاتا ہو اسے بھولے سے بھی کسی قانونی بحث میں نہ پڑنا چاہئے۔ اسے اللہ نے قانونی مباحث میں این و آں کرنے کے لئے بنایا ہی نہیں۔

اور ہمارے دوست نے ٹھیک اسی جگہ خود جو فقہی موشگافیاں کی ہیں ان کا انھیں کوئی احساس نہیں۔ مثلاً اسی صفحے میں انھوں نے آیتِ قرآنی کو اپنا مؤید ثابت کرنے کے لئے فائے تعقیب اور عبارۃ النص اور اشارۃ النص جیسے نکات پر زورِ قلم صرف کیا۔ مزید برآں آیت کے متضمنات سپردِ خامہ کئے۔ یہ سب کچھ گویا فقہی موشگافی سے الگ کوئی چیز ہے۔

آگے اسی نمبر کے تحت ہمارے دوست نے ہماری ایک عبارت پیش کر کے قارئین کو یہ بشارت دی ہے کہ مدیر تجلی کو جب اپنی بات منوانے کے لئے دلیل نہیں ملی تو وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ بے اختیار ہنسی آگئی اس بھولے پن پر! بھولا پن یہ کہ جھنجلاہٹ تو خود ہمارے دوست کو اس لئے ہو رہی ہے کہ مدیر تجلی فقہی موشگافیاں کرتا ہے مگر اس جھنجلاہٹ کو وہ ہمارے اعمال نامے میں درج کئے دے رہے ہیں۔

ہم نے طلاقِ ثلٰث کی بحث تین شماروں میں کی ہے۔ اجماعی مسلک کے احقاق و اثبات میں ایجابی و سلبی ہر طرح کے دلائل کا اتنا بڑا انبار لگا دیا ہے کہ کم سے کم اردو میں ایسا انبار شاید کہیں نہ مل سکے پھر بھی ہمارے دوست طعنہ زن ہیں کہ مدیر تجلی کو دلیل نہیں ملی!

ایک مبارک سنئے:-

"زاویۂ نظر کی یہ تنگی اختلافات کی خلیج کو ہمیشہ وسیع ہی کرتی رہی ہے۔ کاش ہمارے فقیہانِ حرم بحث و تحقیق کے آداب سے آشنا ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی بات کو ہرگز حرفِ آخر قرار نہ دیتے بلکہ نصوص کی تعبیر و اجتہاد کے معاملے میں آراء کا جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کے لئے گنجائش تسلیم کر لیتے۔" (صفحہ ۲۱۹)

نہیں معلوم کہ "فقیہانِ حرم" سے کیا مراد ہے۔ ہر شخص دیکھ

چکا اور خود فریقِ ثانی بھی معترف ہے کہ چاروں ائمہ تین طلاقوں کے وقوع پر متفق ہیں۔ تو گویا ہمارے دوست یہ فرما رہے ہیں کہ چاروں ائمہ اور ان کے کروڑوں مقلدین و متبعین بحث و تحقیق کے آداب سے ناآشنا ہیں۔ تنگ نظر ہیں یکم سواد ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ چاروں مکاتبِ فکر کے فقہاء میں ہزاروں مسائل میں اختلاف ہے اور سارے فقہاء اس اختلاف کی گنجائش کو تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسرے کو برحق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نہیں کہتے کہ ہماری رائے وحی ہے اور اس کا مخالف گمراہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ نہ تنگ نظر ہیں نہ بے تمیز۔ البتہ یہ قصور ان کا ضرور ہے کہ وہ اجماع کو حجت مانتے ہیں اور یہ جائز نہیں سمجھتے کہ متفق علیہ مسائل میں روز روز اختلافی شوشے پیدا کئے جائیں۔ ہمارے دوست نے جو عبارت تحریر فرمائی اگر یہی عبارت غلام احمد پرویز یا کوئی اور منکرِ حدیث تحریر کر دے تو کیا کوئی انصاف پسند یہ کہہ سکتا ہے کہ انکارِ حدیث کو بھی گمراہی نہ کہنا چاہئیے بلکہ اسکی گنجائش تسلیم ہی کر لینی چاہیئے۔

علاوہ ازیں تین طلاقوں کے مسئلے میں غیر مقلدین کا جو بھی موقف ہے اس پر کسی بڑے جارحانہ حملے کا ارتکاب مقلدین کی طرف سے نہیں ہوا بلکہ آپ حضرات ہی نے احمد آباد میں ایک سیمینار منعقد کر کے مقلدین کے اجماعی مسلک پر دھاوا بولا ہے۔ مقالات مرتب کئے ہیں۔ قرآن و حدیث کی غلط تعبیرات پھیلائی ہیں۔ اس کے جواب میں اگر ہم جیسا کوئی مقلد آپ کی علمی و تحقیقی اغلاط کا گوشوارہ پیش کرتا ہے تو اسے آپ تنگ نظری اور بے ادبی اور موشگافی کا عنوان دیتے ہیں۔

دہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

محترم دوست کی جھنجلاہٹ کا نمونہ:-

"مدیر تجلّی نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے ہر بات محتاجِ ثبوت ہے۔ بتایا جائے قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ جلد بازی کی صورت میں رجوع کا حق ساقط ہو گا یا زمانِ عدت میں رجوع کا استحقاق سلب ہو جائے گا۔" (صہ ۲۲)

اگر ہمارے دوست پر جھنجلاہٹ طاری نہ ہو جاتی تو یہ بات وہ فراموش نہ کر دیتے کہ کلام کے لازمی مدلولات و متضمنات بھی عینِ کلام ہوا کرتے ہیں۔ جیسے دہلی میں رہنے والے کسی شخص کے بارے میں یوں کہا جائے کہ وہ حاجی ہے تو لازماً اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکا ہے۔ اس نے حجاز کا پانی پیا ہے۔ وہاں کا کھانا کھایا ہے۔ اس طرح کے امور اگرچہ لفظاً بیان نہیں ہوئے مگر "حاجی" کے لازمی متضمنات میں شامل یقیناً ہیں۔

اب دیکھئے قرآن کہتا ہے کہ طلاقیں دو ہیں جن کے بعد رجوع ممکن ہے۔ تیسری دیدی تو حقِ رجوع ساقط ہوا۔ اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ جلد بازی کر کے آپ دفعتاً تین طلاقیں دیدیں تو حقِ رجوع ساقط ہو جائے۔ بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ الطلاق مرتان کا مطلب ہے دو بار طلاق۔ تو اگرچہ ہم بہ دلائل ثابت کر چکے ہیں کہ اس مطلب کی قطعیت کا دعویٰ غلط ہے تاہم اسے صحیح مان کر بھی آپ کے مسلک کا جواز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دو چار منٹ کے فصل سے طلاقیں دینا بھی متعدد بار طلاقیں دینا ہے لہذا آج اور کل اور پرسوں آپ نے ایک ایک طلاق دیدی تو حقِ رجوع عین قرآن کی رو سے ساقط ہو گیا۔

ایک اور رُخ سے دیکھئے۔ زید نے آج بیوی کو بحالتِ طُہر ایک طلاق دی۔ ایک ماہ بعد دوسرے طُہر میں دوسری دی تیسرے ماہ تیسرے طُہر میں تیسری دی۔ آنجناب بھی یہ مانتے ہیں کہ تیسری دیتے ہی حقِ رجوع ساقط ہو گیا اور مانتے اسلئے ہیں کہ قرآن سے یہی ثابت ہے۔ مگر کیا عدت ابھی باقی نہیں ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ باقی ہے۔ تیسری طلاق تیسرے مہینے کے آغاز میں دی گئی ہے لہذا ایک مہینہ عدت کا باقی ہے۔ تو کیا خود آپ کے نزدیک بھی قرآن ہی سے یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ زمانِ عدت میں رجوع کا استحقاق سلب ہو جاتا ہے۔؟

بہت ہی محترم دوست! ہم مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ

(اب) آئندہ کبھی مباحثوں میں نہ پڑیں۔ اس الجھے ہوئے شک مشغلے کو ہم جیسے بنیاد اقوں کے لئے ہی چھوڑ دیں۔

(۵) اس نمبر کے ذیل میں فرماتے ہیں :-

"جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ان میں سے بیشتر حدیثوں پر میں اپنے مقالے میں گفتگو کر چکا ہوں کہ تین کے وقوع پر کوئی بھی حدیث ایسی موجود نہیں ہے جو صحیح بھی ہو اور صریح بھی۔ رہی دار قطنی وغیرہ کی حدیثیں تو اولاً اتنے اہم مسئلہ میں دار قطنی جیسی تیسرے درجے کی کتاب کسی حکم کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ ثانیاً اس قسم کی حدیثوں کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے۔" (صفحہ ۲۱۲)

کیا لکھا ہے۔ اسے ہم ان سطور کا تجزیہ کرنے کے بعد نقل کریں گے۔ ان سطور کی بے مائگی کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو تجلی کا طلاق نمبر شروع سے آخر تک پڑھ چکے۔ اس نمبر کے بعد اگلے تجلی میں ہم نے آٹھ احادیث اور ۳۰ صحابہ رضی کے فتاویٰ یکجا کر دئیے۔ لیکن ہمارے دوست ان سب کو چٹکیوں میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ ان کی مذکورہ عبارت پڑھ کر لوگ سمجھیں گے کہ مدیر تجلی نے بس دار قطنی جیسی کتاب سے احادیث نقل کی ہیں۔ حالانکہ جن کتابوں کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں :-

دار قطنی۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ حاکم۔ ابن حبان۔ بیہقی۔ طبرانی۔ مصنف ابن ابی شیبہ۔ مصنف عبدالرزاق۔ فتح الباری۔ تفہیم القرآن۔ بخاری۔ مسلم۔

علاوہ ازیں دو پہلو قابل لحاظ ہیں۔ اول یہ کہ سنن دار قطنی اتنی گئی گذری کتاب نہیں ہے جتنی موصوف کے بیان سے ترشح ہے۔ امام دار قطنی کے بارے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین میں تشریح کی ہے کہ وہ حافظ ابن مندہ کا اور تمام رازی اور حاکم اور ابو نعیم جیسے افاضل کے استاد ہیں۔ علم نحو و فن تجوید میں کامل مہارت رکھتے تھے فن معرفت علل حدیث اور اسماء الرجال میں بے نظیر اور اپنے وقت کے یگانہ تھے۔ نیز مذاہب فقہاء سے بھی باخبر تھے۔

دوئم یہ کہ اہل فن نے کتابوں کے درجات کی حیثیت مجموعی تشخص کئے ہیں۔ یعنی درجۂ اوّل کی کتابیں من حیث المجموع درجۂ ثانی کی کتابوں سے بڑھ کر ہیں اور درجۂ ثانی کی درجۂ ثالث سے۔ اس درجہ بندی کا مطلب یہ تو کسی صاحب فن نے نہیں لیا کہ تیسرے درجے کی کتاب میں درج ہر حدیث صحت کے اعتبار سے تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ بے شمار ایسی حدیثیں ہیں جو تیسرے درجے کی کتابوں میں مندرج ہونے کے باوجود اعلیٰ درجۂ صحت رکھتی ہیں لہٰذا کسی خاص حدیث کو محض اس لئے گھٹیا قرار دینا کہ وہ تیسرے درجے کی کتاب میں آئی ہے اہل فن کے نزدیک قابل التفات نہیں ہے۔ حدیث کے ضعف و قوت کا مدار تو اصلاً اس کی سند پر ہے۔ سند اگر باعتبار قواعد مضبوط ہو تو اسے درج خواہ کہیں کر دیا جائے اسکی صحت و قوت میں فرق نہیں آئے گا۔

اب ابن تیمیہ کے منقولہ ارشاد کو پڑھ لیجئے :-

"کسی نے بھی نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اسناد کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ نقل نہیں کیا ہے کہ کسی شخص نے بیک کلمہ تین طلاقیں دی ہوں اور آپ نے ان تین طلاقوں کو لازم کر دیا ہو۔ بلکہ اس مسئلے میں جو حدیثیں بھی مروی ہیں وہ باتفاق اہل علم جھوٹی ہیں ہاں احادیث صحیحہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے متفرق طور سے تین طلاقیں دی تھیں۔"

ابن تیمیہ کے علم و فضل کو خراج تحسین ادا کرنے والے تمام لوگ ۔۔۔ جن میں ہم بھی شامل ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ بہت پر جوش آدمی تھے اور جوش کے عالم میں بعض اوقات احتیاط کی حدود سے کچھ آگے بھی بڑھ جاتے تھے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ بہر حال شمس صاحب جیسے غیر مقلد کو تو زیب نہیں دیتا کہ مجرد ابن تیمیہ کی رائے کو دلیل بنائیں۔ خیر یہ بھی گوارا۔ ہم شمس صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ طلاق ثلث کی بحث میں مدعی کون ہے؟

ایک شخص کہہ رہا ہے کہ تین کے معنی تین ہوتے ہیں
دوسرا شخص کہہ رہا ہے کہ تین کے معنی ایک ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلا شخص ایک معلوم و مسلم واقعہ بیان کر رہا ہے جسے دعوے کی حیثیت کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ ہاں دوسرا شخص ایک دعویٰ لے کر اٹھا ہے جو مسلمات کے خلاف ہے۔
لہٰذا قاعدے کے مطابق دلیل بھی مدعی ہی کے ذمہ ہوئی۔
اب اگر یہ مدعی شخص اول سے مطالبہ کرنے لگے کہ کوئی ایسی صریح حدیث دکھلاؤ جس میں تین کے معنی تین بیان ہوئے ہوں تو کون اس مطالبے کو بے جا اور بے محل نہیں کہے گا۔
اصل ذمہ داری تو خود اس مدعی کی ہے کہ ایسی کوئی حدیث دکھلائے جس میں صاف طور پر کہا گیا ہو کہ تین طلاقوں کے معنی ایک طلاق ہوتے ہیں۔
ابن تیمیہ باوجود مدعی ہونے کے ایسی کوئی صریح و صحیح حدیث پیش نہ کر سکے جو ان کے مدعیانہ موقف کی تائید کر تی مگر اُلٹا اعتراض ان لوگوں پر کرنے لگے جو مدعی نہیں ہیں بلکہ ایک سیدھا سادا امر واقعہ بیان کرنیوالے ہیں۔ جب قرآن وحدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں کہ تین اکٹھی طلاقیں تین نہیں ہوتیں ایک ہوتی ہیں تو المطلق یجری علیٰ اطلاقہٖ کے مطابق بلا شرط وقید یا ننا پڑے گا کہ تین طلاقیں جس طرح بھی دی جائیں پڑ جائیں گی۔
مطلق کو مقید اور عام کو خاص آپ حضرات بنا رہے ہیں اور دلیل کا مطالبہ ہم سے ہے۔ یا للعجب!
نیز یہ کہہ دینا بھی عجیب ہی ہے کہ اس باب کی ساری حدیثیں باتفاق اہل علم جھوٹی ہیں۔ بڑے بڑے اہل علم کی تفصیلی شہادتیں تو ہم پیش کر چکے۔ ہر شہادت حوالے کے ساتھ ہے۔ تاریخ کو محض یوں ہی تو رد نہیں کیا جا سکتا۔
شمس صاحب چند احادیث کے بارے میں حافظ ابن قیم کا کچھ نقد پیش کرتے ہیں۔ ہم طلاق نمبر میں شرح وبسط سے بتا چکے ہیں کہ اس طرح کا جزئی نقد کافی نہیں ہوا کرتا۔
ہم نے صفحہ ۲۴ پر "راوی شعیب بن زریق" کا مستقل عنوان قائم کر کے صفحہ ۵۶ تک فنی دلائل دیئے ہیں کہ اس راوی کو قابلِ اعتبار کہنا درست نہیں مگر افسوس کہ طلاق نمبر پڑھ کر بھی شمس صاحب ابن قیم کی تقلید جامد میں یہ کہے چلے جا رہے ہیں کہ شعیب راوی ضعیف ہیں۔ اس دھاندلی کا کوئی علاج نہیں
رہا ابن قیم کا یہ کہنا کہ حدیثوں میں جہاں تین طلاق کا ذکر آیا ہے وہاں متفرق تین طلاقیں مراد ہیں تو یہ بھی دعویٰ بے دلیل ہے۔ (جاری)

محمد قطب شہید

روحِ انتخاب

صدرِ اول کے مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ یہی ایمان تھا آج کے مسلمان کی نجات کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے بحیثیت مسلمان آج ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں وہ صدرِ اول کے مسلمانوں کی حالت سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے وہ مٹھی بھر لوگ تھے مگر اس وقت کی دو سب سے طاقتور حکومتوں روم اور ایران کے خلاف برسرِپیکار تھے جو افرادی قوت، مادی سر و سامان، دولت، فنونِ حرب و ضرب اور سیاسی طاقت ہر لحاظ سے ان پر فوقیت رکھتی تھیں مگر اس کے باوجود پچاس برس سے کم عرصہ میں انہوں نے قیصر و کسریٰ دونوں کا غرور خاک میں ملا دیا اور بحیرۂ احمر سے لیکر بحیرۂ روم تک ان کے سارے علاقے پر قبضہ کرلیا! ان کی یہ کامیابی تاریخ کا ایک عظیم معجزہ تھا

تاریخ کی کسی مادی تشریح و تعبیر کے ذریعہ اس عظیم تاریخی معجزے کی کنہ کو پہنچا ہی نہیں جا سکتا! اسے صرف ایمان اور یقین کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے! یہی ایمانی جذبہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان مجاہدین میدانِ جنگ میں دشمن کی فوج کو دیکھتے تو پکار اٹھتے تھے۔

ليس بيني وبين الجنة	میرے اور جنت کے درمیان صرف اتنی
	سی بات حائل ہے کہ میں جا کر اس آدمی
الا ان اقتل	(کافر) کو ہلاک کر دوں یا خود اس کے
هذا الرجل	ہاتھوں مارا جاؤں۔
او يقتلني	

اور پھر یہ کہتے ہوئے وہ میدانِ کارزار کی جانب ایسے جذب و شوق سے لپکتے جیسے کوئی دولہا حجلۂ عروسی میں داخل ہوتا ہے۔ یہی ایمان کا کرشمہ تھا کہ دشمن کو دیکھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھتے۔

هل تربصون بنا	تم ہمارے معاملہ میں دو بھلائیوں
الا احدى الحسنيين	میں سے ایک بھلائی کے منتظر
(النصر أو الشهادة)	رہو! (یعنی فتح یا شہادت)

یہ ہے وہ راہ جس پر چل کر ہم اپنے مقصود کو پا سکتے ہیں اسی راہ پر چلے بغیر کوئی دعوت کامیابی کی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ سعی و جہد، خون اور آنسوؤں کے درمیان ہو کر گزرتی ہے، اس میں قربانیاں دیئے بغیر چارہ نہیں۔

آج کی دنیا ایک طرف مادہ پرستی اور دوسری طرف معاشی کشمکش کی دوہری لعنت میں گرفتار ہے، اسلام دونوں سے نجات دلاتا ہے اور اسے ایک ایسا نظامِ حیات عطا کرتا ہے جو مادے اور روح پر محیط ہے اور دونوں کے تقاضے بیک وقت پورے کرتا ہے۔

باقی رہے ہم ——— تحریکِ اسلامی کے کارکن ——— تو عرض ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ کوئی ٹھنڈی سڑک نہیں ہے۔ صدرِ اول کے مسلمانوں کی طرح ہمیں بھی آزمائشوں، ابتلاء اور مشکلات کے کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزرنا ہے۔ تب کہیں جا کر ہم دنیا کو اسلام کی صداقت اور حقانیت پر مطمئن کر سکیں گے ✦

——— (اردو ترجمہ)

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کے پہاڑ اور تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں، ان پست فکر اور حجاب آسا لوگوں کا گروہ پیدا ہو جاتا ہے، جو غلامیوں کی زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتے، اور جنھیں ضمیر فروشی کے علاوہ کوئی دوسرا فن نہیں آتا، وہ انسان زندہ و پائندہ اسلامی علوم و معارف کو پس پشت ڈال کر ایک ایسے زدمایہ اور رکیک لٹریچر کی طرف مائل ہو جاتا ہے جس میں رکاکت فحش کلامی، کھلے ہوئے تناقض، سفید جھوٹ، لمبے چوڑے دعووں، مضحکہ خیز تاویلوں اور ایسی پیش گوئیوں کے طومار کے سوا جو سچی نہ ہوئیں کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور وہ انسان اس مقدس شہر سے جہاں وحی نازل ہوئی ہے اور جہاں ملائک اترتے ہیں، جہاں درسِ انسانیت ہے، جو پناہ گاہِ آدمیت ہے اور جس کو افق سے اس عالم کی صبح صادق نمودار ہوئی اس شہر سے رشتۂ عقیدت توڑ کر اس شہر کو مرکز عقیدت بنا تا ہے جو جاسوسی کا آشیانہ اور ملت اسلامی کے قفس کا لم کا گڑھ ہے، یہ ہے ملت قادیانی جو ہر خیر کو ایک شر سے بدلتی ہے، بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۔

قادیانی مذہب عالم اسلامی کے جسم کا وہ مادۂ فاسد ہے جو اس کے شریانوں میں بے غیرتی اور بزدلی، مغربی سامراجیوں کے حضور جبہ سائی اور کاسہ لیسی اور ان ظالم حکمرانوں کے لئے تذلل اور نیازمندی کا زہر پھیلاتا ہے جنھوں نے اللہ کی زمین کو جور و فساد سے بھر دیا، اور دنیا کے مسلمانوں کو اپنی غلامی کے شکنجے میں کس لیا ہے۔

قادیانیت وحدت کلمہ کو پارہ پارہ کر کے دنیائے اسلام کو انتشار فکر میں مبتلا کرتی ہے، اسلام کے حقیقی سرچشموں اس کے اصلی ماخذوں اور مستند بزرگوں پر اعتماد کو متزلزل کرتی ہے، امت کے شاندار ماضی، اس کے تابناک ایام اور جلیل القدر اشخاص سے امت کا رشتہ کاٹتی ہے اور نبوت کے نئے نئے دعویداروں اور طفیلیوں کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔ اسلام کی لازوال طاقت اور ابھار زندگی سے بدگمان کرتی ہے اور مسلمانوں کو ان کے مستقبل کی طرف سے مایوس کرتی ہے۔

قادیانیت مسلمانوں کا ذہن، عالمی مسائل اور اس نظام عدل کی اقامت سے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو پیدا فرمایا تھا، ہٹا کر لاطائل مسائل کی طرف لگاتی ہے اور اس عظیم امت کو اس یورپین قوم کی گاڑی کا قلی بنانے کی کوشش کرتی ہے جس کے ایماء سے یہ پیدا ہوئی اور جس کی حفاظت میں یہ پلی۔

افسوس قادیانیت نے مرزا غلام احمد صاحب کو نبوت کا تاج پہنا کر انسانیت کو اتنا ہی سرنگوں کر دیا جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت نے اسے سربلند کیا تھا۔ قادیانیت نے پوری انسانیت کی تذلیل کی ہے، اس کی جبین شرافت پر داغ لگایا ہے، اس لئے اس کا وجود ایک ایسے گناہ کا وجود ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا، اور ایک ایسے جرم کا وجود ہے جس کو تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

قادیانیت کا مسئلہ کسی ایک ملک یا حکومت کا مسئلہ نہیں ہے، یہ پوری دنیائے اسلام کا مسئلہ ہے، یہ عقیدۂ اسلامی کا سوال ہے، عزتِ رسول کا سوال ہے! شرفِ انسانیت کا سوال ہے! ——— اور اس کرۂ ارض میں ایک ذرۂ خیر نہیں، اگر یہ عقیدہ مٹ جاتا ہے، اگر اس عزت کو ہاتھ لگایا جاتا ہے، اور اگر اس شرف کو داغدار کیا جاتا ہے!!

یہ چند ٹھوس حقائق ہیں، لیکن جو لوگ واقعات سے دور اور اوہام و خیالات ہی کی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں اور حقیقتوں کے بارے میں بھی اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کی نظر میں دین و عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں! اور جو آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں، ان کو مطمئن کرنے کے لئے میرے پاس کوئی زبان یا قلم نہیں۔

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

(ترجمہ از عربی بقلم مولانا عتیق الرحمن سنبھلی)

جلے کا افریت نے کتنی خون بھی کئے ہیں۔"

"توبہ خدا نہ کرے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"وہ آپ کو ڈرا ہی رہے ہوں گے۔ اللہ نہ کرے تو آپ سے کر تھوڑی چڑھیں گے۔"

"میرے ہاتھ پیروں میں اب پہلا سا کس نہیں رہا ہے جانِ حیات! فرض کرو اندھیرے اُجالے میں انھوں نے گردن دبوچ ہی لی۔"

"اب میں کیا بتاؤں۔ یہ مشورہ بہر حال نہ دوں گی کہ ان کا آلۂ کار بن کر آپ کسی کو لوٹیں۔"

"میں کہاں لوٹوں گا۔ میں تو صرف کمیشن ایجنٹ ہوں گا۔ پچیس فیصدی۔"

"چولھے میں گیا ایسا کمیشن۔ مجھے اُلو بنا رہے ہیں۔"

"اُلو تو میں ہوں مغلانی بیگم۔ پتا نہیں اُلو کی شریکِ حیات کو کیا کہتے ہوں گے۔"

بہت دیر سر مارا مگر کوئی کانٹے کا مشورہ نہ اس ملانہ اپنی کھوپڑی میں طلوع ہوا۔ تھک ہار کر لیٹ ہی گیا۔ بہت دیر میں نیند آئی۔ نیند آتے ہی عالمِ رویا میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ کہنے لگے بیٹا جی کیوں چھوٹا کرتے ہو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ کان کھول کر سنو۔ نورِ الٰہی اور صوفی مہتاب صرف مٹی کے شیر ہیں۔ تم بلا تکلف سیٹھ سے سب کچھ کہہ ڈالو۔

"کہہ ڈالوں" میں نے عرض کیا "مگر وہ اعتبار نہیں کریں گے۔ حافظ پچاما بھی دستیاب نہیں ہیں کہ انھیں گواہی میں پیش کر سکوں۔"

"وہ بدبخت ایک گاؤں میں آوارگی کرتا پھر رہا ہے۔"

"گاؤں کا نام بتائیں۔"

"افسوس۔ اس کی اجازت ہمیں نہیں۔ ہوتی تو ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیتے۔ خیر یہ بتاؤ آج کل تمھارے بھیجے کو کیا ہو گیا ہے۔ گوبر کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔"

"گوبر سے بھی بدتر۔ میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں حضور والا۔ علاج آپ ہی بتائیں۔"

"انجکشن تو ہم تجویز کر دیں گے مگر لاؤ گے کہاں سے۔ بازار نقلی دواؤں سے پٹا پڑا ہے۔"

آگے کی گفتگو یاد نہیں رہی۔ ویسے صبح جب آنکھ کھلی تو طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ سر کے گول کمرے میں ہنڈے سے جل رہے تھے۔ بیوی نے چہرے کی کھلاوٹ شاید محسوس کر لی۔ مسکرا کر بولی:۔

"چشم بد دور سوتے میں ہنس رہے تھے۔ کیا کوئی مبارک خواب دیکھا ہے۔"

"حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔ اسی بات پر دو چار انڈے ابال لاؤ۔ چائے میں بھی دودھ برابر کا۔"

"جبھی آج دودھ اور انڈے کچھ بھی نہیں ہیں — آپا سلطانی کے پہلے ہی دس انڈوں کے پیسے چل رہے ہیں۔ دودھ والا رات دودھ نہیں لایا۔ پرسوں کہہ رہا تھا کہ پچھلا حساب صاف ہو جب دودھ آئے گا۔"

"اوہ — پھر تو ہمیں کمیشن قبول ہی کرنا پڑے گا۔"

"ہرگز بھی نہیں۔ حرام کے مال سے تو مر جانا بہتر۔ ویسے ناشتے کے بغیر آج تک کوئی مرا تو ہے نہیں۔"

"تمھارے دماغ کو دو شخصوں نے بگاڑا ہے۔ مولانا اشرف علیؒ اور مولانا مودودی۔ تم اب رومانی ناول پڑھا کرو۔ رومانس کی دنیا میں حلال حرام کے جھگڑے نہیں چلتے۔"

"اب پلنگ سے تو اٹھیے۔ نماز میں مشکل سے پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"جب ناشتہ تک نصیب نہیں تو نماز میں کیا جی لگے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ صوفی تمکین بھی آج ضرور ٹپکیں گے۔ کل راستے میں مل گئے تھے کہہ رہے تھے کہ صبح ناشتہ پر آ رہا ہوں۔"

"ٹرخا دیجئے گا۔ انھیں ہوٹل میں چلئے گا۔"

"اور بل آپ دیں گی؟" — میں غرایا۔

"میری بلا کو غرض پڑی ہے۔ میرے پاس تو بس دو روپے ہیں۔ لیجئے یہ لیجئے ان سے جو چاہے خرید لائیے۔" اس نے

اپنے تکیے کے نیچے سے دو میلے کچیلے نوٹ نکال کر مجھے پکڑائے۔ میں اٹھ ہی گیا۔
پھر نماز کے دوران لاشعور کے تاریک گوشے سے ایک پلان کے مبہم سے خطوط یک بیک اُبھرے۔ امام صاحب قرأۃ فرما رہے تھے اور میں بدبخت ذہنی خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ وائے بر حالِ ما۔

حیات عبدالحئیؒ — مولانا علی میاں کے خامۂ زرنگار سے ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت کی ایک ایمان افروز سوانح۔ قیمت مجلد ۱۳/۷۵

مکتوبات مجدد الف ثانیؒ — حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔

قیمت مجلد جلد اول اٹھارہ روپے

جلد دوم ——— اٹھارہ روپے

جلد سوم ——— پندرہ روپے

احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت — از مولانا تقی امینی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شریعت کے احکام زمانہ کے تقاضوں اور تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام مواد حوالوں سے آراستہ۔ قیمت غیر مجلد ۸/۷۵

بدعت کیا ہے؟ — بدعات کے رد میں بہترین لاجواب مقالے ذہن کو روشنی اور قلب کو نورانیت دینے والے۔ قیمت مجلد ۶/۵۰

تفسیر رشیدی — مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے قلم سے بیس آیات قرآنیہ کی قابل مطالعہ تفسیر عارفانہ اور محققانہ۔ قیمت ۲/۵۰

انفاس عیسی — حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی تصنیفات سے تصوف و شریعت، اخلاق اصلاح معاشرہ اور دیگر بیشمار موضوعات پر دین و دانش کی روشنی میں دلچسپ اور روح پرور۔ قیمت ۲۵/-

تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے — جدید و قدیم دونوں علوم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو۔ زبان سلیس، اسلوب شگفتہ، دلائل قوی، مواد محققانہ۔ قیمت ۸/-

مدارج سلوک — ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا۔ قیمت ۶/۵۰

وحدۃ الوجود — اہل معرفت کے مشہور مسلک وحدۃ الوجود پر محققانہ گفتگو۔ حضرت مجدد الف ثانی کا بیان اور اس کے اسرار۔ مجلد قیمت ۳/۱۲

مکاتیب گیلانیؒ — مولانا مناظر احسن گیلانی کے قابل قدر خطوط کا مجموعہ معقول و منقول کا خزانہ۔ قیمت مجلد پلاسٹک ۱۰/-

فضائل نماز — شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ عکسی طباعت کے ساتھ۔ قیمت ایک روپیہ ۷۵ پیسے۔

فتاوی عبدالحئیؒ — مولانا عبدالحئیؒ کا مشہور مجموعہ فتاوی ایک جلد میں مکمل نظر ثانی کے بعد۔ قیمت ۲۰/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ — مولانا منظور نعمانی کی مقبول کتاب۔ اس میں وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔

قیمت چھ روپے پچاس پیسے ۶/۵۰

معارف سلیمان نمبر — مولانا سید سلیمان ندویؒ کے احوال و کوائف اور تذکرہ و تعارف پر یہ نمبر بڑا شاندار ہے۔ قیمت ۵/-

الحج — مولانا اشرف علیؒ کے خلیفہ شاہ مسیح اللہؒ کی نادر تصنیف۔ موضوع نام سے ظاہر ہے

قیمت دو روپے۔

آداب زیارت قبور — شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا محمد سلطانؒ کے فرمودات

قیمت ۶۵ پیسے

(ہر قسم کی کتابیں اس پتہ سے طلب فرمائیں)

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

حافظ بچا ما علیہ ما علیہ کو زمین نگل گئی یا آسمان اُچک لے گیا یہ تو نیلی چھتری والا ہی جانے۔ لیکن ان کی بیوی محترمہ کو گمان تھا کہ ہو نہ ہو ان کی گمشدگی میں ملا کا ہاتھ ضرور ہے۔ ان کی بیوی محترمہ کیا چیز تھیں یہ بھی سن لیجئے۔ پورب کے کسی دیہات کا گنج گرانمایہ۔ نام تھا حسینہ۔ عمر ۲۶ سال۔ رنگ جامنی۔ ناک نقشہ کارٹون جیسا۔ نور علیٰ نور چیچک کے داغ۔ آواز گو بجلی سماعت شکن۔ مزاج تیز۔ بولی دوغلی۔ یعنی کچھ پورب کچھ پچھم۔ کئی سال ہوئے حافظ بچا ما انھیں بقول شاعر عشق کی ڈوری میں باندھ کر لائے تھے۔ نکاح بعد میں ہوا۔ مجھ سے وہ عموماً خفا ہی رہتی تھیں۔ پردہ اپنے گاؤں میں تو خدا جانے کرتی ہوں نہ کرتی ہوں اب اس حد تک کرنے لگی تھیں کہ باہر نکلتیں تو چادر کا پلو منھ پر مار لیتیں۔

بعد مغرب میرے یہاں آ دھمکیں۔ میں امریکہ کے سابق صدر علیہ الواثر تحیث کی یاد میں بڑی آسودگی کے ساتھ یہ مصرعہ گنگنا رہا تھا — بڑے بے آبرو ہو کر تری محفل سے ہم نکلے۔

وہ میری زوجہ سے علیک سلیک کر کے دفعۃً میری طرف متوجہ ہوئیں:-

"اے ملوے صاحب۔ ہمرے مردوا کو تم کونسی میں دھکا دے آئے ہو رے۔"

میری گنگناہٹ زرع کی ہچکی میں تبدیل ہو گئی۔

"دیکھو مسز حافظ بچا ما" میں نے پچھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "تمری یہ عبرانی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے لہذا فقط ان ہی سے سر مارو" میں نے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔ بیوی پان بنا رہی تھی۔

"ہائے دیا۔ یہ فرنگی ہمرے ساتھ مت بولا کرو" انھیں مسز کا خطاب پسند نہیں آتا تھا مگر میں عموماً اسی کا عادی تھا۔ پھر انھوں نے روئے خطاب مائی ہنی مون ڈارلنگ کی طرف موڑ دیا — "گنگا قسم بہن جی ہمیں پتا چل رہین کہ جناب ہمارے مردوا کو موٹر وا میں بٹھا کر جنگلوا کی طرف سے جانی رہین۔"

"اے آپا حمیدن" بیں لٹکا یا "ہم تمرے کو پہلے بھی ایک دن کہے رہن کہ گنگا کی قسم مت کھایا کرس۔"

"دیکھو ہو بہن جی" انھوں نے فریاد کی "اب ہمیں آپا کہن۔ ہماری عمر وا دیکھو اور ان کی عمر وا دیکھو۔"

"آخر بتا دیجئے نا حافظ صاحب کہاں ہیں؟" بیوی محترمہ نے اس انداز میں مجھے خطاب فرمایا جیسے انھیں مطلع کرکے میں نے حافظ مردود کو باقاعدہ غائب کیا ہو۔

"انھیں میں نے سمو چا نگل لیا ہے۔ ان سے کہو لائیں چھری۔ پھاڑیں میرا پیٹ۔"

"اے نوج ہم چھریاں چلائن۔ پر ہاں پولس میں تمھاری رپٹ ضرور کرائن۔ تم ہی ہمرے مردوا کا بھیجا زیادتی خراب کر دی ہو۔"

"تمھارے مردوا کی کھوپڑیا میں بھیجا تھا ہی کب جو ہم نے خراب کر دی ہو۔"

"کاہے ناہی تھا۔ تیس سپر دا کیا خواہ مخواہ ہی مس بند کر لی ہو۔ تمرے کو تو ایک سپر دا بھی ناہی یاد ہوئی سکن۔"

"میں اب پاگل کتے کی طرح بھونکنے لگوں گا نسیمہ ڈی گریٹ۔" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے زوجہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے عرض کر رہا ہوں کہ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ "ملوا ہی کیا کم تھا کہ اب سپر وا بھی سننا پڑا۔ عرش و کرسی کانپ اٹھے ہوں گے۔

"اب یہ بچاری کریں بھی کیا۔" زوجہ نے میرے بجائے ان کی وکالت کی "زبان ٹھیک ہوتے ہی ہوتے ہو گی۔ آپ بھی تو خدا جانے کیا کیا کرتے پھرتے ہیں۔ بتا ہی دیجئے حافظ صاحب کہاں ہیں۔"

"یا میرے والد کے اللہ تعالیٰ۔ یقین کرو زوجہ ڈارلنگ میں خود اس مردِ خوش اطوار کی تلاش میں زمین کے آخری سرے تک ہو آیا ہوں۔ تمھیں کیا معلوم کیا کر کے بیٹھا ہے وہ اخبث الخبائث۔ میری تو دین دنیا سب تباہ کر کے رکھدی۔"

"جھوٹ ناہی بولو۔ وہ تمرے ہی ساتھ موٹروا میں گئے رہن۔ اور ہمرے کو یہ بھی ملوم ہے کہ ایک پھلر دی بھی تمرے سنگ رہی راہن۔"

"پھلر دی" نسیمہ چونک پڑی۔ پہلے ان کی اور پھر میری طرف گھورا۔ میرا دل دھک دھک کے بجائے ٹائیں ٹائیں کرنے لگا تھا۔

"اور کیا" مسز بجا ما کی آواز اور زیادہ تڑاخے دار ہوگئی" مٹرو بھیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھی رہن۔ میم ہو ئیو یا کوئی اور ہو ئیو۔ مٹرو بھیا کہے رہن کہ کیا پتا کوئی رنڈی پنڈی ہو ئیو۔"

"خدا تمھیں غارت کرے" مسز بجا ما "تم سے کس الو کے پٹھے نے کہا تھا کہ یہاں دوڑی چلی آنا۔ بکے چلی جا رہی ہو جو منھ میں آئے۔"

مجھے طرارہ آ گیا تھا۔ کیسے نہ آتا نسیمہ کو خبر تھوڑی تھی کہ راز دی آج کل کیا لکھ رہا ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔ اس کی مستفسرانہ نظریں اب میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں پھر وہ پوچھ ہی بیٹھی:۔

"کون تھی وہ؟"

"میری خالہ کی نانی کی بھتیجی تھی۔ اسے کون ہوتی زوجی تھی۔ زیبا غوثیہ سیٹھ عنایت اللہ کی نئی بیوی۔"

"ماشاء اللہ۔ مجھے تو آج تک صاحبزادی کا شرفِ دیدار تک میسر نہیں آیا۔ آپ اسے موٹروں میں بھی گھماتے پھر رہے ہیں۔" نسیمہ کا لہجہ کڑوا تھا مگر ماتھے پر شکن نہیں تھے۔ ہونٹوں پر تبسم ہی کھیل رہا تھا۔

"موٹروں میں نہیں ڈارلنگ۔ فقط ایک موٹر میں ایک ہی بار اسے اس کی خالہ کے گھر پہنچانا پڑا تھا۔ حافظ بجاما بھی ساتھ تھے۔"

"تھے نا" مسز بجا ما نے منھ کی بات اچک لی" مٹرو بھیا ہم سے جھوٹ ناہی بولین۔ تب ہی سے وہ غائب غلہ ہیں۔ ہم بخت ماری راستہ تکن تکن پگلیا ہو گیو۔"

"ارے تو تکن تکن کی خالہ میں نے انھیں جیب میں چھپا رکھا ہے کیا۔ وہ رتجولی میں مجھ سے جدا ہو گئے تھے کہہ ہے

تھے کہ آج ہی گھر چلا جاؤں گا ۔ میں تو خود انھیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا منزلِ فنا میں جا پہنچا ہوں ۔"

"پھنا سنا تھی جانو بھیا ۔ جب تک وہ نا ہی لوٹن ہم تو تمرے ہی گھروا میں ڈھیا دہن ۔ ہائے بہن جی ۔ راتوں کو تو ایسا ڈر لگت ہے کہ بس ۔ گھروا بھائیں بھائیں کرت ہے ۔ مٹرو بھیا کہے رہن کہ تب تک ہم تمرے ہی گھروسوئے جائن پر ہمنا اپنا تو جی ٹھکت ناہیں ۔ بھلے کو انھیں بھیا کہی راہن پر مائی جائے تھوڑی ہے اِن ۔"

"ہاں ہاں ۔ وہ تو تمھارے ہیرے توڑ لیں گے ۔ بس بھاگوان ہم پر رحم کرو ۔ تمھاری لاطینی بولی ہم برداشت نہیں کر سکتا ۔"

"اب کا ہے کو کرو گے ۔ جب اُس دن ہم سے حلوا بنوا کے کھائے رہیو تو کیسے چیڑ چیڑا اپنے حافظ جی سے بول رہن کہ تمری بیوی تو بڑی پیاری زبنیا بولت ہے ۔"

"یا ربّ الارباب میرے گناہ بخش دے ۔ چلو ڈھیا دو یہیں مگر میرے سامنے بولو گی نہیں ۔"

"لے جاؤ بڑے لاٹ صاحب آئے ۔ پولس میں رپٹ کرائے دہن تو جیل ہی میں سڑوا کیجو ۔ اب کی تھانہ میں ہمرے گاؤں کے مکھیا کا سگا داماد سپاہیا بن کے آئی گئن ہوئے ۔"

بہرکیف وہ اپنے شوہر نامدار کی بازیافت تک غریب خانے ہی پر سکونت پذیر بلکہ اقامت گزیں بلکہ قابض مسلط بلکہ وہ کیا ہوتا ہے رہائش فرما بلکہ کفگیر و دامن گیر ۔ وعلیہ اللعنۃ ۔ اور مجھ پر بھی لعنت ۔

مسز پاجامہ کی مریخی زبان کا مارا میں اُکتھ باسٹھ کرتا سڑکیں ناپ رہا تھا کہ دفعتاً ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی ۔ کٹورے شاہ کے سجادے خواجہ نورالٰہی رکشا سے اُتر کر صوفی وہتاب کے گھر میں داخل ہو رہے تھے ۔ ان کی یکلخت زیارت میرے لئے گھونسہ ثابت ہوئی ۔ تخیلات کی چرخی اُن سے گھومی ۔ وہ یہاں آئے ہیں تو سیٹھ عنایت سے بھی ضرور ملیں گے اور ان سے ملیں گے تو مجھ ناہنجار کا جامۂ راز بھی ضرور تار تار ہوگا ۔

"نہیں" میں بلبلایا "ان کے پہنچنے سے پہلے ہی میں خود جا کر سیٹھ کو کچا چٹھا سناتا ہوں ۔ سو روپے بھی لوٹا دوں گا ۔"

قریب ایک رکشا نظر آئی ۔ میں جست لگا کر بیٹھا ۔ رکشا پولر بولا ۔ صاحب رُکی ہوئی ہے ۔

میں نے ایک اور رکشا کو آواز دی ۔ اس کا بھی پولر دھڑی بھر کا سر نفی میں ہلاتا چلا گیا ۔ کچھ دیر بعد اسکوٹر پکڑا وہ ابھی ایک دو فرلانگ چلا ہوگا کہ پھٹ پھٹ سے مشین بند ہوگئی ۔ ڈرائیور ایک مغلظ گالی دیتے ہوئے نیچے اترا ۔ پندرہ منٹ ٹھیک ہونے میں لگ گئے ۔

آخر کار میں عنایت منزل پہنچ ہی گیا ۔

برآمدے میں مسز عنایت بید کی کرسی ڈالے کچھ پڑھنے میں مشغول تھیں ۔ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے ان تک پہنچا تو کتاب بند کرتے ہوئے انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر بولیں ۔

"ہائیں ہائیں ۔ کچھ دماغ تو ٹھیک ہے نا ۔"

"نہیں ٹھیک ہے ۔ سیٹھ صاحب کہاں ہیں ؟"

"وہ کرسی کھینچ لو ۔ خیریت تو ہے ؟"

"اُن کی حد تک خیریت ہے مگر میری خیریت اُفق کے اُس پار دوڑی جا رہی ہے ۔ کیا وہ اندر نہیں ہیں ؟"

"ہیں تو ۔ باتھ روم میں ہیں ۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ ۔"

"عربی تم نہیں جانتیں اور میری داستانِ دردِ عربی کے سوا کسی زبان میں سما نہیں سکتی ۔"

"لعنت ہے تم پر ۔ ارے ہاں میں تو بھول ہی گئی تم سے تو مجھے کلام ہی نہیں کرنا تھا ۔"

"تم کیا ۔ آج کے بعد شاید تمھارے وہ بھی مجھ سے کلام سلام پسند نہ کریں ۔ مجھ سے حرکت ہی ایسی سرزد ہوئی ہے ۔"

"الفاظ ضائع کئے جاؤ ۔ میں سن ہی نہیں رہی ۔" انھوں نے کتاب کھول لی ۔ پھر فوراً ہی بند بھی کر لی اور چونک کر بولیں ۔

"تم کہاں ۔ کے دن میں صورت دکھائی ہے ؟"

میں جواب نہیں دے پایا تھا کہ سیٹھ برآمد ہوئے اور

قریب آکر بولے —— "کہاں تھے برخوردار زوبیہ روٹھے ریبا پر ڈھائی کیوں بج رہے ہیں۔"

"مصروفیات سے چھٹکارا ہی نہیں چھوڑتیں۔" میں آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ سیٹھ کے قہقہے نے بریک لگا دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک کرسی کھینچ لی اور تشریف رکھتے ہوئے بولے

"تم سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ میں اور زوبی دونوں روز ہی تمھارا انتظار کرتے رہے ہیں۔"

"آپ کرتے رہے ہوں گے۔ میں نے تو نہیں کیا۔" زوبی نے سیٹھ کی بات کاٹی۔

"دیکھ رہے ہو کس قدر ناراض ہے۔" سیٹھ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا "یہ روز ہی تمھارے پیچھے تمھیں برا بھلا کہتی رہتی ہے۔"

میں اپنی دنیا میں گم تھا کس طرح حرفِ مطلب زبان پر لاؤں کس نہج سے آغاز کروں۔ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یکایک سے خواجہ نور انی کا پیکر خاکی طلوع ہوتا نظر آیا۔ باپ رے باپ۔ ارے رے۔

اور پھر انھیں میرا آمد نے تک پہنچنے میں دیر ہی کیا لگتی۔ سیٹھ نے اٹھ کر تعظیم دی۔ میں نے بھی مصافحہ کیا۔ زوبی کے سر پر انھوں نے دستِ شفقت پھیرا۔ پھر ہم سب اس کمرے میں جا بیٹھے۔ میری کھوپڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ اعصاب چٹخنے کے قریب تھے۔ مگر آئینہ چائے کی پیالی نے کچھ سہارا دیا۔ خواجہ بڑے بزرگانہ لہجے میں سیٹھ کو مبارکباد دے رہے تھے۔

"تسلیم۔ میری کامیابی تو آپ ہی کا طفیل ہے۔" سیٹھ نے منکسرانہ کہا۔ "ویسے میں نے کوشش بھی کی تھی کہ شہر میں سب سے بہتر کپڑا مل سکے اسی کی چادر چڑھے اس اعلیٰ قسم کی ساٹن مارکیٹ میں مل ہی نہیں سکا تھا۔"

میں اس طرح گوش بر آواز تھا جیسے کھوپڑی پر ڈنڈا لگا بیٹھا ہو۔ صاف ظاہر ہے اب خواجہ آنکھیں چڑھائیں گے اور منھ پھاڑ کر کہیں گے کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں درگاہ میں کوئی چادر وادر نہیں پہنچی۔ مگر......

"جی بے شک" انھوں نے تحیر اور تامل کے بغیر بڑے اطمینان سے ارشاد فرمایا "قیمتی کپڑا تھا۔ اولیاء اللہ آدمی کے حوصلے اور جذبے ہی کی قدر کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رضی اللہ عنہ آپ کی دریادلی سے بہت خوش ہوئے۔ لوگ عام طور پر سستے کپڑوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔"

"زہے نصیب —— کیا آپ سے شاہ صاحب نے خواب میں خوشی کا اظہار فرمایا تھا۔" سیٹھ نے احترام بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اب آپ کیا پوچھتے ہیں۔ خواب کیا اور بیداری کیا۔ ہم تو ان کے حاضر باش خادم ہیں۔ روحانی صحبتیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔"

"ارے ارے انھیں کیا ہو گیا۔" دفعتاً زوبی کی تشویش آمیز آواز بلند ہوئی۔ خطاب اور دونوں سے تھا اشارہ میری طرف تھا۔ میں نے واقعی فرطِ حیرت میں پہلے تو آنکھیں پھاڑی تھیں پھر موندلی تھیں اور گردن کرسی کے تکیے پر ڈھلکا دی تھی۔

"برخوردار۔ برخوردار۔" سیٹھ نے مجھے جھنجوڑا۔ "نیند آ رہی ہے کیا ——"

"نہ... نہ نہیں تو۔" میں چونک کر سیدھا ہوا۔ آنکھیں پھڑپھڑائیں پھر خواجہ کی طرف ٹکٹکی باندھ دی۔ میں دم بخود ہو گیا۔ خواجہ مسکرائے۔

"مرزا صاحب۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس دن آپ فوراً ہی لوٹ گئے۔ ہماری دعوت قبول نہیں کی۔ آپ شیوخ کے خاندان سے ہیں۔ آپ کے پردادا کے دادا شاہ نذیر اللہ قطب العالم حضرت داؤد علی شاہ کے خلیفہ تھے۔ سبحان اللہ کیا ہستیاں تھیں۔ ہمیں آپ سے بھی دلی انس ہے۔" خواجہ فرفر کہے چلے جا رہے تھے اور میرا یہ عالم کہ کھوپڑی کی وسعتوں میں گویا مرغیاں بول رہی تھیں۔

"یہ صاحبزادے خود بھی آپ کے بہت مداح ہیں کہہ رہے تھے کہ سجادہ نشین صاحب بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ نہایت خوش اخلاق انسان ہیں۔" سیٹھ نے جوابی مصرعہ عرض کیا۔

"انھوں نے بمشکل ہماری چائے پی تھی دعوت قبول نہیں کی تھی۔ خیر پھر سہی۔" خواجہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

یا مشکل کشا۔۔۔ یا پیرانِ پیر دستگیر۔ یا غوث الاعظم۔ میری یادداشت کی لوح پر تمبروار وہ تمام الفاظ اُبھرتے آرہے تھے جو کبھی پیران کلیر اور اجمیر اور دیگر مقامات مقدسہ میں سنے ہوں گے۔ اور میرا لاشعور تحت الشعور کی دُم میں نمدہ باندھ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ سے بڑا احمق دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ میرے پاس پستول نہیں تھا ورنہ خواجہ نور الٰہی کے سرِ مصفّا پر گولی کے بجائے اس کا دستہ رسید کرتا کس اطمینان سے وہ سفید جھوٹ بول رہے تھے۔

مگر کیوں؟

"میری آپ کی ملاقات آج سے پہلے بھلا کب ہوئی تھی؟" دفعتاً میں نے کھسیا کر جارحانہ لہجے میں ان سے پوچھا۔

"یوں تو پیارے عزیز آپ سے متعدد ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر آخری ملاقات وہی تھی جب آپ حافظ پجامے کے ساتھ چادر کا تھان اور مٹھائی کے ڈبے لیکر درگاہ شریف لائے تھے سو روپے بھی آپ نے ہمیں دیئے تھے۔"

"پجامے نہیں پجاما۔" میں نے بے ساختہ تصحیح کی۔ "خواجہ صاحب قبلہ کیا آپ بتا سکتے ہیں میرے جسم پر اسوقت کس رنگ کی شیروانی تھی؟"

سیٹھ اور زدبی نے بڑے تعجب سے میرے چہرے پر نظریں گاڑیں۔ سیٹھ کے تعجب میں ناگواری کی بھی آمیزش تھی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو عزیزم" انھوں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"اب کیا بتاؤں آپ کو۔ یہ پجامے صاحب....."

میں جملہ پورا نہ کر سکا کیونکہ خواجہ نے اپنے ہاتھ کی آڑ لے کر بڑے زور سے مجھے آنکھ ماری تھی۔

"جملہ پورا کرو۔" سیٹھ قدرے طیش سے بولے۔

"چھوڑیئے بھی۔" خواجہ نے جلدی سے کہا "اُنکی ہماری دل لگی پرانی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے یہ کسی بھی معاملے میں سنجیدگی اختیار نہیں کر سکتے۔"

"آخر بات کیا ہے۔" زدبی کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے۔

"کچھ نہیں بیٹی۔ ہاں یہ بتاؤ تمھارے ابا میاں تو اچھی طرح ہیں؟" خواجہ بات کا رُخ موڑتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں آپ کی دعا ہے۔۔۔"

میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مرغے کی بولی بولوں یا گدھوں کی طرح ڈھیچوں ڈھیچوں کروں۔ موجودہ سچوئیشن میں اگر میں کہہ بھی دیتا کہ خواجہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تھان اور مٹھائی درگاہ تک نہیں پہنچے۔ سو روپے میری جیب میں ہیں تو سیٹھ ہرگز یقین نہ کرتے۔

خواجہ سے میری سلام دعا تو تھی مگر اس حد تک بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ آنکھ بھی ماریں۔ آنکھ مارنے کا انداز بڑا معنی خیز تھا۔ کیا چکر ہے۔ کیا ظہور میں آنے والا ہے! ۔۔۔ فی الحال میں نے یہی فیصلہ کیا کہ معاملہ گول ہی رہنے دیا جائے۔

چائے کے بعد خواجہ رخصت کے لئے کھڑے ہوگئے۔

"اب چلوں گا۔ بعد عصر درگاہ شریف میں ختم خواجگان ہے میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔"

"جی تو چاہتا تھا کہ آج یہیں قیام فرماتے" سیٹھ نے مریدانہ ادب سے کہا "وعدہ کیجئے پھر کسی دن آئیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ مجھے تو آپ سے بعض اُمور میں ضروری مشورہ بھی کرنا ہے۔" یہ کہہ کر خواجہ میری طرف متوجہ ہوئے "عزیزم! آپ خواجہ ادریس کا گھر تو جانتے ہی ہوں گے وہی جو مستجاب الدعوات کے نام سے مشہور ہیں۔"

"جی ہاں فرمائیے۔" میرا لہجہ خواب کی بڑبڑاہٹ جیسا تھا۔

"ذرا زحمت کر کے مجھے وہاں تک چھوڑ دیجئے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" سیٹھ نے کہا "جاؤ صاحبزادے گاڑی لیتے جاؤ۔"

کچھ دیر بعد جب گاڑی عنایت منزل سے کئی فرلانگ دور جا چکی تو خواجہ نے پچھلی سیٹ سے ارشاد فرمایا۔۔۔

"بائیں طرف موڑلو ذوالقدر۔کچھ دیر شالیمار ہوٹل میں بیٹھیں گے ۔"

میرا موڈ بہت خراب تھا۔

"نہیں خواجہ صاحب۔اب تو یہ گاڑی جہنم ہی کے دروازے پر جاکر رکے گی۔"

"بہت خفا ہو" انھوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"حالانکہ تمھیں میرا ممنون ہونا چاہیے۔ ذرا سوچو اگر سیٹھ سے ہم کہہ دیتے کہ تم نے انھیں کیسا دھوکا دیا ہے تو کیا پھر بھی وہ کبھی تمھاری صورت تک دیکھنے کے روادار ہوتے۔"

"نہ ہوتے مگر آپ سے میں اس طرزِ عمل کی وضاحت ضرور چاہوں گا۔"

"وضاحت ہی کے لئے تو ہوٹل چلنے کی فرمائش کررہا ہوں ۔موڑلو۔نہیں تو آگے سے لمبا چکر کاٹنا پڑے گا۔"

تاؤ کے باوجود میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔کچھ دیر بعد ہم شالیمار کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔یہاں اور کوئی نہیں تھا۔کاؤنٹر کلرک نے جس انداز میں خواجہ کا خیر مقدم کیا تھا اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ خواجہ اس کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔چند ہی منٹ میں کوکاکولا کی بوتلیں بھی یہاں پہنچ گئیں۔

"ہاں۔اب فرمائیے۔" میرے لہجے میں درشتی تھی۔

خواجہ نے کوکاکولا کی چسکی لی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"ملا صاحب۔میں آپ کو خوب جانتا ہوں مگر آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"اس غلط فہمی میں نہ رہیے" میں بھناکر بولا۔" میں سیٹھ عنایت جیسے احمقوں میں نہیں ہوں۔"

"اپنا لہجہ درست کرلو عزیزم۔ہم یہاں دوستانہ فضا میں گفتگو کریں گے۔تم شاید اتنا ہی تو جانتے ہوگے کہ کٹوڑے شاہ کا سجادہ کچھ بزنس بھی کرتا ہے۔بس۔"

"مجھے آپ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں۔فی الحال یہ جاننا ہے کہ آپ کو کیسے علم ہوا کہ سیٹھ نے میرے ہاتھ چادر وغیرہ بھجوائی تھی۔"

"بہت آسانی سے۔سیٹھ سے پہلے میں صوفی مہتاب سے ملا تھا۔انھیں سیٹھ ہی سے معلوم ہوا تھا کہ تمھارے ہاتھ کیا کیا بھجوایا گیا ہے۔"

"صوفی مہتاب کو کیسے پتا چلا کہ بھجوائی ہوئی چیزیں پہنچائی نہیں گئیں؟"

"انھیں کہاں علم تھا۔اب بھی علم نہیں ہے۔میں نے انھیں نہیں بتا کہ وہ سب کچھ درگاہ تک نہیں پہنچا۔"

"کیوں آخر؟"

"تمھاری خاطر۔۔۔تم نہیں جانتے میرے دل میں تمھارے لئے کیسی چاہ ہے۔تمھیں دیکھ کر مجھے اپنا مرحوم بھائی یاد آجاتا ہے جو تمھاری ہی ہم عمر تھا۔تمھارے ہی جیسا خوش مزاج۔ بے چارہ ایک حادثے میں جان کھو بیٹھا۔۔۔"

ان کے لہجے میں درد بھی تھا اور سچائی کی جھلک بھی۔ میرا تاؤ بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔

"کیا آپ سچ بول رہے ہیں۔۔۔"

"جھوٹ کیوں بولوں گا۔۔۔عزیزمن!میرا تمھارا رشتہ لڑنے کا نہیں ہے پیار محبت کا ہے۔میں مدت سے چاہ رہا تھا کہ میری تمھاری شناسائی گہرے تعلقات میں تبدیل ہو۔آج قسمت نے اس کا موقعہ دے ہی دیا۔"

"مگر میں قبوری کراماتوں کو ڈھونگ سمجھتا ہوں۔میرے نزدیک آپ جیسے لوگ لکا فراڈ ہیں۔"

"میں تردید نہیں کروں گا۔" خواجہ بڑی خوش مزاجی سے بولے" مجھے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ تم حقیقۃً کس قسم کے عقائد رکھتے ہو۔"

"اس کے باوجود آپ مجھ سے تعلق بڑھانا چاہتے ہیں؟"

"دل منطق کا پابند نہیں ہوا کرتا عزیزم۔میں نے کہا نا تم میرے مرحوم بھائی سے بہت مشابہ ہو۔"

میں نے کوکاکولا کا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔وہاں گہرے سکون کے سوا کچھ نہ تھا۔میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

"پھر بھی میں سیٹھ کو اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔ میرے ضمیر پر بڑا بار ہے ۔۔۔"

"ضمیر کی غلامی سمجھدار لوگ نہیں کیا کرتے۔ ذرا سوچو ہم تم ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔ سچائی جاننے کے بعد اگر گوڈڑ شاہ سے سیٹھ کی عقیدت ختم ہو گئی تو تم سے بھی وہ رسم و راہ نہیں رکھیں گے۔ پھر کیا فائدہ ہوا۔"

"میں ان سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کے چکر میں نہیں ہوں۔ ۔۔ نہ رہے رسم و راہ۔"

"اب مجھے اتنا احمق مت سمجھو۔" خواجہ ذومعنی انداز میں مسکرائے۔ میں تردیداً کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔

"خیر خیر۔ میں تمھیں اعتراف پر مجبور نہیں کرتا ۔۔۔ تم ان کے مخلص دوست سہی۔ لیکن زیبا غوثیہ جیسی چیز کے قرب سے محروم ہونا تو شاید تم بھی پسند نہ کرو۔"

"کیا مطلب ؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"عزیزم! ہم اگرچہ پچاس کے پیٹے میں ہیں مگر رومانی جذبات سے بالکل عاری تو نہیں ہوئے۔ تمھارے جذبات کیا ہوں گے یہ ہم سمجھتے ہیں۔"

"بکواس ہے آپ غلط سمجھتے ہیں۔"

"اچھا اچھا ۔۔۔ جوش میں مت آؤ۔ کیوں نہ ہم ایک دوستانہ معاہدہ کر لیں۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے بڑی یگانگت سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں کہنیاں ٹیکے میز پر جھکا ہوا تھا۔

"فرمائیے کس قسم کا معاہدہ ؟"

"درگاہ کے عقبی حصّے میں ایک وسیع و عریض دارالاقامہ ہوانے کا پلان ہے۔ کم سے کم بیس کمروں والا۔ نقشہ بن چکا ہے۔ تخمیناً دو لاکھ خرچ آئیں گے۔ بتاؤ یہ رقم کہاں سے آئے ؟"

"مجھ سے پوچھ رہے ہیں آپ!"

"تکلف برطرف۔ صاف سی بات ہے سیٹھ کروڑ پتی ہیں۔ لاکھ دو لاکھ دے ڈالنا ان کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ درگاہ سے اب ان کی عقیدت کافی بڑھ گئی ہے۔ اسے اور بڑھنا چاہیئے۔ دو چار ہزار تو اب بھی وہ آسانی سے دیدیں گے لیکن یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہم دریا سے ایک دو گھونٹ لینے پر اکتفا کریں۔ پچیس فیصدی ہر حال میں تمھارا۔"

"اوہ" میری زبان سے بے اختیار نکلا "تو یہ اسکیمیں ہیں۔ لیکن حضور عالی۔ میرا صرف پچیس فی صدی کیوں۔ آپ کا پچھتر فیصدی کس لئے ؟"

"اعتراض معقول ہے۔ مگر واضح ہونا چاہیئے کہ پچیس فیصد صوفی مہتاب کے بھی ہیں۔ باقی پچاس فی صد درگاہ کی تعمیرات میں صرف ہوں گے۔"

"مجھے سوچنا پڑے گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں وقت ضائع کرنے سے۔ یہ بھی سوچ لو پچیس فی صد کے علاوہ زیبا غوثیہ بھی تمھاری ہے سمجھے اور صوفی مہتاب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

میرے اندر پھر ایک شعلہ سا لپکا۔

"آپ نے اسے بیٹی کہہ کر خطاب کیا تھا۔" میں جھلا کر بولا

"تو اس میں غصّے کی کیا بات ہے۔ اسے میں آئندہ بھی بیٹی ہی کہتا رہوں گا۔ تم پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔"

"میں تو خواجہ صاحب محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ۔۔۔ آپ اپنی بیٹی کے بارے میں بھی اتنی بے تکلفی برت سکتے ہیں!"

"یہ مت بھولو ہر لڑکی کسی نہ کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔ فضول باتیں چھوڑو۔ ہم تحریری معاہدہ تو نہیں کر سکتے لیکن مردوں کی زبان اور تحریر میں فرق نہیں ہوا کرتا۔ میرا خیال ہے تم بھی مرد ہی ہو۔"

"میری کیا ڈیوٹی ہوگی ؟"

"سیٹھ کو شیشے میں اُتارنا۔ حالات کے مطابق خاص خاص اسکیمیں ہم مل جل کر بناتے رہیں گے۔ اس وقت تو بنیادی مقصد پر مکمل اتفاقِ رائے کی ضرورت ہے۔ تم کل درگاہ آنا لیکن سیٹھ کی گاڑی میں نہیں۔ انھیں علم نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے تعلقات بڑھ گئے ہیں۔ میں آگے کے لئے کوئی مفید تجویز سوچ رکھوں گا۔ تم سے تبادلۂ خیال ہو جائے گا ۔۔۔"

"اور اگر میں یہاں کی ساری گفتگو سیٹھ سے جا کہوں"
میں نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ البتہ تم ضرور خسارے
میں رہو گے ـــــ" ان کا انداز اعتماد سے بھرپور تھا۔
"گویا ہمارا معاہدہ دھمکی کے پس منظر ہو رہا ہے!"
میں بلبلایا۔
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم ہی ہماری جگہ
ہوتے تو کیا یہ پسند کرتے کہ کوئی بیچ کا ٹھولی خواہ مخواہ
تمہارے منصوبوں پر پانی پھیر دے۔"
"اب تک آپ نے سیٹھ سے کتنا روپیہ اینٹھا ہے؟"
"کتنا بھی نہیں۔ لوہا جب تک سرخ نہ ہو جائے
چوٹ مارنا احمقوں کا کام ہے۔ انھوں نے پہلے ایک
بار چادر چڑھائی تھی۔ سو روپے نذر دیے تھے۔ کامیابی
کے بعد پانچسو اور دیے۔ بس۔"
"میرا خیال ہے وہ بہت زیادہ دیں گے بھی نہیں۔
آدمی کائیاں ہیں۔"
"اپنے مذہب میں تو مایوسی کفر ہے۔ تم اگر ذرا عقیدے
کو پوری طرح مٹھی میں لے لو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"
"میری عاقبت تباہ ہو جائے گی۔ قبر میں کیڑے
پڑیں گے۔"
"استغفار کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ پھر یہ تو
سوچو ہم شافع المذنبین کی امت میں ہیں۔ وہ حشر کے دن
گنہگاروں کی سفارش کریں گے۔ کیا اس پر تمہارا ایمان
نہیں ہے؟"
"میرے پاس ایمان جیسی کوئی شے ہوتی تو حافظ جی آپ
کے بہکانے میں کیوں آجاتا۔ آپ اب جہنم ہی میں جھونک
کر چھوڑیں گے۔"
"خواہ مخواہ تقویٰ مت بگھارو۔ سیٹھ دوسروں کا
خون چوس چوس کر سیٹھ بنے ہیں ـــــ ان سے جو کچھ اینٹھ
لیا جائے کارِ خیر ہی میں شامل ہوگا ـــــ تو کل آ رہے ہو نا
رجولی؟"

"وعدہ نہیں کرتا کوشش کروں گا۔"
پھر انھیں میں نے گاڑی ہی میں بس اسٹینڈ تک پہنچایا۔
اس دوران میں انھوں نے بس ایک بات قابلِ ذکر کہی تھی۔
"یہ مت بھولنا میاں دوست۔ ہم نے کئی خون بھی کئے
ہیں۔ جو ہم سے الجھے وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتا۔"

تسخیر ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ خواجہ نور الٰہی کی دھمکی
کا کوئی اثر مجھ پر نہیں ہوا۔ وہ سچ مچ قاتل ہوں نہ ہوں
مگر بعید ان سے کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے جبڑوں کی ساخت
سفاکی کی غماز تھی۔ بدن مضبوط تھا۔ بس شدت سے یہ محسوس
کر رہا تھا کہ اس وقت مجھے کسی مشیر کی ضرورت ہے۔ معاملات
بڑا سنگین رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔
گاڑی عنایت منزل چھوڑ کر میں گھر پہنچا۔ میں نے طے کر لیا
کہ زوجہ سے مشورہ کروں گا۔
اور جب ساری کہانی اسے سنا دی تو وہ سہم کر بولی:۔
"یا اللہ۔ یہ کیا جھمیلا بنا کے بیٹھے ہیں آپ میں تھوڑی
اس میں کیا مشورہ دوں۔"
"دیکھو ڈارلنگ۔ یہ موقعہ مغلانی زبان بولنے کا
نہیں ہے۔ نہ تم نگوڑی نہ میں نگوڑا۔ آخر مجھے کرنا کیا چاہیے"
"نفل پڑھ کر خدا سے توبہ استغفار کیجئے۔ یہ سب
بداعمالیوں کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے۔"
"آپ تو ہنسی زیور کھول بیٹھیں۔ مائی سوئٹ بیگم
کوئی ڈھنگ کا مشورہ دو۔"
"آپ سچ سچ بتائیے عنایت صاحب سے دھوکا کرنے
میں آپ کی کیا نیت تھی؟"
"بس یہ کہ چادر نہ چڑھے اور انھیں کامیابی ہو جائے
تو میں ان کے گھوڑے سے کٹورے شاہ کی عقیدت کھرچ
سکوں۔"
"تب تو اللہ کا نام لے کر ان سب کچھ کہہ ڈالئے۔ اللہ
نیت دیکھتا ہے وہ مدد کرے گا۔"
"اور خواجہ نور الٰہی سے کیسے نبٹا جائے گا۔ وہ کہہ چکے ہیں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

بریلوی فتنہ کا نیا روپ • کم وکیف

آپ تقریر کیسے کریں

تبصرے

کھرے کھوٹے

بریلوی فتنے کا نیا روپ

مصنف :- مولانا محمد عارف سنبھلی • صفحات (۲۲۴) • لکھائی چھپائی متوسط۔ قیمت پانچ روپے شائع کردہ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

غالب کا مشہور شعر ہے :

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مگر کبھی کبھی طعنوں سے کام نکل بھی آتا ہے۔ ہم نے "زلزلہ" نامی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے علماء دیوبند پر اس نے شاید طعن کئے تھے کہ شاید ان پر گستاخی اور بدتمیزی کا بھی اطلاق غلط نہ ہو مقصد یہی تھا کہ یا اللہ کے بندے کسی طرح تو خواب استراحت سے جاگیں اور ٹوٹے ہوئے قلم کی نوک درست کر کے دشنامی بنیاد ڈھائیں۔ طعن دیتا بالکل ہی ضائع نہیں گیا۔ پہلے "انکشاف" آئی مگر خاطر خواہ نہیں تھی۔ پھر یہ زیر تبصرہ کتاب آئی۔ اس کے مصنف مولانا محمد عارف سنبھلی دارالعلوم دیوبند کے استاد نہیں مگر ہیں حلقۂ دیوبند ہی کے فاضل۔ انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے حق تنقید ادا کیا ہے۔ ماشاء اللہ۔ جزاہم اللہ خیرا لجزاء

بعض نکات پر ہم یا کوئی اور قاری ان سے اتفاق نہ کرسکے لیکن اس اختلاف کی نوعیت اور ہوگی۔ وہ نہیں ہوگی جس سے "زلزلہ" کے ناپاک مقصد کو تقویت پہنچے۔ ہمیں بریلوی قسم کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق کم ہوا ہے لیکن زیر تبصرہ کتاب سے پتا چلا کہ ہم اب تک اندھیرے میں تھے۔ ہمیں ادراک نہیں تھا کہ بریلوی قلم کا کام فحاشی، گالی بازی اور تنگی یا راریت کے کس مقام تک پہنچا ہوا ہے۔ فاضل مصنف نے "زلزلہ" کے مغالطات کا پورا پورا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ایک ضمیمہ شامل کتاب کیا ہے جس میں بریلی کے تکفیری فتنے کی مختصر تاریخ

اسے پڑھنے کے بعد ہم نے اللہ سے دعا مانگی کہ اے غفور ورحیم "زلزلہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے قلب میں بریلوی مکتب فکر کے بارے میں جو تھوڑا سا حسنِ ظن تھا اس کے لئے ہمیں معاف کر دے۔

اس سے قطع نظر خدا کی اس عجیب مخلوق نے ــــ یعنی بریلوی ادیبوں کے [illegible] نے کس کس کو کا زبنا ڈالا ہے عبرت ناک اور لرزا دینے والی بات یہ ہے کہ اس کے اراکین نے بے شمار جگہ یا ن وہ استعمال کی ہے جو طوائفوں کے اڈوں اور شراب خانوں کی محفلوں میں بھی شاید ہی استعمال ہوتی ہو۔ مولانا سنبھلی نے حوالوں کے ساتھ اس زبان کے جو نمونے نقل کئے ہیں ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ہم کوشش بھی کریں تو ہمارا قلم انھیں نقل نہیں کر سکتا۔ اور اگر قلم کو بے آبرو کر کے نقل بھی کر دیں تو رحمت کے فرشتے ہمارے سایہ تک سے دور بھاگیں گے۔ گالیاں ننگی اور فحش ترین۔

ہمارا خیال ہے جو لوگ زیر تبصرہ کتاب کا صرف ضمیمہ ہی پڑھ لیں وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہیں گے کہ بریلوی علم کلام کے خمیر میں کوئی بہت ہی خبیث اور غلیظ روح سمائی ہوئی ہے جسے نہ شرافت کی حس ہے نہ حیا کا پاس نہ شرم دنیا نہ خوف آخرت۔

ہم زیادہ اقتباسات نہیں دے سکتے مگر بطور نمونہ صرف دو شعر ان بزرگوار کے دیتے ہیں جو بریلوی مکتب فکر کے اعلیٰ حضرت اور امام الائمہ تھے اور نام نامی ان کا احمد رضا خاں صاحب تھا۔ یہ دو شعر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے قصیدے میں کہے ہیں۔

تنگ و چست ان کا لباس اور وہ جوبن کا ابھار
مسکی جاتی ہے قبا سر سے کمر تک لے کر
یہ پھٹا پڑتا ہے جوبن مرے دل کی صورت
کہ ہوئے جاتے ہیں جامے سے بروں سینہ و بر

بے علم سے بے علم مسلمان جانتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں اور آپ کی تمام بیویوں کو اللہ نے قرآن میں تمام امت مسلمہ کی مائیں قرار دیا ہے۔ پھر مسلمان ہی نہیں غیر مسلم تک اس احساس میں مشترک و متفق ہیں کہ بد معاش سے بد معاش آدمی بھی چاہے وہ کتنا ہی بڑا زانی اور بے حیا ہو اپنی ماں کے بارے میں جنس زدہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی ماں کے لئے اسکے حاشیۂ خیال میں بھی ایسے الفاظ نہیں آ سکتے جو ہوس شہوت اور عریانی و فحاشی کے تیور لئے ہوئے ہوں۔ حد ہے کہ جو لوگ حرام نطفے سے پیدا ہوتے ہیں اور عیاشی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے وہ تک کم سے کم اپنی ماں کے [illegible] خطوط جسمانی کا ذکر اپنی زبان سے نہیں کر سکتے جن سے دلچسپی جنسی جذبات ہی کو ہو سکتی ہے۔

اس عالم آشکارا حقیقت کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ اس ماں کے لئے جو سگی ماں سے بڑھ کر مقدس ہے۔ جو آقا کا حرم ہے۔ جو آقا کی محبوب ترین بیوی ہے بریلوی حلقے کے امام اور شیخ و مرشد کیا طرز گفتگو اختیار فرما رہے ہیں۔ اس انداز کلام کو یاوہ گوئی اور فحش کہنے سے اس کی ناپاکی اور لرزہ خیزی کا حق وضاحت ادا نہیں ہوتا زبان و لغت کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس گندہ ذہنی کی پوری ترجمانی کر سکیں۔

اپنی ماں کو کوئی شخص واقعۃً بھی چست ٹیڈی لباس میں دیکھے تو اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس کے نسوانی اعضاء اور شباب اور سینہ و بر کا قصیدہ شروع کر دے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ماں سامنے بھی نہیں ہے۔ بیٹا ــــ احمد رضا خاں آپ سے آپ بذریعہ تخیل اسے ٹیڈی لباس پہنا کر نعوذ باللہ من ذلک چٹخارے لے رہا ہے۔ یہ گندہ ذہنی انتہائی خیالی کی حد ہے جب استاد و امام ایسے ذہن کے ہوں گے تو شاگردوں اور پیروؤں میں شرافت و حیا نامی کوئی چیز کہاں باقی بچتی چنانچہ ان حضرات نے بلا تکلف اس شاعری کو چھاپ دیا کتاب یعنی مجموعۂ کلام کا نام ہے حدائق بخشش حصہ سوم یعنی یہ خوش فکرے ایسے شیطانی تخیل کے [illegible]

بخشش و انعام کی اونچی چھت پر پہنچنے کے امیدوار ہیں
ایک نمونہ اس کا بھی دیکھ لیجیے کہ بریلوی حضرات
اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابیہ" فرقے کا نام دیکر
اس کی طرف کیا کیا عقیدے منسوب کرتے ہیں۔

"وہابی ایسے خدا کو مانتا ہے ... جسکا ...
کھانا پینا، پیشاب کرنا، پاخانہ پھرنا، ناچنا
تھرکنا، نٹ کی طرح کلا کھیلنا، عورتوں سے
جماع کرنا، لواطت جیسی خبیث بے حیائی کا
مرتکب ہونا حتی کہ مخنث کی طرح مفعول بننا
کوئی خباثت، کوئی فضیحت اس کی شان کے
خلاف نہیں" (فتاوی رضویہ جلد اول ص۲۲)

یہاں ہمیں محمد عثمان فارقلیط اور ان کے دانشور یاد آئے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں اور خیال کریں کیا کبھی کسی دیوبندی یا اہل حدیث یا کسی بھی صحیح الدماغ مسلمان سے اس طرح کے عقیدے ان کے سننے میں آئے ہیں۔ کوئی آدمی جب تک پاگل نہ ہو جائے ایسے عقائد و تصورات کا سایہ بھی اس کے حواشی خیال پر نہیں پڑ سکتا۔ مگر بریلوی فنکار دوسروں کی عبارتوں سے اس طرح کے خبیث خیالات نکال کر کفر کے فتوے جڑتے ہیں اور انہیں خوش فہمی یہ ہے کہ خدا کو بھی دھوکہ دیکر جملہ "وہابیہ" کو جہنم میں بھجوا دیں گے۔

تبصرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عارف سنبھلی نے "بریلوی فتنہ کا نیا روپ" لکھ کر ذلزلہ کے مصنف کو ان کی اصلیت یاد دلا دی ہے اور عوام کے آگے ایک ایسا مواد رکھ دیا ہے جسے پڑھ کر وہ ملاک کر سکیں گے کہ بریلویت کا خمیر کس مٹی سے اٹھا ہے۔ (یہ کتاب مکتبہ تجلی سے بھی مل سکتی ہے)

کم دیکھیے

جناب اختر انصاری کی غزلوں کا مجموعہ

صفحات ۱۴۴ ● لکھائی چھپائی خوشنما
● قیمت مجلد سات روپے ● شائع کردہ:-
ادارہ دانش کدہ (اردو لائبریری)
میتونا تھ بھنجن۔ یو۔ پی۔

اختر صاحب کو شہرت یافتہ نہیں مگر کہتے ہیں شہرت یافتہ سخن وروں سے اچھا کہتے ہیں۔ ان کے یہاں پرواز خیال کی بلندی بھی ہے اور انداز بیان کی متانت بھی۔ اسلوب پڑھے لکھوں جیسا ہے۔ رنگ بنیادی قائم ہے مگر جدیدیت کے زاویے لئے ہوئے۔ دونوں رنگوں کی آمیزش میں فنکارانہ سلیقہ پایا جاتا ہے۔ لب لہجہ معتدل ہے۔ نہ گھن گرج نہ سرگوشی۔

اس مجموعے کے چند اچھے شعر بطور ضیافت نقل ہیں

جہاں سے لوٹ گیا قافلہ بہار رو کا
خزاں نصیب وہی گوشۂ چمن ہوں میں

مجھے نصیب کہاں گیسوؤں کی چھاؤں اختر
غموں کی دھوپ میں جلتا ہوا ایک بن ہوں میں

نیند آنے کو سر دار بھی آسکتی ہے تختۂ دار اگر آپ کا زانو ہو جائے
میں گنہگار وفا ہوں مجھے انکار نہیں کوئی الزام محبت کے سوا ہو [illegible]

وہ جو طوفانوں کا رخ موڑ دیا کرتے تھے
ہاتھ باندھے ہوئے جاتے ہیں تباہی کی طرف
آپ ہی اپنے مسائل کا کوئی حل ڈھونڈو
تشکیک گہرئی حالات سے کیا ملتا ہے
میں تو ہنس کر ٹال جاؤں گی غم کو مگر
[illegible] لوگ
[illegible] ہے
[illegible] لوگ
[illegible] حیات
امتحاں کا [illegible] لوگ

●

فصل رنگ و بو پہ بہن گل بھی ہے یار د
کیوں میرے ہی دامن کی کہیں فکر پڑی ہے

ہم کیوں کسی سے شکوۂ جور و جفا کریں
مارے ہوئے تو اپنے خلوصِ وفا کے ہیں

ساری دنیا ہو مخالف تو کوئی بات نہیں
تو نگاہوں سے گرا دے تو اگر رسوا ہے

ہائے وہ لغزشِ مستی جو سنبھالی نہ گئی
ہائے وہ شوق جسے آفتِ جاں ہونا تھا

یہ کیسے لوگ ہیں جو دکھاتے ہیں دل کے زخم
یہ لوگ کیا نزاکتِ غم جانتے نہیں

غم وہ دولت ہے کہ جس کے لئے دنیا بھی اگر
میری ٹھوکر میں رہی مسندِ شاہی کی طرح

بہت حسین تھی مگر خواب ہو کے رہ گئی
ترے بغیر زندگی عذاب ہو کے رہ گئی
وہی ادائے حسن جو محیطِ کائنات تھی
سمٹ گئی تو مظہرِ شباب ہو کے رہ گئی
ترے کرم کی داستاں کچھ اس قدر طویل تھی
کہ زندگی غموں کی اک کتاب ہو کے رہ گئی

بہار آئی جنوں کو حساب دینا ہو ٭ ہم اپنے جیب و گریباں کا لیکے چلے
یہ تحسین کا رخ تھا، دوسرا رخ بھی دیکھ لیجئے۔

اک بہانہ ہے خمارِ تشنگی در منو اخر
کتنی لذت کوش ہے بادہ گساری کی ہوس

اس میں بڑا الجھاؤ ہے۔ خمار تو نشہ اترنے کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ خمار تشنگی اور لذت کوش کے الفاظ نے مضمون میں عجیب سی پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

اس کی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی ہو
اس میں جاکر کوئی پایاب ہوا ہو تو کہو

"پایاب" کے استعمال میں شاعر کو تسامح ہوا ہے۔ پایاب کہتے ہیں اتھلے دریا کو۔ یہ دریا اور پانی کی صفت ہے نہ کہ پانی میں اترنے والے کی۔ گہرے پانی میں اتر کر کوئی ڈوب جائے تو یوں نہیں کہیں گے کہ وہ پایاب نہیں ہوا۔

خرد نے خاکۂ ہستی پہ رنگ پھیر دیا
جنوں خموش ہے تصویرِ بے کسی کی طرح

اس کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ سوچ کر چل پڑا ہوں تنہا کہ ایک ہی منزلِ طلب ہے
کوئی بھی سمتِ سفر ہو لیکن وہ مل ہی جائیں گے راستے میں

"وہ" جب بغیر مشارٌ الیہ کے آئے تو ظاہر ہے اسکا مصداق ہوتا ہے محبوب۔ عاشق کی "منزلِ طلب" تو محبوب ہے۔ محبوب کی منزل طلب تو اپنی ذات نہیں ہو سکتی پھر یہ کہنا کیسے درست ہے کہ دونوں کی منزل طلب ایک ہے۔ اور اگر یہ مقصد نہیں بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ میری تو ایک ہی منزل طلب ہے تب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ محبوب کا راستہ میں مل جانا کیوں ضروری ہوا۔ اس طرح کے شعر کا یہ کہ خود شاعر کو ایک مرتبہ اس کے مفہوم و مصداق کا جائزہ لے لینا چاہیئے۔

شراب جیسی لطیف شئے بھی سلگ اٹھی آج میکدے میں

یہ استعجاب اس وقت درست ہوتا جب لطیف اشیاء کا سلگ اٹھنا نادر ہوتا۔ آج تو ہر طرف پٹرول سلگ رہا ہے جو شراب سے بھی لطیف تر ہے۔

اس عہدِ نو کا ہر ایک آذر عظیم فنکار اور شاعر
حسین پیکر تراشتا ہے دل و نظر کے صنم کدے میں

یہ مشغلہ عہدِ نو کے ساتھ خاص نہیں۔ فنکار اور شاعر قدیم ترین زمانے سے یہی کام کرتے آئے ہیں۔

زندگی لے گئی یوں مجھ کو تباہی کی طرف
روشنی جیسے لپکتی ہے سیاہی کی طرف

بادی النظر میں شعر خوبصورت ہے مگر تجزیہ کے بعد بے مغز۔ روشنی جب سیاہی کی طرف لپکتی ہے تو یہ سیاہی کے لئے موت کا پیغام ہوتا ہے۔ خود روشنی کو سیاہی کے ہاتھوں ہلاکت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ حالانکہ زندگی جب تباہی کی طرف جائے گی تو خود زندگی کا خسارہ ہوگا۔ تمثیل یا تشبیہ ناقص رہی۔

رات بھیگی ہے گنہگار کے دامن کی طرح
پھول برسا گئے شاید تری زلفوں کے سحاب

زلفوں کے سحاب اگر پھول برسائیں تو بھیگنے بھگونے سے

اس کا کیا تعلق ہے۔ پھول کی جگہ "موتی" ہوتے تو یہ دور کی کوڑی لائی جا سکتی تھی کہ محبوب غسل کر کے آیا ہے۔ پانی کی بوندیں اس کے بالوں میں موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں پھر وہ کسی کے دامن پر گر کر پھیل جاتی ہیں۔ پھولوں اور بھیگنے میں تو کوئی جوڑ نہیں۔ پھر لفظ "گنہگار" جس طرف مشیر ہے اس کے اعتبار سے بھی محض زلف اور پھول کا ذکر مفہوم کی وضاحت نہیں کرتا۔

تو دھڑکتا ہے تو رک جاتی ہے نبضِ کونین
تو بھی کیا چیز ہے آخر اے دلِ خانہ خراب

دل کا دھڑکنا تو معمولات میں سے ہے نہ کہ کبھی کبھار پیش آنے والا واقعہ۔ معلوم نہیں شاعر کیا کہنا چاہتے ہیں (اے کا استعمال بھی یہاں مشاقانہ نہیں ہوا)

راز سربستہ جہاں زیرِ قبا ملتا ہے
غنچۂ گل کی طرح عقدہ کشا ملتا ہے

شاید یہاں مفہوم شاعر "لیکن شاعر" کا محاورہ صادق آتا ہو۔

جلا دیا ہے غمِ دل نے آنسوؤں کے دیئے

یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے "جلا دیئے ہیں" لکھا گیا ہوگا۔

میں پھول بھی چنتا جاتا ہوں اور خار بھی چنتا جاتا ہوں
کچھ آپ کے قدموں کی خاطر کچھ اپنے ہی داماں کی خاطر

"کچھ" کا لفظ وہ مطلب ظاہر نہیں کرتا جو شاعر کا ہے اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ پھولوں اور کانٹوں کے مجموعے سے کچھ حصہ محبوب کی راہ میں ڈالا جائے گا اور کچھ اپنے دامن میں۔ حالانکہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ یہ ہے۔

وہ آپ کے قدموں کی خاطر یہ اپنے ہی داماں کی خاطر

اس طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ پھول تمام تر محبوب کے لئے ہیں اور خار صرف اپنے لئے۔

حوصلے ہوں کہ نہ ہوں دار و رسن کی خاطر
بوالہوس اٹھتے ہیں اصلاحِ چمن کی خاطر

مصرعۂ اولیٰ میں ردیف چست نہیں ہے "دار و رسن کا حوصلہ" صحیح زبان ہے۔ "دار و رسن کی خاطر حوصلہ" خلافِ محاورہ۔

یاد رہے گا دیوانوں کو اہلِ چمن کا حسنِ سلوک
پھولوں کی تو بات الگ ہے خار بھی دامنگیر نہیں

اس بحر کا اصطلاحی نام ہمیں یاد نہیں۔ لیکن یہ سامنے ہے کہ اس کے دونوں مصرعے برابر ہیں۔ مگر اسی غزل میں ذیل کے دو شعر بھی ملتے ہیں۔

آپکی مرضی میرا مقدر آپ کی منشا میری قسمت
وصل ہو جس میں میری خوشی کا وہ میری تقدیر نہیں

یہ لب و عارض یہ رخ تاباں یہ خم گیسو یہ صف مژگاں
آپکے سب انداز ہیں لیکن آپ کی یہ تصویر نہیں

ان دونوں شعروں کے پہلے مصرعے نسبتاً بڑے ہو گئے ہیں بحر "قسمت" اور "مژگاں" پر تمام ہو جاتی ہے۔ بشکل موجودہ دونوں مصرعہائے اولیٰ کی بحر دوسری ہے اور مصرعہائے ثانی کی اپنی الگ۔ ممکن ہے کسی استادِ فن نے اس کا جواز رکھا ہو۔ ہمیں علم نہیں۔

پھوٹ رہی ہے بدن سے مستی شباب کی
عقدہ کشائے حسن تمہاری قبا نہ ہو

"نہ ہو" کا کوئی محل نہیں۔ جب پہلے مصرعہ نے بتایا کہ قبا چست پہنی گئی ہے تو اب کلمۂ شک کی کیا گنجائش۔

ہمیں اس طرح کے اشعار سے دلچسپی ہے جو محبوب کے جسم کی طرف جنسی پرواز میں اشارہ کرتے ہوں۔ مجموعے میں چند اشعار اور بھی ایسے ہی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے تو نازِ حسن بتاں بھی نہ اٹھ سکا
کیا چیز ہے نگاہِ کرم جانتے نہیں

دونوں مصرعوں کا ربط سمجھ میں نہ آ سکا۔

لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے آپ نہ جانے کیا سوچیں گے
میرے آنسو پونچھ لیا ہے ناحق آپ کے داماں میں

"لیا ہے" تو شاید کتابت کی غلطی ہو گئی ہے [illegible] ہے۔ اس مصرعے میں بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے [illegible] مصرعے میں آخر کا "کے" [illegible] ہے جس نے مصرعے [illegible]

اور تعیم صدیقی کے کچھ شہ پارے شامل کئے گئے ہیں۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

(تبصرے کیلئے ہمیشہ دو نسخے بھیجئے)

دینی و علمی ماہنامہ

26 (9)

صدقہ صرف یہی نہیں کہ غربا کو مال دو —
بھی ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرا دو —
یہ بھی ہے کہ کسی کی محنت میں ہاتھ بٹا دو — راستے
پتھر اور جھاڑ جھنکاڑ ہٹا دینا بھی صدقہ ہے —
صدقہ ہے کہ ملنے والوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ
باتوں کی تلقین کرنے اور بری باتوں سے منع کرنے
اللہ کے آخری رسولؐ نے "صدقہ" فرمایا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست فروری ۱۹۷۵ء

پاکستانی حضرات
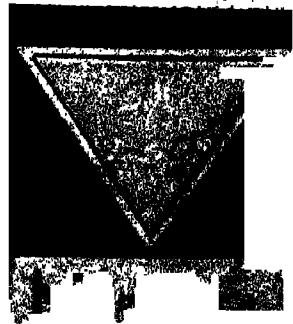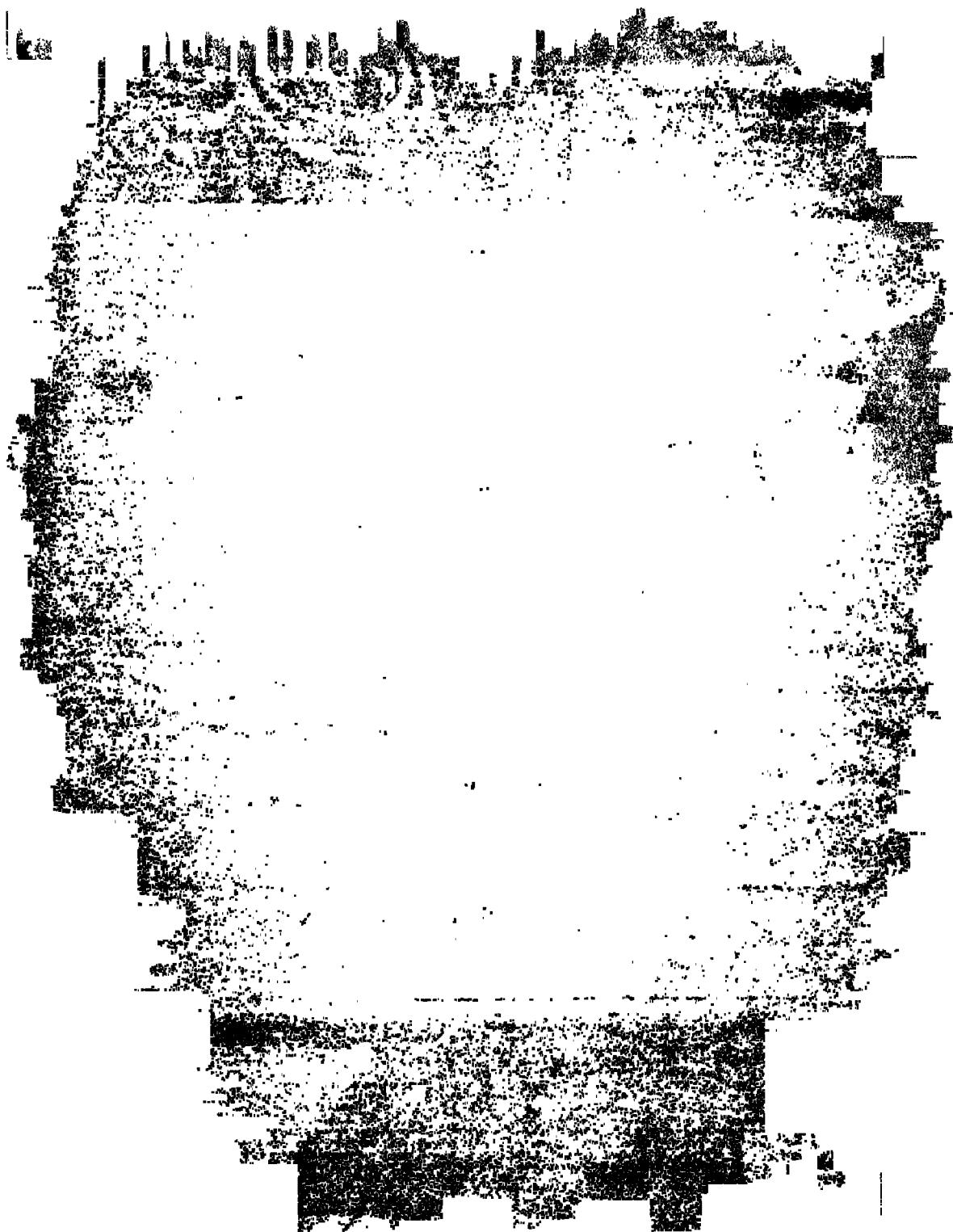
پاکستانی حضرات سالانہ خریداری کیلئے ۲۵ روپے کا منی آرڈر درج ذیل پتے پر بھیجیں:-

مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار۔
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی۔

پھر منی آرڈر وصول ہو جانے کی جو دستخطی رسید واپس آئے اسے ہمارے پاس لفافے میں بھیج دیں پرچہ جاری ہو جائیگا۔
منیجر تجلی۔ تجلی آفس۔ دیوبند (یو۔پی)

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔ بحرین افریقہ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

۲۶ ویں سال کا نواں شمارہ

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر عامر عثمانی

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

سالانہ قیمت بیس روپے ۲۰

اس شمارے کی قیمت ۲ دو روپے

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوالِ واقعی

تصحیح الاغلاط

(۱) دسمبر ۷۴ء کے شمارے میں "تجلی کی ڈاک" کے تحت صفحہ ۳۵ پر ہم نے جناب فضا ابن فیضی کے ایک شعر کو بایں طور نشانۂ اعتراض بنایا تھا کہ "باور آنا" خلافِ محاورہ ہے۔ اشاعت کے بعد نہ جانے کتنے قارئین نے خطوط کے ذریعہ تنبیہ فرمائی کہ تمہارا اعتراض غلط ہے۔ ثبوت میں غالب کا معروف مصرعہ لکھا —— باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا لطف یہ ہے کہ یہ شعر خود ہماری یادداشت کے کسی گوشے میں عرصہ سے استراحت فرما تھا۔ پہلی ہی تنبیہ پر آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور ہمیں اپنی حالت پر تعجب ہوا کہ کس عالم میں ہم نے فضا صاحب پر اعتراض جڑ دیا ہے۔ خدا ان بزرگ کی مغفرت فرمائے جنھوں نے درج ذیل شعر کہا تھا:-

مجھے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ہمیں خوشی ہے کہ قارئینِ تجلی میں بہت لوگ ایسے موجود ہیں جو بروقت ہمیں ہماری غلطیوں پر ٹوک سکتے ہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ بعض اوقات ہم سے فاحش غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ امید ہے فضا صاحب اس قصور کیلئے معاف فرمائیں گے۔

(۲) ایک کرم فرما کے خط سے پتا چلا کہ دسمبر کے شمارے میں صفحہ ۶۸ پر عبارت یوں چھپی ہے:-

"تم ہر طرح کی کامرانیوں سے دوچار ہو سکتے ہو۔"

کرم فرما کی گرفت درست تھی کہ "دوچار" کا لفظ یہاں بے محل ہے۔ "ہمکنار" ہونا چاہیئے۔ ہم نے اپنا مسودہ دیکھا۔ وہاں "ہمکنار" ہی تھا۔ گویا چوک ہم سے نہیں ہوئی کاتب صاحب نے کمالِ فن دکھایا۔ یہ بات ہم سخت معیوب تصور کرتے ہیں کہ اپنی غلطی کاتب اور مصحح کے سر مڑھ دیں مگر یہاں قصور ان ہی صاحبان کا نکلا۔ ہمارے قلم نے "ہم کنار" ہی لکھا تھا۔ یقین کرنا نہ کرنا قارئین کے اختیار میں ہے۔

لطیفہ

کچھ نہ کچھ لیٹ ہونا تو تجلی کا مقدر ہی ہے۔ تجلی کا رونا آپ ہزار بار سن چکے۔ وہ بیچاری تو جوں کی توں اپنی وضع کی پابند ہے ہی مگر اب کی یہ بھی ہوا کہ عین اس وقت جب جنوری ۷۵ء کا تجلی پوسٹنگ کے لئے تیار تھا تو ڈاکخانے کی وہ ریڑھی (ٹھیلی۔ گاڑی) اپاہج ہو گئی جس میں ڈاک لد کر ریلوے اسٹیشن تک جاتی ہے۔ راقم الحروف اس سفر پر جانے سے پہلے جس کی تفصیل آگے دی جا رہی ہے یہ شمارہ نہ صرف مکمل کر گیا تھا بلکہ اس کا بڑا حصہ چھپ بھی چکا تھا۔ توقع تھی کہ اہلِ دفتر اسے جنوری کے پہلے ہفتے میں پوسٹ کر دیں گے۔ لیکن واپسی پر معلوم ہوا کہ ریڑھی خراب ہو جانے کے باعث پوسٹنگ میں چھ سات دن زائد لگ گئے ہیں۔ یہ بس حکایت ہے شکایت نہیں۔ شکایتیں تو اب ساری حشر کے دن پر اٹھا کر رکھدی ہیں۔

(۳) پچھلے شمارے میں "آپ تقریر کیسے کریں" کے تبصرے میں مصنف کا نام نجم الدین اصلاحی چھپ گیا ہے۔ درست "احیائی" ہے۔

رُوداد سفر

اندازہ کیجئے۔ ۲۸ر دسمبر ۶۷ء میں رات کے سوا گیارہ بجے جنتا جینتی ایکسپریس نئی دہلی کے اسٹیشن سے چلی تھی اور چوتھے روز ۳۱ر دسمبر کی صبح سوا دس بجے اس نے ہمیں منگلور کے اسٹیشن پر اُتارا۔ یہ مسافت تقریباً اتنی ہے کہ دہلی سے بمبئی دو بار ہو آیا جائے۔ راقم الحروف طویل اسفار کا عادی نہیں ہے۔ تجلّی کی گوناگوں ذمہ داریوں میں اس کا موقعہ بھی نہیں کہ معتد بہ وقت کسی اور مشغلے میں صرف کیا جائے مگر حالات کبھی کبھی مجبور بھی کر دیتے ہیں۔ یہ سفر مجبوری ہی کا شاخسانہ سمجھیئے۔

ہوا یوں کہ جماعتِ اسلامی ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی میں بندہ بھی حاضر تھا۔ آخری دن اس کی ایک ادبی نشست ہوئی جس میں احقر کو بھی کچھ پڑھنا پڑا۔ کچھ سے مراد ہے کلامِ منظوم۔ اس نشست میں جناب حفیظ میرٹھی بھی تھے "ابوالمجاہد زاہد بھی، عروج قادری بھی اور دہلی کے بعض خوشگو شعراء بھی۔ اناؤنسمنٹ یعنی شاعروں کے نام نشر کرنے کا فریضہ جناب م۔ نسیم انجام دے رہے تھے۔ م نسیم حلقۂ ادبِ اسلامی کی معروف شخصیت ہیں۔ نثر اچھی لکھتے ہیں۔ غالباً جماعتِ اسلامی کے رکن بھی ہیں۔ بدذوقی ہوگی اگر اس لطیفے کا ذکر نہ کیا جائے جو اس دلچسپ نشست میں پیش آیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ اناؤنسر جب کسی شاعر کو مائک کے آگے بلاتا ہے تو اس کا ضروری تعارف بھی کرا دیتا ہے۔ م نسیم صاحب یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ ناچیز کا خیال تھا کہ جب وہ مجھے پکاریں گے تو میرے نام کے ساتھ "مدیر تجلّی" کا اضافہ ضرور فرما دیں گے تاکہ آگے مجھے کچھ کہنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جماعتِ اسلامی کے اس اجلاس میں شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو جو "تجلّی" سے واقف نہ ہو۔ اجلاس کے تین دنوں میں بلا مبالغہ ہزاروں افراد نے ناچیز سے حسنِ ذوق و شوق اور محبت و عقیدت کے ساتھ ملاقات کی

اس سے ظاہر تھا کہ تجلّی ان سب کو عزیز ہے۔
بہر حال یہ ایک تاریخی بات ہوتی اگر محترم اناؤنسر ناچیز کے تعارف میں صرف "مدیر تجلّی" کے الفاظ اپنی مبارک زبان پر لے آتے مگر خدا جانے انھوں نے کیا سوچ کر تعارف کچھ اس انداز میں کرایا۔
"اب آپ کے سامنے عامر عثمانی آرہے ہیں
جو لکھنؤ کے حلقۂ ادبِ اسلامی کے صدر ہیں"۔
میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ موصوف نے ٹھیک وہی الفاظ فرمائے تھے جن پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔ یہ بہر حال طے ہے کہ انھوں نے "صدارت" کا ذکر کیا تھا۔ میں حیران کہ یا اللہ یہ کونسی صدارت ہے جو محترم م۔ نسیم نے ازراہِ عنایت مجھے عطا فرمادی ہے۔ اس کا تو تصور تک نہیں کرسکتا تھا کہ اب سے کم و بیش بیس سال پہلے لکھنؤ کے کسی جلسے کی صدارت اگر غلطی سے کسی نے مجھ نالائق کو سونپ دی تھی تو نسیم صاحب اس کا ذکر ضروری سمجھیں گے۔ یہ صدارت تو مجھے یاد بھی نہیں تھی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے قیاساً بتایا کہ شاید انکا اشارہ لکھنؤ کے جلسے والی صدارت کی طرف تھا۔ حاضرین میں سے شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس "تعارف" کا مطلب سمجھا ہو۔ جی چاہا کہ کلام پیش کرنے سے پہلے محترم اناؤنسر سے تعارف کی وضاحت چاہوں اور دریافت کروں کہ لفظ تجلّی میں کونسا زہر تھا جس کے ڈر سے آپ اسے اپنی زبانِ مبارک پر نہ لاسکے اور ایک ایسے تعارف کی زحمت فرمائی جو حاضرین کے لئے چیستاں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے یہ شکایت نہیں کہ مجھ نالائق کے نام سے موصوف نے جناب اور صاحب کے الفاظ کا جوڑ مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ دوسرے تمام شعراء اس سے نوازے گئے مگر یہ شکایت ضرور ہے کہ محترم اناؤنسر نے ارادی یا غیرارادی طور پر ایک ایسا عجیب و غریب تعارف کرایا جو بجائے تعارف کے "تجاہل" قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

لطیفہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ میں اگر محترم اناؤنسر کے اس لطفِ خاص پر برملا کچھ عرض کرتا تو اندیشہ تھا کہ انھیں شرمندگی اٹھانی پڑے اس لئے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں نے نعتیہ اشعار سے پڑھنے کا آغاز کیا۔ خیال یہ تھا کہ پہلے چند نعتیہ شعر ہوجائیں پھر وہ چند اشعار پیش کروں جو اجتماع سے متأثر ہوکر فوری طور پر کہے گئے ہیں لیکن سامعین کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں نعتیہ کلام کا سلسلہ کافی دراز ہوگیا اور پانچ چھ قطعات کے بعد وہ نظم بھی مجھے پڑھنی پڑی جو "صلے اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے تجلّی میں چھپ چکی ہے۔ عادت پڑھنے کی ہے نہیں مسلسل دیر تک پڑھنے کے باعث تھک گیا تو نظم ختم کرکے مائک کے آگے سے ہٹ آیا۔ خیال تھا کہ دوبارہ اگر نوبت آئی تو اجتماع والے اشعار پڑھ دوں گا۔ دوبارہ نوبت آنے کی توقع اس لئے تھی کہ خود نسیم صاحب بعض شعراء کو دوبارہ زحمتِ سخن دے رہے تھے۔ نہ صرف زحمت دے رہے تھے بلکہ جناب حفیظ میرٹھی کے کلام پر تو انھوں نے کافی دیر ایک توصیفی تقریر بھی فرمائی۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ حاضرینِ مشاعرہ اتنے عقلمند ہرگز نہیں ہوسکتے کہ کلامِ حفیظ کی باریکیوں اور خوبیوں کو پوری طرح سمجھ سکیں لہٰذا میرا فریضہ ہے کہ انھیں رہنمائی دوں۔ ایسے شفیق و کریم اناؤنسر سے میرا یہ امید کرنا بے جا تو نہیں ہوسکتا تھا کہ مجھ گناہگار کو بھی وہ ایک بار اور یاد فرمائیں گے۔
لیکن مشیتِ ایزدی میں کسے چارہ ہے۔ وہ ناچیز کے کلام سے شاید ابتداً ہی اس قدر بیزار ہوگئے تھے کہ دوبارہ سننے کی تاب ہی نہیں تھی۔ سامعین نے انھیں ضبطِ نفس کرتا دیکھ کر خود ہی آواز اٹھائی کہ عامر عثمانی کو لاؤ۔ اب وہ مائک کی طرف بڑھے اور ناچیز نے خیال کیا کہ نہ سہی ذوق و شوق کے ساتھ بادلِ ناخواستہ ہی سہی اب وہ کسی ماسٹر کی طرح حاضری لینے کے انداز میں کہیں گے کہ عامر عثمانی حاضر ہے؟ اور بندہ کورنش بجا

لائے گا کہ حاضر جناب!

لیکن انھوں نے تو تقریر شروع کر دی۔ تقریر بھی کوئی بری چیز نہیں۔ مگر اقبال نے کہا تھا:۔

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ہر شے کا ایک محل ہوا کرتا ہے۔ بعض لوگ اب مشاعروں میں بھی تقریریں کرنے لگے ہیں۔ اناؤنسر حضرات نے مستقلاً یہ وطیرہ بنالیا ہے کہ اپنی طلاقتِ لسانی اور خوش گوئی کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے شاعروں کے حصے کی بھی کچھ داد خود وصول کر لے جائیں۔ راقم الحروف میدانِ مشاعرہ کا مرد نہیں۔ عرصہ ہوا یہ وادی چھوڑ دی ہے لہذا اناؤنسمینٹ کی اس نئی قسم پر تفصیلی اظہار رائے بھی فضول۔ لیکن م۔ نسیم صاحب نے اس وقت جو تقریر کی ہے اس کا بین السطوری خلاصہ لطیفے کو مکمل کرتا ہے اس لئے آپ بھی سُن لیجئے۔ الفاظ کچھ بھی رہے ہوں حاصل ان کا یہ تھا کہ دیر کافی ہو گئی ہے عامر عثمانی جیسے گھٹیا شاعر کو سننے میں سامعین مزید وقت برباد کریں یہ شرافت کے خلاف ہے۔ آپ کو صبح اٹھنا بھی ہے۔ دس پندرہ منٹ اور عامر عثمانی نے لے لئے تو نظامِ کائنات تہ و بالا ہو جائے گا۔ سمندر خشکیوں پر چڑھ آئیں گے۔ وغیر ذالک۔

میرا خیال ہے محترم م۔ نسیم صاحب نے تقویٰ سے کام لیا۔ اب دو بج رہے تھے۔ انھیں غالباً تہجد پڑھنا ہوگا یہ کہنا تو تقویٰ کے خلاف ہوتا کہ مجھے تہجد پڑھنا ہے لہذا مشاعرہ ختم کرتا ہوں۔ کچھ اِدھر اُدھر کی کہہ کر انھوں نے مشاعرہ ختم کر دیا اور عامر عثمانی غریب سوچتا ہی رہ گیا کہ ایک تہجد گذار مردِ مومن کو آخر مشاعرے جیسے "خرافاتی اجتماع" کا اناؤنسر کس گدھے نے بنا دیا تھا۔ بقول شاعر:

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ سب جملۂ معترضہ تھا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ آخر مجھ جیسے گمنام شاعر کو بھٹکل کے مشاعرے کی دعوت کیوں اور کیسے مل گئی۔ شدنی ہو کر رہتی ہے۔ مذکورہ نشست کے اگلے روز بھٹکل کے انجمن کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر سیّد انور علی صاحب ناچیز سے ملے اور فرمایا کہ تجھے بھٹکل کے مشاعرے میں شریک ہونا ہے جو ۱۵ دسمبر [illegible] کو منعقد ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ محترم! اتنا لمبا سفر میرے بس کی بات نہیں۔ نہ صحت اس کے لئے سازگار ہے نہ مصروفیات اس کی اجازت دیتی ہیں۔ انھوں نے اس اعتذار کو ایک خوبصورت مسکراہٹ کے خنجر سے موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے فرمایا کہ جانا تو تجھے ضرور پڑیگا۔ حفیظ میرٹھی بھی جائیں گے سفر تنہا نہیں کرنا پڑے گا۔ لفظ بہ لفظ مکالمہ تو یاد نہیں۔ حاصلِ گفتگو یہ نکلا کہ ڈاکٹر صاحب کے حسنِ اخلاق اور حسنِ اصرار کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہامی بھر لی۔

پھر دیوبند کے قیام میں رام پور سے دعوتنامہ ملا کہ مرکزی درسگاہ ۱۶ دسمبر میں ایک ادبی نشست کر رہی ہے اس میں تیری حاضری ضروری ہے۔ جواب دینا پڑا کہ بھائی ۱۵ دسمبر کے لئے بھٹکل والوں سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر وہاں سے باضابطہ دعوت نامہ آگیا تو انکار کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ الکریم اذا وَعَدَ وفا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر بھٹکل کا پروگرام کسی وجہ سے ٹل جائے تو ضرور آنا۔ میاں ارشاد کسی صاحبِ کرامت ہی کا تھا لہذا بھٹکل سے تار آیا کہ مشاعرہ ۲ جنوری [illegible] پر ملتوی کر دیا گیا ہے اس کے بعد باضابطہ دعوت نامہ بھی آگیا۔

رام پور کی حاضری میرے لئے بلاشبہ مسرت بخش تھی۔ رام پور میں میرے بہت ہی محبوب عزیز شمس [illegible] عثمانی بھی ہیں اور جماعت اسلامی کے متعدد افراد بھی یقیناً محبوب ہیں جیسے مولانا عروج قادری۔ مولانا [illegible] اصلاحی۔ برادرم ابوالمجاہد زاہد وغیرہ۔ وہاں کی [illegible] باوجود خرابیٔ موسم کے دلچسپ رہی۔ دوستوں کے [illegible] پر اجتماع سے متعلق اشعار بھی سنانے پڑے۔ اگر [illegible] انھیں سنانے کو دل نہیں چاہتا تھا اگر م۔ نسیم صاحب [illegible]

محفل میں ہوتے تو ہرگز نہ سناتا۔ بلکہ شاید کچھ بھی نہ سناتا دہلی کی ادبی نشست سے اندازہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ محترم مرتسیم صاحب کی لکھنوی طبیعت پر عامر عثمانی کی کرخت و کریہہ آواز شاید بہت ہی گراں گذرتی ہے۔ یہ خدا کی شان ہے بھلا منطقی یا نفسیاتی توجیہہ اس کی ہم یا آپ کیوں کریں۔

بات بھٹکل کی چل رہی تھی۔ دعوت کی شانِ نزول آپ نے سن ہی لی۔ ۲۱ر کو منگلور کے اسٹیشن پر اتر کر بھٹکل تک کیسے پہنچے یہ بعد میں سنیے گا۔ پہلے یہ گوش گذار فرمالیجیے کہ ناگپور کے اسٹیشن سے دو اور شاعرانِ کرام ہم سفر بنے جو بھٹکل ہی جا رہے تھے۔ شمسی مینائی اور اور ناظم انصاری۔ شمسی مینائی کافی شہرت یافتہ نظم گو شاعر ہیں یہ بات اتنی اہم نہیں جتنی یہ بات اہم ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ شاعر اور صوم و صلوٰۃ ـــ ہنسی کی بات ہے لیکن کرشمۂ قدرت کو کیا کہیے کہ جنتا جنتی کے ڈبوں میں چاروں ہی "نمازخواں" شاعر جمع ہو گئے۔ ناظم صاحب مزاح گو ہیں اور نہیں کہہ سکتا کہ عام دنوں میں روزانہ کتنی نمازیں پڑھ لیتے ہوں گے۔ یہاں بہرحال انھوں نے پوری طرح ساتھ دیا اور چشمِ فلک نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ شاعروں کی قوم ریل میں نمازیں پڑھتی جا رہی ہے!

اسے تعفن مت سمجھیے۔ شاعر لوگ متقی تو پہلے بھی کم ہی ہوتے تھے۔ اب تیج کی شراب نوشی ان میں اس حد تک عام ہو چکی ہے کہ عین مشاعرے میں پیتے ہیں ڈٹ کر پیتے ہیں۔ فخر سے پیتے ہیں۔ پھر ایک انقلاب دوران یہ ہوا ہے کہ تیزی سے شاعرات بھی زینتِ اسٹیج بننے لگی ہیں۔ صورتیں کیسی بھی ہوں، عورت بہرحال عورت ہے اور جب وہ نک سک سے درست اور تیر تلوار سے لیس ہو کر جلوہ آرا ہو تو فضا ویسے بھی بادۂ جام کے لئے کچھ زیادہ ہی سازگار ہو جاتی ہے۔ شعر کیسے ہیں کس نے لکھے ہیں کیوں لکھے ہیں۔ یہ مولویانہ بحث بھلا سامعین کیوں چھیڑیں اور مشاعرہ کرانے والے خوش فکرے بھی ایسے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں۔ سوال تو مشاعرے کی کامیابی کا ہے۔ عوام جب اشتہار میں پڑھ لیتے ہیں کہ فلاں محترمہ اور فلاں مکرمہ بھی رونق طراز ہونے والی ہیں تو خواہی نخواہی انھیں بزمِ مشاعرہ تک قدم رنجہ فرمانا ہی پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ شاعرات "مسز فلاں" نہیں کہلاتیں بلکہ فلمی ستاروں کی طرح انھیں صدیوں تک "مس" ہی کہا جاتا ہے۔ یہ بہرحال اپنی اپنی قسمت ہے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ چار مولوی شاعر نمازیں پڑھتے مشاعرے تک پہنچے۔ غضب یہ تھا کہ مشاعرے کے سرپرست جناب ڈاکٹر سید انور علی بھی نماز کی حد تک مولوی ہی نکلے اور دو ہزار میل سے آنے والے چار تھکے ماندے شاعروں کو سب سے پہلے مصلے ہی سے واسطہ پیش آیا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ جو آتا گیا مصلے کے چکر میں پھنستا گیا۔ غنیمت ہے اُدھر سردی نہیں تھی۔ وضو کرنے والے خدا کا شکر بھیج سکتے تھے کہ اسی بہانے انھیں برابر منہ دھونے کا موقعہ نصیب ہوتا رہا۔ سردی ہوتی تو یہ فعلِ مسلسل بعض حضرات کو عذاب ہی کے ہم معنی محسوس ہوتا۔

منگلور سے بھٹکل تک بس اور ٹیکسی کا راستہ تقریباً پانچ گھنٹے کا ہے۔ کچھ فاصلہ بس سے طے کیا گیا پھر ٹیکسی لی۔ راستہ اس قدر دلکش اور سرسبز و شاداب تھا کہ سفر کی تکان ایک رومانی کیف و سرشاری میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ چھوٹے بڑے پہاڑ، وادیاں، نخلستان، ندیاں اور تالاب۔ کتنا حسن تھا ان قدرتی مناظر میں۔

اُدھر کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ لوگ کثرت سے "ابوبکر" نام رکھتے ہیں۔ ہم شاعروں کے علاوہ ایک اور صاحب بھی ٹیکسی میں شریکِ سفر تھے۔ ان کا نام بھی "ابوبکر" ہی تھا۔ یہ بھٹکل ہی کے رہنے والے تھے کہیں باہر سے مع اہلیہ تشریف لا رہے تھے۔ ان کے حسنِ اخلاق سے اہلِ بھٹکل کے بارے میں بڑا اچھا تاثر قائم ہوا۔

مہمان نوازی کی شان انھوں نے اس طرح دکھلائی کہ
بمشکل پہنچکر پوری ٹیکسی کا کرایہ خود ادا کیا حالانکہ اسے
ہم سب پر برابر برابر تقسیم ہونا چاہئے تھا۔

ہمارے میزبان ڈاکٹر سید انور علی صاحب نماز کی
حد تک مولوی بے شک تھے لیکن باقی امور میں ہم سے
کم زندہ دل نہیں تھے۔ خوش گفتار، بے تکلف، سادہ
مزاج ہنسنے ہنسانے کے دلدادہ۔ انھوں نے کچھ شعراء
کو اپنے درِ دولت ہی پر ٹھیرا لیا تھا مگر ہم چاروں کو ایک
ایسی قیام گاہ میں ٹھیرایا جسے کوٹھی کہیئے تب بھی غلط
اور نہ کہیئے تب بھی غلط۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا
جس میں بہت سے کمرے تھے۔ محلِ وقوع نہایت پُر
فضا۔ ارد گرد بہت سا میدان۔ کچھ فاصلے پر چھوٹے
بڑے پہاڑ۔ نیچی اونچی وادیاں۔ درمیان سے گذرتی ہوئی
تارکول کی کالی سڑک۔ صبح سویرے تو یہ مجموعی منظر
بڑا ہی رومان پرور اور خواب ناک محسوس ہوتا تھا۔
معلوم نہیں یہ مکان پہلے سے خالی پڑا تھا یا فوری ضرورت
کے لئے خالی کرایا گیا تھا۔ چند ہی روز کے لئے سہی مگر
ایک مستقل کمرہ عاجز کے نام الاٹ ہو گیا۔ مرض کہیئے
یا مالیخولیا۔ عاجز بہر حال یہ پسند کرتا ہے کہ الگ کمرے
میں سوئے خواہ اس کمرے کا قطر قبر ہی کے برابر ہو۔ یہ
کمرہ قبر سے تقریباً آٹھ گنا بڑا تھا۔ پختہ اور صاف ستھرا
سونے کے لئے اگرچہ چارپائی نصیب نہ ہو سکی لیکن چارپائی
نما میز پر اتنا موٹا گدا ڈال دیا گیا کہ ریل کے سابق سکنڈ
کلاس کا مزا آ گیا۔ ناچیز ویسے بھی کبھی کبھی تخت پر سو لیتا
ہے تاکہ جیل کا سیمنٹ والا مرقد ہڈیوں کے لئے بالکل
ہی نامانوس نہ رہے۔ یہ عادت جیل جانے کے بعد سے
ڈالی ہے۔ جیل برحق ہے کون جانے پھر کب مہمانی کا
شرف حاصل ہو جائے۔

تاریخ ابھی ۳۱ دسمبر تھی اور مشاعرہ ۲ جنوری کو
تھا۔ صبح کی سیر میں یکم جنوری کو ڈاکٹر صاحب بھی شامل
ہوئے اور کم سے کم میں تو اتنا محظوظ ہوا کہ اگر ایسی سیر
کے لئے اتنا لمبا سفر کر لیا جاتا تو سودا مہنگا نہ ہوتا۔ ڈاکٹر
صاحب نے مشاعرے کا یہ کھڑاگ پہلی بار پھیلایا تھا اس لئے
مہمان داری کے انتظامات میں کچھ نہ کچھ خامیاں تو رہنی
ہی چاہئیں تھیں۔ ان خامیوں نے بعض مہمانوں کو تھوڑی
بہت تکلیف پہنچائی ہو یہ بھی حیرت ناک نہیں۔ لیکن
قصد و شعور کی حد تک ہماری خاطر داریوں میں کسر نہیں
چھوڑی گئی۔ حد ہے کہ راقم الحروف کو چار بجے شب والی
چائے بھی مہیا ہوئی۔ چار جون جولائی میں تو صبح کے وقت
بجتے ہیں مگر دسمبر اور جنوری میں تو اذانِ فجر بھی پانچ کے بعد
ہی ہوتی ہے لہذا چار بجے والی چائے کو "چائے نیم شبی" کے
سوا کیا کہیئے۔ تعبیر شاعرانہ رخ سے ہے۔ مولویانہ زاویۂ نظر
سے اسے "تہجد والی چائے" کہہ سکتے ہیں یہ الگ بات ہے
کہ پینے والے کو تہجد کی توفیق ہو یا نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی
قیام گاہ اور ہمارے الاٹ شدہ مکان میں تقریباً دو
فرلانگ کا فاصلہ تھا اس لئے رات میں چار بجے چائے
کا مہیا ہو جانا وضاحت چاہتا ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ
جو لوگ نفس کے غلام ہوں انھیں اپنے نفس کی ضیافت
اور میزبانی کا ہر ممکن اہتمام خود ہی کرنا چاہئیے۔ دوسروں
سے بہت زیادہ توقعات نہیں باندھنی چاہئیں۔ میں بھی
غلامانِ نفس ہی کے زمرے میں شامل ہوں لہذا سفر میں
متعدد ایسی چیزیں بھی ساتھ رکھتا ہوں کہ بعض ثقہ قسم کے
حضرات انھیں دیکھ کر ہنس دیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے شاید یہ
بھی کہتے ہوں کہ تجلی کا ایڈیٹر مراقی ہے۔ مثلاً موم بتی جسے
کمر بند ڈالنے کی سلائی۔ فالتو ماچس۔ ٹاٹ جس پر مصلیٰ
بچھایا جا سکے۔ بسکٹ وغیرہ وغیرہ۔

اس وغیرہ وغیرہ میں تھرمس بھی شامل تھا۔ بے حیائی
کہہ لیجئے یا جسارتِ بے جا۔ میں نے بہر حال گیارہ بجے
رات ڈاکٹر صاحب سے تھرمس میں گرم چائے بھروالی اور
رات میں چار بجے نہ صرف میں نے بلکہ شمسی مینائی نے بھی
اسے مزے لے کر پیا۔

مزید سنیئے۔ اسی وقت یعنی چار بجے شب میں بھی

بھاگ گئی۔ اتنا اندھیرا کہ چاٹے والے ہاتھ کو منھ کا پتا نہ چلے۔ شمسی صاحب کا متبسم چہرہ بھی نظروں سے غائب "محفل نیم شبی" کا سارا مزا ہی کرکرا ہوا جا رہا تھا، لیکن مذاق کام آگیا۔ موم بتی نے وہ کام کیا جیسے شمس بازغہ طلوع ہو گیا ہو۔ ایسے ہی موقعہ کے لئے شاعر نے کہا ہے

جب خدائے عشق نے توفیق دی سر جھک گیا
اپنے سر کے ساتھ اپنا آستاں رکھتا ہوں میں

مسجد قریب ہی تھی۔ اذان کی صدا اس وقت بلند ہوئی جب چہل قدمی کا مرض مجھے قریب کی ایک سرسبز وادی میں ٹہلا رہا تھا۔ شمسی صاحب اس لغویت میں میرا ساتھ نہ دے سکے۔ ناظم صاحب نے بھی ان کا ہی ساتھ دیا۔ گویا؎

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب!

داستان اگر اسی تفصیل سے دہرائی جائے تو شاید قارئین بدمزا ہو کر ورق ہی الٹ دیں گے اس لئے آمدم برسر مطلب کہہ کر ناچیز شبِ مشاعرہ کی طرف آتا ہے:-

ٹکٹ دس روپے سے سو روپے تک رکھا گیا تھا۔ جی ہاں ٹکٹ۔ ٹکٹ کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مشاعرہ بگاڑنے والے سامعین شرکت کا موقعہ نہ پاسکیں۔ جو شخص پیسے خرچ کر کے شریکِ مشاعرہ ہوگا وہ نہ تو اختتام سے پہلے بھاگنا پسند کرے گا نہ شور و شر مچائے گا۔ پرانا قصہ ہے کہ ایک سرحدی پٹھان نے قلاقند کے دھوکے میں صابن خرید لیا۔ اب جو کھایا ہے تو برے برے منھ بننے ہی تھے۔ کسی نے پوچھا کہ خان کیا بات ہے۔ انھوں نے کہا خان اپنا پیسہ کھاتا ہے۔

کم و بیش اسی طرح ٹکٹ خرید کر مشاعرہ سننے والا آدمی بھدے سے بھدے مشاعرے کو بھی اس لئے برداشت کرتا ہے کہ نقد پیسہ خرچ ہوا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شاعروں کو "اپنی روزی آپ کمانے کا درس ملتا ہے۔ شاعر لوگ زادِ راہ اور کچھ نہ کچھ نذرانے بغیر تو قدم رنجہ فرمانے سے رہے۔ ان کی پیٹ بھرائی کی دو ہی شکلیں ہیں۔ یا تو مشاعرہ کرانے والے کسی اور طرح فنڈ جمع کریں یا پھر ٹکٹ والا راستہ اختیار کریں۔ یہ دوسرا راستہ عموماً اس حد تک نافع بلکہ انفع ثابت ہوتا ہے کہ دینے دلانے اور کھلانے پلانے کے بعد بھی اچھی خاصی رقم بچ ہی رہتی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ مشاعرے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بے ٹکٹ کا تماشا کیا اہمیت رکھے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی چوتھا اور پانچواں فائدہ بھی ہو۔ بہرحال جتنی جگہ سامعین کے لئے رکھی گئی وہ بڑی حد تک بھر ہی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجموعی شمار ہزاروں میں نہیں بس سیکڑوں میں کیا جا سکتا تھا۔

شریکِ بزم تمام شعراء کے نام تو یاد نہیں۔ تھے بہرحال کافی تعداد میں۔ رشید کوثر۔ برمی ٹونکی۔ قمر ٹونکی۔ خلش بنگلوری۔ فطرت بھٹکلی۔ ہم چار۔ بعدہ آغاز دس بجے ہوا تھا۔ اختتام پانچ بجے۔ اتنا طول شعراء کی کثرت کی بنا پر نہیں کھنچا۔ کھنچا اس لئے کہ سب شاعروں سے دو دو غزلیں پڑھوائی گئیں اور ہم چاروں سے تو شاید اس لئے ان گنت پڑھوائی گئیں کہ زیادہ دور سے آئے تھے ——— اور اسی مناسبت سے ہمیں اپنی روزی کچھ زیادہ کمانی تھی۔ کس نے زیادہ داد بٹوری اور کون مشاعرے کا دولھا بنا یہ بتانا میرا کام نہیں۔ کچھ لوگوں نے غالباً پورا مشاعرہ ٹیپ کیا تھا۔ اس ٹیپ سے جو غائب حضرات اپنی سمع خراشی پسند کریں گے وہی فیصلے بھی دیں گے۔ مجھے تو ذرا سا صدمہ اس بات کا ہوا کہ بھٹکل کے عوام تک ہم اپنی آواز نہیں پہنچا سکے۔ اگر ٹکٹ دو روپے بھی ہوتا تو مجمع یقیناً دگنا تگنا ہو جاتا۔ مجمع کی زیادتی ہی شاعر اور مقرر کی سب سے بڑی حوصلہ افزائی ہے۔ ہاں ان شعرائے کرام کی بات الگ ہے جو تمام تر توجہ "نذرانے" ہی پر مرکوز کئے رکھتے ہیں اور یہ محسوس کرنے کی فرصت ہی انھیں نہیں ملتی کہ سامعین کم ہیں یا زیادہ۔

چنانچہ بعد میں یہ بات سنی میں ڈاکٹر صاحب سے
معلوم ہوئی کہ عوام کے کچھ نمائندے مشاعرے کی
اگلی صبح ان سے ملے تھے اور خواہش ظاہر کی تھی کہ
ہم ٹونک میں مشاعرہ کرتے ہیں شعرائے کرام انہیں زحمت
فرمائیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب تو خوشی آمادہ ہو گئے
تھے لیکن کسی شاعر صاحب نے ان سے فرمایا کہ مزید مشاعرہ
ہوگا تو پیسے بھی اور ملنے چاہئیں۔ یہ سنکر ڈاکٹر صاحب
سوچ میں پڑ گئے کہ بھلا اور پیسے شعراء کو کہاں سے
دیئے جائیں گے۔ سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالا ہی بالا
انھوں نے سوامی خواہش کو مسترد کر دیا۔ کاش وہ
مسترد نہ کرتے۔ ان کا یہ خیال کرنا درست نہیں تھا کہ
سارے ہی شاعر مزید پیسوں کے خواستگار ہوں گے۔
مثلاً حفیظ میرٹھی اور رشید کوثر نہ مانگتے اور میرے
بارے میں تو ڈاکٹر صاحب جانتے ہی تھے کہ شروع سے
آخر تک پیسوں کا کوئی ذکر ہی میرے اور ان کے
مابین نہیں آیا۔ کیا ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا۔ اس
بحث میں پڑنا ان بڑے شاعروں کا کام ہوتا ہے
جو عوامی شہرت کے مالک ہیں اور دعوت دینے والوں
سے سودا کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ عاجز شاعر کی
حیثیت سے قطعاً گمنام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بمشکل
بلا لیا یہ ان کا حسن کرم تھا ورنہ مجھ جیسوں کو گھاس کون
ڈالتا ہے۔ انھوں نے اپنے کالج کے ارباب حل و عقد
کی مشورت سے عاجز کے لئے جو بھی رقم تجویز کی اپنی
صوابدید سے۔ میں جب از راہ اخلاق حاضری کی ہامی
بھر چکا تھا تو چاہے مجھے کچھ نہ ملتا جب بھی ضرور پہنچتا
ایسا شخص بھلا ان دوسرے مشاعرے کی "مزدوری"
کیونکر طلب کر سکتا تھا جو وہیں کے وہیں منعقد ہونے جا
رہا تھا۔ حضرات [illegible] کے دو دن مزید ٹونک
میں ٹھہرنا ہی تھا۔

بہر حال عوامی مشاعرہ نہیں ہوا البتہ گھریلو
نشستوں میں [illegible] چھوٹے بڑے شاعر مزدوری
مانگے بغیر بڑے اطمینان سے اپنا اپنا گلا دکھلاتے رہے۔
کاش اس موقعہ پر بھی کسی شاعر اعظم نے ڈاکٹر صاحب
سے کہا ہوتا کہ پہلے کچھ نقد عطا فرما دیجئے تب ہم اپنا
کلام بلاغت نظام پیش کریں گے۔

لہجے کی تلخی معاف۔ میزبان محترم نے چائے اس
قدر عمدہ اور اتنی افراط سے پلائی تھی کہ لہجے کو کچھ
زیادہ ہی میٹھا رہنا چاہئے لہذا آگے کی داستان یہ ہے
کہ کالج میں ایک نشست ہوئی جس میں اولاً درس قرآن
ہوا۔ ثانیاً سوال و جواب کی محفل۔ بتایا گیا کہ درس قرآن
کی نشست یہاں معمولاً ہوتی ہے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ آج
میں ہی اس کار خیر کو انجام دوں لیکن مجھے اپنی نا اہلی
کا علم تھا اس لئے گلا بیٹھنے کا بہانہ کر کے جان بچالی
اور گذارش کی کہ درس قرآن آج بھی وہی بزرگ دیں جو
معمولاً دیتے آئے ہیں۔ گلا بیٹھا یقیناً تھا۔ جب خلاف
عادت مسلسل اشعار کی بالجبر جگالی ہوتی رہی ہو تو گلے کا
بیٹھنا اور لیٹنا سب برحق۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ بحالات
موجودہ درس قرآن میرے بس کا نہ تھا۔ بحالات موجودہ
سے مراد یہ ہے کہ حاضرین مجلس بیس پچیس سے زیادہ
نہ تھے اور ان میں بھی چند حضرات جلسے میں سو رہے
تھے کیونکہ مشاعرے کی سزا میں انھیں رات بھر جاگنے
کے بعد محفل شب کی "بساط لپیٹنے" کا فریضہ بھی انجام دینا
پڑا تھا۔ ایسے حاضرین اور اتنے مجمع میں مجھ جیسے لوگوں
کو انشراح کیسے ہوتا۔ انشراح کے بغیر درس قرآن کی
صلاحیت تو کجا اپنے اشعار تک بھول جاتا ہوں۔ خیر جب
اسی میں نظر آئی کہ "فقط سامعین" ہی میں شامل رہوں۔
درس قرآن کے بعد البتہ کوئی عذر نہ تھا۔ نہ آسکا اور سوالات
کے جوابات دینے پڑے۔ سوالات کی نوعیت عالمانہ
تھی اس لئے مشاعرے کی خرابی روداد میں ان کی تفصیل
بے محل ہوگی۔ ویسے بھی مجیب کی حیثیت سے میں اپنا
کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکا جس کا علم قارئین کے
مفید ہو سکے۔

بتایا گیا تھا کہ منتا جنتی ایکسپریس ۵ ر کی صبح میں دہلی کے لئے روانہ ہوگی اور اس میں دو سیٹیں رزرو ہوگئی ہیں یہ گاڑی روز نہیں چلتی۔ ہم میں تحلّی کے ایک مخلص جناب عبدالغنی صاحب نے شعراء کے لئے پکنک کا پروگرام بنایا اور یہ پکنک بہت ہی دلچسپ رہی۔ جانی نام سے سمندر کا ایک کنارہ ہے جہاں نخلستان کے درمیان ایک مختصر سی عمارت ہے۔ اس میں موصوف نے رات ہی سے "مطبخ" قائم کر دیا اور ہم خانہ بدوش شعراء کرام کو اتنا کھلایا پلایا کہ بقول شخصے منہ بھر گئے۔ وہ تو آب و ہوا ہی وہاں کی کچھ ایسی ثابت ہوئی کہ جو کھاؤ ہضم۔ محترم میزبان نے جس فیاضی اور اخلاص و محبت سے یہ پکنک کرائی ہے اس کا نقش تادیر لوح قلب پر باقی رہے گا۔ مناظر کی دلکشی کے کیا کہنے۔ دیو پیکر پتھروں سے سر ٹکرانے والی موجیں اور حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر متحرک کشتیوں کے بادبان۔ شعاعوں کی بارش سے پانی میں مسلسل لرزنے والے "ستارے" اور رہ رہ کر موجوں کا خروش۔ وجدان و احساس کے کتنے بند دروازے ایسے مناظر کھول دیتے ہیں۔ سب سے بڑا احساس خلاقِ اکبر کی عظمت و جلالت اور اپنے وجود کی بے مایگی کا پیہم انگڑائیاں لیتا رہا۔ ننگے پیروں سے رگ رگ میں سرایت کرنے والی ریت کی نمی کتنے رومانوی محسوسات کے گھروندے اندر ہی اندر بناتی اور توڑتی ہے۔ خاموش فضائیں کیسے ناشنیدہ نغمے سناتی ہیں۔ لکھئے تو ایک دفتر بن جائے۔

مگر آہ! ہر لمحۂ راحت کی طرح اس پکنک کو بھی آخر ختم ہونا ہی تھا۔ دلچسپ حادثہ یہ پیش آگیا تھا کہ ریزرویشن کی خبر غلط ثابت ہوئی۔ یعنی میں اور حفیظ صاحب جو مطمئن تھے کہ صبح مزے سے منگلور پہنچ کر منتا جنتی میں جا بیٹھیں گے یہ اطمینان خاک میں مل گیا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو بہرحال رزرویشن نہیں ہو سکا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ اتنا لمبا سفر بغیر سیٹ رزرو ہوئے تو سقر ہی کہلائے گا۔

لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے رائے دی کہ بس کے ذریعہ بمبئی چلے جایئے۔ رائے غلط نہیں تھی لیکن ۲۴ گھنٹے بس میں بیٹھنا مجھے اپنے بس سے باہر محسوس ہوا۔ نتیجہ یہ کہ بھٹکل سے ہم سب کار پر سوار ہو گئے اور وہاں سے گوا۔ ابھی تک ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ ہی تھے اور متعدد اور حضرات بھی۔ لیکن گوا سے بہرحال عہدِ فراق شروع ہونا تھا۔ تماشا یہ ہوا کہ کسی مذہبی میلے کی بنا پر گوا سے بمبئی تک کی بسیں آٹھ دس روز کے لئے مکمل طور پر انگیج تھیں۔ ایک بھی ٹکٹ نہیں مل سکتا تھا۔ پھر کیا ہو؟

اس سوال پر ہم لوگوں نے ہوٹل کے نرم و گرم بستروں پر چائے نوش کرتے ہوئے غور کیا۔ آفت یہ بھی کہ ہم لوگ دیوبند کی طرف پیدل بھی نہیں چھوٹ سکتے تھے کیونکہ بیچ میں سمندر حائل تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بھٹکل ہی لوٹ چلو وہاں سے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ مجھے یہ پیش کش ایک قسم کی پسپائی اور شکست خوردگی کے ہم معنی محسوس ہوئی۔ بھلا ایسے اولوالعزم شعراء اور ایسی رجعت قہقری! حفیظ صاحب کی مشکل یہ بھی کہ ایک تار تو چھٹی میں اضافہ کا بھیج چکے تھے۔ اب پھر نظر آ رہا تھا کہ مزید تار دینا ہوگا۔ ملازمت تو ملازمت ہی ٹھہری۔ میں چونکہ خود اپنا ہی ملازم ہوں اس لئے گھر سے چلتے وقت خود کو معزول کر آیا تھا اور معزول شدہ ایڈیٹروں کو مزید چھٹی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ آخر گھر کیسے پہنچیں۔ یہ سوال دیر تک مصرعہ طرح بنا رہا اور آخرکار میں نے گرہ لگائی کہ بندہ تو پانی کے جہاز سے بمبئی جائے گا۔ حفیظ صاحب کتنے ہی مشہور اور بڑے شاعر سہی لیکن حالات کے تھپیڑے نے فی الحال انھیں اسی صف میں کھڑا کر دیا تھا جس میں میں کھڑا تھا۔ سمندر کو تیر کر پار کرنے کی صلاحیت نہ مجھ میں تھی اور نہ ان میں۔ البتہ اولوالعزمی والا پہلو ان کے نزدیک قابلِ لحاظ نہ تھا۔ وہ بخوشی تیار تھے کہ بھٹکل ہی لوٹ کر جان بچتی ہے تو بلا تکلف بچا لی جائے۔

مزید ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ محترم بزمی تو ابھی بیمار تھے۔ ایسی بیماری تھی کہ بحری جہاز کا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ عبدالقوی صاحب اگرچہ بیمار نہیں تھے لیکن ٹونک سے بزمی صاحب کے ساتھ ہی آئے تھے اس لئے یہ کیسے مناسب ہوتا کہ تنہا انھیں چھوڑ کر بحری جہاز سے نکل جائیں۔ پروفیسر رشید کوثر کو پونا جانا تھا۔ لہذا بحری جہاز کے مسافر ہم دو ہی رہ گئے ہیں اور حفیظ صاحب۔ سوال یہ بھی تھا کہ بحری جہاز ہی کا ٹکٹ کیا آسانی سے مل سکے گا؟ خبر یہ تھی کہ جہاز بھی بس کل ہی جائے گا پھر دو دن تک نہیں جائیگا۔

قصہ مختصر جہاز کے دو ٹکٹ مل ہی گئے۔ مجھے بڑی تکلیف ہوتی اگر حفیظ جیسے اچھے دوست کو چھوڑ کر اکیلا بمبئی چل دیتا۔ افسوس تو بزمی صاحب اور بزمی صاحب کی جدائی کا بھی ہوا لیکن یہ جدائی ناگزیر تھی۔ وہ دونوں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بعجلت واپس چلے گئے۔ رشید کوثر صاحب بطور تفریح ایک دو دن کے لئے گوا ہی میں رک گئے اور ہم دو شاعرانِ آفت زدہ دن کے ساڑھے دس بجے بحری جہاز پر لد گئے۔ لدنے کے سوا اور کیا کہیں گے جب نہ کیبن نصیب نہ سیٹ۔ رزرو۔ میلہ اپنا جلوہ یہاں بھی دکھا رہا تھا۔ جائے تنگ است و مردماں بسیار۔ مرد عورت سب کورے تختوں پر چادریں بچھائے بستر کھولے اس طرح فروکش تھے جیسے کہیں سے جانیں بچا کر بھاگے ہوں۔ ہم نے بستر وغیرہ تو ایک جگہ ٹیک ہی دیئے اور بقول شخصے سینگ سمانے کی جگہ میسر آ ہی گئی۔ لیکن جہاز کو تو اگلے دن بمبئی پہنچنا تھا اور رات یہیں کہیں کاٹنی تھی۔

کچھ ذہنی اطمینان یہ دیکھ کر ہوا کہ جن لوگوں نے ہم سے دو گنے اور تگنے پیسے خرچ کر کے نسبتاً اعلیٰ ٹکٹ خریدے ہیں وہ بھی درگت میں ہم سے کم نہیں۔ انھیں بھی سوائے ننگے تختوں کے کچھ نصیب نہیں ہوا ہے۔ مزید اطمینان یہ دیکھ کر ہوا کہ ہم سے بعد میں آنے والے تو بیٹھنے تک کی جگہ کو ترس رہے ہیں۔

ویسے اپنی موجودہ حالت پر ہنسی ضرور آرہی تھی۔ حفیظ صاحب کی ذہنی کیفیت مجھے نہیں معلوم۔ میری ہی کیفیت یہ تھی کہ ایڈیٹر تجلی سے آنکھ ملاتا شرما رہا تھا۔ بار بار یہ مصرعہ ذہن میں گونج رہا تھا:-

اس شاعری میں عزت سادات بھی گئی

ایڈیٹر تجلی جیسے بڑے ناخوشگوار لہجے میں کہہ رہا ہو "اور کرو شاعری!"

غنیمت یہ تھا کہ اردگرد بھرے لوگ نہیں تھے۔ گوا کے مختصر سے قیام میں یہ اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ بد مزاجی و بد اخلاقی یہاں عام نہیں ہے۔ حالانکہ شراب اس قدر عام تھی کہ بعض پنواڑیوں کے یہاں بھی اسے کھلے بندوں فروخت کیا جا رہا تھا۔

جہاز چلتے ہی میں تو مناظرِ قدرت میں کھو گیا اور حفیظ صاحب بھی متبسم ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑے خوش مزاج اور اچھے ساتھی ہیں۔ ان کے بشرے سے قناعت عیاں تھی اور میں بھی یہ دیکھ کر بہت مگن تھا کہ کینٹین کے پہلو میں لمکا ہی لمکا کی بوتلیں بھری رکھی ہیں۔ لمکا تقریباً ویسا ہی مشروب ہے جیسا دیوبند کا لیمن ہوتا ہے۔ حقیر پُر تقصیر بیس سال سے اس کا اس حد تک عادی ہے کہ جاڑوں میں بھی دو تین بار ضرور چاہیئے۔ کینٹین جہاز میں دو تھے۔ ہر طرح کے ماکولات و مشروبات سے مالا مال۔ ہم لوگوں کی جیب میں پیسے بھی تھے اور رات ابھی دور تھی۔

ظہر کا وقت آیا تو سوال نماز کا پیدا ہوا۔ اب تک باجماعت چل رہی تھی۔ مگر اب تو [illegible] بے جماعت ہی پڑھ لیں۔ حفیظ صاحب جگہ کی تلاش میں نکلے اور میں سامان کی چوکسی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد یہ مسرت بخش خبر لائے کہ اوپر والے درجے میں [illegible] کے جملے کا ایک مخصوص حصہ نماز کے لئے [illegible] پڑھ آیا ہوں۔ تم بھی پڑھ آؤ۔ جب تک خود حاضر [illegible]

جان لیوا انسانی ہجوم کا بھی اضافہ۔ حفیظ صاحب کی
[illegible] اسرار اطلاع نے کہہ دیا کہ وہاں ایک حقہ بھی
رکھا ہوا ہے۔

حقہ! ــــ اس بیچارے کا ذکر تو اب تک کی
[illegible] آیا ہی نہیں حالانکہ اس کی یاد سے سفر کا ایک
دن بھی خالی نہیں گیا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کوئی ستم
ظریف ماں کے پیٹ ہی سے حقہ پیتے ہوئے پیدا ہوا
ہو مگر یہ بہرحال کہنا پڑے گا کہ اپنی حقہ نوشی کے آغاز
کی تاریخ میرے علم میں نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے
حقہ سامنے پا رہا ہوں۔ حقے اور معدے میں جو ربط ہے
ان کے اسرار سے تمام اہلِ تحقیق واقف ہیں۔ سفر میں حقہ
نہیں ملتا تو سگریٹ کے ذریعہ معدے کو پھسلانا
پڑتا ہے۔ حقے کی بشارت نے میرے قدم کچھ زیادہ
ہی تیز کر دیئے۔ عملے کے کیبن جہاز کی پچھلی "نوک" کی
طرف تھے۔ وسیع و عریض جگہ خالی ہی خالی نظر آئی۔
حقہ اگرچہ بدشکل تھا مگر تھا بہرحال حقہ۔ سمندری پس
منظر نے اس کی بدشکلی میں اچھی خاصی ملاحت پیدا
کر دی تھی۔ ادھر ادھر ڈھونڈا کہ کوئی صاحب ملیں
تو حقے کے اصلی مالک کا سراغ لگایا جائے۔ جوئندہ
یابندہ۔ ایک صاحب ملے جو اپنی ہیئت کذائی
کی بنا پر حقے کے مالک ہی نظر آ رہے تھے۔ دریافت
کرنے پر تصدیق بھی ہو گئی۔ لیکن یہ بھی انکشاف ہوا
کہ نام ہے لچھمن سنگھ۔ انکشاف گویا ہوائے تند کا
جھونکا تھا جو آناً فاناً چراغِ امید گل کر گیا۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اب حقہ نوشی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا
لیکن خیر کا پہلو ایک اور رخ سے نکلا۔ میں نے نام
کے بعد اتا پتا بھی دریافت کیا تھا۔ جواب ملا کہ میرٹھ
کے ایک دیہات کا رہنے والا ہوں۔ یہ جواب سمندر
[illegible] کے لئے تمہید ثابت ہوا۔ میں نے کہا کہ خوب ملے
میرے ساتھی بھی میرٹھ کے ہیں اور میں خود دیوبند کا
ہوں۔ لچھمن کی باچھیں کھل گئیں۔ میرٹھ [illegible]
اور دیوبند کا فاصلہ بالشت بھر سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا
پُرتپاک مصافحہ ہوا اور فوراً ہی میں نے حفیظ صاحب
کو بلا لیا۔ تھوڑی سی دیر کے تجربے نے مطمئن کر دیا تھا کہ
سامان کو پہرے دار کی ضرورت نہیں۔ حفیظ صاحب نے
اپنے میرٹھی ہونے کا مکمل اطمینان دلانے کیلئے لچھمن سنگھ
سے ہنس ہنس کر نیم گھریلو قسم کی بہت سی باتیں کیں
اور حسین توقعات کا میدان ہموار ہوتا چلا گیا۔ پھر
مغرب کے وقت عملے ہی کے ایک فرد مصلیٰ در بغل بھی نظر
آئے۔ نام تھا احمد حسن۔ مجھ سے مشورہ لے کر بڑی اچھی
اذان دی اور اللہ کے فضل سے بڑی خوشگوار جماعت
ہوئی۔

حاصل یہ نکلنا ہی تھا کہ ہم لوگوں کو بافراغت کشادہ
اور خالی جگہ الاٹ ہو جائے۔ یہ فیصلہ آپ ہی کر سکیں گے
کہ یہ حقہ کی کرامت تھی یا نماز کی۔ سونے کی حد تک اس
جگہ سے استفادہ صرف حفیظ صاحب نے کیا۔ مجھے سامان
ہی والے درجے میں ٹھیک ریلنگ کے قریب بستر کی
نہایت عمدہ جگہ مل گئی تھی۔ مل اس طرح گئی تھی کہ
قریب کی بینچ پر (جی ہاں اس حصے میں کچھ بینچیں بھی
تھیں) ایک نوجوان کپڑا بچھائے بہت سی جگہ گھیرے
لیٹے تھے۔ کونا پھر بھی خالی تھا۔ میں اجازت لئے بغیر
وہاں بیٹھ جاتا تو وہ ضرور ناک بھوں چڑھاتے لیکن
میں نے گذارش کے انداز میں کہا کہ اگر آپ کو زحمت نہ
ہو تو میں کچھ دیر یہاں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کر لوں۔ سادگی
بھلے تھے لہجے کی "مسکینی" محسوس کر کے لیٹے سے بیٹھے
ہو گئے اور فرمایا کہ چچا میاں ضرور بیٹھئے۔ [illegible]
کر کے میں بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ آپ لیٹے رہیے مگر
وہ شاید تعظیماً لیٹے نہیں۔ کچھ دیر بعد میں نے اندازہ
کیا کہ بینچ اور ریلنگ کے درمیان بڑی عمدہ جگہ [illegible]
ہے جس پر سوٹ کیس [illegible] رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سوٹ کیس
ہٹ جائیں تو میرا بستر بڑی شان سے [illegible]

...مستعمل تھا۔ ہوا بہت خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔ زیادہ عمدگی اس جگہ کی یہ تھی کہ آنے جانے والوں کا ہنگامہ یہاں ممکن ہی نہیں تھا ورنہ ہر طرف ہنگامہ تھا۔ مذکورہ نوجوان کی شرافت سے مزید فائدہ اٹھانے کی نیت سے میں نے عرض کیا کہ شاید یہ سوٹ کیس آپ کے ہیں۔ اگر کوئی حرج نہ سمجھیں تو انھیں ذرا اس طرف رکھ دوں۔ یہاں میرا بستر کھل جائے گا۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ ہاں ہاں چچا میاں آپ بستر لائیے اور کھولیے۔ ہم سوٹ کیس ہٹائے لیتے ہیں۔ اس طرح :-

چنانچہ یہیں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا جلوت میں خلوت شاید اسی کو کہتے ہوں۔ یکسوئی اور طمانیت۔ ہوا میں خوشگواری تھی۔ رضائی میں کمبل جوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

حفیظ صاحب عملے والے حصے میں سوئے لیکن یہ حصہ خود میرے لئے بھی کم مفید نہیں تھا۔ لطیف الطبع حضرات جانتے ہیں کہ استنجاء کا مسئلہ تقریباً تمام ہی مسئلوں سے اہم تر ہے۔ جہاز کے عام استنجاء خانے بہت محدود سے تھے اور خلقت کثیر۔ کتنی ہی بار انشن ڈبہ والے کیو کا منظر دیکھنے میں آیا۔ عملے کے لیٹرین الگ تھے اور نسبتاً صاف ستھرے بھی تھے آگے کیا کہا جائے۔

چار بجے کی چاء جہاز میں بھی مل گئی۔ چائے والا کینٹین رات بھر بند نہیں ہوا تھا۔ صبح کا منظر اللہ اکبر۔ دیکھئے اور دیکھتے ہی رہئیے۔ لطف یہ کہ عملے والی کھلی جگہ ٹہلنے کے بھی کام آگئی۔ گویا جو آسانی سفر حج کے دوران ہوائی جہاز میں میسر آئی تھی اس سے اللہ نے بحری جہاز میں بھی محروم نہیں رکھا۔ درجے کا باقی تمام حصہ تو مردوزن سے اس طرح پٹا ہوا تھا کہ کینٹین میں بھی ہمیں سامان اور جسموں کو پھلانگ کر جانا پڑتا تھا۔

(جاری)

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں

یرموک کا میدانِ جنگ جہاں کفر اور اسلام
میں ہتھیاروں کی جنگ ہو رہی تھی۔ وہی اس حقیقت
پر ایک تاریخی گواہ بھی ہے کہ اسلام تلوار کے زور
سے نہیں پھیلا ۔۔۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور تلواروں کی
جھنکار میں اسلام کی صداقت نے اس دن رومیوں
کے سپہ سالار کو اپنے تیرِ نیم کش سے کیسا شکار کیا تھا؟
۔۔۔ اس کا نام جرجہ تھا ۔۔۔ اس نے دیکھا کہ اسلام کی
فوجیں اس کے سامنے صف آرا ہو چکی ہیں اور رومیوں
کے لاؤ لشکر میں نفرت و انتقام کی آگ شعلہ زن ہے ۔۔
شیطان بیقرار ہے کہ خدائے واحد کی بندگی سے سرشار
انسانوں کے سروں پر ننگی تلواروں کی بوچھار کر کے
سچائی کو جھوٹ ثابت کر ڈالے ۔۔۔ لیکن اچانک
سچائی نے جرجہ کے قلب کی دھڑکنوں پر اپنا ایک
حسین ترین وار کیا اور ابلیسی سازش کے سارے تار و
پود کو مکڑی کے جالے کی طرح بکھیر کر رکھ دیا ۔۔۔
جرجہ کی نظریں اسلامی سپہ سالار حضرت خالدؓ
بن ولید کے روئے انور میں اسلامی رعنائیوں کا ایک
دلربا منظر دیکھ رہی تھی ۔۔۔ اس نے ایک نظر اپنے
لشکر کے چہروں پر ڈالی ۔ وہاں نفرت تھی ۔ قہر تھا۔
۔۔۔ انتقام تھا ۔ خود غرضی اور سنگدلی کا پتھریلا پن
تھا ۔۔ اور ساتھ ہی ساتھ مرنے کا خوف بھی! ۔۔۔ لیکن
خالد بن ولیدؓ کا چہرہ! ۔۔۔ حسنِ مصطفےٰ کا آئینہ دار
چہرہ! وہاں ان حیوانی جذبات کی ہلکی سی پرچھائیں
بھی اسے نظر نہ آئی ۔۔۔ وہاں مارنے کا جنون نہیں تھا
بلکہ کسی حسین مقصد کے قدموں پر مر جانے کی بیتابیاں
تھیں ۔۔۔ دشمن کی دشمنی نہیں بلکہ حق کی محبت تھی
جو باطل کو حق میں تبدیل کر دینے کے لئے بے قرار تھی۔
۔ وہاں خدا سے پیار تھا ۔۔۔ وہاں خدا سے پیار تھا۔
۔ انسان کا درد تھا ۔۔۔ جاں نثاری کا سوز و ساز تھا۔
یہ کیسا عجیب انسان ہے! ۔۔۔ جرجہ نے سوچا ۔۔۔ سوچ
گہری ہوتی گئی ۔ اور محویت کے عالم میں جیسے وہ بالکل
بھولنے لگا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے! ۔۔۔ اس نے
اپنے گھوڑے کو تیزی سے ایڑ لگائی ۔ اور والہانہ شوق
میں خالدؓ کو آواز دینے لگا۔

"خالد! ۔۔۔ خالد ابن ولید! ... خدارا
میری بات سنو!"

حضرت خالدؓ نے دشمن کے سپہ سالار کو دونوں فوجوں
کے درمیان ایک بے تاب جستجو کی حالت میں دیکھا اور
اس کی آواز میں دل کی دھڑکنوں کا سوز و گداز محسوس
کرتے ہی وہ بھی اسلامی فوجوں کی صفوں سے تنِ تنہا
نکل کھڑے ہوئے۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ ..... میں حاضر ہوں!"

خالد نے محبت و تلاش کے اس پروانے کو محبت و
پذیرائی کے ساتھ جواب دیا ۔۔۔ اور دیکھنے والوں نے
دیکھا کہ دونوں دشمن فوجوں کے سپہ سالار اس قدر
قریب ہو گئے کہ دونوں کے جنگی گھوڑوں کی گردنیں
بھی ایک دوسرے سے مل گئیں ۔۔۔

آہ! ۔۔۔ وہ میدانِ جنگ! جہاں دشمنی اور

انتقام کی حیوانی طاقت انسانوں کو انسانوں سے ٹکرا کر انسانیت کو پاش کرنے کے سوا اور کبھی کچھ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ہاں وہیں زندگی کا یہ کونسا حسن بے حجاب ہو گیا تھا؟ یہ کونسا درد تھا جس نے دو دشمن سپہ سالاروں کے دلوں کو ہی نہیں ان کے گھوڑوں کے حیوانی سروں کو بھی ایک دوسرے سے گلے ملنے پر مجبور کر دیا تھا! ——

نفرت و سنگدلی کے دہکتے ہوئے شعلوں میں محبت کے حسین ترین پھول کھلانے والی یہ کونسی طاقت تھی آخر؟ یہ اسلام تھا — یہ اسلام کی عملی تصویر ایک مومن کی لافانی زندگی ہی تو تھی جو اس وقت خالد بن ولیدؓ کی شکل میں جرجہ کے سامنے موجود تھی۔

"میں تم سے کچھ پوچھنے والا ہوں —— لیکن اس توقع کے ساتھ کہ تم ایک انتہائی شریف اور سچے انسان ہو اور ایسا انسان جو جھوٹ نہیں بول سکتا —— مجھے بتاؤ خالد! تمھاری فتوحات کا راز کیا ہے؟ — کیا یہ خبر سچ ہے کہ خدا نے تمھیں کوئی آسمان سے اُتری ہوئی تلوار عنایت کی ہے اور یہ اسی آسمانی برقِ تپاں کا نتیجہ ہے کہ تم ہر جنگ میں فاتحانہ لہراتے چلے جاتے ہو؟"

"نہیں! ایسی کوئی تلوار مجھے نہیں ملی جرجہ!" خالد بن ولیدؓ نے سیدھا سادا جواب دیدیا۔

"پھر تمھیں اللہ کی تلوار کیوں کہا جاتا ہے؟" جرجہ نے حیرت اور جستجو کی دو آتشہ کیفیت میں دوسرا سوال کیا۔

"اس کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ نے ہماری قوم میں اپنا ایک پیغمبرؐ پیدا کیا۔ اس کی آواز پر کچھ لوگ اللہ کے قدموں میں فوراً جھک گئے اور کچھ مقابلہ پر تل گئے۔ — میں بھی ان لوگوں میں تھا جو خدا سے جنگ کرنے کی حماقت میں مبتلا ہو گئے تھے

لیکن —— پھر میری آنکھ کھل گئی —— اور احساسِ خطا کا زلزلہ میرے وجود میں برپا ہو گیا۔ آہنی تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گری اور میں نے خدا کے آستانے پر عجز انکسار سے گھٹنے ٹیک دئیے — سر جھکا دیا —— اور —— اور

پھر خدا نے مجھے ایمان کی وہ زندگی عنایت فرمائی جو موت سے نہیں ڈرتی موت خود اس سے ڈرتی ہے —— جو جینا اور مرنا دونوں سکھاتی ہے —— اور جب میں نے ایمانی زندگی کے مہکتے ہوئے چند سانس لیتے ہی ایمان پر جان دینے کے لئے باطل سے جنگ کی گھاٹیوں میں قدم رکھا تو مجھے خدا کے رسولؐ نے اپنی دعاؤں کی جاں نواز کمک بخشی اور فرمایا کہ خالد! تم خود ہی خدا کی تلوار ہو — جسے خدا نے حق کے دشمنوں کا فیصلہ کرنے کے لئے بے نیام کیا ہے — میرے پاس کوئی خدا کی تلوار نہیں —— میں خود ہی خدا کی تلوار ہوں اے جرجہ! —— اسی لئے میں سیف اللہ کہلاتا ہوں —"

جرجہ نے اس انسان کے چہرے پر عقیدت کی نظریں مرکوز کر دیں جو اسی زمین کے سینے پر آسمانی طاقت کی ایک مقدس تلوار بنا ہوا تھا —— اور پھر اس نے جذبۂ شوق میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "مجھے بتاؤ خالد! وہ اسلام کیا ہے جس نے تمھیں بھی فتح کر دکھایا ہے اور پھر تمھیں ایک بے پناہ فاتحانہ تلوار بنا ڈالا —"

چند لمحات اور چند الفاظ میں خالدؓ نے ایک عظیم ترین سوال کا پورا جواب دیدیا "حقیقی خدا کی بندگی چھوڑ کر زندگی کا ہر انداز خدا سے جنگ کرنے کا دوسرا نام ہے جرجہ! لیکن خدا کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس سے جیتنے کی صرف ایک ہی شکل ہے!"

"خدا سے جیتنے کی؟! —— آخر وہ کیا ہے خالد؟" جرجہ کی حیرت نقطۂ عروج پر جا پہنچی۔

"وہ یہ کہ خدا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جائیں — اس کی خوشی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے ہی کا دوسرا نام اسلام ہے"۔ حضرت خالدؓ نے جرجہ کو دلسوز اور دلنشیں کیفیت میں حق کی تلقین کرتے ہوئے کہا اور —— اور دونوں کی آنکھوں میں دعوت آنسوؤں کی چمک ابھری —— دو سپہ سالار —— دو انسانوں کے روپ میں ڈھل کر ایک خدا کی یاد میں رونے لگے ——

"لیکن ابھی ایک خلش باقی ہے خالدؓ!" جرجہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "تم اس حسین سپردگی کی راہ پر مجھ سے بہت پہلے روانہ ہو چکے ہو — کیا یہ ممکن ہے کہ اس وقت جس طرح ہمارے جسم پاس پاس اور ساتھ ساتھ ہیں اسی طرح اس قدر دیر میں چلنے والا دوسرا مسافرِ حق بھی تمہارے ساتھ اس راہ پر ہو سکے؟ — کیا میں ایمانی راہ پر تمہارا ساتھی بن سکوں گا؟"

"یقیناً اے جرجہ!" خالد نے والہانہ مسرت کیساتھ کہا "ہم دونوں خدا کی سمت میں دوش بدوش ہو کر چل سکیں گے — میرے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ تم مجھ سے بھی آگے نکل جاؤ یہ عین ممکن ہے!"

"یہ کیسے ممکن ہے آخر!" جرجہ نے بچوں کی طرح رو دینے کے انداز میں کہا۔

"وہ اس طرح کہ ہم اس وقت ایمان لائے تھے جب خدا کے رسولؐ کی شخصیت اسلامی صداقت کے سیکڑوں معجزے دکھا رہی تھی اس وقت کفر مشکل تھا۔ ایمان بہت آسان تھا۔ لیکن اب جب کہ اسلام اکیلا تمہارے سامنے ہے اور اسلام کے رسول کی پُرکشش شخصیت موت کے پردوں میں چھپ گئی تمہارے لئے کفر آسان ہے اور اسلام کس قدر مشکل! — اس لئے اگر تم نے اسلام قبول کیا تو اس کا درجہ اس پھول کا سا ہو گا جو موسم کیخلاف تمام امکانات کے خلاف کھل اٹھا ہو!" — اور فی الفور جرجہ اشک آلود سجدۂ شوق بن کر اسلام کے قدموں میں آگیا! — اور چند ہی ساعتوں کے بعد دنیا نے دیکھا کہ خدا کے در پر جو باغی سر سجدۂ نیاز بن کر جھکا تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سجدے میں جھکا کا جھکا رہ گیا ہے۔ جرجہ شہید ہو گئے تھے — اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہاں — اے اسلام کے نام لیواؤ! اسلام کے دشمنوں نے اس طرح اسلام قبول کیا ہے۔ تو جو لوگ اسلام کی محبت کا دم بھرنے والوں میں پیدا ہوئے ہیں ان کے اسلام کا حال کیا ہونا چاہیئے تھا — مگر… مگر حقیقت میں آج ہے کیا؟؟ آج! — جب کہ نہ صرف پیغمبرِ اسلام کی لافانی شخصیت موت کے پردوں میں چھپ گئی ہے بلکہ خود اسلام کا حسن و جمال بھی نام نہاد مسلمانوں کے جرائم کی کالی گھٹاؤں میں روپوش ہے اسی لئے آج خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا مقام کہیں سے کہیں بلند تر ہو چکا ہے — آہ! وہ محروم جو اس وقت بھی محروم کا محروم ہو۔ اور خوشا وہ نیک بخت جو آج بھی مالا مال ہو! —

تجلّی کی ڈاک

رسول اللہؐ کی بیویاں

سوال ۱؎ — از — محمد منصور عالم۔ چکر دھر پور۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے سورۂ احزاب میں فرمایا ہے "غیر خونی رشتوں میں صرف ایک ہی رشتہ ایسا ہے جو خونی رشتوں سے بھی بڑھ کر حرمت والا ہے اور وہ ہے نبیؐ اور مومنین کا رشتہ جس کی بنا پر" نبی کی بیویاں ان کی ماؤں کی طرح ان پر حرام ہیں۔"

پھر آگے چل کر حکم دیتا ہے کہ آپ خود اپنے متبنّیٰ زید بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر کے جاہلیت کے اس اس وہم کو توڑ دیں جس کی بنا پر لوگ منہ بولے بیٹے کو صلبی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔

اور جب کفار و منافقین نے اس پر اعتراض کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو جواب دیا گیا ان میں سے ایک یہ ہے کہ "محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ اس کی مطلقہ بیوی ان پر حرام ہوتی"

مگر پھر سورۂ احزاب ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ میں تمھیں تمھارے حقوق دے دلا دوں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر نبیؐ کی بیویاں چاہیں تو اپنے حقوق لے کر قطع تعلق کر سکتی ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق جس سے بھی چاہیں نکاح کر سکتے ہیں کیونکہ جملہ "دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب" دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ وہ نبیؐ سے قطع تعلق کر کے کسی دولتمند شخص سے نکاح کر لیں۔

یہی تضاد ہے جو بار بار میرے ذہن میں کھٹکتا ہے جو شاید کم علمی کا نتیجہ ہے) کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نبیؐ کی بیویوں کو عام لوگوں پر ان کی ماؤں کی طرح حرام قرار دیتا ہے اور پھر دوسری طرف یہ کہلواتا ہے کہ "آؤ تمھیں تمھارے حقوق دے دلا کر رخصت کر دوں"۔ مطلب یہ کہ عام آدمیوں کو بھی نبیؐ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کی اجازت دیتا ہے اور اگر

نہیں جیساکہ ہے تو کیوں نہیں ؟ جب کہ اسی کے قول کے مطابق وہ کسی مرد کا باپ نہیں ہے اور جب وہ کسی کا باپ نہیں ہے تو اس کی بیویاں کسی کی مائیں کیونکر ہوتیں، لیکن جب انھیں ماؤں کا درجہ دیا گیا تو پھر نبی کا درجہ بھی باپ کا سا کیوں نہ ہوا؟

جوابؔ :-

یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ محکم اور واضح اقوال مقدم ہوا کرتے ہیں۔ ازواج مطہرات کو قرآن نے جب صریح و قطعی الفاظ میں تمام امت کی مائیں قرار دیدیا تو اب یہ جزوِ ایمان بن گیا اور کسی بھی تاویل کی گنجائش نہ رہی۔ اسکے مقابلہ پر دوسری جو آیت آپ کو الجھن میں ڈال رہی ہے اس میں گفتگو کا موضوع یہ ہے ہی نہیں کہ رسولؐ کی بیویاں طلاق کے بعد یا رسولؐ کی رحلت کے بعد کسی اور سے نکاح کر سکتی ہیں یا نہیں کر سکتی ہیں۔ اس موضوع کی طرف لفظاً کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ آپ صرف قیاس کے ذریعے یہ بات نکال رہے ہیں کہ اس سے اول الذکر آیت کے خلاف مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ جملہ شرطیہ ہے اور شرطیہ جملے بارہا غیر ممکن بھی ہوتے ہیں جیسے قرآن ہی میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ آپنے دیکھا ہی کہ آیت مذکورہ کے بعد ایک بھی بیوی نے علیحدگی نہیں چاہی۔ اسی سے ظاہر ہے کہ مشیت الٰہی کے اعتبار سے یہ نا ممکن تھا کہ وہ طالب دنیا ہو کر علیحدگی چاہیں پھر ایک بات یہ بھی سوچیں۔ اگر کوئی بیوی طالب دنیا ہو کر حضورؐ سے طلاق حاصل کر لیتی تو یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ اسلام ہی پر قائم رہتی۔ زیادہ توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ مرتد ہو جاتی کیونکہ دنیاوی لذات کی خاطر دنیا کے سب سے بڑے انسان اور اللہ کے آخری رسولؐ کے شرفِ زوجیت کو ٹھکرا دینے والا دین اسلام ہی سے کیسے چمٹا رہتا جب کہ غیر مسلموں میں دولتمندوں اور عیش پرستوں کی کمی نہیں تھی۔ کوئی مسلمان تو ویسے بھی اس عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا جو لذتِ نفس کی خاطر آقائے نامدارؐ سے طلاق لے آئی ہو۔

لہٰذا آپ کا قیاس ہوائی رہا۔ حالانکہ قیاس جاندار بھی ہو تو اس کی آیاتِ محکمہ صریحہ کے مقابلے کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

آخر میں جو معارضہ آپ نے قائم کیا ہے وہ بیان کے لائق نہ تھا۔ حضورؐ امت کے لئے نہ صرف باپ ہیں بلکہ باپ سے بڑھکر ہیں۔ لیکن یہ تعلق روحانی اور شدتِ محبت و عقیدت کا کنایہ ہے ورنہ قرآن تو صاف لفظوں میں کہہ ہی رہا ہے کہ "محمدؐ تم میں سے کسی آدمی کے باپ نہیں ہیں۔ وہ تو خاتم النبیینؐ ہیں۔" اس طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ کسی امتی کی مطلقہ بیوی یا بہن یا بیٹی آپ کی محرم نہیں اور اس سے آپؐ کا نکاح درست ہی داست ہے۔

اس کے برعکس ازواجِ رسولؐ کو "امت کی مائیں" قرار دیا گیا اور اس کا مقصود یہی تھا۔ جیساکہ احادیث اور اجماع سے ظاہر ہے کہ کوئی امتی ان سے نکاح نہیں کر سکتا۔ "کیونکر" کا سوال عجیب ہے۔ اللہ جنھیں صاف الفاظ میں "مائیں" قرار دے رہا ہے ان کے بارے میں آپ "کیونکر" کا شوشہ پیدا کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں اس کا منطقی جواز نہیں آیا۔

اسلامی شریعت، معاشرہ وغیرہ

سوالؔ :-

(۱) اسلامی شریعت کے کیا معنی ہیں ؟ اور اسلامی شریعت کسے کہتے ہیں ؟

(۲) اسلامی معاشرت کے کیا معنی ہیں ؟ اسلامی معاشرت کسے کہتے ہیں ؟

(۳) اسلامی معاشرت پر عمل کرنے میں کیا فائدے ہیں ؟

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کیا معنی ہیں ؟

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے سے دنیا میں کیا حاصل ہوگا ؟

(۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ان کے اسوے

پر عمل کرنے والے کو آخرت میں کیا حاصل ہوگا یا اس کا کیا مقام ہوگا ؟

محترمی میرے دوستوں کے ان سوالات کے جوابات تحریر فرماکر (یعنی تجلی میں چھاپ کر) مجھے اور میرے دوستوں کو مشکور و ممنون فرمائیے۔

جواب :-

چند مسلمان اگر اس طرح کے سوالات کریں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ انھوں نے اسلامی لٹریچر کا بالکل مطالعہ نہیں کیا۔ ان سوالات کے واضح جوابات دینی کتابوں اور رسالوں میں عام طور پر موجود ہیں۔ مختصر جوابات بالترتیب یہ ہیں :-

(۱) اللہ نے جو اوامر و نواہی اپنے آخری پیغمبرؐ کے ذریعہ بھیجے ان کے مجموعے کا نام ہے شریعت اسلامی۔

اوامر جمع ہے امر کی۔ امر کہتے ہیں حکم کو۔ یعنی فلاں فلاں عمل تمھارے ذمے ہے۔ نواہی جمع ہے نہی کی۔ نہی ممانعت کو کہتے ہیں۔ یعنی فلاں فلاں افعال سے بچو۔

پوری شریعت ان ہی اوامر و نواہی کی تفصیل سے عبارت ہے۔ علماء و فقہاء نے جو ضمنی اور فروعی قوانین مرتب کئے ہیں ان کا بھی سرچشمہ یہی اوامر و نواہی ہیں اور قرآن میں چونکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ رسولؐ حکم دے اسے مانو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ، رسولؐ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے لہذا احادیث بھی اسی طرح شریعت کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں جس طرح قرآن۔

(۲) مسلمان اس طرح زندگی گذارے کہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کسی بھی شعبۂ زندگی میں نہ ہو۔ تجارت۔ ملازمت۔ سیاست۔ گھریلو رہن سہن، تفریحات، مشاغل، ان سب میں اللہ اور رسولؐ کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھتے ہوئے جو زندگی گذرے گی اسی پر "اسلامی معاشرت" کا اطلاق ہوگا۔ عملی اعتبار سے اس کے متعدد درجے اور مرتبے ہو سکتے ہیں۔ غالب اکثریت اسی نہج کی زندگی گذار رہی ہو تو اس پر اسلامی معاشرے کا عنوان بالکل درست ہوگا۔ اس نہج میں کچھ نقص رہے اور بعض امور میں مسلمان خدا اور رسولؐ کے فیصلوں کو نظر انداز کر دیں تو اسی اعتبار سے اسلامی معاشرت کا عنوان داغ دار ہو جائے گا۔

اسلامی معاشرت کے بعض مظاہر تو شریعت نے متعین کر دیئے ہیں مثلاً داڑھی رکھنا اور مونچھیں کم کرنا۔ یا ٹخنوں سے نیچے پائنچا نہ لٹکانا۔ مجموعی طور پر کسی کافر قوم کی مشابہت سے بچنا۔ اور بعض مظاہر غیر متعین ہیں جن کی صورت گری اخلاق و کردار کرتا ہے اور ان کا تعلق قواعد شرعیہ سے ہے جیسے شیریں زبانی، حسن معاملت، برادرانہ تعلقات۔ غربا پروری، بخل سے پرہیز، بدزبانی سے اجتناب وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اسلامی معاشرے کی تصویر میں رنگ بھرتی ہیں۔

(۳) اصل فائدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد والی زندگی میں آرام ملے گا۔ دنیا کی زندگی بڑی مختصر ہے۔ بہت سے بہت سو سال۔ آخرت کی زندگی جاوداں ہے کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ مختصر سی زندگی میں نفس پر قابو رکھ کر حاضر لذتوں سے بس مناسب حد تک فائدہ اٹھانا اور آخرت میں بھی مزے کرنا اس سے بہتر ہے کہ نفس کی لگام چھوڑ کر بے تحاشا ہر لذت کو حاصل کیا جائے خواہ اس کے نتیجے میں آخرت کی زندگی خراب ہو جائے۔

(۴) اصطلاحاً "سنت نبویؐ" کے یہ معنی ہیں کہ وہ فعل آپ نے کیا ہو اور اس کا تعلق امور طبعی سے نہ ہو۔ مثلاً کسی دن تھک کر بعد عصر کچھ دیر کے لئے سو گئے ہیں تو یہ سونا "سنت" نہ ہوگا کیونکہ یہ امور طبعی میں سے ہے۔ اس کے برخلاف اگر آپ نے مثلاً فجر سے قبل یا مغرب کے بعد دو رکعات ادا کی ہیں تو انھیں "سنت" کہیں گے کیونکہ ان کا تعلق دین سے ہے۔ پھر اس کی بھی تقسیم فقہاء اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ کونسی رکعات ہیں جن کی آپ نے پابندی کی ہے اور کونسی ہیں جنھیں کبھی کبھی چھوڑ بھی دیا ہے۔ دوسری قسم کا نام "نفل" رکھا جاتا ہے اور پہلی کا سنت۔

(۵) دنیا بندۂ مومن کا مقصود ہی نہیں ہے۔ اسلام کا اصل مقصد تو ہے آخرت کی فلاح اور دنیا کو وہ صرف امتحان گاہ

قرار دیتا ہے۔ امتحان گاہ میں تو دشواریوں سے سابقہ پیش
آنا ہی ہے۔ اگر اللہ اور رسولؐ کے احکام پر چل کر دنیا
میں کچھ نہ ملے تب بھی کیا نقصان ہے اگر اس کے بدلے آخرت
کی طویل و غیر مختتم زندگی سنور جائے۔

ویسے یہ دنیا دیکھ ہی چکی ہے کہ سنتِ نبویؐ پر پوری
طرح چلنے والے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے دنیا میں بھی کیا کچھ
حاصل نہیں کیا۔ برق رفتار فتوحات۔ غلبہ و اقتدار حکومت و
سیادت۔ مال و منال۔ وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے
چھاتے چلے گئے تھے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب
معاشرے میں غالب تعداد کے اہل ایمان کی ہو۔ لیکن آخرت
میں ہر شخص سے حساب چونکہ الگ الگ انفرادی حیثیت میں
ہوگا اس لئے آج بھی کوئی مومن پوری طرح سنتِ رسولؐ پر
یعنی طریقِ رسولؐ پر عامل ہے تو اسے مطمئن رہنا چاہئے کہ
آخرت میں اجر سے محروم نہ رہے گا۔

(۶) قرآن میں اس کی بہت کچھ تفصیل ہے۔ بہشت کی
نعمتیں۔ چین کی زندگی۔ لطف ہی لطف۔ عیش ہی عیش۔
نہ بیماری۔ نہ موت۔ نہ اور کوئی افتاد۔ اس سے زیادہ آخر
کیا چاہئے۔

چاند گرہن

سوال ۳:۔ از عتیق جیلانی سالک۔ رام پور

سائنس داں "چاند گرہن" کو دورانِ گردش کسی بھی
دوسرے سیارے کا عکس جانتے ہیں؟ یا کچھ اور ـــــ بہر حال
مسلمانوں کو تو یہ معلوم ہے کہ حضور صلعم فرماتے ہیں کہ اس
وقت چاند پر سختی ہوتی ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد
جاکر عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے اور آپ اسی کی تلقین
فرماتے تھے۔

ہمارے رام پور میں کچھ لوگ "چاند اور سورج گرہن"
کے موقع پر روزے رکھتے ہیں۔ بیویاں اپنے شوہروں کے
لئے اور کنواری لڑکیاں اپنے بھائیوں کے لئے!۔

جواب:۔

کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کے
سلسلے میں جتنی روایات آئی ہیں ان سب کا خلاصہ اور حاصل
یہ ہے کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جس کا
مقصد بندوں کو خالقِ کائنات کی عظمت و جلالت پر متوجہ
کرنا ہے۔

سائنسی ذرائع سے اگر کسوف و خسوف کی ظاہری وجہ
علم میں آگئی ہے تو اس سے مضمونِ احادیث پر کوئی اثر
نہیں پڑا بلکہ ان احادیث کی مقصدیت کچھ زیادہ ہی واضح
ہوگئی۔ سائنسی ترقیات سے پہلے انسان نہیں جانتا تھا کہ
ستاروں اور شمس و قمر کی جسامت کیا ہے۔ نہ زمین کی
جسامت اور دیگر تفصیلات کا پورا علم تھا۔ سائنس نے
ان مخفیات سے پردہ اٹھایا تو یہ بات اور زیادہ منقح ہوگئی
کہ خالقِ کائنات کی قدرت و قوت بیکراں ہے۔ کتنے کتنے
بڑے کرّے اور اجسام اس کے حکم پر کس طرح خلا میں
گردش کر رہے ہیں۔ وہ اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک
دوسرے سے نہیں ٹکراتے۔ ان میں محیر العقول نظم و ضبط ہے
اس نظم و ضبط کی موجودگی میں اگر کبھی کبھی سورج یا چاند گرہن
ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نظامِ گردش بطور
معمول مقرر ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی آئی۔ کسی سیارے
یا زمین کا عکس چاند اور سورج پر روز روز تو نہیں پڑتا۔ ایسا
گاہے گاہے ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا ظاہری مشاہدے کے اعتبار
سے بھی انسانی طبیعت کے لئے یہ نظارہ دہشت ناک ہے کہ چاند
یا سورج کا چہرہ سیاہ پڑتا چلا جائے اور مضمرات و مفاہیم
کے اعتبار سے بھی خطرناک ہے کہ اگر نظم کی اس جزوی تبدیلی
میں چاند یا سورج یا ستارے باہم ٹکرا جائیں تو کتنا عظیم حشر
برپا ہو۔ زمین روئی کے گالے کی طرح دھنک جائے۔
فضائیں جہنم زار بن جائیں۔ زندگی کا نام و نشان مٹ جائے۔
سائنس یہ تو بتا سکتی ہے کہ چاند یا سورج گرہن کا ظاہری
سبب کیا ہے لیکن وہ یہ ضمانت نہیں دے سکتی کہ نظم کی تبدیلی
کے دوران دو ہولناک جسامت والے کرّوں کا ٹکرانا ناممکن
ہے۔

لہذا خالقِ کائنات کی عظمت وجلالت پر ایمان
رکھنے والے ہر انسان کو ایسے خطرناک لمحات میں اپنے
احساسات کا اظہار کرنا چاہئیے۔ اسلام میں اس اظہار کا
سب سے بہتر طریقہ نماز ہے لہذا نماز کی تلقین کی گئی۔
رہا چاند یا سورج پر سختی ہونے نہ ہونے کا مسئلہ۔
تو یہ دراصل کنایاتی طرزِ تعبیر ہے۔ سب جانتے ہیں اور حضورؐ
بھی جانتے تھے کہ چاند سورج ذی روح نہیں ہیں۔ انھیں شعور و
احساس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود اگر آپ نے
"سختی" کا ذکر کیا تو ظاہر ہے کہ اس سے بطور کنایہ بندگانِ
خدا کو خوفِ خدا دلانا تھا۔
گرہن کے موقعہ پر روزے رکھنا مسنون نہیں۔
کوئی رکھ لے تو مضائقہ بھی نہیں۔ البتہ روزہ کسی اور کے لئے
نہیں رکھا جاتا۔

ذکر وشغل اور تبلیغی نصاب وغیرہ

سوال ۲۲:- از شکیل احمد۔ ناگپور۔
تجلی بابت اکتوبر ۱۹۷۴ء صفحہ نمبر ۲۷ بسلسلہ "مسجد میں
ذکر وشغل اور تبلیغی نصاب" آپ نے لکھا ہے:-
"ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد میں مومنین کا اجتماع یا تو
فرض نمازوں کیلئے ہوتا تھا یا کسی ملی وسیاسی مسئلے
میں مشاورت اور تبادلۂ خیال کے لئے۔ وہ سنن و
نوافل تک اکثر صحابہؓ اور خود حضور صلی اللہ علیہ
وسلم گھروں میں پڑھتے تھے جو فرض نمازوں سے
قبل یا بعد فرادیٰ فرادیٰ پڑھے جاتے تھے۔"
آپ کے ان جملوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں
مساجد میں نہ تو کہیں درسِ قرآن ہوتا تھا اور نہ درسِ حدیث
تو پھر جماعتِ اسلامی کے افراد مساجد میں درسِ قرآن اور
درسِ حدیث کا پروگرام کیوں رکھتے ہیں؟ اگر درسِ حدیث
اور درسِ قرآن کا پروگرام ہو سکتا ہے تو مسجد میں "تبلیغی
نصاب" کے پڑھنے میں کیا حرج ہے؟
جواب:-
ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ مسجد میں "تبلیغی نصاب" پڑھنا
گناہ یا نامناسب ہے۔ اعتراض ہمیں جس بات پر ہے
وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں مساجد میں تبلیغی نصاب پڑھا جانے
لگا ہے وہاں وہاں اس کا ایسا التزام ہے کہ اس کی جگہ کچھ
اور پڑھنے کو عملاً حرام کر لیا گیا۔ کبھی کوئی شخص اس کے عوض
کوئی اور کتاب سنانا چاہے یا وقتی ضرورت کے تحت کوئی
تقریر ضروری سمجھے تو اسے گوارا نہیں کیا جاتا بلکہ تبلیغی
نصاب ہی کی خواندگی ہوتی ہے۔ اسی کا نام ہے غیر واجب
کو واجب بنا لینا۔
آپ نے سوال کے ذیل میں جماعتِ اسلامی پر جو اعتراض
کیا ہے وہ بے محل ہے۔ اول تو یہ جماعتِ اسلامی ہی کے
افراد کی خصوصیت نہیں کہ مساجد میں قرآن وحدیث کا درس
دیں۔ اور بھی لوگ یہ کارِ خیر انجام دیتے ہیں۔ دوسرے اس
فعل کو "ذکر وشغل" پر قیاس نہیں کرنا چاہئیے۔ ذکر وشغل
عبادات ہیں جنھیں آدمی موجبِ ثواب سمجھکر اختیار کرتا ہے۔
مساجد میں وہی عبادتیں درست ہیں جن کا ثبوت صحابہ
رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مل جائے۔ درسِ قرآن وحدیث
کا اہتمام بطور عبادت نہیں بلکہ اس مقصد سے کیا جاتا ہے
کہ سامعین کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اللہ اس حسنِ نیت کا
ثواب عطا کر دے تو اس کا احسان ہے لیکن اس کی حیثیت
بہرحال ایک وسیلے اور ذریعے کی ہے عبادت کی نہیں اس لئے
اس پر ذکر وشغل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔
علاوہ ازیں یہ سمجھنا نادانی ہے کہ زمانۂ رسالت میں مساجد
کے اندر قرآن وحدیث کا درس نہیں ہوتا تھا۔ حضورؐ خود چلتا
پھرتا قرآن تھے۔ اپنی مسجد میں آپ ہر مناسب موقعہ پر لوگوں
کو وعظ ونصیحت بھی کرتے تھے مخصوص حالات کی بھی خبر
دیتے تھے سیاسی مشورت کی بھی نوبت آتی تھی۔ اسی طرح
آپ کے بعد صحابہؓ نے مساجد کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا
حضورؐ کا اپنا وعظ وخطبہ تو حدیث ہونے کے علاوہ قرآن بھی
ہے کیونکہ آپ دین کے مسائل واحکام میں وحی کے تحت ہی
کلام فرماتے تھے۔

غیبی اسرار

سوال :- (ایضاً)

قرآن کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وہ نظامِ عالم کو درست کرنے کے بعد عرش پر مستوی ہوا" کا مطلب اچھی طرح واضح کیجئے۔

تجلی مذکورہ صفحہ ۱۳ پر آپ نے لکھا ہے :-

"رسول اللہ صاحبِ جسم تھے وہ جب جس مقام پر بھی ہوں ان کا جسم اسی طرح خلا کا کچھ حصہ گھیرتا تھا جس طرح دوسرے اجسام گھیرتے ہیں اور یہ کہہ دینا آسان تھا کہ آپ اس وقت فلاں جگہ ہیں اور فلاں جگہ نہیں ہیں۔ یہی حال اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا بھی ہوتا تب تو یہ کہنا واقعی ممکن تھا کہ فلاں وقت رسول اللہ صلعم کے اور اللہ کے مابین اتنا کم فاصلہ رہ گیا ہے لیکن اللہ کا حال یہ نہیں ہے پھر کیسے درمیانی فاصلہ کا تعین یا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔"

مجھے آپ کی اس تحریر سے اتفاق ہے مگر ایک عام بات جو کہی جاتی ہے کہ "معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اپنے پاس بلایا اور سدرۃ المنتہیٰ کے آگے بلا کر آپؐ سے کچھ باتیں کیں۔" تو یہ بلانا کس معنیٰ میں ہوا جب کہ اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

جواب :-

اللہ تعالیٰ بلاشبہ انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہے لیکن اس کے انوار مختلف مقامات پر مختلف انداز کے جلوے پیدا کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کوہِ طور پر اس کی بعض تجلیات سمٹ کر اس طرح ایک نقطہ پر جمع ہوئیں کہ حضرت موسیٰؑ تابِ نظارہ نہ لا سکے اور بے ہوش گئے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان مکالمہ بھی ہوا تھا جو قرآن میں درج ہے۔ اسی پر معراج کو قیاس کر لیجئے۔ آدمی کے بس میں بالکل نہیں کہ ان مغیبات کے بارے میں ایسی کوئی نقشہ کشی اور تصویر سازی کر سکے جو دو اور دو چار کی طرح واضح ہو۔ جو کچھ قرآن وحدیث سے معلوم ہو گیا ہے اسی پر ایمان رکھنا چاہئے اور مزید قیاس آرائیوں سے کم از کم عوام کو تو پرہیز ہی کرنا چاہئے

یا رسول اللہؐ کہنے کا حکم

سوال :- (ایضاً)

تجلی بابت اگست وستمبر ۶۶ء صفحہ ۲۸،۲۷ پر آپ نے لکھا ہے :-

"یا رسول اللہؐ" کا نعرہ اس عقیدہ کے ساتھ لگانا کہ حضورؐ سن رہے ہیں۔ شرک کی بدترین قسم ہے۔"

اگر کوئی شخص صرف ذکر اور یاد کے ارادہ سے یا رسول اللہؐ کہتا ہے مگر اس کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ حضورؐ اس کی آواز کو سن رہے ہیں تو کیا اس کے ایسا کہنے سے شرک ہو جائے گا۔ اگر ہو جائے گا تو کیا اس پر "مشرک" کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے، اگر وہ توبہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

جواب :-

نہیں۔ اس صورت میں شرک نہیں ہو گا۔ البتہ جب اِس شخص کو بتا دیا جائے کہ "یا" حرفِ ندا ہے۔ اس کا استعمال اللہ کے لئے کرنا چاہئے رسول کے نہیں اور التحیات میں جو "یا" ہے یہ بس اسی موقعہ کے لئے مخصوص ہے تو اس کے بعد بھی اس شخص کا باز نہ آنا گناہ کہلائے گا۔

اور اگر یہ کلمہ اس عقیدے سے دہرایا گیا کہ رسول اللہؐ سن رہے ہیں تو گو کہ اس کے شرک ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن باقاعدہ "مشرک" ایسے شخص کو پھر بھی قرار نہ دیں گے کیونکہ یہ لوگ زبان سے اس عقیدے کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ تاویلیں کرتے ہیں۔ لیکن اگر زبان سے اعتراف کر لیں تب انہیں شرک کا فتویٰ ضرور لگ سکتا ہے اور اسی عقیدے پر مریں تو ان کی نمازِ جنازہ بھی درست نہیں۔ انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں بھی نہیں دفن کرنا چاہئے۔ البتہ اس معاملہ میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ بہت مضبوط ثبوت چاہئے اس بات کا کہ مجرم سے

قبل انھوں نے اس واہی عقیدے سے توبہ نہیں کی بلکہ اسی پر مرے ہیں۔

یہ بھی سننا پڑا!

سوال :- از۔ افضل واجد۔

ہماری مسجد میں پیش امام صاحب نے ایک شخص کا آسیب اُتارنے کی غرض سے اس مسلمان شخص کو ایک مسلمان کا پیشاب پلادیا۔ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

جواب :-

خدا پناہ میں رکھے۔ ایسا تو نہیں آپ نے بے تحقیق محض اِدھر اُدھر سے سُن کر لکھدیا ہو۔ آخر کسی مسلمان سے کیسے اس گھناؤنے اور بیہودہ فعل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ آپ ان امام صاحب ہی سے پوچھئے کہ کیا واقعی انھوں نے ایسا کیا ہے۔ اگر وہ کہیں کہ نہیں کیا تو انپر اعتبار کر لیجئے۔ لیکن اقرار کریں تو انھیں دیگر مصلیوں کے تعاون سے نکال باہر کیجئے۔ ایسا شخص جو بغیر جوازِ شرعی کے آدمی کا پیشاب کسی مسلمان کو پلادے امامت تو کیا پاس بیٹھنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کسی سفلی عمل میں یہ خبیثانہ نسخہ بھی موجود ہی ہو۔ امام صاحب اقرار کے بعد توبہ پر آمادہ ہوں تو علانیہ توبہ کرائی جائے۔ اس کے بعد انھیں امامت پر قائم رکھا جاسکتا ہے بشرطیکہ نمازیوں کی بڑی اکثریت خوشی سے اسے قبول کرے۔

تبلیغی جماعت اور مولانا مودودی

سوال :- (ایضاً)

میں نے جناب مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کی چھ جلدیں خریدی ہیں۔ میں اور میرے دوست اللہ کے کلام اور جناب مولانا کی تشریحات سے اللہ کے کرم سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے تبلیغ کی آیتیں کلام پاک میں دیکھیں اور مولانا کی تشریحات بھی دیکھیں کہ مولانا نے کہیں تبلیغی جماعت پر طنز نہیں کیا۔ جیسا کہ آپ نے تجلی میں کیا ہے اور بہت سے ہمارے دوستوں اور بذاتِ خود میں بھی اللہ کے کرم سے اسی جماعت کی بدولت صحیح راستہ پر آیا۔ پچھلے تجلی میں آپ نے شاید دو صحابہؓ کے واقعات لکھے ہیں مگر جو کلام پاک کی کئی آیتیں ہیں اب آپ ہی بتائیے کہ تبلیغ کا صحیح طریقہ کونسا ہے؟

جواب :-

آپ بہت سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں۔ نظام الدین والوں کو — جہاں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تفہیم القرآن پڑھتے ہیں اور مولانا مودودی کے ثنا خوانوں میں ہیں تو فوراً اندر ہی اندر یہ تار برقی دوڑ جائے گا کہ اس شخص کو جماعت سے دور رکھا جائے۔

تبلیغی جماعت کو ہم بھی سراپا گمراہی نہیں کہتے۔ ہم نے بھی بار بار یہ وضاحت کی ہے کہ یہ جماعت بھلی جماعت ہے بشرطیکہ غلو اور خوش فہمیوں سے دامن بچائے رکھے۔ مگر جو مزاج یہ بناتی ہے وہ اُس مزاج سے بالکل مختلف ہے جو جماعتِ اسلامی کو مطلوب ہے۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت سے کچھ بھلائیاں سیکھتے ہوئے بھی دوسرا مفید لٹریچر مطالعے میں رکھتے ہیں۔

رہی طنز کی بات۔ تو مولانا مودودی بھلا تفسیر قرآن میں تبلیغی جماعت پر طنز کیوں کرتے۔ وہاں طنز نہ کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ تبلیغی جماعت کے طریق کار اور اندازِ فکر سے متفق ہیں۔

زکوٰۃ اور صدقہ فطر

سوال :- از۔ عبداللطیف عبدالرحمٰن۔ الوله

ریڈیو پاکستان ملتان سے میں نے سنا ہوں کہ جو شخص زکوٰۃ دیتا ہے وہ فطرہ بھی دے تو وہ فطرہ ناجائز ہوگا۔ یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا جواب دیں۔

جواب ۹ :-

خدا جانے ریڈیو نے کیا کہا ہوگا اور آپ نے کیا سُن لیا۔ جو بات آپ نے نقل کی وہ تو بے معنی اور بے تُکی ہے۔

زکوٰۃ اس سالانہ صدقہ کا نام ہے جو مال واسباب اور دولت پر قواعدِ شرعیہ کے مطابق عائد ہوتا ہے۔ یہ صدقہ فرض ہے۔ اور فطرہ اس صدقے کا نام ہے جو عید الفطر پر شریعت نے واجب کیا ہے۔

جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہو اس پر فطرہ تو ضرور ہی واجب ہوگا کیونکہ زکوٰۃ اسی پر واجب ہوتی ہے جو ضرورت سے زیادہ مال رکھتا ہو۔ اور فطرہ ان لوگوں پر بھی واجب ہوتا ہے جن پر زکوٰۃ تو واجب نہ ہو مگر ضرورت سے زیادہ اتنا سامان ان کے پاس ہو کہ اس کی قیمت پر زکوٰۃ عائد ہو سکتی ہو۔ مثلاً آپ کے پاس ایک فاضل مکان ہے جسے آپ نے کرایہ پر دے رکھا ہے اور اس کے کرایہ پر ہی آپ کی روزی کا مدار نہیں ہے تو اگرچہ اس مکان پر زکوٰۃ نہیں لیکن اس کی وجہ سے آپ پر صدقۂ فطر واجب ہوگیا۔ (صدقۂ فطر کی مقدار ۸۰ تولہ والے سیر کے حساب سے ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک گیہوں ہے یا اس کی موجود الوقت قیمت)

اصول یہ سمجھ لیجئے کہ جو لوگ زکوٰۃ لینے کے مستحق نہیں ہیں ان پر صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اور جو مستحق ہیں ان پر واجب نہیں۔

غلو پسندی

سوال ۱ :- از سلیم۔ ہوڑہ۔

فضائلِ مسواک" مصنفہ :- مولانا حافظ اطہر حسین صاحب کے صفحہ نو ۹ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں لکھا ہے۔ "حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کو امت پر فرض نہیں کیا۔ اگرچہ اس کے فضائل اور منافع کا تقاضا بھی تھا کہ اس کو فرض کیا جاتا تاکہ امت کا ہر فرد ان فضائل و منافع کو حاصل کر سکتا الخ"

فضائلِ مسواک ص ۹ ناشر کتب خانہ سعیدیہ نزد مظاہر علوم۔ سہارنپور۔

اس میں کتنا کھل کر حضورؐ کی طرف فرض کرنے کی نسبت کی گئی ہے حالانکہ یہ تو خدا کا حق ہے۔ آپ اپنی رائے گرامی سے نوازیں کہ کیا حضورؐ بھی کسی چیز کے فرض کرنے یا واجب کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب ۱ :-

آپ کے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ امر و نہی اور تحلیل و تحریم کا تمام تر اختیار تو باری تعالیٰ ہی کو ہے اور تمام انبیا علیہم السلام بھی دوسرے انسانوں کی طرح احکامِ خداوندی کے تابع فرمان ہیں لیکن باری تعالیٰ ہی نے قرآن میں یہ حکم بھی صادر فرمایا ہے کہ اے مومنو! رسول اللہؐ جس چیز کا حکم دیں اسے مانو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔ نیز فرمایا گیا کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ نیز فرمایا گیا کہ اللہ کا رسولؐ کسی قضیے میں ایک فیصلہ صادر فرما دے تو اس فیصلے کو دل و جان سے قبول کرنا اہلِ ایمان کا فرض ہے۔

اس طرح کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے رسول اللہؐ کو وسیع اختیارات عطا فرمائے تھے اور ان پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر وہ امت پر کسی ایسی چیز کو فرض و واجب قرار دیتے ہیں جسے قرآن میں فرض و واجب قرار نہیں دیا گیا تو اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا اور یقین کرنا پڑے گا کہ فرض و واجب کرنے کا یہ اقدام رسول اللہؐ نے وحیِ خفی کے تحت کیا ہے جسے اصطلاحِ شرعی میں "وحیِ غیر منطوق" بھی کہتے ہیں۔ گویا اصلاً اور حقیقۃً تو حاکم و قانون ساز اور آمر

ناہی اور مطاع اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن بعض احکام اور قوانین کا اجراء وحی خفی کے تحت رسول اللہؐ کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔

البتہ "فضائل مسواک" کے لائق مصنف کی عبارت اس اعتبار سے سخت قابلِ اعتراض ہے کہ وہ خود کو اللہ اور رسولؐ سے زیادہ عقلمند تصور کر بیٹھے۔ وہ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ جس تقاضے کو انھوں نے سمجھا وہ اللہ اور رسولؐ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یا پھر یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ اور رسولؐ کو معاذ اللہ یہ شعور نہیں تھا کہ کس شے کو فرض و واجب قرار دینا بندوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔

اگر واقعتہً مسواک کے فضائل و منافع کا تقاضا یہی تھا کہ اس کو فرض کیا جائے تو آخر اللہ اور رسولؐ کو کس نے روک دیا کہ وہ مسواک کو فرض نہ کر سکے۔ اس قسم کی باتیں دراصل تفقہ کی کمی اور مبالغہ کی فراوانی پر دلالت کرتی ہیں۔ خدا محفوظ رکھے۔

ابن عبدالوہاب نجدیؒ

سوال :- (ایضاً)

ابن عبدالوہاب کے بارے میں مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کا خیال کیا تھا مطلع فرما سکتے ہوں تو نوازیں۔

جواب :-

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ابن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں صحیح معلومات نہیں تھیں اس لئے وہ ان سے بدگمان تھے۔ ابن عبدالوہاب نجدی بڑے پائے کے مصلح تھے اور بدعات و خرافات کا قلع قمع کرنا ان کا نصب العین تھا۔ اس کے نتیجے میں بدعت پسند حضرات ان کے دشمن ہوگئے اور خوب خوب الزامات تراشے۔ اب وہ بھی دنیا میں نہیں اور مولانا مدنیؒ بھی کوچ کر چکے لہذا معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے

وہ جوابات جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے

توہمات

یہ محض افتراء ہے کہ مولانا مودودی اپنے آپ کو "نبعض شناس رسولؐ" کہتے ہیں۔ نیز یہ خیال محض جہالت ہے کہ کسی کلمہ گو کو کسی بھی صورت میں خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تمام اکابر علماء اس پر متفق چلے آ رہے ہیں کہ دین کے بنیادی اصول و اقدار میں سے کسی کا منکر کافر ہے خواہ وہ دل میں ہزار بار کلمہ پڑھے۔

مولانا مودودی کو تجلی میں شائع شدہ نظم میں مجدد اور محدث اور فقیہہ العصر کہا گیا ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔ یہ نبوت جیسے عہدے نہیں ہیں۔ البتہ مرزا غلام احمد قادیانی کو جو شخص مجدد یا محدث یا فقیہ العصر تصور کرے وہ خارج از اسلام مانا جائے گا کیونکہ مرزا نے دعوۂ نبوت کیا تھا اور جھوٹے مدعی کو خراجِ عقیدت ادا کرنا کھلی گمراہی ہے۔

مولانا مودودی کی بیٹیاں

لڑکیوں کی تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں تجلی اگست، ستمبر ۱۹۵۷ء میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے اس کی روشنی میں مولانا مودودی کی بیٹیوں پر اعتراض اسی وقت درست ہو گا جب یہ تحقیق ہو جائے کہ وہ اجنبیوں کے سامنے بے پردہ رہی ہیں اور مردوں کے ساتھ مخلوط تعلیم حاصل کی ہے۔ اگر یہ کالج صرف لڑکیوں کا ہو یا مخلوط کالج میں الگ الگ کلاس ہوں اور لڑکیاں پردے کی حدود سے باہر نہ ہوں تو اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

یا عبدالقادر شیئاً للہ

ایک سے زائد بار وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس کلمہ

درود داخل شرک ہے۔ اور اولیاء اللہ کے بارے میں اعتقاد رکھنا کہ وہ مرنے کے بعد بھی ہماری پکاریں سنتے اور ہماری مدد فرماتے ہیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

کوئی شخص اگر یوں کہتا ہے کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے اور عالم اسلام کا ایک گروہ اس وظیفہ کو جائز سمجھتا ہے تو اسے محض لغویت اور گمراہی قرار دیں گے۔ عالم اسلام کے بہتیرے گروہ نہ جانے کتنے واہی خیالات میں مبتلا ہیں۔ آپ کے اردگرد یہی ایسے لوگ مل جائیں گے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت کے مستحق حضرت علیؓ تھے اور دیگر صحابہؓ نے ان کے بجائے ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلیفہ بنا کر اہل بیت سے دشمنی کی۔ نیز یہ کہ معدودے چند حضرات کو چھوڑ کر سارے صحابہ گمراہ ہو گئے تھے۔ وغیر ذالک۔ اسی طرح بہتیرے لوگ ایسے مل جائیں گے جو یقین رکھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود تھے اور نبوت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کا خلافتوں کا راشدہ ہونا اختلافی مسئلہ ہے یا رسول اللہ پر ہر طرح کی نبوت کا خاتمہ دو رائے کی گنجائش رکھتا ہے۔

شاہ عبدالقادر جیلانیؒ اسی طرح ایک امتی بزرگ تھے جس طرح اور بے شمار بزرگ گذرے ہیں۔ بزرگوں کے مابین فرق مراتب تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی کو خدائی اوصاف سے متصف کرنا شرک و ضلالت ہے۔ جو لوگ شاہ عبدالقادر کو پکار پکار کر شیئاً للہ کی رٹ لگاتے ہیں ان کے بارے میں کم سے کم جو کچھ کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ان کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مالیخولیا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مستند علمائے سلف میں ایک بھی عالم اور مجتہد اور مفسر و محدث ایسا نہیں گذرا ہے جس نے اس قسم کے مشرکانہ وظائف کو جائز قرار دیا ہو۔ بعد کے غیر عالم صوفیوں نے اگر کسی تاویل کی بنا پر اسے جائز قرار دے لیا ہے تو اس کا مطلق اعتبار نہیں۔

جادو

جادو برحق ہے۔ یعنی وہ کوئی داستانی چیز نہیں بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔ قرآن سے اس کا امر واقعہ ہونا ثابت ہے اور خود رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا جس کا کافی اثر آپ پر ہوا تھا۔ اس کی تفصیل کسی بھی مستند کتاب سیرت میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جادو کا علاج ظاہر ہے وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس فن سے واقف ہوں۔ جادو کرنا سخت گناہ ہے لیکن جس پر جادو کر دیا جائے اس کا علاج کرنا گناہ نہیں ہے۔ تعویذ اور نقش وغیرہ کے دھندے کو اگرچہ ہمارے زمانے میں مستقل کاروبار بنا لیا گیا ہے لیکن اصلاً یہ بہرحال ایک حقیقت رکھتے ہیں اور ان کے اثرات مسلم ہیں۔

مرنے کے بعد کی رسمیں

اس حد تک تو درست ہے کہ جس کے یہاں کوئی موت واقع ہو جائے اس کے عزیز و اقارب کو چاہیئے کہ تین وقت تک وہاں پکا پکایا کھانا بھیجیں۔ یہ اس لئے کہ مرنے والے کے پس ماندگان رنج و غم کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور تعزیت کے لئے آنے والوں کو بھی وقت دینا پڑتا ہے دشواری ہوگی اگر اس حالت میں بھی انھیں چولھا جلانا پڑے لیکن تین وقت کو تین دنوں میں تبدیل کر دینا مناسب نہیں۔ نیز کوئی شخص اگر احباب و اعزہ سے محروم ہو اور اس کے گھر موت کے موقع پر کھانا نہ آئے تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے یہاں چولھا جلائے اور کھانا پکائے۔

مزید جن رسموں کا اضافہ کر لیا گیا ہے وہ بدعتیں ہی ہیں۔ ان کا تعلق شریعت سے نہیں ہے۔

لیلۃ القدر

دسمبر ۱۹۶۷ء کے تجلی میں سوال و جواب کے تحت

شبِ قدر پر کچھ مواد پیش کیا گیا ہے۔ ایک ذی علم دوست جناب منظور انصاری نے اس پر ایک مفصل مراسلہ ارسال فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ ایک ہی شب کے دو نام ہیں۔ اس مراسلہ کو نقل کرکے تفصیلی گفتگو کرنا اس لئے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کسی ایک رائے پر اصرار نہیں۔ فاضل مراسلہ نگار یا کچھ اور حضرات اگر اس پہلو کو درست نہیں سمجھتے جس کی نشاندہی تجلی میں کی گئی ہے بلکہ دوسرے معروف پہلو کو درست سمجھتے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ کیا ضروری ہے کہ ہر مسئلہ پر این و آں جاری ہی رہے۔

"شب براۃ" پر بھی ہم مزید کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ اخبار دعوت میں شائع شدہ مضمون کے اس خلاصے سے ہم متفق ہیں کہ "شب براۃ" کوئی تہوار نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ اہمیت اس کی ہو سکتی ہے کہ لوگ انفرادی طور پر اس میں عبادات کریں تو ثواب نسبتاً زیادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

فیملی پلاننگ

رزق کی تنگی کے ڈر سے خود کو خصی کرا لینا یا بیوی کا آپریشن کرا دینا اگرچہ مناسب بات نہیں ہے لیکن کسی مفتی کا یہ کہنا بھی انتہائی غلط ہے کہ جس نے "فیملی پلاننگ" کرالیا اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ استغفر اللہ۔ امامتِ نماز کی حد تک تو کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص شرعی وجوہ کے بغیر ضبطِ تولید کرتا ہے اس کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اسے امام نہ بنایا جائے لیکن وہ بہرحال مرتد تو نہیں ہو گیا کہ اس کے ذبیحے تک میں حرمت پیدا ہو جائے۔ ایسے غلو سے بچنا چاہئے۔

(یہ تازہ غزل ۲ جنوری ۱۹۷۵ء کو بھٹکل (ضلع میسور) کے مشاعرے میں پڑھی گئی)

یہ سیلِ بے درنگ آنسوؤں کا فضول ہے لاکھ بار آئے
بنے گا موتی وہ اشکِ رنگیں لہو سے جو ہمکنار آئے

چمن کے دیدہ وروں کو یارو ہنسی نہ کیوں بار بار آئے
میں فصلِ گل اسکو کہہ رہا ہوں خزاں کو بھی جس سے عار آئے

وفا تو کانٹوں کی سرزمیں ہے، یہاں وہی جاں نثار آئے
سکون میں جس کو بے کلی ہو تڑپ میں جسکو قرار آئے

چمن کے وہ خود پرست مالی جنھیں خزاں راس آ گئی ہے
وہ کس لئے آرزو کریں گے چمن میں فصلِ بہار آئے

درِ گلستاں پہ فصلِ گل کے حسین کتبے لگانے والو
ہمیں تو ڈر کا ہے وہ موسم گلو نکو جو سازگار آئے

متاعِ گلشن کچھ ایسے بانٹی مرے وفادار دوستوں نے
نہ میرے دامن میں پھول پہنچے نہ ان کے دامن میں خار آئے

یہ کوئے جاناں ہے ہمصفیرو عزیز ہو سر تو لوٹ جاؤ
ابھی تو آیا ہے صرف نیزہ ابھی توقع ہے دار آئے

وفا کے ایوانِ مرمریں پہ جلی قلم سے لکھا ہوا ہے
یہاں وہی سرفراز ہوگا جو سر کی بازی بھی ہار آئے

ہے رائگاں دوستو وہ ساعت ہے جو محرومِ جذب و مستی
وہ سانس قیمت میں کچھ نہیں ہے، نہ جس سے پیغامِ یار آئے

خیالِ جاناں کی محویت میں کچھ ایسی حد میں بھی آ گیا ہوں
سنوں اگر اور کی زباں سے نہ خود مجھے اعتبار آئے

بہت ہی چھوٹی سی داستاں ہے ہماری صحرا نوردیوں کی
وہاں وہاں ہم برہنہ پا تھے جہاں جہاں خارزار آئے

یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اپنی مٹی لگی ٹھکانے
وہ سر جو تھا بارِ دوش عامر کسی کے قدموں پہ وار آئے

عامر عثمانی

قطعات

نہ زہد و تقویٰ نے یاوری کی نہ کام کوئی کمال آیا
حساب کی ضربتوں نے ڈھا دی
حساب کے دن یہ سب عمارت
ہمارے دامن میں وہ تو کہئے کہ تھے ندامت کے چند آنسو
کسی نے انکو قبول کر کے ہماری فردِ عمل جلا دی

یہ سچ ہے زاہد کہ میں اصولاً عذاب کا مستحق ہوں لیکن
جہنمی کہہ کے تو نے ظالم غضب کیا آگ ہی لگا دی
خدا رحیم و غفور بھی ہے خدا کی رحمت کو دے نہ گالی
غرورِ طاعت کی رو میں تو نے خدا کی شانِ کرم گھٹا دی

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا لیکن
حکم یہ ہے کہ اسے شب نہ کہو دن مانو
داغ ہی داغ ہیں چہرے پہ مگر بھی خم ہے
حکم یہ ہے گُل رعنائیِ گلشن مانو

ہمارے عزت و شہرت بھی حرصِ دولت بھی
ہمارے دل کے خزانے میں کیا نہیں اے دوست
جنابِ شیخ کا ڈر بھی ہے خوفِ حاکم بھی
فقط نہیں ہے تو خوفِ خدا نہیں اے دوست

ہائے یہ دور کہ اربابِ تُنک مایہ کو
مرشد و شیخ کہو صاحبِ باطن مانو
وہم زائیدہ خیالات، خرد سوز نکات
ماننے کی کوئی صورت نہ ہو لیکن مانو

عامر عثمانی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

کھوکھلی دیواروں پر سونے کے پترے بھی چڑھادو گے تو وہ انھیں گرنے سے نہ بچا سکیں گے

دعوتِ فکر و عمل

دوسری صدی ہجری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ سجستان درنج (موجودہ افغانستان) کے فرمانروا نے جس کا خاندانی لقب زنبیل تھا، بنی امیہ کے عمال کو خراج دینا بند کردیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلبِ خراج کے لئے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا۔

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔"

کہا گیا وہ لوگ تو گزر گئے۔ زنبیل نے کہا۔

"اگرچہ تمھاری شکلیں ان سے زیادہ شاندار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے اور تم سے زیادہ طاقتور تھے۔"

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر زنبیل نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔ یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین اور تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمہ مجتہدین کا زمانہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گذری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھا رہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ اور اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے اور ساز و سامان، شان و شوکت، دولت و ثروت کے اعتبار سے کوئی قوم ان کے ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا، دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکامِ شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع طاقت کا نظام قائم تھا پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا مگر پھر بھی جو لوگ عہدِ صحابہؓ کے فاقہ کش خستہ حال صحرا نشینوں سے نبرد آزمائی کر چکے تھے انھوں نے ان سر و سامان والوں کو اور ان بے سر و سامانوں میں زبردست فرق محسوس کیا ۔۔۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ ۔۔۔ فلسفۂ تاریخ والے اسے بداوت و حضریت پر محمول کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوصِ نیت، اخلاق اور اطاعتِ خدا اور رسولؐ کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصل قوت یہی چیزیں تھیں۔ ان کی قوت نہ کثرتِ تعداد پر مبنی تھی، نہ اسباب و آلات کی افراط پر۔ نہ مال و دولت پر، نہ علوم و صناعات کی مہارت پر، نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر ۔۔۔ وہ صرف عملِ صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھادی تھی۔ جب قوت و عزت کا یہ سرمایہ ان کے پاس تھا تو وہ قلتِ تعداد اور بے سر و سامانی کے باوجود طاقتور اور معزز تھے اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہو گیا تو کثرتِ تعداد اور سر و سامانی کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوگئے

چلے گئے۔

زنبیل نے دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصل طاقت اس کی آراستہ فوجیں، اس کے آلاتِ جنگ، اس کے خوش خورو خوش پوش سپاہی اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل نہیں ہیں بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات اور اس کے بلند تخیلات ہیں۔ یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکہ چلا دیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کر دیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں دلوں کا وارث بھی بنا دیتی ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چپلیاں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے، بے رونق چہروں والے، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے لوگ دنیا پر وہ رعب، وہ سطوت و جبروت، وہ قدر و منزلت، وہ اقبال و اقتدار جما دیتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شاندار لباس پہننے والے، بڑے ڈیل ڈول والے، بارونق چہروں والے، اونچی بارگاہوں والے، بڑی بڑی منجنیقیں اور ہولناک دبابے رکھنے والے نہیں جما سکتے۔ اخلاقی طاقت کی فراوانی، مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے، مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی طاقت کے فقدان کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو گیا تو ناقص اور عارضی ہو گا۔ کامل اور پائدار نہیں ہو گا، دل کبھی مسخر نہ ہوں گے صرف گردنیں جھک جائیں گی اور وہ بھی اکڑنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مستعد رہیں گی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ و روغن، نقش و نگار، زینت و آرائش، صحن و چمن اور ظاہری خوشحالی سے نہیں ہوتا نہ مکینوں کی کثرت نہ ساز و سامان کی افراط اور اسباب و آلات کی فراوانی اسکو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں، ستونوں کو گھن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہو جائیں تو اس کو گرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ خواہ وہ مکینوں سے خوب معمور ہو اور اس میں کروڑوں روپے کا مال و اسباب بھرا ہوا ہو اور اس کی سجاوٹ نظروں کو لبھاتی اور دل کو موہ لیتی ہو ـــ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو، تمہاری نظریں مدّ نظر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں مگر حوادثِ زمانہ کا معاملہ نمائشی مظاہر سے نہیں اندرونی حقائق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں، دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں، ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں مضبوط ہوں تو زمانہ کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائیں گے اور وہ ان پر غالب آجائے گی خواہ وہ زینت و آرائش سے یکسر محروم ہو ورنہ حوادث کی ٹکریں آخر کار اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں گی اور وہ اپنے ساتھ مکینوں اور اسبابِ زینت کو بھی لے ڈوبے گی۔

ٹھیک یہی حال حیاتِ قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ، طاقت ور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسبابِ عیش، اس کے فنونِ لطیفہ، اس کے کارخانے اور اس کے کالج نہیں ہیں بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہونا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں یعنی اصول کی صحت ان پر پختہ ایمان اور عملی زندگی میں ان کی کارفرمائی ـــ حیاتِ قومی میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک عمارت میں اس کی مستحکم بنیادوں، اس کی پختہ دیواروں اور اس کے مضبوط ستونوں کی ہے، جس قوم میں یہ تینوں چیزیں

مدد رجتنا اتم موجود ہوں وہ دنیا میں غالب ہوکر رہے گی۔ اس کا کلمہ بلند ہوگا خدا کی زمین میں اس کا سکہ چلے گا' دلوں میں اس کی دھاک بیٹھے گی گردنیں اس کے حکم کے آگے جھک جائیں گی اور اس کی عزت ہوگی خواہ وہ جھونپڑیوں میں رہتی ہو' پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہو' فاقوں سے اس کے پیٹ تنے ہوئے ہوں۔ اس کے یہاں ایک کالج بھی نہ ہو' اس کی بستیوں میں ایک بھی دھواں اڑانے والی چمنی نظر نہ آئے اور علوم و صناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامان ترقی سمجھ رہے ہو' محض عمارات کے نقش و نگار ہیں۔ اس کے ترائم دار کارن نہیں ہیں' کچھ کھلی دیواروں پر اگر سونے کے پترے بھی چڑھا دئے گئے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچا سکیں گے۔

بریلوی فتنے کا نیا روپ

بریلوی مکتبِ فکر کے اہلِ قلم جناب ارشد القادری کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ۔ تحریفی تلبیس کی نشاندہی۔ دلچسپ علمی و منطقی بحثیں دستاویزی حقائق۔ کتاب کے فاضل مصنف جناب مولانا محمد عارف سنبھلی نے بڑے دلکش اور فہیمانہ انداز میں نقد و تبصرہ کا فریضہ ادا کیا ہے۔ قیمت — پانچ روپے۔

انکشاف | یہ کتاب بھی "زلزلہ" کی تلبیسات کا جامع فریب چاک کرتی ہے۔ قیمت۔ چھ روپے۔

زلزلہ در زلزلہ | جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بھی "زلزلہ" ہی کے رد میں تصنیف ہوئی ہے۔

قیمت پچاس پیسے

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر

جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ ان تمام امور پر نہایت وقیع و دلچسپ اور بصیرت افروز مضامین نظم و نثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔

قیمت — سوا پانچ روپے

(پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے)

بزمِ پیغمبر (مولوی محمد اسمٰعیل سیوہاروی)		.50
چاند کے ٹکڑے	〃	1/50
معجزاتِ نبوی	〃	1/25
لڑکیوں کا اسلامی کورس	〃	1/50
جنات کی دنیا	〃	2/-
عملیات اور جادو	〃	/50
پودے یا جنگلی خزانے	〃	1/00

منتخب تقریریں | مشہور عالم دین مولانا منظور نعمانی کی اصلاحی تقریریں۔ ہر ہر صفحہ سبق آموز اور ایمان پرور۔ قیمت مجلد — پانچ روپے۔

پیامِ انسانیت | زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے انداز میں کوشش کرنے کی طرف دعوت دینے والی مولانا ابوالحسن علی ندوی کی پانچ اہم تقریریں۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

مقامِ انسانیت | یہ بھی مولانا موصوف کی پانچ تقریریں ہیں جن میں ضروری موضوعات پر مفکرانہ گفتگو کی گئی ہے۔ قیمت دو روپے

انگریزی سے ہندی سیکھئے | "چارمنگ پرائمر" آپ کو انگریزی کے ذریعہ ہندی سیکھنے میں مدد دے گی۔ قیمت — ایک روپیہ۔

اردو سے انگریزی سیکھئے | اس کا نام بھی "چارمنگ پرائمر" ہے۔ اردو سے انگریزی سیکھنے کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت سوا روپیہ 1/25

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

[illegible]

قادیانیت کے جیب و گریباں

ایک معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ملت کے تمام ہی معروف دینی حلقے اور طبقے اور مکاتب فکر قادیانیوں کی تکفیر پر متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے اگر قادیانیت میں ذرا بھی حسنِ تاویل اور حسنِ ظن کی گنجائش موجود ہوتی۔ امت میں ایسے جلد باز اور غیر محتاط لوگ بے شک رہے ہیں اور آج بھی ہیں کہ جو تکفیر کے فتوے میں احتیاط نہیں برتتے۔ لیکن انھیں دوسرے حلقوں اور متین طبقوں کی تائید ہرگز میسر نہیں آتی۔ مثلاً بریلویوں نے علمائے دیوبند اور علمائے اہلِ حدیث اور نہ جانے کس کس کو کافر قرار دیا لیکن دنیا کے سامنے ہے کہ ان کی فتوے بازی کو سنجیدہ اہلِ علم کی طرف سے بیزاری اور نفرت کے سوا کچھ نہ ملا۔ اسی طرح بعض بدبختوں نے مولانا مودودی پر کفر کا فتویٰ جڑ دیا مگر ان کی آواز بھی دیوانے کی بڑ بن کر رہ گئی۔ کسی مسلمان فرد یا گروہ پر کفر کا فتویٰ جڑ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس پر امت کے مختلف مکاتبِ فکر اور اہل الرائے کے مابین کامل اتحادِ رائے ہو ہی نہیں سکتا جب تک وجوہِ کفر روزِ روشن کی طرح واضح نہ ہوں۔

یہ بھی ہر شخص کو معلوم ہے کہ پاکستانی حکومت نے قادیانیوں کو قانونی طور پر خارج از اسلام اس وقت قرار دیا ہے جب ملک بھر کے عوام و خواص نے متفق طور پر اس کا مطالبہ کیا۔ پاکستان میں ہر ہر مکتبِ فکر کے نمائندہ علماء کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں باہم بے شمار اختلافات بھی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف وقتاً فوقتاً تنقیدیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان میں مباحثے اور جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود قادیانیت کے مسئلے میں انھیں اختلافِ رائے کی گنجائش نہ مل سکی اور سب نے یک آواز ہو کر کہا کہ قادیانیت جسدِ ملت کا ناسور ہے۔ اسلام کے خلاف سازش ہے۔ دین کے مقابل صف آرا ہے۔ رسالت مآبؐ کی توہین و تضحیک ہے۔ اس طرح اس کو کسی قیمت پر مسلمان نہیں مانا جا سکتا۔

ہندوستان کے چوٹی کے علماء بہت پہلے قادیانیوں کی تکفیر کر چکے ہیں۔ آج بھی جو قابلِ ذکر حلقے علماء دین کے یہاں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب ان کی تکفیر اور اسلام سے قطعی خارج ہونے پر متفق ہیں۔ پھر [illegible]

انہوں نے ۔۔۔ یا ضرورت سے زیادہ "روشن خیالوں" کے یہ دیو... سکتا ہے کہ یہ تفسیر مناسب نہیں یا اس تفسیر میں ضروری احتیاط نہیں برتی گئی۔ احتیاط بہت عمدہ چیز ہے لیکن بے غیرتی، بے حسی اور غفلت کو تو احتیاط نہیں کہتے۔ خاتم الانبیاءؐ کے بعد کوئی شخص کھلا کھلا دعوٰہ نبوت لے کر اٹھے اور دنیا کو اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دے تو اس پر تڑپ اٹھنا ایک باضمیر مسلمان کا فطری ردِ عمل ہونا چاہیے۔

پاکستان سے جڑیں اکھڑ جانے کے بعد گمان ہے کہ قادیانیت کی جولانگاہ اب شاید ہمارا ہندوستان ہی بنے گا۔ اس کے آثار بھی پیدا ہو چلے ہیں۔ دنیائے اسلام میں اس فتنے کے لئے اور کہیں ٹھکانا ہے بھی نہیں۔ بیت اللہ اور مدینۃ الرسولؐ کی پاک حدود میں تو پہلے ہی قادیانیوں کا قدم رکھنا ممنوع ہے۔ اہلِ حجاز ان کے کفر سے باخبر ہو چکے ہیں۔ عنقریب دوسرے عرب ممالک بھی حقیقت جان لیں گے اور انھیں ہندوستان کے سوا اور کہیں جائے پناہ میسر نہ آسکے گی۔ پناہ یہاں یہ شوق سے لیں اور مختلف مذاہب کے گلدستے میں پھول کی طرح سجیں لیکن یہ فریب قابلِ درگذر نہیں ہے کہ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی یہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے جائیں۔ اسی لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اپنے کم علم اور سادہ لوح مسلمان بھائیوں کو ان ظاہر فریب دلائل کی پوست کندہ حقیقت سے آگاہ کر دیں جن کی آڑ لے کر یہ دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ واللہ الموفق وہو المستعان

پیشِ نظر بحث

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی مبعوث ہونے والا نہیں۔۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس پر تمام امت متفق ہے۔ حضورؐ کے بعد جس نے بھی کسی گوشے دیار میں نبوت کا دعویٰ کیا امتِ محمدیہؐ نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے دعوے کو ایڑیوں تلے رگڑ ڈالا۔ لیکن قادیانی حضرات اس عیاں صورت حال سے آنکھیں بند کر کے عوام الناس کو برابر یہ باور کرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ رسول اللہؐ پر صرف تشریعی نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے، غیر تشریعی کا نہیں۔ یعنی ایسا نبی تو آپؐ کے بعد نہیں آئے گا جو نئی شریعت لائے مگر ایسا نبی ضرور آئے گا جو شریعتِ محمدیؐ کے تحت نبی بنایا گیا ہو۔ چنانچہ مرزا غلام احمد ایسے ہی نبی ہیں۔ ان پر وحی اترتی رہی ہے اور ان پر ایمان نہ لانے والے گمراہ و بے دین ہیں۔

اس سلسلے میں ان حضرات نے کچھ دلائل تراش لئے ہیں۔ یہ دلائل قابلِ ذکر بھی نہ ہوتے اگر ہمارے مسلمان بھائیوں میں دین کا علم و فہم عام ہوتا لیکن دین کا علم و فہم عام کہاں اسلئے بادلِ ناخواستہ ہمیں ان دلائل کا ذکر اور رد کرنا پڑ رہا ہے تاکہ حق و باطل گڈمڈ نہ ہونے پائیں۔

فی الحال ہمارے آگے ایک کتابچہ ہے جو پہلے پاکستان میں چھپا تھا اور اب ماضی قریب میں اسے پنجاب سے پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا ہے۔ ہم اس کے تمام مندرجات پر قسط وار نقد کریں گے۔ ترتیب یہ ہے کہ پہلے قرآن۔ پھر حدیث۔ پھر بزرگوں کے وہ اقوال جنھیں قادیانی مبلغ نے اپنے باطل موقف کی شہادت میں پیش کیا ہے۔ یہ کتابچہ چونکہ بڑا ظاہر فریب ہے، اور خطوط سے ہمیں علم ہوا کہ اس کے بعض مندرجات کا کوئی شافی جواب بہتیرے بھائیوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے لہٰذا ابتداءً اسی پر توجہ دینا ضروری معلوم ہوا۔ ہمارے بھائی مطمئن ہو جائیں کہ قادیانی عالم کلام کی جو باتیں انھیں بظاہر عالمانہ اور منصفانہ نظر آرہی ہیں وہ فی الحقیقت جاہلانہ اور فریب کارانہ ہیں۔ اپنے اس دعوے کے دلائل ہم انشاء اللہ اتنی ہی تشفی بخش تفصیل و توضیح کے ساتھ پیش کریں گے جو ہمارا معمول ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے عقلی و نقلی دلائل ہر انصاف پسند اور سمجھ دار آدمی کے لئے کافی شافی ہوں گے۔

واللہ المستعان

سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف آئیے:۔

قرآن کریم کی آیات کو کس بے دردی کے ساتھ یہ لوگ توڑتے مروڑتے اور اپنے باطل خیالات کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اس کے دو نمونے پیش نظر کتابچے میں پائے جارہے ہیں:۔

پہلی آیت

سورۂ نساء میں فرمایا گیا ہے:۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ	جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ	(صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کریں گے،
اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ	وہ ان کے ساتھ شامل ہیں جن پر اللہ تعالیٰ
النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ	نے انعام کیا ہے یعنی نبی صدیق شہید
وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ	اور صالح اور یہ ان کے اچھے ساتھی
وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ؕ	ہیں۔۔

آیت کا ترجمہ بھی ہم نے کتابچے ہی سے نقل کیا۔

اس سے پہلے کہ قادیانی صاحب کی قرآن فہمی پر بحث کی جائے یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ صحابہؓ اور تابعین اور دیگر مستند اہلِ علم سے اس آیت کی شانِ نزول اور مراد و منشا کیا منقول ہے اور یہ کہ جملہ مفسرین اس کا کیا مطلب سمجھتے اور بیان کرتے آئے ہیں۔

شہرۂ آفاق مفسر امام البغویؒ نے اور روح المعانی کے مصنف علامہ آلوسیؒ نے اور دیگر دسیوں قدیم و جدید مفسرین نے اسی آیت کے تحت روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ کو آپ سے بے حد محبت تھی۔ آپ کو دیکھے بغیر جب تھوڑا وقت گذرتا اور بے چین ہوتے۔ یہ خوف کہ موت کے بعد ہمیشہ کے لئے آپ کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا انھیں اس درجہ غمگین بنائے ہوئے تھا کہ قلق جسمہ و تغیر لونہ و بدن لاغر ہو گیا تھا اور رنگ میں تبدیلی آگئی تھی، ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو ان کا غم آلود اور مرجھایا ہوا سا چہرہ دیکھ کر حضورؐ نے پوچھا ثوبان کیا بات ہے؟ وہ بولے کہ اے اللہ کے رسول! اور تو کوئی بات نہیں بس آپ کی زیارت کے بغیر مضطرب رہتا ہوں اور یہ خیال ستاتا رہتا ہے کہ آخرت میں آپ تو انبیاء کے ساتھ اونچے درجوں میں ہوں گے میں بھلا آپ کا دیدار کیسے کر سکوں گا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت مسروقؒ کہتے ہیں اور مفسر ابن جریرؒ نے حضرت ربیعؒ سے بھی یہ بات نقل کی ہے کہ کچھ صحابہؓ ایک دن آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ تو آخرت میں بہت ہی اونچے درجات میں مکین ہوں گے ہم لوگ انھیں کیسے دیکھ سکیں گے۔ اس وقت جبریلؑ یہ آیت لائے اور رسول اللہؐ نے ارشاد کیا کہ جنت میں اونچے درجے والے وقتاً فوقتاً نیچے بھی آتے جاتے رہیں گے اور اس طرح مختلف درجات والوں کا میل ملاپ ہوتا رہے گا۔

طبرانیؒ، ابو نعیمؒ اور ضیا مقدسی نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ مجھے آپ، اپنی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز ہیں۔ میں گھر میں سوتا ہوں تو برابر آپ کی یاد آتی رہتی ہے اور پھر اس وقت تک چین نہیں ملتا جب تک آپ کی زیارت نہ کر لوں۔ مگر مجھے ایک دن مرنا ہے اور آپ کو بھی۔ آپ تو جنت میں داخل ہو کر درجاتِ عالیہ میں چلے جائیں گے میں آپ کا دیدار کیسے کر سکوں گا۔ حضورؐ خاموش رہے یہاں تک کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ یہ بیان حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

ان متعدد روایات میں کوئی ٹکراؤ اور اختلاف نہیں آیات اترتے وقت ظاہر ہے تمام صحابہؓ تو حضورؐ کے پاس موجود ہوتے نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مثلاً ثوبان کی موجودگی میں یہ آیت اتری ہو۔ فوری طور پر دوسرے صحابہؓ کو اس کا علم نہ ہوا ہو پھر دوسرے موقع پر صحابہؓ یہی گفتگو کر رہے ہوں کہ جنت میں ہم حضورؐ کو کیسے دیکھ سکیں گے تو حضورؐ نے یہ آیت پڑھ دی ہو۔ اس طرح اس آیت کے نزول کا تعلق ان تمام واقعات سے ہو جاتا ہے جن کا روایات میں ذکر آیا۔

پھر مستند اور محدثین اس آیت کو سمجھنے میں ...

یہ تو بہر حال طے ہے کہ جنت میں مختلف درجات ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کا تذکرہ کیا ہے اور عقلاً بھی واضح بات ہے کہ نیکی اور خدا پرستی میں سب مومنین تو یکساں نہیں، کسی کی عبادات کم ہیں کسی کی زیادہ۔ انبیاء کا مرتبہ سب سے اونچا ہے لہٰذا ان کے انعامات و درجات میں بھی فرق ہونا ہی چاہئیے۔ مگر اللہ تعالیٰ بندوں کو یہ خوشخبری دے رہا ہے کہ تم میں سے جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ جنت میں بفرقِ مراتب انبیاء اور صدیقین وغیرہ کی رفاقت و معیت حاصل کرے گا۔

رفاقت اور معیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی مکان میں رہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ حضورؐ کے دولتکدے میں تو نہیں رہتے تھے لیکن پھر بھی انھیں رسول اللہؐ کا ساتھی اور رفیق کہا جاتا ہے۔ صحابی کے معنی ہی ساتھی کے ہیں — آج بھی ہم سب کے کچھ ساتھی اور رفیق ہوتے ہیں مگر ان کی جائے سکونت اور معاشرتی حیثیت اور معاشی حالت الگ الگ ہوتی ہے۔ وقتاً فوقتاً ہم آپس میں ملتے جلتے ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جنت کا معاملہ ہے کہ وہاں درجات یقیناً بہت ہیں اور مومنین کے مختلف طبقوں کو ان کی حیثیت کے مطابق مختلف درجات میں رکھا جائے گا۔ علاوہ اس کے لطف و کرم کا ایک یہ طریقہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ اللہ دو شخصوں کو ایک ہی جگہ رکھے اور ایک ہی جیسی نعمتوں سے نوازے مگر ایک شخص کے اندر لذت کے احساس کی صلاحیت دوسرے کے مقابلہ میں بڑھا دے۔ جیسے آپ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک ہی غذا اُس شخص کو زیادہ مزا دیتی ہے جو خوب بھوکا ہو۔ رمضان میں آپ تجربہ کرتے ہی ہیں کہ افطار کے وقت غذاؤں میں عام دنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ لذت ملتی ہے۔ یہی حال دوسری اشیاء کا ہے۔ ایک ہی باغ میں دو آدمی ٹہل رہے ہیں تو وہ شخص زیادہ لطف حاصل کرے گا جو صحت مند ہو بمقابلہ اس کے جو بیمار ہو۔ نیز طبعی طور پر کچھ لوگ زیادہ حساس اور کچھ لوگ کم حساس ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی نعمت سے برابر کا لطف نہیں اٹھا سکتے کیونکہ تاثر کی استعداد یکساں نہیں ہوتی۔

اس تفصیل کا حاصل یہ نکلا کہ مثلاً انبیاء علیہم السلام کو ان کی عظمت و محبوبیت کے تحت زیادہ درجہ اور انعام دینے کی صورت جہاں یہ ہے کہ ان کی سکونت زیادہ بہتر جگہ ہو وہیں یہ بھی ہے کہ ان کی استعدادِ تاثر اور حس بڑھا دی جائے۔ اس طرح عین اس وقت بھی جب وہ جنت میں اپنے سے نیچے درجے والوں کے ساتھ ہوں یہ ممکن ہے کہ انھیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ راحت اور آسودگی کا احساس ہو رہا ہو۔

جب یہ آپ سمجھ گئے تو آئیے احادیث کی طرف۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد ابن حنبل، مسند ابویعلیٰ، مسند بزار، مسند شافعی اور متعدد دوسری کتبِ حدیث میں کثیر صحابہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ایک قوم سے دلی وابستگی رکھتا ہو مگر حالات کی مجبوریوں سے اس کا ساتھی نہ بن سکا ہو۔ حضورؐ نے جواب دیا المرءُ مع من احبَّ (ہر آدمی ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت رکھتا ہے)۔ صحابہؓ یہ سنکر بے حد مسرور ہوئے۔ حضرت انسؓ فرطِ انبساط میں کہنے لگے کہ مجھے تو رسول اللہؐ سے اور ابوبکرؓ و عمرؓ سے محبت ہے۔ میرے اعمال ان جیسے نہ سہی مگر اب امید ہوگئی ہے کہ آخرت میں مجھے ان کا ساتھ میسر آئے گا۔

اسی طرح مسلم شریف میں حضرت ربیعہؓ بن کعب اسلمی کا یہ بیان مروی ہے کہ میں رات کو حضورؐ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے مجھ سے فرمایا کہ اے ربیعہ مانگ کیا مانگتا ہے! — میں نے عرض کیا اے رسول اللہؐ! جنت میں آپ کا ساتھ اور رفاقت مانگتا ہوں۔ حضورؐ بولے اور مانگ! میں نے کہا یا رسول اللہ میری مانگ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اب آپؐ نے فرمایا کہ اچھا تو میری مدد کر اور خوب خوب عبادت کیا کر۔

حضورؐ کا منشائے مبارک یہ تھا کہ تو خوب خوب عبادت کرے گا تو میں اللہ سے تیری شفاعت کروں گا اور اس کے فضل سے تیری مراد پوری ہو جائے گی۔

ترمذی شریف میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جھوٹ سے پرہیز کرنے والا راست باز اور ایماندار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضورؐ بلند درجات والے اہلِ جنت کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ بعض صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہؐ! یہ اونچے درجات تو انبیاء ہی کے لئے مخصوص ہوں گے کسی اور کا وہاں تک پہنچنا کیونکر ہو سکتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا خدا کی قسم وہاں تک وہ لوگ بھی پہنچیں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کے رسولوں کی تصدیق کی اور انھیں ماننے کی طرح مانا۔

ایک سیاہ فام حبشی حاضرِ خدمت ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو اللہ نے صورت اور رنگ اور نبوت سب میں مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ اگر میں اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ لائے ہیں اور ان احکام کی پیروی کروں جن کی آپ کر رہے ہیں تو کیا جنت میں آپکی معیت و رفاقت ملے گی۔ اللہ کے رسولؐ نے جواب دیا بے شک ملے گی۔

اسی نوع کی اور بھی روایات ہیں۔ ان کی نقل سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جنت میں اگرچہ مختلف درجات ہیں اور بندوں کو ان کی حیثیات کے مطابق یہ عطا ہوں گے انبیاء سب سے اونچے درجے میں ہوں گے اور ان میں بھی قرآنی تصریح کے مطابق مراتب کا فرق ہے حتیٰ کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ ترین مرتبے میں ہیں لہٰذا انعام بھی ہر ایک کو اس کی حیثیت ہی کے مطابق ملے گا مگر ایسا نہیں ہوگا کہ ایک درجے والے دوسرے درجے والوں کی رفاقت سے بالکل محروم کر دیئے جائیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو لفظ مَعَ آیت میں آیا وہی حدیث میں موجود ہے اس سے پتا چلا کہ غیر انبیاء کو بھی انبیاء کی معیت و رفاقت اس طرح نصیب ہوگی کہ وقتاً فوقتاً انھیں ملنے جلنے کا موقعہ ملتا رہے گا جیسے دنیا میں مختلف مکانوں میں رہنے والے دوست رشتہ دار وغیرہ بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آیت میں اللہ یہی بشارت دے رہا ہے ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ صحابہؓ نبی نہیں تھے اور ہم غلامانِ غلام تو نام ہی کے مسلمان ہیں لیکن اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ (جنت میں تمھیں ہر وہ چیز ملے گی جسے تمھارا جی چاہے گا) لہٰذا صحابہؓ میں سے اور ہم میں سے جسے بھی رسول اللہؐ سے گہری محبت ہوگی وہ جنت میں پہنچ کر قدرتاً یہ چاہے گا کہ مجھے اپنے محبوب کا دیدار اور صحبت و رفاقت میسر ہو لہٰذا اس آیت کے اور احادیث کے مطابق اس کی آرزو ضرور پوری ہوگی۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اگرچہ انبیاء اور صدیقین وغیرہ کے جنت میں الگ الگ درجات ہیں اور ہونے بھی چاہئیں لیکن کمتر درجے والے بھی ان کی صحبت و معیت سے محروم نہیں رہیں گے۔

اب دیکھئے قادیانی صاحب مذکورہ آیت نقل کر کے کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔

"اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ایک انسان صالحیت کے مقام سے ترقی کر کے نبوت کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے اس فقرے پر نگاہِ نقد ڈال لیجئے تاکہ اندازہ کر سکیں کہ اس فقرے کی بنیاد پر آگے جو کچھ کہا گیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے۔

"نبوت" کیا ہے۔ اس کے بارے میں علماءِ امت کے مابین دو رائے نہیں۔ صحابہؓ سے لے کر آج تک کے تمام مفسرین و محدثین اور شیوخ و اساتذہ اس بات پر متفق چلے آرہے ہیں کہ "نبوت" کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے انسان عبادات و مجاہدات کے ذریعہ حاصل کر لے۔ وہ تو ایک عہدہ اور منصب ہے جو کسی بندے کو اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

نبا خبر کے معنی خبر کے ہیں قرآن میں مستقل ایک سورہ موجود ہے النبأ۔ اس میں فرمایا گیا ہے۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ

یعنی "کس چیز کے متعلق یہ لوگ پوچھ گچھ میں مشغول ہیں۔ کیا اس بڑی خبر کے متعلق جس میں ان کی چہ میگوئیاں جاری ہیں۔"

اسی طرح سورۂ ص میں قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ سورۂ توبہ میں أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ سورۂ ابراہیم میں، سورۂ تغابن میں، سورۂ یونس میں، سورۂ مائدہ میں، سورۂ اعراف میں، سورۂ شعراء میں اور مزید کچھ سورتوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کو اہلِ عرب باب افعال میں لاکر (انباء) خبر دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اسی سے لفظ "نبوت" ماخوذ ہے۔ گویا جس بندے کو اللہ تعالیٰ بطورِ خاص خبریں دے وہ "نبی" ہے۔

پھر یہ بھی قطعی طور پر طے ہے کہ نبی کو خبریں بذریعہ وحی عطا ہوتی ہیں اور وحی کے معنی نبوت کے باب میں یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا فرشتہ بھیجے۔ خبر دینے کے اور جو متعدد طریقے اللہ نے رکھے ہیں ان سے نبوت ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً قرآن میں فرمایا گیا:۔

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ۔

"اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف کہ بنالے پہاڑوں اور درختوں اور ٹٹیوں میں گھر۔"

اب ظاہر ہے کہ شہد کی مکھی کو اپنا چھتہ بنانے کا جو شعور اللہ نے عطا فرمایا ہے اسی کو یہاں "وحی" سے تعبیر کیا گیا۔ ایسے طبعی شعور سے نبوت ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح سورۂ انعام میں جو فرمایا گیا:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (آیت ۱۱۲)

اور اسی طرح ہر نبی کیلئے ہم نے شریر دغاباز انسانوں اور جنوں کو دشمن کردیا جو ایک دوسرے کو ملمع کردہ باتیں دھوکا دینے کے لئے سکھلاتے ہیں۔

تو یہاں فتنہ پردازوں کی سازش آمیز اور خبیثانہ سرگوشیوں اور خبروں کو بھی لفظ "وحی" سے تعبیر کیا گیا۔ یہ "وحی" بھی یقیناً "وحیِ نبوت" سے جدا شے ہے۔

کشف والہام یا خواب یا تخیلات یا منطقی استدلال یا سائنسی تجربات کے ذریعے جو اطلاعات حاصل ہوتی ہیں وہ بھی وحیِ نبوت سے تعلق نہیں رکھتیں کیونکہ ان سب میں غلطی اور مغالطے اور شکوک و شبہات کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا کوئی انسان نبی جس وحی کے ذریعے بنتا ہے وہ صرف یہ مفہوم رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مذکورہ تمام طریقوں سے جدا ایک ایسا طریقہ استعمال فرمائے جو امکانِ خطا اور ریب و شک سے بالاتر ہو۔ یہ طریقہ سب جانتے ہیں کہ فرشتوں کے ذریعہ اطلاع دینا ہے جسے اللہ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے بالالتزام استعمال فرمایا ہے اور کبھی کبھی وہ فرشتے کے توسط کے بغیر بھی بندے سے کلام فرماتے ہیں، جیساکہ حضرت موسیٰؑ کا واقعہ سب کے علم میں ہے۔ لیکن اس خاص طریقِ خطاب کے باوجود نبی پر فرشتہ بھی ضرور نازل کیا جاتا ہے جیساکہ حضرت موسیٰؑ پر کیا گیا۔ یہ دونوں طریقے ایسے ہیں کہ غلطی اور شبہ کی مطلق گنجائش ان میں نہیں اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ آدمی کی ریاضت و عبادت اور کسب و محنت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ جو بندے نبی بنائے جاتے رہے ہیں وہ نبوت سے قبل بے شک نکوکار اور خوش کردار ہوا کرتے تھے لیکن نبوت اس نکوکاری کے نتیجے میں نہیں ملتی تھی۔ یہ بات ہوتی تو ہر نکوکار نبی بن جاتا مگر یہ معلوم ہے کہ بے شمار عابد و زاہد بندے نبی نہیں بنے۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھئے جیسے سفارت کا عہدہ ہے۔ سفیر کوئی بھی حکومت یقیناً ایسے ہی کسی شخص کو بنائے گی جس میں اس کے نزدیک سفارت کی اہلیت اور اوصاف خوب پائے جا رہے ہوں۔ لیکن ہر وہ شخص جس میں اہلیت اور اوصاف پائے جا رہے ہوں آپ سے آپ سفیر تو نہیں بن جاتا۔ سفیر بھی شخص مانا جائے گا جسے اقتدارِ وقت باقاعدہ یہ منصب سونپ دے۔ نبوت کا معاملہ ٹھیک ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی کسی ایسے بندے کو نہیں بناتا جو بدکار ہو۔ بدنام ہو حسنِ کردار سے محروم ہو۔ یہ منصبِ جلیل نیک نہاد اور نکوکاروں ہی کو تفویض ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ

ہر شخص نیک نہاد اور نکوکار بن کر نبوت کا تاج پہن سکتا ہے جہالت و حماقت ہے اور امت کے اہل الرائے نے کبھی اس واہی خیال کو پاس نہیں پھٹکنے دیا ہے۔ بہت موٹی سی بات ہے کہ صحابۂ کرامؓ تو بعد کے تمام زاہدوں عابدوں اور متقیوں سے بہتر تھے۔ ان جیسی مرتبت والا بعد میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ امت ان کی افضلیت پر متفق ہے۔ اگر نبوت ریاضت و مجاہدات اور صالحیت و پرہیزگاری کا ہی کوئی ارتقائی درجہ اور پھل ہوتا تو سب سے پہلے صحابہؓ کو انبیاء کا مقام حاصل ہوتا۔ خصوصاً وہ ممتاز صحابہؓ تو ضرور ہی نبی بن جاتے جنھیں عشرۂ مبشرہ یا جنھیں خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے دیکھ لیا حضرت عمرؓ کے بارے میں تو خود رسول اللہؐ نے خبر دی کہ ان کے اندر نبوت کی اہلیت اور صلاحیت موجود ہے لیکن عمرؓ بھی نبی نہ بن سکے تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ یہ منصب محنت مشقت سے نہیں ملا کرتا۔ یہ کسی نیک عمل کا طبعی حاصل اور کسی درجۂ صالحیت کا فطری ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے انتخاب اور فیصلے پر اس کا مدار ہے۔ بندہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کر کے ولی بن سکتا ہے۔ صدیق بن سکتا ہے۔ راہ خدا میں جان دے کر درجۂ شہادت حاصل کر سکتا ہے مگر نبوت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ وہ رائے اور عقیدہ جس پر تمام صحابہؓ اور تابعین اور مجتہدین اور مفسرین اور محدثین کا اتفاق چلا آ رہا ہے لیکن قادیانی صاحب کی گل افشانی آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ کس بھول پن سے وہ صالحیت کو مقام نبوت تک پہنچا رہے ہیں۔ وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ شہادت اور صالحیت کی طرح نبوت بھی کسبی شے ہے۔

اہلِ علم اندازہ فرمائیں کہ قادیانیت اگر سرے سے ہی باطل نہ ہوتی تو قادیانی مناظروں کو یہ مصیبت کیوں پیش آتی کہ امتِ مسلمہ کے بے شمار اجماعی اور اتفاقی نظریات کو جھٹلائیں اور خانہ ساز نظریات پر علم کلام کی عمارت اٹھائیں۔ آدمی خیر کو بھی شر اور شر کو بھی خیر ثابت کرنے پر تل جائے تو ظاہر ہے ایسے سیکڑوں ہزار بیانات بکنے ہوں گے اور سیکڑوں ...

کو پامال کرنا پڑے گا۔

اب آگے چلیئے۔ قادیانی صاحب اس آیت سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی امت میں بھی نبیوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ آیت سے یہ پتا چلتا ہے کہ آخرت میں نبیوں کو نبیوں کے ساتھ اور صدیقوں کو صدیقوں کے ساتھ اور شہیدوں کو شہیدوں کے ساتھ اور صالحوں کو صالحوں کے ساتھ رکھا جائے گا۔ اگر قرآن میں اللہ اور رسولؐ کی پیروی کرنے والوں کو انبیاء کے ساتھ رکھے جانے کی بشارت دی جا رہی ہے تو ضروری ہے کہ یہ پیروی کرنے والے بھی نبی ہوں۔ یہ ہے قادیانی علم کلام۔ اہلِ فہم اندازہ فرمائیں کہ کیسا مذاق آیاتِ الٰہیہ سے کیا جا رہا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم قادیانی استدلال کو بگاڑ کر پیش کر رہے ہیں قادیانی صاحب کی اپنی تحریر بھی دیکھ لیجئے۔ لکھتے ہیں:-

"اگر آیت کے یہ معنی کئے جائیں کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والے صرف ظاہری طور پر نبیوں کے ساتھ ہوں گے نبی نہیں ہوں گے تو یہی تشریح دوسرے تین مدارج کے بارے میں بھی کرنا پڑے گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو صرف بظاہر صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ خود صدیق، شہید اور صالح نہیں ہوں گے۔ یہ تشریح صحیح نہیں کیونکہ یہ معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بزرگ کے صریح منافی ہیں کہ ان کی پیروی سے کوئی شخص صدیق، شہید اور صالح بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ظاہری طور پر ان کے ساتھ ہوگا۔ حالانکہ امت محمدیہ کی اطاعت کرنے والوں کا اس دنیا میں زمانی اور مکانی طور پر پہلے انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہونا امر محال ہے۔ اور آیت فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم جملہ خبریہ ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی اس دنیا میں ان کے ساتھ ہونا بھی ثابت کرتا ہے جیسا کہ اس دنیا میں

ساتھ ہونے میں مرتب پاتا ہی مراد ہو سکتا ہے۔"
یہ ہے قادیانی دماغ کی شعنی آفرینی۔ یہ ہے وہ تفسیر قرآنی
کا اسلوب جسے یہ حضرات سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔
کوفت ہوتی ہے ایسی واہی گل افشانیوں کا تجزیہ کرتے
ہوئے لیکن کیا کریں۔ سادہ لوح بھائیوں کے فریب کھا جانے
کا ڈر ہے اس لئے کوفت بھی گوارا۔
آپ احادیث صحیحہ ثابتہ اور عقل و قیاس کی روشنی
میں دیکھ لیجئے کہ آیت کا مطلب کیا ہے۔ آخرت میں انبیاء
انبیاء کے ساتھ، صدیقین صدیقین کے ساتھ، شہداء
شہداء کے ساتھ اور صلحاء صلحاء کے ساتھ ہوں یہ تو ایک
ایسی بات ہے جو ہر آدمی خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ کسی بھی صحابی
کو اس میں شک نہیں تھا۔ لہذا یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ
آیت وہ بات بتانے کے لئے اتری جو پہلے سے معلوم و مسلم
تھی۔ آیت تو تمام امت محمدیہ کو یہ بتانے کے لئے اتاری
گئی کہ تم اگر جنت میں اونچے درجات والوں کی رفاقت و
صحبت چاہتے ہو تو مایوس مت ہو۔ یہ ضرور ملے گی اگر
تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ یہ مت سمجھو کہ ہم نبی
نہیں تو انبیاء کی دید اور رفاقت ہمیں جنت میں کیسے میسر آ
سکتی ہے۔ تم میں سے جو بھی کسی بھی زمانے میں اللہ اور رسول
کی اطاعت میں زندگی گذارے گا اس کے لئے جنت میں
اللہ یہ موقع فراہم کر دے گا کہ انبیاء و صدیقین اور شہداء و
صالحین کی معیت و رفاقت اسے حاصل رہے جس طرح کہ
دنیا میں مختلف مکانوں میں رہنے والے افراد ایک دوسرے
سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور ان میں رفاقت و موانست کا
تعلق ہوتا ہے۔
لیکن قادیانی صاحب آیت کے منہ میں اپنا یہ مفہوم ڈال
رہے ہیں کہ جب حضورؐ کی امت کے افراد کو یہ بشارت دی
گئی کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے نتیجے میں تمھیں انبیاء
اور صدیقین وغیرہ کی معیت نصیب ہوگی تو لازماً وہ افراد
امت نبی ہونے چاہئیں جنھیں انبیاء کی معیت نصیب ہو۔
اگر انھیں نبی نہ سمجھا جائے تو پھر لازم آئے گا کہ صدیقین
کو صدیق اور شہیدوں کو شہید اور صالحین کو صالحین نہ سمجھا
جائے۔
منطق ہر لحاظ سے واہی ہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ آیت
میں مذکور چاروں درجات میں صرف درجۂ نبوت وہ درجہ
ہے جسے کوئی بھی انسان ریاضت و عبادت کے ذریعہ حاصل
نہیں کر سکتا اور باقی تینوں درجے کوشش کے ذریعہ حاصل
کئے جا سکتے ہیں تو منطق ہی کا تقاضا ہے کہ دونوں قسموں کا حکم
الگ الگ ہو۔ انبیاء کی معیت حاصل کرنے والے امتی نبی
تو یقیناً نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ عہدہ انھیں نہیں ملا مگر صدیق
اور شہید اور صالح ضرور ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ عہدوں کے نام
نہیں ہیں بلکہ ان مقامات معنوی کے نام ہیں جنھیں کوشش
سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور امت کے بے شمار افراد نے
حاصل کیا ہے۔
نقل و روایت یعنی احادیث مبارکہ آپ نے دیکھ ہی لیں
ان کی روشنی میں بھی اس منطق کی لغویت ظاہر ہے۔ بشارت دی
ہی جا رہی ہے غیر نبی اہل امت کو تاکہ انھیں خدا اور رسولؐ کی
اطاعت کا شوق ہو مگر قادیانی صاحب یہ باور کرانا چاہ رہے
ہیں کہ نبیوں کی معیت صرف انبیاء ہی کو نصیب ہو سکتی ہے۔
اس کا حاصل بھی سمجھ لیجئے۔ حاصل یہ ہوا کہ بہشت میں
انبیاء کی معیت فقط مرزا غلام احمد قادیانی کی جاگیر بنے گی
کیونکہ قادیانیوں کی دانست میں امت میں ایک وہی نبی بن سکے
ہیں۔ صحابہؓ اور تابعین اور اولیاء سب کے بارے میں معلوم ہے
کہ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے۔ حضرت عمرؓ تک نبی نہیں بن
سکے حالانکہ اللہ کے رسولؐ نے ان کے اندر استعداد نبوت کی
تصدیق فرمائی تھی پھر دوسرے صحابہؓ یا تابعین وغیرہ نبی
کیسے بن سکتے۔ لہذا قادیانی صاحب قرآن کے بطن میں اپنے
خیالات انڈیل کر اللہ تعالیٰ سے یہ کہلوا رہے ہیں کہ صحابہؓ اور
ائمہ اور شیوخ و اولیاء کسی کو بھی جنت میں رسول اللہؐ کی معیت
نصیب نہ ہو سکے گی کیونکہ وہ نبی نہیں ہیں البتہ مرزا غلام احمد
قادیانی کو یہ نعمت عطا کی جائے گی کیونکہ [illegible] سے ترقی
کر کے نبی بن گئے تھے!

اہلِ نظر انصاف کریں کیا اس کے سوا بھی قادیانی منطق کا کچھ حاصل ہوگا۔ اور اہلِ نظر خدا کے لئے مولانا دریابادی اور عثمان فارقلیط سے بھی دریافت کریں کہ اے بزرگو! کیا اسی طرزِ فکر اور اندازِ نظر کے حامل گروہ کے بارے میں آپ کو یہ حسنِ ظن ہے کہ یہ بچارے خادمانِ اسلام ہیں، نمازی ہیں، دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ کاش اِن حضرات کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ قادیانی مبلغین اسلام کی خدمت نہیں کرتے اس کی جڑیں کھود دیتے ہیں۔ اور دامِ ہمرنگ زمین بچھا کر سادہ لوح مسلمانوں کی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

کچھ دوسرے کرتب

کرم فرمانے آگے تحریر فرمایا:۔

"ہمارے انھی معنوں کی تائید امام راغب علیہ الرحمۃ کی تفسیر سے بھی ہوتی ہے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات سوچیئے۔ امت میں سیکڑوں مفسر گذرے ہیں۔ متقدمین کی بچاسوں تفسیریں موجود ہیں۔ صحابہؓ اور تابعین تک سے منقول تفسیریں ناپید نہیں ہیں مگر ان سب میں خاتم النبیّین کی جو تفسیر بیان ہوئی ہے اس سے تو موصوف کو کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کا مطلق اعتبار نہیں۔ ہاں ایک ایسے بزرگ کو فوراً "علیہ الرحمۃ" کے الفاظ سے تعظیم دی گئی جو صرف عالمِ لغت ہیں امامِ تفسیر نہیں۔ ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ کسی زبان کے لغات کا محقق ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہ محقق اس زبان کے ہر شاہکار کی تفسیر دوسروں سے بہتر کر سکے گا۔ مگر ایک مفاد پرست اور ہٹ دھرم آدمی یہی اس تلاش میں رہا کرتا ہے کہ جہاں کہیں بھی اپنے کام کی کوئی بات ملے اٹھا لاؤ اور پروا مت کرو کہ یہ بات کتنے مستند علماء کے نزدیک فاسد و باطل ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں امام راغب اصفہانی کی اپنی کوئی تفسیر نہیں۔ ان کی "مفردات" کا تعلق لغاتِ قرآنیہ سے ہے

ہمارا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں کہ امام راغب قابلِ تعظیم نہیں یا انھیں علیہ الرحمہ لکھ کر کوئی غلطی کی گئی ہے۔ ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ قادیانی حضرات جہاں بھی کسی اہلِ سنت بزرگ اور عالم کو تعظیمی الفاظ میں یاد کرتے ہیں وہاں اس کی حیثیت تدلیس و تلبیس اور دانۂ و دام کی سی ہوتی ہے۔ واقعتہً وہ ان کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس کے متعدد ثبوت آگے آئیں گے۔

خیر بازی گری ملاحظہ فرمائیے۔ اوپر کا جملہ لکھ کر انھوں نے تفسیر بحر المحیط سے ایک عبارت نقل کی جس میں تفسیر بحر المحیط کے مصنف نے امام راغبؒ کا درج ذیل فقرہ ذکر کیا ہے:۔

"قال الراغب ممن انعم اللہ علیھم من الفرق الاربع فی المنزلۃ والثواب۔
النبی بالنبی والصدیق بالصدیق والشھید بالشھید والصالح بالصالح۔"

ترجمہ فرمایا:۔

"راغب نے کہا ہے یعنی ان چار گروہوں کے ساتھ درجہ اور ثواب میں شامل کر دے گا جن پر اس نے انعام کیا ہے اس طرح کہ جو تم سے نبی ہوگا اس کو نبی کے ساتھ ملا دے گا اور جو صدیق ہوگا اسے صدیق کے ساتھ ملا دے گا۔۔۔۔"

بے چارے عام آدمی کیا ادراک کر سکیں گے کہ مترجم صاحب نے فقط ایک لفظ "تم سے" بڑھا کر کیسی ہاتھ کی صفائی دکھلائی ہے۔ امام راغب کی مذکورہ تفسیری وضاحت علمی اعتبار سے وقیع ہے یا بوگس اس پر ہم ابھی روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلے اس نکتے کو سمجھ لیجئے کہ منقولہ عبارت کا ٹھیک ترجمہ یہ ہوگا۔

"نبی نبی کے ساتھ اور صدیق صدیق کے ساتھ اور شہید شہید کے ساتھ اور صالح صالح کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے۔"

اس ترجمے سے کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا کہ امت [illegible] میں بھی نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ لیکن قادیانی مترجم نے اپنے مطلب کے لئے "تم سے" کا اضافہ کیا حالانکہ یہ [illegible]

ترجمے میں اس وقت شامل ہوسکتا تھا جب النبی منکم
النبی کہا گیا ہوتا۔ منکم کے بغیر "تم سے" کس لفظ کا ترجمہ
ہو گیا۔ اس اضافے نے واقعی یہ معنی پیدا کر دیئے کہ امتِ
محمدیہ میں بھی نبی مبعوث ہوتے رہیں گے۔

یہ تو ترجمے کی خیانت ہوئی۔ اب دوسری کاریگری
دیکھئے۔ کوئی بھی کتابچے کا قاری یہی سمجھے گا کہ تفسیر بحر المحیط
کے مصنف نے امام راغب کی عبارت بطور تصویب و تائید
لکھی ہوگی۔ مگر اس بے چارے کو کیا خبر کہ بحر المحیط کے مصنف
ابو حیان اندلسی آیتِ زیرِ تذکرہ کی تفسیر میں پہلے تو بیسیوں
سطروں میں وہی اکثر روایات نقل کرتے ہیں جنھیں ہم نقل
کر آئے ہیں اور آیت کا وہی مطلب بیان کرتے ہیں جو ہم
کر آئے۔ اس کے بعد وہ بعض فلاسفہ کی ایک رائے کو حکایۃً
نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد امام راغب کی مذکورہ
عبارت کو اس مقصد سے شاملِ مضمون کرتے ہیں کہ اس کی
تردید وار تغلیط کریں۔ چنانچہ ان کے الفاظ امام راغب
کی رائے کے بارے میں یہ ہیں :۔

فاسداً من جهة المعنى ومن جهة النحو

یعنی یہ رائے معنی کے اعتبار سے بھی فاسد ہے اور نحو کے اعتبار سے بھی

اس کے بعد وہ معنوی خرابی کی وضاحت کرتے
ہوئے کہتے ہیں :۔

" فيلزم ان يكون في زمان الرسول او بعده
انبياء يطيعونه وهذا غير ممكن لانه
قد اخبر تعالى ان محمداً هو خاتم
النبيين وقال رسول الله لا نبي بعدي"

"یعنی اس رائے سے لازم آتا ہے کہ رسول اللہ کے
زمانے میں یا ان کے بعد ایسے انبیاء مبعوث ہوں
جو ان کی اطاعت کریں اور یہ غیر ممکن ہے کیوں کہ
اللہ تعالیٰ خبر دے چکا ہے کہ محمد رسول اللہ پر سلسلۂ
نبوت ختم ہو چکا اور خود رسول اللہ نے فرما دیا ہے
کہ میرے بعد کوئی نبی مبعوث ہونے والا نہیں "

یہاں یہ بات بھی صاف ہے کہ غیر تشریعی اور امتی نبی کی
بعثت کو بھی ناممکن کہا جا رہا ہے کیونکہ جو انبیاء حضورؐ کی اطاعت
کریں وہ امتی ہی کہلائیں گے اور ان کی کوئی الگ شریعت
نہیں ہوگی۔ ان کی بھی بعثت ابو حیان کے نزدیک آیت اور
حدیث کی رو سے غیر ممکن ہے۔

اس کے بعد ابو حیان دلیل اور مثال سے سمجھاتے ہیں کہ
راغب سے غلطی ہوئی۔ ان کا نکالا ہوا مطلب آیت کی نحوی
ترکیب سے بھی سراسر خلاف ہے۔

اہلِ انصاف! آپ ہی کہئیے۔ اس رویّے کو سوائے
بازیگری اور نظر بندی کے آخر کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ جس
مفسر کی تفسیر سے ایک عبارت نقل کر رہے ہیں اس کی اپنی
مدلل و مفصل تفسیر و توضیح کو یکسر چھپا گئے اور یہ بھی چھپا گئے
کہ امام راغب کا قول صاحبِ تفسیر نے تغلیط و تردید کیلئے
ذکر کیا ہے اور پھر دلائل قویہ سے تغلیط کر بھی دکھائی ہے۔

ویسے تحقیق کی جائے تو خود امام راغب بھی بالیقین اسی
کے قائل ہیں کہ حضور پہ باب نبوت بند ہو چکا چنانچہ اپنی
"مفردات" میں وہ صفحہ ۱۴۲ پر لکھتے ہیں :۔

" وخاتم النبيين لانه ختم النبوة اے
تممها بمجيئه۔

(اور حضور خاتم النبیین اس لئے ہیں کہ انھوں نے نبوت کو
ختم کر دیا یعنی نبوت ان کی تشریف آوری سے تمام
ہو گئی)۔

یہ ان کی اپنی معروف ترین تصنیف کی عبارت ہے جس سے
صاف پتا چلتا ہے کہ وہ بھی تمام امت کی طرح حضورؐ پر ہر طرح
کی نبوت کا دروازہ بند سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کہیں
کوئی فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اسکے خلاف
عقیدہ نکالا جا سکے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی تحریر کا نقص سمجھا
جائے گا۔ یہ تصور کیا جائے گا کہ از راہِ بشریت وہ اپنا مافی الضمیر
ادا کرنے میں الفاظ کا صحیح انتخاب نہ کر سکے۔ چنانچہ آپ
دیکھ ہی رہے ہیں کہ جس مفسر نے ان کی عبارت نقل کی فساد ہی
ظاہر کرنے کے لئے نقل کی نہ کہ تحسین و تائید کے لئے۔ اس کے
باوجود اگر کوئی یہ رٹ لگائے جائے کہ امام راغب سے انشاء کی

غلطی کا صدور ہم نہیں مانیں گے اور امام راغب تو یہی رائے رکھتے تھے کہ حضورؐ کے بعد انبیاء مبعوث ہوتے رہیں گے تو ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہ ہوگا کہ وہ بھی خارج از اسلام تھے لیکن انھیں خارج از اسلام ہم نے نہیں کیا بلکہ ان قادیانیوں نے کیا ہے جو ان کو ایک عقیدۂ کفر کا حامل بتا رہے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اوپر کی بحث کا خلاصہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔

(۱) قادیانی صاحب نے صحابہؓ سے لیکر آج تک کے تمام مفسرین کو نظر انداز کر کے اُن امام راغب کے ایک قول کو حرفِ آخر بنانا چاہا جو نہ صرف یہ کہ مفسر بھی نہیں ہیں فقط امام لغت ہیں۔

(۲) جس تفسیر بحر المحیط سے امام راغب کا قول نقل کیا اُس تفسیر کو بھی پس پشت ڈال دیا۔

(۳) یہ بھی چھپا گئے کہ بحر المحیط کے مصنف نے امام راغب کا قول تائید و حمایت کے لئے نہیں بلکہ سخت تردید اور تغلیط کے لئے بیان کیا ہے۔

(۴) امام راغب کی منقولہ عبارت کے ترجمے میں ایک لفظ "تم سے" بڑھا دیا جس سے ان کا ترجمہ مغالطہ انگیز بن گیا۔

(۵) اس کی بھی پروا نہیں کی کہ امام راغب اپنی تصنیف "مفردات" میں صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ قرآن میں وارد شدہ لفظ خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی تشریف آوری نے سلسلۂ نبوت کو تمام کر دیا۔ اب کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

دوسری آیت

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (اعراف)

"یعنی اے بنی آدم! جب کبھی آئندہ تم میں سے تمہارے پاس رسول آئیں گے جو تم پر میری آیات بیان کریں تو جو لوگ تقویٰ اختیار کر کے اپنی اصلاح کر لیں گے ان پر کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔"

یہ آیت اور ترجمہ پیش کر کے فرمایا گیا ہے:۔

"اس آیت کے سیاق میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کو قُل کہہ کر کئی ہدایات دلائی ہیں اور اسی سلسلہ میں تمام نوعِ انسانی کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آئندہ جب بھی تم میں سے رسول تمہارے پاس آئیں تو تقویٰ اختیار کر کے اصلاح کرنے والے ہی کامیاب ہوں گے۔"

قادیانی صاحب کا یہ بس تو نہیں چلا کہ آیت کے شروع میں قُل کا اضافہ کر کے نقل کرتے کیونکہ ان کا یہ اضافہ فوراً پکڑا جاتا۔ مگر آیت اور ترجمہ نقل کرنے کے بعد یہ دھوکا دینا چاہ رہے ہیں کہ حقیقۃً اس آیت میں بھی اس شروع میں قُل ہے۔ یعنی اللہ فرما رہا ہے کہ اے محمدؐ ہمارے رسول! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تمھارے پاس ہمارے رسول آئیں گے ان پر ایمان لانا۔

اب اہلِ ایمان قرآن اٹھا کر سورۂ اعراف کھولیں)۔ آیت ۲۸ سے اللہ تعالیٰ قُل کہہ کر کچھ ہدایات کا آغاز کر رہا ہے۔ یہ ہدایات وہ ہیں جو رسول اللہ کو لوگوں کے آگے پیش کر دینی ہیں۔ لیکن یہ ہدایات آیت ۳۳ پر ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ۳۴ ویں آیت یہ آتی ہے:۔

"اور ہر امت (فرقہ۔ گروہ) کے لئے موت ہے پھر جب ان کا وقتِ اجل آ جاتا ہے تو یہ ایک پل آگے پیچھے نہ کر سکیں گے۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی تشریعی ہدایت نہیں ہے، نہ حکم ہے۔ نہ ترغیب و تلقین ہے۔ یہ تو عبرت دلانے کے لئے ایک مسلّم قانونِ تکوینی کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُن ہدایات کا سلسلہ اس مقام کی حد تک پورا ہو گیا جن کے بارے میں اللہ نے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے قُل کہا تھا۔ اب آگے جو آیات آئیں گی وہ اس قُل کے تحت نہ ہوں گی۔ چنانچہ منقولہ بالا آیت

یَا بَنِیْ آدَمَ کے آغاز میں قُل نہیں ہے۔ اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کے بارے میں اللہ یہ نہیں فرما رہا کہ اے رسول! لوگوں کو اس مضمون سے باخبر کردو۔ اسکے بجائے اس میں حکایت ہے اُس خطاب کی جو اللہ نے آغازِ عالم میں بنی نوعِ انسانی سے فرمایا تھا ——— چنانچہ سورۂ بقرہ کی ۳۷ ویں آیت میں یہی بات اس وقعہ پر مذکور ہے جب اللہ نے آدم و حوّا کو حکم دیا تھا کہ جاؤ یہاں سے۔ قرآن کا کون طالب علم نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ متعدد قصوں کے اجزا کئی کئی جگہ دہراتا ہے۔ قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں جو آج کل کی مرتب کتابوں کی طرح فہرست مضامین رکھتی ہو اور یہ مضمون خاص عنوان کے تحت خاص صفحات میں بیان کیا گیا ہو۔

پھر اہل فہم یہ بھی سوچیں سیکڑوں قدیم و جدید مفسر موجود ہیں۔ کیا ان میں سے ایک بھی مستند مفسر ایسا ہے جس نے وہ تفسیر کی ہو جو قادیانی صاحب کر رہے ہیں۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو دو باتوں میں سے ایک ماننی ہوگی۔ یا تو یہ کہ قرآن کو پہلی بار صرف قادیانیوں نے سمجھا اور کسی نے ان سے پہلے نہیں سمجھا یا یہ کہ قادیانی اپنے خیالات قرآن میں ڈال رہے ہیں۔ ہمارے بھائی اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن کے طرزِ خطاب کی بہت قسمیں ہیں۔ مثلاً دیکھئے۔ سورہ احزاب میں فرمایا گیا:۔

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ۔

اے نبی اللہ سے ڈرا اور کافروں کی فرمانبرداری مت کر۔

ملاحظہ کیجئے۔ کیا رسول اللہؐ نعوذ باللہ اللہ سے نہیں ڈرتے تھے اور کافروں کی اطاعت فرماتے تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ نہیں اس کے باوجود اللہ ان سے ایسا کہہ رہا ہے تو معلوم ہوا کہ خطاب فی الحقیقت ان سے نہیں امت سے ہے۔ امت کا ہر ہر فرد غیر معصوم ہے۔ گناہ کر سکتا ہے غلط سوچ سکتا ہے۔ گمراہ ہو سکتا ہے لہذا صرف حضورؐ ہی اس خطاب سے خارج ہیں باقی ہر فردِ امت داخل ہے۔

یا مثلاً سورۂ یونس میں حضور سے خطاب کیا گیا:۔

فَاِنْ کُنْتَ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ فَسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْکِتٰبَ (پس اگر تجھے اُس کلام میں شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کیا تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو کتاب پڑھتے ہیں۔)

کیا خود حضورؐ کو اس قرآن میں شک ہو سکتا تھا جو انھیں جبریل لا لا کر دے رہے ہیں؟ کھلی بات ہے کہ ظاہراً خطاب حضورؐ سے ہوتے ہوئے بھی مخاطب افرادِ امت ہیں۔

یا مثلاً سورۂ ہود میں فرمایا گیا:۔

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ (پس اگر اے رسولؐ وہ تمھاری بات نہ مانیں تو جان لو کہ وہ خدا کے حکم سے نازل ہوا ہے)

دیکھ لیجئے ایک ہی فقرہ ہے لیکن پہلے ٹکڑے میں خطاب رسول سے ہے اور دوسرے ٹکڑے میں فَاعْلَمُوْا کہہ کر مخاطب کفار کو بنا لیا گیا ہے۔

یا مثلاً سورۂ مومنون میں فرمایا گیا:۔

یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ

اے رسولو! کھاؤ تم سب پاکیزہ چیزیں۔

یعنی پہلے لفظ سے رسولوں کو مخاطب کیا گیا لیکن خطاب فی الاصل سارے انسانوں سے تھا غیر پاکیزہ چیزوں سے بچنے کی ہدایت کو سبھی کیلئے ہے اسی طرح یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ۔

بے شمار مثالوں میں سے ہم نے صرف چند مثالیں قرآن سے ایسی پیش کی ہیں کہ قرآن کا طرزِ خطاب طرح طرح سے ہے اور وہ شخص جاہل ہے جو اس رنگا رنگی کو نہیں سمجھتا۔ قادیانی صاحب یہ استدلال فرما رہے ہیں کہ چونکہ ماقبل کی کچھ آیتوں میں اللہ نے لفظ قل کہہ کر حضورؐ کو خطاب کیا ہے لہذا اس بعد کی آیت کو بھی حضورؐ ہی سے مخاطبت پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن آپ نے اوپر کی امثلہ میں دیکھا متعدد آیتیں تو بڑی چیز ہیں ایک ہی آیت میں بلکہ ایک ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ مختلف مخاطب بنا لیتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطاب ظاہراً کسی سے ہے لیکن مخاطب حقیقتاً کوئی اور ہے۔ قادیانی صاحب کا سارا قصرِ استدلال اسی

مفروضے پر کھڑا تھا کہ یہ رسولوں کو بھیجنے کی بات اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہی ہے۔ جب یہ بنیاد ہوائی ثابت ہوئی تو قصر آپ سے آپ ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

جھوٹ اور جہل و مکر

آگے لکھتے ہیں:۔

"امام جلال الدین سیوطی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

بنی آدم کے الفاظ سے یہ خطاب اس زمانہ اور بعد کے لوگوں سے ہے (تفسیر اتقان۔ جلد ۲ صفحہ ۳۶)"

جہل یہ ہے کہ "اتقان" کوئی تفسیر نہیں بلکہ قرآنی علوم و فنون کی کتاب ہے۔ اس کا پورا نام ہے الاتقان فی علوم القرآن۔ اسے "تفسیر" کہنا اصطلاحات سے ناواقفیت کا بھونڈا مظاہرہ ہے۔

جھوٹ یہ ہے کہ سیوطی کے قول کو کسی خاص آیت کی تفسیر قرار دیدیا گیا حالانکہ وہ تفسیر نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اصولِ تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ تفسیرِ آیات ان کا موضوع سے ہی نہیں۔

مکر یہ ہے کہ جو کچھ سیوطی نے یہاں لکھا اس کا محض ایک ٹکڑا قادیانی صاحب نے نقل کر دیا پوری بات نہیں نقل کی ورنہ فریب نہ چلتا۔ صورت یہ ہے کہ قرآن میں اللہ نے خطاب کے جو گوناگوں طریقے استعمال فرمائے ہیں ان کی وضاحت کے لئے سیوطی نے عنوان قائم کیا:۔

النوع الحادی والخمسون فی جمیع مخاطبات

اس کے بعد قسم الرابع والثلاثون کا عنوان دے کر فرماتے ہیں:۔

خطاب المعدوم ویصح ذٰلک تبعًا لموجود نحو یا بنی آدم فانہ خطاب لاھل ذٰلک الزمان ولکل من بعدھم (خطاب کی ۳۴ ویں قسم یہ ہے کہ موجود کے ضمن میں کسی غیر موجود کو خطاب کیا گیا ہو۔ جیسے یا بنی آدم کہہ کر ان لوگوں کو بھی مخاطب بنایا جائے جو زمانۂ خطاب میں موجود ہیں اور ان کے بعد کے لوگوں کو بھی"

یہ ہے سیوطی کا پورا کلام۔ وہ یہ بتا رہے ہیں کہ اگرچہ خطاب عموماً اسی سے ہوا کرتا ہے جو موجود ہو لیکن خطاب کا ایک یہ طریقہ بھی ہے کہ کسی موجود سے خطاب کرتے کرتے معدوم لوگوں سے خطاب ہو جائے۔ جیسے "اے آدم کی اولاد" کہہ کر اللہ تعالیٰ زمانۂ خطاب کے لوگوں کو بھی اور مستقبل کے افراد کو بھی مخاطب بنا لیتا ہے۔

گویا سیوطی نے کسی خاص آیت کی تفسیر نہیں کی بلکہ ایک قاعدہ بیان کیا اور اس کی مثال میں "یا بنی آدم" کے الفاظ پیش کئے جو کسی ایک آیت میں نہیں بلکہ سورۂ اعراف کی چار آیتوں میں اور سورۂ یٰسٓ میں بھی آئے ہیں۔ سورۂ یٰسٓ کو دیکھئے اس میں فرمایا گیا ہے:۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ (آیت ۶۰) "کیا اے اولادِ آدم میں نے تم سے نہ کہہ رکھا تھا کہ شیطان کے پجاری مت بننا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا۔"

آیت حضور ﷺ ہی کے زمانے میں نازل ہو رہی ہے اور حضور ﷺ سے قبل کی سیکڑوں امتیں اور قومیں ناپید ہو چکی ہیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس خطاب میں داخل نہیں ہے۔ قرآن ہی بتا رہا ہے کہ اللہ نے حضرت آدم ؑ ہی کے زمانے میں ہدایت کر دی تھی کہ شیطان کا کہا مت ماننا میرے ہی احکام پر چلنا ورنہ بڑی سخت سزا ملے گی۔ اسی ہدایت کی یاد دہانی کے لئے بے شمار پیغمبر نازل کئے جاتے رہے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود نہیں تھے۔

اسی طرح اس آیت میں غور فرمایئے جو قادیانی صاحب پیش کر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں حضور ﷺ کے زمانے والوں اور ان کے بعد والوں سے خطاب ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا پچھلے زمانے والوں کو اللہ نے یہی ہدایت نہیں دی تھی ۔۔۔۔ اگر دی تھی تو وہ اس خطاب میں کیسے

ـنامل ہو سکتے ہیں جب کہ دنیا میں اب انھیں آنا نہیں۔ واضح
ـت ہے کہ یہ آیت آغازِ انسانی ہی کے دور کی حکایت ہے۔
ـس وقت یا بنی آدم کہکر جو ہدایت فرمادی گئی وہ اس
ـانے کے لئے بھی تھی اور آنے والے زمانے کیلئے بھی۔ تمام
ـلی امتیں اس کا مخاطب بن گئیں یہاں تک کہ آخری
پیغمبر آگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔
کہہ دیا گیا کہ اس پیغمبر پر انبیار کی بعثت ختم ہے۔ اب
قیامت تک کوئی نیا دین، نیا نبی نہیں آئے گا۔

اور ایک بات دیکھئے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ
ـت میرے رسول تمھیں میری آیات سنائیں گے۔"

ہر شخص جانتا ہے کہ "آیت" وہ کلام کہلاتا ہے جو حرفاً
حرفاً اللہ تعالیٰ کا ہو۔ رسولؐ تک کے کلام کو "آیت" نہیں
کہہ سکتے۔ آیات اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر پر اس لئے نازل کرتا
ہے کہ ان کے ذریعہ بندوں کو وہ ہدایات پہنچائے جن سے
وہ بے خبر ہیں۔ پچھلے انبیار پر اس نے آیات نازل کیں مگر
یہ آیات وقتی تھیں لہٰذا ان کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا
گیا۔ جب ایک ہی نبی کی بعثت پر مدت گذر جاتی اور اس پر
نازل شدہ آیات بدل سدل جاتیں یا گم ہو جاتیں یا انہیں
اللہ کو حذف و اضافہ مقصود ہوتا تو مزید پیغمبر مبعوث فرما
دیتے۔ نیز یہ پیغمبر مقامی تھے آفاقی نہیں تھے۔ جس جس
علاقے میں پیغمبر مبعوث کئے گئے وہاں وہاں کی زبان میں آیات
آتی رہیں۔ ان آیات ہی کے مضامین کا نام شریعت تھا۔
آخر کار بندوں کی تربیت کا دور تمام ہوا اور ایک آخری نبی
جامع مانع شریعت کے ساتھ بھیجا گیا۔ یہ مقامی نہیں تھا
آفاقی تھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ آج سے دین مکمل ہو گیا۔ قیامت
تک اسی پر چلنا ہے۔ اس دین کی کتاب ضائع بھی نہیں ہو
سکتی۔ اس کی حفاظت ہم اپنے ذمہ لیتے ہیں۔

اس طرح اس وحی متلو کا سلسلہ بند کر دیا گیا جسے اصطلاح
میں "آیات" کا نام دیا جاتا ہے۔ کوئی سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا کہ آیات قرآنیہ میں جن کا دوسرا نام آیات الٰہیہ
ہے اضافہ ہو۔ لہٰذا قادیانی صاحب سے کوئی پوچھے کہ اگر انکی

پیش کردہ آیت میں حضورؐ کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں
کی خبر ہے تو یہ بھی خبر ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی آیات لوگوں کو
سنائیں گے۔ اب اگر ان آیات سے مراد یہی قرآنی آیات لیتے
ہیں تو پھر مرزا غلام احمد ہی کی کیا خصوصیت ہوئی۔ یہ آیات
تو لاکھوں حفاظ، ہزاروں علماء اور واعظین اور مصنفین و
مقررین خلق خدا کو سناتے آرہے ہیں اور سناتے جائیں گے۔
اس کام کے لئے کسی نبی کی ضرورت کیا ہوئی۔ اور اگر آیات
سے خدا کا کوئی نیا کلام مقصود ہے تو صاف کہئیے کہ مرزا غلام
احمد نے کونسا نیا کلام الٰہی مخلوق کو سنایا ہے۔

غرض آیت کا منشار اگر بقول قادیانی یہ سمجھ لیا جائے
کہ امتِ محمدیؐ میں انبیار مبعوث ہوا کریں گے تو اس کا
لازمی مطلب جہاں یہ ہے کہ تیس پاروں والا قرآن مکمل نہیں
ہے برابر اس میں آیاتِ الٰہیہ کا اضافہ ہوتا رہے گا وہاں
لازماً یہ بھی مطلب ہے کہ اسلامی شریعت کسی بھی وقت مکمل
نہیں ہوگی کیونکہ نئی آیات تو اللہ تعالیٰ نئی ہدایات ہی کیلئے
نازل کیا کرتا ہے اور نئی ہدایات ہی کا مطلب ہے، موجودہ
شریعت میں حذف و اضافہ۔ گویا یہ دعویٰ بھی محض جھوٹ
اور مکر آمیز ثابت ہوا کہ قادیانی حضرات صرف غیر تشریعی نبوت
کے قائل ہیں۔ ایسے نئے انبیار کی بعثت کا عقیدہ رکھنا جو نئی
آیاتِ الٰہیہ سنائیں بلا ریب تشریعی نبوت کا عقیدہ رکھنا ہے
ورنہ آیات کا کوئی مصرف ہی نہیں رہتا۔

فریب کاری کی دلیلِ مبین

پیشِ نظر کتابچہ دراصل مولانا مودودی کے رسالہ
"ختم نبوۃ" پر تبصرہ ہے۔ یہ رسالہ فی الحقیقت وہی ضمیمہ ہے
جو مولانا نے تفہیم القرآن جلد چہارم میں سورۂ احزاب کے ساتھ
لگا دیا ہے اور آج ہر شخص اسے بہ آسانی دیکھ سکتا ہے قادیانی
صاحب اس پر تبصرہ فرما رہے ہیں تو ظاہر ہے پڑھ کر ہی فرما
رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اسی "رسالہ" میں مولانا مودودی نے
دیگر اکابر کی آرار کو نقل کرتے ہوئے امام سیوطی کا ارشاد
بھی ان کی مشہور تفسیر جلالین سے نقل کیا ہے جو یہ ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں اور عیسٰیؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت ہی کے مطابق عمل کریں گے (ص ۶۸)

قادیانی تبصرہ نگار کھلی آنکھوں سے سیوطی کا یہ صاف صاف بیان دیکھتے ہیں لیکن کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ بجائے دیانت کے بد دیانتی کرتے ہیں کہ سیوطی ہی کی ایک عبارت سے ان کے عقیدے اور رائے کے برعکس مطلب برآمد فرماتے ہیں اور یہ عبارت اگرچہ ان کی تفسیر میں نہیں ہے مگر دھوکا دینے کے لئے اتقان کو تفسیر بھی لکھ دیتے ہیں۔ کیا یہ دجل و فریب کے سوا بھی کچھ ہے۔

مزید چالبازی

اسی آیت کے تحت قادیانی صاحب نے لکھا:۔

"علامہ بیضاوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں اتیان الرسل امر جائز غیر واجب کہ رسولوں کا آنا جائز یعنی ممکن ہے واجب یعنی ضروری نہیں۔"

ہم کبھی کبھی تو یہ سمجھا کرتے تھے کہ قادیانی مبلغ کم علمی و کم فہمی کی بنا پر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہوں گے اور نادانستہ غلطی کر بیٹھتے ہوں گے لیکن تحقیق نے ثابت کیا کہ نادانستہ نہیں۔ جان بوجھ کر پوری عیاری کے ساتھ یہ دھوکا دہی کی جاتی ہے اور بزرگوں کی واضح ترین عبارات کو قصداً توڑ مروڑ کر اپنے مفید مطلب بنانا ان کا شعوری مشغلہ اور مذہبی پیشہ ہے۔

ذرا بیضاوی اٹھائیے۔ آیت میں (جو پیچھے نقل ہو چکی) اِمّا کا لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں "اگر"۔ ہم لوگ مثلاً جب کہتے ہیں کہ:۔

"اگر میں تمہارے یہاں آیا تو مجھے شربت پلانا"

تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ میرا آنا تمہارے یہاں ممکن اور متوقع ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ میں ضرور ہی آؤں گا گویا میرے آنے کی حد تک بات یقینی نہیں مشکوک ہے۔ احتمال ہے کہ نہ بھی آؤں۔ اسی لئے عربی میں حرف اِمّا کو حرفِ شک سمجھا جاتا ہے۔ اب اسی سلسلے میں قاضی بیضاوی نے تحریر فرمایا:۔

"شرطٌ ذکرہ بحرف الشك للتنبیه علیٰ اَن اِتیانَ الرّسل جائزٌ غیر واجب کما ظنہ اھل التعلیم۔"

یہ ہے وہ عبارت جس کا سر اور پیر کاٹ کر قادیانی صاحب نے بیچ کا دھڑ لے لیا ہے۔ بیضاوی بتا یہ رہے ہیں کہ آخر اللہ نے حرفِ شک اِمّا کیوں استعمال کیا۔ اس کی حکمت ان کے نزدیک یہ ہے کہ رسولوں کو برابر بھیجتے رہنا اللہ پر واجب نہ تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ صرف جائز تھا۔ یعنی وہ رسولوں کو نہ بھیجتا جب بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس پر قادر تھا کہ بلا کسی توسط کے براہِ راست بندوں کو مخاطب کرے وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنا کلام مرتب شکل میں کسی پہاڑ پر یا کسی میدان میں یا کسی انسان کے گھر اتار دے۔ یہ بھی اس کے قبضۂ قدرت میں تھا کہ اس کے احکام فضائے آسمانی میں لکھے نظر آئیں۔ کوئی بھی صورت وہ اختیار فرما سکتا تھا۔ اس نے انبیاء بھیجنے کی صورت اختیار فرمائی یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا بھی جواز مسلم ہے۔ وہ آقا ہے جو چاہے کرے اسے کون روک سکتا ہے یا اس پر یہ اعتراض کون کر سکتا کہ انبیاء کیوں نہیں بھیجے فلاں شکل کیوں اختیار کی۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک لطیف تفسیری نکتہ ہے جسے لفظ اِمّا کی تاویل و توجیہہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مطلق تعلق اُس بحث سے ہے ہی نہیں جس سے قادیانی صاحب نے دیدہ و دانستہ اسے جوڑ دیا ہے۔ بیضاوی میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس سے یہ اشارہ تک نکلتا ہو کہ گفتگو رسول اللہؐ کے بعد نبوت کے جواز و عدم جواز کی ہو رہی ہے استغفر اللہ۔ گفتگو اُس پورے سلسلۂ انبیاء کی ہے جس کا آغاز حضرت آدمؑ سے اور اختتام رسول اللہؐ پر ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھولے سے وہ مطلب نکال بیٹھے جو موصوف نے نکالا ہے یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ تو سوچی سمجھی تحریفِ کلام

اور مغالطہ انگیزی ہے۔ ثبوت مزید لیجئے

مولانا مودودی کے "رسالہ" میں بیضاوی کا عقیدہ بھی نقل ہے۔ وہ اپنی تفسیر انوار التنزیل میں لکھتے ہیں:۔

—"یعنی آپ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں۔
جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا۔ جس سے انبیاء کے
سلسلے پر مہر کر دی گئی اور عیسٰی علیہ السلام کا آپ کے
بعد نازل ہونا اس ختم نبوت میں قادح نہیں ہے
کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ہی کے دین
پر ہوں گے۔" (جلد ۲ ص ۱۶۴)

کیا اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد بھی کوئی باضمیر اور دیانت دار آدمی قاضی بیضاوی کی مختصر تفسیر بیضاوی سے ایک عبارت اٹھا کر ان کے سر یہ رائے مڑھنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ رسول اللہ کے بعد رسولوں کا آنا جائز ہے۔
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

صلی اللہ علیہ وسلم

تفہیم القرآن سے فارغ ہو کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اب یہ عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اس ضخیم تفسیر میں سیرتِ نبویؐ پر جو کچھ آیا ہے اسے الگ کر کے ایک لڑی میں پرو دیں۔ لڑی کو منضبط کرنے کے لئے انھوں نے صدہا ورق نئے تالیف کئے ہیں جو قرآن کے اِن درہائے شہوار کو منظم اور مربوط کرتے ہیں۔ ہم ان میں سے چند اوراق پیش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہ مبارک سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ (ادارہ)

سفرِ شام اور بحیری راہب کا واقعہ

ایک مرتبہ ابوطالبؓ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام جانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اس وقت ایک روایت کے مطابق ۹ سال اور دوسری روایت کی رُو سے ۱۲ سال تھی اور یہی دوسری روایت صحیح ہے۔ جب ابوطالبؓ چلنے لگے تو حضورؐ اُن سے لپٹ گئے اور (ابن سعد کی روایت کے مطابق) آپ نے اُن سے کہا "چچا جان، آپ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں، میری نہ ماں ہے نہ باپ جو میری دیکھ بھال کرے۔" اس پر ابوطالبؓ کا دل پگھل گیا اور انھوں نے کہا "خدا کی قسم میں نہ اسے جُدا کروں گا نہ اِس سے جدا ہوں گا۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔" یہ قافلہ جب شام کے علاقے میں بُصریٰ پہنچا اور بحیریٰ (یا بحیرا) راہب کے صومعہ کے پاس ٹھیرا تو اپنے معمول کے خلاف بحیریٰ نکل کر آیا، حالانکہ وہ کبھی کسی قافلے کے لئے اپنے صومعہ سے نہ نکلتا تھا۔ اس نے اس سارے قافلے کے لئے کھانا پکوایا اور دعوت دی کہ سب لوگ کھانے کے لئے آئیں کوئی پیچھے نہ رہے۔ دعوت کے وقت سب قافلے والے گئے مگر حضورؐ کو آپ کی کم سنی کے باعث اپنے پڑاؤ میں چھوڑ گئے۔ بحیریٰ نے کہا کیا سب لوگ آگئے ہیں؟ لوگوں نے کہا بس ایک کم سن لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے ساتھ اپنے پڑاؤ میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس نے کہا نہیں اسے بھی بلاؤ۔ قریش میں سے ایک آدمی نے کہا لات و عزّیٰ کی قسم یہ ہمارے لئے بری بات ہوگی کہ محمدؐ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوں۔ چنانچہ وہ گیا اور آپؐ کو لے آیا۔ آپؐ کے آنے کے بعد بحیریٰ آپؐ کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور آپؐ کے جسم کا جائزہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا "میاں لڑکے میں تم کو لات و عزّیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دو۔" حضورؐ نے فرمایا "مجھے لات و عزّیٰ کی قسم نہ دو۔ میں اُن سے بڑھ کر کسی چیز سے بغض نہیں رکھتا۔" اس نے کہا "اچھا تو اللہ کے واسطے مجھے اُن باتوں کا جواب دو جو میں پوچھوں۔" آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ اس کے بعد اس نے آپؐ کے حالات، آپ کی نیند، آپ کی ہیئت اور

دوسرے امور کے متعلق دریافت کیا اور آپ جواب دیتے رہے۔ پھر وہ آپ کے گرد پھر کر آپ کے مچتّے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد ابوطالب سے اس نے پوچھا کہ یہ آپ کا کون ہے؟ انھوں نے کہا میرا بیٹا ہے۔ بحیری نے کہا اس لڑکے کا باپ زندہ نہیں ہو سکتا۔ ابوطالب نے کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ اس نے کہا اس کے باپ کو کیا ہوا؟ ابوطالب نے جواب دیا یہ ابھی بطنِ مادر میں تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس نے کہا تم نے سچ کہا۔ پھر بحیری نے کہا "اپنے بھتیجے کو اپنے وطن واپس لیجاؤ۔ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ۔ واللہ اگر انھوں نے اس کو دیکھ کر وہ باتیں پہچان لیں جو میں نے پہچانی ہیں تو وہ اس کے ساتھ کوئی شرارت کریں گے۔ کیونکہ تمھارا یہ بھتیجا بڑی عظیم شخصیت کا مالک ہے۔" چنانچہ ابوطالب نے جلدی جلدی اپنا تجارتی کام انجام دیا اور آپ کو لے کر واپس چلے گئے۔

یہ واقعہ ہے جس پر مستشرقین نے بہت سے قیاسات کی عمارت اٹھائی ہے اور اُن علوم کو جو بعد میں رسول ہونے کے بعد آپ سے ظاہر ہوئے عیسائی راہبوں سے حاصل کردہ معلومات قرار دیا ہے۔ اس پر مزید خود ہمارے یہاں کی بعض روایات بھی ایسی ہیں جو ایک حد تک اِن قیاسات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ایک زاہد مرتاض آدمی جس نے مجاہدوں سے اپنی روحانی قوتوں کو نشوونما دیا ہو، کچھ غیر معمولی برکات کے آثار دیکھ کر محسوس کرے کہ اس قافلے میں کوئی عظیم شخصیت موجود ہے۔ اور آپؐ کو دیکھ کر اسے اپنے اندازوں کی تصدیق ہو گئی ہو۔ لیکن یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ آپ ہونے والے نبی ہیں۔ حافظ ابو بکر الخرائطی نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت نقل کی ہے کہ بحیری نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ:-

هٰذا سيّد العالمين — یہ تمام دنیا کا سردار ہے۔

بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ اس نے کہا:-

هٰذا رسول ربّ العالمين بعثه الله رحمة للعالمين — یہ رب العالمین کا رسول ہے جسکو اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

قریش کے شیوخ نے پوچھا کہ یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ بحیری نے کہا کہ "جب تم گھاٹی سے گذر کر اس طرف آئے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا نہ تھا جو سجدہ نہ کر رہا ہو، اور یہ ایک نبی کے سوا کسی کے لئے نہیں جھکتے۔" آگے چل کر اس روایت میں یہ ہے کہ ابوطالب نے اُس کے اصرار پر حضورؐ کو وہیں سے ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ مکہ واپس بھیج دیا۔ اسی طرح ترمذی، حاکم اور ابن عساکر نے بھی یہ قصہ نقل کیا ہے۔

لیکن اول تو خود اس حدیث میں یہ عجیب بات بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ مکہ واپس بھیجا گیا۔ حالانکہ جب حضورؐ ۱۲ برس کے تھے تو حضرت ابو بکرؓ اس وقت ۱۰ برس کے ہوں گے اور حضرت بلالؓ کی عمر اس سے بھی کم ہو گی۔ یہ بات کیسے سمجھ میں آسکتی ہے کہ حفاظت کے لئے آپؐ کو خود آپ سے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ پھر حضرت بلالؓ اُس وقت نہ حضرت ابو بکرؓ سے وابستہ تھے نہ بنی عبد المطلب سے ان کا کوئی واسطہ تھا کہ ابوطالب ان سے کوئی خدمت لے سکتے لیکن سب سے بڑی بات جس کی بنا پر نہ صرف یہ روایت بلکہ وہ تمام روایات جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے سامنے کسی نے آپ کے رسول یا نبی ہونے کی پیشین گوئی کی تھی اس بنا پر قابلِ قبول نہیں ہیں کہ وہ صریح قرآن کیخلاف ہیں اور حضورؐ کی رسالت کے بعد کے متواتر اور کثیر و مشہور واقعات کے بھی خلاف پڑتی ہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:-

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ۔ (القصص - ۸۶) — اور اے نبی تم ہرگز اس کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ - ۵۲) — تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔

یہ آیات اس باب میں بالکل قطعی الثبوت ہیں کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے آپ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ یہی کچھ اُن روایات سے معلوم ہوتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ پہلی مرتبہ

وحی نازل ہونے کے بعد آپؐ پر کیا کیفیت طاری ہوئی تھی ظاہر بات ہے کہ وہ کیفیت آپؐ پر طاری نہ ہوتی اگر آپ پہلے سے نبی ہونے کے متوقع ہوتے۔ پھر یہی کچھ اُن کثیر اور متواتر روایات سے معلوم ہوتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ کے اعلانِ نبوت اور آغازِ دعوت کا کیا ردِ عمل آپ کی قوم کی طرف سے ہوا۔ اگر پہلے سے لوگوں کو بتا دیا گیا ہوتا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں تو یہ چیز اُن لوگوں کے لئے خلاف توقع نہ ہوتی اور ان کا ردِ عمل اس صورت میں اُس سے بہت مختلف ہوتا جو بالکل ایک خلاف توقع معاملہ پیش آنے سے ہوا۔

حربِ فجار

ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضورؐ ۱۴-۱۵ سال کے تھے جب حربِ فجار واقع ہوئی۔ ابن اسحاق ابن سعد اور ابن جریر کا بیان ہے کہ یہ جنگ سنہ ۲۰ عام الفیل[1] میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے آپؐ کی عمر اس وقت ۲۰ سال ہونی چاہیئے۔ اس میں ایک فریق بنی کنانہ تھے (جن میں قریش بھی شامل تھے) اور دوسری طرف قیس عیلان تھے (جن میں ثقیف اور ہوازن وغیرہ شامل تھے) جنگ اس بات پر چھڑی تھی کہ بنی ہوازن میں سے عُروۃ الرَّحّال نامی ایک سردار نے نعمان بن مُنذِر کے تجارتی قافلہ کو اپنی امان میں بازارِ عُکاظ جانے کے لئے رہگذر عطا کردی تھی۔ بنی کنانہ کے ایک سردار بَرّاض بن قیس نے کہا کیا تو کنانہ کے مقابلے میں بھی اس کو امان دے رہا ہے؟ اس نے کہا "ہاں اور تمام دنیا کے مقابلے میں بھی"۔ اس پر براض کو تاؤ آگیا اور اس نے نجد کے بالائی علاقہ میں تیمن کے مقام پر عروہ کو قتل کر دیا۔ یہ فعل چونکہ حرام مہینے میں ہوا تھا اس لئے اس پر جو جنگ چھڑی اُس کو حربِ فجار کا نام دیا گیا۔ قریش ابھی عکاظ کے بازار میں تھے کہ ان کو اس کی خبر پہنچ گئی اس لئے وہ فوراً حرم کی طرف روانہ ہو گئے، مگر قبل اس کے کہ وہ حدودِ حرم میں داخل ہوتے، ہوازن نے اُن کو جا لیا اور دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ رات کو قریش حرم کے حدود میں پہنچ گئے اور ہوازن رُک گئے۔ اس کے بعد لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے بعض لڑائیوں میں صرف اس حد تک شریک ہوئے کہ جو تیر دشمن کی طرف سے آتے تھے انھیں اٹھا کر آپؐ اپنے چچاؤں کو دے دیا کرتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ بعد میں حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس میں اتنا حصہ بھی نہ لیتا تو اچھا ہوتا۔

اس ایک واقعہ کے سوا غزواتِ نبویؐ سے پہلے آپ نے کبھی کسی جنگ میں نہ شرکت کی اور نہ آپؐ کو کسی قسم کا جنگی تجربہ حاصل ہوا۔ اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دامن جاہلیت کی لڑائیوں سے پاک رہا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوت کے غزوات میں آپ سے جو عظیم قائدانہ صلاحیتیں ظاہر ہوئیں وہ سراسر خداداد تھیں۔ آپ پیشہ ور سپہ سالار نہیں بلکہ پیدائشی سپہ سالار تھے۔

حِلْفُ الفُضُول

حضورؐ ۲۰ سال کے تھے کہ قبائل قریش نے ایک عہد نامہ کیا جسے تاریخ میں حِلْفُ الفضول کہا جاتا ہے (یعنی اس بات کا معاہدہ کہ فضل اہلِ فضل کی طرف واپس کیا جائے اور کوئی ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرے) ابن سعد نے اس معاہدے کی تاریخ ذی القعدہ ۲۰ عام الفیل لکھی ہے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ زُبَید (یمن کے ایک قبیلے) کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا اور اس سے مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا مگر قیمت نہ دی۔ اُس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی مگر سب نے اسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابو قبیس پر چڑھ گیا اور اُس نے بلند آواز سے آلِ فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن

[1] عام الفیل سے مراد ہے ہاتھیوں کا سال، یعنی جس سال اصحاب الفیل نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ یہ ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ اس کے بعد اہل عرب اسی سال سے تاریخوں کا حساب کرنے لگے تھے۔

عبدالمطلب اٹھے اور انھوں نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جاسکتا۔ پھر انھوں نے بنی ہاشم، بنی عبدالمطلب، بنی اسد بن عبد العزیٰ، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا (جو حضرت عائشہؓ کا چچازاد بھائی تھا) اور وہاں سب نے عہد کیا کہ مکّہ میں شہر کا یا باہر کا جو شخص بھی مظلوم ہوگا اس کی مدد کریں گے اور ظالم سے اس کا حق دلوا کر چھوڑیں گے چنانچہ اس کے بعد سب مل کر عاص کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان واپس لیکر دیا۔

محمد بن اسحاق نے امام زہری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعانؓ کے یہاں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ اگر مجھے سُرخ اونٹ بھی اس کے بدلے میں ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انھیں قبول نہ کرتا اور اگر آج دَورِ اسلام میں بھی کسی ایسے معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کر دوں گا۔

حضرت خدیجہؓ کیساتھ تجارت میں شرکت

۲۰ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان حضورؐ کے وہ جوہر ساری قوم پر (اور قوم سے مراد یہاں آپ کا قبیلہ قریش ہے) عیاں ہوتے چلے گئے جو بچپن سے اب تک ایک محدود دائرے میں معلوم و معروف تھے۔ آپ کی شرافت، دیانت و امانت، صداقت شعاری، حسنِ اخلاق، نیک نفسی، سنجیدگی و دانشمندی، ضبطِ نفس اور حلم و وقار، عالی حوصلگی اور سردارانہ شان، غرض ایک ایک خوبی نمایاں ہونے لگی جس کی وجہ سے آپ کا غیر معمولی احترام اور اعتماد اور نفوذ و اثر لوگوں میں قائم ہوتا چلا گیا یہی زمانہ ہے جب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے ساتھ تجارتی شرکت کا معاملہ کیا۔

حضرت خدیجہؓ قریش میں اپنی عفّت اور پاکیزہ سیرت کی بنا پر طاہرہ کے لقب سے معروف تھیں۔ پورے قبیلے میں ان کی دانائی اور فہم و فراست اور اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ قریش کی کوئی عورت اُن سے زیادہ مالدار نہ تھی۔ بسا اوقات قریش کا آدھا قافلہ صرف ان کے مال پر مشتمل ہوتا تھا۔ پہلے ان کی شادی ابوہالہ بن زُرارہ تمیمی سے ہوئی تھی جس سے دو بچے ہند اور ہالہ پیدا ہوئے اور دورِ رسالت میں دونوں مسلمان ہوگئے۔ ابوہالہ کی وفات کے بعد انکی شادی عتیق بن عابد المخزومی سے ہوئی جس سے ان کی صاحبزادی ہِند پیدا ہوئیں اور عہدِ نبوت میں وہ بھی مسلمان ہوگئیں۔ اس دوسرے شوہر کی وفات کے بعد وہ بیوہ ہی رہیں۔ قریش کے بہت سے سرداروں نے چاہا کہ وہ ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرلیں مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ اپنے مال سے وہ تجارت کرتی تھیں اور کسی نہ کسی شخص سے معاملہ کرلیتی تھیں کہ وہ ان کی طرف سے تجارتی قافلوں میں جائے اور مقرر حصّہ لے لے۔

انھیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق اور امانت اور بلند اخلاق کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے آپؐ سے کہا کہ آپ میرا مالِ تجارت شام لے جائیں، میں دوسروں کو جتنا حصہ دیتی ہوں، آپ کو اس سے زیادہ دوں گی۔ یہ ابن اسحاق کی روایت ہے۔

دوسری روایت جو ابن سعد اور زُرقانی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ ابوطالب نے حضورؐ سے کہا "بھتیجے میں مال دار آدمی نہیں ہوں، ہمارے حالات خراب ہوئے ہیں اور ہمارے پاس کوئی مالِ تجارت بھی نہیں ہے۔ یہ قافلہ جو تمھاری قوم شام کی طرف بھیج رہی ہے اسکے چلنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس میں خدیجہؓ بھی اپنا مال بعض لوگوں کے ہاتھ تجارت کے لئے بھیجنا چاہتی ہیں، اگر تم ان کے پاس جاؤ تو وہ تمھیں دوسروں پر ترجیح دیں گی کیونکہ انھیں تمھاری پاکیزہ سیرت کا حال معلوم ہے۔" حضورؐ نے فرمایا شاید خدیجہؓ مجھے خود اس کام کے لئے کہلوائیں گی۔ ابوطالب نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ کسی دوسرے کو منتخب نہ کرلیں۔ چچا بھتیجے کی یہ گفتگو حضرت خدیجہؓ تک پہنچ گئی، مگر حضورؐ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا کیونکہ وہ پہلے ہی حضورؐ کو وہ پیغام بھیج چکی تھیں جس کا ذکر اوپر ابن اسحاق کے حوالہ سے کیا جاچکا ہے۔

طبقات ابن سعد میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ

ابوطالب نے حضرت خدیجہؓ سے جاکر کہا کہ اے خدیجہ کیا تم پسند کروگی اپنی تجارت کے لئے کسی اور کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاملہ کرلو۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ اگر کسی دُور کے ناپسندیدہ آدمی کے لئے بھی فرماتے تو میں مان لیتی۔ آپ تو ایسے شخص کے لئے کہہ رہے ہے جو حبیب قریب ہے۔

غرض حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کا تجارتی معاملہ طے ہوگیا اور انھوں نے اپنے غلام مَیسرہ کو آپؐ کے ساتھ اس تجارتی سفر پر شام بھیج دیا۔ اس سفر میں میسرہ نے حضورؐ کے اخلاق، عادات اور خصائل کی وہ خوبیاں دیکھیں جن سے وہ آپؐ کا گرویدہ ہوگیا۔ واپس آکر اس نے حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اس نے آپؐ کو کیسا پایا۔ تجارت میں بھی حضورؐ نہایت کامیاب رہے اور پہلے جتنا کچھ منافع کما کر دوسرے لوگ ان کو لاکر دیتے تھے آپؐ نے اس سے دوگنا منافع لاکر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے بھی آپ کو جتنا دینے کا وعدہ کیا تھا اس سے دوگنا دیا۔ اس سلسلے میں بھی متعدد روایات ایسی بیان کی گئی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ مَیسرہ کو شام کے ایک راہب نسطورا اور ایک دوسرے شخص نے بتایا تھا کہ آپ ہونے والے نبی ہیں اور میسرہ نے یہ بات شام سے واپس آکر حضرت خدیجہؓ کو بتادی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اُوپر بیان کرچکے ہیں۔ یہ روایات اُن صحیح ترین روایات کے بالکل خلاف پڑتی ہیں جو غارِ حرا میں آپؐ پر پہلی وحی کے نزول اور وہاں سے آپؐ کی واپسی اور حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی گفتگو کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اُن سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم آغازِ نبوت کے موقع پر اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپ نبی ہونے والے ہیں اسی طرح حضرت خدیجہؓ بھی پہلے سے اس کی کوئی توقع نہ رکھتی تھیں۔

آپؐ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح

مَیسرہ جو مکہ سے شام تک اور واپسی پر مکہ تک کے طویل سفر میں شب و روز آپؐ کے ساتھ رہا تھا اور ہر پہلو سے آپؐ کی زندگی کو دیکھ کر آپ کا بندۂ بے دام بن چکا تھا۔ اس سے آپؐ کے حالات سُن کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے شادی کا عزم کرلیا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ آپؐ سے ناواقف نہ تھیں اور قریش میں آپؐ کے جو محاسن معلوم عوام ہوتے جارہے تھے اُن کا چرچا وہ سن چکی تھیں۔ لیکن اب انھوں نے طے کرلیا کہ حضورؐ سے بہتر شوہر انھیں کوئی نہیں مل سکتا۔ نکاح کا معاملہ کس طرح طے ہوا اس کے متعلق کچھ روایات میں اختلاف ہے۔

ایک روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے براہِ راست بات کی اور کہا کہ اے ابن عم آپؐ سے میری قرابت بھی ہے[1]۔ اور میں آپ کی امانت و صداقت اور حسن خلق اور شرافتِ نسبی اور اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپؐ سے شادی کرلوں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے نکاح کی خواہش ظاہر کرنے سے پہلے اپنی ایک سہیلی نُفَیسہ بنت مُنْیَہ[2] کو آپؐ کے پاس بھیجا تاکہ آپؐ کی مرضی معلوم کرلیں۔ نُفَیسہ کا اپنا بیان یہ ہے کہ میں نے جاکر آپؐ سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ شادی کیوں نہیں کرلیتے؟" فرمایا "میرے پاس کیا رکھا ہے کہ میں شادی کروں؟" میں نے کہا "اس کا انتظام ہوگیا ہے اور آپ کو ایک ایسی جگہ شادی کرنے کی دعوت دی جارہی ہے جہاں جمال بھی ہے، مال بھی ہے، شرف بھی ہے اور قابلیت بھی۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے؟ فرمایا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خدیجہ۔ فرمایا میری ان سے شادی کیسے ہوسکتی ہے؟ میں نے کہا اسے آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہوں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے پیغام بھیجا کہ فلاں فلاں

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ (حضرت زبیرؓ کی والدہ) حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں [2] بعض مصنفین نے بنت مُنیہ لکھا ہے

وقت آجائیے اور اپنے چچا عمرو بن اسد کو کہلا بھیجا کہ آکر میری شادی کردیں (حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد کا انتقال ہوچکا تھا) اس طرح اُدھر سے عمرو بن اسد اور اِدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاؤں حضرت حمزہؓ اور ابوطالبؓ کو لیکر پہنچ گئے اور شادی ہوگئی۔ مہر میں حضورؐ نے ۲۰ اونٹ دیے۔ یہ شادی سفر شام سے حضورؐ کی واپسی کے دو مہینے ۲۵ دن بعد ہوئی۔ حضورؐ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی تھیں۔

حضورؐ کی ساری اولاد (بجز حضرت ابراہیمؑ کے جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے) حضرت خدیجہؓ ہی سے تھی۔ ان میں سے دو صاحبزادے تھے اور چار صاحبزادیاں (۱) القاسم جن کی نسبت سے آپؐ ابوالقاسم کہلاتے تھے (۲) عبداللہؓ جن کو طیب اور طاہر بھی کہا جاتا تھا (۳) حضرت زینبؓ (۴) حضرت رقیہؓ (۵) حضرت اُمِّ کلثومؓ (۶) حضرت فاطمہؓ۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون کس سے بڑا تھا۔

ازدواجی زندگی

اگرچہ حضورؐ کی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں ۱۵ سال کا فرق تھا، لیکن دونوں کے درمیان اتنی محبت تھی کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ تمام عمر اُن کو یاد کرتے رہے۔ بخاری میں حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ فرماتے تھے۔ خیر نساءھا مریم و خیر نساءھا خدیجہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنی امت کی بہترین عورت مریم تھیں اور اس امت کی بہترین عورت خدیجہؓ ہیں۔ لیکن مسلم میں یہ روایت وکیع کے حوالہ سے آئی ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے وکیع نے آسمان و زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وکیع نے یا جن لوگوں سے یہ روایت اُنکو پہنچی تھی انھوں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ دنیا کی بہترین خواتین یہ دو ہیں۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر مجھے اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہؓ پر آتا تھا، حالانکہ آپؐ سے میری شادی ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکثر آپؐ کو ان کا ذکر کرتے سنتی تھی اور جب کبھی آپ کوئی بکرا ذبح فرماتے تو اس میں سے ضرور حضرت خدیجہؓ کی ملنے والیوں کو ہدیہ بھیجتے تھے۔ بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کی بہن حضرت ہالہؓ بنت خویلد آئیں اور انھوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ ان کی آواز سنکر تڑپ گئے اور فرمایا اللھم ہالہ (خدایا یہ ہالہ ہوں) کیونکہ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس پر میں جل گئی اور میں نے کہا "آپ قریش کی ایک بوڑھی عورت کو اتنا یاد کرتے ہیں جسے انتقال کئے مدت گذر گئی اور اللہ نے آپ کو اس سے اچھی بیوی دیدی"۔ مسند احمد اور طبرانی کی روایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ میری اس بات پر حضورؐ کو غصہ آگیا اور میں نے کہا قسم ہے اُس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آئندہ کبھی ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی طرح نہ کروں گی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ جنگِ بدر میں رسول اللہ

۱؎ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ہماری تحقیق میں وہ تمام روایات غلط ہیں جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے باپ خویلد نے پڑھایا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ واہی تباہی روایت یہ ہے کہ خویلد کو شراب پلائی گئی اور نشے کی حالت میں اس نے نکاح پڑھا دیا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ سخت ناراض ہوا۔ ہمارے نزدیک اہل علم سے جو بات ثابت اور محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ خویلد حرب فجار سے پہلے مرچکا تھا اور حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے چچا عمرو بن اسد نے کیا تھا۔

۲؎ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے مہر میں ۴۰۰ دینار دیئے اور بعض میں ۵۰۰ درہم کا ذکر ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص بھی گرفتار ہوکر آئے تھے۔ حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے انکو چھڑانے کے لئے جو فدیہ بھیجا اس میں حضرت خدیجہؓ کا ہار بھی تھا جو انھوں نے ابو العاص سے اُن کی شادی کے وقت زمانہ جاہلیت میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہوگئی اور آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو ویسے ہی چھوڑ دو اور اس کا فدیہ واپس کردو۔ سب لوگ اس پر راضی ہوگئے اور ابو العاص فدیہ کے بغیر چھوڑ دیئے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی گہری محبت تھی جو ان کی وفات کے بعد بھی عمر بھر آپؐ کے دل میں تازہ رہی۔

۱۵ سال حضرت خدیجہؓ نبوت سے پہلے اور دس سال نبوت کے بعد آپ صلعم کی بیوی رہیں۔ نبوت کے دسویں سال ان کا انتقال ہوا جب کہ آپؐ پچاس سال کے تھے اور وہ ۶۵ سال کی تھیں۔ لیکن آپ نے اپنی ساری جوانی انھیں سن رسیدہ بیوی کے ساتھ گذار دی اور کسی دوسری عورت کا خیال تک نہ کیا۔ حالانکہ اس وقت اہلِ عرب میں کسی شخص کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا کسی درجے میں بھی معیوب نہ تھا، اور نہ بیویاں ہی اس میں مانع ہوتی تھیں۔ خود حضرت خدیجہؓ کے خاندان سمیت، قریش کے تمام ہی خاندانوں میں ایک ایک شخص کے کئی کئی بیویاں ہونے کی بے شمار مثالیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود آپؐ کا پچاس برس کی عمر تک ایک ایسی بیوی پر قانع رہنا جن کی عمر ۶۵ سال کی ہوچکی تھی اُن تمام معترضین کے لئے عملاً ایک منھ توڑ جواب ہے جو عمر شریف کے آخری دس سالوں میں حضورؐ کی کثرتِ ازدواج کو معاذ اللہ نفس پرستی پر محمول کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم یہ بحث کرینگے کہ عمر کے آخری دَور میں وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر آپؐ نے تعددِ نکاح کئے۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضور کی مفلسی کا	خوش حالی کا دَور اور آپؐ کے اخلاقی فضائل کا نمایاں ہونا

دَور ختم ہوگیا۔ پہلے وہ دوسروں کے ذریعہ سے تجارت کرتی تھیں جس میں ان کو فائدہ کم ملتا تھا کیونکہ وہ سب لوگ جس اخلاقی حالت میں مبتلا تھے اُس میں یہ امر کم متوقع ہو سکتا تھا کہ وہ غیر کے مال میں پوری دیانت اور خیر خواہی سے کام لیں گے۔ مگر جب ان کی تجارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے امین اور فرزانہ شخص کے ہاتھ میں آئی جو فطری خیر خواہی کے ساتھ شوہر ہونے کے باعث بھی اپنی اہلیہ کے حق میں کمال درجہ کے خیر خواہ تھے تو آپ کی تجارت چمک اٹھی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پورا ہوا کہ:-

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ۔	اور اللہ نے آپ کو غریب پایا پھر غنی کر دیا۔

اس دَور میں آپؐ کی صداقت وامانت، معاملات میں انتہائی راست بازی، سخاوت اور جود وکرم، صلہ رحمی، بیکسوں کی مدد، غربا پروری اور دانائی فرزانگی کے وہ اوصاف تمام قریش اور گرد ونواح کے قبائل پر عیاں ہوگئے جو پہلے اپنے ظہور کے مواقع نہ پانے کی وجہ سے مخفی تھے۔ اب معاشرے میں بھی آپ کا مرتبہ محض اخلاقی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مادّی حیثیت سے بھی اتنا بلند ہوگیا کہ آپؐ کا شمار سردارانِ قریش میں ہونے لگا۔ آپ کے اُوپر لوگوں کا اتنا اعتماد قائم ہوگیا کہ وہ اپنی قیمتی امانتیں آپؐ کے پاس رکھوانے لگے، حتیٰ کہ یہ سلسلہ اسوقت بھی جاری رہا جب اعلانِ نبوت کے بعد مکہ کے عوام و خواص آپؐ کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ اس دشمنی کے باوجود وہ اپنی امانتیں آپؐ ہی کی حفاظت میں دیتے تھے اور ہجرت کے وقت آپ کو اپنے پیچھے صرف اس لئے حضرت علیؓ کو چھوڑنا پڑا کہ ہر ایک کی امانت اسے واپس کر کے آئیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت تھی کہ نبوت سے پہلے ہی نہیں، نبوت کے بعد بھی دشمنانِ اسلام کے دلوں میں آپؐ کی دیانت وامانت کا نقش بیٹھا ہوا تھا اور وہ اپنے درمیان آپؐ کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی سمجھتے تھے۔

تجارتی معاملات میں آپ اس قدر کھرے تھے کہ ایک صاحب زمانۂ جاہلیت میں آپؐ کے شریک تجارت رہ چکے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ بہترین شریک تھے۔ کبھی دھوکا نہ دیا، کبھی کوئی چالبازی نہ کی اور کبھی جھگڑا نہ کیا (ان صاحب کا نام مختلف روایتوں میں مختلف آیا ہے۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں قیس بن السائب بن عویمر مخزومی لکھا ہے۔ مسند احمد کی کسی روایت میں سائب بن عبداللہ المخزومی بیان کیا گیا ہے اور کسی میں سائب بن ابی السائب۔ تاہم ان مختلف ناموں سے جس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا قول یہی ہے کہ میں جاہلیت میں آپؐ کا شریک تجارت تھا اور آپ کا معاملہ میرے ساتھ وہ تھا جو اوپر بیان ہوا ہے)۔

مارگ دیپ ہندی

اسلام کی بنیادی تعلیمات کو غیر مسلموں تک پہنچانے والا خالص تبلیغی ماہنامہ۔ جسے پڑھے لکھے غیر مسلم حلقوں میں وقعت اور پسندیدگی کے ساتھ دیکھا جارہا ہے۔ سالانہ چندہ صرف پانچ روپے۔ لیکن اعزازی حیثیت سے آپ پچاس اور سو روپے بھی دے سکتے ہیں۔

تبلیغ دین کی اہمیت کا احساس کرنے والے حضرات اپنے زیادہ سے زیادہ مالی تعاون کے ذریعہ اس کا ہاتھ بٹائیں

ہندی ماہنامہ "مارگ دیپ" روشنی پبلشنگ ہاؤس
کے۔ بی روڈ۔ رامپور (یو۔ پی)

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبدالوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبدالوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی بدعت کے دشمن اور دین و ملت کے خیرخواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدقسمتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمۂ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ـــ ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم بستی ہے۔ اس کی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کروٹیں دیکھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ صفحات ۴۱۲۔ قیمت مجلد۔ دس روپے

شہدائے بدر | شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔ ایک روپیہ

دین و شریعت | اردو ایڈیشن۔ قیمت مجلد ۲/۲۵
انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

فضا ابن فیضی

دی جو توفیقِ ہنر، حُسنِ پذیرائی بھی دے — اس زیاں خانے میں سودِ نکتہ آرائی بھی دے
لوگ اس کی قوتِ تحریر سے ہوں آشنا — شہ رگِ جاں کو مذاقِ خامہ فرسائی بھی دے
ہوں خود اپنے آپ میں گم جیسے جنگل کا گلاب — میں ہوں اِک منظر تو پھر اس کو تماشائی بھی دے
چپ رہے کب تک یہ سینے میں بھڑکتی آگ — نطق و لب کے پاسباں! پتھر کو گویائی بھی دے
اَن گنت چہروں کی بڑھتی بھیڑ میں کھو جاؤنگا — خال و خط بخشے تو کچھ اپنی سی یکتائی بھی دے
شوخیٔ پائے ہوس پر شرم آتی ہے مجھے — آگے بڑھنے کی سکت دی تھی تو پسپائی بھی دے
اِک سلیقے سے ذرا مجھ سے یہ نفرت کر سکیں — جو نہ دی مجھکو اب اوروں کو وہ دانائی بھی دے
ہو چکے وحشت میں کامل، شہر کے سنجیدہ لوگ — اب در و دیوار کو صحرا کی پہنائی بھی دے
مدتیں گذریں نہ اپنے آپ سے ملنا ہوا — مجھ کو یارب! ان بھرے شہروں میں تنہائی بھی دے
یہ جراحت بے خلش نکلی تو پھر کیا فائدہ — شہرت ایسی دے کہ جس کی داد رسوائی بھی دے
انگلیاں ہیں کائنات و ذات کے اوراق پر — دی ہے ہاتھوں میں کتاب ایسی تو بینائی بھی دے

لفظ تو کیا، خود معانی کے دلوں میں ڈوب جاؤں
دینے والے! میرے جذبوں کو وہ گیرائی بھی دے

حافظ امام الدین رام نگری

کمالِ بے خودی ہے اور میں ہوں — مقامِ آگہی ہے اور میں ہوں
نہ کوئی خال و خط جس کے نہ تمثیل — وہ حسنِ معنوی ہے اور میں ہوں
نہ ہو کیوں ناز مجھ کو اپنے دل پر — کسی کی دلبری ہے اور میں ہوں
وہی ساقی وہی بے اعتنائی — وہی تشنہ لبی ہے اور میں ہوں
وہی ہے نیم شب کی اشکباری — وہی تر دامنی ہے اور میں ہوں
جو ہے نا آشنائے راہِ منزل — اسی کی رہبری ہے اور میں ہوں

برہمن خو ہے شیخِ شہر حافظ
اسی کی آذری ہے اور میں ہوں

تبلیغ المبین | شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تصنیف جو بدعت و سنت کی بہترین تشریح کرتی ہے۔ شریعت قبوری کے مقابلے میں شریعت حقہ کی تعلیمات ضرور پڑھیئے۔ قیمت مجلد چھ روپے ۵۰ پیسے ٦/٥٠

ولی کامل | حضرت مولانا ذکریا شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور کی داستانِ زندگی مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے۔ قیمت مجلد — چھ روپے۔ ٦/-

فلاح ملت | بدعتوں کے رد اور صحیح عقائد کے اثبات میں ایک عام فہم۔ دلچسپ اور مفید کتاب۔ جس دور میں بدعتیں عام ہوں ایسی کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتے رہنا چاہیئے۔ قیمت — پانچ روپے

مآثر و معارف | علوم حدیث، علوم فقہ، فنونِ اسلامیہ اور دیگر اہم موضوعات پر مولانا قاضی اطہر مبارکپوری۔ ۲۵ عمدہ مقالات کا مجموعہ۔
قیمت — نو روپے ۹/-

اسمائے حسنیٰ کے برکات | تعویذ و عملیات کے سلسلے میں ایک عمدہ کتاب۔
قیمت مجلد — چار روپے ۴/-

مسجد سے میخانے تک | یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ملا ابن العرب مکی کے شہ پارے کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے پڑھنا بھی لطف سے خالی نہیں۔ ان میں تبسم کی چاندنی اور طنز کی نمکینی ہی نہیں افادیت بھی ہے۔ ملا فقط طنز برائے طنز اور مزاح برائے مزاح پر بس نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی اخلاقی مقصد پر بھی آپ کی توجہ منعطف کراتا ہے۔
قیمت حصہ اول — قیمت — آٹھ روپے ۸/-
حصہ دوم — قیمت — نو روپے ۹/-

سفر مصر و حجاز | امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے ۲/۵۰

نہایۃ التحقیق اردو شرح مسند ابوبکر صدیق رضہ

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب یک جا۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بڑے سائز کے ۲۷۵ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف بائیس روپے ۲۲/-۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اردو خواں طبقے کے لئے فن حدیث کی باریکیوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپرد قلم فرمایا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ۔ فن حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ امید ہے شائقین اس تحفۂ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔
قیمت مجلد — بائیس روپے۔ ۲۲/-

قرآن اور حدیث | قرآن اور حدیث میں کیا ربط ہے؟ سنت کا مفہوم اور مقام کیا ہے؟ رسالت کسے کہتے ہیں؟ ان ہی جیسے دسیوں سوالوں کا مدلل جواب مولانا مودودی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔ نیا ایڈیشن مع ڈسٹ کور۔ قیمت — دو روپے ۶۰ پیسے۔ ۲/۶۰

ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر شکیل عاصم بریلوی کا مجموعۂ کلام

صہبائے خیال

خوشنما گیٹ اپ کے ساتھ۔ چھ روپے ٦/-

دینی دعوت کے قرآنی اصول | مولانا قاری محمد طیب صاحب کی فکر انگیز کتاب جو دینی دعوت کے بنیادی اصولوں پر بحث کرتی ہے۔ پانچ روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

(آخری قسط)

معترضین کیا فرماتے ہیں؟

آخر میں شمس صاحب نے چند باتیں فرمائیں جن میں سے پہلی یہ ہے کہ مدیر تجلی نے صحابہؓ کے جو فتاویٰ نقل کئے ان میں سے متعدد بغیر اسناد کے ہیں اس لئے ثبوت اجماع کے لئے ناکافی ہیں۔

ہم کہتے ہیں یہ غلط بیانی ہے یا پھر نظر کی کمزوری۔ طلاق نمبر سے اگلا شمارہ (بابت اگست و ستمبر ۱۹۶۷ء) کھولئے صفحہ ۵ پر پہلا فتویٰ عبداللہ ابن مسعودؓ کا منقول ہے۔ اس کے لئے ہم نے مؤطا امام مالک جیسی مستند کتاب کا حوالہ دیا۔ ہر عالمِ حدیث جانتا ہے کہ مؤطا میں جو روایات بغیر سند کے یا ناقص سندوں سے آئی ہیں انھیں بعد کے محدثین مثلاً بخاری و مسلم جیسے اساتذہ نے مکمل سندوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اور دینی بناپر مؤطا قابل اعتماد بھی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی جگہ ہم نے تصریح کر دی ہے کہ امام مالکؒ کی بیان کردہ اس بے سند روایت کو تین جلیل القدر محدث ابن ابی شیبہ، بیہقی اور عبدالرزاق نے سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ کوئی بتلائے کیا اس کے باوجود یہ بے سند کہلائے گی؟

دوسرا فتویٰ اسی صفحہ پر ابن عمرؓ کا ہے اس کے لئے ہم نے بخاری و مسلم کے حوالے دیئے ہیں اور یہ بھی جتادیا ہے کہ سنن دارقطنی میں یہ روایت چار سندوں سے ہے۔

تیسرا فتویٰ حضرت علیؓ کا ہے۔ اس کی سند بھی مختصراً پیش کی گئی اور چار کتابوں کے حوالے دیئے گئے۔

چوتھا فتویٰ حضرت عثمانؓ کا ہے۔ اس میں ہم نے دو کتابوں کے حوالے سے ایک سند ذکر کی۔ پھر بتایا کہ مصنف عبدالرزاق میں ایک اور سند سے اور محلّٰی میں ایک اور سند سے یہی واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ دونوں سندیں بھی وہیں ہم نے نقل کر دی ہیں۔ اس کے بعد مصنف عبدالرزاق سے ہم نے ایک ایسی اعلیٰ ترین سند نقل کی ہے جس کی صحت و قوت میں کوئی استادِ حدیث بھی نہیں نکال سکتا۔

مزید جتنے فتاویٰ ہم نے نقل کئے ہیں ان میں سے ایک بھی بے سند نہیں۔ البتہ ہم نے ہر جگہ سندیں نقل نہیں کیں بلکہ کتاب کے حوالے دیئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے متقدمین حضرات اور خود شمس صاحب بھی متعدد حدیثیں پیش کر کے کتاب کا حوالہ دیتے ہیں اور سندیں نقل نہیں کرتے تو

ظاہر ہے کہ یہ طوالت سے بچنے کا ایک طریق ہے۔ سندیں حوالوں کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہر شخص انھیں دیکھ سکتا ہے تعجب ہے شمس صاحب پر کہ وہ صحابہؓ کے متعدد فتاویٰ کو بے سند کہہ رہے ہیں حالانکہ ایک بھی فتویٰ بے سند نہیں ہے کسی سند کی صحت میں وہ کلام کرسکیں تو یہ الگ بات ہے مگر سند کے وجود ہی سے صاف انکار کر دینا مشاہدات کو جھٹلانا ہے جو محض جھنجلاہٹ کا نتیجہ ہو سکتا ہے معقولیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری بات انھوں نے مسلم کی ایک حدیث کے بارے میں بطور معارضہ فرمائی۔ اس حدیث پر ہم شرح وبسط سے گفتگو کر چکے ہیں لہذا ان کے معارضے کی کمزوری جسے دیکھنی ہو یہ گفتگو پڑھ لے بار بار ہم کہاں تک ساری باتیں دہرائے جائیں۔

تیسری بات جو انھوں نے کہی وہ کافی قابلِ توجہ ہے، لہذا ان کی تمام عبارت نقل کی جاتی ہے:-

"جن روایتوں میں صحابہؓ کے فتوے بیان ہوئے ہیں، ان میں سے متعدد روایتوں کے بارے میں درایۃً کلام کی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ یہ روایتیں بتلاتی ہیں کہ ان کے زمانے میں لوگ بیک وقت سو سو اور ہزار ہزار طلاقیں دینے لگے تھے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس طرح بھی طلاق دی جاتی کہ آسمان میں جتنے تارے ہیں اتنی طلاقیں — یہ اِکّا دُکّا واقعات نہیں بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے واقعات بہ کثرت پیش آتے رہے ہیں۔ اس لئے ان روایتوں کو قبول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ قرنِ اوّل کے بارے میں تسلیم کیا جائے کہ اُس وقت شدید معاشرتی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، لوگ کتابُ اللہ کے ساتھ کھیلنے لگ گئے تھے اور بدعی طلاق کا رواج عام ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں تو ہمارا موجودہ معاشرہ ایسا غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ لوگ صرف تین طلاقیں دینے پر اکتفا کرتے ہیں ایک سو اور ایک ہزار طلاق کی بات تو کبھی سننے میں بھی نہیں آتی۔ ظاہر ہے جو روایتیں قرنِ اوّل کی اتنی غلط تصویر پیش کرتی ہوں، وہ نہ قابلِ قبول ہو سکتی ہیں اور نہ لائقِ حجت اور نہ اس قسم کی روایتوں کا ڈھیر لگانے سے اجماع ثابت ہوتا ہے"

اولاً تو یہی مبالغہ آرائی ہے کہ سو یا ہزار طلاقیں دینے کے واقعات اکّا دُکّا نہیں بلکہ بہ کثرت ملتے ہیں۔ ہم نے چودہ آثارِ صحابہؓ نقل کئے۔ ان میں صرف دو اثر ہزار طلاقوں کے ہیں اور اتنے ہی سو طلاقوں کے۔ پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ واقعہ ایک ہی ہو اور استفتاء اس کے بارے میں حضرت علیؓ سے بھی کیا گیا ہو اور حضرت عثمان سے بھی۔ اس صورت میں رائے تو دونوں حضرات کی ظاہر ہو گئی اور روایات بھی دو ہو گئیں لیکن واقعہ ایک ہی رہا۔ اگر لاکھوں مسلمانوں کے معاشرے میں دو چار مغلوب الغضب لوگ بیوی کو سو یا ہزار طلاقیں دے گذرے ہوں تو اس سے شدید معاشرتی بگاڑ کا ثبوت کہاں ملا۔ اس سے یہ کہاں ظاہر ہوا کہ لوگ عام طور پر کتابُ اللہ سے کھیلنے لگے تھے۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ بعض نادر دانشوروں کی طرح کہیں شمس صاحب بھی کسی دن یہ نہ کہہ گذریں کہ جنگِ جمل اور جنگ صفین محض من گھڑت افسانے ہیں — کیونکہ انھیں واقعہ مان کر صحابہؓ کی بہت بری تصویر بنتی ہے۔

ہمارے دوست بھول رہے ہیں کہ دورِ صحابہ کی تیز رفتار فتوحات نے بے شمار ایسے لوگوں کو داخلِ اسلام کر دیا تھا جو دورِ جاہلی کے بے شمار تصورات وخیالات ساتھ لئے ہوئے تھے۔ طلاق دورِ جاہلی میں ایک کھلونا تھی۔ مرد کتنی ہی طلاقیں دیتے اور رجوع کر لیتے۔ اس رواجِ عام کا اثر دورِ خلافت میں بھی اگر کسی حد تک ظاہر ہوا ہو تو اس میں نہ کوئی حیرت ہے نہ پریشانی خصوصاً جب صحابہؓ کی طرف اس طرح کے افعال کی نسبت نہیں تو اور بھی قرینِ قیاس ہے کہ یہ واقعات درست ہوں۔

چوتھی بات انھوں نے یہ کہی:-

"صحابۂ کرامؓ کے کتنے فتوے ایسے ہیں جن کو متعدد فقہاء نے تسلیم نہیں کیا۔ مثلاً حضرت علیؓ "تو مجھ پر حرام ہے" کو تین طلاق قرار دیتے تھے لیکن حضرت ابن عباسؓ اس صورت میں کفارہ کی ادائیگی کو کافی خیال کرتے تھے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ کہنے والے کی نیت اگر طلاق کی تھی تو طلاق ہوگی اور اگر ظہار کی تھی تو ظہار ہوگا اور اگر مطلقاً یہ الفاظ کہے ہیں تو نہ طلاق ہوگی اور نہ ظہار، بلکہ صرف قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ (ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہؒ کی شرح مؤطا کتاب الطلاق)

میراث کے مسئلہ میں ذوی الفروض پر ردّ (بقیہ مال لوٹانے) کا طریقہ حضرت علیؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے رائج کیا تھا، لیکن امام شافعیؒ اور امام مالکؒ رحمہما اللہ نے اس سے اتفاق نہیں کیا لہٰذا تین یکجائی طلاقوں کے مسئلہ میں صحابۂ کرامؓ کے فتووں سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ "اگر تمھارے درمیان نزاع ہو جائے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔"

ہم نے کب دعویٰ کیا کہ کسی صحابی کے فتوے سے بعد کے اہل علم اختلاف نہیں کر سکتے۔ یہ تو مسلّمات میں سے ہے کہ کوئی صحابی بجائے خود معیارِ حق نہیں۔ اس کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے مگر جس مسئلے میں بحث ہے اسمیں اول تو کسی ایک صحابی کے فتوے کا ذکر نہیں بہت سے صحابہ کے فتووں کا ذکر ہے۔ دوسرے ان فتووں سے اختلاف کی کوئی آواز آس پاس بھی نہیں سنائی دیتی۔ اگر ان فتاویٰ سے دورِ صحابہ کے کسی عالم نے اختلاف کیا ہو تو پیش فرمائیے۔ اوّلاً جو مثیل آپ نے پیش کی ہے وہ غیر متعلق ہے۔ اس میں ایک ذومعنی فقرے کے مصداق میں اختلاف ہے نہ کہ تین طلاق کے وقوع میں۔

میراث کا مسئلہ ہو یا کوئی مسئلہ۔ اگر اس میں کسی صحابی کی رائے سے خیر القرون کے کسی معروف مجتہد و امام نے اختلاف کیا ہے تو بے شک اس کی اہمیت ہے۔ زیر بحث مسئلہ میں صورتِ حال جدا ہے۔ یہاں تو چاروں معروف امام اور دیگر اہل علم متفق ہیں کہ صحابہؓ کی رائے درست ہے۔

اور یہ جو آپ نے فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ والی آیت ذکر فرمائی تو مکرم دوست! ہم خود اسی پر عمل پیرا ہیں۔ ہم نے قرآن و حدیث ہی سے ثابت کیا ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ آپ کا یہ تأثر دینا کہ قرآن و حدیث اس مسئلے میں صحابہؓ کے فتووں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں خلافِ واقعہ ہے۔ محض دہراتے رہنے سے کوئی مفروضہ حقیقت نہیں بن جاتا۔

پانچویں بات شمس صاحب نے یہ کہی:-

"صحابہؓ کے یہ فتوے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کیا تھا جب کہ معاشرہ شدید بگاڑ سے دوچار نہیں ہوا تھا، لیکن بعد میں جب بگاڑ میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو نظرِ ثانی کی ضرورت اُبھر کر سامنے آئی۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ نے قرآن و سنت کی روشنی میں از سرِ نو غور فرمایا۔"

ہر باخبر جانتا ہے کہ خالص اجتہادی مسائل میں مجتہدین کے مابین اختلاف ہوا کرتا ہے۔ مکمل اتفاقِ رائے اسی وقت ممکن ہے جب کوئی حکم قرآن یا حدیث سے اس طرح نکل رہا ہو کہ اس سے صرفِ نظر ممکن نہ ہو۔ طلاقِ ثلٰثہ کے مسئلے میں تابعی مجتہدین ائمہ کا کامل اتفاقِ رائے بجائے خود قرینہ ہے اس بات کا کہ وہ ایک ایسی رائے پر متفق ہوئے ہیں جس کی کھلی تائید قرآن و حدیث سے ہو رہی ہے۔ چنانچہ آٹھ حدیثیں ہم نے پیش کر دیں اور آیاتِ قرآنیہ پر بھی گفتگو کر لی۔

ان پانچ باتوں کے بعد شمس صاحب نے ذیل کی تقریر اپنا

کلام ختم کیا ہے:-

"موجودہ دور کے مقلد علماء اجتہاد کو اتنا مشکل بناکر پیش کرتے ہیں کہ نہ نومن تیل ہوگا والی بات کے مترادف ہوجاتا ہے ـــــ اور مفتی حضرات کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ حالات سے آنکھیں بند کرلیں اور پیش آمدہ مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے شامی اور دُرِّ مختار جیسی فقہی کتابوں کے حوالے نقل کرکے پیش کریں اور اگر اجتہاد ناگزیر ہی ہوجائے تو تخریج در تخریج کا طریقہ اختیار کریں۔

آخری بات یہ ہے کہ تین یکجائی طلاقوں کے وقوع کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جمہور علماء وفقہاء کا قول ہے۔ مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ جمہور کی ہر رائے صحیح ہو اور گروہِ قلیل کی ہر رائے غلط ـــــ کبھی گروہ قلیل کی رائے ہی صائب ہوتی ہے۔ وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ۔ اور دین نے ہمیں جمہور علماء کا نہیں بلکہ صرف کتاب وسنت کا پابند بنایا ہے۔"

اس تقریر کا کم سے کم اس بحث میں تو کوئی محل نہیں تھا۔ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ اہل حضرات اجتہاد نہ کریں نہ ہم نے اس مسئلے میں شامی اور درمختار کو مستدل بنایا۔ ہماری تمام تر گفتگو قرآن وسنت کے محور پر گھومتی رہی ہے اور ہمارا زور اس نکتے پر ہے کہ جب قرونِ اولیٰ کے جملہ مجتہدین قرآن وسنت سے یہ حکم اخذ کرتے ہیں کہ تین یکجائی طلاقیں واقع ہوجانی چاہئیں تو بعد میں کسی کا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم کیسے ہوگا کہ قرآن وسنت اس سے مختلف حکم دے رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست "اجماع" کی حجیت کے قائل نہیں ہیں۔ اگر یہی بات تھی تو خواہ مخواہ انھوں نے یہ ثابت کرنے پر زور لگایا کہ اس مسئلہ میں اجماع نہیں ہے۔ صاف کہتے کہ ہوا کرے اجماع۔ ہم اجماع کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔

رہی وہ بات جو انھوں نے آیتِ قرآنی وکم من فئۃ قلیلۃ کے تعلق سے کہی ہے تو وہ بھی سوائے مغالطے کے کچھ نہیں۔ کبھی قلیل التعداد جماعت بے شک کثیر التعداد گروہ پر غالب آجاتی ہے مگر زیر بحث مسئلہ میں قلیل جماعت ہے کہاں۔ جو دعویٰ خود تشنۂ ثبوت ہے اسی کو آپ دلیل بنا رہے ہیں۔ اسلام کی پہلی تین صدیوں میں اہلِ علم کی کوئی جماعت تو درکنار ایک دو افراد بھی ایسے نہیں پائے جاتے جن کا اختلاف ثابت ہو۔

ہاں منکرینِ حدیث اور متجددین کے لئے آپ نے اجماعی مسائل سے جان چھڑانے کا نسخہ ضرور پیش فرمادیا۔ وہ ٹھیک اسی استدلال سے متفق علیہ مسائل کو ڈائنامیٹ کر سکتے ہیں۔ پناہ بخدا۔

فریقِ ثانی کی طرف سے جتنے بھی معارضے جواباً پیش کئے گئے تھے ایک ایک پر ہم نے یہ ضروری تبصرہ کر دیا۔ ان میں سے کوئی معارضہ ہماری کسی دلیل کو نہ کاٹ سکا۔ حالانکہ اگر دو چار دلیلیں کٹ بھی جاتیں تو بیسیوں پھر بھی باقی رہتیں۔ بھرپور نقد اسے کہتے ہیں کہ تمام مخالف دلائل کا جواب لایا جائے جیساکہ ہم نے تمام مقالہ نگاروں کے ہر ہر استدلال کو آپریشن تھیٹر میں رکھا ہے اور عقلی ونقلی شواہد کے ساتھ دکھلایا ہے کہ یہ سب کھوکلے ہیں۔ مولانا محفوظ الرحمان صاحب یا شمس پیرزادہ صاحب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ مدِ مقابل کی درجنوں دلیلوں میں سے دوچار کو کمزور ثابت کردینا کیس جیتنے کے لئے کافی ہے تو وہ خواب وخیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔

(ختم شد)

مکتوبات مجدد الف ثانیؒ — حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط تمام اہلِ علم میں ایمان، معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔

مجلد جلد اوّل —— پندرہ روپے ١٥/-

جلد دوم —— اٹھارہ روپے

جلد سوم —— بیس روپے ٢٠/-

احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت — از:- مولانا تقی امینی۔ جیساکہ نام سے ظاہر ہے شریعت کے احکام زمانہ کے تقاضوں اور تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام مواد حوالوں سے آراستہ

قیمت غیر مجلد — آٹھ روپے ۷۵ پیسے ٨/٧٥

تفسیرِ رشیدی — مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے قلم سے بیس ٢٠ آیاتِ قرآنیہ کی قابلِ مطالعہ تفسیر عارفانہ اور محققانہ۔ قیمت —— دو روپے ۵۰ پیسے۔

تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے — جدید و قدیم دونوں علوم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو۔ زبان سلیس، اسلوب شگفتہ، دلائل قوی مواد محققانہ۔ قیمت —— آٹھ روپے۔

مدارجِ سلوک — ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا۔ قیمت — چھ روپے ۵۰ پیسے۔ ٦/٥٠

وحدۃ الوجود — اہلِ معرفت کے مشہور مسلک وحدۃ الوجود پر محققانہ گفتگو۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بیان اور اس کے اسرار۔ مجلد قیمت — تین روپے ١٢ پیسے

مکاتیبِ گیلانیؒ — مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے قابلِ قدر خطوط کا مجموعہ۔ معقول و منقول کا خزانہ

قیمت مجلد پلاسٹک — دس روپیہ ١٠/-

الحج — مولانا اشرف علیؒ کے خلیفہ شاہ مسیح اللہؒ کی نادر تصنیف۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت —— دو روپے۔ ٢/-

فتاویٰ عبد الحیی — مولانا عبد الحیی مرحومؒ کا مشہور مجموعۂ فتاویٰ ایک جلد میں مکمل نظرِ ثانی کے بعد۔

قیمت —— بیس روپے۔ ٢٠/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ — مولانا منظور نعمانی کی مقبول کتاب۔ اس میں وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔

قیمت —— چھ روپے ۵۰ پیسے۔ ٦/٥٠

تفہیم القرآن پارۂ عمّ — مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق اور معرکۃ الآراء تفہیم القرآن کا پارہ عمّ۔ کسی بھی مسلمان کو اس پارے کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہیئے۔ تاکہ نماز میں عام طور پر پڑھی جانے والی سورتوں کے مطالب ذہن میں رہیں۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ ہدیہ —— پانچ روپے۔

البدائع — مولانا اشرف علیؒ کی گراں قدر تالیف، جس میں نوع بہ نوع پیچیدہ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ زبان اردو ہی ہے۔

قیمت مجلد —— پندرہ روپے۔ ١٥/-

التکشف عن مہمات التصوف — یہ بھی مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب ہے۔ مضامینِ نادرہ سے لبریز۔ قیمت مجلد — تیس روپے ٣٠/-

تربیتُ السّالک — مولانا اشرف علیؒ کی بیش بہا کتاب اب دو ضخیم جلدوں میں دستیاب ہے۔ اربابِ ذوق اس تحفۂ عجیبہ سے فائدہ اٹھائیں۔

قیمت مکمل ہر دو جلد — چالیس روپے۔ ٤٠/-

معرفتِ الٰہیہ — اسی کتاب کا معروف نام "خدا کی پہچان" بھی ہے۔ حضرت شاہ عبد الغنیؒ کے نہایت وقیع اور معرفت سے لبریز فرمودات حکمت و شریعت اور حسنِ تربیت کا گنجینہ۔ مجلد — بیس روپے۔ ٢٠/-

امام اعظم ابو حنیفہؒ — امام اعظمؒ کے حالات مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ کے قلم سے۔ مجلد — نو روپے۔

مسجد سے میخانے تک

مسجد سے نکل کر گھر چل رہا تھا کہ شیخ خدا بخش مل گئے۔ ثابت شاہ کے خاندان کے سب سے بڑے یا بزرگ آخری فرد ہیں۔ بہت بوڑھے لاغر ضعیف۔ اسی محلے کے آخری سرے پر رہتے ہیں۔ تھوڑا بہت پڑھے لکھے بھی ہیں۔

"ملا بیٹے۔ اچھے تو ہونا۔ کہاں غائب رہتے ہو۔ تمھاری پھوپی جان تمھیں یاد کر رہی تھیں۔" انھوں نے ہچکولے لیتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شرمندہ ہوں۔ ان سے سلام عرض کیجئے گا۔"

"نہیں تم ساتھ چلو۔ تمھیں شاید خبر نہیں تمھاری بہن رشیدہ بیمار ہے۔"

"اوہو۔۔۔ کیا بیمار ہیں؟"

"آٹھ دن میں چار دورے پڑے ہیں۔ خبر نہیں کیسے دورے ہیں دوا علاج سے کچھ نہیں ہوا۔ عامل صاحب نے بتایا ہے کہ اس پر کسی شہید کا سایہ ہو گیا ہے۔ فلیتے جلائے تھے اس میں یہ نکلا کہ کٹورے شاہ کے مزار پر چادر چڑھا کر سات پھیرے کرائے جائیں۔"

"کٹورے شاہ....." میرے دل پر گھونسہ لگا۔ مجھے اس وقت اس موضوع سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں رہ گئی تھی مگر شیخ کی بیوہ بہن کو میں پھوپی کہتا تھا اور پھوپی کی صاحبزادی رشیدہ بیگم اسی رشتہ سے میری بہن ہوتی تھیں۔ کیسے کہتا کہ جہنم میں ڈالو۔

"میں آج ہی ان کی مزاج پرسی کو حاضر ہوں گا۔"

"نہیں بیٹا ابھی چلو۔ رشیدہ کے میاں کو بیماری کا خط لکھا تھا وہاں سے جواب آیا ہے کہ مجھے ابھی چھٹی نہیں مل رہی ہے۔ اب بتاؤ تمھارے سوا کون ہے جس سے کہوں کہ رشیدہ کو رجولی لے جاؤ۔"

"میں لے جاؤں!" میں دل ہی دل میں اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں۔ نہیں تو بتاؤ کس سے کہوں۔ رات صوفی ناسور بھی دیکھنے آئے تھے۔ انھوں نے بھی یہی رائے دی کہ جتنی جلدی ہو سکے کٹورے شاہ کے مزار کا طواف کرا دیا جائے ورنہ شہیدوں کا غصہ بہت خراب ہوتا ہے کیا خبر کیا ہو جائے۔"

"مگر اکیلی رشیدہ بہن کو میں کیسے ساتھ لے جاؤں۔ زمانہ تو آپ جانئے بہت خراب ہے۔"

"اکیلی نہیں۔ رفیقن بھی ساتھ جائے گی اسکی جٹھانی کے اولاد نہیں ہوتی وہ درگاہ میں چادر اور عرضی بھجوا رہی ہیں۔"

"پھر بھی رفیقن کون سی بوڑھی ہے۔ دنیا کی زبان کون پکڑے گا۔"

"اوہو۔ رفیقن کے ساتھ بھی تو بوا زعفرانی ہوں گی۔ انھیں اپنے منجھلے بیٹے کا روزگار مانگنا ہے۔ بہت دنوں سے بے کار ہے۔"

"گویا خواتین کی پلٹن۔۔۔۔ کاش آپ ہی تکلیف فرما لیتے۔۔۔"

"مجھ میں دم درود کہاں بیٹا۔ میری طرف سے بھی تم ہی شاہ صاحب کو سلام پیش کر دینا۔ اور ہاں۔ سنا تھا تمھاری زوجہ کو کبھی کبھی نکسیر پھوٹ جاتی ہے۔ یہ بڑا اچھی علامت نہیں ہے۔"

"جی ہاں پھوٹتی تو ہے۔۔۔ پھر؟"

"مزار شریف کی پائنتی سے ایک چٹکی خاک اٹھا کے نسیشی میں رکھ لانا۔ مولا چاہے اکسیر ثابت ہو گی۔"

"کیا ناک میں چڑھائی جائے گی؟!"

"نہیں سنگھا دینا کافی ہے۔ نہ فائدہ ہو تب ناک میں چڑھاتے ہیں۔"

"کیا آپ کو تجربہ ہے؟"

"تجربہ ہی سمجھو۔ قطب الاولیاء حضرت داؤد حسن نقشبندی کی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے کسی مرید کے پیٹ میں کیچوے ہو گئے تھے۔ ہزاروں علاج کئے مگر مرض نہ

گیا جتنے کیچوے نکلتے اس سے زیادہ پیدا ہو جاتے۔ ایک دن خواب میں انھیں اپنے دادا پیر کی طرف سے اشارہ ملا کہ کٹورے شاہ کے مزار پر حاضری دو۔ وہ اگلے ہی دن دوڑے گئے۔ مزار سے ہدایت ملی کہ ہمارے قدموں کی خاک چاٹ لے۔ انھوں نے چاٹی۔ بس پھر کبھی کیچوا پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"اللہ اکبر۔ لیکن نکسیر اور کیچوے میں کیا جوڑ ہوگا۔"

"ان کی زوجہ کو نکسیر کا مرض تھا۔ کیچوے کی طرح نکسیر بھی غائب ہو گئی۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں نے بھی کسی بہت ہی بڑے بزرگ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ بعض اولیاء اللہ کے مزارات کی خاک اکسیر ہوتی ہے۔ بلکہ خواجہ فتح علی ہفت کشاد کی خاکِ مزار کے بارے میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ آنکھوں میں سرمہ کی طرح لگاؤ تو مخلوق کی نظروں سے غائب ہو جاؤ۔ خدا جانے یہ مزار کہاں ہے۔"

"اب نہیں ہے تھا کبھی۔ شاہ مردار یدنے اسکی تاریخ لکھی ہے۔ فرنگی قدم جب تک ہندوستان میں نہیں آئے تھے یہ کھٹارا ضلع تنورہ میں خلقِ خدا کی رجوعات کا مرکز بنا ہوا تھا جس دن فرنگی نے قدم رکھا یہ کھٹارے سے سرک کر جمبو پہاڑ کے دامن میں جا پہنچا۔ پھر فرنگی نے دخل فصل کر کے حکومت بنائی تو یہ غائب ہی ہو گیا۔"

"مزار غائب ہو گیا!" میں نے آنکھیں پھاڑیں۔

"ہاں بیٹا۔ خواجہ فتح علی بڑی غیرت والے اولیاء تھے۔ حضرت چمن شاہ نے اپنی کتاب جواہر الکرامت میں خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنا مزار شاید تبت میں لے گئے۔"

"بہت بری جگہ لے گئے۔ وہاں تو اب کمیونسٹوں کا راج ہے۔"

"ہوا کرے اس سے کیا ہوتا ہے۔ چین کا بادشاہ اب بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ذرا بے ادبی کرے گا تو جان سے ہاتھ دھوئے گا۔"

مشرک ہی پھر کھڑے کھڑے روحانیت کے دُر ہائے آبدار بلکہ گہر ہائے شہوار ہم دونوں نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق کافی دیر لٹائے پھر میں یہ وعدہ کر کے کہ گھنٹے بھر میں درِ دولت پر حاضر ہو رہا ہوں گھر لوٹا۔ زوجہ نے خوش خبری سنائی :-

"صوفی تمکین آئے تھے میں نے واپس لوٹا دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔"

"مگر وہ کہہ گئے ہیں کہ تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔"

"کھد بیا ملا دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ کفن دفن کے لئے چندہ مطلوب ہے۔ پھر شاید وہ دُم دبا کر بھاگیں۔"

"ہم اتنے بے وفا نہیں ہیں مُلا بھائی" صوفی تمکین کی آواز سنائی دی۔ مجھ بدبخت نے دروازے کی چوکھٹ ہی پر چیخ کھولدی تھی۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا — "تمھارے سر کی قسم مر کر دیکھو۔ کفن کے لئے بہت بڑھیا لٹھا ہم خود دلائیں گے۔"

میں مڑا۔ وہ کھلے پڑے تھے۔

"یار مبارک ہو۔" انھوں نے مجھے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا "کریمن بائی کی منظوری آ گئی ہے۔ مس بہار بیگم کو بھی ساتھ لا رہی ہیں۔"

"منظوری کے بچے آہستہ!" میں نے دانت کٹکٹائے۔

"چلو بیٹھک میں مرو۔"

"ارے تو کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔ جلدی سے چائے وائے لے آؤ پھر درگاہ چل رہے ہیں۔ شاہ صاحب تمھارے منتظر ہیں۔"

"میرے کیوں منتظر ہیں؟"

"عرس کا بہت سا انتظام تمھارے ہی سپرد کرنا ہے ہو یار بڑے خوش قسمت۔ ہم نے شاہ صاحب سے کہا تھا کہ ابھی ہمیں انتظام کرنے دیجئے مگر وہ تو تم پر فدا ہیں۔ استقبالیہ بھی تم سے ہی لکھوائیں گے۔"

"استقبالیہ؟"

"ہاں یار۔ اب کی خواجہ نقی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ مس بہار بیگم کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا جائے۔ آئینہ جگمگاتا

بھی منگوالیا گیا ہے۔"

"میں بے حد مصروف ہوں۔ تم میری طرف سے کہدینا کہ بجائے استقبالیہ کے حافظ کی کوئی پھڑکتی سی غزل یا عمر خیام کی دو چار رباعیاں فریم کرا کے پیش کر دیں۔"

"جو کچھ بھی مشورہ دینا ہو تم ہی چل کر دو۔ عرس کے دن ہی کے رہ گئے ہیں۔"

"بھائی تمکین۔ تم نہیں جانتے آج کل میں کس مصیبت میں ہوں۔ زمین سخت آسمان دور۔ چائے کی بھی امید مت رکھو بجٹ فیل ہو چکا ہے۔"

"کمال کرتے ہو۔ کونسا ہم مرغ پلاؤ مانگ رہے ہیں۔ دیر نہ کرو۔ حلوہ انڈا سب چل جائے گا۔"

"چھچھوندر کے انڈے بھی کھائے ہیں جناب والا نے۔"

"سب کھائے ہیں۔"

"اور چوہے کا حلوہ؟"

"وہ بھی کھایا ہے ــــ ہم تمہارے جھانسے میں آنے والے نہیں۔ چائے تمہاری زوجہ بڑی عجیب بناتی ہے۔ ہماری زوجہ پر تو خدا کی پھٹکار ہے۔"

"غنیمت سمجھو کہ خدا کی پھٹکار ہے۔ میری زوجہ پر تو شیطان کی پھٹکار ہے۔ چائے کو کہو تو پھنکنی مارنے دوڑتی ہے۔ انڈے اور حلوے کا تو نام ہی سنکر چمٹا کھینچ مارتی ہے۔"

"ہاں ہاں ایسے ہی نیک ہو تم۔ جاتے ہو یا ہم خود بھابی کو پکاریں۔"

"وہ بہری بھی ہو گئی ہے۔"

"تم ہو گئے ہوگے بہرے۔ اچھا ہٹو۔ ہم آزمائے لیتے ہیں ــــ"

یہ کہہ کر وہ بند کواڑ کی اوٹ میں پہنچے۔ میں نے بھی غنیمت جانا کہ وہ خود کہہ سن لیں۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں تھے جن سے زوجہ کی خدمت میں ناشتہ کی درخواست پیش کرتا۔

"بھابی صاحبہ السلام علیکم" وہ بہ آواز بلند شروع ہو گئے "چائے ذرا جلدی بھجوا دیجئے۔ ملا بھائی کو ہمارے ساتھ ایک ضروری کام جانا ہے۔"

"بھجوا رہی ہوں آپ تشریف رکھیے۔ اور انھیں ذرا ادھر بھیج دیجئے۔" زوجہ کا جواب آیا۔

"جاؤ پیارے دغاباز۔" صوفی تمکین کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ میں گردن لٹکائے اندر پہنچا۔ ذہنی کیفیت اس بچے سے مختلف نہیں تھی جو کئی دن کی غیر حاضری کے بعد استاد کے آگے پہنچتا ہے۔

"اب یہ بھی ہوا کرے گا؟" زوجہ نے دبی آواز میں کہتے ہوئے مجھے گھورا۔ تیور غصے کے تھے مگر آنکھوں میں تبسم کی بھی جھلک نظر آتی۔

"مجھ پر مطلق ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ تم بھابی دہ جیٹھ چائے کی پتی نہ ہو تو مراد آبادی تمباکو جھونک دو۔ دودھ نہ ہو تو چوہے کا گھولن ڈال دو۔ شکر کی جگہ نمک بھی چلے گا۔ حلوہ گلاب کے پتوں کا بھی بن سکتا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔"

اس نے بات نہیں کاٹی بس ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی دیکھتے دیکھتے آنکھوں کا تبسم چہرے پر پھیل گیا۔ میں اپنی بکواس کا مطلب خود بھی کم ہی سمجھا تھا۔ وہ آخر کار بولی۔

"جائیے باہر بیٹھئے۔ میں کچھ نہ کچھ کرتی ہوں۔"

اور پندرہ منٹ بعد ہمیں نہ صرف چائے مل گئی تھی بلکہ سوجی کا حلوہ بھی ساتھ تھا۔ انڈوں کا خلا نمکین بسکٹوں نے پر کر دیا تھا۔ صوفی صاحب چٹخارے لیتے ہوئے بولے۔

"کاش ہمیں بھی ایسی بیوی ملتی۔ قسم قرآن کی ایسی منحوس پلے پڑی ہے کہ جی چاہتا ہے اس کے اینٹ ماریں یا اپنے اینٹ ماریں۔"

"تو طلاق دے کر دوسری جو کر لو۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ بدبخت کو دس دفعہ طلاق دی مگر بکواس کیئے چلی جاتی ہے کہ میں نہیں مانتی طلاق۔ بتاؤ کیا کریں۔"

"گھر سے نکال دو۔"

"وہ الٹا ہمیں گھر سے نکال دے گی۔ پٹھانی ہے۔

ایک دفعہ ہم نے غصہ میں آکر دھپ رسید کردیا تھا۔ اس مردود نے پیتل کا بٹہ پھینک مارا۔ وہ تو کہو ہمارے بازو ہی پر لگا ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا۔ دراصل وہ وہابی خاندان سے ہے۔ کہتی ہے کہ عرسوں میں رنڈیوں کا ناچ کیوں دیکھتے ہو۔ سور کی بچی کو ہزار سمجھایا کہ وہ رنڈیاں نہیں ہوتیں نانِ عاشقانِ اولیاء ہوتی ہیں۔ گلزارِ تصوف کی تتلیاں ہوتی ہیں۔ دریائے طریقت کی مرغابیاں ہوتی ہیں مگر الٹی کھوپڑی جوٹھیری۔ بکے چلی جاتی ہے کہ مجھے پاگل مت بناؤ میں خوب جانتی ہوں تم صوفیوں کے لچھن۔"

"خدایا —— تصوف پر ڈائرکٹ حملہ" میں تشویش آمیز لہجے میں کراہا۔

"ارے وہابی کیا جانیں تصوف۔ اسی بات پر تو ہم نے دھپ مارا تھا کہ مزاروں کی شان میں اناپ شناپ بکے چلے جارہی تھی۔"

"تم اخبار میں جو طلاق نکلوادو۔"

"نہیں یار۔ اس شیطان زادی نے تیزاب کی بوتل منگاکر تالے میں سینت لی ہے۔ کہتی ہے اب کی طلاق دے کے دیکھو بوتل تمہارے سر پر توڑدوں گی پھر چاہے پھانسی ہی لگ جائے۔"

صوفی نمکین کا کمال یہ تھا کہ کہہ بھی رہے تھے اور کھا بھی رہے تھے۔ میں پورے انہماک سے ان کی دل گداز آپ بیتی سنتا رہا تھا اور وہ ماکولات کی صفائی کرگئے تھے۔ میں اگر احتجاج کرتا تو شاید وہ یہی کہتے ھٰذا مِن فضلِ ربی۔

کریمن بائی مس بہار بیگم اور استقبالیہ وغیرہ کے بارے میں درگاہ تنبورے شاہ کے محترم سجادے شاہ بریانی سے کیا گفت وشنید ہوئی اس کا انکشاف مفادِ عامہ کے خلاف ہوگا اس لئے ان رازہائے سربستہ کو اپنے ہی تک محدود رکھتے ہوئے آپکو عنایت منزل کی طرف لے چلتا ہوں۔

وہاں میں اس غرض سے پہنچا تھا کہ کچھ بھی ہو اصل حقیقت ظاہر ہی کرکے رہوں گا۔ مگر وہاں مسٹر جمشید مع اہلیہ جلوہ طراز تھے۔ مسز جمشید آپ کے لئے نئے ہوں مگر میرے لئے نئے نہیں تھے۔ وہ اور ان کی اہلیہ مجھے اس وقت سے جانتی ہیں جب عصری خ کی درگاہ میں خواجہ کھڑے بڑے رحمۃ اللہ علیہ کی سلور جوبلی منائی گئی تھی۔

برآمدے میں رکھے سب کافی اُڑا رہے تھے۔ نشست یوں تھی کہ مسز جمشید اور سیٹھ عنایت میز کے ایک طرف۔ زروبی اور مسٹر جمشید مقابل کی کرسیوں پر گویا وقتی طور پر جوڑے بدل کر ملنکا سا رومان پیدا کیا گیا تھا۔ میرے لئے ملازم نے پانچویں کرسی ڈالی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد مسز جمشید بولیں۔

"ویل ملا۔ تم آج کافی دیر میں دکھائی دئیا مگر" یہ ان کا مرغوب طرزِ گفتگو تھا۔ ہوسکتا ہے انکی والدہ انگلو انڈین رہی ہوں۔ وہ بہرالحال عجیب الطرفین تھیں۔ مگر ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا بچپن ہانگ کانگ میں گذرا ہے اس لئے گفتگو ہندوستانی لب ولہجے میں نہیں کرنی چاہیئے تھوڑا سا ولائتی پنچ فضا میں رومان کا رس گھول دیتا ہے یہ عقیدہ انھیں شاید وراثت میں ملا تھا اور مسٹر جمشید بھی ان کے عقائد میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ عمر پینتیس رہی ہوگی۔ خال وخد زیادہ دلکش نہیں تھے لیکن رنگ گورا تھا جس میں سرخی کی آمیزش تھی۔ میک اپ سے کبھی غفلت نہیں برتتی تھیں۔

"غنیمت جانئے محترمہ کہ ہم دکھائی دیتا لگتا ورنہ حالات تو ایسے دردناک ہیں کہ ہم دنیا سے غائب ہوجانا مانگتا۔"

سب ہنس دیئے۔ یہ اچھی بات تھی کہ مسز جمشید اپنے انداز کی نقل پر برا نہیں مانتی تھیں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ زروبی باوجود ہنس پڑنے کے برا مان گئی

"اچھے تو لگتے نہیں نقل اتارتے ہوئے۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔

"یہ نقل نہیں ہے شہزادی صاحبہ۔ محترمہ مسز جمشید کو دیکھ کر میں واقعی اپنی مادری زبان بھول جاتا ہوں۔"

اس پر بھی مسکراہٹیں ابھریں مگر زوبی کا چہرہ کشیدہ ہو گیا۔ وہ کافی کی پیالی کو پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"تم مجھ سے فضول باتیں مت کیا کرو۔ شہزادے ہو گے خود تم۔"

انداز دس برس کی بچی کا سا تھا۔

"مجھے چائے چاہیئے۔ کافی میرے بس کا روگ نہیں۔" میں نے موصوفہ کو اس انداز میں دیکھا جیسے ان کا کلام بلاغت نظام سنا ہی نہ ہو۔

"دیہاتی جو ٹھہرے۔ کون بنائے گا آپ کے لئے چائے۔ حلیمہ تو بازار گئی ہے۔"

"پھر میں خون کے گھونٹ پینے پر قناعت کر لوں گا۔"

"نونسینس ملا۔ تم کافی کی موجودگی میں چائے مانگتا۔ الدم کا فدی کا مالک۔" مسز جمشید نے لہجے میں تحیر شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہوٹل سے منگائے لیتے ہیں۔ کیوں کیا رائے ہے۔" سیٹھ عنایت نے زوبی کی طرف دیکھ کر استفسارانہ انداز میں فرمایا۔

"دھر لے پاس ہوٹل بھی کو مصیبت بھرنی پڑے گی۔ خدا جانے لوگ گھر سے چائے پی کر کیوں نہیں آتے۔" زوبی جلا بھی گئی تھی مگر اٹھ بھی گئی تھی۔

"میں آپ کے ہاتھ کی چائے پسند نہیں کرتا۔ کیا فائدہ گھولن زہر مار کرنے سے۔" میں نے زوبی کو ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا۔

"تم دونوں تو خوامخواہ کر لڑا کرو۔"

سیٹھ عنایت نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ "چھوڑو ڈارلنگ۔ میں گاڑی بھیج کر منگوائے لیتا ہوں۔"

"ایسی تیسی۔ میں دیکھتی ہوں یہ کیسے نہیں پیتے میرے ہاتھ کی چائے۔ مٹھی بھر نمک ڈالوں گی۔" وہ تیز قدموں سے کچن کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ حاضرین بے تمکین نے مشترکہ قہقہہ اچھالا۔

"تم بڑا نالائق آدمی ہونا مانگتا ملا۔" مسز جمشید نے میری کمر پر ہلکی سی تھپکی لگائی۔

"چھوٹا نالائق کون ہے یہ بھی وضاحت ہم آپ سے چاہنا مانگتا۔" میرا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا کیوں؟ یہ تو خدا ہی جانے۔

"اچھا عزیزم۔ مذاق ملتوی۔ تمھیں ایک بار پھر رجولی جانا ہے۔" سیٹھ میری سمت دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

"میرے فرشتے بھی نہیں جا سکتے۔ اب کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"ڈیئر جمشید کو بھی چادر چڑھانی ہے۔"

"کیوں چڑھانی ہے۔" میرا لہجہ خراب ہی تھا۔

"شدید ضرورت ہے۔" یہ کہتے ہوئے سیٹھ نے مسز جمشید کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ارے ملا بیٹے سے کیا پردہ۔" مسز جمشید شفقت بھرے انداز میں بولے پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

"تمھیں عزیزم یہ سنکر افسوس ہوگا کہ پچھلے چند مہینوں میں مجھے زبردست لاس ہوا ہے۔ جس گھوڑے پر داؤ لگایا وہی ہر دوڑ ہار گیا۔ اب ایک لمبا داؤ ڈمپل دی گریٹ پر لگانے جا رہا ہوں۔ اس دفعہ مجھے جیتنا ہی چاہیئے ورنہ تباہی آجائے گی۔"

"مجھے ریس سے دلچسپی نہیں۔ اور کوئی موضوع چھیڑیئے۔"

"موضوع کے بچا۔ تم سے مشورہ نہیں لینا ہے۔" سیٹھ غرائے "ڈمپل کی کامیابی کے لئے چادر

لتے ہیں اور یہ تم ہی چڑھا کر آ رہے ہو۔"

"میں نے کبھی چادر نہیں چڑھائی۔ وہ تو آپ کو
کا دیا تھا۔ تمھارا حافظ بجا مرہ لیکر رفو چکر ہو گئے
ی اُدھار بک گئی۔ سو کا نوٹ یہ رہا میری
میں۔" فوراً ہی میں نے نوٹ نکال کر آگے
یا۔ سیٹھ بس ہنس دیتے۔ ظاہر ہے انھوں نے
ہی سمجھا تھا۔

" نوٹ جیب میں رکھ لو۔ تمھاری یہی تو ادائیں دل
ب جاتی ہیں۔ موسم بڑا اچھا ہے گاڑی لیکر
نکل جاؤ۔"

"خدا تجھے بھی اور موسم کو بھی غارت کر دے۔
ر آپ ہی دونوں حضرات کیوں نہیں چلے جاتے"
نے سر اور مسز جمشید کی طرف رخ موڑا۔

"ہمیں چلنے میں کوئی عذر نہیں" سر جمشید بولے
تمھارے ہاتھ بر کتی ہیں۔ اُفوہ۔ سنیما والی زمین
ت کو ملنے کے بھلا کیا امکانات تھے۔ پھر دیکھ لو
ئی۔ ہم نے بھی سبز ہی رنگ کا ٹیری کاٹ خریدا

"کڈ ونیس۔" مسز جمشید کھلکھلائیں "ہم بھی چلیں گے
ہونا مانگتا۔"

"میرا ہارٹ فیل ہونا مانگتا" میں جھلّایا "پتا
آپ لوگ کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھ کر بھی
دقیانوس کیوں ہیں۔ مردے رلیں جتوائیں گے
ر کر لینا پاگل پن کے علاوہ اور کیا ہے۔"

استنے میں زوبی طلوع ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک
چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ ٹرے میز
دی گئی۔ زوبی نے مجھے تحکمانہ لہجے میں مخاطب

"چلو بیٹو — ساتھ میں کچھ کھانے نہیں دوں
یہ ناشتے کی پلیٹیں اٹھالے جا۔" کریمے
ل میں دیر نہیں کی۔ مجھے اور دوسروں کو یقین

تھا کہ چائے کے پانی میں کئی اونس نمک ضرور جھونکا
گیا ہو گا۔ بعید نہیں پسی ہوئی مرچیں بھی گھول دی
گئی ہوں۔ مجھے جھجکتا دیکھ کر زوبی نے جلدی سے
خود ہی پیالی تیار کر دی۔ میں نے ڈرتے سہمتے اٹھا
کر ہونٹوں سے لگایا۔ خدا کی شان ہے نہ نمک نہ
مرچ۔ اعلیٰ درجے کی خوش ذائقہ چائے تھی۔ مجھے
پل بھر کو تحیر ہوا۔ مگر شکریہ ادا کرنے کے بجائے میں نے
برا سا منھ بنایا اور اُبکائی لی۔

"کیوں اس پر ظلم ڈھاتی ہو" سیٹھ نے
زوبی سے کہا۔ لہجہ بڑا ترحم آمیز تھا۔

"اے ڈرٹی بائے۔ پیچھے ہٹو۔ تم تو شاید قے
کر دینا مانگتا۔" مسز جمشید نے کلکاری مارتے ہوئے
اپنی کرسی پیچھے سرکائی۔ وہ میرے بگڑے ہوئے منھ
کو دیکھ کر خود بھی منھ بگاڑ رہی تھیں۔

"نہیں ہم قے کرنا نہیں مانگتا چاہے دل جگر
سب کٹ کر اندر ہی اندر بہہ جانا مانگتا۔" یہ کہتے
ہوئے میں نے پوری پیالی ڈھکوس لی۔ "ایک پیالی
آپ بھی لیجئے محترمہ۔" میرا تخاطب مسز جمشید سے تھا

"نہیں مانگتا۔ او شیطان۔ یہ اب تم اور کیا
کرنا مانگتا۔" وہ مجھے مزید پیالی تیار کرتے دیکھ کر
باریک آواز میں چیخی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ شاندار چائے کی دو پیالیاں میں نے
مکمل تجوید کے ساتھ غاغو کر کے معدے میں اتاریں
زوبی ابھی تک بیٹھی نہیں تھی۔ کھڑے کھڑے میری
طرف اس طرح دیکھے جا رہی تھی جیسے میں نے گھونٹ
بھرنے تأمل کیا تو سر پر دو ہتھڑ بجا دے گی۔ وہ شاید
نیم پاگل تھی! سیٹھ اور سر جمشید اس لا یعنی قسم کے
منظر کو خدا ہی جانے کس نقطۂ نظر سے دیکھ رہے
ہوں گے۔

بہر حال کریمے نے چائے کے برتن سمیٹے۔ وہ
ناشتے کے برتن رکھ کر واپس آگیا تھا۔

"یہ برنس رکھ کر مٹھائی کے ڈبے گاڑی میں رکھ دو۔" سیٹھ نے کریسے کو آرڈر دیا "سبز رنگ کا ایک تھال ہال کمرے کی گول میز پر رکھا ہے وہ بھی گاڑی میں جائے گا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں محترم قبلہ۔ آپ کی چادر اور مٹھائی درگاہ تک نہیں پہنچی تھی۔" میں نے چہرے پر کمال درجہ متانت پیدا کرتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں نہ پہنچی ہوگی —— تم کھڑے ہو۔ ڈیر جمشید تمھارا جانا ضروری نہیں۔ کیا بھول گئے تمھیں مرزا کاؤس سے ملنا ہے۔"

"ضرور چلنا مانگتا۔" مسز جمشید چہکیں "اٹھو ڈارلنگ۔" یہ فقرہ انھوں نے شوہر نامدار سے کہا تھا۔

"نہیں" سر جمشید نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا "گیارہ بجے مرزا کاؤس سے ملنا ہے۔ ڈمپل دی گریٹ پہلے انھیں کے پاس تھا۔ ملاّ بیٹا تم ہی ہو آؤ۔"

"ضرور ہو آؤں گا۔ مگر آپ کوئی درخواست تو کٹورے شاہ رضی اللہ عنہ کے نام لکھ دیں۔ انھیں آخر کیسے معلوم ہوگا کہ ڈمپل دی گریٹ کو جتانا ہے فرض کیجئے انھوں نے پھلکڈ یا فرنٹیر کو جتا دیا۔"

"اوہ —— تم تو کہہ رہے تھے مجھے ریس سے دلچسپی نہیں۔ گھوڑوں کے یہ نام کیسے معلوم ہوئے؟" سر جمشید تعجب سے بولے۔

"مرشد رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان۔ میرے جنت مکانی شیخ ہر مناسب موقعہ پر مجھے الہام سے نوازتے رہتے ہیں۔"

"بیٹا ڈیر! پھر تو وہ یہ بھی بتا سکیں گے کہ اب کی کونسا گھوڑا جیتے گا۔" سر جمشید کا لہجہ لجاجت آمیز تھا۔

"یہ پہاڑیا ہیں چچے۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔" نروبی تڑخ کر بولی تھی۔ خدا جانے وہ جھلّا کیوں گئی تھی۔

"مگر پھلکڈ اور فرنٹیر تو شریک ہو رہے ہیں اس ریس میں —— ملاّ بیٹے مذاق مت کرو۔ کیا واقعی کچھ الہام وغیرہ کا معاملہ ہے۔" سر جمشید سراپا شوق بن گئے تھے۔

"کیوں نہیں ہے۔ مجھے یہ تک بتا دیا گیا ہے کہ سیٹھ فقیر داس کا ٹموٹا اس ریس میں ٹھوکر کھا کے جاکی کو گرا دے گا۔ جاکی مر جائے گا پھر ٹموٹا کو بھی گولی مار دی جائے گی۔"

"او ملاّ ڈارلنگ تم تو بڑا کام کا آدمی نکلنا مانگتا۔" مسز جمشید نے کرسی میرے بالکل ہی قریب سرکالی "اپنے کو اتنے دن سے لاس ہی لاس چل رہا ہے تم نے کبھی اپنا الہام سے ہمارا مدد نہیں کرنا مانگتا۔"

"ہمارا الہام کبھی کبھی اوندھا بھی ہو جانا مانگتا۔ لعنت بھیجئے۔ آپ لوگوں کے لئے کٹورے شاہ ہی ٹھیک ہیں۔ تو سہی وہ درخواست۔"

"درخواست کی ضرورت نہیں ہے۔" سیٹھ نے لقمہ دیا "خواجہ نور الٰہی صاحب کہہ رہے تھے کہ اولیا اللہ کو سب کچھ پتا رہتا ہے۔ وہ چادر چڑھانے والے کی دلی مراد کو آپ سے آپ جان لیتے ہیں۔ ہم نے کونسی درخواست لکھی تھی۔"

"اور کیا اولیا ہی جو ٹھیرے۔" سر جمشید نے زوردار تائید کی "ویسے تو ہم درخواست بھی لکھے دیتے ہیں۔" انھوں نے جیب سے قلم نکالا کاغذ بھی فوراً مہیا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ذیل کی درخواست تیار تھی۔

"اے ولیوں کے ولی۔ پیروں کے پیر۔ دستگیر عالمگیر۔ جناب کٹورے شاہ راضی باللہ فانی فی اللہ باقی باللہ۔ میں سر جمشید سن آف رستم جی مرغی والا آپ سے درخواست کرتا ہے

کہ اب کی ریس میں ڈمپل کو جتا دیجئے۔ میں زندگی
بھر آپ کا غلام رہوں گا۔ میری مسز کی طرف سے
بھی درخواست کا مضمون واحد ہے۔" فقط
والسلام۔ خاکسار مسز جمشید۔
مضمون کی ہم سب نے تعریف کی۔ بس زوبی کی کمان
ھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں وہ اندر ہی اندر کیوں اینٹھ
ہی تھی۔ دفعتاً مسز جمشید ٹھنٹھنائیں۔
ڈارلنگ۔ چلو نا ہم بھی چلیں۔ ہارٹ جانے کو
تا۔ زوبی ڈیر تم بھی چلنا مانگوٹ"
"نہیں مسز جمشید" سیٹھ معذرت کے لہجے میں
ے "زوبی کو مسز جمشید کے ساتھ مرزا کاؤس سے
نے جانا ہے۔ آپ جانا چاہیں تو ملا کے ساتھ چلی
ں۔ شام تک تو لوٹ ہی آنا ہے۔"
"میں آج کہیں نہ جا سکوں گی۔" زوبی جھلائے
ئے لہجے میں بولی "سر میں شدید درد ہے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈارلنگ۔ مرزا کاؤس
ت برا مانیں گے۔"
"پھر آپ بھی ساتھ چلیں۔" زوبی نے کہا۔
"بھول گئیں۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ آج میرے
اپائمنٹ ہیں۔ تم تو مرزا کاؤس سے ایک بار مل
چکی ہو۔ کس قدر شاندار آدمی ہیں۔ تمھارے تو
ے ہی مداح ہیں۔"
زوبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ بنا کر رہ گئی۔
الٹ پلٹ کر بات یوں بنی کہ اور سب اپنے اپنے
جائیں گے مسز جمشید میری چھاتی پر مونگ دلیں
وہ تیز قدموں سے چل کر پہلے ہی گاڑی کی پچھلی
ٹ پر فروکش ہو گئی تھیں۔ میں نے بہت کہا سنا
برے ساتھ ان کا جانا مناسب نہیں مگر کوئی
ائی نہیں ہوئی۔ زوبی کے ہونٹوں کو دفعتاً
تالا لگ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب
نا اب روئی۔ پھر وہ میری رخصت سے پہلے ہی

اندر چلی گئی۔ چند منٹ بعد سیٹھ بھی اندر گئے۔
"جاؤ بیٹے۔ شاباش" مسز جمشید نے میری کمر پر
تھپکی دی "مگر گاڑی ذرا سنبھال کر چلانا۔ اور دیکھو
سنو۔" یہ کہہ کر وہ میرے بالکل قریب آ گئے اور
رازدارانہ لہجے میں بولے۔
"یاسمین ذرا کریک ہے۔ وہ جہاں بھی کوئی بیوٹی
فل منظر دیکھے گی ضرور کہے گی کہ گاڑی روک کر کچھ
دیر یہاں رکو۔ خبردار اس کے کہنے میں نہ آنا۔ کم سے
کم جاتے ہوئے تو کہیں رکنا ہی مت۔ چادر چڑھ
جائے بس پھر کوئی بات نہیں۔ یہ لو۔ سو روپے سجاد
صاحب کے۔"
"میرے بہت ہی محترم بزرگ۔ آپ انھیں روک
ہی کیوں نہیں لیتے۔ کیا آپ کا حکم وہ ٹال سکتی ہیں"
"بیٹے۔ یہی تو تم نہیں سمجھتے۔ جب بیوی کی
عمر شوہر سے بہت کم ہو تو وہ بیوی نہیں شوہر ہوتی
ہے۔ جاؤ خدا حافظ۔"
میں کاٹھ کا اُلّو بلکہ حکم کا غلام شاید مالیخولیا کے
زیر اثر حرکت و جنبش کر رہا تھا۔ یا مرشد کا نعرہ مار کر اسٹیرنگ
وہیل کے آگے جا بیٹھا اور دروازہ اس زور سے بند کیا
کہ بے حیا نہ ہوتا تو ٹوٹ ہی جاتا۔
چار ہی میل کے فاصلے پر ایک تالاب تھا۔
کنارے پر پیڑوں کا جھنڈ اور اس کے پس منظر میں
بڑا سا ٹیلا۔ ایسے منظر دلکش ہوتے ہی ہیں۔ مسز جمشید
یعنی یاسمین صاحبہ کلکاری مار کر بولیں۔
"ملا دی گریٹ۔ تھوڑا منٹ یہاں رک جانا مانگتا
ونڈر فل آرٹ آف دی نیچر۔"
"بریک فیل ہو جانا مانگتا محترمہ مکرمہ۔ آپ
گدی سے ٹیک لگا کر سو ہی جائیے۔"
"نانسینس۔ کیا کہا بریک فیل ہو جانا مانگتا۔ ائی
گارڈ اب کیا ہونا مانگتا۔"
"ہم دونوں جہنم میں جانا مانگتا۔ آپ کا سیٹھ ہو"

ہونا مانگتا اور ہمارا ولف کسی یتیم خانے میں داخلہ لینا مانگتا۔"

"تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ گاڑی ہلکی کرو۔" ان کی آواز میں خوف کی لرزش تھی شاید اسی لئے خالص مادری بول گئی تھیں۔

"کیسے ہلکی کردوں۔ بریک کام نہیں کرنا مانگتا۔ ویسے گھبرائیے نہیں کٹورے شاہ کی درگاہ پر گاڑی آپ سے آپ رُک جائے گی۔ وہ اپنے مہمانوں کو بے سہارا نہیں چھوڑنا مانگتا۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں تو اگلی سیٹ پر آؤں گی۔"

"کیسے آئیں گی پھلانگ کر آ سکیں تو ضرور آئیے۔"

"ڈفر بریک پر اور زور دو۔ میں تمھارے سر پر دو ہتھڑ رسید کردوں گی۔"

"بسم اللہ۔ ہم دونوں شہید کٹورہ کہلائیں گے کیونکہ دو ہتھڑ کھا کر میرا دماغ عرشِ معلّی پر پہنچ جائے گا اور گاڑی سر کے بل رقص کرے گی۔"

"کباڑا کردیا تفریح کا۔ میں کتنے اچھے موڈ میں تھی۔"

"آپ کی اپر چیمبر شاید اوور لوڈ ہو گئی ہے۔ ذرا سوچا تو ہوتا کہ آپ کے ہسبنڈ نے اکیلے آپ کو ادھر کیوں روانہ کردیا۔"

"کیوں کردیا" وہ جیسے اچھل پڑی ہوں۔

"بہت بھولی ہیں۔ کیا زوبی کے حسن کا قصیدہ گا کر سناؤں۔"

"ایڈیٹ۔ حرام خور۔ اب بتا رہے ہو۔ لوٹاؤ گاڑی۔ کہیں سے بھی ٹرن لیکر لوٹاؤ۔"

"بریک اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔" میں نے گاڑی روک دی۔ "فرمائیے۔ نیچر کی گلگشت کرنا مانگتا یا بھاگم بھاگ سر جمشید کی خبر لینا مانگتا۔"

"سچ بتاؤ کیا زوبی خراب عورت ہے؟"

"عورتیں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ خراب۔ آپ اپنے شوہر کے بارے میں غور فرمائیں۔"

"انھوں نے کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی۔"

"کیا آپ ان کی دُم میں بندھی رہتی ہیں۔"

"کیا بکتے ہو۔ میں بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔"

"پھر آپ لوٹ ہی جائیں۔ مجھ پر کبھی کبھی بدتمیزی کا دورہ پڑتا ہے۔ کتے کی طرح کاٹنے دوڑتا ہوں۔"

"ہوش میں رہنا۔ کیسے لوٹ جاؤں کیا پیدل لوٹ جاؤں۔"

"ابھی اتنا ہوش تو ہے کہ آپ کو واپس چھوڑ آؤں ـــــ فرمائیے کہاں جانا مانگتا۔"

"وہ دونوں تو مرزا کاؤس سے ملنے جا بھی چکے ہوں گے۔ میں مرزا کاؤس کا گھر نہیں جانتی۔"

"عنایت منزل چلے چلتے ہیں۔ ممکن ہے ابھی وہ نہ گئے ہوں۔ یا چلے گئے ہوں تو سیٹھ عنایت سے مرزا کاؤس کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے۔"

"اچھا ایک منٹ ٹھیرو مجھے سوچنے دو۔" وہ گاڑی سے اُتر کر سہارہ لئے کھڑی تھیں۔ میں اپنی سیٹ ہی پر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دفعتاً اگلی سیٹ پر آلیں۔

"جہنم میں جھونکو۔ ہم بھی تفریح کرنا مانگتا جمشید کھوسٹ سے میں بعد میں نمٹ لوں گی۔"

"مم مگر محترمہ۔ مجھ پر دورے کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کم سے کم پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔"

"تم مجھ سے زیادہ طاقتور تو ہو نہیں۔ چانٹے مار مار کر منھ لال کردوں گی۔ چلو اسٹارٹ کرو۔"

"میں مرزا کاؤس کا آفس جانتا ہوں۔ وہاں سے ان کا گھر بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"کہہ تو دیا جہنم میں ڈالو۔ وہ کمینہ اگر زوبی کے ساتھ ہے تو میں تمھارے ساتھ ہوں۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں اس کی دُم میں تو بندھی نہیں رہتی۔ یہ سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ہم عورتیں بھی [illegible]

میں بدنام ہیں۔"

"محترمہ۔ آپ کے ہسبینڈ مجھے بیٹا کہتے ہیں گستاخی نہ ہوگی اگر میں آپ کو ماں کہوں۔"

اور اسی لمحے ایک زناٹے کا چانٹا میرے گال پر رسید ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ زناٹے کا زیادہ زور اسٹیرنگ وہیل پر منتقل ہوا ہو۔ کم سے کم ان کے لمبے ناخن تو میرے گال پر خراشیں ڈال ہی گئے تھے اور داڑھی کا شاید ایک دو بال بھی ناخنوں سے لپٹا چلا گیا ہو۔ میں ہکابکا رہ گیا۔ ان کی آنکھیں شعلہ ریز تھیں۔

"بڑی ظالم ماں ہو ——" میں بڑبڑایا۔ ایک چانٹا اور پڑا مگر اب میں ہوشیار تھا۔ تیزی سے پیچھے کو جھک گیا اور ان کا ہاتھ ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ چیخ نما سسکاری بلند ہوئی۔

"ذلیل۔ کمینے۔ سوور۔ تم مجھے گالی دیتے ہو۔ مار ڈالوں گی ——"

"اگر ماں گالی ہے محترمہ تو کیا بیٹی کہوں۔ بہن کہوں ——"

"بکواس بند کرو۔ مجھے فوراً میرے گھر پہنچادو۔ ڈیڈی ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ مولوی ملا خبطی ہوتے ہیں۔ جنگلی وحشی۔"

میری عقلِ گرامی ایڑیوں میں پہنچ کر گدگدی کررہی تھی۔ بجائے غصے کے مجھے زور سے ہنسی آئی اور پھر وہ عورت خدا کی پناہ۔ مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ دروازہ کھلا ہوتا تو باہر جا گرتا۔ میں نے کھٹاک سے دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگادی۔ مگر اس پر تو شاید جن سوار ہوگیا تھا۔ دوسری طرف سے گھوم کر میری طرف آئی۔ میں بھاگا تو اس نے ایک پتھر کھینچ مارا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ماں تو تمہارے باپ کی بھی نہیں ہوگی۔ مجھے ماں کہتا ہے سوور کا بچہ۔" لہجہ دیوانگی ہی کا تھا۔ پھر اس نے جھک جھک کر پتھر کنکر اٹھائے اور بوچھار شروع کردی۔ جمناسٹک کے باوجود ایک پتھر میرے بھونڈے پر اتنی زور سے لگا کہ نانی یاد آگئی۔ وہ یقیناً ہسٹریا کی شکار تھی۔ میں ایک درخت کی آڑ لیکر اس کی مذبوحی حرکات دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی سرگرمی کم ہوئی پھر دیکھتے دیکھتے وہ گری اور زمین پر پھیل گئی۔ میں دوڑکر قریب پہنچا۔ اینٹھ مروڑ میں اس کا چست لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں سانس تیز چل رہا تھا۔

اب کیا ہو۔ سڑک فی الحال سنسان تھی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھاکر پچھلی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی کچے میں اتار کر شہر کی طرف موڑ دی۔ کم بخت کہیں مرمرا گئی تو اور جان عذاب میں آئے گی۔ جس قدر جلد ہوسکے اسے زندہ عنایت منزل تک پہنچا دینا سخت ضروری تھا۔ اسی خیال سے میں نے پکی سڑک کا عام راستہ اختیار کرنے کے بجائے گاڑی داہنے ہاتھ اس کچی سڑک پر اتاری جس سے شہر کا فاصلہ ایک ڈیڑھ میل کم ہوجاتا تھا۔ اس پر عموماً مضافات کی بیل گاڑیاں چلتی تھیں تقریباً نصف میں کھڑنجا لگا تھا پھر یہ پختہ کردی گئی تھی چوڑائی اتنی نہیں تھی کہ دو گاڑیاں برابر سے گذر جائیں۔

ستارے جب گردش میں آتے ہیں تو آدمی دو کوڑی کا نہیں رہتا۔ سامنے ایک گڑھا آیا۔ میں بچتے کو اس سے بچا بھی سکتا تھا مگر جلد بازی کے جنون میں گھسائے لئے چلا گیا۔ دفعتاً انجن جدید شاعری کے انداز میں ملبلایا اور پھر بکے گانے کے سُر الاپنے لگا۔ گاڑی دھچکا کھاکر دم بخود ہوگئی اور بکے سُر ٹھمری میں تبدیل ہوکر نزع کی ہچکی تک جا پہنچے۔

یا پیرانِ پیر دستگیر۔ یا غوث الاعظم۔ شہر ابھی کافی دور تھا۔ بونٹ اٹھاکر میں نے مشین کا جائزہ لیا۔ جائزہ کیا لیا۔ جھک ماری۔ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ انجن مردود پر کس مرضِ خبیث کا حملہ ہوا ہے۔ سر درد کر رہا تھا۔ اسی وقت خون کی چند بوندیں ہاتھ پر ٹپکیں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ مسز جمشید کے ایک پتھر نے میرے ماتھے سے کیسا

شفقت بھرا سلوک کیا تھا۔ ہاتھ جو منہ پر پھیرا تو معلوم ہوا کہ داڑھی میں بھی خاصی چپچپاہٹ ہے۔ بونٹ کو کھینچ کر عقب نما آئینہ کے سامنے آیا۔ سبحان اللہ کیا بہار آرہی تھی روئے زیبا پر۔ خون کے کئی قطرے داڑھی میں الجھ رہے تھے۔ کئی پھیل کر خشک ہو گئے تھے۔ گال پر دھلال لکیریں تھیں۔ ماتھے کا زخم منہ چڑانے کے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ کئی سکنڈ اپنا ہی جلوہ دیدۂ عبرت سے دیکھتا رہا پھر معاً خیال آیا کہ کہیں میم صاحب ٹھنڈی ہو گئی ہوں۔ پلٹ کر پچھلی کھڑکی پر جھکا۔ خدا کا شکر ہے سانس آرہا تھا۔ چہرے پر زندگی کے آثار تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ منہ کی رال نے لپ اسٹک کو ٹھوڑی تک پہنچا دیا تھا۔ جی میں آیا گاڑی کو سر پر اٹھا کر ایک لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑا چلا جاؤں۔ منحوس سڑک کسی بدبخت بیوہ کی اجڑی ہوئی مانگ کی طرح سنسان تھی۔ دور دور تک آدم نہ آدم زاد۔ قریب کے ایک درخت پر بلبل بولی یا بولا۔ غالباً پیر رحمۃ اللہ کی غائبانہ توجہ سے میں اس وقت پرندوں کی بولی سمجھنے کی پوزیشن میں آگیا تھا۔ بلبل صاف کہہ رہی تھی یا کہہ رہا تھا —" اور چلاؤ داڑھی لگا کر گاڑی۔ اور چلاؤ داڑھی لگا کر گاڑی۔" آس پاس کوئی چھوٹا موٹا گھر بھی نہ تھا کہ مکینوں ہی کو مدد کے لئے پکارتا۔ بس ایک کھنڈر نما سا مکان تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلہ پر نظر آرہا تھا جس کی شکستہ حالی بتا رہی تھی کہ اُلّو اور چمگادڑ ہی اس میں چین کی بانسری بجا رہے ہوں گے۔ پھر بھی میں پگڈنڈی سے ہوتا ہوا اس تک پہنچ ہی گیا شاید کوئی مل جائے۔ مل جانے پر کس قسم کی مدد اس سے حاصل ہو سکے گی یہ بعد کا سوال تھا مگر توقع فضول ثابت ہوئی۔ کئی خستہ حال کوٹھریاں ویران پڑی تھیں۔ جھکی ہوئی چھتیں مسدس حالی پڑھ رہی تھیں۔ پتا نہیں کب کسی زمیندار نے یہ عشرت کدہ بنایا ہوگا — پگڈنڈی پر اپنے قدموں کے نمایاں نشانات چھوڑتا ہوا میں پھر گاڑی تک لوٹا۔ الٰہی کیا کروں۔ کس پتھر سے سر پھوڑوں۔ کیا انجام ہونا ہے مجھ سیاہ کار ناہنجار عصیاں شعار وغیرہ وغیرہ کا۔

مسز جمشید کو اب شاید ہوش آنے والا تھا۔ ان کے منہ سے ہلکی سی غرغراہٹ نکل رہی تھی۔ پپوٹوں میں بھی خفیف سی لرزش تھی۔ میں خالی الذہنی کی حالت میں انھیں تکے جا رہا تھا۔ (جاری)

جناب محمد عثمان فارقلیط کا اعترافِ حق

(یہ اعلانیہ فارقلیط صاحب کی طرف سے اخبار دعوت سہ روزہ ایڈیشن مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۶ء میں چھپا ہے)

پاکستانی اسمبلی نے ان طبقوں کو خارج از اسلام قرار دیدیا جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کسی نبوت کے قائل ہیں اس فیصلہ کی زد قادیانی حضرات پر پڑی۔ چند تعلیم یافتہ حضرات ایک طویل تحریر لے کر راقم کے پاس آئے اور اس کی اشاعت پر زور دیا، راقم نے اصل مضمون سے بہت کچھ حذف و ترمیم کے بعد مضمون واپس کر دیا جو ماہنامہ شبستان میں شائع کر دیا گیا۔ مضمون کے آغاز میں راقم نے لکھ دیا تھا کہ دانشوروں کے یہ خیالات اس لئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ علمائے کرام ان کا تسلی بخش جواب دیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ راقم کے اپنے خیالات محفوظ ہیں۔ راقم نے مضمون کا عنوان دانشوروں کے لئے چھوڑ دیا تھا، مگر وہ اس پر کوئی عنوان نہ لگا سکے اور ایڈیٹر نے غلطی سے اس پر میرا نام دیدیا اور لوگ غلطی میں پڑ گئے کہ اصل مضمون میری طرف سے شائع ہوا ہے۔

مضمون کے جواب میں دو اسلامی ماہناموں نے بہت کچھ لکھا۔ ماہنامہ تجلی دیوبند اور الفرقان لکھنؤ کے جوابات درست پائے گئے۔

۱۔ راقم کی اپنی تحقیق میں وہ احادیث بالکل صحیح ہیں جن میں مسیح موعود کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ایک امتی اور مجدد کی حیثیت سے ضرور آئیں گے۔ اس بارے میں میرے خیالات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خیالات سے الگ نہیں ہیں۔

۲۔ جو علماء بخاری اور مسلم کی ان حدیثوں کے منکر ہیں جن میں مسیح موعود کی آمد کا وعدہ دیا گیا ہے وہ تکفیر کی زد میں نہیں آتے۔ شیخ عبدہ مصری، سید رشید رضا مصری، شیخ شلتوت اور ہندوستان کے علامہ اقبال مرحوم کہ احادیث پر جرح کرتے اور انھیں مجوسی عقائد سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی علماء نے بھی تکفیر نہیں کی۔

غرض شبستان کا مضمون ایک الگ چیز ہے اور میرے خیالات کی حیثیت جداگانہ ہے۔

تجلی

اللہ کا ہزار شکر ہے کہ محترم فارقلیط صاحب نے غلط فہمیوں کو رفع کر دیا۔ یہ ہم بھی نہیں کہتے کہ جو علمائے حرمت علماء نزولِ مسیح والی روایات پر قواعدِ فن کے رُخ سے نقد کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں وہ کافر ہیں۔ نہیں، ایسے ہم اپنے نقطۂ نظر سے علمی مغالطہ کہیں گے مگر کفر و گمراہی کا فتوی نہیں لگائیں گے کیونکہ نہ تو وہ حدیثِ رسول میں رکیک تاویلات کے مجرم ہیں نہ انھوں نے اپنے نتیجۂ فکر کو کسی جدید نبوت کے فتنۂ خبیثہ کی بنیاد بنایا ہے قادیانی بھی اگر فنی دلائل پیش کر کے صرف یہ کہتے کہ ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰؑ وفات پاچکے اور اب انھیں نازل نہیں ہونا ہے تو ان پر خارج از اسلام ہونے کا حکم نہیں لگتا۔ مگر ان کی شرارت تو یہ ہے کہ فن کی روشنی میں نہیں بلکہ ایک باطل خواہش ور جحان کے اتباع میں وہ حیاتِ مسیح کا تو انکار کرتے ہیں لیکن نزولِ مسیح کی روایات کا انکار نہیں بلکہ ان کے مفہوم و مصداق میں صریح تحریفیں کر کے مرزا غلام احمد کو مسیح

ود بنا ڈالتے ہیں۔ جس قسم کی تاویلاتِ رکیکہ
قوں نے آیات و احادیث میں کی ہیں ان کی نظیر
ریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ وہ نصوص کو توڑنے مروڑنے
یں مضحکہ خیز اور نفرت انگیز حدوں تک جا پہنچے۔
ی لئے ان پر کفر ثابت ہوا!! اور علماءِ حق نے اس
ی نشاندہی کی۔

محترم فارقلیط صاحب کا اعلان مسرت بخش ہے
یکن ہم نے خط کے ذریعہ انھیں مشورہ دیا ہے نہ
یہ اعلان شبستان میں ضرور چھپنا چاہیے تاکہ ان تمام
لوگوں کی نظروں سے گذر جائے جو شبستان پڑھ کر
غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر وہاں نہیں چھپا
تو تلافی مافات نہیں ہوتی۔

اب صرف مولانا عبد الماجد دریابادی باقی
رہ گئے ہیں جو قادیانیت کے لئے "نرم گوشہ" رکھتے
ہیں۔ ان کی یہ روش اگرچہ بجائے خود کوئی اہمیت
نہیں رکھتی لیکن خود ان کی آخرت کے تعلق سے یہ بڑی
تخفوش ہے۔ وہ اگر علانیہ اعترافِ حق اور پچھلی تحریروں
سے رجوع کے بغیر رحلت کر گئے تو یہ ان کے بھی خواہوں
اور عقیدت مندوں کے لئے بڑا رنجدہ حادثہ ہوگا۔
ہم گنہگار بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔ ان جیسے جہاندیدہ
اور سرد و گرم چشیدہ بزرگ کو قائل کرنا ہماری دسترس
سے باہر ہے۔

کتاب	پیسے	روپے
مسند امام احمد کی شرح مسند ابوبکرؓ۔ غیر مجلد ۲۰/- مجلد	-	۲۲
اعمال قرآنی ضخیم ایڈیشن (رف کاغذ) کتابت و طباعت نہایت عمدہ مجلد ۔۔۔۔۔	-	۳
تفسیر و معجزات علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۔۔۔۔۔	۷۵	-
فارسی کی پہلی کتاب عکسی مع ٹائٹل ۔۔۔۔۔	۶۵	-
مفہوم القرآن پارہ الٓم ۔۔۔۔۔	۵۰	۴
ہمارا دینِ حق ۔۔۔۔۔	-	۳

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کی نئی تصنیفات

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہدِ کبیر سید احمد شہیدؒ اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز حالات، شروع میں سید صاحبؒ کی سیرت کا مکمل خلاصہ ہے اور اس کے بعد مختصر اور اثر انگیز واقعات۔ مولانا ندوی کے مؤرخانہ، ادیبانہ اور مجاہدانہ قلم سے۔ قیمت ـــــ بارہ روپے۔

پرانے چراغ

یہ کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا اشرف علیؒ مولانا حسین مدنیؒ، مولانا وصی اللہ فتحپوریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، ڈاکٹر فریدیؒ، ڈاکٹر سید محمودؒ اور مولانا شاہ معین الدین ندویؒ جیسے مشاہیر و اہلِ کمال کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ بہترین ادبی اسلوب کا نمونہ ہے جو دلچسپ، مفید اور اثر انگیز ہے۔ آخر جنوری تک منظرِ عام پر آرہی ہے۔

ذکرِ خیر

مولانا ندوی کی والدہ ماجدہؒ کے مؤثر حالاتِ زندگی جنمیں انکی تعلیمی و تربیتی خصوصیات، ذکر و عبادت و دعاء و مناجات کے شوق و انہماک کے واقعات ہیں جو عورتوں، مردوں، بیبیوں اور بچیوں سب کے لئے یکساں مفید و سبق آموز۔ قیمت صرف ـــــ تین روپے۔

مسئلہ تعدد ازدواج

اس اہم مسئلے پر ایک عرب فاضل شیخ عبدالعزیز القناعی کی نئی بحث قرآنِ حکیم اور عقلِ سلیم کی روشنی میں۔ قیمت صرف ایک روپیہ پچیس پیسے۔
انگریزی اعلیٰ طباعت ـــــ دو روپے۔

مکتبہ فردوس مکارم نگر (برولیا) لکھنؤ

قرآن اور تعمیر سیرت تعلیمات قرآن کا نچوڑ، تصوف اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ۔
ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ سات روپے ۷/۵۰

جائزہ تراجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے، اسکی
تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ ایمان افروز
اور معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ روپے ۶/-

غنیۃ الطالبین (اردو) مصنفہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
قیمت مجلد — تیس روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر
عبداللہ عنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخ اسلام
کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ ساڑھے سات روپے

اسلام اور ترقی مولانا اشرف علیؒ کے افادیت سے
لبریز ارشادات۔ ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ملک و ملت کی ایک ممتاز
شخصیت مولانا عبداللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح
العلوم متوفی ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی
کے زندۂ جاوید کارنامے اور اہل علم اور رہنمایان ملک و
ملت کے خراجہائے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے ۵/-

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند
کتاب کا ترجمہ اردو فارسی اور فرنچ
زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو
ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت — تیرہ روپے ۷۵ پیسے ۱۳/۷۵

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ معارف و اسرار ہدایات و نصائح
اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ
کی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے ۶/-

مناجات مقبول کریمی عکسی مولانا اشرف علی کی مقبول عام اور مفید ترین کتاب
پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت — چھ روپے
(مجلد — سات روپے)

رمضان کیا ہے؟ مولانا محمد عبداللہ دہلوی کے رشحات قلم۔ رمضان کے موضوع
پر خوب تر کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے ۳/-

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں اس میں بتایا گیا ہے
کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم
کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی
ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین
سے غافل نہیں کیا۔ (از قاضی مبارک پوری)
قیمت — ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰

التشرف تصوف کی معرفت میں مولانا اشرف علیؒ کی
معروف کتاب۔ قیمت — سولہ روپے ۱۶/-

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی
کے قلم سے ایک بصیرت افروز
معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت — دو روپے ۵۰ پیسے ۲/۵۰

بریلوی فتنے کا نیا روپ بریلوی مکتب فکر کے
اہل قلم جناب ارشد القادری
کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ۔ تحریف و تلبیس
کی نشاندہی۔ دلچسپ علمی و منطقی بحثیں۔ دستاویزی حقائق۔
کتاب کے فاضل مصنف جناب مولانا محمد عارف سنبھلی نے بڑے
دلکش اور فہمانہ انداز میں نقد و تعقیب کا فریضہ ادا کیا ہے۔
قیمت — پانچ روپے۔

حیات عبدالحیؒ مولانا علی میاں کے خامۂ زرنگار سے
ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت
کی ایک ایمان افروز سوانح۔ قیمت مجلد تیرہ روپے ۷۵ پیسے ۱۳/۷۵

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

کتاب	پیسہ	روپیہ
جنات کی دنیا مولوی مقبول سیوہاردی ...	-	۲
عملیات اور جادو 〃 ...	۵۰	۱
پودے یا جنگلی عنزارنے 〃 〃	۴۰	۱
سو برس پہلے کا ہندوستان 〃 〃	۵۰	۱
مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد مجلد	-	۲
تصوف کی حقیقت (شاہ ولی اللہؒ) ...	-	۲
جنت اور دوزخ (شاہ عبدالقادر جیلانیؒ)	۵۰	۱
مومن کی زندگی قرآن کی روشنی میں مولانا مودودی	۹۰	۱
تذکرہ شیخ الہندؒ مجلد	-	۵
کرامات صحابہؓ 〃	۵۰	۲
ایمان کیا ہے 〃	-	۲
سپاس نامے (مولانا محمد طیب صاحب کو پیش کئے گئے)	-	۲
اعجاز قرآنی یعنی بیماریوں کا قرآنی علاج	۵۰	۲
بازار رشوت قرآن و حدیث کی روشنی میں	-	۳
مفتاح عملیات یعنی عملیات کی کنجی	-	۸
آلات جدیدہ کے شرعی احکام	-	۴
عرفان عارف (مولانا محمد طیب کا کلام منظوم) ...	۵۰	۲
ایمان اور آزمائش	۴۰	-
اسلامی نظام ہی کیوں؟	۶۵	-
اپنی اصلاح آپ	۵۰	-
اسلامی خطوط نویسی	-	۱
ہمیشہ زندگی اسلامی نقطۂ نگاہ سے	۶۰	-
بدعت کیا ہے؟ مجلد	-	۲
بلاغ المبین	۵۰	۲
تعزیہ علمائے اسلام کی نظر میں	۵۰	-
تحریک وہابیت پر ایک نظر	۷۵	-
تفسیر سورۂ نور مجلد	۵۰	۵
تاریخ غلاف کعبہ	۵۰	-
قرآن پر ظلم (در رد بریلویت میں)	۵۰	-

کتاب	پیسہ	روپیہ
تزکیۂ نفس .... مجلد	-	۱
تقلید کیا ہے؟	۱	-
جماعت اسلامی پر لگائے گئے الزامات کا جائزہ	۵۰	۴
حسینؓ و یزید	-	۱
تصوف کیا ہے؟ (مولانا منظور نعمانی اور ابوالحسن علی ندوی) مجلد	-	۵
درس پیغمبر ...... مجلد	-	۶
ردِّ بدعت	-	۲
روحِ تصوف (از مولانا تھانوی)	-	۶
قرآن اور حدیث (از مولانا مودودی)	۵۰	۳
کیا ہم مسلمان ہیں؟ اول 〃	۵۰	۲
کیا ہم مسلمان ہیں؟ دوم 〃	-	۵
کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟ 〃	-	۵
کثرت آبادی کا علاج	۶۵	-
کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے؟	۳۵	-
کمیونزم یا اسلام؟	۶۵	-
مسجد سے میخانے تک اول مجلد	-	۸
مسجد سے میخانے تک دوم 〃	-	۹
ورق ورق روشن (معلومات کا خزانہ) مجلد ...	-	۳۰
مولانا مودودی اور تصوف 〃	۵۰	۳
مسئلہ قربانی علم و عقل کی روشنی میں	۹۰	-
مسئلہ تعداد ازدواج	۷۰	-
مولانا مودودی اور جماعت اسلامی اپنے علماء کی نظر میں	-	۳
تنبیہ الغافلین	۷۵	-
انکشاف (بجواب زلزلہ در رد بدعت میں)	-	۶
التکشف .... مجلد	-	۳۰
فتوح الغیب 〃	-	۶
شہدائے بدرؓ	-	۱
شہادت امام حسینؓ	۵۰	-
عورت کیا کچھ کر سکتی ہے مجلد	-	۳

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو-پی)

مولانا مودودی اور تصوف

کہا جاتا ہے کہ مولانا مودودی تصوف کے دشمن ہیں۔ اس الزام کی پوست کندہ حقیقت خود مولانا کی اپنی تحریروں کے آئینے میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ مولانا کس تصوف کے دشمن اور کس کے حامل ہیں۔ قیمت مجلد —— ساڑھے تین روپے ۳/۵۰۔

تاریخ الفخری

تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب جس کا ترجمہ اردو، فارسی اور فرنچ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت مجلد۔ تیرہ روپے ۱۳/۵۰ پیسے

سیرت خلفائے راشدین

خلافت راشدہ کے خصائص حقائق اور چاروں خلفائے راشدین کے تفصیلی حالات مصنفہ مولانا عبد الحئی۔ قیمت —— پانچ روپے۔

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ

معارف و اسرار ہدایات و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت —— پانچ روپے۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم کی چند تصانیف شرح و تسہیل کے ساتھ

قبلہ نما مجلد ۱۱/-
حجۃ الاسلام مجلد ۶/-
حکمت قاسمیہ ۳/-
انتصار الاسلام ۵/۵۰

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو.پی)

ایک مستند مفصل اور مشرح پرورد سیرت رسولؐ

سیرت حلبیہ (اردو)

اردو میں سیرت کی بہت کتابیں موجود ہیں جو اپنی جگہ بیش قیمت ہیں لیکن اب سے تقریباً تین سو برس پہلے ایک عالم علی ابن برہان الدین حلبیؒ کی سیرت حلبیہ اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے اس لئے جناب محمد اسلم قاسمی نے اس کے اردو ترجمہ کا اہتمام کیا اور کم استطاعت عوام تک پہنچانے کے لئے اسے قسط وار چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اب تک ۳۲ قسطیں چھپ چکی ہیں اور ہر دوسرے مہینے قسط آجاتی ہے۔

خریداری کا آسان طریقہ

آپ دو روپے بھیجکر ممبر بن جائیں۔ فوراً آپ کو پہلی دو قسطیں ڈاک خرچ معاف کر کے صرف آٹھ روپے کی وی پی سے بھیج دی جائیں گی۔ ہر دوسرے مہینے اسکی دو قسطیں اسی طرح پیش کی جائیں گی۔ ۳۲ قسطیں جو کہ موجود ہیں اس لئے آپ چاہیں تو ایک مدت میں دو سے زیادہ بھی طلب فرما سکتے ہیں۔ البتہ جب شائع شدہ قسطیں آپ تک پہنچ جائیں گی تو اس کے بعد ہر قسط دو ماہ بعد ہی حاصل کر سکیں گے۔

امید ہے کہ اہل ذوق اس سلسلے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے ناقد —— ۶/-
سوانح حضرت موسیٰؑ —— ۱/۲۵
سوانح حضرت عیسیٰؑ —— ۱/۲۵
سوانح حضرت داتا گنج لاہوریؒ —— ۱/۲۵
سوانح شیر شاہ سوری —— ۱/۲۵
گنجینہ اسرار (عملیات علامہ انور شاہ کشمیریؒ) —— ۲/-
تاریخ دیوبند (اضافہ شدہ) —— ۱۲/-
عقیدت کے پھول (مجموعہ نعت مختلف شعراء) —— ۲/-

صحت کا توازن...
اجزا آپ کے رگ و پٹھوں میں سرایت
ہو کر نئی جان ڈالتے اور چستی پیدا کرتے ہیں
ماء اللحم خاص
غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانک

MARCH
ماہنامہ
تجلّی
دیوبند
ایڈیٹر: عامر عثمانی
خدا سے ڈرو
پھر دوسرے خوف سے نجات مل جائیگی
تاریکیوں میں ایک چراغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا سے
بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔
بحرین۔ افریقہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک
پونڈ دس شلنگ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

چھبیسویں سال کا دسواں شمارہ

ماہنامہ
تجلی
دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی

فہرست مارچ ۱۹۷۵ء

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریدار نہ رہنا ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔
منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پروپرائٹر، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر
عامر عثمانی ولد مطلوب الرحمٰن
قومیت۔ ہندوستانی۔
میرے بہترین علم کے مطابق یہ تفصیلات صحیح ہیں۔
عامر عثمانی

سالانہ تیس روپے ——— فی کاپی دو روپے

سلوجی پریس۔ دیوبند

کھرا کھوٹا

آج ہم تجلی کے مخلص قارئین سے ایک مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ رسالہ کا کاغذ پچھلے سال جس قیمت پر ملتا تھا۔ اب اس سے تگنی قیمت ہو چکی ہے (بلیک میں نہیں بلکہ سفید بازار میں) اس کے بالمقابل تجلی کی قیمت ڈیڑھ روپے سے دو روپے کی گئی۔ گویا دگنی بھی نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے آمد خرچ کا توازن بگڑنا ہی چاہئے تھا۔ بگاڑ کو زیادہ دنوں تک برداشت کرنا اپنی ہی جڑیں کھودنے کے مرادف ہے اس لئے دو علاج فی الحال ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ قیمت فی پرچہ کم از کم ڈھائی روپے کر دی جائے دوسرا یہ کہ قیمت دو ہی روپے رکھتے ہوئے سولہ صفحات گھٹا دیئے جائیں۔

دوسری صورت بڑی تکلیف دہ ہے صفحات اب بھی مضامین کی نسبت سے کم ہیں۔ مزید کمی اور بھی دم گھونٹ دیگی اور افادیت بہت محدود ہو کر رہ جائے گی پہلی صورت آپ سے جس تعلق پر منحصر ہے۔ آپ بازار پر نظر ڈال لیں۔ اتنے صفحات کا کوئی پرچہ آپ کو دو روپے میں نہیں ملے گا۔ ہم عرصہ سے تجلی کی مالی بیماریاں تڑ تڑ دیکھ رہے ہیں اور سچ پوچھئے تو "کہانی نمبر" کو بھی اسی لئے "ملانے" کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ نمبر اگر سستا ترا ما چھپ گیا تو اور کے نقصان میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

لہٰذا آپ ہی مشورہ دیجئے کہ ہم کیا کریں۔ یہ تو بہرحال غلط ہو گا کہ ہم اور آپ تجلی کو گھل گھل کر مر جانے کی اجازت دیدیں۔ تدبیر ہم سب کا فرض ہے۔ نتائج بے شک اللہ کے ہاتھ ہیں۔

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں یقین ہے کہ یہ شمارہ آپ کو ٹھیک وقت پر یعنی مارچ کے پہلے ہفتہ میں مل جائے گا۔ آپ جس قدر جلد اپنی رائے اور مشورے سے سرفراز فرمائیں، اتنا ہی بہتر ہو۔ ملا ابن العرب مکی بھی کہانی نمبر کے سلسلہ میں شش و پنج پڑا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تجلی کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھے تو میں بھی چوکڑی بھروں۔

ایک اور بات بھی مشورہ طلب ہے "کہانی نمبر" کی ایک تو یہ صورت ہے کہ تجلی کے باقی اہم کالم شامل رہیں اور دوسری یہ ہے کہ تمام کا تمام "ملا" ہی پر مشتمل ہو۔ پہلی صورت میں ضخامت کافی بڑھ جائے گی کیونکہ نمبر کی رعایت سے کہانی کو بہرحال طویل ہونا ہے۔ ضخامت بڑھنے کا مطلب ہے قیمت میں اضافہ۔ اندازاً پانچ روپے تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ دوسری شکل میں اندازہ یہ ہے کہ تین روپے میں کام چل جائیگا سالانہ خریداروں پر تو دونوں ہی صورتوں میں کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن جو بے شمار شائقین ایجنٹوں سے پرچہ خریدتے ہیں انھیں اپنی رائے سے ضرور مطلع کرنا چاہئے۔ ہم چاہ رہے ہیں کہ "کہانی نمبر" اب زیادہ مؤخر نہ کیا جائے۔

افق میں نظر آنے والا بمبئی بحری جہاز سے کیسا لگتا ہے یہ بتانے کی چیز نہیں دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اونچی عمارتوں کے آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے پیش منظر میں جگ مگ کرتے ستارے جو سورج کی کرنوں اور پانی کی مضطرب لہروں کے اختلاط سے مسلسل بن بگڑ رہے تھے۔ سمندر کا کنارہ خوبصورت ہلالی خم لئے ہوئے۔ ملک ملک کے دیو پیکر جہاز ادھر ادھر لنگر ڈالے ہوئے۔ جیسے پہرے دار ایستادہ ہوں۔ پگھلی ہوئی چاندی جیسا غبار فضا میں لہریں لیتا ہوا۔ نہ جانے کتنی بار زبان پر فتبارک اللہ احسن الخالقین کے الفاظ آئے۔

صبح دس بجکر دس منٹ پر جہاز کنارے لگ گیا تھا۔ اب میں اور حفیظ صاحب دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے کہ سمندر میں ڈوبے بغیر گھر پہنچ جائیں گے موصوف نے خواہش ظاہر کی کہ گودی سے سیدھے ریلوے اسٹیشن چلیں۔ میں نے اسے مسترد کر دیا کیوں کہ کوئی بھی گاڑی ہمیں رات سے پہلے نہیں مل سکتی تھی اور سارے دن ریلوے اسٹیشن پر پڑا رہنا حماقت ہوتا۔ حفیظ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ضد نہیں کرتے ٹیکسی کے بجائے وکٹوریہ میں بیٹھ کر ہم نے ایم اے رحمت اللہ روڈ کا رخ کیا۔ وکٹوریہ کا انتخاب میں نے ہی کیا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت پہلے سے پسند ہے۔ اس پر بیٹھ کر کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے مغلیہ دور لوٹ آیا ہو۔ وکٹوریہ نام تو بعد کا ہے پہلے اسے بگھی یا شکرم کہا جاتا تھا۔ دو دو گھوڑے جتتے تھے۔ اب ایک ہی جتتا ہے ٹیکسی میں تو جب چاہے جہاں چاہے بیٹھ جاؤ مگر وکٹوریہ سوائے بمبئی کے کہاں نصیب۔ بجلی کے طفیل بمبئی میں ناچیز کے ٹھہرنے کا رہا خاصا حلقہ ہے لیکن ۱۹۶۵ء کے بعد جب بھی بمبئی جانا ہوا قیام جماعت اسلامی کے دفتر میں رہا۔ یہ دفتر صاف ستھرا ہے اور اس کے مکین بھی ستھرے ہیں نیک اور متواضع۔ اس مرتبہ ذرا سی خلش یہ تھی کہ [illegible] ثلث کی بحث میں جناب شمس پیرزادہ صاحب سے

کر چکا ہوں جو جماعتِ اسلامی بہار و اڑیسہ کے امیر ہیں اور دفتر کے ہیڈ بھی قدرۃً وہی ہیں)۔ ایسا نہ ہو گرانی محسوس کریں۔ لیکن دل اس خلش کو اہمیت نہیں دے رہا تھا کیونکہ محترم موصوف کی وسعتِ ظرف اور حسنِ اخلاق کا تجربہ پہلے کئی بار ہو چکا تھا۔ سادہ دل، نیک خو اور دوست نواز۔ دفتر کے دیگر متعلقین نے بھی ہمیشہ احسان و نوازش ہی کا اسوہ پیش کیا تھا۔

خدا کا شکر ہے ذہنی خلش کے مقابلے میں دل کی جیت ہوئی اور محترم پیرزادہ سمیت سبھی احباب گرمجوشی اور محبت سے پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

جی تو چاہتا ہے کہ بمبئی کے چار روزہ قیام کا حال تفصیل سے لکھا جائے مگر ان فضولیات کے مقابلہ میں کام کے موضوعات قلم پکڑے لے رہیں۔ صفحات کم ہاتیں زیادہ۔ اچھا ہی ہے کہ قصہ مختصر کر دیا جائے۔

قصہ بھی کیا ہے۔ بس یہی کہ اربابِ ذوق نے پے در پے کئی شعری نشستیں کیں۔ بعض میں ہم دو ہی نے سامعین کو بھگتایا بعض میں اور بھی مقامی شعراء نے سماعت نوازی کی۔ حفیظ صاحب کو ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی تو احباب ابھی ہمیں اور روکنا چاہتے تھے۔ میں بھی معذور ہی ہو گیا تھا کیونکہ جس حصۂ جسم کا نام گلا ہے وہ پلتھی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ بات بھی کیجئے تو کان سے منہ لگا کر۔

بمبئی سے دیوبند تک پہنچنے کی کہانی بے لطف ہے۔ کوئی حادثہ یا ڈرامائی موڑ اس میں پیش نہیں آیا۔ جگہ بغیر ریزرویشن کے بھی آرام کی مل گئی تھی۔ دیوبند پہنچکر یوں لگا جیسے جان بچی لاکھوں پائے۔ بار بار یہ خیال خواہ مخواہ ذہن میں اٹھکھیلیاں کرتا رہا کہ اگر کوئی پانی کا جہاز بھی نہ ملتا اور ہم دونوں شاعرانِ آشفتہ حال پیدل چل کھڑے ہوتے تو شاید قیامت ہمیں راستے ہی میں مل جاتی۔

سوچتا ہوں عمر کے سولہ دن ختم ہو گئے۔ ختم تو انھیں بہرحال ہونا ہی تھا لیکن جن مشغولیتوں میں ختم ہوئے ہیں انھیں کراماً کاتبین کس خانے میں لکھیں گے۔ یہ بڑا تشویش انگیز سوال ہے۔ شاعری جس کا پیشہ ہو وہ تو یہ سوچ کر دل اور ضمیر کو تسلی دے سکتا ہے کہ رزق کی جد و جہد بھی عبادت ہی ہے۔ رزق کا رزق اور داد کی داد۔ مگر میں ضمیر کو کیا طفل تسلی دوں۔

دلیل کے نام پر فضول گوئی

ہم نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا وہ اچھی خاصی رفتار سے رونما ہونا شروع ہو چکا ہے یعنی قادیانیت کے پروپیگنڈے کا زور شور۔ ڈاک میں ہر چھٹے پانچویں روز کوئی پمفلٹ یا کوئی کتابچہ یا کوئی پوسٹر اخبار ایسا آ جاتا ہے جسے دیکھ کر سینہ سے سرد آہ ابھر کر لبوں تک آتی ہے اور دل پر چوٹ لگتی ہے کہ یا اللہ یہ عقل و خرد کا مدعی انسان حماقتوں اور گمراہیوں کے کس تحت الثریٰ تک جا کر دم لے گا۔

پڑھنا تو ایسی چیزوں کا مشکل ہی ہے لیکن ہمارا فرضِ منصبی کچھ ایسا ہے کہ دل پر پتھر اور سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھنا ہی پڑتا ہے۔ پڑھنا اس لئے پڑتا ہے کہ کہیں ان میں شیطان کی مدد سے کوئی نیا ظاہر فریب استدلال تو درج نہیں کر دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے اس سے دھوکا کھا جائیں۔ ایسے استدلال کی حقیقت واضح کرنا ہمارا فرضِ منصبی ہے لہٰذا کوفت جھیلتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ اس روح فرسا مشغلے نے بہت سا وہ وقت بھی کھا لیا ہے جسے تبصرہ طلب کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہونا چاہیئے تھا۔ سو سے اوپر تبصرہ طلب کتابوں کا ڈھیر ہماری جان کو رو رہا ہے اور ہم ہیں کہ قادیانیت کے تعاقب کی فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔

خیر۔ پتے کی بات سب بھائی سن لیں۔ پچھلے

شمارے سے "قادیانیت کے جیب و گریباں" کا عنوان دے کر ہم جس کتابچے کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں وہ انشاء اللہ ایسا ہے کہ قادیانی متکلمین کے علمی افلاس، ذہنی کج روی اور ہذیان سرائی کو اچھی طرح واضح کر دے گا۔ اس کتابچے میں جو مواد مصنف نے جمع کیا ہے وہ شاید قادیانی حضرات کی مدتوں کی محنت کا ثمرہ اور ان کا قیمتی سرمایہ ہے کیونکہ جتنے بھی پمفلٹ وغیرہ ہمارے پاس آ رہے ہیں ان میں جزوی فرق کے ساتھ یہی سارا مواد دہرایا جا رہا ہے اور صاف معلوم ہو رہا ہے کہ علم دین سے تہی دامن، قرآن و حدیث سے بے خبر اور عقل سلیم سے محروم لوگ اسی مواد کو متاع بے بہا سمجھ کر نقل کرتے اور پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا مذکورہ پوسٹ مارٹم ایسے تمام کتابچوں کا شافی کافی جواب مہیا کر دے گا بشرطیکہ قارئین پوری توجہ سے اسے پڑھیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔

یہ دعویٰ تو ہم یقیناً نہیں کر سکتے کہ جتنے بھی نئے پمفلٹ وغیرہ چلے آ رہے ہیں ان میں ایک بھی نئی دلیل اور نئی بات ایسی نہیں ہوتی جو ہمارے زیر نقد کتابچے میں نہ آ چکی ہو۔ بے شک ہر فن کار کوئی نہ کوئی نیا شوشہ ضرور چھوڑتا ہے لیکن اہل ہوش کو سمجھ لینا چاہیے کہ جن لوگوں کی بنیادی اور قوی ترین دلیلیں نقد کے دائرے میں آ کر پاش پاش ہو گئیں اور واضح ہو گیا کہ یہ قرآن و سنت کو توڑنے مروڑنے کے عادی ہیں تو ان کی بچی کھچی باقی دلیلوں کے بارے میں بھی یہی قیاس بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ وہ دام فریب اور ملمع کاری کے سوا کچھ نہ ہوں گی۔ ہم بطور مثال سامنے رکھے ہوئے ایک کتابچے سے ایک دو نمونے پیش کرتے ہیں۔

اس کتابچے میں بہت سا مواد تو وہی ہے جسے ہمارا نقد قسط وار آپ کے سامنے لائے گا۔ نئے شوشوں میں سے ایک شوشہ یہ ہے:۔

"حیاتِ عیسیٰ کا عقیدہ باطل اور خلافِ عقل ہے کیونکہ وہ عبد البشر ہے اور عبد البشر کے مادی جسم کو یہ قوت اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کی ہے کہ وہ ہزاروں سال اپنی بے اصلی کیفیت سے زندہ رہے اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو۔ اسی بارے میں ارشادِ ربی ہے وما جعلناھم جسداً الّا یاکلون الطعام (اور ہم نے ان رسولوں کے ایسے جسم نہیں بنائے جو کھانا نہ کھاتے ہوں۔ (سورۃ الانبیاء) یعنی اس مادّی جسم کے لئے دنیاوی لوازمات کھانا پینا ضروری امر ہے۔ اسی طرح آپ کے اس باطل عقیدۂ حیات جسمانی پر اللہ کی لعنت ہے اور عالم اسلام کو تسلیم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت محمد رسول اللہ سے پہلے ہو چکی اور وہ بنی اسرائیل میں اپنا کام انجام دے کر زندہ بعد الموت آسمان پر تشریف لے گئے۔"

اس خامہ فرسائی کا سہرا جن صاحب کے سر ہے وہ اگر علوم دین سے بے بہرہ اور فکر و تفقہ سے محروم نہ ہوتے تو قادیانیت کا فریب ہی کیوں کھاتے۔ نادان آدمی کو کب شعور ہوتا ہے کہ میری نادانی کس ڈگری تک پہنچ گئی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ علم کلام صریح جھوٹ بدترین جہالت اور عبرت ناک بدعقلی کا مجموعہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے یا دنیا میں وفات پا گئے، اس موضوع پر بحث یہاں ہم نہیں کریں گے۔ یہ بحث تو کسی اہل علم سے کی جا سکتی ہے جاہلوں اور سفیہوں سے نہیں۔ یہ بھی ہم نہیں کہتے کہ جو شخص حیاتِ عیسیٰ کا عقیدہ نہ رکھے وہ کافر ہے۔ اگر قادیانی حضرات وفات عیسیٰ کی بنیاد پر کفریات

اور مصنوعی نبوت کا طومار نہ باندھتے تو مجرد اس عقیدے کی بنا پر انھیں بھی کافر نہ ٹھیرایا جاتا کیونکہ اس عقیدے میں کچھ نہ کچھ قیل وقال کی گنجائش ضرور ہے۔

لیکن سفید جھوٹ وہ دعویٰ ہے جو اس سلسلہ میں یہاں کیا گیا ہے۔ کتابچے کے مؤلف یہ الفاظ لکھنے کے بعد کہ ـــ "عالم اسلام کو تسلیم ہے" دو باتیں لکھتے ہیں۔ پہلی یہ کہ "حضرت عیسیٰ کی بعثت حضورؐ سے پہلے ہو چکی" یہ بلاشبہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ "عالم اسلام کو تسلیم ہے" کسی احمق ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ عالم اسلام کیا معنی مسلم اور غیر مسلم، ساری دنیا مانتی اور جانتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے نبی ہیں۔ یہ بات کبھی اختلافی نہیں رہی ہے۔

لیکن دوسری بات جو انھوں نے کہی ہے وہ سفید جھوٹ یا پھر جہالت فاحشہ کے درجے میں آتی یعنی یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد الموت آسمان پر جانے کو عالم اسلام تسلیم کرتا ہے۔

کیسے عقیدے کو عالم اسلام میں کتنے لوگ مانتے ہیں یہ کوئی عقلی اور نظری مسئلہ تو نہیں تاریخی اور واقعاتی مسئلہ ہے۔ "عالم اسلام" سے مراد اس طرح کے مواقع پر صرف آج کا عالم اسلام نہیں بلکہ چودہ سو برسوں کی پوری امت مسلمہ ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے علمائے سلف وخلف کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ صحابہؓ سے لے کر آج تک کی امت میں سے اگر ایسے اہل علم کے نام جمع کئے جائیں جو حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر اٹھا لئے جانے کا عقیدہ نہ رکھتے ہوں بلکہ قادیانیوں کی طرح یہ کہتے ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا ہی میں طبعی موت مر گئے تو ان ناموں کی تعداد کا تناسب زندہ اٹھائے جانے کا عقیدہ رکھنے والوں کے مقابلے میں ایسا ہوگا جیسے دس لاکھ کے مقابلہ میں ایک کا عدد۔ یعنی سلف وخلف میں بعض اہل علم نے بے شک زندہ اٹھائے جانے کے عقیدے میں اختلاف کیا ہے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے حتیٰ کہ اگر "عالم اسلام" سے مراد فقط آج کا عالم اسلام لیا جائے تب بھی چند گنے چنے ناموں کے علاوہ نہ بتایا جا سکے گا کہ کروڑوں افراد پر مشتمل امت مسلمہ میں ہزار یا سو آدمی بھی حیات عیسیٰ کے منکر ہوں۔

پھر انصاف کیجئے کہ صاحب مذکور نے کتنا بڑا جھوٹ بولا یا پھر یوں کہئے کہ انھیں چونکہ خبر کچھ نہیں جو کچھ قادیانی خطیبوں سے سن لیا ہے وہی ان کا کل علمی سرمایہ ہے لہٰذا وہ بالکل اسی کو گنگا بہا رہے ہیں۔ کھلا واقعہ یہ ہے کہ چودہ سو برسوں میں معدودے چند افراد کے علاوہ اربوں کھربوں مسلمانوں کا عقیدہ یہی رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور قیامت سے پہلے دنیا میں پھر بھیجے جائیں گے اور یہیں اپنی طبعی موت مریں گے۔

اگر ہماری اس وضاحت پر کوئی قادیانی فنکار انکار کرے تو ہمارا چیلنج ہے کہ وہ تسلی بخش ثبوت کے ساتھ وفات عیسیٰ کے قائل علماء کے نام پیش کرے ہم اس کے مقابلہ میں کم سے کم پچاس گنے نام فوراً پیش کر دیں گے اور ہر نام کے لئے دستاویزی ثبوت بھی دیں گے۔ خوب بازی کی کوئی حد ہونی چاہئے۔ دین جیسے اہم معاملہ میں بہتان اور یاوہ گوئی سے کام لینا سچ پوچھیا ہی کی بدترین قسم کہلا سکتا ہے۔ صحیح الدماغی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

لطیفہ یہ ہے کہ باکمال مصنف نے "زندہ بعد الموت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کوئی پوچھے یہ پہیلی۔

بہرحال سفید جھوٹ تو آپ نے دیکھ ہی لیا اب یہ بھی خیال فرمایئے کہ حیات جسمانی کا عقیدہ رکھنے والوں پر سعاید مصنف لعنت بھی فرما رہے ہیں۔ گویا کم وبیش ساری ہی امت کو برملا ملعون قرار دیا گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں مفسرین ومحدثین اور فقہاء وائمہ تو ایک طرف رہے کثیر صحابہ تک پر لعن جا پہنچا۔ تجلی دسمبر ۲۰ء کے صفحہ ۱۴ پر ہم ۱۴ صحابہ کے نام نقل کرا آئے ہیں جن سے نزول عیسیٰ کی روایات مروی ہیں

ان میں سے بعض میں تو صریحاً یہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا اور بعض میں یہ صراحت نہیں مگر "نزول" کا لفظ وارد ہوا ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمانوں میں کہیں زندہ موجود ہیں اور اللہ انھیں نازل کرے گا۔ جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے فرشتے نازل کئے تو یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فرشتے پیدا کئے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ پیدا شدہ فرشتے جو پہلے سے موجود ہیں انھیں اتارا۔ ماں کے پیٹ سے انسان کی پیدائش کے لئے "نزول" کا لفظ بولا ہی نہیں جا سکتا۔ قادیانی حضرات نزولِ عیسیٰ کی احادیث کو جزوِ ایمان بنائے ہوئے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں مرزا غلام احمد کو "مسیح موعود" سمجھتے ہیں۔ لیکن ان احادیث کی ہر ہر تصریح کو مضحکہ خیز قسم کی تاویلات سے کھلونا بنانا ان کا عام شیوہ ہے۔ اگر یہ شیوہ نہ ہوتا تو صرف "نزول" ہی کا لفظ یہ سمجھ لینے کے لئے کافی تھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح نے وفات نہیں پائی ہے بلکہ زندہ اٹھائے گئے ہیں۔

جھوٹ، جہالت اور جسارت کے نظاروں سے گزر کر اب آئیے اس استدلال کی طرف جو منقولہ عبارت میں حیاتِ عیسیٰ کے باطل اور خلافِ عقل ہونے پر کیا گیا ہے۔

ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جماعتِ مسلمہ حیاتِ عیسیٰ کی قائل ہے وہ اس احمقانہ خیال کی حامل نہیں کہ حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر جا پہنچنا اور وہاں اب تک زندہ ہونا ان کے اپنے کسی کمال اور قوت و اختیار کا ثمرہ ہے۔ استغفر اللہ۔ ایسے اعجاز قدرت میں اللہ کی قدرتِ کاملہ کے سوا کسی اور کا کیا دخل۔ جاہل اور غبی مصنف اگر قرآن پڑھتے تو انھیں سورۂ کہف سے بھی پہلے سورۂ بقرہ میں ہی وہ آیات نظر آجاتیں جن میں اللہ نے حیات بعد الموت کا ایک نمونہ دنیا میں ہی دکھایا ہے۔ ایک شخص کسی بستی کے کھنڈر سے گزرا اور اسے خیال آیا کہ اس بستی کے باشندے تو کبھی کے مر کھپ گئے بھلا اب انھیں اللہ کیسے زندہ کریگا۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ.	پس اس شخص کو اللہ نے سو سال تک مردہ رکھا۔ اس کے بعد زندہ کیا۔ کہا تو کتنی دیر یہاں رہا؟ بولا ایک دن یا اس سے بھی کچھ کم۔ فرمایا نہیں بلکہ تو سو برس یہاں رہا۔ اب اپنے کھانے اور پینے کو دیکھ وہ سڑا نہیں (جوں کا توں ہے) اور اپنے گدھے کو دیکھ (جس کے انجر پنجر تیرے سامنے پڑے ہیں)

جس دلیل سے مصنف حیاتِ عیسیٰ کو باطل قرار دے رہے ہیں اس دلیل سے تو قرآن کا بیان فرمودہ یہ قصہ بھی نعوذ باللہ باطل ہونا چاہئے کیونکہ کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ مرے اور پھر سے زندہ ہو جائے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ سو سال تک مرا پڑا رہے اور بدن میں تغیر نہ آئے نہ یہ ممکن ہے کہ خورد و نوش کا سامان سو سال تک بگڑنے کا نام نہ لے۔

آگے سورۂ کہف میں تو اللہ تعالیٰ ایک دو کا نہیں متعدد بندوں کا قصہ بیان کرتا ہے جن کے ساتھ ایک کتا بھی ہے یہ اتنے طویل عرصہ تک غار میں سوتے رہتے ہیں کہ نسلیں بدل جاتی ہیں۔ تمدن بدل جاتا ہے۔ حکومت بدل جاتی ہے اور پھر اچھے خاصے اٹھ بیٹھتے ہیں۔

کیا یہ سب انسان کے بس کی بات تھی۔ کیا عام قانونِ فطرت سے اس کی کچھ بھی مطابقت ہے۔ اگر نہیں تو پھر قادیانی حضرات نعوذ باللہ اس قصۂ قرآنی کو بھی غلط ہی سمجھتے ہوں گے۔

حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ رسول اللہ بہ نفسِ نفیس آسمانوں کی سیر کر آئے۔ اس طرح کے مسلمات نہ خلافِ عقل ہیں نہ قدرتِ خداوندی کے لئے ذرا بھی مشکل ان میں عیسیٰ بشر کی اپنی صلاحیت اور قوت اور اختیار و قدرت کا تعلق بھی نہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ کے زندہ اٹھائے جانے کو

جو شخص انسانی قوت و قدرت کی منطق سے باطل قرار دیتا ہے اسے بے عقل اور بے شعور نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

بے تمیزی کی حد ہے کہ مصنف اپنی یا وہ گوئی کے ثبوت میں قرآن ہی کی ایک آیت پیش کر رہے ہیں اور بلا تکلف یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "اسی بارے میں ارشاد ربانی ہے"

آیئے ایک نظر اس آیت پر بھی ڈال لیں۔

سورۂ انبیاء میں کفار کی اس روش کا ذکر ہے کہ یہ لوگ نصیحتوں کو کھیل تماشے کے انداز میں سنتے ہیں اور رسول اللہ ؐ کے بارے میں یہ گل افشانی کرتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ اسے تو جادو آتا ہے اس کے چکر میں مت پھنسو۔ مزید کہتے ہیں کہ یہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ تو خوابہائے پریشاں ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ رسول نہیں شاعر ہے۔ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں نصیحت فرماتا ہے کہ اے نادانو! کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ اس رسول سے پہلے بھی ہم نے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں وہ سب بشر ہی تھے۔ دوسرے سب انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور دوسرے ہی انسانوں کی طرح وہ ایک عمر کو پہنچ کر مر بھی جاتے تھے۔ یہ بات اتنی معروف و مسلم ہے کہ ہر شخص جانتا ہے۔ تم اب بھی اس میں شک کر رہے ہو تو باخبر لوگوں سے پوچھ دیکھو وہ تمہیں یہی بتائیں گے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں مصنف کی پیش کردہ یہ آیت آئی ہے

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ	اور ہم نے ان پیغمبروں کے جسم ایسے نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ کھائیں۔

گویا جس بات پر قرآن نے متعدد مقامات پر تنبیہ کی ہے وہی بات یہاں بھی بیان فرمائی کہ اے احمقو! رسول کی رسالت پر ایمان لانے میں یہ کیوں اس مت کرو کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا بشر ہے کھانا پڑتا ہے، سوتا جاگتا ہے ـــــ انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر ہم انسانوں ہی کو مبعوث کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی میں انسانوں کے لئے قانون یہی بنایا گیا ہے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے کچھ کھائیں پئیں۔ سوئیں۔ بیمار ہوں۔ وغیر ذلک۔ اس بیان سے یہ شوشہ کہاں سے نکل آیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو زندہ آسمان پر نہیں اٹھا سکتا اور اسے وہاں طویل عرصہ تک زندہ نہیں رکھ سکتا قرآن جس نے پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور جو بھی ارادہ فرمائے بس "کُن" کہہ دینے سے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ جس اللہ نے شیطان کو قیامت تک کی زندگی دی۔ جس نے فرشتوں کو لامحدود طویل حیات عطا فرمایا جس نے حضرت عیسیٰ کو کنواری مریم صدیقہ کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا کر دیا، جس نے پل کے پل میں خاتم الانبیاء کو معراج عطا کر دی، جس نے حضرت مسیح کو مُردے زندہ کرنے کا معجزہ عطا فرمایا اور یہ صلاحیت دی کہ پالنے ہی میں بول پڑیں۔ جس کے اعجاز قدرت کا کوئی شمار اور حد و حساب ہی نہیں۔ اس کے بارے میں اگر ایک گروہ یہ خیال کرتا ہو کہ وہ اپنے کسی بندے کو آسمان پر زندہ اٹھا لینے اور عرصۂ دراز تک زندہ رکھ کر پھر سے دنیا میں اتارنے پر قادر نہیں تو اس کا صحیح مقام پاگل خانہ ہے یا پھر دماغی امراض کا شفاخانہ ـــــ اللہ کی آیات سے کھیل کرتے ہوئے کچھ تو ڈرنا چاہئے جب کہ قادیانی حضرات بڑے زور شور سے اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کئے ہی چلے جاتے ہیں۔

(دوسرا نمونہ انشاء اللہ ہم اگلی صحبت میں پیش کریں گے)

اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص نے بھی ہدایت پائی تو یہ تمہارے لئے دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے ـــــ (حدیث)

تجلی کی ڈاک

قادیانیت کا مسخرہ پن • جماعتِ اسلامی اور دیوبندی مسلک • شریعت اور توہمات • اسقاطِ حمل کا قانون • زکوٰۃ اور صدقۂ فطر کا مسئلہ • زمین سے زمین بدلنا • خدمتِ دین۔

قادیانیت کا مسخرہ پن

سوال :- از محمد سعید درگاہی ۔ گودھرہ ۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اپنے مضمون "قادیانیت" میں خلیفۂ قادیان میاں محمود احمد کی ... رِ خلافت کی تحریر درج فرمائی ہے :-

"اور میرا ایمان ہے کہ اس آیت (اِسْمُہٗ اَحْمَدُ) کے مصداق موعود علیہ السلام ہی ہیں۔"

اس سے متعلق آپ سے توقع ہے کہ اپنے کسی آئندہ مضمون میں قادیانیوں کی اس لفظی شیشہ گری کو واضح فرمائیں کہ کوئی شخص کبھی "عبداللہ" کو "اللہ" کہہ کر یاد نہیں کرے گا۔ بالکل اسی طرح جو شخص غلام احمد ہے اسے "احمد" ماننا ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

جواب :- کبوتر لوہے کی میز کو کہتے ہیں۔ تمنّا کا مطلب ہے ریل کا ڈبہ۔ درخت کے معنی چوہا ہیں۔ بکری سات انڈے دیتی ہے۔

فرمایئے۔ کوئی گروہ اگر اس قسم کی خرافات کا ڈھیر لگاتا رہے تو کیا کسی صحیح الدماغ آدمی کا جی چاہے گا کہ ان کی تردید اور تعقب پر اپنا وقت برباد کرے وہ تو خدا کی شان ہے کہ شیطان کے مکر و فریب سے اچھی خاصی عقلیں گوبر کا ڈھیر ہو جاتی ہیں اور احمقانہ سے احمقانہ بات بھی بہتیرے انسانوں کے دل و دماغ میں عقیدہ بن کر اُتر جاتی ہے چنانچہ سراپا خرافات ہونے کے باوجود "قادیانیت" لاکھوں مسلمانوں کو اسیرِ فریب کر گئی اور علماء مجبور ہوئے کہ مزید مسلمانوں کو اس بربادی سے بچائیں۔

اسی مجبوری کا ہم بھی شکار ہیں چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنے ہی صفحات سیاہ کر چکے اور کتنے ہی ابھی اور کریں گے۔

مگر اس قسم کے دعوے کہ فلاں آیت کا مصداق میں ہوں اور فلاں حدیث میں میری طرف اشارہ ہے مرزا غلام احمد کے یہاں اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان پر فرداً فرداً کلام کرنے کے خیال ہی سے ذہنی استفراغ ہونے لگتا ہے۔ اسے مثلاً یہی شوشہ جو آپ نے مستقل ایک سوال کی صورت میں پیش فرمایا اتنا واہی اور بے تکا ہے کہ اس پر سنجیدہ التفات کرتے ہوئے اپنے احمق ہونے کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ ایک صریح لغویت تو آپ نے واضح فرما دی۔ دوسری بدترین لغویت یہ ہے کہ اس آیت میں احمد کا مصداق نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو ٹھیرانے کی شمہ برابر گنجائش کسی طریقے سے ہے ہی نہیں مگر خلیفۂ قادیان خیر سے اسے دین و ایمان بنائے ہوئے ہیں۔

ذرا ملاحظہ کیجئے۔ آیت کا مضمون یہ ہے:-

"اور جب کہا مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں تصدیق کرتا ہوا اس چیز کی جو توراۃ میں ہے اور خوش خبری سنانے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔" (سورۂ صف آیت ۶)

یہاں ہے وہ لفظ اِسْمُہٗ اَحْمَدُ۔ اگر رسول اللہؐ نے اس قسم کی خوش خبری دی ہوتی تب تو یہ سوال بے شک اٹھتا کہ احمد کا مصداق کون ہے لیکن اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ خوش خبری حضرت عیسیٰ ابن مریم دے رہے ہیں اور چودہ سو سال کے تمام مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ بشارت سید الابرار احمدِ مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت نے پوری کردی۔ وہی تھے جن کے بارے میں کتب سماویہ خبر دیتی آرہی تھیں اور وہی تھے جو قرآن کی اس آیت میں بلا ریب و شک احمد کا مصداق بنے لیکن شاباش ہے ان سوداؤں کو جو خود کو مسلمان بھی کہنے پر بضد ہیں اور خم ٹھوک کر قرآن سے بھی ٹھٹول اور استہزاء کئے چلے جا رہے ہیں۔

اگر صرف "نام" ہی سب کچھ ہے تو پھر آج ہزار مائیں اپنے نومولود کا نام احمد رکھ سکتی ہیں اور جوان ہوکر یہ سب اپنے اپنے حلقوں میں پروپیگنڈہ کرسکتے ہیں کہ دیکھو ہمارا نام احمد ہے ہم ہی قرآنی بشارت کا مصداق ہیں۔

ایک اور بھی نکتہ یہاں دیکھ لیجئے۔ قادیانی حضرات چیختے چیختے نہیں تھکتے کہ ہم مرزا کو غیر تشریعی امتی نبی مانتے ہیں کسی نئی شریعت کا لانے والا نہیں مانتے مگر سورۂ صف کی مذکورہ آیت میں خاص طور پر رسول آیا ہے نبی نہیں۔ یعنی جس احمد کی خبر حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کو دے رہے ہیں وہ صرف نبی نہیں ہوگا رسول بھی ہوگا رسول محاورۂ اس نبی کو کہتے ہیں جو صاحب شریعت ہو۔ ہر نبی رسول نہیں کہلاتا مگر ہر رسول نبی ضرور ہوتا ہے۔ اب اگر خلیفۂ قادیان اس آیت کا مصداق مرزا کو مانتے ہیں تو کھلی بات ہے کہ وہ مرزا کو رسول ہی مانتے ہیں نہ کہ صرف نبی۔ اس طرح ان کے بے شمار تضادات میں ایک اس تضاد کا بھی اضافہ ہوا کہ مرزا رسول بھی ہیں اور صاحب شریعت بھی نہیں ہیں!

ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری تو قادیانیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان لوگوں کی جرأت کا یہ عالم ہے کہ سالہا سال سے قرآن کے ایسے نسخے چھاپے چلے جارہے ہیں جنمیں بیسیوں جگہ لفظی تحریف اور حذف و اضافہ ہے۔ خدا کی پناہ۔ جو گروہ خدا کے کلام کو بلا تکلف بدلے سدلے وہ بھی اگر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بانگ دہل کئے چلا جاتا ہے تو اس سے بڑھ کر ڈھٹائی اور ہذیان سرائی دنیا میں اور کیا ہوسکتی ہے۔

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ۔

جماعتِ اسلامی اور دیوبندی مسلک

سوال :- از: نثار احمد۔ مالیر کوٹلہ۔

دیوبندی مسلک کا لفظ اکثر سننے میں آتا رہتا ہے۔ یہاں مالیر کوٹلہ کے رہنے والے اکثر لوگ اپنے آپ کو دیوبندی مسلک کا بتلاتے ہیں۔ جس میں جماعتِ تبلیغ سے متعلق بھی لوگ شامل ہیں۔ ہمارے یہاں کے موجودہ مفتی صاحب بھی دیوبند کے رہنے والے ہیں اور دیوبندی مسلک کے ہیں۔ جامع مسجد میں ہر ہفتے انکی تقریر ہوتی ہے۔ مسلک دیوبند کے بارے میں ایک بار انھوں نے تقریر کی تھی جس کا حاصل میری یادداشت اور فہم کے مطابق کچھ اس طرح تھا کہ — "مسلک دیوبند کا مطلب قرآن اور سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دیوبند کے علماء نے قرآن اور حدیث کے احکامات کو اپنے قول وعمل سے نکھار کر پیش کیا۔ اہلِ بدعت نے ان پر وہابی ہونے کے طعنے کسے۔ اور دیوبند کو ایک مستقل مسلک کی حیثیت سے پیش کرنے لگے اور ایسا دکھانے لگے کہ یہ قرآن وسنت کے طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ ہے۔ ورنہ مسلکِ دیوبند قرآن و سنت سے علیحدہ اور کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ علماءِ دیوبند کا طریقہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے اسلاف کے اقوال کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا اور جانچا۔ قرآن وحدیث کے سمجھنے کے سلسلے میں اسلاف کی کاوشوں سے مدد ضرور لی۔ اور کہیں ہٹا ہوا محسوس ہوا تو اس کی مناسب توجیہہ کرتے رہے — میں دیوبندی ہوں یعنی قرآن وحدیث میرے ایمان کا محور ہیں اور اس معنی میں ہر شخص دیوبندی ہے اور اسکو دیوبندی ہونا چاہئیے" اس وضاحت کے باوجود تبلیغی جماعت سے متعلق چند لوگ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مفتی صاحب دیوبندی نہیں ہیں بلکہ ان کا میلان جماعتِ اسلامی کی طرف ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے کبھی کسی جماعت کا نام لے کر مخالفت نہیں کی اور اس میں جماعتِ اسلامی بھی شامل ہے اور غالباً یہ بات یہاں کے تبلیغی بھائیوں کی امنگوں کے خلاف ہے آپ سے بھی یہ وضاحت مطلوب ہے کہ دیوبندی اور مودودی کیا ایسا نمایاں فرق ہے۔ اس کے ساتھ علماءِ دیوبند کا جماعتِ اسلامی کے ساتھ اختلاف بھی ایک الجھن پیدا کرتا ہے اور لوگ اس فرق کے لئے اختلاف کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔

جواب :-

بنیادی اعتبار سے مفتی مذکور کی بات درست ہے تمام اہلِ حق کا جو طریقہ چلا آرہا ہے وہی اکابرِ دیوبند کا بھی رہا ہے۔ البتہ "مسلک دیوبند" کا عنوان کوئی ایسا عنوان نہیں جو دوسروں کا گھڑا ہوا ہو اور طنزاً بولا جاتا ہو بلکہ خود علمائے دیوبند اس عنوان کو اپنے لئے استعمال کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد انداز فکر کی وہ مخصوص ہیئت ہوتی ہے جو خاندان ولی اللّٰہی سے منسوب ہے اور جس میں طریقت و تصوف کا ایک خاص رنگ اور ایک خاص تناسب پایا جاتا ہے۔

مثال سے شاید بات زیادہ واضح ہو۔

تصوف اصلاً نام ہے دین میں گہرا اخلاص پیدا کرنے کا۔ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو "احسان" کہا جاتا ہے وہی تصوف کی منزل ہے اور صحیح تصوف اسی طرح قرآن و حدیث کو حجت اور حرفِ آخر مانتا ہے جس طرح مفسرین محدثین اور مجتہدین مانتے آئے ہیں۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ تصوف کا ایک منفرد طرزِ فکر اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے جو انھیں غیر صوفی علماء و صلحاء سے الگ کرتا ہے۔ پھر خود تصوف میں مختلف سلسلے ہیں۔ نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ وغیرہ۔ یہ سب بھی بنیاداً قرآن وسنت کی حجیت پر متفق اور

شریعت کی قطعیت پر متحد الخیال ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بعض امتیازات اور فروق سے الگ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

اسی طرح مختلف مکاتبِ فکر اور علماء کے مختلف حلقوں کا حال ہے۔ جو خصوصیت مفتی صاحب نے علماء دیوبند کی بیان کی ان میں کم و بیش یہ سبھی شریک ہیں تعبیرات، منہج استدلال، مزاج و مذاق اور توجیہات کے فرق نے انھیں باہم دگر ممتاز کر دیا ہے۔ علماءِ دیوبند، علمائے ندوہ، علماءِ فرنگی محل، علمائے ازہر، علمائے حرمین شریفین ان سب کے اہلِ حق اور حاملانِ دین ہونے میں کوئی کلام نہیں، یہ سب اپنی اپنی ذات میں قرآن و سنت ہی پر عمل کرتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسلاف کی کاوشوں سے مدد لیتے ہیں لیکن ان میں ہر ایک کی اپنی اپنی کچھ جزوی خصوصیات بھی ہیں جیسے مختلف انسانوں میں اعضاء کی یکسانی کے باوجود شکل و ہیئت کے کچھ امتیازات ہوتے ہیں اور ان کی بناء پر زید، عمرو، بکر ہر ایک کو الگ الگ پہچان لیا جاتا ہے۔

مزید ایک مثال ہمارے منشاء کو اور واضح کرے گی۔

آپ سو آدمیوں سے یوں کہیں کہ تم میں سے ہر ایک کو دس ہزار گز مربع زمین پر ایک مکان بنانا ہے جس میں چار کمرے ہوں۔ غسلخانہ اور بیت الخلاء ہو، باورچی خانہ ہو، دالان اور صحن ہو۔ پائیں باغ ہو، چھتوں کے نیچے خوبصورت ستون ہوں اور محرابیں کمان جیسی ہوں۔ یہ لوگ اپنی صوابدید سے الگ الگ اپنے مکان بناتے ہیں تو اگرچہ آپ کی عائد کردہ تمام شرائط یہ پوری کریں گے لیکن ہر ایک کا مجموعی نقشہ اور شکل و ہیئت الگ الگ ہوگی۔ ممکن نہیں کہ دو مکان بھی پوری طرح ایک جیسے ہوں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایک ہی جیسے احکام اور شرائط و ضوابط کی عملی تشکیل میں انسانوں کے ذوق و رجحان اور فکر و نظر کے فرق سے مختلف ہیئتیں اور صورتیں ظہور میں آتی ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام ہی وہ افعال جن کا واضح سانچا اور نقشہ شریعت نے دیدیا ہے ان تک میں طرزِ فکر کا فرق امتیازات پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے ایک عالم دین بہت لمبی نماز پڑھتا ہے کہ نماز ہی دین کی اہم ترین عبادت ہے اور اس کے طول سے وہ بہت زیادہ ثواب کی توقع رکھتا ہے لیکن دوسرا عالمِ دین اتنا طول نہیں دیتا بلکہ متوسط انداز میں نماز ادا کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت تعلیم و تصنیف میں لگاتا ہے تاکہ خلقِ خدا کو دین کا علم پہنچائے دونوں عالم اہلِ حق میں ہیں۔ مگر دیکھنے والے ان میں ایک ایسا فرق ضرور محسوس کریں گے جس سے ان دونوں کے اندازِ فکر کا تفاوت ابھر کر سامنے آئے گا۔ اسی تفاوت اور فرق پر مشتمل جزئیات کے مجموعے کو "مسلک" کے عنوان سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

یہ بات جب سمجھ میں آگئی تو اب سنئے کہ دیوبندی ہوں، جماعتِ اسلامی والے ہوں، جماعتِ تبلیغی والے ہوں یہ سب اصلاً اربابِ حق ہیں۔ انمیں کوئی نہیں جو شریعت کے چار معروف بنیادی ماخذ قرآن سنت۔ قیاس اور اجماع کا قائل نہ ہو۔ کوئی نہیں جو سلفِ صالحین کے فرمودات کو مشعلِ راہ نہ مانتا ہو۔ کوئی نہیں جس کی نیت فاسد اور بنیادی عقیدہ غیر اسلامی ہو لیکن تعبیر و توجیہہ اور طریقِ استنباط اور مزاج و مذاق اور منہج و استدلال کا فرق ان میں یقیناً پایا جاتا ہے اور یہی چیز انھیں ایک دوسرے سے متمیز کرتی ہے۔ انہی کے الگ الگ حلقے بناتی ہے اور انھیں مختلف القاب دینے کا جواز دیتی ہے۔

یہیں یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ "جماعتِ اسلامی" بجائے خود کسی مسلک کا نام نہیں۔ وہ ایک ایسی جماعت ہے جس میں فضلائے دار العلوم بھی ہیں۔ فضلائے ندوہ

بھی۔ شوافع بھی ہیں، حنابلہ بھی۔ احناف تو کثرت سے ہیں۔ اہلِ حدیث بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس کا کوئی اپنا فقہی مسلک نہیں بلکہ وہ ان مختلف مسالک کے حاملین کو اعلائے کلمۃ الحق اور غلبۂ دین کے متفقہ اور مشترکہ نصب العین کی طرف دوش بدوش گام زن کرنا چاہتی ہے۔ فروعات و جزئیات کی غیر ضروری جنگ اور مخالفت بازی سے بچا کر اہلِ اسلام کی توانائیوں کو اسلام کے بلند ترین مشن اور اعلیٰ ترین کاز کے لئے صرف ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔

لہٰذا کوئی مفتی یا عالم یا عامی دیوبندی مسلک پر قائم رہتے ہوئے بھی جماعتِ اسلامی کی طرف میلان رکھ سکتا ہے اور اس میلان سے اس کی دیوبندیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہمارے اکثر برادرانِ اسلام اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیئے گئے ہیں کہ جماعتِ اسلامی ناپسندیدہ جماعت ہے اور بعض حلقے تو اسے گمراہ تک سمجھ بیٹھے ہیں یہ یقیناً غلط فہمی ہے اور اس کی پشت پر شیطان کا مکر کام کر رہا ہے۔

جو لوگ مفتی موصوف کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان سے پوچھا جائے کہ ان کا حقیقی اعتراض کیا ہے اور اس کی صحت کے لئے ان کے پاس کیا دلائل ہیں۔ خواہ مخواہ کسی مفتی یا عالم کے خلاف بدگمانیاں پھیلانا بڑے گناہ کی بات ہے اور اگر خدانخواستہ جماعتِ تبلیغی والوں کی خواہش یہ ہو کہ جماعتِ اسلامی کو منبروں پر برا بھلا کہا جائے تو اس ناپاک خواہش سے دل کو پاک کر لینا چاہیئے۔

علمائے دیوبند کا جماعت اسلامی سے اختلاف ایک مستقل موضوع ہے۔ ہم بلا مبالغہ ہزاروں صفحات یہ ثابت کرنے میں صرف کر چکے ہیں کہ جماعتِ اسلامی یا مولانا مودودی پر عائد کئے جانے والے الزامات و اعتراضات زیادہ تر غلط فہمیوں اور کج فکریوں پر مبنی ہیں۔ بعض مسائل میں اگر علماءِ دیوبند اور مولانا مودودی کے درمیان واقعۃً اختلاف پایا جاتا ہے

تو اس کی نوعیت سنگین نہیں۔ ایسی نہیں کہ اس کی بنیاد پر مستقل مخالفت کا محاذ بنا لیا جائے۔ کون سے دو مفکر اور مجتہد ہیں جن کے مابین کتنے ہی مسائل میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ خود علمائے دیوبند کے مابین کتنی ہی جزئیات میں اختلاف موجود ہے۔ احناف، شوافع، مالکیہ، حنبلیہ ان سب کے اختلافات ہزاروں تک پہنچے ہوئے ہیں مگر کیا سبھی اہلِ حق نہیں۔ اسی طرح اگر فکر و تحقیق کے نتیجے میں مولانا مودودی کے بعض افکار علمائے دیوبند کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتے تو اس کی بنا پر منافرت اور مخالفت بہت ہی بری بات ہے جس سے شیطان تو خوش ہوتا ہے اللہ اور رسولؐ خوش نہیں ہوتے۔

پھر مولانا مودودی تو بارہا الفاظ بدل بدل کر متنبہ بھی کر چکے ہیں کہ فقہی مسائل میں میری آراء میری ذاتی آراء ہیں جماعت کے کسی رکن پر انھیں قبول کرنے کی پابندی عائد نہیں بلکہ جس رائے کو کوئی رکن اپنی دانست میں غلط سمجھے اس کا رد بھی کر سکتا ہے۔

ایسی صورت میں مولانا مودودی کی بعض فقہی آراء کو جماعتِ اسلامی کی مخالفت کا بہانہ بنا لینا معقولیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ مولانا مودودی کے تفردات[1] کا شمار بیجا کرایا جاتا ہے۔ ان کی بعض آراء تو ایسی ہیں کہ ان میں وہ متفرد ہیں ہی نہیں بلکہ سلف میں کتنے ہی علماء وہی رائے رکھتے رہے ہیں مگر غلط طور پر انھیں تفرد کا عنوان دے دیا گیا۔ معدودے چند تفردات ہوں بھی تو آخر ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام مالکؒ، ابن تیمیہؒ اور اسی طرح کے بے شمار علماء میں کون ہے جو تفردات کا سرمایہ دار نہیں۔ پھر کیا انھیں ان تفردات کی بنا پر

[1] ایسی آراء جن میں کوئی شخص اکیلا ہو۔ دوسرے اہلِ علم ان میں اس کے ہم

اہ دکھراہ مان لیا گیا۔

ہم خلاصۃً کہہ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف جو فضا پیدا کر دی گئی ہے اس میں شیطانی دسیسہ کاریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ شیطان کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ مسلمان آپس کی مخالفتوں میں وقت اور انرجی برباد کرنے کے عوض مشترکہ مقاصد کے لئے بھائی بھائی بن جائیں اور شیطنت کے فروغ میں روڑے اٹکائیں۔ بھاری بھرکم ناموں پر نہ جائیے شیطان تو وہ ہستی ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو فریب دینے کی فکر کرتا رہا مگر انبیاء کی عصمت اللہ تعالیٰ کو محفوظ رکھنی تھی اس لئے شیطان ناکام رہا لیکن انبیاء کے بعد کوئی معصوم نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو ہوا دے کر ابلیس نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور داماد رسول حضرت علیؓ کو لڑوا دیا۔ دونوں ہی طرف کیسے کیسے جلیل صحابہ تھے۔ پھر علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کی منازعت تو ایک طویل ٹریجڈی ہے۔ کیا یہ اس بات کا اٹل ثبوت نہیں کہ شیطان کی دسیسہ کاری کہاں سے کہاں تک ہے۔ بعد کے علماء و مشائخ صحابہؓ سے برتر تو نہیں ہو سکتے۔ انھیں اگر بعض امور میں شیطان غلط فہمیوں کا ہدف بنا دے تو آخر کیا بعید از قیاس ہے۔ آپ تاریخ دیکھیں۔ امام مالکؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، عزّ الدین بن عبدالسلامؒ، ابن تیمیہؒ، امام بخاریؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ جیسے بزرگوں کو ابتلاء میں گرفتار کرانے والے حضرات کے کیمپ میں کتنے ہی علمائے وقت اور مشائخِ عصر کے نام ملیں گے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ یہ آگے بھی ہوتا رہے گا۔ مذکورہ تمام اکابر آیات مِّن آیات اللہ تھے۔ مولانا مودودی بھی اللہ کی ایک آیت ہیں یعنی نوعِ انسانی کا ایک ایسا فرد جس کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اللہ اکبر زبان سے نکلتا،

شریعت اور توہمات

سوال ۲:۔ از محمد شریف خان۔ بارہمولہ (کشمیر)

عرض حال یہ ہے کہ آج کل اردو ڈائجسٹ "ہما" اور "شبستان" میں روحوں کے متعلق طرح طرح کے واقعات نظر نواز ہوتے ہیں اور اکثر واقعات کو سچا اور اصلی (بلا مبالغہ) قرار دیا جاتا ہے اس سلسلے میں آپ سے عرض ہے کہ شبستان کے سالنامہ ۱۹۷۰ء میں جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "تم کون ہو" اور "بے سر کی عورت" کے مضمون زیر مطالعہ لائیں مزید برآں کچھ مسلمان دوست اپنی آپ بیتیوں میں مختلف قسم کے واقعات سناتے ہیں جو اُن پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے پاس بیٹھا ہوا ایک ڈرائیور ایک ایسا واقعہ سناتا ہے کہ جس میں اس نے عبدالرحیم نام کے کنڈکٹر کی بھٹکتی روح کو اصل جسمانی حالت میں دیکھا اور حد یہ کہ روح نے پکار کر (یعنی نام لیکر) ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔

میرے ایک اور دوست کی ملاقات "راجد ہانی پاس" پر ایک اور ڈاکئے کی روح سے ہوئی جو دو سال قبل وہاں ہلاک ہوا تھا۔ میرے دوست کے بیان کے مطابق روح اصل انسانی شکل میں تھی اور اُسے اپنے ساتھ لینے پر اصرار کر رہی تھی۔

اب جو سوال میرے ذہن کے لئے پریشان کن ثابت ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی علم کے مطابق روحوں کے ٹھیرنے یا قیام کی جگہ "علیین" یا "سجین" ہے پھر ان بھٹکتی روحوں کے وجود اور ان کے مختلف روپ دھارنے کا راز کیا ہے نیز کچھ لوگ کہتے ہیں کہ روحیں اگر اُن کے مرنے کے بعد چوتھا۔ چہلم۔ فاتحہ و نیاز وغیرہ ٹھیک طور انجام نہ دی جائے تو وہ بھٹکتی روحیں بن جاتی ہیں اور زندہ انسانوں کو ڈرانے کا کام سنبھال لیتی ہیں۔ اکثر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر زندگی کے

غالباً ہر کسی کے دل کا کوئی ارمان نکلنے سے رہ جائے تو روح اس کی موت کے بعد وہ بے آوارہ ہو جاتی ہے۔
آپ شاید میرا مقصد سمجھ گئے ہوں گے اس لئے عرض ہے کہ مذہبی (اسلامی) نقطۂ نظر سے اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالیں۔

جوابؒ :-

جہاں تک رسائل میں چھپی ہوئی کہانیوں کا تعلق ہے ان کی صحت پر اعتماد کر کے غائب اشیاء کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا سادہ لوحی کہلائے گا۔ کسی کہانی کے متعلق مصنف کا یہ لکھنا کہ یہ سو فیصدی سچی کہانی ہے بجائے خود ایک افسانوی اسلوب ہے جو قارئین کی زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہانی بنیاداً سچی بھی ہو تو لکھنے والا قلم اسے کبھی مربوط کرنے کے لئے اور کبھی زیادہ تحیر خیز بنانے کے لئے فرضی اور خیالی اضافوں سے ایک نیا رنگ دیتا ہے۔

رہے وہ لوگ جن سے آپ جیسے حضرات کو زبانی اس طرح کی "آپ بیتیاں" سننے کا موقعہ ملے ان پر بھی کامل اعتماد مشکل ہی ہے۔ بارہا ایک توہم پرست آدمی پر کا کبوتر اور رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے اور ایسا وہ دانستہ نہیں کرتا بلکہ اسے شعور ہی نہیں ہوتا کہ جو کچھ اس نے دیکھا یا محسوس کیا اس کا کتنا حصہ بطور امر واقعہ خارج میں موجود تھا اور کتنا حصہ خود اس کے وہم خیز دل و دماغ نے اس میں شامل کر دیا تھا۔

کتنے ہی لوگ دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے مبالغہ آرائی کے عادی ہوتے ہیں، کتنے ہی بالارادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کتنے ہی جھوٹ نہ بولنے کے باوجود اس صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے اسکی ہر تفصیل یاد رکھیں۔ بعض کی یادداشت قوی ہوتی ہے مگر قوت مشاہدہ بھروسے کے قابل نہیں ہوتی۔ ان کے قلب و نظر ایک وسیع اور رنگا رنگ منظر کے کسی ایک ہی حصے یا نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ تفصیلات نظر انداز ہو جاتی ہیں جن کے ذریعہ اس پورے منظر کی منطقی تاویل و تشریح بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔
انسانوں کی گوناگوں صلاحیتوں اور کمزوریوں کے اعتبار سے بے شمار قسمیں ہیں اور اخلاقی رخ سے بھی وہ صدہا اقسام رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے روایت قبول کرنے کا معیار بڑا سخت رکھا ہے۔

جب تک ہر اعتبار سے اطمینان نہ کر لیا جائے کہ فلاں حیرت انگیز قصہ بیان کرنے والا شخص پوری طرح قابلِ اعتماد ہے اس وقت تک اس کے قصے کو بس وقت گذاری اور تفریح کے لئے ہی سننا چاہئے اس سے معنی آفرینی اور اخذ و استنباط کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

علاوہ ازیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہماری دنیا میں اللہ کی پیدا کردہ ایک مخلوق جن بھی رہتی ہے۔ ان میں انسانوں ہی طرح نیک اور بد، پاک نفس اور شریر ہیں۔ متعدد واقعات میں ان کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔ نیز شیطان الگ ایک فتنہ ہے۔ اس کی نہ جانے کتنی ذرّیات ہیں۔ وہ کسی بھی غیر نبی کے بھیس اور شکل و ہیئت میں آدمیوں کو دھوکا دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے کوئی بھی سمجھدار انسان اُن عقائد میں شک نہیں کر سکتا جو قرآن و حدیث سے مضبوطی کے ساتھ ثابت ہوں۔

روحوں کے لئے دو مقام ہیں علیین اور سجّین۔ مگر زیادہ تفصیلات انسانوں کو نہیں بتائی گئیں۔ یقین کے ساتھ کسی کو معلوم نہیں کہ جسموں سے نکلنے والی روحیں اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچنے سے پہلے کن درمیانی مراحل سے گذرتی ہیں اور اس میں کتنا عرصہ لگتا ہے۔ اس موضوع پر کافی مفصل کتاب حافظ ابن قیمؒ کی "کتاب الروح" ہے جس کا اردو ترجمہ بھی غالباً پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی مکمل طور پہ تشفی بخش

نہیں ہے۔

(۳) تیجا، دسواں، چہلم اور فاتحہ و نیاز کا قصہ تو اس کی شرعاً کوئی حقیقت نہیں۔ یہ چیزیں تو توہم پرست اور موٹی عقل والوں نے قیاس سے گھڑ لی ہیں۔ انکو اہمیت دینے کے نتیجے میں مسلمان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ ضروری و اہم چیزوں کو درجۂ ثانی میں ڈال کر یا نظر انداز کر کے غیر ضروری اور بے اہمیت اشیاء پر وقت اور طاقت صرف کرنے لگتا ہے۔

ایسا کوئی شخص کروڑوں میں بھی مشکل سے ایک ملے گا جس کا سینہ مرتے وقت تمام ہی ارمانوں اور حسرتوں سے خالی ہو چکا ہو۔ کم و بیش ہر آدمی صدہا ارمان و حسرت دل میں لئے دنیا سے سدھارتا ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر کسی کی روح کسی کے درپئے آزار کیوں ہونے لگی۔

اور آخری گُر کی بات یہ ہے کہ جن احوال و واقعات کی تشریح و توجیہہ ہم یقینی ذرائع سے نہ کر سکیں مجرد قیاس آرائی اور پرواز تخیل ہی کا سہارا ہمیں میسر ہو انہیں خدا کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ ان کے اسرار وہی جانے۔ آدمی کو دینی اور شرعی نوع کی جتنی تفصیلات اور احکامات و ہدایات درکار تھیں وہ سب قرآن و سنت کے ذریعے واضح کر دی گئیں۔ یہ ذرائع قطعی اور بے ریب ہیں۔ ان کی رہنمائی کے بغیر دسویں اور چہلم اور نذر و نیاز کی رسموں میں وقت اور پیسہ برباد کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔

آگے آپ جانیں اور آپ کا کام!

اسقاطِ حمل کا قانون

سوال:۔ سری نگر (کشمیر)

حکومت جموں و کشمیر نے حال ہی میں اسقاط حمل سے متعلق ایک بل پاس کرایا ہے، جس کے مطابق کوئی بھی شادی شدہ یا غیر شادی شدہ حاملہ عورت کسی بھی حمل کو چاہے وہ حمل حرام ہو یا حلال، کامل الخلقت ہو ناقص الخلقت، جس کی وجہ سے حاملہ عورت کو کسی بھی ذہنی پریشانی یا جسمانی پریشانی لاحق ہونے کا احتمال ہو، تو وہ معالج سے حمل گرواسکتی ہے۔

آپ کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے کہ آپ مطابق شرع اسلامی اپنے فتوے سے مشکور فرمائیں۔ آیا یہ مداخلت فی الدین تو نہیں؟

(نوٹ ۱) بل کا ہو بہو ترجمہ ساتھ ہی ارسال خدمت ہے (نوٹ ۲) یہ استفتاء حصول فتویٰ کمیٹی نے تفصیلی ترجمے کے تمام دفعات و شرائط وغیرہ پر سنجیدہ غور و فکر کے بعد مرتب کیا۔

(دستخط) (۱) مولانا محمد عباس انصاری (۲) صوفی احمد مسلم (۳) محمد قاسم شاہ وکیل۔

(اراکینِ حصول فتویٰ کمیٹی)

جواب:۔

ایک ایسی حکومت سے جو لادینی جمہوریت اور سیکولرازم کی فلاسفی پر اپنے قوانین کی عمارت تعمیر کرتی ہو یہ توقع رکھی نہیں جاسکتی کہ قانون سازی میں وہ دین و اخلاق کی قدروں اور اصولوں کو ملحوظ رکھے گی۔

لیکن خلافِ دین قوانین دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو لوگوں کے لئے اختیاری حیثیت رکھتے ہوں اور ان کی مرضی کے خلاف کسی طرح کا جبر ان پر نہ مسلط ہوتا ہو۔ جیسے جوئے کے لائسنس جاری کرنا، سینما ہال تعمیر کرنے کی اجازت دینا، شراب فروشی کے پرمٹ عطا کرنا وغیر ذلک۔ یہ سب دینی اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہے مگر اس میں کسی پر جبر نہیں۔ آپ کو حکومت مجبور نہیں کرتی کہ جوا کھیلئے، سینما دیکھیے، شراب پیجئے۔ اس طرح کے قوانین کے خلاف عام اخلاقی نقطۂ نظر اور اصلاح معاشرہ کے رُخ سے احتجاج کرنا ضروری

ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اسے مذہب دشمنی قرار دیکر حکومت سے جنگ شروع کر دی جائے۔ اس طرح کی قانون سازی "مداخلت فی الدین" کے زمرے میں نہیں آتی۔

دوسرے وہ قوانین ہیں جو لوگوں پر انکی مرضی کے خلاف کوئی چیز ٹھونستے ہوں۔ جیسے وراثت اور نکاح و طلاق کے قوانین۔ جس وارث کو قانونِ شریعت جتنا حصہ دیتا ہے اس میں یقیناً فرق واقع ہوگا اگر حکومت شرعی قواعد میں تبدیلی کرے۔ کچھ لوگ اپنے شرعی حصے سے محروم ہو جائیں گے اور کچھ حصے سے زیادہ لے جائیں گے۔ اسی طرح نکاح و طلاق کے قواعدِ شرعیہ میں جو بھی تبدیلی حکومت کرے گی اس سے عام مسلمانوں کی زندگی متأثر ہوگی اور عدالتیں انھیں پابند کرسکیں گی کہ قانون سلطنت کے مطابق عمل کریں خواہ شرعاً یہ عمل فاسد و باطل ہو۔

اس طرح کے قوانین کے خلاف نہ صرف عام اخلاقی نقطۂ نظر سے احتجاج ضروری ہے بلکہ مسلمانوں کو پوری جدوجہد کرنی او تحریک چلانی چاہیئے کہ یہ قوانین مسترد ہوں یا ابھی بننے جارہے ہوں تو ان کا بننا رُک جائے۔

اسقاط کے جس قانون پر یہ استفتا مشتمل ہے وہ اول الذکر قسم میں داخل ہے لہذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت نے مداخلت فی الدین کی ہے۔ نیز یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس قانون کو بنانے میں حکومت کی نیک نیت نہیں ہے۔ ہاں یہ یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ حکومت جس قانون کو معاشرے کے لئے مفید سمجھ کر نافذ کر رہی ہے وہ سخت دینی مضرتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔

زکوٰۃ اور صدقۂ فطر کا مسئلہ

سوال ۶:- از: نیاز احمد رضوان۔

(۱) صدقۂ فطر محتاجوں کا حق ہے۔ لیکن اگر امام محتاج ہو تو اس کو صدقۂ فطر دے سکتے ہیں یا نہیں۔ اگرچہ میرے خیال کے مطابق بحیثیت امام اس کو صدقۂ فطر لینا جائز نہیں۔

(۲) اگر امام بچوں کو تعلیم القرآن دے اور محتاج ہونے کی وجہ سے صدقۂ فطر اجرت یا تنخواہ میں لے تو لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:-

اصول یہ سمجھ لیجئے کہ جو لوگ زکوٰۃ کے مستحق ہوں وہی صدقۂ فطر کے مستحق ہیں خواہ وہ امام مسجد ہوں یا مدرسے کے استاد۔ قرآن کی تعلیم دیتے ہوں یا کوئی اور نصاب پڑھاتے ہوں۔

زکوٰۃ کے مستحقین کون لوگ ہیں اسے بھی ہیں نوٹ کرلیجئے یا ذہن میں بٹھا لیجئے:-

زید کے پاس ۵۲ ½ تولہ چاندی موجود ہے (خواہ زیورات کی شکل میں یا دھات کی شکل میں) تو وہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں کیونکہ زکوٰۃ تو خود اس پر واجب ہو گئی ہے۔ اسی طرح اس کے پاس اگر ساڑھے سات تولہ سونا ہے یا مثلاً چار تولہ سونا ایک دو تولہ چاندی ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ جب چاندی اور سونا دونوں موجود ہوں تو دونوں کی موجود الوقت قیمت جوڑ کر دیکھا جائے گا کہ اس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اگر خریدی جاسکتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی مثلاً بیس تولہ چاندی کا ایک زیور ہے اور تین تولہ سونے کا بھی ایک زیور ہے۔ تنہا چاندی یا تنہا سونے کی بنا پر تو اس شخص پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ لیکن فرض کیجئے

چاندی کا بھاؤ دس روپے تولہ ہے اور سونے کا پانچ سو روپے۔ تو بیس تولہ چاندی دو سو کی ہوئی اور تین تولہ سونا پندرہ سو کا۔ سترہ سو میں ایک سو ستر تولہ چاندی آ جائے گی لہٰذا اس شخص پر سترہ سو کی زکوٰۃ واجب ہو گئی جو بیالیس روپے پچاس پیسے بنتی ہے (ڈھائی فی صد کی شرح سے) سونا چاندی نہ ہو لیکن ۵۲ ½ تولہ چاندی کی قیمت کا سامانِ تجارت ہو تو اس سامان پر بھی سال بسال زکوٰۃ عائد ہو گی۔

البتہ تجارت کا سامان نہ ہو استعمالی سامان ہو تو چاہے کتنے ہی کا ہو اس پر زکوٰۃ نہیں لیکن یہ شخص زکوٰۃ لے بھی نہیں سکتا۔ مثلاً زید کے پاس نصاب کے بقدر سونا چاندی نہیں۔ مالِ تجارت بھی نہیں لیکن گھر میں فالتو سامان کافی ہے جیسے ریڈیو ٹرانسسٹر، فاضل لحاف بستر، کبھی کبھار خصوصی تقاریب میں استعمال ہونے والے چائے کے سیٹ یا ڈنر سیٹ وغیرہ تو اگرچہ ان اشیاء پر زکوٰۃ نہیں لیکن ان کا مالک زکوٰۃ لے بھی نہیں سکتا۔ ہاں ضروری استعمال کی چیزوں کا حکم جدا ہے۔ زید کے گھر میں کچھ کرسیاں ہوں، روزانہ استعمال کے کافی برتن ہوں، کپڑا سینے کی مشین ہو، دفتر جانے کی سائیکل ہو مگر سونا چاندی بقدرِ نصاب نہ ہو اور بال بچوں کا گزارا میسر آمدنی میں سہولت سے نہ ہو رہا ہو تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ بلکہ اربابِ استطاعت کو خاص طور پر ایسے سفید پوشوں کا خیال اپنی زکوٰۃ میں رکھنا چاہئیے کیونکہ یہ بے چارے مانگ بھی نہیں سکتے۔ زکوٰۃ دیتے ہوئے بالکل ضروری نہیں کہ دینے والا اظہار بھی کرے۔ اس کا صرف دل میں نیت کر لینا کافی ہے۔

کسی معلم کو خواہ وہ بچوں کا ہو یا بڑوں کا اس کی تنخواہ میں صدقۂ فطر اور زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ اس کی تنخواہ تو حق الخدمت کے طور پر پہلے ہی واجب ہے۔ یہ حق الخدمت الگ ادا کیجئے اور زکوٰۃ الگ سے دیجئے جب کہ یہ معلم مندرجہ بالا قواعد کی رو سے زکوٰۃ کا مستحق ہو۔ زکوٰۃ کسی خدمت کے بدلے میں نہیں دی جاتی وہ تو حسبۃً للہ دی جاتی ہے۔ مزدور کو مزدوری دیتے ہوئے اگر آپ یہ نیت کر لیں کہ میں زکوٰۃ دے رہا ہوں تو یہ فضول ہو گا۔ زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

زمین سے زمین بدلنا

سوال:۔ (ایضاً)

جنس کے بدلے جنس اگر تبادلہ کرنا ہو، مثلاً ایک آدمی کے پاس زمین ڈیڑھ کنال ہے اور دوسرے کے پاس ایک کنال، دونوں تبادلہ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے آدمی کی زمین ڈھلوان اور بنجر ہے جس میں مرمت کرنے سے یہ قابل بن جائے دوسرے کے پاس اچھی زمین ہے یہ آپس میں تبادلہ اس طرح کرتے ہیں کہ ڈیڑھ کنال زمین ایک کنال کے بدلے تبادلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں ایک طرف زیادتی ہوتی ہے جو سود ہے۔ اس تبادلے کو شریعت کے مطابق کس طرح بنایا جائے؟

جواب:۔

جنس کے بدلے جنس کے تبادلے کا مسئلہ اور ہے اور زمین کے بدلے زمین کا اور۔ آٹا یا گیہوں یا چنا اور جوار وغیرہ کا تبادلہ کرنا ہو تو دو لازمی شرطیں ہیں۔ برابر سرابر بدلنا اور ہاتھوں ہاتھ بدلنا۔ یہ نہیں کہ آپ نے زید کو دس کلو گیہوں ابھی دے دئیے اور وہ کہے کہ دس کلو گیہوں میں تمہیں شام کو لوٹا دوں گا۔

رہیں وہ چیزیں جو تول کر نہیں پیمائش کے حساب سے یا گنتی کے حساب سے بکتی ہیں ان کا یہ حکم نہیں۔ زمین پیمائش کے حساب سے بکتی ہے۔ بیگہ، ایکڑ، کنال جو بھی اصطلاحات کہیں رائج ہوں بہرحال زمین کی خرید و فروخت طول و عرض کے حساب سے ہوتی ہے

لہذا یہ تو ضروری ہے کہ لین دین اور تبادلہ ہاتھوں ہاتھ ہو مگر برابر ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ مختلف زمینیں اپنی صلاحیت اور محل وقوع کے اعتبار سے اچھی یا بری ہوتی ہیں۔ بنجر زمین زرخیز زمین کی ہمسر کہاں ہو سکتی ہے یا نہروں کے قریب واقع ہونے والی زمین کا مقابلہ لق ودق صحرا کی گود میں پائی جانے والی زمین کے لئے کہاں ممکن ہے لہذا زمینوں کے مالک مختار ہیں کہ جس طرح مناسب سمجھیں اپنی زمینوں کا تبادلہ کر لیں۔ اس میں طول و عرض کی کمی بیشی سود نہیں ہے۔

آپ یا اور کچھ عام لوگ اس طرح کے مسائل میں یوں کان نہ کریں اور اپنے قیاس سے کام نہ لیں تو بہتر ہے۔ ان مسائل کے لئے اہلِ علم کے پاس دلائل موجود ہیں لیکن عوام کو دلائل سے نہیں اہلِ علم کے فتووں سے سروکار ہونا چاہیئے۔

خدمتِ دین

سوال:۔ (ایضاً)

مجھ سے دین کا کام کچھ نہیں ہوتا، دل میں بہت شوق ہے۔ خامیاں بہت ہیں۔ میں کس طرح دین کا کام کروں اور بہتر کام دین کا کیا ہے اس کی طرف زیادہ توجہ مبذول فرمائیں تاکہ نیک اعمال ہوں۔

جواب:۔

اگر بھلے کاموں کا شوق ہے تو بہت بڑا میدان پڑا ہے۔ پڑوس والوں کے کام آیئے۔ ضرورت مندوں کی مدد کیجئے۔ احباب و اعزا کو اچھی باتیں بتایئے اور برے کاموں سے روکنے کی مخلصانہ کوشش کیجئے۔ یہ سب "خدمتِ دین" ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس سے آگے یہ ہے کہ خلقِ خدا کی خدمت اور دین کی اشاعت کرنے والی کسی جانی پہچانی جماعت کے ممبر بن جایئے اور جو کام یہ جماعت آپ کے لئے اسے محنت اور اخلاص سے پورا کیجئے۔

خامیوں سے کون خالی ہے۔ ان لوگوں کو غنیمت سمجھئے جن کی خامیاں انگلیوں پر گنی جا سکیں ورنہ ہم میں سے ہر ایک بے شمار خامیاں رکھتا ہے۔ ان گنت گناہ کرتا ہے۔ آپ کو اپنی جن خامیوں کا شعور ہو جائے ان کی تطہیر کوئی دوسرا دور نہیں کرے گا بلکہ آپ خود کریں گے۔ بہتر سے بہتر صاحبِ ایمان بننا بھی آپ کی اپنی ہی جدوجہد پر منحصر ہے۔ شریعت کے احکام اللہ کے فضل سے معلوم و معروف ہیں۔ اچھی سے اچھی دینی کتابیں اردو میں بھی موجود ہیں۔ انھیں مشعلِ راہ بنا کر زندگی گذاریئے۔ آپ عزم کر لیں گے تو اللہ بھی مدد کرے گا۔

ایشیا (لاہور)

مولانا مودودی کی مجلس

چند دن پیشتر ایک رات مولانا محترم کے سینے میں درد کی شکایت رہی۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد یہ بتایا کہ سینے کی یہ تکلیف دل پر کسی قسم کی خراش یا زخم کے نتیجے میں نہیں ہوئی اور تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، تاہم احتیاط ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نے مولانا محترم کو ایسی ملاقاتوں سے روک دیا ہے جو دل و دماغ پر بوجھ ڈالنے والی ہوں۔ البتہ عصر و مغرب کے درمیانی وقت میں مولانا محترم آنے والوں سے بدستور ملاقات کر رہے ہیں اور نماز عصر کے بعد کی مجلس پر رونق ہے۔

مولانا محترم چونکہ ان دنوں سیرت پر کام کر رہے ہیں، اس لئے ہر مجلس میں کوئی نہ کوئی ملاقاتی ضرور اس کے بارے میں سوال کر بیٹھتا ہے۔ سوال کی نوعیت یہی ہوتی ہے کہ کتنا کام مکمل ہو چکا ہے۔ کتاب کب تک چھپ کر آجائے گی اور یہ کتنے حصوں پر مشتمل ہوگی؟ مولانا محترم اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں پوری تفصیل سے ان استفسارات کا جواب دیتے ہیں، ایک مجلس میں مولانا محترم نے بتایا کہ سیرت کی پہلی جلد کتابت ہونے کے بعد چھپنے کے لئے تیار ہے، دوسری جلد کی کتابت بھی قریب قریب مکمل ہو چکی ہے پہلی جلد چھپنے کے بعد یہ بھی پریس میں چلی جائے گی۔ اس کے بعد دو مزید جلدوں کا کام باقی رہ جائے گا، اس طرح سیرت چار جلدوں میں مکمل ہو جائے گی۔

ایک نوجوان کا سوال ترجمے والے قرآن پاک کے بارے میں بھی تھا، کیونکہ ادارہ ترجمان القرآن مولانا محترم کے ترجمۂ قرآن کو عربی متن کے ساتھ الگ شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔

مولانا محترم نے بتایا کہ یہ کام بھی مکمل ہو چکا ہے اور کتابت کے بعد اس کی پانچ مرتبہ تصحیح بھی ہو چکی ہے اشاعت میں تاخیر اس لئے ہو گئی کہ مطلوبہ باریک کاغذ کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ باریک کاغذ امپورٹ کروایا

جارہا ہے کہ قرآن با ترجمہ پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور عام کاغذ لگانے سے اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ قرآن پاک ایک ہی جلد میں شائع کیا جائے اس لئے اب باریک کاغذ تیار کروایا جارہا ہے انشاء اللہ مارچ اپریل میں قرآن پاک چھپ کر آجائے گا۔

اسی مجلس میں ایک نوجوان نے جماعتِ اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی کے اتحاد کے بارے میں ایک سوال کردیا۔ سائل کا موقف یہ تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی سیکولر نظام کی داعی ہے جب کہ جماعتِ اسلامی کا مقصود اسلامی نظام ہے۔

مولانا محترم نے فرمایا کہ متحدہ جمہوری محاذ میں تمام جماعتوں نے جن میں جماعتِ اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی بھی شامل ہے۔ ان بارہ نکات پر اتحاد کیا ہے جو سراسر اسلامی اور ملک کی سالمیت وبقا سے متعلق ہیں۔ اس اتحاد کے نتیجے میں نیشنل عوامی پارٹی بھی اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کی بات کرنے کی پابند ہو گئی ہے۔ مولانا محترم نے مزید فرمایا کہ یہ اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ نیپ نے ختم نبوت کی تحریک کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کے حق میں ووٹ دیا۔

اسی نوجوان نے پھر پوچھا، اگر جماعتِ اسلامی نیپ سے اتحاد کرسکتی ہے تو پیپلز پارٹی سے اتحاد کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

مولانا محترم نے جواب دیا کہ پیپلز پارٹی اقتدار چھوڑ کر اپوزیشن میں آجائے تو محاذ کے بارہ نکات پر اس سے بھی اتحاد ہوسکتا ہے، لیکن موجودہ صورتِ حال میں اتحاد اس لئے ممکن نہیں کہ پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار جماعت ہے اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہے تو کرسکتی ہے اس کی حیثیت ان جماعتوں کی سی نہیں ہے جو حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے میدان میں نکلتی ہیں پیپلز پارٹی تو حکومت کا ہی دوسرا نام ہے۔ وہ بحالتِ موجودہ اس اتحاد میں کیسے شامل ہوسکتی ہے، رہا نیپ سے اس کا تقابل تو نیپ خواہ سیکولر نظریات کی حامی کیوں نہ ہو، لیکن اس وقت تو اس سے اسلام نظریۂ پاکستان اور ملک کی سالمیت وبقا سے متعلق نکات پر اتحاد کیا گیا ہے اور وہ اس بات کی پابند ہے کہ اس جدوجہد میں دوسری جماعتوں کا ساتھ دے۔

ایک سوال مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں اسلام کی اشاعت سے متعلق تھا، مولانا محترم جب سے امریکہ سے واپس آئے ہیں ملاقاتی اکثر یہ سوال کرتے رہتے ہیں۔

مولانا محترم نے فرمایا کہ امریکہ میں نیگرو نسل کے لوگ بڑی تیزی سے اسلام قبول کررہے ہیں۔ یہ محض زبانی اقرار وقبول نہیں ہے، بلکہ اسلام قبول کرتے ہی ان کی زندگی کا ہنجار بدل جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو عین اسلام کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ پھر اسلام کی اشاعت وتبلیغ ان کی زندگی کا مقصود بن جاتا ہے۔ البتہ سفید نسل میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار تیز نہیں ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ سفید نسل اسلام کے بارے میں تعصب کا شکار ہے چونکہ یہ عیسائیت سے متنفر ہو چکی ہے اس لئے اطمینانِ قلب کی تلاش میں پہلے وہ بدھ مت، ہندو مت اور یہودیت وغیرہ کا مطالعہ کرتی ہے لیکن جب یہ مذاہب بھی اس کے درد کا مداوا نہیں کرسکتے تو پھر وہ آخر میں اسلام کا مطالعہ کرتی ہے سفید نسل کے جو لوگ سنجیدگی سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، اسلام ان کے اندر اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اطمینانِ قلب ہوجاتا ہے اور وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اسلام کو اختیار کرلیتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں اب تو سفید نسل کے مسلمانوں نے بھی اپنی تنظیم قائم کرلی ہے اور وہ بڑے جوش وخروش سے کام کررہے

ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی کمی اسلامی لٹریچر کی ہے، جس کی وجہ سے دنیا میں اسلام پھیلنے کی رفتار وہ نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔

ایک نوجوان نے دریافت کیا کہ کیا جماعت اسلامی لٹریچر کی کمی کو دور نہیں کرسکتی؟ مولانا محترم نے فرمایا جماعت اسلامی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کے ہر ملک کو اس کی اپنی زبان میں کثرت سے اسلامی لٹریچر فراہم کرسکے۔ تاہم جماعت نے اپنے وسائل کی حد تک دنیا کی بہت سی زبانوں میں اپنا لٹریچر شائع کیا ہے اور وہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مولانا محترم نے اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر رابطہ عالم اسلامی دنیا کے ہر ملک کی زبان میں اسلامی لٹریچر کا ترجمہ کروانے کے لئے بہترین مترجموں کا بندوبست کرے تو بہت جلد دنیا کی ہر زبان میں اسلامی لٹریچر مہیا کیا جاسکتا ہے۔ رابطہ اگرچہ جزوی طور پر یہ کام کررہا ہے تاہم اسے بہت وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

ایک مجلس میں کسی صاحب نے سوال کیا مولٰنا مغرب کی خاندانی زندگی میں کیا کمزوریاں ہیں؟

مولانا نے فرمایا، اصل میں مغرب کی خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ان لوگوں میں وہ احساسات تقریباً مفقود ہو گئے ہیں جو خاندانی زندگی اور معاشرے کی اساس قرار پاتے ہیں۔ مغربی خاندانوں میں ماں باپ لڑکے لڑکیاں سب خودمختارانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ والدین پہلے خود اپنی نوجوان اولاد کو آزاد کر دیتے ہیں، اور جب وہ کھانے کمانے لگ جاتی ہے تو والدین کی خدمت و اطاعت کو فراموش کر بیٹھتی ہے اور بوڑھے والدین کو یا تو اپنے پس انداز کئے ہوئے سرمائے پر گذر اوقات کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ محتاج خانے میں داخل ہو جاتے ہیں اور زندگی کے دن پورے کر کے ملک عدم کو سدھار جاتے ہیں۔

مولانا محترم نے اس ضمن میں یہ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ لندن میں ایک بوڑھی عورت اپنے فلیٹ میں مرگئی اور چار دن تک مری پڑی رہی۔ آخر جب اسکے پڑوسیوں کو علم ہوا تو ان میں سے کسی نے اسکے لڑکے کو ماں کے مرنے کی اطلاع دی۔ لڑکے نے ماں کی میت پر پہنچنے کے بجائے مُردوں کو دفنانے والی انجمن کو فون پر اطلاع دی کہ فلاں جگہ ایک بڑھیا چار یا پانچ دن سے مری پڑی ہے اسے دفنا دیا جائے اور جو خرچ آئے اس کا بل مجھے بھیج دیا جائے ——— یہ ہے ان لوگوں کی زندگی کا نقشہ۔ جو لوگ اپنے والدین کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوں وہ دوسری قوموں کے ساتھ بھلا کب اچھا سلوک کرسکتے ہیں۔

قطعات

عامر عثمانی

دیوانوں کو اہلِ خرد نے چوراہے پر سولی دی ہے
تھی یہ فردِ جرم کہ اس نے فرزانوں پر کنکر پھینکا
بارہا کہتا تیری دہائی اے منصف تو اہلِ نظر ہیں
ان کو خبر ہے سنگِ ملامت پہلے اس نے کس پر پھینکا

شرم سے گردن جھک جاتی ہے یاں کہنی کیسا ہو ہیں
کن کن لوگوں نے چھپ چھپ کر وار ہے مجھ پر خنجر پھینکا
رہزنوں ہی کی راہبری تھی جس کے بھروسے ہیں نے اکثر
زہر خریدا امرت چھوڑا کنکر ڈھونڈا گوہر پھینکا

طعنۂ عصیاں دینے والو ایک نظر اس پر بھی ڈالو
میری توبہ کے شیشے پر فطرت نے خود پتھر پھینکا
بے موسم گھر آئے بادل بن بادل بھی برسا پانی
میں نے جب بھی توبہ کر کے مینا توڑا ساغر پھینکا

میری نظر میں یہ بھی ساقی کم نظری ہے بے ذوقی ہے
کس نے ٹوٹا ہوا ساغر میخانے سے باہر پھینکا
میخواروں کو یہ تو خبر تھی اس کو تیرا ہاتھ لگا ہے
باہر کی ناپاک زمیں پر پھر کس دل سے کیونکر پھینکا

[illegible] بھی کھیل گیا ساقی نے
[illegible] دیا ہی کو [illegible] کر دیا لیکن ظالم نے
میرے ہی آگے صہبا کو پیمانے میں بھر بھر پھینکا
پاس بلا کر آس بندھا کر دکھلا کر للچا کر پھینکا

پچھلے شمارے میں اس مبارک کتاب کے چند اوراق دیئے گئے تھے وہ اکتوبر [illegible] کے ترجمان القرآن سے تھے ذیل کے اوراق اگست [illegible] کے ترجمان القرآن سے ہیں۔ گویا ان میں باہم ترتیب نہیں ہے لیکن الحمدللہ اگلے ماہ سے یہ کتاب ترتیب سے پیش کریں گے۔ انشاء اللہ ——— (ادارہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان

—— ۳ ——

حضرت اسماعیلؑ کی رسالت اور عرب میں اس کے اثرات

اغلب یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور اس گھر کو مرکز و مرجع قرار دے کر ہر سال اس کی طرف حج کرنے کا اذنِ عام لوگوں کو دیا وہی وقت تھا جب حضرت اسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا تاکہ وہ عرب میں دینِ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے:-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ	اور اس کتاب میں اسماعیلؑ
كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ	کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا
رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ وَكَانَ يَاْمُرُ	اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر
اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ	والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم
وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔	دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک
(مریم۔ ۵۴-۵۵)	پسندیدہ تھا۔

اگرچہ تاریخ میں حضرت اسماعیلؑ کی زندگی کے حالات اور ان کی رسالت کے کام کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں لیکن ان کی رسالت کے کامیاب ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حج اور عمرے کے لئے عرب کے تمام اطراف و نواحی سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔ مناسکِ حج تقریباً وہی رہے جو ابتداء میں مقرر کئے گئے تھے۔ صفا اور مروہ کی سعی اور ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کا طریقہ بھی عربوں میں رائج رہا جو بلاشبہ حضرت ہاجرہ کی سعی اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانی ہی کی یادگار تھا۔ حج اور عمرے کی خاطر چار مہینوں کی حرمت بھی تمام اہلِ عرب میں مسلّم رہی اور دینِ ابراہیمی کے دوسرے بہت سے شعائر بھی عربوں میں مروّج رہے۔ مثلاً ختنہ، غسلِ جنابت، جانوروں کو ذبح کرنے اور اونٹوں کو نحر کرنے کا طریقہ، مُردوں کو دفن کرنا، نکاح اور طلاق اور اِحداد (بیوہ کے سوگ) کے قاعدے بیٹیوں اور ماؤں اور بہنوں کو حرام سمجھنا، قصاص اور دیت اور قسامت کے احکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض حکمائے عرب وضو بھی کرتے تھے بعض نماز بھی پڑھتے تھے۔ جیسے قس بن ساعدۃ الایادی۔ حضرت ابوذرؓ بھی اسلام قبول کرنے سے تین سال پہلے ہی نماز پڑھنے لگے تھے، اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی نماز تھی۔ اس کے علاوہ عربوں میں روزہ کا بھی ایک طریقہ رائج تھا۔ وہ اعتکاف بھی کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بہت سی چیزوں کو اہلِ عرب نیکی کے کام سمجھتے اور ان کی مدح کرتے تھے۔ مثلاً مہمان اور مسافر کی ضیافت۔ مساکین کی مدد کرنا اور صلہ رحمی کرنا۔ اگر حضرت اسمٰعیلؑ کی رسالت کو عرب میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبے رہنے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اس دین کے آثار باقی اور تمام عرب میں جاری و ساری رہتے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی اور ان سے متاثر ہونے والوں کی تبلیغ

ہی کا یہ اثر تھا کہ اہل عرب میں حضورؐ کی بعثت کے زمانے تک اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ تصورات پائے جاتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ زخرف، آیت ۸۷۔ سورۂ عنکبوت، آیات ۶۱ تا ۶۳۔ سورۂ مومنون، آیات ۸۴ تا ۸۹۔ سورۂ یونس، آیات ۲۲۔ ۲۳ و ۳۱۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۶۷)۔

اور یہ بھی رسالت اسماعیلیؑ کا اثر ہی تھا کہ بعثت محمدیؐ کے وقت تک عرب میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ موجود رہا جنھیں تاریخ میں حنفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے مختلف قبائل میں جگہ جگہ پائے جاتے تھے شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرتے تھے اور دین ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے "تفہیم القرآن" جلد چہارم میں صفحہ ۷۴ پر ان لوگوں کی فہرست درج کی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض کے حالات لکھتے ہیں:۔

النابغۃ الجعدی۔ یہ بنی عامر بن صعصعہ میں سے تھے جاہلیت کے زمانے میں دینِ ابراہیمی اور حنیفیت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ روزے رکھتے اور استغفار کیا کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ جاہلیت کے کلام میں توحید اور حیات بعد موت اور جزاء و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں انھوں نے اسلام قبول کیا (الاستیعاب ج ۱، ص ۳۱۰)

صِرْمَہ بن انس۔ یہ بنی عدی بن نجار میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں درویشی اختیار کر لی تھی۔ بت پرستی چھوڑ دی تھی۔ غسل جنابت کرتے اور حائضہ سے پرہیز کرتے تھے۔ شراب اور ہر نشہ آور چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ پہلے عیسائی ہونے کا ارادہ کیا پھر رک گئے اور ایک مسجد سی بنائی جس میں کسی جنبی یا حائضہ کو نہیں آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں رب ابراہیم کی عبادت کرتا ہوں اور دین ابراہیمی کا پیرو ہوں۔ ان کا ایک شعر ہے:۔

الحمد للہ ربی لا شریک لہ
من لم یقلہا فنفسہ ظلما

"تعریف میرے رب اللہ کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو شخص اس کا قائل نہیں ہے وہ اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۳۲۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۱۷۹۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۶)۔

عمرو بن عَبَسَہ۔ یہ بنی سُلَیم میں سے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انھوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی۔ امام احمد نے ان کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں ان کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے۔ ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی باتیں کہتا ہے۔ چنانچہ میں مکہ آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آپ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپؐ کی رسالت پر ایمان لے آیا (الاستیعاب ج ۴، ص ۴۳۱)

سب سے زیادہ سبق آموز قصہ زید بن عمرو بن نفیل کا ہے جو حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی اور حضرت سعیدؓ بن زید (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور یکے از عشرۂ مبشرہ) کے والد تھے۔ یہ توحید کے عقیدے میں بہت سخت تھے۔ بت پرستی، اور مردار اور خون اور بتوں پر کی ہوئی قربانی کو حرام سمجھتے تھے۔ بیٹیوں کے قتل کو بہت برا جانتے تھے اور ان کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کو بھی انھوں نے رد کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ ہماری قوم کے شرک اور ان کے شرک میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر کا بیان ہے کہ "میں نے زید بن عمرو کو دیکھا کہ وہ کعبہ کی دیوار کے سہارے بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ قریش کے لوگو، خدا کی قسم میں کسی ایسے جانور کا گوشت نہیں کھاؤں گا جو اللہ

سوا کسی کے لئے ذبح کیا گیا ہو۔ خدایا قسم دینِ ابراہیمؑ
یرے سوا کوئی نہیں ہے۔" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ
فدایا اگر مجھے معلوم ہو تا کہ تیری عبادت کا کونسا طریقہ
ے سب سے زیادہ محبوب ہے، تو میں اُسی طرح تیری عبادت کرتا۔"
روہ اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر سجدہ کرتے۔ انھوں نے دینِ
براہیمی کی تلاش میں شام کا سفر کیا مگر وہ نہ یہود میں
لا اور نہ نصاریٰ میں۔ اس پر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر
ہا "خدایا میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں دینِ ابراہیمؑ پر
وں۔" آخر کار بلادِ لخم میں حضورؐ کی بعثت سے پانچ سال
لے کسی نے انھیں قتل کر دیا۔ ان کا چچا خطاب انکو دینِ
بائی سے پھر جانے پر سخت تنگ کرتا تھا حتیٰ کہ اس نے
ھیں مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور قریش کے شُہدا
ان کے پیچھے لگا دیا کہ اسے شہر میں نہ گھسنے دو۔ زمانۂ اسلام
یں حضرت عمرؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید نے حضورؐ سے
رض کیا کہ زید کے خیالات آپ کو معلوم ہیں کیا ہم ان کے
ئے دعائے مغفرت کریں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں، قیامت
ے روز وہ تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔"
الاستیعاب ج ۲، ص ۵۳۹۔ الاصابہ، ج ۱، ص ۵۵۲،
بن ہشام، ج ۱، ص ۲۳۹۔ ۲۴۰)

تاہم عام اہلِ عرب جس شرک میں مبتلا تھے اس کی
وعیت اُن کے اُس تلبیہ سے معلوم ہوتی ہے جو وہ حج
ے موقع پر کرتے تھے۔ ان کا تلبیہ یہ تھا:-

بیك اللّٰھم لبیك، لبیك ۔۔۔ میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر
ا شریك لك اِلّا شریکاً ۔۔۔ ہوں۔ میں حاضر ہوں، کوئی تیرا
ھو لك، تملکہ وما ملك ۔۔۔ شریک نہیں سوائے اُس شریک

کے جو تیرا ہی ہے، تو اس کا بھی مالک ہے اور ہر
اُس چیز کا بھی مالک جس کا وہ مالک ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے بہت سے مفروضہ خداؤں
کو معبود ماننے کے باوجود ایک ربِّ اعلیٰ کی حیثیت سے اللہ
کو مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے تمام معبود اُس بزرگ و
برتر ہستی کے بندے اور مملوک ہیں۔ اس کو رسالتِ اسماعیلی
کے اثرات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی جاہلیت
اور بدترین شرک میں ڈوب کر بھی اللہ کے بارے میں
اُن کے اندر یہ عقیدہ موجود تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت کا انتظام

حضرت اسمٰعیلؑ جب تک زندہ رہے خانۂ کعبہ کی تولیت ان ہی
کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت
متولی ہوئے۔ لیکن نابت کی وفات کے بعد جُرہُم کے لوگ
جو مکہ میں حضرت ہاجرہ کے وقت سے بسے ہوئے تھے اس
گھر کی تولیت پر قابض ہو گئے اور صدیوں تک قابض
رہے۔ ان لوگوں میں رفتہ رفتہ اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ
انھوں نے مکہ کی حرمت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ کعبہ
میں جو مال ہدیۃً دیا جاتا تھا اسے ناجائز طور پر کھانے
لگے۔ زیارت کے لئے آنے والوں کو ستانے لگے۔ یہاں تک
کہ ان میں سے جب کسی کو زنا کے لئے کوئی جگہ نہ ملتی تو وہ
خانہ کعبہ میں جا کر یہ گناہ کرتا تھا۔ اسی زمانے کا یہ واقعہ
ہے کہ ایک شخص اِساف نے ایک عورت نائلہ کے ساتھ
کعبہ میں یہ فعلِ حرام کیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو مسخ کر دیا۔
کچھ مدت تک تو یہ واقعہ نشانِ عبرت بنا رہا مگر ایک مدت
بعد ان دونوں کے بُت بنا کر ایک کو صفا پر اور دوسرے کو
مروہ پر رکھ کر ان کی عبادت کی جانے لگی۔ یہ اُس تنزل کی
انتہا تھی جس میں خانہ کعبہ کے یہ متولی مبتلا ہو گئے تھے۔

آخر کار جب جُرہمیوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں
تو بنی کنانہ میں سے بنی بکر بن عبدِ مناۃ اور بنی خزاعہ میں سے
غُبشان نے مل کر اُن سے جنگ کی اور اُن کو مکہ سے نکال دیا۔
چلتے ہوئے یہ لوگ زمزم کو بند کر کے اُس کا نشان تک مٹا
گئے اور اپنے اصل وطن یمن کا راستہ لیا۔ اُن کے بعد کعبہ کی
تولیت بنی خزاعہ کی اُس شاخ کے قبضے میں آگئی جو غبشان
کے نام سے موسوم ہے۔ تین چار سو برس تک وہی اس مقدس
گھر کے متولی رہے اور ان ہی کے زمانہ میں خانہ کعبہ ایک پورا
بُت خانہ بن گیا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اس قبیلے کا

سردار عمرو بن لحی ایک مرتبہ شام گیا اور وہاں اس نے لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ اسے یہ چیز بہت پسند آئی' وہاں سے ہبل نامی ایک بت لے آیا اور کعبہ میں اسے نصب کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس پر مزید بتوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انہی میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور حضرت مریمؑ کے بت بھی شامل تھے۔ حضرت مریمؑ کا بت غالباً اس لئے رکھا گیا تھا کہ عیسائی عرب بھی کعبہ کی طرف رجوع کریں۔ بخاری کتاب الانبیاء میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صورت اس شکل میں تھی کہ دونوں کے ہاتھوں میں ازلام (پانسے) تھے۔

کعبہ کی تولیت پر خزاعہ کا قبضہ اُس وقت ختم ہوا جب قریش میں سے قصی بن کلاب نے اُسے اپنے خزائی خسر سے حاصل کیا۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

اولادِ اسماعیل علیہ السلام

عرب کے علماء انساب اور قبائل کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے مگر جب مکہ پر جرہمیوں کا قبضہ ہو گیا تو اولادِ اسماعیل کا بہت تھوڑا سا حصہ اِس شہر میں بسا رہ گیا' باقی سب عرب کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ تاریخ اس باب میں خاموش ہے کہ ان بارہ بیٹوں کی اولاد کہاں کہاں گئی اور کون کون سے قبائل ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ البتہ عرب کے علم الانساب میں جو چیز محفوظ اور معتبر ہے اور جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کے بڑے بیٹے نابت کی اولاد میں سے تھا۔ عدنان سے پہلے حضرت اسمٰعیلؑ تک کتنی پشتیں گذریں' اس میں سخت اختلاف ہے اور عدنان سے اوپر کا کوئی شجرۂ نسب محفوظ نہیں ہے۔ عروہ بن زبیر کا قول ہے کہ ہمیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے درمیان کا نسب نامہ جانتا ہو۔ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ دونوں کہتے ہیں کہ عدنان سے اوپر کا نسب نامہ جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نسب نامہ صرف عدنان تک بیان کرنا چاہیئے۔ طبقات ابن سعد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ آپ مَعَد بن عدنان بن اُدَد تک نسب بیان کرنے کے بعد فرماتے کذب النسابون "آگے کا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں"۔ لیکن اوپر کا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عدنان کا اولادِ اسماعیل میں سے ہونا کسی درجے میں بھی مشکوک ہے۔ تمام اہلِ عرب اس بات پر متفق تھے کہ عدنان بنی اسمٰعیل میں سے تھا اور اہلِ عرب کا اس پر بالکل متفق ہونا اس کے صحیح ہونے کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے' کیونکہ عرب کے لوگ نسب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان کے لئے کسی کے نسب پر متفق ہو جانا اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اُن کے یہاں نسلاً بعد نسل اس کے بارے میں متواتر روایات موجود نہ ہوں۔

رسول اکرمؐ کا نسب نامہ اور قبائلِ عرب سے آپؐ کا رشتہ

عدنان کے بعد تمام اُن قبائلِ عرب کا نسب نامہ محفوظ ہے جو اولادِ عدنان میں سے ہیں اور اس میں علمائے انساب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم یہاں پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ کس کس پشت پر عرب کے کون کون سے قبائل آپ کے ساتھ نسب میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ کا شجرۂ نسب یہ ہے:۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' بن عبداللہ' بن عبدالمطلب' بن ہاشم' بن عبدِ مناف' بن قصی' بن کلاب' بن مُرّہ' بن کعب' بن لؤی' بن غالب' بن فہر' بن مالک' بن النضر' بن کنانہ' بن خزیمہ' بن مُدرکہ' بن الیاس' بن مُضر' بن نزار' بن مَعَد' بن عدنان۔

اس سلسلۂ نسب میں ہر پشت کے جدِّ اعلیٰ پر عرب کے حسب ذیل قبائل حضورؐ کے ہم نسب ہوتے چلے جاتے تھے۔

عدنان پر اس کے دوسرے بیٹے عَک کی اولاد جو یمن جا کر بس گئی اور اشعریوں میں (جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا قبیلہ تھا) اُس کے شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے۔

مَعَد پر بنی قضاعہ اور بنی ایاد۔

نزار پر بنی انمار (خثعم اور بجیلہ) تمام قبائل ربیعہ (جن میں بنی بکر بن وائل، تغلب اور جدیلہ وغیرہ شامل ہیں) بنی عبدالقیس، عنزہ اور نمر بن قاسط۔

مضر پر تمام قبائل قیس (سلیم، مازن، فزارہ، عبس، اشجع، مرّہ، ذبیان، غطفان، عقیل، قشیر، جشم، ثقیف، باہلہ، بنی سعد بن بکر اور تمام بنی ہوازن وغیرہ) حضورؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ بنی سعد بن بکر میں سے تھیں۔

الیاس پر بنی تمیم، بنی ضبّہ، مزینہ، خزاعہ، اسلم، عکل، تیم وغیرہ۔

مدرکہ پر ہذیل۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی قبیلے سے تھے۔

خزیمہ پر بنی اسد، قارہ اور تمام بنی الہون بن خزیمہ۔

کنانہ پر بنی عبد مناۃ (جن میں بنی بکر اور بنی ضمرہ شامل ہیں)، بنی مالک، بنی ملکان یا ملکان اور بنی مدال وغیرہ۔ بنی فراس اور بنی فقیم بھی اولادِ کنانہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوذر کا قبیلہ غفار بنی ملکان میں سے تھا۔

قریش علمائے انساب کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ النضر بن کنانہ ہی کا لقب قریش تھا لیکن محققین کہتے ہیں کہ قریش دراصل النضر کے پوتے اور مالک بن النضر کے بیٹے فہر کا لقب تھا۔ جو لوگ اس کی اولاد ہیں وہ قریش میں شامل ہیں اور جو اس کی اولاد نہیں ہیں وہ قریش میں سے نہیں ہیں [1]

اب حضورؐ کے نسب نامہ کی طرف پھر رجوع کیجئے، اور دیکھئے کہ قریش کے کون کون سے خاندان کس پشت میں حضورؐ کے ساتھ نسب میں شریک ہوتے ہیں۔

فہر پر بنی محارب اور بنی الحارث۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بنی الحارث کی ایک شاخ سے تھے۔

غالب بن فہر پر بنی تیم الادرم۔

لؤی بن غالب پر بنی عامر۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے فاطمہ بنت زائدہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی والدہ تھیں۔ اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ سے سہیلؓ بن عمرو تھے جنھوں نے کفر کی حالت میں صلح حدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں اور اپنے بیٹے ابوجندل پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد جب مکہ میں ارتداد کا میلان ابھرنے لگا تو یہی اسکو روکنے کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ اسی خاندان کی ایک اور شاخ سے ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

کعب بن لؤی پر بنی عدی، بنی جمح اور بنی سہم، حضرت عمرؓ بنی عدی کے ایک خاندان سے تھے حضرت عثمانؓ بن مظعون بنی جمح میں سے تھے۔ اور حضرت عمروؓ بن عاص کا تعلق بنو سہم کے ایک خاندان سے تھا۔

مرّہ بن کعب پر بنی تیم اور بنی مخزوم۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بنی تیم میں سے تھے۔ حضرت طلحہؓ بھی اسی خاندان سے تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ان کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ بنی مخزوم میں سے تھے اور اس خاندان کا ایک فرد ابوجہل

---

[1] قریش کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک معنی پراگندہ ہونے کے بعد جمع ہونے کے ہیں۔ مگر اس معنی کے لحاظ سے قریش قصی بن کلاب ہی کا لقب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی کے زمانے میں قریش کے تمام خاندان مکہ میں جمع ہوئے۔ دوسرے معنی کسب تجارت کے ہیں جو قریش کا پیشہ تھا۔ تیسرے معنی تفتیش کے ہیں۔ اس لحاظ سے قریش نضر بن کنانہ کا لقب قرار پاتا ہے کیونکہ اس کے متعلق عرب کی روایات میں یہ منقول ہے کہ وہ حاجتمند لوگوں کی حاجات کا تجسس کرتا تھا اور ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ قریش سمندر کے ایک بڑے جانور کا نام ہے جو ہر چیز کو کھا جاتا ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ قریش بن بدر بنی نضر بن کنانہ میں سے ایک شخص تھا جو اپنے قبیلے کے قافلوں کیلئے بدرقے اور رسد رسانی کا انتظام کرتا تھا۔ اسلئے عرب اس قبیلے کے قافلے کو دیکھ کر کہتے تھے کہ قریش کا قافلہ آگیا۔ یہ مختلف اقوال ہیں مگر تحقیق یہی ہے کہ قریش بنی فہر کا

تھا۔ حضرت عمرؓ کی ماں حَنتمہ بنت ہشام بھی اسی خاندان سے تھی اور اس رشتے سے ابوجہل بن ہشام اُن کا ماموں ہوتا تھا۔ حضرت ارقمؓ جن کا دارِ ارقم حضورؐ کی دعوتِ رسالت کے دور میں بڑی اہمیت رکھتا تھا وہ بھی مخزومی تھے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت خالدؓ بن ولید تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عمرو بھی مخزومیہ تھیں جن سے حضورؐ کے والد اور آپ کے چچا ابوطالب اور زبیر پیدا ہوئے۔

کِلاب بن مُرّہ پر بنی زہرہ۔ حضورؐ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بنی زہرہ ہی میں سے تھے۔ حضرت حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت اُہیب بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔

قصیّ بن کلاب پر بنی عبدالعزّیٰ اور بنی عبدالدار۔ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ، حضرت زبیرؓ بن العوام، ورقہ بن نوفل اور حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) سب بنی عبدالعزّیٰ میں سے تھے۔ حضورؐ کی نانی بَرّہ بنی عبدالدار میں سے تھیں اور اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر کا تعلق تھا۔

عبدِ مَناف بن قصیّ پر بنی المطّلب، بنی عبدشمس اور بنی نوفل۔ تمام بنی اُمیّہ عبدشمس کی اولاد تھے۔ اِس خاندان کی ایک شاخ سے مشہور دشمنِ اسلام عُقبہ بن ابی مُعیط تھا، دوسری شاخ سے اُمِ جمیل (ابولہب کی بیوی حمّالۃ الحطب) ابوسفیان اور اُن کی بیٹی ام المومنین حضرت اُم حبیبہؓ تھیں۔ تیسری شاخ سے امیرالمومنین حضرت عثمانؓ بن عفّان تھے اور چوتھی شاخ سے مروان کا باپ حَکَم۔ عبدشمس کی اولاد ہی میں سے مشہور دشمنِ اسلام عُتبہ اور شَیبہ بھی تھے۔ عُتبہ کی بیٹی ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) اور بیٹے حضرت ابوحذیفہؓ تھے۔ شَیبہ فتح مکہ کے وقت تک کلید بردارِ کعبہ تھا اور فتح مکہ کے بعد اُس کو آپؐ نے اس منصب پر برقرار رکھا حتیٰ کہ آج تک کلید برداری کعبہ اُسی کے خاندان میں چلی آرہی ہے۔ بنی نوفل میں سے جُبیرؓ بن مُطعِم تھے۔

اور بنی المطلب وہ خاندان تھا جس نے زمانہ رسالتؐ سے پہلے بھی ہر تنگی و ترشی میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا اور زمانہ رسالت کے بعد بھی وہ بنی ہاشم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سینہ سپر رہا۔ مُطّلب کو اس کی خوبصورتی کی بنا پر قمر کہا جاتا تھا۔

ہاشم بن عبدِ مَناف پر تمام بنی ہاشم۔ ہاشم کی ایک بیوی بنی قضاعہ سے تھی۔ نَضلہ بن ہاشم اور شِفاء بنت ہاشم اسی بیوی سے تھے۔ ان کی دوسری بیوی بنی مازِن سے تھی جس سے خالدہ بنت ہاشم اور ضعیفہ بنت ہاشم پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی بنو خزاعہ سے تھی جس سے اسد بن ہاشم پیدا ہوا۔ چوتھی بیوی مدینے کی ہند بنت عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھی۔ جس سے ایک بیٹی حَیّہ اور ایک بیٹا ابوصیفی پیدا ہوا۔ پانچویں بیوی بھی مدینہ کے ایک اور خزرجی خاندان بنی النجار میں سے تھیں۔ جن کا نام سلمیٰ بنت عمرو تھا۔ یہی عبدالمطلب اور ان کی ایک بہن رُقیّہ کی ماں تھیں۔ اس طرح پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اہلِ مدینہ سے قائم ہوچکی تھی۔

عبدالمطلب پر تمام بنی عبدالمطلب۔ ان کی ایک بیوی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بنی مخزوم میں سے تھیں جن سے حضورؐ کے والد ماجد عبداللہ اور دو چچا ابوطالب اور زبیر۔ اور پانچ پھوپیاں بَرّہ، ام الحکیم البیضاء، عاتکہ، اُمیمہ اور اَروی پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوسلمہؓ اور ابوسبرہ بَرّہ کے بیٹے تھے۔ ام الحکیم البیضاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی تھیں۔ اُمیمہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ام المومنین حضرت زینبؓ کی والدہ تھیں۔ عبدالمطلب کی دوسری بیوی ہالہ بنت اُہیب بنی زہرہ میں سے تھیں اور حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔ ان سے حضورؐ کے تین چچا، حضرت حمزہؓ، مُقوّم اور حَجل پیدا ہوئے۔ آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بھی انہی بیوی کے بطن سے تھیں جن کے صاحبزادے حضرت زُبیرؓ بن العوام تھے۔ اُن کے والد

خرام بن خویلد حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے۔ عبدالمطلب کی کی تیسری بیوی نُتیلہ بنت جناب بنی النمر بن قاسط میں سے تھی جس سے حضرت عباسؓ اور ضرار پیدا ہوئے۔ انکی ایک اور بیوی سَمرا، بنت جُندب بنی بکر بن ہوازن میں سے تھی جس سے حارث بن عبدالمطلب پیدا ہوا۔ اُن کی ایک اور بیوی لُبنیٰ بنت ہاجرہ بنی خُزاعہ میں سے تھی جس سے ابولہب پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نسب نامے اور قبائلِ عرب کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آپؐ کے تعلق کی ان تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ دنیا کے کسی ایک مذہب کے پیشوا، اور کسی ایک دنیوی نظام کے بانی کے متعلق بھی تاریخ میں اتنی معلومات موجود نہیں ہیں جن سے اس قدر تفصیل کے ساتھ اسکے حسب نسب اور اصل نسل کا پتہ چلتا۔ جتنی تفصیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ملتا ہے۔ اس لئے دنیا کے اکابر رجال میں حضورؐ کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

دوم یہ کہ حضورؐ کے سوا کسی بڑے مذہبی یا دنیوی رہنما کے متعلق ہمیں اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے معاشرے میں اس کی جڑیں کتنی گہری اور کتنی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہلِ عرب کے لئے آپ کوئی غیر معروف شخص نہیں تھے بلکہ جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک پورے عرب میں پھیلے ہوئے سیکڑوں قبائل کو معلوم تھا کہ آپ کس خاندان کے فرد ہیں اور اُس خاندان کے ساتھ اُن کا اپنا نسبی رشتہ کیا ہے۔

سوم یہ کہ قریش کے جتنے خاندان مکہ اور اسکے اطراف میں آباد تھے ان میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس سے آپکا کسی نہ کسی طرح کی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ:-

لم یکن بطن من قریش الا وله فیه قرابة۔ — قریش کے ہر خاندان سے آپ کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور تھا۔

قریش کا مکہ میں جمع ہونا اور کعبہ کی تولیت حاصل کرنا

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ پر بنو جرہم کے تسلط کے بعد اولادِ اسماعیل عرب کے مختلف خطّوں میں منتشر ہو گئی تھی۔ یہی کیفیت بنی خزاعہ کی ایک شاخ غُبشان کی تولیتِ کعبہ کے دَور میں بھی رہی۔ سنہ ۴۴۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں[1] قُصَیّ بن کلاب کے ہاتھوں یہ صورتِ حال ختم ہوئی اور مکہ قریش کے قبضہ میں اور خانۂ کعبہ اس کی تولیت میں آ گیا۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قُصَیّ کا باپ کلاب بن مُرّہ جب مر گیا تو اس کی ماں فاطمہ بنت سعد جو ازد شنوءہ میں سے تھی، بنی قُضاعہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام کے ساتھ نکاح کر کے شام چلی گئی اور وہاں اس دوسرے شوہر سے اس کے ایک اور لڑکا رِزاح بن ربیعہ پیدا ہوا۔ جب قُصَیّ جوان ہوا تو ایک مرتبہ بنی قضاعہ میں سے ایک شخص سے اس کی لڑائی ہو گئی اور اس نے قُصَیّ کو طعنہ دیا کہ تو "ہمارے یہاں پل کر ہم ہی پر غرّاتا ہے۔ اپنے لوگوں میں کیوں نہیں جاتا؟" اس پر قُصَیّ نے اپنی ماں سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ اس نے بتایا کہ کلاب کا بیٹا اور قبیلہ قریش کا فرزند ہے اور تیری قوم بیت الحرام کے پاس شہر مکہ اور اس کے گردو نواح میں رہتی ہے۔ تب قُصَیّ نے اصرار کیا کہ میں اپنے لوگوں میں جاؤنگا چنانچہ جب حج کا زمانہ آیا تو وہ بنی قضاعہ کے حاجیوں کے ساتھ مکہ پہنچ گیا۔ یہاں اس کا حقیقی بھائی زُہرہ جو

---

[1] ابن کثیر کی روایت ہے کہ کعب بن لُوَیّ (قُصَیّ کے پردادا) کی موت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان ۵۶۰ برس کا فصل ہے اس لحاظ سے شاید غالب بن فہر حضرت مسیح کا ہم عصر تھا۔ ابن کثیر ہی نے سُہَیلی اور دوسرے ائمہ کے حوالے سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مَعَد بن عدنان کا زمانہ وہ تھا جب بُخت نصر یروشلم کو تباہ کر کے اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا۔ یہ ۵۸۶ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

کلاب کی وفات کے وقت جوان تھا، پہلے سے آباد تھا۔ وہ اسی کے پاس ٹھیر گیا اور اس نے حُلیل بن حُبشیہ خزاعی سے جو اس وقت کعبہ کا متولی اور مکہ کا صاحب امر تھا، اس کی لڑکی حُبّی کا رشتہ مانگا جسے اس نے قصیؔ کی شرافت نسبی اور شاندار شخصیت دیکھ کر بخوشی قبول کرلیا۔ اس کے بعد کعبہ کی تولیت اور مکہ کی سرداری کس طرح اس کے قبضہ میں آئی۔ اس باب میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حُلیل نے خود وصیت کردی تھی کہ اس کے بعد قصیؔ ولایت کعبہ کا اہل ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حُلیل کے مرنے کے بعد قصیؔ نے دعویٰ کیا کہ میں دوسروں سے بڑھکر اس منصب کا اہل ہوں اور جب بنی خزاعہ اور بنی بکر نے نہ مانا تو اس نے اپنے ماں جائے بھائی رِزاح اور بنی کِنانہ اور قضاعہ کو مدد کے لئے بلالیا اور مکہ کے اطراف میں قریش کے جو لوگ آباد تھے اُن کو بھی جمع کرلیا اور بزورِ خزاعہ اور بنی بکر کو مکہ سے نکال دیا۔ بعد میں جب فریقین نے یَعمرؔ بن عوف کو پنچ بنایا تو اس نے فیصلہ دیا کہ خزاعہ کے مقابلے میں قصیؔ ولایت کعبہ کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہ اور اُس کا خاندان قطعی اور صریح طور پر آلِ اسماعیلؑ میں سے ہے۔

اس طرح جب قصیؔ نے کعبہ کی تولیت اور مکہ کی سرداری حاصل کرلی تو اس نے فِہر کی ساری اولاد کو (جو قریش کہلاتی تھی) عرب کے مختلف حصوں سے مکہ میں جمع کرلیا اور مکہ کو ان کے درمیان بانٹ کر شہر کے ایک ایک حصہ میں ایک ایک خاندان کو آباد کردیا۔ اسی بناپر قریش اُسے مُجَمّع (جمع کرنے والا) کہتے ہیں۔ چنانچہ حُذافہ بن غانم عَدَوِی کہتا ہے:-

ابوکم قصیٌّ کان یُدعیٰ مجمّعاً

تمہارا باپ قصیؔ مجمّع کہا جاتا تھا۔

بہ جمّع اللّٰہ القبائلَ من فہر

اسی کے ذریعے اللہ نے فِہر کے قبائل کو جمع کیا

مکہ کی شہری ریاست اور حج کا انتظام

قصیؔ کی انہی خدمات کی بناپر اُس کو تمام قبائلِ قریش نے اپنا سردار مان لیا۔ قریش کے کسی گھرانے میں جو لڑکی بھی جوان ہوتی اُسے قمیص قصیؔ کے گھر ہی میں پہنائی جاتی۔ جو نکاح بھی ہوتا قصیؔ کے گھر میں ہوتا۔ کوئی اہم معاملہ پیش آتا یا کسی قبیلے سے جنگ کی نوبت آتی تو اسی گھر میں سب گھرانوں کے سردار مشورے کے لئے جمع ہوتے۔ اسی وجہ سے یہ گھر دار النّدوہ کہلاتا تھا۔ جنگ کے موقع پر قصیؔ ہی کی اولاد میں سے کسی کو علمبردار بنایا جاتا۔ اس منصب کا نام اللّواء تھا۔ حج کے سارے انتظامات بھی قصیؔ کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے ایک کام السِّقایہ تھا، یعنی حاجیوں کو پانی پلانا۔ دوسرا الرِّفادہ تھا، یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست جس کے لئے قریش کے سارے گھرانے چندہ اکٹھا کرکے قصیؔ کو دیتے تھے اور وہ حج سے واپسی تک تمام حاجیوں کے لئے کھانے کا انتظام کرتا تھا جو اپنے کھانے کا خود انتظام نہ کرسکتے۔ تیسرا الحِجابہ تھا، یعنی خانہ کعبہ کی کلید برداری۔

قصیؔ اپنی زندگی میں مکہ کی ریاست کا بلا شرکتِ غیرے مالک رہا۔ جب اس کا آخر وقت آیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا عبدِ مَناف پہلے ہی عرب میں ناموری حاصل کرچکا ہے اور اس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ مکہ کی ریاست کے تمام مناصب (نَدوہ، حجابہ، سقایہ، رِفادہ اور لِواء) اپنے دوسرے بیٹے عبد الدّار کو دیدیئے۔ قصیؔ کی وفات کے بعد ایک مدت تک اس کے فیصلے کا احترام کیا گیا، لیکن پھر کسی وقت اس کی اولاد میں ان مَناصب کی تقسیم پر جھگڑا ہوگیا جس میں قریش کے کچھ گھرانے بنی عبد الدّار کے ساتھ اور کچھ بنی عبدِ مَناف کے ساتھ ہوگئے۔ قریب تھا کہ یہ جھگڑا طول کھینچ جاتا لیکن خانہ جنگی تک نوبت پہنچنے سے پہلے آپس میں تصفیہ ہوگیا جس کے تحت حجابہ، لواء اور ندوہ بنی عبد الدّار کے پاس رہے اور سِقایہ اور رِفادہ بنی عبدِ مناف کو دیئے گئے۔ آلِ عبدِ مَناف نے آپس کے مشورے سے یہ دونوں منصب ہاشم کو دیدیئے۔

ہاشم

ہاشم کا اصل نام عمرو تھا۔ ہاشم کا لقب اسے اُس وقت دیا گیا جب مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

نورِ ایمان سے منوّر ضمیر کا اعجاز

انسان خود اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی سے بھاگتا
ہے اور اُن کے اجراء و نفاذ پر ذاتی مفادات کے تحفظ کی خاطر
ہر طرح کی تدابیر سوچتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومتیں کاروبارِ
سلطنت چلانے کے لیے ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ امنِ عامہ
بحال رکھنے اور معاشرتی جرائم کے سدِّ باب کے لئے قانونی
تعزیرات نافذ کرتی ہیں۔ آپس کے معاملات کو درست
رکھنے اور بیع و شریٰ کے صحیح انعقاد کی خاطر اصول و ضوابط
طے کرتی ہیں۔ سیاست و حکمرانی کے باب میں ایسے اقدامات
کی بھی ممانعت کر دی جاتی ہے جن سے ملک و قوم کا مفاد
متاثر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد عملاً ہوتا یہ ہے
کہ قوانین و ضوابط کی کھلم کھلا مخالفت کی جاتی ہے۔
ٹیکسوں کی چوری اور جرائم کا ارتکاب سرِ عام ہوتا ہے۔
قانون کا احترام نہ حکّام کرتے ہیں اور نہ عوام ہی اس کے
تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگ
قوانین کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کے باوجود ان سے انحراف
کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اُن کا ضمیر
بیدار نہیں ہوتا اور اسے ایمان کی حرارت نصیب نہیں
ہوتی کیونکہ جو ضمیر ایمان کی بدولت بیدار ہو چکا ہو اُس پر
کسی عیار کا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ آئیے ذرا اسلامی
تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھیں کہ نورِ ایمان سے منوّر قلوب و
ضمائر کس طرح زندگی کے ہر میدان میں انسان کی رہنمائی کرتے
ہیں۔

حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ
رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے
بھیجا۔ میں ایک آدمی کے پاس گیا اور اسے اپنے تمام اونٹ جمع
کرنے کے لئے کہا۔ جب وہ سارے میرے سامنے حاضر کر دیئے
گئے تو میں نے حساب لگا کر اُسے بتایا کہ آپ کو صرف ایک سال کا
بچہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا۔ اُس نے کہا کہ ایک سال کا بچہ تو
نہ دودھ دے گا نہ سواری کے قابل ہوگا۔ آپ اس کے بجائے
یہ جوان اور موٹی تازی اُونٹنی لے جائیں۔ میں نے کہا کہ جس
چیز کو لینے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا اُسے کیسے لے سکتا ہوں۔ ہاں
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے قریب ہی ہیں۔ اگر آپ
چاہیں تو حضورؐ کے پاس چلے چلتے ہیں' پھر اگر آپؐ نے اسے
قبول کر لیا تو مَیں وصول کر لوں گا۔ بصورتِ دیگر آپ کا مال
آپ کو مبارک۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے اور وہ میرے ساتھ
چل پڑا اور وہ اونٹنی جو مجھے پیش کر رہا تھا ساتھ لے لی۔ بارگاہِ
رسالتؐ میں پہنچ کر کہنے لگا۔ "یارسول اللہ آپ کا قاصد میرے
پاس پہنچا تاکہ میرے مال کا صدقہ وصول کرے اور اس سے
پیشتر میرے مال سے صدقہ وصول کرنے کے لئے نہ کبھی آپ تشریف
لائے نہ آپ کا کوئی قاصد آیا۔ میں نے اس کے سامنے اپنے
سارے اونٹ پیش کر دیئے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک سال کا بچہ
ادا کر دوں' لیکن وہ تو اللہ کے رسولؐ نہ دودھ دینے کے قابل ہوتا
ہے نہ سواری کے۔ میں نے اس کے بجائے اسے ایک جوان
اور موٹی تازی اونٹنی دی مگر یہ اُسے لینے سے انکار کرتا ہے۔
اونٹنی میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں اے اللہ کے رسولؐ آپ قبول
فرمالیں۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تمہارے ذمہ واجب الادا صدقہ تو وہ بچہ ہی ہے تاہم اگر تم زیادہ دینا چاہتے ہو تو اس کا اللہ تم کو اجر دے گا اور ہم اسے قبول کر لیتے ہیں۔" اس کے بعد آپؐ نے اس اونٹنی کو وصول کرنے کا حکم دے دیا۔ اور اس صحابی کے مال میں برکت کی دعا کی ——— آپ نے غور کیا اس واقعہ میں فریقین کے اندر کونسا مقدس جذبہ کار فرما ہے؟ یہ ضمیر کی آواز تھی، اس ضمیر کی جس پہ ایمان کا رنگ چڑھ چکا تھا۔

حضرت ماعزؓ بن مالک مشہور صحابی تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ میں نے اپنی جان پہ ظلم کیا ہے اور زنا کر بیٹھا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کر دیں۔" رسول پاکؐ نے فرمایا شاید تو نے چھیڑ چھاڑ کی ہو یا بوس و کنار کیا ہو، مگر حضرت ماعزؓ نے ہر بار تردید کر دی اور گناہ کا اعتراف کرتے رہے اور اس بات پر مصر رہے کہ حد جاری کر کے انھیں پاک کیا جائے۔ بالآخر رسول پاکؐ نے انھیں رجم کرنے کا حکم صادر فرما دیا اور حضرت ماعزؓ نے اپنے اوپر بخوشی حد نافذ کرائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اور یہ ایک مسلمان خاتون ہیں۔ رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں۔" اے اللہ کے رسولؐ میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے مجھے پاک کر دیجیے۔" رسول اللہؐ اسے لوٹا دیتے ہیں مگر اگلے دن وہ پھر آ جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔" یا رسول اللہؐ آپ نے مجھے کیوں لوٹا دیا شاید آپ ماعز کی طرح مجھ پر سے حد کو ٹالنا چاہتے ہیں، بخدا میں حاملہ ہو گئی ہوں۔" آپؐ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو اب چلی جا اور بچے کی پیدائش کے بعد آنا۔ عورت چلی گئی۔ دن بہ دن گذرتے گئے مگر اس کے ضمیر کی خلش نہ گئی، گناہ سے پاک ہونے کا خیال اُسے ہر وقت مضطرب رکھتا۔ آخر وضع حمل ہو گیا اور بچے کو لے کر وہ ایک بار پھر دربارِ رسالت میں حاضر ہو گئی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ابھی حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ جا اور اس بچے کو دودھ پلا اور جب زمانۂ رضاعت گذر جائے اور بچہ روٹی وغیرہ کھانے لگے تو پھر آنا۔ بیدار ضمیر خاتون واپس چلی جاتی ہے اور پورے دو سال بچے کو دودھ پلاتی ہے مگر اس عرصے میں کبھی ایک لمحے کیلئے بھی اس کے دل و دماغ سے گناہ کا تصور محو نہیں ہوتا۔ وہ آخرت میں اس جرم کی سزا کا خیال کر کے کانپ کانپ جاتی ہے۔ آخر جب بچے نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو وہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر رسول اللہؐ کی خدمت میں پھر پہنچ گئی۔ —" یا رسول اللہؐ اب بچہ میرا دودھ نہیں پیتا۔ اب یہ کھانا کھانے لگا ہے۔" اس کے بعد اجرائے حد میں مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید بھی اُن لوگوں میں تھے جو اسے پتھر مار رہے تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر پتھر مارا جس سے خون کے چھینٹے حضرت خالدؓ کے چہرے پر جا پڑے۔ اس پر ان کے منھ سے گالی نکل گئی۔ اللہ کے نبیؐ نے سنا تو فرمایا۔ اے خالدؓ رک جا۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ کو مدینہ کے ستر گنہگاروں پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لئے کافی ہو۔ کیا اس سے افضل بھی کسی کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے تو خدا کے لئے اپنی جان دیدی۔

کیا دنیا کے کسی قانونِ تعزیرات کی اس درجہ اطاعت کی گئی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ دُنیا کے قوانین کا نفاذ فوج، پولیس یا حکومت کے دوسرے اہل کاروں کے ہاتھوں بجبر و اکراہ ہوتا ہے جس سے بچاؤ کی کئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ مگر اسلامی قانون کی تنفیذ پہ ایک مومن کو اس کا ضمیر مجبور کرتا ہے اور اس کی پکار پر لبیک کہنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے بعد دو چار واقعات اور سنئے جن کا تعلق امانت و دیانت اور حسنِ معاملہ سے ہے اور جن سے متعلق قوانین پر عمل درآمد ایمان و ضمیر کے ماسوا کوئی طاقت نہیں کرا سکتی۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے حکم جاری کر دیا کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ قابلِ تعزیر جرم ہے۔ کوئی مسلمان مرد اور عورت یہ حرکت نہ کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا۔ جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں۔ اِدھر فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم تھا اور اُدھر ایک عورت اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں

پانی ڈال کر کچھ زیادہ پیسے وصول ہو جائیں گے۔ بیٹی نے ماں کو امیر المومنین کا حکم یاد دلایا تو ماں نے کہا امیر المومنین یہاں کہاں ہے؟ وہ ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ بیٹی نے جواب دیا اگر امیر المومنین ہمیں نہیں دیکھتا تو خدا تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اماں جان میں دودھ میں پانی ہرگز نہیں ملاؤں گی۔ یہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ دھوکا کرنا ہے۔ یہ سنگین جرم ہے۔

مؤرخ طبری نے ذکر کیا کہ جب مسلمان مدائن میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انھوں نے مقبوضہ غنائم ایک جگہ جمع کر دیئے۔ ایک صاحب آئے اور ایک بیش قیمت چیز خزانچی کو دیدی۔ لوگوں نے کہا ایسی بہترین چیز تو ہم نے آج تک نہیں دیکھی اور ہمارے پاس موجود اشیاء میں کوئی بھی اس کے برابر نہیں۔ آپ نے اس پر قبضہ کیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو کبھی اسے تمھارے پاس لے کر نہ آتا ــــــ ــــــ لوگوں نے سمجھ لیا کہ آدمی بڑے مرتبہ و مقام کا حامل ہے۔ استفسار کرنے لگے آپ کون ہیں؟ انھوں نے کہا میں یہ نہیں بتاؤں گا نہ آپ کو اور نہ کسی اور کو۔ آپ میری مدح و تعریف کرنے لگیں گے حالانکہ میں نے یہ کام صرف خدا کی رضا کے لئے کیا ہے اور وہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے۔ لوگوں نے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور اس کے ساتھیوں سے اس کا نام معلوم کرو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو پتہ چلا کہ آنجناب عامر بن عبد قیس ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن دینار نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک مقام پر ہم نے رات گذاری۔ وہاں پہاڑ پر سے ایک چرواہا ریوڑ سمیت نیچے اترا اور ہمارے پاس سے گذرا۔ امیر المومنینؓ نے اُسے کہا اے چرواہے ان میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس نے جواب دیا میں غلام ہوں اور یہ آقا کا ریوڑ ہے۔ آپ نے بر بنائے آزمائش فرمایا کہ "اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے" چرواہا بولا تو اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ اس پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے اور صبح کے وقت اس غلام کے ساتھ گئے اور آقا سے خرید کر اسے آزاد کر دیا اور فرمایا اس کلمہ کی بدولت تجھے دنیا میں تو آزادی نصیب ہو گئی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی یہ تجھے نجات دلا دے گا۔

اب ذرا اُمورِ سیاست و حکمرانی کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ ایمان کا تربیت کردہ ضمیر کس طرح مسندِ حکومت پر فردکش عمال کو راہِ راست پر رکھتا ہے اور با اختیار ہونے کے باوجود ظلم و زیادتی کا ادنیٰ تصور بھی ان کے دماغ میں نہیں ابھرتا نہ قومی دولت پر خود کو متصرف پاکر خیانت و بددیانتی کا کوئی خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا۔ آپ نے اس عرصے میں معمول کا کھانا ترک کر دیا اور تیل یا روغن کے ساتھ روٹی چبا لیتے۔ نتیجۃً آپ کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ رفقائے کار نے یہ دیکھا تو عرض کیا۔ اے امیر المومنینؓ امورِ سلطنت کا بار آپ کے کاندھوں پر ہے۔ آپ اکل و شرب کے معاملے میں اتنا پرہیز نہ کریں، مبادا آپکی صحت بالکل ہی جواب دے جائے۔ اس پر آپ نے فرمایا بئس الوالی انا ان شبعت والناس جیاع۔ میں بدترین قسم کا حکمران ہوں گا: اگر خود سیر ہو کر کھاؤں اور لوگ بھوکے رہیں۔

اس زمانے میں آپ نے ایک دن اپنے خاندان کی ایک ننھی بچی دیکھی جو بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی اور چلتے ہوئے گر گر پڑ رہی تھی۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہے؟ آپ کے بیٹے عبداللہؓ نے جواب دیا میری بیٹی ہے۔ فرمایا اس کو کیا [illegible] ہے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا: "سامانِ خورد و نوش آپ کے قبضے میں ہے جسے آپ نے ہم سے روک رکھا ہے، اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں" بیٹے کی شکایت سنی تو آپ نے فرمایا: "عبداللہؓ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کن چیز اللہ کی کتاب ہے، بخدا میں آپ حضرات کو وہی چیز دے سکتا ہوں جس کا اللہ نے تمھیں حقدار بنایا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دوسروں کو اُن کے حقوق سے محروم کر کے تمھیں نوازتا رہوں اور یوں خدا و خلق کی نظروں میں خائن قرار پاؤں"

امام ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں [illegible] سے

کا بہت نمایاں اور عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔ "آپ اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے، سادہ زندگی بسر کرتے اور معمولی خوراک کھاتے تھے۔ بایں ہمہ دین حق کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بڑے مستعد اور شدید تھے سادگی کا یہ عالم تھا کہ لباس میں خود چمڑے کے پیوند لگا لیتے۔ پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ خود ہی اٹھا لاتے۔ گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہو چلتے۔ بہت کم ہنستے اور کبھی کسی سے مذاق نہ کرتے۔ آپ کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔ کفیٰ بالموت واعظاً یا عمر۔ اے عمر تیرے لئے موت کا ناصح کافی ہے۔"

اور یہ امیر المومنین علیؓ ابن ابی طالب ہیں۔ جعدؓ بن ہبیرہ ان سے مخاطب ہے۔ اے امیر المومنینؓ دو آدمی آپکے پاس آتے ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کو اپنے اہل و عیال اور مال و منال سے زیادہ محبوب رکھتا ہے جب کہ دوسرا آپ کی دشمنی میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو آپ کو ذبح کر ڈالے مگر آپ ہیں کہ دشمن کے حق میں اور دوست کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے سنکر فرمایا۔ جانب داری کا رویہ تو میں اس صورت میں اختیار کر سکتا ہوں جب ذاتی منفعت میرے پیش نظر ہو مگر میرے تو سب کام اللہ کیلئے ہوتے ہیں۔

امام شعبیؒ کہتے ہیں حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی کے پاس ہے۔ چنانچہ اُسے عدالت میں طلب کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے بیان دیا کہ یہ زرہ میری ہے۔ میں نے اسے فروخت کیا ہے نہ ہدیۃً کسی کو دی ہے۔ قاضی شریحؒ نے عیسائی سے کہا امیر المومنینؓ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ عیسائی نے جواب دیا زرہ میری ہے اور امیر المومنینؓ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔ قاضی نے جناب امیرؓ کی طرف توجہ کی اور دریافت کیا آپکے پاس کوئی ثبوت ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسکرا دیئے اور فرمایا ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں۔ قاضی نے فیصلہ دے دیا کہ زرہ کا مالک عیسائی ہے۔ وہ زرہ لے کر چلا گیا۔ ابھی چند ہی قدم گیا تھا کہ پھر پلٹ آیا اور کہنے لگا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ عین انبیاء و رسل کی تعلیمات ہیں۔ امیر المومنینؓ عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے قاضی سے فیصلہ طلب فرماتے ہیں۔ مگر قاضی ان کے حق میں فیصلہ کرنے کے بجائے ان کے خلاف فیصلہ کر دیتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے امیر المومنین اسمیں کچھ شک نہیں کہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ صفین جا رہے تھے کہ راستے میں آپ سے گر گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ سُنا تو فرمایا۔ "اب جب کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے تو جاؤ میں نے آپ کو یہ زرہ بخش دی۔"

یہ دولت ایمان سے مالا مال ضمیر تھا جو خلیفہ اور قاضی دونوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ خلفاء نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ قوت کے بل بوتے پر اپنا حق وصول کریں یا قاضی پر کسی طرح کا اثر ڈالیں تاکہ وہ فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق دے۔ اسی طرح قاضی نے یہ نہیں کیا کہ خلیفہ کی رضا جوئی کے لئے انصاف کا خون کرے۔ اسے اگرچہ یقین تھا کہ خلیفہ سچ کہتا ہے مگر تقاضائے عدل و انصاف یہ تھا کہ امیر و مامور دونوں کے ساتھ قانون کے مطابق مساوی برتاؤ کیا جائے۔

اور یہ اموی خلیفہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز ہیں جن کے بارے میں مالکؒ بن دینار کہا کرتے تھے۔ "لوگ کہتے ہیں کہ مالک بڑا پرہیزگار ہے، میں بھلا کیونکر پرہیزگار ہوا۔ پرہیزگار تو عمرؓ بن عبدالعزیز ہیں جن کے پاس دنیا مُنہ کھولے ہوئے آئی مگر انھوں نے اُسے جھٹک دیا۔"

خلفائے بنی امیہ میں یہی وہ خلیفہ راشد تھے جن کے پاس صرف ایک قمیص تھی، میلی ہو جاتی تو اسی کو دھونے کے لئے دے دیتے اور جب تک وہ خشک نہ ہو جاتی آپ گھر پہ ہی قیام فرماتے۔

ایک دن اپنے گھر تشریف لائے اور اہلیہ سے ایک درہم قرض مانگا تاکہ انگور خرید سکیں۔ مگر محترمہ کے پاس بھی نام خدا ہی تھا وہ کہاں سے دیتیں۔ کہنے لگیں آپ اچھے امیر المومنین ہیں، آپکے خزانوں میں انگور خریدنے کے لئے بھی کچھ نہیں۔

اس پر آپ نے فرمایا: "میرے لئے آج محروم رہنا گوارا اور آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل نارِ جہنم کے طوق و اغلال میری گردن میں ہوں۔"

آپ نے اپنے مختصر سے دورِ حکمرانی میں اس امر کی بھرپور کوشش کی کہ مظالم سلسلہ بند کر دیں اور حق داروں کو اُن کے غصب شدہ حقوق لوٹا دیں۔ اُن کی طرف سے روزانہ ایک منادی یہ اعلان کیا کرتا تھا: "مقروض کہاں ہیں؟ تنگدست نکاح کے خواہش مند ہیں کہاں ہیں؟ یتامیٰ اور مساکین کہاں ہیں؟ میرے پاس آئیں تاکہ سب کی ضروریات پوری کر دوں"۔ بے نظیر عدل و انصاف، کمال درجہ کے زہد و پرہیزگاری اور شدید نفسانی ریاضت کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا کیا کرتے تھے۔ "اے اللہ عمر میں یہ اہلیت نہیں کہ تیری رحمت کا حق دار ثابت ہو سکے لیکن تیری رحمت اتنی وسیع ضرور ہے کہ عمر کو اپنے دامن میں ڈھانپ لے۔"

مسلمان امراء و حکام کے اندر یہ خدا خوفی کہاں سے آئی؟ وہ مفادِ ملت کے پاسبان اور عدل و انصاف کے پیکر کیسے بن گئے تھے۔ صرف اس لئے کہ اپنا احتساب آپ کرنا ان کا شعار تھا اور اسی خود احتسابی کا نام ضمیر ہے۔ ضمیرِ بیدار کے امثلہ و شواہد کا بیان کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے، لیکن ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر میدان میں ایمانی سے منور ضمیر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسکی وضاحت کرتے ہوئے بعض شعبہ ہائے حیات سے متعلق مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اور بعض کا بیان ابھی باقی ہے۔

تجارت اور آپس کے لین دین میں ایک بندۂ مومن کا ضمیر کس حد تک آمادۂ نفع و خیر خواہی رکھتا ہے اس کا اندازہ ذیل واقعات سے کیجئے:۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں نقل کیا کہ حضرت یونسؒ بن عبید پارچات فروخت کیا کرتے تھے۔ اُن کے پاس موجود بیش قیمت پارچات میں سے بعض کی قیمت چار سو درہم تھی اور بعض کی دو سو درہم۔ آپ اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر خود نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک بدو آیا اور چار سو درہم والا حلّہ طلب کیا۔ آپ کے بھتیجے نے دو سو درہم والا حلّہ دکھایا جسے بدو نے پسند کیا اور خرید لیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا اور حلّہ بھی اس کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ سامنے سے حضرت یونس بن عبید آ گئے۔ آپ نے حلّہ پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ ان کی دکان سے خرید ا گیا ہے۔ پوچھا کتنے میں خریدا؟ بدو نے کہا چار سو درہم میں۔ آپ نے فرمایا مگر اس کی قیمت تو دو سو درہم ہے۔ آؤ اور یہ حلّہ واپس کر دو۔ بدو نے جواب دیا لیکن ہمارے علاقے میں تو اس کی قیمت پانچ سو درہم ہے اور میں چار سو میں خرید کر راضی ہوں۔ حضرت عبیدؒ نے کہا بھائی میرے ساتھ آیئے دین میں نصیحت و خیر خواہی کو دنیا بھر کے مال و منال سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ اسے دکان پر لے آئے اور دو سو درہم واپس کئے اور اپنے بھتیجے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تمھیں شرم نہ آئی، سو فیصد منافع لیتے ہوئے تم نے خدا کا خوف نہ کیا۔ تمھیں مسلمانوں کی خیر خواہی کا مطلق خیال نہ آیا۔ بھتیجے نے کہا "چچا جان! خدا کی قسم یہ صاحب تو چار سو درہم دے کر بھی راضی تھے"۔ "مگر تم جو قیمت اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اس کے لئے کیوں نہ کی۔" حضرت عبیدؒ نے جواب دیا۔

ہو سکتا ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ خیر خواہی کا یہ احساس صرف قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے اندر ہی موجود تھا۔ یہ سوچ درست نہیں۔ اس گئے گذرے زمانے میں بھی بہت سے روشن ضمیر ایسی اعلیٰ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک مقالے میں تحریر فرمایا کہ حجاز کے ایک ثقہ بزرگ سے مجھے معلوم ہوا کہ مکہ کے تجار اپنے اپنے کاروباری ساتھیوں کے ساتھ حد درجہ اخلاص و ایثار کا برتاؤ کرتے تھے۔ اگر کسی تاجر کے پاس دن کے آخری حصے میں کوئی گاہک آتا اور تاجر یہ سمجھتا کہ آج میرا کافی مال فروخت ہو گیا ہے مگر فلاں دکان دار کی بکری بہت کم رہی، تو گاہک کو مشورہ دیتا کہ اس بازار میں فلاں دکان دار کے پاس وہ مال موجود ہے جو آپ مجھ سے خریدنا چاہتے ہیں آپ براہِ کرم وہاں تشریف لے جائیں۔ یوں ہر تاجر دوسرے کی خیر خواہی

کرتا۔

آخر میں ایک دو واقعات بذل و انفاق کے بھی سُن لیجئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک باایمان اور باضمیر شخص کے نزدیک مال و دولت دنیا کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے دوسروں پر خرچ کر کے زیادہ راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مسکین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا جب کہ آپ روزے سے تھیں اور گھر میں سوائے ایک روٹی کے اور کچھ نہ تھا آپ نے اپنی کنیز کو حکم دیا کہ جاؤ اسے وہ روٹی دے دو۔ اس نے کہا تو پھر روزہ افطار کرنے کے لئے آپ کے واسطے کچھ نہ رہے گا آپ نے فرمایا بس اسے وہ روٹی دے دو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ممکن ہے کوئی آدمی یہ خیال کرے کہ روٹی معمولی چیز تھی، اس لئے آپ نے اپنی ذات پر مسکین کو ترجیح دی تو ایسے حضرات کے لئے ہم اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ ہی کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ اسی ہزار درہم حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھجوائے۔ اس وقت بھی آپ روزے سے تھیں اور ایک پرانا سا لباس آپ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ درہم وصول کرنے کے بعد اُسی وقت حضرت عائشہؓ نے انھیں فقراء و مساکین میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ اُن کی خادمہ نے کہا: "ام المومنین آپ ایک دو درہم کا گوشت ہی خرید لیتیں تاکہ ہمارے لئے رات کا کھانا تیار ہو جاتا اور آپ کی افطاری کا سامان بھی"۔ ام المومنین نے فرمایا بیٹی پہلے ذکر کیا ہوتا تاکہ میں کچھ بچا لیتی۔ تو آپ نے غور فرمایا کہ وہ روزہ دار تھیں جس نے ایک روٹی کے لئے اپنے اوپر ایک مسکین کو ترجیح دی، جب اس کے قبضے میں اسی ہزار درہم آئے تو اس وقت بھی فقراء و مساکین ہی کو اپنی ذات پر مقدم رکھا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے چار سو دینار ایک تھیلی میں باندھ کر اپنے لڑکے سے کہا کہ انھیں ابو عبیدہ بن الجراح کو میری طرف سے دینا، پھر دیکھنا وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں۔ لڑکا ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی امیر المومنینؓ نے فرمایا ہے کہ آپ یہ رقم قبول فرمائیں اور اپنی کوئی ضرورت پوری کر لیں۔ حضرت ابو عبیدہ نے کہا اللہ امیر المومنین پر رحم فرمائے اور انھیں میل ملاپ کی توفیق دے۔ بعد ازاں انھوں نے ایک لڑکی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ یہ سات دینار فلاں آدمی کو دے آؤ۔ اور یہ پانچ دینار فلاں صاحب کے لئے لے جاؤ اور یہ پانچ فلاں کے لئے۔ اسی طرح بھجواتے گئے "تا آنکہ سب ختم ہو گئے۔ لڑکا واپس آیا اور حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اتنے ہی دینار حضرت معاذؓ بن جبل کے لئے گن رکھے ہیں۔ لڑکے سے کہا جاؤ یہ چار سو دینار معاذؓ بن جبل کو دو، اور پھر گھر کے کسی کام میں مشغول ہو جانا اور دیکھنا کہ وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں۔ لڑکا ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی امیر المومنینؓ فرماتے ہیں: "اس رقم کو اپنی کسی ضرورت کے پورا کرنے میں صرف کر لیں"۔ آپ نے رقم قبول فرمالی اور کہا اللہ امیر المومنین پر رحم فرمائے اور انھیں ربط و تعلق قائم رکھنے کی توفیق دے۔ پھر ایک لڑکی کو بلایا اور حکم دیا جاؤ فلاں آدمی کے گھر اتنے دینار دے آؤ۔ فلاں آدمی کے گھر اتنے اور فلاں کے گھر اتنے۔ آپ تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کی اہلیہ کو خبر ہوئی۔ انھوں نے آ کر کہا واللہ ہم بھی تو غریب ہیں، ہمیں بھی کچھ دیجئے۔ اُس وقت کپڑے میں صرف دو دینار رہ گئے تھے حضرت معاذؓ نے وہ گھر والوں کی طرف پھینک دئیے۔ لڑکے نے جا کر ان کے متعلق بھی اطلاع کی یہ سنکر امیر المومنینؓ بہت خوش ہوئے اور فرمایا یہ سب بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے کے لئے مثال۔

ایک دفعہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا قافلہ تجارت مدینے میں وارد ہوا۔ قافلہ اتنا بڑا تھا کہ پورے مدینے میں ہلچل مچ گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شور و غوغا سنا تو پوچھا کیا ماجرا ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا قافلہ تجارت آیا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے حدیث بیان کی کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آپؐ فرما رہے تھے کہ میں ایسے دیکھتا ہوں جیسے میں اور عبد الرحمٰن بن عوف پلصراط پر اٹھے ہوں۔ عبد الرحمٰن نیچے کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں مگر پھر سیدھے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بچ جاتے ہیں۔ اگرچہ قریب تھا کہ .... جب یہ حدیث حضرت عبد الرحمٰن رضؓ بن عوف کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا جتنے اونٹ سامانِ تجارت لیکر آئے ہیں یہ سب اور ان پر جو سامانِ تجارت لدا ہوا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ راوی نے بیان کیا کہ جو سامانِ تجارت اونٹوں پر لدا ہوا تھا وہ اونٹوں سے زیادہ مالیت کا تھا اور اونٹوں کی تعداد پانچسو تھی۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صاحب کی خدمت میں بکری کی سری ہدیۃً بھیجی گئی، انھوں نے قبول کر لی، پھر فرمایا فلاں آدمی مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے، چنانچہ اس کی طرف بھیج دی۔ انھوں نے قبول کر کے ایک اور صاحب کے یہاں بھیجا دی جوان کے خیال میں زیادہ حاجت مند تھا۔ اس طرح ہر وصول کرنے والا بکری کی سری کو آگے بھیجتا رہا حتیٰ کہ وہ پلٹ کر پھر پہلے صحابی کے پاس پہنچ گئی۔

اہلِ ایمان کا یہ بذل و انفاق اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھنے کا احساس ایمان و ضمیر ہی کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور اسی کی پیہم ترغیب و تحریک سے برقرار رہتا ہے۔

پھر اُس نے شام سے غلہ لاکر روٹیاں پکوائیں اور بہت سے اونٹ کٹوا کر سالن تیار کرایا اور روٹیوں کو اس میں چور کر لوگوں کو اس کا ثرید (مالیدہ) کھلایا۔ ہشم کے معنی توڑنے اور کچلنے کے ہیں۔ روٹیاں توڑ کر سالن میں مالیدہ بنوانے کی وجہ سے اس کو ہاشم کہا جانے لگا۔ رفادہ اور سقایہ کا منصب ہاتھ میں آنے کے بعد ہاشم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب حج کا زمانہ آتا تو وہ قریش کے لوگوں کو جمع کر کے کہتا "یہ اللہ کے پڑوسی اور اس کے گھر کے لوگ اس زمانے میں یاترا کے لئے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ مہمان ہیں اور سب سے زیادہ ضیافت کے حق دار اللہ ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ اللہ نے تم کو یہ خصوصیت بخشی ہے اور اسی کی بدولت تمہیں عزت دی ہے اور تمہاری ایسی حفاظت کی ہے جیسی کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کے مہمانوں اور زائروں کا اکرام کرو جو گرد آلود اور پراگندہ حال ہر دُور دراز علاقہ سے دُبلی اونٹنیوں پر جو سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں، آ رہے ہیں۔ اُن کے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ ان میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ اُن کا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے لہٰذا ان کو کھانا کھلاؤ اور پانی پلاؤ" اس پر قریش کے سارے خاندانوں سے چندہ آتا اور خود ہاشم زرِ کثیر اپنے پاس سے خرچ کرتا۔ پھر چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں مکہ کے سارے کنوؤں سے (کیونکہ زم زم کو تو جرہم بند کر گئے تھے اور اس کا نشان تک باقی نہ تھا) پانی لا لا کر ان میں حاجیوں کے لئے بھرا جاتا۔ روٹیاں اور سالن پکا کر ان کا ثرید بنایا جاتا۔ روٹی اور دودھ کا ملیدہ بھی بنایا جاتا۔ ستو اور کھجوریں وغیرہ فراہم کی جاتیں اور حاجیوں کے منیٰ سے رخصت ہونے تک اُن کی ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی چیز نے ہاشم کو عرب کے تمام قبائل میں مقبول بنا دیا تھا کیونکہ ان سب کو ہر سال حج میں اُس کی اس فیاضانہ خدمت سے استفادہ کا موقع ملتا تھا۔ (اضافہ از مولف)

عامر عثمانی

قادیانیت کے چیلنج

— ۲ —

اہلِ انصاف دیکھ چکے کہ قادیانی صاحب نے قرآن کی جن دو آیات کو اپنے موقف کے لئے پیش کیا تھا وہ کس طرح ان کے اس ذہنی بگاڑ کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ کلام الٰہی کو توڑنے مروڑنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے اب ان روایات کی طرف آیئے جن سے انھوں نے استدلال کا کھیل کھیلا ہے۔

حدیث اوّل

حدیث کی کتاب "ابن ماجہ" میں ایک روایت آئی ہے جس میں حضورؐ کے صاحب زادے ابراہیم کے بارے میں حضورؐ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

لوعاش لکان صدیقاً نبیا۔ — اگر ابراہیم زندہ رہتا تو صدیق نبی ہوتا۔

اس حدیث کو قادیانی حضرات بڑے زور و شور سے اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ رسول اللہؐ پر ہر طرح کی نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا ورنہ آپ اپنے مرحوم بیٹے کے بارے میں یہ بات نہیں فرما سکتے تھے۔ فرمانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

استدلال ظاہراً تو دلکش ہے لیکن علم و تحقیق کی روشنی میں تجزیہ کیجئے تو معقولیت کی پرچھائیں تک اس میں نہ ملے گی۔ تجزیہ کے دو رخ ہیں۔ ایک یہ کہ منقولہ روایت قابلِ اعتماد ہے بھی یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ قابلِ اعتماد مان لیں تو اس کا واقعی مفہوم اور حاصل کیا نکلتا ہے۔

پہلا رُخ

ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اس روایت سے ختم نبوت جیسے بنیادی عقیدے میں حجت پکڑتا ہے وہ یا تو علم الحدیث اور علم الکلام سے بالکل کورا ہے یا جان بوجھ کر لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے۔

مبتدی بھی جانتے ہیں کہ کسی روایت کا پایہ اور درجہ متعین کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی سند دیکھنی ضروری ہے سند میں کون کون راوی ہیں اور ان کے بارے میں مستند ماہرین کیا کہہ گئے ہیں، اس کا علم جب تک نہ ہو روایت

نہیں ہو سکتی۔ قادیانی صاحب نے سند بیان نہیں کی بلکہ مدد صاحب سے مستعار لے کر صرف یہ عبارت روایت کے ثبوت میں لکھ دی کہ :-

"اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اسے ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے"۔

"وغیرہ" کا مصداق کیا ہے یہ تو موصوف ہی بتا سکتے ہیں۔ جب تک مصداق متعین نہ ہو یہ لفظ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ "ابن ماجہ" کا نام صاف صاف لیا گیا ہے اور اس انداز میں لیا گیا ہے گویا کہ ابن ماجہ حدیث کی کوئی ایسی ہی مستند کتاب ہے جس میں آئی ہوئی روایات کا صحیح ہونا مسلمات میں سے ہو۔

ہم اپنے ناواقف بھائیوں کو قادیانی فنکار کی فن کاری کا اندازہ کرانے کے لئے سب سے پہلے "ابن ماجہ" کی حیثیت واضح کریں گے۔ ذی علم قارئین ہمیں معاف فرمائیں اگر ہماری تحریر میں ایسے بھی اجزاء آتے چلے جائیں جو اصحاب علم کے لئے محتاج بیان نہیں۔

ابن ماجہ کی حیثیت

سب سے پہلے علم الحدیث کی تین اصطلاحوں کو ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) حدیث صحیح :- حدیث صحیح وہ ہے جس میں شروع سے آخر تک تمام راوی پوری طرح قابل اعتماد ہوں۔ شروع یا آخر یا بیچ میں سے کوئی راوی غائب نہ ہو، اور روایت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہو۔ نیز اس کے متن (مضمون) میں کوئی ایسی بات موجود نہ ہو جو قرآن و حدیث سے ثابت شدہ کسی حکم یا عقیدے یا خبر سے ٹکراتی ہو۔

(۲) حدیث ضعیف :- حدیث ضعیف وہ ہے جس میں مذکورہ شرائط میں سے کوئی ایک بھی شرط کم ہو۔ ضعف کی اسی طرح بہت سی قسمیں اور درجے ہیں جیسے بیماریوں کے مختلف درجے ہوا کرتے ہیں۔ کسی حدیث میں معمولی ضعف ہے کسی میں اس سے زیادہ کسی میں اس سے زیادہ۔ ماہرین نے اسی فرق کے لحاظ سے بہت سے مختلف نام وضع کئے ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال ضعف کا درجہ کچھ بھی ہو حدیث "صحیح" نہیں کہلائے گی اگر کسی بھی درجے کا ضعف اس میں پایا جا رہا ہو۔

حدیث موضوع :- موضوع کہتے ہیں من گھڑت کو جس حدیث کے بارے میں پتا چل جائے کہ اس کی کوئی اصل نہیں اور کسی بدبخت نے اسے گھڑ لیا ہے اس کا نام "حدیث موضوع" ہے۔ اس میں اور حدیث ضعیف میں فرق یہ ہے کہ حدیث ضعیف بالکل بے اصل نہیں ہوتی۔ اس میں کسی درجے کا امکان صحت موجود ہوتا ہے مگر حدیث موضوع باطل ہی باطل ہوتی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بھی سمجھ لیجئے کہ عقائد کی بنیاد کبھی ضعیف حدیث پر نہیں رکھی جا سکتی۔ کم اہمیت والے عقائد کے لئے بھی لازماً صحیح حدیث چاہئیے اور زیادہ اہمیت کے لئے یا تو قرآنی وضاحت درکار ہے یا متعدد صحیح حدیثیں۔ ایسا کوئی بھی عقیدہ جو کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے والا ہو، ان دو چار حدیثوں سے بھی قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا جنھیں اصطلاح میں صحیح کہا جاتا ہے بلکہ اس کے لئے یا تو قرآن کی محکم آیت چاہئیے یا حدیث متواتر۔

حدیث متواتر کی تعریف بھی سن لیجئے کہ دینی لٹریچر میں اس کا ذکر آتا ہی رہتا ہے۔

حدیث متواتر وہ ہے جسے ہر ہر طبقے کے اتنے آدمیوں نے نقل کیا ہو جن کا جھوٹ پر جمع ہو جانا عادۃً محال ہو۔ طبقوں سے مراد ہیں راویوں کے مختلف اشیج اور حلقے۔ جیسے رسول اللہ سے پچاس ساٹھ مختلف صحابی کسی بات کو نقل کریں۔ صحابہؓ سے کم سے کم اتنے ہی مختلف تابعین نقل کریں۔ تابعین سے کم از کم اتنے ہی تبع تابعین نقل کریں۔ گویا صحابہؓ کا ایک طبقہ ہوا۔ تابعین کا دوسرا۔ تبع تابعین کا تیسرا۔ اسی طرح ہر طبقے کے اس قدر آدمی نقل کرتے چلے جائیں کہ ان پر کسی سازش کا شبہ ممکن نہ ہو۔ اگر مثلاً کسی روایت میں یہ تو ملتا ہے کہ پچاس صحابہ اس کے راوی ہیں مگر تابعی

صرف دو چار ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اسے صحابہؓ سے نقل کیا یا تابعی بھی پچاس سا ٹھ ناقل ہیں مگر تبع تابعین میں ناقلین کی تعداد محض دو چار رہ جاتی ہے تو اس حدیث کو متواتر کہنا مشکل ہو جائے گا۔ مکمل تواتر کے لئے شرط ہی یہ ہے کہ ہر طبقے میں اس کے راوی کثیر ہوں۔ جیسے مثلاً پانچ نمازوں کی فرضیت۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا نصاب۔ حج کے ارکان۔ یہ امور ایسی ہی احادیث سے ثابت ہیں جن کی روایت ہر طبقے کے کثیر افراد نے کی ہے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کا عملی تواتر بھی موجود ہے۔

توحید و رسالت کے عقائد اسلام کے ایوانِ بلند کا سنگِ بنیاد ہیں۔ حضورؐ آخری نبی ہیں یہ عقیدہ قرآن سے بہ الفاظِ صریح ثابت ہے اور صحیح حدیثوں میں اس کی وضاحت آئی ہے۔ کبھی کسی صحابی' تابعی' مفسر' محدث' مجتہد' امام' شیخ' ولی کو اس میں شک نہیں رہا (جو عبارتیں قادیانی بعض اکابر کی نقل کرتے ہیں وہ محض دھوکے کی ٹٹی ہیں جن پر انشاء اللہ آگے ہم روشنی ڈالیں گے)

ایسے اجماعی اور قطعی عقیدے کے خلاف تو کسی حدیثِ صحیح سے بھی استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حدیثِ صحیح اس کے مخالف ہو ہی نہیں سکتی اور ظاہری الفاظ اگر خلاف نظر آ رہے ہوں تو ان کا مفہوم وہ نہیں ہو سکتا جس سے مسلمہ عقیدے کی تکذیب لازم آئے۔ مگر شاباش ہے قادیانی خوش فکروں کو کہ وہ اس عظیم الشان بنیادی عقیدے کی بحث میں ضعیف و موضوع احادیث کا سہارا لینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے اور خدا کے دین سے بے رحمانہ مذاق جاری رکھتے ہیں۔

بہرحال ابن ماجہ" اگرچہ صحاح ستہ میں شامل ہے یعنی ان چھ کتابوں میں جنھیں علماء نے حدیث کی چھ صحیح کتابوں کا نام دیا ہے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ کسی کتاب کو اصطلاحاً "صحیح" کہنے کا مطلب علماء کے نزدیک یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس میں کوئی بھی غیر صحیح روایت موجود ہی نہیں ہے۔

"صحیح" کا نام محض غلبے اور کثرت کی رعایت سے دیا جاتا ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ فلاں ملک غریب ہے، تو آپ کا مطلب بس یہ ہوتا ہے کہ وہاں زیادہ تر غرباء بستے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ وہاں کوئی بھی شخص امیر ہے ہی نہیں۔ اسی طرح حدیث کی یہ چھ کتابیں ہیں کہ ان میں بکثرت صحیح حدیثوں کی ہے مگر غیر صحیح اور مشکوک روایات بھی یقیناً پائی جاتی ہیں۔ بخاری و مسلم ان میں اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں لیکن ان تک کا حال یہ ہے کہ ان کے بہت سے راویوں کی ثقاہت میں کلام کیا گیا ہے لہذا یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ہر ہر روایت تمام محققین کے نزدیک قطعی طور پر صحیح ہے اور کسی درجے کا بھی ضعف اس میں پایا ہی نہیں جاتا۔ رہیں باقی چار تو ان میں نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع روایات تک موجود ہیں اور اہلِ علم نے ان کی نشاندہی کی ہے۔

اس کے بعد اب یہ سنئے کہ صحاح ستہ میں سب سے کمتر درجہ پر "ابن ماجہ" ہی ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے تقریباً اختتام تک تو پانچ ہی کتابیں "صحاح" مانی جاتی تھیں ابن ماجہ کا شمار صحاح میں نہ تھا پھر ایک صاحبِ علم نے اپنی صوابدید سے ابن ماجہ کو بھی صحاح ستہ میں شامل کرنا پسند کیا اور اب صحاح کی تعداد چھ ہو گئی۔ ہم اس فعل پر معترض نہیں کیونکہ ابن ماجہ میں اکثریت احادیثِ صحیحہ کی ہی ہے لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ اس کا درجۂ استناد باقی پانچوں صحاح کے مقابلے میں کم ہے جس کے لئے ذیل کے چند شواہد پیش خدمت ہیں۔

توضیح الافکار میں علامہ محمد عابد سندی محقق نے بحث و نظر کے بعد حاصلاً کہتے ہیں کہ یہ بہرحال درست ہے کہ ابن ماجہ باقی پانچ صحاح سے کم رتبہ ہے (دیکھئے [illegible])

یہیں علامہ محمد بن اسمٰعیل الامیر الیمانی کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ابن ماجہ' ابوداؤد اور نسائی سے نچلے درجے میں ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا گیا کہ امام ابن ماجہ کی سندوں میں بہت راوی ضعیف ہیں اور انھوں نے بہت سی شاذ و منکر روایات لے لی ہیں (یعنی ایسی روایات جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا)

مشہور امامِ فن حافظ ابو زرعہؒ جو ابن ماجہ کے معاصر

میں ہیں۔ ابن طاہر کی روایت کے مطابق ابن ماجہ کی کم و بیش
تیس حدیثوں کو ضعیف مانتے ہیں لیکن علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ
ابن طاہر کی روایت منقطع ہے اس لئے قابلِ اعتبار نہیں۔ ابو
زرعہ نے ابن ماجہ کی صرف تیس ہی احادیث کو ضعیف نہ
کہا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس میں کثیر حدیثیں یا تو بالکل باطل
ہیں یا ساقط الاعتبار ہیں یا منکر ہیں۔ ابنِ حاتم نے "کتاب
العلل" میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ
ابن طاہر کی روایت درست ہے تو ابو زرعہ کا مطلب یہ
ہوگا کہ تقریباً تیس حدیثیں تو انتہا درجہ کی ناقابلِ اعتبار ہیں
یہ نہیں ہوگا کہ بس تیس ہی حدیثیں ضعیف ہیں (زہر الربی
علی المجتبلی ص۵)

شہرۂ آفاق استادِ فن حافظ شمس الدین ذہبی اپنی
"النبلاء" میں رقمطراز ہیں کہ اگر امام ابو زرعہ نے صرف تیس ہی
احادیث کو غیر مستند قرار دیا ہے تو ان کا منشا یہ ہوگا کہ اتنی
حدیثیں تو سرے سے ہی باطل ہیں۔ یہ نہ ہوگا کہ فقط اتنی ہی
حدیثیں ضعیف ہیں۔ ضعیف حدیثیں جن سے کوئی استدلال
نہیں کیا جا سکتا ان کی تعداد تو ابن ماجہ میں ہزار کے لگ
بھگ ہے۔ (تنقیح الانظار لابن الوزیر بتوسط ما تمس الیہ
الحاجۃ ص۳۴)

علم الحدیث کے مسلّم شیخ حافظ سخاوی اپنی فتح المغیث
میں دو اور کتب حدیث کے ساتھ ابن ماجہ کو بھی شامل کرتے
ہوئے کہتے ہیں کہ ان کتابوں کی کسی حدیث سے صرف ایسے
ہی لوگوں کو حجت پکڑنی چاہیئے جو فنِ حدیث سے اچھی طرح
واقف ہوں اور صحیح و غیر صحیح میں تمیز کا ملکہ رکھتے ہوں۔
جو حضرات راویوں کے حال احوال اور اسناد کے اتصال و
انقطاع وغیرہ کی نزاکتوں سے بے خبر ہیں ان کے لئے تو بس
ایک ہی طریقہ درست ہے کہ وہ ان کتابوں کی جس حدیث
سے حجت پکڑنا چاہیں اس کے بارے میں یہ تحقیق کرلیں کہ کسی
امام نے اسے صحیح یا حَسَن بھی قرار دیا ہے یا نہیں۔ اگر وہ
تحقیق نہیں کریں گے تو بارہا ایسا ہوگا کہ وہ ایک باطل و
فاسد شے سے حجت پکڑ رہے ہوں گے اور انھیں اس کا
شعور بھی نہ ہوگا۔ (صفحہ ۴۳۔ مطبوعہ ہند)

ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ
کے فاضل مؤلف علامہ عبدالرشید نعمانی تفصیلی بحث و نظر کے
بعد بطور حاصل کلام لکھتے ہیں کہ ابن ماجہ میں کثیر حدیثیں ضعیف
ہیں، بعض تو بے حد ضعیف ہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جنھیں
بعض اساتذہ نے موضوع قرار دیا ہے۔ اگر ابن ماجہ کی
ساقط الاعتبار حدیثوں کو الگ جمع کیا جائے تو مستقل ایک
رسالہ تیار ہو جائے گا (ص۴۵)

مشہور محدث امام ابن الجوزی نے جو نقدِ حدیث میں
کافی شہرت رکھتے ہیں ابن ماجہ کی ۳۴ حدیثوں کو من
گھڑت ٹھیرایا ہے اور ما تمس الیہ الحاجۃ کے مؤلف علامہ
عبدالرشید نے ان ۳۴ کے علاوہ سات اور حدیثیں ایسی پیش
کی ہیں جن کو بعض ائمہ نے موضوع یا باطل قرار دیا ہے۔ البتہ ہم
کہتے ہیں کہ یہ تعداد بھی جامع مانع نہیں۔ ان ۴۱ کے علاوہ
بھی ابن ماجہ میں ایسی روایتیں ہیں جو موضوع قرار دی گئی ہیں۔
مثلاً یہی زیر بحث روایت کہ اسے شارح مسلم امام نووی نے
موضوع کہا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

مناسب ہوگا اگر علامہ عبدالرشید کا آخری ریمارک
بھی سن لیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن ماجہ ایسی کثیر حدیثیں بیان کرنے
میں اکیلے ہیں جن کے بعض راویوں پر جھوٹ کا اور بعض پر
حدیثیں چرانے کا الزام ہے اور اس الزام کی بنا پر انکی رِوایات
باطل اور ساقط الاعتبار ہیں۔ اور اسی لئے علماءِ فن نے صراحت
کردی ہے کہ ابن ماجہ جن احادیث کے بیان میں اکیلے ہوں۔
(یعنی باقی پانچوں صحاح میں یہ احادیث نہ ہوں) ان میں سے
کسی حدیث سے حجت پکڑنا جائز نہیں جب تک کہ پوری تحقیق
کرکے یہ اطمینان نہ کرلیا جائے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور
دوسری بھی کوئی علت اس میں نہیں پائی جاتی (ص۴۵)

یہ قول پچھلے اہلِ فن کے درمیان کافی مشہور رہا ہے کہ
ما اَنْفَرَدَ بِہ ابن ماجۃ ضعیفٌ (جس روایت کو پانچوں
صحاح میں سے کسی نے بیان نہیں کیا بلکہ صرف ابن ماجہ نے
بیان کیا وہ ضعیف ہے) اگرچہ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اطلاق

اور عمومیت کے ساتھ ایسا کہنا صحیح نہیں لیکن بہ اعتبارِ غالب حال یہ قول بہر حال وہ بھی درست مانتے ہیں۔

یہ ہے مختصراً ابن ماجہ کا حال۔

مجموعاً ہم ابن ماجہ کو یقیناً "صحیح" اور رفیع مانتے ہیں، لیکن جو لوگ محض اس بنیاد پر کسی حدیث کو "صحیح" قرار دیں کہ وہ سننِ ابن ماجہ میں آگئی ہے ان کی یہ روش نہایت غیر عالمانہ اور مغالطہ انگیز ہے۔ یہ درجہ تو فی الحقیقت صرف بخاری و مسلم کا ہے کہ جو حدیث ان دونوں میں آگئی اسے محض ان کے حوالے سے "صحیح" کہا جا سکتا ہے۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قادیانی صاحب کا منقولہ بالا استدلال سراسر مغالطہ انگیزی پر مبنی ہے۔ اب ذرا انکی مزید موشگافیوں کا حال دیکھئے۔ وہ اسی ابراہیم والی روایت کے تعلق سے فرماتے ہیں:۔

"حضرت امام علی القاری نے جو فقہ حنفیہ کے ایک زبردست امام ہیں اس حدیث سے امکانِ نبوت پر استدلال کیا ہے اور لکھا ہے۔ لو عاش ابراہیم فصار نبیاً وکذا لو صار عمر نبیاً لکانا من اتباعہ علیہ السلام یعنی اگر ابراہیمؑ زندہ رہتے اور نبی ہو جاتے اور اسی طرح اگر حضرت عمرؓ نبی ہو جاتے تو یہ دونوں آپ کے متبعین ہی ہوتے"......

(موضوعات کبیر)

ملا علی قاری کا نام اتنا مشہور ہے کہ معمولی علم والوں نے بھی سن رکھا ہے۔ کتنی آسانی سے وہ دھوکا کھا جائیں گے کہ واقعی احناف کا یہ مشہور عالم بھی قادیانیوں ہی کا ہم خیال نکلا۔ آیئے حقیقتِ حال ملاحظہ فرمایئے۔

ملا علی قاری نے اپنی "موضوعاتِ کبیر" میں اس روایت کو درج کرنے کے بعد وضاحت کی ہے۔

قال النووي في تهذيبه هذا الحديث باطل وجسارة على الكلام بالمغيبات ومجازفة وهجوم على عظيم وقال ابن عبد البر في تمهيده ما أدري ما هذا فقد وُلِدَ نوح عليه السلام غير نبي ولو لم يلد النبي إلا أنبياء لكان كلُّ أحدٍ نبياً لأنهم من وُلدِ نوح عليه السلام

نووی نے اپنی کتاب "تہذیب" میں کہا ہے کہ یہ روایت باطل ہے اور اس میں امورِ غیب میں کلام کی جسارت کی گئی ہے اور اس میں بے تکا پن ہے اٹکل بازی ہے اور اس میں ایک امرِ عظیم میں بلا اجازت دخیل ہوا گیا ہے اور ابنِ عبد البر نے اپنی کتاب "تمہید" میں فرمایا کہ میں اس روایت کو نہیں جانتا کہ کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کا لڑکا تو نبی ہوا نہیں۔ اگر یہ قاعدہ ہوتا کہ نبی کا ہر بیٹا نبی ہوا کرتا تو نوحؑ کا بیٹا تو نبی ہوا نہیں۔ حالانکہ اس قاعدے سے اسے بھی نبی ہونا چاہیے تھا

* * *

اس عبارت سے واضح ہوا کہ جس روایت کو قادیانی صاحب صحیح باور کرانا چاہتے ہیں اسے علم الحدیث کے دو شہرہ اساتذہ نے بے اصل کہا ہے اور ان کا یہ کہنا قادیانی صاحب کی نظروں کے سامنے بھی ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ ابن جوزی یا ابن عبد البر حرفِ آخر ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ملا علی قاری سے بہت پہلے کی شخصیت ہیں اور شہرت و قبولیت میں ان کا درجہ ملا علی قاری سے زیادہ ہی ہے ان کے نزدیک جب یہ روایت بے اصل ہے تو فقط علی قاری کی رائے حرفِ آخر کیسے مانی جا سکتی ہے۔

پھر یہ بھی سن لیجئے کہ علی قاری نے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کو موضوع قرار دینا درست نہیں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔ صحیح اور موضوع کے درمیان ایک درجہ ضعیف کا بھی ہے علی قاری بجائے موضوع کے اسے ضعیف مانتے ہیں اسکی طرف اشارہ ان کے قلم سے اسی جگہ موجود بھی ہے۔ انھوں نے اسی جگہ یہ تسلیم کیا ہے کہ بے شک اس کی سند کا ایک راوی ابو شیبہ ضعیف ہے لیکن اس کی دو اور سندیں بھی پائی جا رہی ہیں۔ لہذا تینوں سندوں سے ایک دوسری کو قوت مل گئی۔ یہ ارشاد بجائے خود بتا رہا ہے کہ باقی دو سندیں بھی ضعیف ہی ہیں کیونکہ اگر وہ دونوں یا ان میں سے ایک بھی صحیح ہوتی تو وہ بغیر کسی مدد کے خود ہی قوی ہوتی

قوت کے لئے کسی دوسری سند کا محتاج ہونا ضعف ہی کی دلیل ہے۔

علاوہ ازیں متعدد ضعیف سندیں اس وقت کارآمد ہو سکتی ہیں جب ان کا ضعف شدید نہ ہو اور ان سندوں سے آئی ہوئی حدیث اس وقت قبول کی جاتی ہے جب اس کا مضمون صحیح احادیث اور مسلم عقائد کے خلاف نہ ہو۔ یہاں دونوں شرطیں عنقا ہیں۔ سندیں بھی اس حد تک ضعیف کہ بعض ماہرین حدیث کے موضوع ہونے کی رائے ظاہر کر رہے ہیں اور مضمون بھی مشتبہ اور منکر۔

بہرحال یہاں ملا علی قاری نے اپنی فہم کے مطابق ایک فنی گفتگو کی۔ اس سے کسی عقیدے کا اظہار مقصود نہیں تھا۔ جہاں تک عقیدے کا سوال ہے یہیں اسی مقام پر انھوں نے درج ذیل عبارت حوالۂ قلم کی ہے۔

ویشیر قوله تعالیٰ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ فانه یومی الیہ بانه لم یعش له ولد یصل الی مبلغ الرجال فان ولده من صلبه یقتضی ان یکون لب قلبه کما یقال الولد سر ابیه ولو عاش وبلغ اربعین وصار نبیا لزم ان لا یکون نبینا خاتم النبیین۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور انبیاء کے خاتم ہیں۔ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا کوئی بیٹا اتنے دنوں نہیں جیئے گا کہ اسے مرد کہا جائے۔ کیونکہ جو بیٹا آپ کے صلب سے ہوا سے بر اقتضائے حدیث آپ ہی جیسا قلب حاصل ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی عادت و خصلت پر ہوتا ہے۔ تو اگر ابراہیم ابن رسول زندہ رہتے اور چالیس سال کی عمر تک پہنچتے اور نبی ہو جاتے تو اس سے لازم آتا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہیں ہیں۔

٭٭٭

یہاں اگرچہ ملا علی قاری سے ایک ذرا سی چوک ہو گئی۔ الولد سر ابیہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ باپ اگر نبی ہے تو ہر بیٹے میں بھی تمام اوصافِ نبوت موجود ہوں۔

یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ نوح علیہ السلام کے کافر بیٹے کی مثال قرآن ہی میں موجود ہے اور دیگر انبیاء میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ ان کے تمام بیٹے باوجود زندہ رہنے کے نبی نہیں ہوئے۔

لیکن اس چوک سے قطع نظر یہ تو بہرحال وہ صاف کہہ رہے ہیں کہ اگر ابراہیم زندہ رہ کر نبی ہو جاتے تو یقیناً یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے خلاف ہوتا اور اس سے ثابت ہوتا کہ حضور آخری نبی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ رسول اللہ کے بعد کسی کا نبی ہونا علی قاری جائز نہیں سمجھتے کیونکہ اس سے حضور کی خاتمیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

قادیانی صاحب موضوعِ کبیر کھولے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے علی قاری کی یہ عبارت موجود ہے لیکن اسے نظر انداز کرتے ہوئے ان کی پوری بحث سے درج ذیل ٹکڑا اٹھا لیتے ہیں۔

"یعنی ان کا (ابراہیم یا حضرت عمرؓ کا) نبی ہو جانا خدا تعالیٰ کے قول خاتم النبیین کے خلاف نہ ہوتا کیونکہ خاتم النبیین کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرتؐ کے بعد ایسا نبی نہیں آسکتا جو آپ کی شریعت کو منسوخ کرے اور آپ کی امت میں سے نہ ہو۔"

یہ بات ملا علی نے کیا کہی ہے اسے سمجھنے کے لئے دقیقہ رس دماغ اور طلب حق کی نیت چاہیئے۔ قرآن نے جس موقع پر خاتم النبیین کا لفظ استعمال فرمایا ہے وہاں بلاشبہ اس کا مفاد یہی ہے کہ حضور پر دین مکمل ہو چکا۔ اب قیامت تک یہی دین معتبر ہوگا۔ اس میں تبدیلی کے لئے اللہ کوئی نبی مبعوث نہیں کرے گا۔ نئی کوئی شریعت نہیں آئے گی۔ علی قاری اسی مفاد کے پیش نظر فرما رہے ہیں کہ یہ لفظ نئی شریعت کے نہ آنے کی خبر دے رہا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ اگر حضور کے بعد انبیاء کا سلسلہ پسند ہی کرتا تب بھی وہ نبی کوئی نئی شریعت نہ لاتا۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ ملا علی کا یہ کلام ایک مفروضے پر

مبنی ہے۔ اللہ نے حضرت عمرؓ کو نبوت نہیں دی حالانکہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو حضورؐ کے بعد سلسلۂ نبوت جاری رکھنا منظور نہیں اور جب منظور نہیں تو طے ہوگیا کہ اب کسی نبی کا مبعوث ہونا محالات میں سے ہے۔

ملا علی قاری کی عظمتِ شان کے باوجود یہ ہم ضرور کہیں گے کہ موضوع کبیر کے اس مقام پر ان کی تحریر اُلجھ گئی ہے۔ وہ اپنا مافی الضمیر عمدہ طور پر بیان کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تاہم جب اسی جگہ انھوں نے صاف صاف یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر ابراہیم زندہ رہ کر نبی ہو جاتے تو یہ بات ہمارے نبی کی خاتمیت کے خلاف ہوتی تو قادیانی صاحب کی نقل کردہ عبارت قابلِ استناد کہاں رہی کیونکہ جو مطلب موصوف اس کا لے رہے ہیں وہ ہماری نقل کردہ عبارت کی ضد ہے اور اس صورت میں دونوں عبارتیں ساقط الاعتبار ہو جاتی ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ایک عبارت سے استدلال کرے اور دوسری کو نظر انداز کر دے۔

اور یہ بھی ہر شخص کے سامنے ہے کہ "موضوع کبیر" علم العقائد کی کتاب نہیں ہے۔ اس کی کسی عبارت سے کھینچ تان کر کوئی عقیدہ نکالنا سراسر نامعقولیت ہے جبکہ ملا علی قاری نے عقائد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

فقہ اکبر جو امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اس کی شرح میں ملا علی قاری صفحہ ۲۰۲ پر رقم طراز ہیں:۔

"ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔"

ملاحظہ کر لیجئے کتنی صاف، بے غبار اور قطعی عبارت۔ کوئی بھی آدمی جس میں ذرہ برابر انصاف پسندی ہو کیا اس سے انکار کر سکتا ہے کہ علی قاری کا عقیدہ یہ ہے نہ کہ وہ جسے قادیانی صاحب [illegible] موضوع کبیر سے نکال رہے ہیں۔

بدنیتی کا نمونہ

اس کے علاوہ موصوف کی بدنیتی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجئے:۔

ملا علی قاری کی جو عبارت ابراہیم ابن رسولؐ کے متعلق ہم کتابچے سے نقل کر آئے ہیں اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "اگر حضرت عمرؓ نبی ہو جاتے۔" یہ دراصل اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جو ترمذی میں آئی ہے اور علی قاری نے چند سطور بعد اسی جگہ اسے احمد اور حاکم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:۔

لو کان بعدی نبیٌ لکان عمرؓ ابن الخطاب۔ — حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتے۔

قادیانی صاحب یہ حدیث پڑھتے ہیں لیکن ذرا پروا نہیں کرتے کہ اللہ کا رسولؐ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کے بجائے ابراہیم والی روایت کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"آنحضرتؐ فرماتے ہیں اگر میرا بیٹا ابراہیم زندہ رہتا تو ضرور نبی ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے نزدیک اس کا نبی نہ بننا اس کی موت کی وجہ سے ہے نہ کہ آیت خاتم النبیین کے نزول کی وجہ سے۔"

کیا حضرت عمرؓ کے معاملے میں موصوف نہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ حضورؐ کے بعد زندہ رہے، جوان سے بڈھے ہوئے لیکن نبی نہ بن سکے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے نبی بننے میں رکاوٹ موت نہیں بنی خاتم النبیین والی آیت بنی۔ لا نبی بعدی والی حدیث بنی۔ اگر حضورؐ کے بعد کسی قسم کے نبی کی بعثت کا امکان ہوتا تو حضرت عمرؓ سے زیادہ کون نبوت کا مستحق تھا جب کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم خود توثیق فرما گئے ہیں کہ عمرؓ میں استعدادِ نبوت پائی جاتی ہے۔ انبیاء والے اوصاف پائے جاتے ہیں۔

اگر ذرا بھی نیک نیتی قادیانی صاحب میں ہوتی تو اس سامنے کی بات کو نظر انداز کر کے یہ منطق کبھی نہ چھانٹتے [illegible]

کی نبوت میں صرف نبوت روک بنی ہے آیت نہیں۔

مکر و دغا کے دو اٹل ثبوت

روایت لوعاش پر مزید گفتگو سے پہلے ہم قادیانی صاحب کے مکر و فریب کے دو ایسے ثبوت دیتے ہیں جن کا کوئی توڑ نہیں۔

(۱) یہ کتابچہ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے مولانا مودودی کے رسالہ "ختم نبوت" پر بہ الفاظِ مصنف "علمی تبصرہ" ہے۔ ہم نے ابھی شرح فقہ اکبر سے ملا علی قاری کا جو عقیدہ نقل کیا وہ اسی رسالہ میں موجود ہے۔ قادیانی صاحب اپنی آنکھوں سے اسے پڑھ رہے ہیں لیکن اس پر ایک حرف کہے بغیر ملا علی قاری کی موضوعات کبیر سے ایک عبارت اٹھا کر دنیا کو دکھلا رہے ہیں کہ دیکھو ملا علی قاری کا عقیدہ یہ ہے۔

یہ آپ دیکھ ہی چکے کہ انھوں نے کس تعظیم سے علی قاری کو فقہ حنفیہ کا ایک زبردست امام کہا ہے۔ گویا باور یہ کرانا چاہتے ہیں کہ ملا علی قاری واقعتہً بہت مستند عالم ہیں اور ان کی میرے قلب میں بڑی وقعت ہے۔ مگر یہ بات اگر دھوکا دہی کے لئے نہ ہوتی تو اپنے زیر تبصرہ رسالے میں شرح فقہ اکبر والی عبارت دیکھ کر فوراً اپنے واہی عقائد سے توبہ کر لیتے اور کانپ اٹھتے کہ ادھر رسول اللہؐ کے بعد دعویٰ نبوت کو ملا قاری نہ صرف کفر مانتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ تمام امت اس کے کفر ہونے پر متفق ہے۔

لیکن توبہ کے عوض کیا انھوں نے یہ ہے کہ ملا علی کے اصل عقیدے کو صاف نظر انداز کر دیا اور کھینچ تان کر ان کی طرف بالکل الٹا عقیدہ منسوب کرنے لگے۔

(۲) اگر موصوف کے دل میں ملا علی قاری کی واقعتہً کوئی توقیر ہوتی اور ان کی رائے کو وہ قابل حجت سمجھتے تو قدرتی بات ہے کہ ملا علی قاری کے مقتدا اور مرجع امام ابو حنیفہؒ کی توقیر اور بھی زیادہ ان کے قلب میں ہوتی اور ان کی رائے کو اور زیادہ اہمیت دیتے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا مودودی رسالہ (ضمیمہ) میں نقل کرتے ہیں:۔

"امام ابو حنیفہؒ (۸۰ھ ۔ ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امام اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی۔" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابن احمد المکی ج ۱ صفحہ ۱۶۱ مطبوعہ حیدرآباد) (ضمیمہ)

قادیانی صاحب نے زیر تبصرہ رسالہ میں ابو حنیفہ کا یہ محکم فیصلہ ملاحظہ فرمایا مگر کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اندازہ کیجئے۔ ملا علی قاری نویں تا دسویں صدی ہجری کی شخصیت ہیں۔ ان کے مقتدا اور شیخ ابو حنیفہ دوسری صدی ہجری میں گزر چکے۔ اس طرح ملا صاحب ان کے شاگردوں کے شاگردوں کے شاگرد بھی نہیں۔ سیکڑوں واسطوں کے بعد ان کا نمبر آتا ہے۔ اگر وہ قادیانی صاحب کے نزدیک ایسے ہی محترم و مستند ہوتے جیسا کہ موصوف نے اپنے گواہ کی حیثیت میں انھیں پوز کیا ہے تو ابو حنیفہ کی رائے کا احترام وہ ان کی رائے سے کہیں زیادہ کرتے۔ مگر کسی کا بھی احترام ہے کس مسخرے کو۔ یہ تو ملا علی قاری "حنفیہ کے زبردست امام" اس لئے لکھ دیئے گئے کہ سادہ لوح عوام کے آگے انھیں اپنا ہم نوا اور حامی بنا کر پیش کرنا تھا۔ کیا اس طرح کا ناٹک رچانے والے بھی فکری دیانت اور حق و انصاف کے امین ہو سکتے ہیں۔

آگے ایسے متعدد نمونے اور بھی ان شاء اللہ آ رہے ہیں۔

عقل و درایت کا پہلو

یہاں تک کی گفتگو سے منقح ہو گیا کہ لوعاش ابراہیم والی روایت انتہائی ساقط الاعتبار ہے اور بہت سے بہت اسے موضوع نہ سہی ضعیف مانا جا سکتا ہے عقائد کے باب میں ضعیف احادیث کی کوئی قیمت نہیں۔ عقیدے کی بنا قطعیات پر ہوتی ہے۔ حضورؐ کا آخری

نبی ہونا اور ان کے بعد کسی کا بھی نبی نہ بن سکنا عقائد ہی کے زمرے میں ہے اور عقائد بھی وہ جنھیں بنیادی ترین اہمیت حاصل ہے لہذا جو لوگ اس کے سلسلے میں ضعیف و واہی روایات سے استدلال کرتے ہیں انھیں اجہل یا پھر مکار کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مگر چلیے کچھ دیر کو ہم مانے ہی لیتے ہیں کہ یہ روایت درست ہے۔ پھر بھی قادیانی موقف کے لئے اس میں مطلق گنجائش نہیں نکل سکتی۔

علم البلاغت کا معروف اسلوب ہے کہ کسی شے کا قطعی انکار اور تردید پیش نظر ہو تو براہِ راست اس کا انکار کرنے کے عوض اسے کسی ناممکن شرط سے جوڑ دیتے ہیں۔ جب شرط ہی ناممکن ہوگی تو وہ چیز کیسے واقع ہو سکتی ہے جو اس شرط سے مشروط ہو۔ جیسے قرآن میں فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں غرور و نخوت کا رویہ اختیار کیا وہ

لَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ۔

"جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جبتک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے۔"

(اعراف۔ آیت ۴۰)

اللہ نے ان کافروں کے دخول جنت کی شرط ایسی رکھدی جو ناممکن الوقوع ہے۔ اس کا یہی تو مطلب ہے کہ ان بدبختوں کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ اب اگر کوئی یوں کہنے لگے کہ اس آیت کی رو سے کفار کا داخلہ جنت میں ممکن ثابت ہوتا ہے تو آپ اسے احمق کے سوا کیا کہیں گے۔ کسی بھی شے کو بطور شرط بیان کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ لازماً ممکن بھی ہو۔ قرآن کہتا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ لَفَسَدَتَا (الانبیاء)

"اگر زمین و آسمان میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو یہ زمین و آسمان تہہ و بالا ہو جاتے۔"

یہاں ایک سے زیادہ خدا کا ہونا بطور شرط بیان کیا گیا تو کیا اس کا یہ منشا ہے کہ ایک سے زیادہ خدا ہونے ممکن ہیں؟

سورۂ رعد میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (پیغمبر! اگر تو چلے مشرکین و کفار کی خواہشات کے پیچھے علم آجانے کے بعد بھی تو یاد رکھ کہ اللہ سے تجھے بچانے والا اور اس کے مقابلے پر تیری حمایت کرنے والا کوئی نہیں)

یہی بات سورۂ بقرہ میں بھی دو بار کہی گئی ہے۔ دیکھ لیجئے جس طرح لو کان عاش والی حدیث میں ابراہیمؑ کا نبی ہونا زندگی پر معلق اور منحصر ہے اسی طرح یہاں ایک سخت وعید کو اس بات پر معلق کیا گیا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلٰوۃ والسلام کفار و مشرکین کی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں۔ کیا عملاً یہ ممکن تھا؟

سورۂ بنی اسرائیل میں اور زیادہ سخت الفاظ کہے گئے:

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم نے تجھے اے پیغمبر سنبھالے رکھا تو اہل شرک و کفر کی طرف تو کچھ نہ کچھ جھک جاتا تب یقیناً ہم تجھے دگنا مزا چکھاتے زندگی اور موت دونوں میں۔ پھر تجھے ہمارے مقابلے میں مدد کرنے والا کوئی نہ ملتا)

اِن قرآنی نظائر سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جو بات کسی امر محال پر معلق اور اس سے مشروط ہو وہ خود محال ہوا کرتی ہے۔

اب آئیے لو عاش ابراہیم کی طرف۔ اگر یہ بات واقعتہً حضورؐ نے فرمائی ہے تو بلاشبہ اس وقت فرمائی ہے جب ابراہیم مر چکے ہیں۔ جو شخص مر چکا اس کی موت کا وقت پہلے سے متعین تھا۔ حضورؐ جانتے تھے کہ جو خدائی فیصلہ واقع ہو چکا وہ اٹل تھا۔ اس کے خلاف واقع ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ اس کے وقت کو آگے پیچھے کیا جا سکے۔ قرآن کہتا ہے لَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاءَ اَجَلُهَا

حضورؐ سے بڑھ کر قرآن کا مومن کون ہوگا علیہ الصلوٰۃ والسلام جب وہ فرماتے ہیں لو عاش ابراھیم (اگر ابراہیم زندہ رہتا) تو صریحاً وہ ایک ناممکن شرط کا تلفظ فرماتے ہیں اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جس چیز کے لئے اس شرط کا تلفظ کیا گیا ہے اس کے ناممکن ہونے پر آپ بلیغ انداز میں زور دے رہے ہیں جیسا کہ ابھی آپ نے قرآنی مثالوں میں دیکھا۔ اگر یہ مقصد نہ ہو تو معاذ اللہ یہ ماننا ہوگا کہ آپ نے ایک فضول اور لاحاصل بات فرمائی۔ خاک بدہنِ گستاخ قادیانیوں کا یہ زور لگانا کہ اس حدیث سے رسول اللہ صلعم کے بعد بھی کسی قسم کے نبی کا مبعوث ہونا ثابت ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی مذکورہ آیات کا حوالہ دے کر یہ زور لگائے کہ بدترین کافروں کا جنت میں داخلہ قرآن سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ خدا پائے جائیں۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ رسول اللہ صلعم کفار و مشرکین کی پیروی کرنے لگ جائیں۔

زید نے کہا کہ میں تمہیں ہزار روپے ضرور دوں گا اگر میری کیاری میں روپوں کا درخت اُگ آئے۔ اب اگر آپ یہ کہتے پھریں کہ زید نے روپے دینے کا وعدہ کر لیا ہے تو آپ خود سوچیے کیا پاگل خانے کے علاوہ بھی کوئی جگہ آپ کے لئے موزوں ہوگی۔ پھر قادیانیوں کے بارے میں کیا رائے ہے جب وہ یہ گل افشانی کرتے ہیں کہ ایک مرے ہوئے بچے کی زندگی سے مشروط کر کے جو بات کہی گئی ہے وہ بہر حال ممکن ہے۔ حالانکہ لو کان بعدی نبی لکان عمر والی روایت صاف بتا رہی ہے کہ حضورؐ اپنی ذات پر ختم نبوت کا اعلان اور اپنے بعد کسی نبی کی بعثت کا صاف انکار کر رہے ہیں۔ اسی انکار کا ایک بلیغ اسلوب وہ بھی ہے جو آپ نے لو عاش ابراھیم میں اختیار فرمایا۔ اُردو کی پرانی کہاوت ہے نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ ابراہیم ابن رسولؐ کا وقتِ مرگ اٹل تھا۔ کون اسے ٹال سکتا تھا۔ موت آ بھی چکی۔ اب زندگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ امکانِ نبوت کی گنجائش نکالو۔ اونٹ سوئی کے ناکے میں کبھی نہیں گھسے گا۔ آیاتِ خدا سے لڑنے والے جنت میں کبھی نہیں جائیں گے۔ ٹھیک اسی طرح حضور کے بعد قیامت تک کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ حضرت عیسیٰؑ آئیں گے تو وہی اپنی سابقہ نبوت لئے ہوئے جو حضورؐ سے پہلے مل چکی اور شریعتِ محمدیؐ کے اتباع کے سوا کوئی دعویٰ ان کی زبان پر نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اول تو لو عاش والی روایت قابلِ اعتبار ہے ہی نہیں لیکن اعتبار ہی کر لیں تب بھی اس سے امکانِ نبوت ثابت نہیں ہوتا بلکہ شد و مد سے اس کی تردید ہوتی ہے اور لو کان بعدی نبی والی حدیث تو ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ بابِ نبوت حضورؐ پر بند ہو چکا۔ اب کوئی شخص کیسی ہی صلاحیتیں رکھتا ہو اسے نبوت نہیں بخشی جائے گی۔ شمّہ برابر بھی امکان ہوتا تو حضرت عمرؓ لازماً نبی ہو جاتے کیونکہ اللہ کے سچے رسولؐ ان کے اندر ادصافِ نبوت اور استعدادِ نبوت پائے جانے کی خبر دے رہے ہیں۔ جب عمرؓ ہی نبی نہیں ہوئے تو دوسرا کون مائی کا لال نبی ہو سکتا ہے۔

یہ بھی دیکھئے

ابنِ ماجہ میں جس جگہ یہ لو عاش ابراھیم والی روایت آئی ہے وہیں اس سے متصل پہلے یہ روایت موجود ہے کہ اسمٰعیل بن خالد نے ایک صحابی عبد اللہ ابن ابی اوفیٰ سے پوچھا کہ تم نے رسول اللہ صلعم کے صاحبزادے ابراہیم کو دیکھا تھا۔ انھوں نے جواب دیا:-

مات وھو صغیر ولو قضی ان یکون بعد محمد نبی لعاش ابنہ ولکن لا نبی بعدہ

(ابراہیم کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا اور اگر اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کرتا کہ محمدؐ کے بعد بھی کوئی نبی ہو تو ابراہیم زندہ رہتے لیکن محمدؐ کے بعد تو کوئی نبی ہے ہی نہیں)

یہ ایک صحابیِ رسول کا واضح کلام ہے۔ قادیانی صاحب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر بھی وہ یہ ادراک نہیں فرماتے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد کسی نبی سے نبوت نہ ہونا

صحابہؓ کے نزدیک مسلمات میں سے تھا اور صحابہؓ کے نزدیک مسلمات میں ہونا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ خبر انھیں رسول اللہ ہی سے پہنچی تھی اور اس درجہ وضاحت کے ساتھ پہنچی تھی کہ کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہاں تشریعی اور غیر تشریعی کی بھی بحث نہیں اٹھائی جا سکتی۔ حق یہ ہے کہ کسی بھی مقام پر اس بحث کی گنجائش نہیں۔ قرآن نے خاتم النبیین فرمایا تو بلا قید و شرط فرمایا۔ ہر طرح کی نبوت کا خاتمہ اس میں آگیا اور حضورؐ نے جب جب اس مضمون کو بیان فرمایا تو اسی عموم کے ساتھ بیان فرمایا۔ اس میں یہ شوشہ پیدا کرنا کہ صرف تشریعی نبوت ختم ہوئی ہے غیر تشریعی نبوت کا سلسلہ جاری ہے کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ نبی جب بھی مبعوث کیا گیا ہے دو میں سے ایک مقصد کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ یا تو وہ ایک آسمانی شریعت اپنے ساتھ لایا یا پچھلی شریعت میں جو رد و بدل لوگوں نے کر لیا تھا اس پر متنبہ کرنے اور اصل احکام کو ظاہر کرنے کی خدمت اس نے انجام دی۔

تکمیل دین اور نزولِ قرآن کے بعد یہ دونوں وجوہ یکسر ختم ہو گئے۔ اب نہ تو کسی نئی شریعت کا امکان ہے نہ شریعتِ محمدیہؐ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ قرآن جوں کا توں محفوظ ہے۔ احادیث منضبط ہو چکی ہیں۔ اب جو بھی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں اور کی جا رہی ہیں ان کا تعلق تعبیر و تشریح سے ہے۔ اس غلط کاری اور فساد انگیزی کا مقابلہ کرنے کے لئے انبیاء کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ آسمان سے کوئی نئی خبر اب نہیں بھیجی جائے گی بلکہ جو خبریں اور روایات دی جا چکی ہیں ان کو ہی پھیلانا اور گرد و غبار سے صاف کرنا اہلِ ایمان کا کام ہوگا۔ اس کے لئے علماء موجود ہیں۔ علماء ہی میں سے بعض وہ بندے ہوتے ہیں جنھیں مجدد کہا جاتا ہے۔ یہ اصل شرعی احکام و ہدایات کے آئینے سے گرد و غبار کی تہیں صاف کرتے ہیں جو قرآن و حدیث کی شکل میں موجود و محفوظ ہیں۔ نبوت کا کوئی موقع ہی نہیں کیونکہ اللہ کو

[illegible]

قرآن، تفسیریں، پارے، حمائلیں، دعائیں

قرآن پاک مترجم — مع تفسیر عکسی، ترجمہ مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) اور تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مجلد ریگزین — ۲۵/-
مجلد اعلیٰ چرمی کی پشت — ۴۰/-

قرآن پاک مترجم نمبر ۸۱ — عکسی ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ جلی حروف — ۲۵/-

عمدہ کتابت و طباعت مجلد ریگزین سائز ۲۰×۳۰/۸

قرآن پاک مترجم نمبر ۵۵۵ — عکسی بدو ترجمہ
مترجم: مولانا تھانویؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ۔ تاج کمپنی کے قرآن کا عکس۔ مجلد ریگزین — ۳۰/-

قرآن پاک مترجم نمبر ۶۴ کلاں — عکسی ترجمہ مولانا تھانویؒ
سائز ۲۲×۲۹/۸ کشادہ حروف۔ صاف ستھری کتابت و طباعت۔ مجلد ریگزین — ۲۴/-

قرآن پاک مترجم نمبر ۱۴۴ — عکسی۔ ترجمہ مولانا تھانویؒ
سائز ۲۰×۳۰/۸ نمبر ۸۱ سے چھوٹے حروف۔ جلد خوبصورت ہر لحاظ سے معیاری
مجلد ریگزین۔ ہدیہ — ۴۰/-

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۳ — عکسی۔ ہر سطر کے بعد لائن کاغذ
کتابت طباعت سب عمدہ سائز ۲۰×۳۰/۸ (تحملی سائز) ریگزین عمدہ — ۲۰/-
قسم دوم کچھ ہلکے کاغذ پر — ۱۸/-

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۱۲۶ — عکسی۔ ہر صفحہ آیت پر ختم
کاغذ، کتابت، طباعت جلد سب عمدہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ مجلد ریگزین — ۱۶/-

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۵۳ — عکسی ۲۰×۲۶/۸ مبتدیوں اور بچوں کیلئے نہایت عمدہ مجلد کریچ قسم اول — ۱۱/۵۰
قسم دوم — ۱۰/-

حمائل مترجم نمبر ۲ — عکسی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ترجمہ مولانا تھانویؒ
حاشیہ پر مختصر تفسیر۔ ہر لحاظ سے اچھی مجلد کریچ — ۱۵/-

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۳ — عکسی ۲۰×۳۰/۱۶ سائز ہر سطر کے بعد لائن۔ روشن حروف۔ ہر لحاظ سے معیاری۔ مجلد کریچ — ۱۰/-

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۶ — عکسی کارڈ سائز باریک عمدہ سفید کاغذ پر مجلد پلاسٹک۔ حفاظ کے لئے عمدہ — ۸/۵۰

حمائل بلا ترجمہ عکسی — سائز ۱۸×۲۲ ہر صفحہ آیت پر ختم
کتابت، کاغذ اور طباعت عمدہ۔ مجلد کریچ — ۱۰/۵۰

قرآن پاک ۲۰×۳۰/۸ سائز کے پارے۔ تمام پارے الگ الگ مجلد جو مساجد میں رکھوائے جاتے ہیں۔ مکمل — ۳۵/-

قرآن پاک ۱۸×۲۲/۸ سائز کے تمام پارے الگ الگ مجلد جو مساجد میں رکھوائے جاتے ہیں مکمل — ۲۵/-

ان کے علاوہ ہر قسم کے عکسی و غیر عکسی پارے قاعدے یسرنا القرآن اور نمازیں وغیرہ مناسب ترین نرخوں پر بھیجے جاتے ہیں۔ پارے کلاں غیر عکسی ۲۵/- روپے سیکڑہ۔ پارے عکسی گلیزڈ کاغذ پر ۳۴/- روپے سیکڑہ۔

فضا ابن فیضی

شوخ ڈھنگ لانا میرا جو مری بصیرت کا حسن بھی ہے خامی بھی
شاعری کی دنیا میں ہے اسی کی پروردہ وضع خود کلامی بھی

نیکیوں سے کیا حاصل جاؤ ان کو دریا میں اب اٹھا کے پھینک آؤ
دامن دل و جاں کا بن گئی ہے اک دھبہ اپنی نیک نامی بھی

اقتدار ذاتی کے بت تراشے جاتے ہیں اور پوجے جاتے ہیں
شہر میر و منعم کا ایک آذرستاں ہے مجلس عوامی بھی

سونے اور چاندی کی پاؤں میں ہیں زنجیریں تیز چل نہیں سکتے
لذت تن آسانی! مجبوری نہیں لیکن یہ سبک خرامی بھی

مہر ہے زبانوں پر، بند ہیں خیالوں پہ، تیغیں ضمیروں پر
پھر بھی ہم سمجھتے ہیں، اک عظیم منصب ہے، وقت کی غلامی بھی

لاؤ میرے ساغر میں، ڈھال دو اسے یارو! میں یہ آگ پی جاؤں
کب سے خاک بر سر ہے، دانش و بصیرت کا شعلۂ گرامی بھی

روح زہر آلودہ، ذہن کرب آئیدہ، فن خراش آلودہ
دیکھ! قلزمِ خوں میں کیسے غسل دیتی ہے شہرتِ دوامی بھی
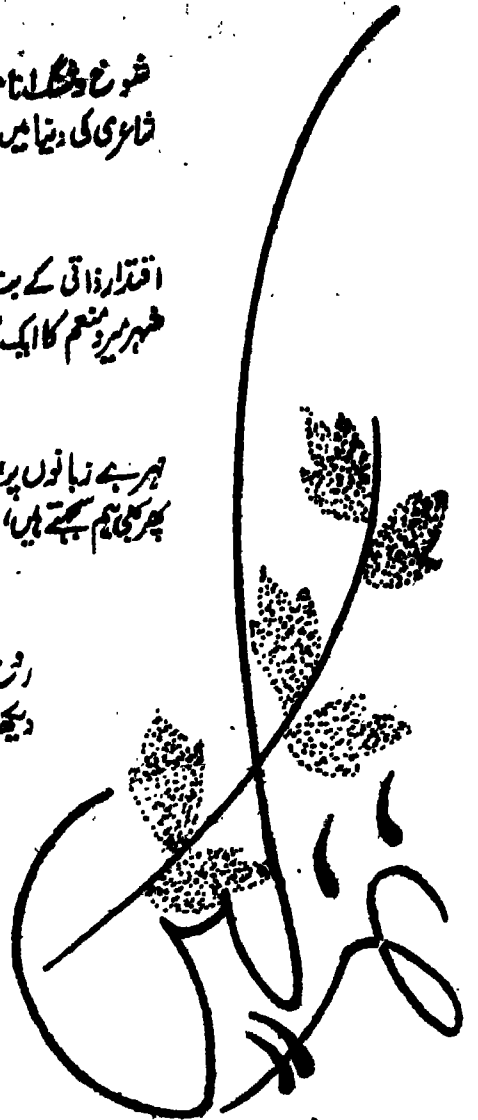
کیف نیر کانوی

زخم دل، سوز دروں، خون جگر مانگے ہے
سیم و زر مانگے ہے جس نے لعل و گہر مانگے ہے
ان کے انکار پہ ہے ترک کا عالم طاری
جادہ پیما ہوا پھر قافلۂ اہل جنوں
آہ انجام گل و لالہ و نرگس معلوم
چھائی ہے ظلمتِ شام غم دوراں کیسے

ہم سفر راہِ وفا، زادِ سفر مانگے ہے
دل بیتاب محبت کی نظر مانگے ہے
زندگی ایک نئی فکر و نظر مانگے ہے
عشق پھر سوز یقیں دیدۂ تر مانگے ہے
باغباں آپ ہی جب برق و شرر مانگے ہے
زندگی اک نئی تابندہ سحر مانگے ہے

کیف پھر تازہ کرو رسم شہیدانِ وفا
تختۂ دار تمہارا ہی تو سر مانگے ہے

مذاقِ امام غزالیؒ قیمت مجلد تین روپے

معارف الحدیث مولانا منظور نعمانی کی مشہور تالیف منتخب احادیث نبوی اردو ترجمہ تشریح کے ساتھ۔ مکمل غیر مجلد اکیاون روپے

حصہ اول ۔ آٹھ روپے پچاس پیسے۔
حصہ دوم ۔ دس روپے۔
حصہ سوم ۔ بارہ روپے پچاس پیسے
حصہ چہارم ۔ نو روپے۔
حصہ پنجم ۔ گیارہ روپے۔

اسلام کیا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی وہ مشہور کتاب جس میں اسلام کا تفصیلی تعارف اس انداز میں کرایا گیا ہے کہ ہر استعداد کا آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قیمت مجلد۔ ساڑھے تین روپے۔

نفیس مناظرہ سنی شیعہ مباحث میں ایک بے بہا کتاب جو عقائد اہل سنت کی صحت اور عقائد شیعہ کے سقم و ضعف کو روشن دلائل کے ذریعے ذہنوں میں اتارتی ہے۔ طرز تحریر سلیس اور دلچسپ اور لب ولہجہ شایانِ شان۔ استدلال علمی مگر عام فہم۔ جلد اول خلافت وامامت اور قصہ قرطاس کی بحثوں پر مشتمل۔
قیمت ۔۔ سات روپے۔
جلد دوم، فدک، متعۃ النساء اور غوث پاک سے متعلق
قیمت مجلد۔ چھ روپے۔ مکمل تیرہ روپے۔
(قابل دید کتاب ہے، شائقین فائدہ اٹھائیں)

اسلام کا نظام امن اسلام کی پاکیزہ ترین اصطلاح "جہاد" کی آڑ لیکر اسلام کے دشمنوں نے بد امنی، فتنہ انگیزی، خوں آشامی اور انتقام پسندی کے جو الزامات اسلام کے خلاف گھڑے ہیں ان کا تسلی بخش جواب قرآن و سنت اور روایات کی روشنی میں۔ قیمت مجلد ۔۔۔ بارہ روپے۔

اصلاح الرسوم مسلمانوں میں جو فضول رسمیں رواج پاگئی ہیں ان کی تردید و مذمت میں مولانا اشرف علیؒ کی مشہور کتاب
قیمت مجلد۔ تین روپے ۲۵ پیسے۔

مکمل لغات القرآن قرآن کے تمام ہی الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تحقیق پر علمائے سلف و خلف نے اب تک جو لکھا ہے اسکی روشنی میں بڑی عرق ریزی سے تیار کی ہوئی یہ رفیع الشان کتاب اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے ہر لفظ کی تشریح میں وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے جس سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب معیاری ہر جلد کے الفاظ کی مفصل فہرست ہم رشتہ۔

جلد اول	
جلد دوم	بیرونِ واسیدٹ غیر مجلد
جلد سوم	ستائیس روپے پچاس پیسے
جلد چہارم	
جلد پنجم	چھ جلدوں میں مجلد
جلد ششم	اکہتر روپے پچاس پیسے

رحمۃ للعالمینؐ حضورؐ کی سیرت پر قاضی محمد سلیمان منصورپوریؒ کی یہ مشہور زمانہ کتاب معرکۃ الآراء سمجھی گئی ہے۔ تحقیقی، مستند اور لاجواب مضامین سے مالا مال۔ بعد کے سارے ہی سیرت نگاروں نے اسے ایک ثقہ ماخذ کی حیثیت سے اپنا رہنما بنایا ہے اس کا ورق ورق مفید مطالب کا گنجینہ ہے ۔۔ تین جلدوں میں مکمل۔ کاغذ سفید۔ کتابت و طباعت روشن
قیمت چھتیس روپے۔

قرآن محکم آیات کے نسخ پر ایک علمی دلچسپ بحث قیمت مجلد۔ تین روپے

مکتبہ تجلی ۔ دیوبند (یو۔ پی)

اہلِ ایمان کی راہ

ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ

دنیا جس طرف جا رہی ہو ہم بھی اسی طرف جائیں ہمارا کام یہ ہے کہ اگر دریا غلط راستہ کی طرف بہہ رہا ہو تو ہم اس کا رُخ پلٹ دیں یا اگر اس کا رخ پلٹ نہ سکیں تو اس کی رَد کے خلاف چل کر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ لینا اور اس کے بھنور میں آکر ڈوب جانا اس سے بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ بہتے ہوئے اپنی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

میں گواہی دیتا ہوں روس کے جبری محنت کیمپوں اور قید خانوں کی حیرت ناک اور لرزہ خیز داستان ایک ایسے ادیب کے قلم سے جو خود ایک قیدی کی حیثیت سے مدت تک اس پُراسرار اور ظالمانہ جکڑبند کا شکار رہا۔ ۵۲۰ صفحات۔ چار روپے۔

چین میں اسلام کا ماضی اور حال یہ کتاب آپ کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ کرے گی۔ قیمت —— چالیس پیسے۔

سوویٹ سفارت خانے میں برما میں متعین ایک روسی ڈپلومیٹ کے تجربات۔ دستاویزی اور واقعاتی حقائق سے لبریز۔
قیمت —— دو روپے۔

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل حصہ مولانا علی میاں ندوی کی وہ تالیف جسے تمام دنیائے اسلام میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے اُن اسلاف کے کارناموں سے روشناس کراتی ہے جو اپنے انداز میں دین کی خدمت کا خوب خوب حق ادا کر گئے ہیں۔ قیمت مکمل و مجلد ۲۴ روپے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور اُنکی فقہ اُردو زبان میں پہلی بار ایک جامع اور عمدہ کتاب جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ پر لکھی گئی سوانح اور حالات۔ قیمت غیر مجلد۔ آٹھ روپے ۵۰ پیسے

مسند امام اعظمؒ یہ کتاب آپ کو بتلائے گی کہ فقہ حنفی اور احادیث رسولؐ میں کتنا گہرا اور بنیادی ربط ہے ۵۲۲ احادیث کا ذخیرہ فقہی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے جس سے ہر خاص و عام کو مطلوب مسئلے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا عبدالرشید نعمانی کا لاجواب مقدمہ بھی ہے اور قاری احمد کے قلم سے امام ابوحنیفہؒ کے حالات بھی ایک کالم میں عربی مع اعراب اور دوسرے کالم میں اُردو ترجمہ۔ قیمت مجلد۔ سولہ روپے۔

تزکیۂ نفس تزکیہ کی اصل، اس کے علمی و عملی اقسام، اس کے حصول کی صورتیں، اسکی اہمیت و ضرورت، ہر اس شخص کے لئے رہنما جو اپنے نفس کا تزکیہ چاہتا ہے۔ قیمت —— آٹھ روپے۔

سو بڑے آدمی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب تاریخ کے سو بڑے آدمیوں کا مختصر تعارف کراتی ہے۔ دلچسپ اور معلومات سے پُر۔
قیمت —— چھ روپے۔

طوفان سے ساحل تک سابق لیوپولڈ ویس اور موجودہ محمد اسد کی وہ شہرت یافتہ کتاب جس میں انھوں نے تفصیل سے اپنے اسلام لانے کی داستان لکھی ہے۔ آدمی بے حد ذہین اور صاحب علم ہیں اس لئے داستان کے ذیل میں بے شمار علمی معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر نہایت دلنشین اور ایمان افروز گفتگو کرتے گئے ہیں۔ قیمت مجلد —— سات روپے۔

آپ حج کیسے کریں؟ مولانا منظور نعمانی کی معروف کتاب۔ قیمت۔ ۳ روپے

الفاروقؓ عکسی خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت پر علامہ شبلی نعمانیؒ کی شہرۂ آفاق تالیف جو حضرت عمر فاروقؓ کے عادات و خصائل علمی کمالات، سوانح اور ان کے عہد کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات اور ان کے مجتہدانہ کارناموں کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ مجلد دس روپے۔

تذکرہ حضرت امام غزالیؒ علمائے سلف میں امام غزالیؒ کا نام نامی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے حالات و سوانح۔ مجلد۔ ڈھائی روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

اتنے میں کسی گاڑی کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی
میرے کان کھڑے ہوتے۔ نظریں آواز کی سمت اٹھ
گئیں۔ اور گرد و غبار کی اوٹ میں کسی گاڑی کا دھندلا
سا ڈھانچہ نظر آیا پھر وہ قریب ہوتا گیا۔ میری ہی طرح
کسی اور نے بھی پکی سڑک سے کٹ کر گاڑی اسی کچی سڑک
پر اتار دی تھی۔ سڑک اتنی تنگ تھی کہ دوسری
گاڑی میری اجل رسیدہ موٹر کے برابر سے ہوکر نہیں
گذر سکتی تھی اسے لازماً کھیت میں اتر کر گذرنا پڑتا۔
اب گویا قدرتاً ہی اسے رکنا پڑے گا اور مجھ ستم رسیدہ
کے لئے نجات کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی۔ وہ نیلے
رنگ کی عمر رسیدہ گاڑی ثابت ہوئی جس کا پورا
ڈھانچہ اب صاف نظر آرہا تھا۔

پھر چند ہی ثانیے بعد وہ میری گاڑی کے پیچھے
آکر رک گئی۔ میں نے دیکھا ڈرائیونگ سیٹ پر ایک
بہت ہی مکروہ صورت والا غنڈہ قسم کا آدمی تشریف
فرما تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ جبڑے کی ہڈیاں ابھری
ہوئیں۔ آنکھیں بجّو جیسی۔ ادھر اس کے برابر والی سیٹ
پر جو صاحب تشریف رکھتے تھے وہ بھی کوئی شریف
آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دونوں ہی ادھیڑ عمر کے
رہے ہوں گے۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یا ربّ
الارباب یہ تو چھٹے ہوئے بدمعاش معلوم ہیں۔ کہیں
نجات کے بجائے یہ عذاب کے فرشتے تو نہیں۔

"کیا قصہ ہے۔ کون ہے۔" ڈرائیور کی تلخ و
تند آواز بلند ہوئی۔ اسی کے ساتھ دوسرے صاحب
دروازہ کھول کر باہر نکلے اور میری طرف بڑھے۔ اب
سراپا دیکھ کر اور بھی یقین ہو گیا کہ ملّا پیارے بجر پھنسے
ان کے توانا جسم پر شکاری ٹائپ کا لباس تھا اور چہرے
سے لفنگے پن کا اعلان بانگ دہل ہو رہا تھا۔ میں اپنی گاڑی
سے ٹیک لگائے کھڑا دل ہی میں لاحول کی گردان کرنے
لگا۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم۔ گاڑی یہاں کیسے روک
رکھی ہے۔" انھوں نے قریب پہنچ کر ایک ہی سانس میں

کئی سوالات کھڑا لے اور اب ڈرائیور بھی نیچے اتر آیا۔ وہ کافی ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ مجھ سے ڈیوڑھا ہوگا۔ پاس آکر اس نے بھی کھنچیلی آواز میں یہی دہرایا۔
"کیا بات ہے" خبیث کے تیور ایسے تھے جیسے پھاڑ کھائے گا۔
میری کھوپڑی ایک لاکھ چکر فی سکنڈ کے حساب سے گردش کر رہی تھی۔ وہ بلا شبہ خطرناک لگ رہے تھے۔ میں تنہا ہوتا تو تشویش کی بات نہیں تھی کیونکہ داڑھی والوں کو ہر قوم مولوی صاحب یا حافظ جی سمجھتی ہے اور شاعر نے تو کہا ہی ہے:-

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

مگر مسز جمشید کی زندہ لاش اس وقت میرے لئے مصیبت نامہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یعنی غالب کی بشارت کے مطابق:-

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

وہ دو نہ ہوتے فقط ایک ہوتا تو ممکن تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں ماضی کی یادوں کا سہارا لے کر یا علی یا علی کہتا ہوا الٹ ہی پڑتا مگر بحالت موجودہ ایسا کرنے کا مطلب ہوگا کہ شاندار مرمت۔ اور مرمت کے بعد بھی حاصل وہی نکلے گا جو بغیر مرمت کے نکلنے والا ہے۔
"اے مولوی صاحب۔ گونگے ہو کیا؟"
ڈرائیور جارحانہ انداز میں للکارا۔ پھر اسکی نگاہ میری گاڑی کی پچھلی کھڑکی سے گذر کر مسز جمشید تک پہنچ ہی گئی۔
"ہائیں — عورت —" وہ جیسے اچھل پڑا۔ دوسرے صاحب نے بھی دو قدم آگے بڑھ کر موصوفہ خبیثہ کا دیدار کر ہی لیا۔ اور پھر ان میں تحیر اور تبسم کا تبادلہ ہوا۔ ڈرائیور کی بجو جیسی آنکھوں میں بلی جیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔
"اے — یہ سب کیا ہے" ڈرائیور غرایا۔
میں ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ بولا ایں نہیں تھا کہ قوت گویائی سمیت ساری ہی قوتوں کو کھوپڑی کے وسط میں مرکوز کر کے میں ایک کروڑ میل فی منٹ کے حساب سے سوچ رہا تھا کہ اب کرنا کیا چاہیئے۔ بے سوچے سمجھے زبان سے کچھ بک دیا تو پچھتانے کی فرصت بھی شاید ہی ملے۔
"ج جناب — بڑی مصیبت ہے" میں نے ڈری سہمی آواز میں ہکلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی زخمی پیشانی کو انگلیوں سے اس طرح دبایا جیسے بہت درد ہو رہا ہو۔
"خبردار۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون چیز ہو۔ یہ عورت کیسی لئے پھر رہے ہو۔ چہرہ زخمی کیوں ہے۔ یہاں ویرانے میں — ہائیں اوہو یہ تو تم نے عورت کے کپڑے بھی پھاڑ رکھے ہیں۔ شاباش پہنچے ہوئے مولوی معلوم ہوتے ہو۔" ڈرائیور نے کریہہ قسم کا قہقہہ اڑایا۔ دوسرے صاحب بھی ہنسے۔ میں اس طرح کراہا جیسے شدید تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ بدن بھی ڈھیلا چھوڑ دیا تھا جیسے گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا رہنا ہی مشکل ہو رہا ہو۔
"بھائی صاحب میری سن لیجئے پہلے۔ رائے قائم کرنے میں جلدی مت کیجئے۔" میری آواز فرط ضعف سے لرز رہی تھی۔
"بکو بھی کچھ" ڈرائیور بولا "بات تو ہم پوری طرح سمجھ گئے ہیں۔"
"ہائیں — آپ کیسے سمجھ گئے ہیں کیا آپ جادوگر ہیں۔" میں نے کسی پیدائشی احمق کے انداز میں منہ پھاڑ کر کہا۔
"ہم رحمت کے فرشتے ہیں ملا جی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس عورت کو کہیں سے بھگا کر لا رہے ہو۔ اس پر تم نے دست درازی بھی کی ہے۔ تیار ہو جاؤ جیل جانے کے لئے۔ تمہیں یہاں سے سیدھے تھانے میں پہنچا کر ہم کچھ اور کریں گے۔"
"نہیں۔ قسم قرآن کی ....." میں نے گھگیا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جیسے تھانے کا نام سن کر ہی روح فنا ہو گئی ہو۔ اب ان دونوں نے سر اور آنکھوں کے اشاروں سے

کچھ ناگفتہ قسم کی گفتگو کی پھر ڈرائیور نے میری گاڑی کا پچھلا دروازہ جھٹکے سے کھولا۔

"بہت بہت شکریہ صاحب۔" میں نے خوش ہو کر کہا "اب خدا کا شکر ہے گھر تو پہنچ جائیں گے۔ آپ آنٹی کو اپنی گاڑی میں ڈال لیجئے۔ مجھے بھی وہیں گھسا لیجئے گا۔"

"بھولو شاہ مطمئن رہو۔ تمھیں ہم اپنی گاڑی میں بھی گھسالیں گے اور چسنی سے دودھ بھی پلائیں گے۔" یہ ڈرائیور کا جواب تھا۔ پھر دونوں نے مسز جمشید کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی سے باہر نکالا۔ وہ اب تک بے ہوش ہی تھیں۔ انھیں اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر منتقل کرنے کے بعد ڈرائیور میری طرف آیا۔

"دیکھو مولوی صاحب۔ پہلے ہم پاس والے قصبے کو رپا چلیں گے۔ وہاں بہت بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔ وہاں تمھاری انٹی کو ڈاکٹر صاحب دوا دے کر ہوش میں لائیں گے پھر ہم تم دونوں کو تمھارے گھر پہنچادیں گے۔"

"مولا علی آپ کو دین دنیا کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ میں خود اس پریشانی میں تھا کہ آنٹی بے ہوش گھر پہنچیں تو انکل کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ وہ آپ کی دعا سے انٹی کو بہت پیار کرتے ہیں۔" یہ سب میں روانی کے ساتھ کہتا گیا مگر لہجے میں نقاہت کا اضافہ کرتا گیا اور حماقت تو اس وقت میرے چہرے سے موسلا دھار برس رہی ہوگی۔

"پھر تم ایسا کرو۔ ہم اپنی گاڑی موڑتے ہیں۔ تم بھی اپنی موڑ لو اور ہماری گاڑی کے آگے چلو۔" ڈرائیور نے آرڈر نما مشورہ دیا۔

"ارے — کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہماری گاڑی ؤ سرکتی ہی نہیں اسی لئے تو یہاں رکی کھڑی ہے۔" میں ہرایا۔

"کیا ہوا اسے۔"

"اب یہ تو مس صاحبہ ہی بتائیں گی۔ وہی اسے چلاتی ہیں — خدا کے لئے معاف کیجئے گا مجھ سے اب کھڑا نہیں رہا جاتا۔" یہ کہتے ہوئے میں زمین پر بیٹھ گیا

"کیا آنٹی کو تم مس صاحبہ بھی کہتے ہو۔" دوسرے صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

"توبہ جناب — آنٹی تو مسز فریدون ہیں۔ جی ہاں میرے انکل کا نام اے۔ آر فریدون ہے۔ چمیلی کے تیل کا بزنس کرتے ہیں — ولایت تک جاتا ہے ان کا تیل۔ کیا مہکار ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ۔"

"پاگل آدمی — مس صاحبہ تم نے کسے کہا۔"

"صاحب وہی تو چلا رہی تھیں گاڑی۔ جی ہاں آنٹی کی چھوٹی بہن ہیں — آہ۔ خبیث نے کتنی زور سے مارا ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے ایک ہاتھ سے سر اور دوسرے ہاتھ سے کمر دبائی۔

"ملا جی تمھارا دماغ خراب ہے کیا" ڈرائیور بھنا گیا "آدمیوں کی طرح ٹھیک ٹھیک بتادو سارا قصہ ورنہ ایک ہی گھونسے میں چپاتی بن جاؤ گے۔"

میں نے خوف زدہ ہو جانے کا مظاہرہ کیا پھر سہمی ہوئی آواز میں بولا:۔

"بھائی صاحب اپنی تو خود ہی جان نکلی جارہی ہے۔ خدا کے لئے گھونسے کا نام نہ لیجئے — ہائے۔" میں کراہ کر بیٹھے سے لیٹا ہو گیا یعنی زمین پر ٹکا کر سر ہتھیلی پر جما لیا۔ "پتا نہیں کمر وہ پھٹ گیا ہے یا کیا ہو گیا ہے۔ بیٹھا بھی نہیں جارہا ہے۔"

"بالکل ہی آلو کا پٹھا معلوم ہوتا ہے۔" ڈرائیور نے اپنے ساتھی سے کہا پھر میرے قریب ہی اکڑوں بیٹھ کر جیب سے ایک بڑا سا چاقو نکالتے ہوئے بولا:۔

"بکواس بہت ہو چکی سیدھی طرح بتاؤ تم کون ہو۔ اپنی آنٹی کو کہاں سے لا رہے تھے۔ یہ کیوں بے ہوش ہیں۔ کونسی مس صاحبہ گاڑی چلا رہی تھی۔"

میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے تھوک نگلا اور دوسرے

ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے چھرا جیب میں رکھ لیجئے۔ دیکھئے ہم لوگ رحم دل گئے تھے۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں بس آنٹی ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن مس زرینہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ بے حد حسین ہیں۔ وہی چلاتی ہیں موٹر۔ لوٹتے میں انھوں نے کہا کہ یہ راستہ جلدی شہر پہنچاتا ہے۔ بس اسی طرف گاڑی موڑ لی۔ یہ جو گاڑی کا پہیہ گڈھے میں آپ دیکھ رہے تو اس مردود گڈھے نے پتا نہیں کیا جادو سو بسن کی کہ گاڑی ٹھپ ہو کر رہ گئی۔"

اتنا کہہ کر میں نے ہونٹوں پر اچھی طرح زبان پھیری جیسے بہت خشکی اور ضعف محسوس کر رہا ہوں۔ میری آواز بھی رفتہ رفتہ ڈوبتی جا رہی تھی۔

"بھینا رو پھر تم چپ ہو گئے۔" ڈرائیور دہاڑا۔

"بڑے صاحب مجھ سے تو بولنا بھی مشکل ہو رہا ہے تو گاڑی جب ٹھپ ہو گئی تو مس زرینہ نیچے اتر کر موٹر کے منہ کی طرف چلیں کہ انجن دیکھیں مگر اتنے ہی میں سامنے سے ایک جوان سا آدمی آ دھمکا۔ بہت ہی لفنگا تھا سور کا بچہ۔ مس زرینہ کو کچھ کچھ کہنے لگا۔ مجھے غصہ آیا تو اسے ڈانٹ دیا۔ پھر تو مردود نے میرے لوہے کا ڈنڈا رسید کر دیا۔ یہ ماتھے پہ اسی کی چوٹ ہے۔ کوکھ میں بھی مارا تھا حرام زادے نے۔ آنٹی گاڑی سے اتر کر اس سے بھڑنا چاہتی تھیں کہ ان پر بھی اس نے گھونسے برسا دیئے۔ گاڑی کے اندر دھکا دے دیا بہت تگڑا تھا۔ ان کے کپڑے اسی دھینگا مشتی میں پھٹے ہیں۔ پھر کمینے نے جانے کیسا گھونسا مارا کہ بے چاری بے ہوش ہی ہو گئیں۔"

"تو کدھر ہے وہ زرینہ؟" ڈرائیور آنکھیں نکال کر بولا۔

"آہ — ہائے — میں تو شاید مر ہی جاؤں گا بھائی صاحب۔ یا مولا مشکل کشا۔"

"ارے گھبراؤ نہیں۔ تمہیں بھی ڈاکٹر کو دکھلائیں گے۔ زرینہ کہاں گئی ذرا جلدی سے بتا دو۔"

"آپ کی گاڑی سامنے آنے سے دو منٹ پہلے وہ کمینہ اسے کاندھے پر لاد کر وہاں لے گیا ہے۔" میں نے اسی کھنڈر نما مکان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جس کی گلگشت ابھی کچھ دیر قبل کر آیا تھا۔ "پہلے تو وہ چیختی رہی تھی مگر معلوم ہوتا ہے اس سور کے بچے کے پاس کوئی عمل دل ایسا ہے کہ گھما کے اسے بے ہوش کر دیتا ہے۔ انٹی کو بے ہوش کیا ہی تھا۔ یقیناً زرینہ کو بھی بے ہوش ہی کر دیا ہو گا کھنڈر تک پہنچنے تک اس کی چیخیں بند ہو گئی تھیں۔ اب بھی دیکھ لیجئے سناٹا چھایا ہوا ہے۔"

ڈرائیور جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کا ساتھی بھی سب کچھ سن ہی رہا تھا۔ اس کے بھی چہرے پر معنی خیز علامات ابھریں۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں میں کچھ مسکوٹ کی۔ میں دفعتاً بولا:۔

بھائی صاحبو۔ مجھے تو اٹھا کے اپنی گاڑی ہی میں ڈال دو۔ مجھ سے خود اٹھا نہیں جا رہا ہے۔"

"تم آرام سے پڑے رہو۔ ہم تمھاری زرینہ کو لاتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو واقعی آپ لوگ رحمت کے فرشتے ہیں۔ تمام عمر پیر دھو دھو کر پیوں گا۔ مگر وہ مردود کا بچہ بڑا طاقت ور معلوم ہو رہا تھا۔ لوہے کا ڈنڈا بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا خبر چھرا بھی ہو۔"

"تم فکر مت کرو۔ اکیلا ہی تو تھا نا؟"

"بھائی صاحب اگر دو ہوتے تو دوسرا آنٹی کو بھی اٹھا کر لے جاتا۔ آپ نہیں جانتے یہ لفنگے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ میں نے کتنی بار مس زرینہ کو سمجھایا کہ گاڑی مت چلایا کرو۔ میں تو ایسے خطرناک کام پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کیا پتا کب گول گھیرا غلط گھوم جائے اور — آ — یا علی — یا ......"

بولتے کراہتے میں بالکل ہی دراز ہو گیا یعنی گردن ڈھیلی چھوڑ کر سر زمین پر ٹیک دیا۔ آنکھیں بھی بند

بند ہی کرلیں۔ یہ الگ بات ہے کہ باریک سی درز باقی رہنے دی ہو۔ میں گویا فرطِ نقاہت سے بیہوش ہو جانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"چلو یہ ڈپوٹ بھی اپنی آنٹی کے پاس گیا۔"

ڈرائیور نے استہزاء کے انداز میں اپنے ساتھی سے کہا" بالکل ہی عقل سے پیدل معلوم ہوتا ہے۔ آج پیارے اپنے ستارے شاندار ہیں۔ پکے پکائے پھل جھولی میں گر رہے ہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں اپنا ساگر ہی ہو۔ اسے آج اسی طرف سے نکل جانا تھا۔"

"چلو دیکھ ہی لیں گے۔"

وہ تیز قدموں سے پگڈنڈی کی طرف بڑھ گئے۔ میں سانس روکے ادھ کھلی آنکھوں سے انھیں دور ہوتے دیکھ رہا تھا۔ کھنڈر کے قریب پہنچکر وہ رُکے۔ شاید کچھ مشورہ کر رہے تھے پھر غالباً یہ طے کیا کہ ایک سامنے سے اور دوسرا عمارت کی پشت سے داخل ہو۔ چنانچہ ڈرائیور داہنی سمت چل کر عمارت کے موڑ پر غائب ہو گیا اور چند ہی منٹ بعد ایک سیٹی کی آواز بلند ہوئی جس کے فوراً بعد سامنے والا عمارت میں گھسا چلا گیا۔

اب میں اس طرح اچھلا جیسے زمین میں دفعتاً اسپرنگ پیدا ہو گیا ہو۔ مسز جمشید کو تو وہ لوگ خود ہی اپنی گاڑی میں ڈال کر میری راہ آسان کر گئے تھے۔ اُچھل کر اُس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے اور انجن کھولنے میں مشکل سے آدھا منٹ صرف ہوا۔ پھر آدھا منٹ پیچھے سرکا کر کھیت میں اُتارنے میں خرچ ہوا۔ دوسرے منٹ وہ رُخ موڑ کر میری مرحوم گاڑی کے آگے سڑک پر آگئی اور اسی وقت ڈرائیور کا ہیولیٰ کھنڈر کے برآمدے میں نظر آیا۔

جی تو چاہا کھڑکی سے گردن نکال کر کہوں ——"پیارے بھائی اسلام علیکم۔" مگر فاصلہ اتنا تھا کہ آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر بھی گردن نکالے بغیر منھ ہی منھ میں اتنا تو کہہ ہی دیا۔" اب اے شریف لوگو تم اپنے ستاروں کو شہد میں لگا کر چاٹو۔"

گاڑی تقریباً ایک فرلانگ آگے بڑھ چکی ہو گی جب ان دونوں کو میں نے بگٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھا وہ کھیتوں کو پھلانگتے میری ہی سمت دوڑ رہے تھے۔ زبان پر گالیاں بھی رہی ہوں گی لیکن اب میں بڑے اطمینان سے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم کے شعر گنگنا رہا تھا:۔

ریل ہوں برق ہوں چھلاوا ہوں
بلکہ میں ریل کا بھی باوا ہوں
گرد کو میری بادِ پا نہ لگے
لاکھ دوڑو مرا پتا نہ لگے

گاڑی پرانی سہی مگر تھی تندرست۔ کچے میں بھی تیس میل کی رفتار تو دے ہی گئی۔ چند ہی منٹ بعد کچا ٹکڑا ختم ہو گیا۔ اب تو رفتار کا کیا کہنا ایک فاتحِ اعظم کی طرح میں ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"ہائے —— ارے میں کہاں ہوں ——" اچانک پشت سے کپکپاتی ہوئی آواز آئی۔ میں نے جھپاکے سے مڑ کر دیکھا مسز جمشید لیٹے سے بیٹھے ہو گئی تھیں۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ زیادہ تفصیلی مطالعہ کا موقعہ نہ تھا سڑک ہی کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔

"آپ گاڑی میں ہیں اور گاڑی سڑک پر چل رہی ہے۔ بس چپکے لیٹ جائیے۔"

"نہیں —— ہائیں یہ کون سی گاڑی ہے —— ارے یہ —— یہ ——"

"بس محترمہ —— عنقریب ہم گھر پہنچنے ہی والے ہیں ——"

"مگر یہ میرے کپڑے —— روکو —— روکو گاڑی۔ مجھے بتاؤ یہ تم نے کیا کیا ہے ——"

"میں نے کیا کیا ہے —— کچھ دماغ خراب ہوا ہے"

ے آگ ہی تو لگ گئی۔

"پھر یہ سب — نہیں نہیں — کس کی گاڑی یہ ہے —"

"خدا کے لئے ملکہ معظمہ محترمہ چپ رہنا مانگتا۔ آپ کو نہیں معلوم کیا کچھ گذر گئی ہے۔ ہم موت سے آنکھ ملا کر آ رہے ہیں۔"

"بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ ہم سیٹھ عنایت کی گاڑی میں رجولی جا رہے تھے۔ اکدم تم نے مجھے کچھ سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔ اب وہ گاڑی بھی نہیں۔ میرے کپڑے بھی پھٹ رہے ہیں۔"

میری ایڑی سے ایسا شعلہ بلند ہوا کہ جیسے کسی نے آگ اگل دی ہو۔ یہ شعلہ کھوپڑی میں جا کر بگولے کی طرح ناچا اور سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر کانپنے لگے۔ شہراب سامنے ہی تھا لیکن اس ناہنجار عورت نے اگر سب کے سامنے یہی بکواس دہرا دی تو — تو —

کھٹکا یہ بھی تھا کہ وہ دونوں مردود کسی نہ کسی طرح ہماری والی گاڑی کو ٹھیک کر کے کہیں پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ آ پکڑا تو گئے دین دنیا سے۔

"مسز جمشید — کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے مجھ پر پتھر برسائے تھے۔ اسی اچھل کود میں آپ کے کپڑے پھٹے تھے اور پھر آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔"

"کہاں کی ہانک رہے ہو۔ میں تم پر پتھر کیوں برساتی۔ سچ سچ بتاؤ نہیں تو جیل میں سڑوا دوں گی۔"

"ارے کیا آپ کو یہ بھی یاد نہیں کہ —"

"دیکھو میاں ملا۔ یہ گدھے پن کی باتیں تو مجھ سے کرو نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ قصہ کیا ہے۔"

میری زبان سے آپ کے لئے ماں کا لفظ نکل گیا تھا آپ اس پر آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔"

"گاڈ — اوہ ہاں یاد آیا — ارے ہاں میں نے تمہیں دھکا دے دیا تھا۔ اس کے بعد — اسکے بعد"

وہ شاید دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپ تو بے ہوش ہو گئیں اور دو غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔ لمبی داستان ہے۔ پلیز۔ میں پھر عرض کروں گا۔"

عنایت منزل تک پہنچتے پہنچتے مجھے پسینہ آ گیا۔ ڈر یہ تھا کہ اگر اس پاگل عورت نے پہلی والی بکواس اگل دی تو کیا ہوگا۔ برآمدے میں زوبی نظر آئی۔ میں گاڑی سے کود کر اس تک پہنچا۔

"سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟" میری آواز کانپ رہی تھی۔ پیچھے پیچھے مسز جمشید بھی بڑھ آئیں۔

زوبی نے پہلے تو متحیرانہ انداز میں مجھے اور انھیں دیکھا پھر گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:۔

"یہ — یہ کس کی گاڑی ہے۔"

"لمبی کہانی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ سیٹھ اندر ہیں یا نہیں؟"

"وہ تو نہیں ہیں — آپ — ارے یہ کپڑے" زوبی مسز جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی

مسز جمشید دھپ سے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں پھر کھولتے کراہتے بولیں۔

"اسی شیطان سے پوچھو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے جلدی جلدی ساری کہانی زوبی کو سنا ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ناگوار تھی۔ جھلاہٹ تھی۔ آخر کار اس نے مسز جمشید کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے بیان کی تصدیق یا تکذیب چاہتی ہو۔ وہ منہ بسورتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اچانک بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتھر مارے ہوں گے کسی اور نے۔"

"مسز جمشید۔ ایمان نہ نگلئے۔ ابھی گاڑی میں آپ نے اعتراف کیا تھا کہ آپ نے مجھے دھکا دیا تھا۔"

"جھوٹ پر جھوٹ نہ بولو۔ میں کیوں دیتی دھکا۔

واہ جی واہ ——"

"یا رب المشرقین والمغربین —— اچھا میرا سیان سفید جھوٹ ہے۔ بتلایئے یہ گاڑی کہاں سے آگئی۔ ہماری گاڑی کہاں گئی ——"

"چھوڑو" زوبی اکتائے ہوئے لہجے میں بولی "بہتر یہ تھا کہ تم انھیں ان کے گھر ہی چھوڑ آتے۔ یہاں کیوں لئے چلے آئے۔"

"گرمیوں کا سرتاج جو ٹھیرا۔ اری خدا کی بندی مجھے کیا علم تھا کہ مسز جمشید اور سیٹھ صاحب اتنی جلدی یہاں سے چلے گئے ہوں گے۔ تمہاری گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"جہنم میں گئی گاڑی۔ چلئے آنٹی۔ میں آپ کے کپڑوں میں ٹانکے لگا دوں۔ یا پھر آپ میری ساڑھی پہن لیں۔ اور تو کوئی کپڑا شاید ہی آپ کے آئے۔"

"مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ چادر والا تھان بھی گیا۔ مٹھائی بھی غارت ہوئی۔ اب چادر بھی نہیں چڑھے گی۔" مسز جمشید کی یادداشت شاید واپس آرہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے آپ کو کچھ یاد تو آیا —— اب آگے یاد کیجئے ——"

"فضول بور مت کرو۔" زوبی نے بیزارانہ لہجے میں بات کاٹ دی "تم ہرگز وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ سچے ہو تو پولیس کو فون کرو۔ پولیس کے سوا کون ہماری گاڑی واپس لاسکے گا۔"

"میں ابھی کرتا ہوں —— مگر زوبی —— میری بہت ہی اچھی زوبی۔ مسز جمشید نے الٹا سیدھا بیان پولیس کو دیا تو کیا ہوگا۔ قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی میں نے جھوٹی کہانی بیان نہیں کی۔"

"آنٹی —— کیا واقعی آپ کو کچھ یاد نہیں؟" زوبی نے مسز جمشید کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"دراصل —— دراصل اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کاؤس کے ساتھ جاؤ گی ——"

"اے میری والدہ کی بھی والدہ۔ یہ بات تو آپ کو پہلے ہی معلوم تھی۔ یہیں اس کا تذکرہ جانے سے کچھ پہلے آیا تھا۔"

"ہاں آیا تھا۔ مگر میں نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ پھر تم نے مجھے اہمیت کا احساس دلایا ——"

"کیا کہا تھا انھوں نے ——" زوبی کرسی سے آدھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر جمے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"اب یاد نہیں پوری طرح۔ اس نے تمہارے حسن کا ذکر کرکے مجھے غیرت دلائی تھی۔"

"اے۔ اے آنٹی۔" میں بلبلایا "خدا سے ڈرو۔ یہ کیا بکواس ہے۔ ارے تم میرا بیڑا غرق کرکے رہو گی کیا۔"

"نہیں انھیں کہنے دو۔" زوبی بولی "پھر کیا ہوا؟"

"اس سے میں نے کہا تھا گاڑی لوٹاؤ۔ اس نے جھوٹ بولا کہ بریک خراب ہوگئے ہیں۔"

"آپ غلط بیانی کر رہی ہیں۔ بریک خراب ہونے کا عذر میں نے اس وقت پیش کیا تھا جب آپ نے اصرار فرمایا تھا کہ ملا دی گر بیٹھ گاڑی پر دور کو سیر کرنا مانگتا —— اور ہاں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم تمہاری گھوڑی پر سوار ہونا مانگتا۔"

"سور۔ جھوٹا۔ میں نے یہ کب کہا تھا۔"

"قسم کھا سکتی ہیں کہ اگلی سیٹ پر آنے کی فرمائش آپ نے نہیں کی تھی۔"

"وہ لونڈر کی وجہ سے کی تھی۔ خراب بریک کی گاڑی سے کون نہیں ڈرے گا۔"

اب محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بھٹیارا ہوں اور مسز جمشید بھٹیارن۔ وہ اپنا لنگ کا نگ لاا شائل بھول کر کھری بولی پر اتر آئی تھیں اور میں اندھا دھند

سمجھیاں کھا رہا تھا کہ یا اللہ کس غضب میں پھنس گیا۔ نیکی برباد گناہ لازم۔ جس سیاست سے اس جان کی لاگو عورت کو لوٹے پھوٹے بغیر بچالایا تھا مگر پھیری ہی ایسی پلیسمنٹ دے رہی ہے۔

"تم کیسے بدمعاش آدمی ہو" وہ بولتی رہی۔ "میں پولیس میں تمہاری شکایت پہنچاؤں گی۔"

"آنٹی۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" زوبی تڑخ کر بولی "یہ اگر بدمعاش ہوتے تو آپ کو والا نہ کہتے۔"

"ارے جھوٹ بول رہا ہے یہ لپاٹیا۔ ماں کون سی گالی ہے جو میں برا مانتی۔ آیا بڑا ننھا بچہ۔"

"اے آسمانوں کے مالک۔ تو نے نوح کی کشتی طوفان سے نکالی تھی۔ میرا بھی بیڑا غرق ہونے سے بچا۔" میں آسمان کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے غرغرایا۔

"جائیے آنٹی۔ آپ اندر جا کر ساری پہن لیجئے۔ منہ بھی دھو لیجئے گا۔" زوبی نے کہا۔

"فی الحال میں ہی دال فی صین ہوا جاتا ہوں۔" میں بولا "شام کو آؤں گا۔"

"کیسے جا سکتے ہو۔" زوبی نے جلدی سے کہا "یہ چوری کی گاڑی یہاں کھڑی ہے۔ وہ غنڈے آگئے یا پولیس آگئی تو پھر۔"

"میں اس نامراد کو بھی ساتھ ہی لئے جاتا ہوں نتیجہ کچھ بھی ہو۔"

"ارے ہاں۔ یہ زخم تو دھو ڈالو۔" اس نے میری پیشانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بے شک۔ اس حالت میں تو ٹریفک کانسٹبل تک میرا مزاج پوچھ ہی بیٹھے گا۔"

آخر کار مسز جمشید ایک کمرے میں سمائیں اور میں باتھ روم میں پہنچا۔ آئینے میں دیکھ دیکھ کر جما ہوا خون دھویا۔ داڑھی صاف کی۔ داڑھی بیچاری پر رحم آ رہا تھا کہ یہ بھی کیا کہتی ہوگی کس ناہنجار خدائی خوار کے چہرے پر آگئی ہوں۔ اتنے میں زوبی فرسٹ ایڈ کا بکس اٹھا لائی۔ بینڈیج کی ضرورت نہیں تھی بس مرہم کے پھائے سے کام چل گیا۔ وہ تو کہتی بھی رہی کہ لاؤ پٹی باندھ دوں مگر یہ فضول ہوتا۔ ہال کمرے میں پہنچ کر وہ بولی۔

"میں تم سے ایک خاص معاملہ میں بات کرنا چاہتی تھی مگر تم نے تو نیا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ اب یہ نہیں کہ تب ذہن یکسو ہو۔"

"کس قسم کا معاملہ؟"

"پھر کسی وقت کہوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ ویسے میرا خیال ہے گاڑی کو یہیں کھڑی رہنے دو۔ سیٹھ جب آئیں گے انھیں قصہ سنا دینا وہ انشاء اللہ سب ٹھیک کر لیں گے۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔"

مسز جمشید ابھی شاید میک اپ میں مصروف تھیں میں بھاگ ہی نکلا اور گھر تک پہنچتے پہنچتے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اے الٰہی اب اس روشن فکر اور مہذب طبقے سے دور ہی رہوں گا۔ تو نے توفیق دی تو شہر چھوڑ کر بن باس لے لوں گا۔ میرے پچھلے گناہ معاف کر اور آئندہ جو ہونے والے ہیں انھیں بھی پہلے ہی سے بخش دے۔ واہ رے میں۔

پہلا پتھر

مجموعۂ کلام جناب طاہر تلہری۔ صفحات ۱۴۴
قیمت مجلد۔ چھ روپے۔ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی غنیمت۔ شائع کردہ مکتبہ دین و ادب لکھنؤ۔

جن غیر مشہور شعراء کے مجموعے ہمارے پاس آتے رہے ہیں ان میں طاہر تلہری صاحب شاید سب سے اچھا کہتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلوب کی جدیت ملی مگر خوشگوار اور سلیقہ مندانہ۔ ان کے پرواز میں علمی تنوع جھلکتا ہے۔ ان کے شہباز تخیل کی اڑان خاصا بانکپن رکھتی ہے۔ وہ نو مشق نہیں معلوم ہوتے یہ الگ بات ہے کہ پختگی ذہن پختگی کے مراحل سے نہ گذری ہو۔ ان کے یہاں غزل بھی ہے نظم بھی اور رباعی و قطعہ بھی۔ غزلوں کے چند اچھے اشعار بطور نمونہ نقل ہیں:-

بہ گئی اشک ندامت سے گناہوں کی اساس
جیسے بارش میں اچانک گری دیوار چلے

ہر سو عذاب حشر کا منظر دکھائی دے
دنیا تمام عرصۂ محشر دکھائی دے
ذرے کو دیکھئے تو پہاڑوں سے بھی عظیم
قطرے میں جھانکئے تو سمندر دکھائی دے
طاہر مجھے ایسے زخم دیتے ہیں حیات نے
پھولوں کی سیج کانٹوں کا بستر دکھائی دے

دیکھنا چاہے اگر دنیا کا مستقبل تو شیخ
کانچ کا برتن کسی پتھر کے اوپر پھینک دے

صحرا پیاسے بستی پیاسی بستی کی پیاس بجھتی پیاسی
کس کس کا دکھ درد بٹائے کس کس کا غم کھائے دل

مٹھی میں بند ہے مری غیرت کی داستاں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ کچھ پا گیا ہوں میں

فرشتے تھا میں قسم جس کی پاکبازی کی
وہ تیرے شہر میں رسوا دکھائی دیتا ہے
(یہاں تبصرہ نگار کو مولانا مودودی یاد آگئے)

ہم نے طاہر جس نگری میں جاکر کی تبلیغ وفا کی
اس نگری کے سارے باسی دوڑ پڑے لے کر پتھر

جراحتیں ہوں مرے جسم کی کہ روح کا کرب
ہر اک عذاب ہے، احساس ہی سے وابستہ
نئی غزل کو سنواروں گا میں ہی اے طاہر
یہ کافرہ ہے مری زندگی سے وابستہ
(یہ شعر قدرے خود ستائی پر مبنی ہے اس لئے ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں لیکن اس میں لفظ "کافرہ" بہت خوبصورت اور برمحل ہے جس نے وجدان پر رس کی بوند سی ٹپکا دی)

یہ روح میں چبھتا ہوا احساس کا کانٹا
اک زہر میں ڈوبے ہوئے پیکاں کی طرح ہے
باریک سے آنچل میں ترا چاند سا مکھڑا
واللہ چراغ تہہ داماں کی طرح ہے
اس دور میں انسان کا ہر مسئلہ طاہر
پیچیدگی گیسوئے جاناں کی طرح ہے

میں کس طرف گیا تھا کسی کو خبر نہ تھی
میرا ہی نقش پا مجھے بدنام کر گیا

برکھا کی تیز دھوپ میں جلتی تھیں کھیتیاں
بادل سمندروں پہ برستا چلا گیا

شب کی تنہائی میں ماضی کی پرانی یادیں
تیر جاتی ہیں مری روح میں نشتر کی طرح

کیوں اتنا خوش ہے دور سے شعلوں کو دیکھ کر
یہ آگ میرے گھر میں نہیں تیرے گھر میں ہے

رازِ حیات و موت کا اظہار کر گیا
غنچہ چٹک کے پھول بنا اور بکھر گیا

دوستو بجھ نہ جائے شمع نفس — یہی شعلہ چراغ منزل ہے
ہائے ترکِ تعلقات کی بات — کتنی آساں ہے کتنی مشکل ہے

خرد در لیوزہ گر کوچہ بکوچہ — جنوں کی ٹھوکروں میں بادشاہی

ہائے کیا دیکھنے کی خواہش تھی — اور کیا دیکھنا پڑا مجھ کو
کتنی ہی مشکل زمینوں میں طاہر صاحب نے اچھے اشعار نکالے ہیں جس سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں بازاریت یا سطحیت یا جنسیت بھی نہیں۔ اسی لئے ذیل کے دو شعر ہمیں ان کے مجموعے میں ایسے لگے جیسے کبوتروں میں دو کوّے
ہائے یہ گورے جواں سال گلابی پیکر
سب ہی خوش رو ہیں کسے دل میں بسایا جائے

میں ایسا بدمعاش نہیں ہوں خدا گواہ
ملئے کبھی مجھ سے مجھ پہ بھروسا بھی کیجئے
صنعتِ شعری کے لحاظ سے ان میں کوئی شعر برا نہیں لیکن پہلے شعر سے جنسیت اُبل رہی ہے اور دوسرے شعر میں قاری کے ذہن کو لفظ بدمعاش نے ایک ناگفتہ گندگی کی طرف ملتفت کر دیا۔

لفظ بدمعاش ویسے بھی غزل کی نرم ونازک، شستہ
اور شریفانہ زبان کے لئے ناجنس ہے۔
دوستانہ خیرخواہی کے طور پر ہم بعض اور اشعار
پر بھی کچھ عرض کریں گے۔

میں ایک ڈوبتا سورج سہی مگر اب بھی
سیاہ رات کی دیوار پھاند جاؤں گا

اول تو مضمون گنجلک ہے۔ دوسرے سیاہ رات کو
دیوار سے تشبیہ دینا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ رات
ایک بے کنار پھیلاؤ کا تصور دیتی ہے جب کہ دیوار میں
نہ پھیلاؤ ہے نہ بیکرانی۔ علاوہ ازیں سورج کی جانی
پہچانی رفتار سے "پھاندنا" مناسبت نہیں رکھتا
اگر ہم غروب شمس کا بیان ان لفظوں میں کر دیں کہ
"سورج افق کی دوسری سمت کود گیا۔" تو یہ تفنن
ہوگا شاعری نہیں۔

میں ایک حباب ہوں پانی کا سطح دریا پر
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا

یہاں "میں" کا مصداق مبہم ہے۔ صاف نہیں
ہوتا کہ کون کس حالت میں کس سے مخاطب ہے۔

بھاری پگڑی دے کے پایا ہے خدا کا شکر کر
گھر کے دروازے پہ کس کا نام لکھا ہے نہ سوچ

اس طرح کے اشعار "غزل" میں مندرج نہیں ہونے
چاہئیں۔

کس کس کا رنج کیجئے کس کس کو روئیے
کیا کیا نہ آفتاب اندھیروں میں کھو گئے

پہلا مصرعہ متوارد ہے۔ بچپن سے سنتے آئے ہیں
کس کس کا رنج کھائیے کس کس کو روئیے
اپنے ہی غم میں لطف ہے منہ ڈھک کے سوئیے

اسی صفحہ پہ یہ شعر ہے:۔

کیا کہئے کیسے کیسے حقیقت شناس لوگ
ہاتھوں کی آڑی ترچھی لکیروں میں کھو گئے

اس سے پتا چلتا ہے کہ ہاتھوں کی لکیروں سے مستقبل
کا حال معلوم کرنا طاہر صاحب کے نزدیک حقیقت
پسندی نہیں بلکہ ایک طرح کا دھوکا اور فریب خوردگی
ہے مگر اگلے ہی صفحے پر یہ شعر ملتا ہے:۔

ریگِ ساحل ہیں مگر پیاس بجھانے نہ بنے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹائے نہ بنے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک ہاتھوں
کی لکیریں واقعی نوشتۂ تقدیر ہیں۔ اس تضادِ خیال
کو آمنے سامنے نمایاں نہ ہونا چاہئے تھا۔

ایسا ڈھلا ہے سانچے میں اُس کا سڈول جسم
سایہ بھی ہو تو قد کے برابر دکھائی دے

مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلا مصرعہ محبوب
کے بدن کا حسین تر تناسب بیان کر رہا ہے مگر سائے
کے سائز کا اعضائے جسم کی موزونیت سے کیا تعلق۔
اس کا مدار تو جسم اور روشنی کے زاویوں پر ہے پھر
سائے کا قد کے برابر دکھائی دینا کیا کوئی دلیل حسن ہے؟
ایک سے زائد شعروں میں "رنگ وروپ"
پڑھنا پڑا۔ واؤ زائد ہے۔ محاورۃً "رنگ روپ"
درست ہوگا۔

آج کا دن بھی یوں ہی گذرا آج بھی آس کا ڈوبا چاند

"آس کا ڈوبا چاند" میں ناگوار تعقید ہے۔
"آج بھی ڈوبا آس کا چاند" کہہ دیتے تو تعقید نہ ہوتی
اور قافیہ بھی قائم رہتا۔

پھینکتے کب ہیں سنگ حسد سے کبھی کسی شیش محل پر پتھر

"کسی" کی یا اس قدر دب گئی ہے کہ وجدان
کر کرا گیا۔ یہ عیب ہے جس سے پرہیز کی ضرورت ہے۔

جسم کے بستر کے اوپر پیدا ہوا بچہ اس کا پدر کا
اور بچے کے بدلے میں اتنی کھیلتے ہیں کنکر پتھر

اس شعر کا مفہوم صرف وہی لوگ سمجھ پائیں گے
جن کے مطالعہ سے وہ حدیث رسول گذری ہو جس کا
یہ ترجمہ ہے۔ آج کے اردو خوانوں میں ایسے لوگ
شاید دس فی صدی بھی دستیاب نہ ہوں۔ اگر کوئی

حیران ہی رہ جائیں گے کہ یہ کیا کہا ہے کیوں کہا ہے۔
کچھ لفظی دروبست بھی جما ہوا نہیں ہے۔
شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے سیکڑوں اشعار احادیث و آیات کا ہو بہو خلاصہ یا ترجمہ ہیں لیکن سبحان اللہ روانی، شگفتگی اور قادر الکلامی کے سرمایہ دار۔ اس بحر کا حسن یہ ہے کہ ہر مصرعہ دو برابر کے ٹکڑوں پر مشتمل ہو جیسے ہم اچھے شعروں میں اسی غزل کا مقطع نقل کر آئے ہیں۔

ہم نے طاہر جس نگری میں ـــ جا کر کی تبلیغ وفا کی

دونوں برابر کے ٹکڑے۔ لیکن مذکورہ شعر میں یہ بات نہیں۔

جس کے بستر کے اوپر پے ـــ دا ہو بچہ اسکا ہوگا
اور بچے کے بدلے میں زا ـــ نی کیلئے ہیں کنکر پتھر

گویا ہر مصرعہ میں ایک لفظ کے دو پارے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر یوں کہہ لیتے تو شاید بہتر ہوتا۔

جس کے بستر پر ہو بچہ باپ اسے مانا جائیگا
سرورِ عالم نے فرمایا زانی کو ہیں کنکر پتھر

اس میں کسی لفظ کی تنصیف بھی نہیں کرنی پڑی اور ہر پڑھنے والے کو معلوم ہو گیا کہ یہ کسی حدیث کا مفہوم ہے۔

تم نے جو مجھ کو دیا ہے لیلو میرا ماضی مجھے واپس کر دو

"واپس دیدو" کہتے تو مطلع نسبتاً بہتر ہو جاتا۔

اٹھا تھا غلغلۂ صبح سن کے میں بھی مگر
ستارے بکھرے تھے اور دور تک اندھیرا تھا

دوسرا مصرعہ سست بھی ہے اور کمزور بھی۔ کیا حرج تھا اگر یوں کر لیتے۔

نظر اٹھائی تو کچھ اور بھی اندھیرا تھا

سلا کے قتل کر نیکے بعد بہت دیر روتا رہا آفتاب

پتا نہیں "آفتاب" سے کیا مراد ہے اور آفتاب کا قتل کرنا کس عمل کی تعبیر ہے۔

اس طرح سے ہے یاد اس کی دل میں جاگزیں تنہا
بتکدے میں ہو جیسے کوئی نازنین تنہا

یہ شعر مشاعرے میں دھوم مچانے والا ہے مگر تین تجزیہ میں کچھ نہیں رہتا "بت" شاعری کی زبان میں حسینہ کو کہتے ہیں۔ اگر دل کو بتکدے سے تشبیہ دی گئی تو وجہ شبہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہاں بہت سی حسیناؤں کی خیالی شبیہیں موجود ہیں۔ پھر محبوب کی یاد تنہا کہاں رہی۔

بتی بجھی ہوئی ہے اندھیرا نگر میں ہے
میں گھر میں قید ہوں مرا سایہ سفر میں ہے

ہماری تو سمجھ میں آیا نہیں مطلب۔

میں غزل گا کے سنانے پہ کمر بستہ ہوں
آج اسے یوں بھی ستانے پہ کمر بستہ ہوں

عجیب شعر ہے۔ آخر کیا بات ہوئی۔

اس کی دوشیزگی کو کیا کہئے
جیسے اک بے پڑھی کتاب کا رنگ

ردیف یہاں دھواں دھواں ہو گئی۔ "رنگ" اگر حقیقی معنی میں لیا جائے تو بات کچھ نہیں بنتی۔ کتاب کا جو رنگ ہے وہی رہے گا خواہ پڑھو یا نہ پڑھو۔ اور اگر مجازاً حالت و کیفیت کے معنی میں لیا جائے تب بھی ابہام کا غبار صاف نہیں ہوتا۔

بری ہی سہی بادہ نوشی مگر بقدرِ ضرورت بڑی چیز ہے

بڑی چیز کیوں اور کیسے ہے اس کا کوئی ثبوت شعر میں موجود نہیں۔ "بقدرِ ضرورت" نے یہ امکان بھی ختم کر دیا کہ "بادہ" کو استعارہ سمجھ لیا جائے۔ بحالتِ موجودہ تو وہ وہی اُمّ الخبائث ہے جسے دو کوڑی کے لوگ بھی چند پیسے خرچ کر کے پی لیتے ہیں ایسے فضول شعروں سے بچنا چاہئے۔

یوں بڑا باد ماغ ہے طاہر لیکن اپنے ہنر میں کامل ہے

یہ شعر اگر کہنا ضروری تھا تو اس وقت کہنا تھا جب محترم شاعر واقعی کمالِ ہنر کے سمائے بلند پر پہنچ جاتے۔ فی الحال ایسا سمجھنا خوش فہمی ہے اور

خطرناک بھی!

یہ کیفِ بہار اور یہ بدمست گھٹائیں
ایسے میں کوئی ساقیِ میخانہ پلا پھول

دوسرے مصرعہ کی تعقید وجدان کو بدمزا کرنے والی ہے۔ پھر پھول کوئی سیّال شے تو نہیں کہ پینے پلانے کا سوال پیدا ہو۔

غزلوں کے بعد نظمیں اور رباعیات وقطعات ہیں۔ ان کے بعد ایک صفحہ پر متفرق اشعار ہیں۔ اس میں ایک شعر کتنا عمدہ ہے۔

چھین لیں مجھ سے اُجالوں نے تری یادیں بھی
اس سے بہتر تھا کہ دنیا میں اندھیرا ہوتا

ایک اور شعر۔

دنیا سے تو ہزار طرح کی امید تھی
جب صرف غم ملا تو ہنسی آگئی مجھے

دوسرا مصرعہ کس قدر پیارا ہے۔ برجستہ، تیکھا اور رواں۔ جیسے سانچے میں ڈھل کر نکلا ہو مگر پہلا مصرعہ اس پائے کا نہیں۔ شاید یوں زیادہ بہتر ہوتا۔

دنیا سے باندھ لی تھیں ہزاروں توقعات

اور تغزل کا عنصر شامل کرنے کے لئے یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔

تھیں اُنکی بارگاہ سے کیا کیا توقعات

بہرحال دوسرا مصرعہ دس غزلوں پر بھاری ہے۔

دل تو بڑی نازک شئے ہے جلکر راکھ نہ کیوں ہو جائے
چٹانیں بھی جب ٹوٹی ہیں تو ان سے بھی نکلی آگ

دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو زیادہ رواں اور فصیح ہوتا۔

چٹانیں بھی جب ٹوٹی ہیں ان سے بھی نکلی ہے آگ

ویسے معنوی اعتبار سے شعر قابلِ نظر ہے۔

حصۂ نظم قابلِ ذکر نہیں۔ بعض رباعیاں اور قطعات اچھے ہیں۔ بطور حاصل یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس شعری مجموعے نے ادب کو کچھ دیا ہے اور اہلِ ذوق اس سے لطف اٹھا سکیں گے۔ (ع۔ ح)

شعورِ حیات

مجموعۂ کلام جناب متین بدایونی۔ ایم۔ اے۔ صفحات ۷۶۔ کاغذ رف۔ لکھائی چھپائی گھٹیا۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔ شائع کردہ، سنسار پبلشنگ ہاؤس۔ لولین۔ بمبئی ۲۷۔

اچھے شعر کم ہی میسر آتے ہیں۔ اگر شاعر کو کوئی اچھا مشیر مل گیا ہوتا تو ابھی یہ مجموعۂ کلام نہ چھپتا یا چھپتا تو بہت چھان پھٹک کے بعد اور اچھی طباعت وکتابت کے ساتھ۔

ان کا اندازِ بیان سادہ اور ہلکا پھلکا ہے۔ تخیل بلند نہیں مگر شکر ہے کہ پست بھی نہیں۔ طرزِ اظہار اور خیالات دونوں میں قدامت کا رنگ اتنا ہے کہ پچاس سال پہلے بھی یہ مجموعہ چھپ سکتا تھا۔ خدا کرے اسے کچھ پڑھنے والے نصیب ہو جائیں گو توقع تو نہیں کہ یہ دعا مقبول ہوگی۔ خدا کارساز ہے۔ (ع۔ ع)

WHO IS A MUSLIM?

ایک مومن کون ہے؟

از:- جی غوث انصاری صاحب۔ صفحات ۱۷۔ قیمت تین روپیہ۔

شائع کردہ:- بی غوث انصاری صاحب۔ سردار منزل ۳-۹-۱۶ ملک پیٹ۔ حیدرآباد ۳۶

غوث انصاری صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں قرآن مجید کی آیات کا وہ انتخاب مختلف اخلاقی زاویوں سے پیش کیا ہے جو اللہ کی نظر میں ایک صحیح مومن کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ پیش لفظ کے اس ایک

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف اور مترجم قرآن مجید سے کس قدر متأثر ہیں اور کس جذبہ کے ساتھ انھوں نے اس کتاب کو تحریر کیا ہوگا۔

"قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ دلکشی اور جاذبیت ترجمہ میں پہنچکر یکسر گم ہوکر رہ جاتی ہے۔"

لیکن قرآن کا صوتی حسن ترجمہ میں منتقل نہ ہو سکنے پر اس کے معنوی حسن وجمال کی تر واشش ایک مومن کے قلب وقلم کے ذریعہ ترجمہ سے بھی بہر حال ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے مؤلف اور مترجم انصاری صاحب نے دو مقاصد کے تحت انگریزی میں مومن کی یہ قرآنی تصویر دکھائی ہے۔ ایک مقصد یہ ہے کہ مومن خود اپنی حقیقی تصویر کو پا سکے ـــــ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر مومن آج کے نام نہاد مسلمانوں کو دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھا سکے کہ مومن ایسا ہی ہوتا ہے!

مومنانہ زندگی کی اداؤں کو اڑتیس مختلف زاویوں سے مختلف خصوصیات کے زیر عنوان دکھایا گیا ہے جن میں کچھ کا تعلق مومن کے قلب ونظر سے ہے اور کچھ کا تعلق مومن کے کردار وعمل سے ہے۔

جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے ترجمہ کے حسن کو حقیقت کا آئینہ دار بنانے میں کافی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ ان اعتبارات سے تو یہ کوشش لائقِ ستائش ہے اور قابلِ قدر ہے لیکن دو ایک ایسی باتیں بھی ضرور ملیں جن سے ہلکی سی کھٹک پیدا ہوئے بغیر نہ رہی ـــــ ایک تو کتاب کی طباعت کی صحت وتصحیح میں غفلت جس کے نتیجے میں ایک ایک صفحہ پر بعض جگہ تین تین غلطیاں نظر آئیں (مثلاً صفحہ ۵ پر چھٹے پیراگراف میں TO زائد ــ پیراگراف ۵ میں WHOSOEVER کے بجائے WHOMSOIE اور پیراگراف ۷ میں OVERCOME کے بعد OVER) اور محض ۷۱ صفحات کی مختصر کتاب کی قیمت مفصل حکل ہیں تین روپے! کاش مترجم موصوف آئندہ ایڈیشن کے وقت ان دو خلشوں کو بھی دور کر سکیں۔

(شمس نوید)

اشرفی بہشتی زیور عکسی بہشتی زیور مختلف اداروں نے چھاپا ہے لیکن حواشی اور کتابت وطباعت وغیرہ کے اعتبار سے اشرفی بہشتی زیور ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہ آپ ہم سے طلب کر سکتے ہیں۔ مکمل کی قیمت چالیس روپے۔ دو جلدوں میں مکمل مجلد ـــــ اڑتالیس روپے۔ ۴۸/-

مذاہب اور سائنس فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر علمی نقطۂ نظر سے بحث اور فلسفہ وسائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات۔ مجلد بارہ روپے۔

الانتباہات المفیدہ مولانا اشرف علی رحمہ کے خامۂ زرنگار سے بعض ایسے شبہات و اعتراضات کے جوابات جو نئے دور کی پیداوار ہیں۔ قیمت ـــــ تین روپے۔

تاریخ اسلام کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے بہت بعد تک کی یہ مفصل اور دلچسپ اور مستند تاریخ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کا وہ مقبول کارنامہ ہے جس نے ان کے نام کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔ ہنگاموں سے لبریز بے شمار سالوں کی یہ طویل داستان صرف داستان نہیں بلکہ گنجینۂ عبرت بھی ہے۔ ہم مسلمان ہوکر بھی یہ نہ جانیں کہ ہمارا ماضی کیا رہا ہے تو محرومی کی بات ہے۔ عمدہ کتابت وطباعت اور اچھے کاغذ پر یہ شاندار کتاب تین جلدوں میں چھاپی گئی ہے۔ مکمل ومجلد ساٹھ روپے

عالمِ عربی کا المیہ قرآنِ حکیم کے مطالعے اور قانونِ فطرت کی روشنی میں تحلیل وتجزیہ جائزہ اور محاسبہ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے گوہر بار قلم سے۔ قیمت ـــــ چار روپے۔

رویتِ ہلال کا مسئلہ پچاس سے زیادہ کتب جن میں اصولِ حدیث، شرح و تفسیر، فقہ واصولِ فقہ اور فتاویٰ کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ۔ قیمت ـــــ چار روپے۔

بنیادی قرآنی تعلیم بچوں سے لیکر بڑوں تک اور عورتوں کے لئے بھی نہایت مفید کتاب۔ قرآنی تعلیم زینہ بزینہ۔ ہر مسلمان گھر کیلئے تحفہ۔ قیمت ـــــ پانچ روپے۔ ۵/-

ادب و ثقافت

ایک منزل کئی قافلے حج کا ایک پُرسوز، دلچسپ اور ایمان افروز سفرنامہ یعقوب سروش کے قلم سے۔ قیمت ـــــ ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

کینسر وارڈ ایک روسی ناول اُردو لباس میں۔ اس کے مصنف الیگزنڈر لینسٹن کو نوبل پرائز دیا گیا۔ قیمت تین روپے۔ ۳/- حصہ دوم ـــــ چار روپے۔

پتھر کے دیوتا چھ عبرت انگیز آپ بیتیاں۔ غیر ملکی ادب کا شاہکار۔ ترجمہ سلیس۔ ایک روپیہ۔

چین کا بدلتا سماج دو بالغ نظر مصنفین کی تصنیف کردہ اس کتاب کو اُردو لباس پہنا کر مترجمین نے ایک قابلِ مطالعہ ذخیرۂ معلومات مہیا کردیا ہے۔ قیمت ـــــ صرف ایک روپیہ۔ ۱/-

آج کا چین اس کتاب کے مترجم روزنامہ الجمعیۃ کے مدیر شہیر جناب عثمان فارقلیط ہیں لہٰذا قلم کی شگفتگی اور زبان کی چاشنی سے اس کا ہر ورق معمور ملے گا۔ قیمت ـــــ ایک روپیہ۔ ۱/-

ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں نام ہی سے مضامین کی غیر معمولی نوعیت اور کشش کا اندازہ کر لیجئے۔ ایک روپیہ۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

صحت کا توازن...
جاڑوں میں ماءاللحم خاص کا استعمال
قوت و توانائی بخشتا ہے۔ اس کے صحت بخش
اجزا آپ کے رگ و پٹھوں میں سرایت
ہو کر نئی جان ڈالتے اور چستی پیدا کرتے ہیں۔
ماءاللحم خاص
غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانک

سرور و خوشی چاہنے والوں کے لیے
لحمینہ
مردوں اور عورتوں کے لیے ایک نئی قوت
جو کمزوری اور اس کے اسباب و علاج پر برسہا برس کی
تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ ہے
لحمینہ
جسمانی قوتوں کی بیداری کے لیے

LAHMINA
LAHMINA

APRIL
ماہنامہ
تجلّی
دیوبند
ایڈیٹر: عامر عثمانی
اکی راہ میں خرچ کرنا
خرچ کرنا نہیں بلکہ جمع کرنا ہے
تاریکیوں میں ایک چراغ
2/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ماہنامہ
تجلی
دیوبند
امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس
انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ
بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔ بحرین۔ افریقہ
سعودی عرب۔ قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک
ایک پونڈ دس شلنگ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ
ایڈیٹر۔ عامر عثمانی
پچیسویں سال کا
گیارہواں شمارہ
سالانہ بیس روپے
فی کاپی
دو روپے
فہرست
اسلامی پریس۔ دیوبند

تصحیح الاغلاط

(۱) پچھلے شمارے میں صفحہ ۶۷ پر طاہر تلہری کے شعر میں بادل کی جگہ دل چھپ گیا (تم کھائے بادل — صحیح ہے)

(۲) تجلی فروری ۵۸ء صفحہ ۵۱ کالم ۱ پر ابوطالب پر رضی اللہ عنہ کی علامت رقم چھپ گئی ہے وہ غلط ہے۔ ابوطالب اسلام نہیں لائے تھے۔ لہٰذا رضی اللہ عنہ نہیں لکھا جائے گا۔

(۳) ایک دینار ہندوستانی اوزان کے اعتبار سے چار ماشہ چار رتی کا ہوتا ہے۔ کبھی ڈاک سے دیئے ہوئے جوابات میں اگر ہم نے کسی کو اس سے مختلف وزن لکھ دیا ہے تو اسے حسابی غلطی تصور کیا جائے۔ اگر مثلاً دس دینار مہر کی رقم میں شامل ہیں تو ان کا سونا ۳ تولہ ۹ ماشہ بنے گا (گویا پونے چار تولہ) اور اسی کی رائج الوقت قیمت یا پھر اتنا ہی سونا ادا کرنا ہوگا۔ بعض کتب فقہ میں دینار کا وزن کچھ اور لکھا ہوا ہے وہ درست نہیں۔ اس پر انشاء اللہ ہم جلد ایک مضمون لکھنے والے ہیں تاکہ سونے چاندی کے نصاب زکوٰۃ کے تعین میں جو غلطی ہمارے بعض متاخر علماء سے ہو گئی ہے اس کی اصلاح ہو۔

(۴) جناب نسیم کرہانی کی "صبح فاراں" کے تبصرے میں لفظ "قتّال" پر کچھ بحث کی گئی تھی۔ پھر یہ بحث دسمبر ۵۴ء کے تجلی میں بھی تازہ ہوئی اس کے سلسلہ میں مدرستہ الاصلاح (سرائے میر) کے ایک ذی علم مہربان نے ہمیں ہمارے علمی قصور پر متنبہ کیا تھا۔ اس پر ہم نے انھیں خط لکھا مگر اس کا جواب ہمیں نہ مل سکا۔ بہرحال بطور حاصل ہمیں یہ اعتراف ہے کہ قتّال بطور مبالغہ عربی میں مستعمل ہے جس کے نظائر فاضل موصوف نے پیش کئے ہیں۔ اپنے افلاس علمی اور قلتِ مطالعہ کا اقرار ہمیں پہلے بھی تھا، آج بھی ہے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور ان تمام اہل علم کو جزائے خیر دے جو ازراہِ کرم رہنمائی کی زحمت اٹھاتے ہیں۔

اس شمارے میں قارئین بہت سے اوراق میلے رنگ کے پائیں گے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ادارہ نے ازراہِ کفایت یہ گھٹیا کاغذ استعمال کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ انھیں یہ سنکر حیرت ہوگی کہ اس کی بھی وہی قیمت ادا کی گئی ہے جو تجلی میں معمولاً استعمال ہونے والے کاغذ کی ادا کی جاتی ہے۔

صورت یہ ہے کہ سرکاری کوٹے میں دو قسم کے کاغذ ہمیں دیئے گئے اور ریٹ میں فرق نہیں کیا گیا اب یہ کاغذ بھی بہرحال استعمال ہونا ہے۔ نہ استعمال کریں تو کریں کیا۔ ویسے انشاء اللہ یہ دو تین شماروں میں کھپ جائے گا اور زیادہ دن یہ ہیئت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔

قیمت کا مسئلہ

پچھلے ماہ ہم نے قارئین سے مشورہ لیا تھا کہ پرچے کی قیمت بڑھائیں یا صفحات گھٹائیں۔ خیال تھا کہ کثرت رائے کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ لیکن کثرت وقلت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اب تک جتنے بھی خط آئے ہیں وہ کلی طور پر اس خواہش کے مظہر ہیں کہ صفحات ہرگز نہ کم کئے جائیں۔ قیمت کا اضافہ مناسب ہوگا۔ ہمارے قلم میں طاقت نہیں جو اللہ کے اس فضل وکرم کا حق تشکر ادا کر سکے کہ ہزاروں مسلمان بھائیوں کے قلوب میں اس نے تجلی کی ایسی محبت ڈالدی ہے

اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ وسط رجب میں اچانک انتقال کر گئے۔

جن کو بے پایاں اور انمول کہہ سکتے ہیں۔ نہ جانے کتنے ایسے خاندان ہیں جن میں تجلی پڑھنے کا آغاز دادے نے کیا تھا اور اب پوتے پڑھ رہے ہیں۔ ایسے بھی حضرات خاصی تعداد میں ہیں جنھوں نے نومبر ۴۹ء میں تجلی کا پہلا شمارہ خریدا تھا اور تادم تحریر ان کا رشتہ اس سے جڑا ہوا ہے تعریف صرف اللہ جل شانہ کے لئے ہے۔ تجلی کا ایڈیٹر ایک ادنیٰ طالب علم اور گنہگار بندۂ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مولا کی شان ہے کہ اس کی باتوں میں اس نے کشش رکھ دی اور ہزاروں بندوں کے دلوں میں حسن ظن ودیعت فرما دیا۔ کیا بعید ہے کہ اس حسن ظن ہی کی بدولت رؤف و رحیم خدا اس ناکارہ کے عیوب اور کمزوریوں سے چشم پوشی فرما کر بخشش عطا فرما دے۔ وھو الغفور الودود ذوالعرش المجید فعال لما یرید۔

بہرحال اگلے شمارے سے سالانہ چندہ ۲۴ روپے ہوگا اور فی پرچہ ڈھائی روپے۔

کہانی نمبر

ہزاروں بھائیوں کو جس شدت سے اس نمبر کا انتظار ہے اس کا ہمیں احساس ہے۔ تاخیر کی وجہ صرف یہی نہیں کہ مُلّا کو قوالی باز صوفیوں نے برباد کر کے رکھ دیا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس نمبر کے لئے جتنے کاغذ کی ضرورت تھی اس کا حصول ذرا جھگڑے میں پڑا ہوا تھا۔ الحمدللہ اب یہ گتھی سلجھ گئی ہے اور توقع ہے کہ اگلے سے اگلے ماہ یہ نمبر پیش ہو جائے۔ ویسے تجلی کے مستقل اور دائمی کاتب فضا صاحب ناسازش ہیں۔ قارئین ان کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

اگلے شمارے میں

(۱) مولانا مودودی کی کتاب "سیرت" کے کچھ اوراق آپ تجلی میں پڑھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ پرچے میں اس کا باب اول آ رہا ہے۔ اس کے بعد ترتیب ہی سے سلسلہ چلے گا۔

(۲) "مسجد سے میخانے تک" میں ملّا ابن العرب مکی اس بار دنیا کو موجودہ صدی کے ایک نئے مجدد سے روشناس کرا رہا ہے۔ عنوان ہے

"موجودہ صدی کے دو مجدد

(۱) اعلیٰ حضرت احمد رضا خانصاحب بریلوی۔

(۲) دالاحضرت گنبد قضا خانصاحب رکھیلوی"

دونوں بزرگوں کی ایمان افروز کرامتوں کا بغداد بریلوی دوستوں کے لئے خاص الخاص تحفہ۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ جھوٹا ثابت کرنے والے کو دو ہزار انعام۔ سچا ثابت کرنے والے کو ڈھائی ہزار انعام

مولانا مودودی کو سزائے موت!

ہمارے بے شمار بھائیوں کو نہیں معلوم ہوگا کہ پاکستان کے جابروں نے مولانا مودودی کو سزائے موت کا فیصلہ بھی سنا دیا تھا اور پھر دنیائے اسلام کے زبردست احتجاج پر اسے چودہ سال بامشقت میں تبدیل کیا تھا۔ یہ بدنصیب جابرہ پیوند خاک ہو چکے اور اللہ کے فضل و کرم سے مودودی آج بھی زندہ ہے۔

بہرحال یہ بھیانک سزا جس کتابچے پر دی گئی تھی اس کا نام تھا "قادیانی مسئلہ" ——— اور یہ کتابچہ آپ آنے والے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

آغازِ سخن

دوسرا نمونہ یہ ہے کہ نزولِ عیسیٰ کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان کے سہارے مرزا غلام احمد صاحب نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا لیکن ان احادیث میں جو دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا یا ان کی ایسی رکیک تاویلیں کیں کہ عقل و علم انھیں کسی طرح قبول نہیں کر سکتے۔

ہمارے سامنے جو کتابچہ ہے اس میں سادہ لوح مصنف نے بار بار اپنی قابلیت اور حق پسندی کی مدح و ثنا فرماتے ہوئے غیر ضروری موشگافیاں تو بہت کی ہیں لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ احادیث میں نازل ہونے والے مسیح موعود کی جو واضح خصوصیات اور تفصیلات آئی ہیں ان کو مرزا غلام احمد پر چسپاں کرنے کی آخر کیا صورت ہے۔

مثلاً ان احادیث میں تقریباً التزام کے ساتھ عیسیٰ ابن مریم کے الفاظ آئے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ قرآن و حدیث کی زبان میں یہ اس متعین شخصیت کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صدیوں قبل منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئی تھی۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی باپ نہیں تھا بلکہ اللہ نے اس کی ماں مریم بنت عمران کے بطن میں اپنی طرف سے فرشتے کے ذریعہ روح پھونکی تھی اور کسی مرد کے نطفے کے بغیر اس کی ولادت ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب حضرت عیسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو ابن مریم کے وصفِ خاص کی یاد دہانی فوراً کرا دیتا ہے۔ ایک دو جگہ نہیں قرآن میں غالباً پندرہ جگہ اللہ نے یہ یاد دہانی کرائی ہے۔ حالانکہ اور کسی بھی پیغمبر کے تذکرے میں ایک بار بھی اس کی ابنیت کا ذکر نہیں کیا۔ پورا قرآن ہر شخص کے سامنے ہے اس میں بیسیوں انبیاء کا نام بہ نام ذکر ہے۔ ایک جگہ بھی نہیں دکھلایا جا سکتا کہ کسی نبی کا تذکرہ فلاں ابن فلاں کہہ کر کیا گیا ہو۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ بات چار دو چار کی طرح صاف ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی عیسیٰ ابن مریم کے الفاظ زبانِ مبارک سے ادا کریں گے ان کا واحد اور قطعی مصداق وہی ہستی ہو گی جسے اصطلاحاً عیسیٰ مسیح بھی کہا جاتا ہے اور ابن مریم بھی۔ لہٰذا کثیر احادیث میں جب آپ نے خبر دی کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ ابن مریم کا نزول ہو گا تو جس شخص کو احادیث پر اعتماد ہو اسے لازماً یہ بھی ماننا ہو گا کہ کنائے اور استعارے اور تاویل اور مجاز وغیرہ کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ قادیانی ان احادیث کو مانتے تو اسلئے ہیں کہ ان ہی کی آڑ میں مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرنے کی بنیاد ہاتھ آئی۔ مگر مانتے بس اپنے مطلب کی حد تک ہیں اور ان میں وارد شدہ تمام تفصیلات کو لایعنی اور مضحکہ خیز قسم کی تاویلات کی آڑ لے کر جھٹلاتے ہیں۔ مثلاً مرزا صاحب کا یہ ارشاد ہم پہلے بھی نقل کر چکے۔

> "اللہ تعالیٰ نے براہین احمدیہ کے تیسرے حصہ میں میرا نام مریم رکھا پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے دو برس تک صفتِ مریمیت میں میں نے پرورش پائی ...... پھر .... مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے

کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں بذریعہ اس
الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصہ
چہارم میں درج ہے۔ مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا
پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھیرا"
(کشتیٔ نوح صفحہ ۸۰ تا ۸۹)

اہلِ عقل انصاف فرمائیں کہ خود کو عیسیٰ ابن مریم کا مصداق بنانے کی یہ مرزائی کوشش معقولیت اور متانت کے کس خانے میں فٹ ہو سکتی ہے۔

سڑکوں کے دوا فروش اور بازیگر اس طرح کے چٹکلے ہنسنے ہنسانے کے لئے چھوڑتے ہیں مگر یہ چٹکلہ ان پر بھی سبقت لے گیا۔ سخت حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی خرافات پر بھی بہت سے لوگ ایمان لے آئے لیکن یہ حیرت دور ہو جاتی ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ شیطان تو وہ فنکار ہے کہ اس کی مکاریوں اور حیلہ بازیوں سے بے شمار لوگ اور بھی کتنی ہی احمقانہ بیہودگیوں اور لغویتوں پر ریجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً قبروں پر سجدہ ریزی۔ بے جان چیزوں کی پوجا۔ بندے کو خدا کا بیٹا ماننا۔ خدا کے وجود ہی سے انکار کر گذرنا۔ وغیر ذلک۔

کتابچہ نویس نے اِدھر اُدھر کی باتیں بہت بنائی ہیں مگر یہ نہیں بتایا کہ ان کے مرزا غلام احمد ابن مریم کیسے ہو گئے حدیثوں کے تنہا یہی الفاظ اس بات کا اٹل ثبوت ہیں کہ عقل سلیم کی تباہی اور دل کے بگاڑ کے بغیر کوئی بھی مسلمان یہ نہیں مان سکتا کہ مرزا غلام احمد کا مسیح موعود ہونا ممکن ہے۔

مگر بات ان ہی الفاظ تک محدود نہیں۔ حدیث میں بار بار یہ بھی آیا ہے کہ مسیح موعود جب نازل ہوں گے تو وہ مروجہ عیسائیت کا بالکلیہ تیا پانچا کر دیں گے۔ نصرانیت کے اس طبعزاد عقیدے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں گے کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں (ان احادیث کے لئے ملاحظہ ہو بخاری کتاب الانبیاء۔ مسلم باب نزول عیسیٰ۔ ترمذی ابواب الفتن مسند احمد بن حنبل مرویات ابوہریرۃ رضؓ)

بتایا جائے کہ کیا مرزا اس کام سے فارغ ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے؟ ہر باخبر جانتا ہے کہ انگریزوں کی مدد اور حمایت تو مرزا کی زندگی کا وہ مشن تھا جس کے لئے بقول خود انھوں نے الماریوں کی الماریاں کتابوں سے بھر دیں اور دنیا کے سامنے ہے کہ عیسائیت کو وہ شکست تو کیا دیتے عیسائیت پر ایمان رکھنے والی انگریز حکومت کی حق الحق مدد حمایت اور قصیدہ گری کرتے رہے — اگر معدودے چند واقعات قادیانی حضرات ایسے پیش بھی کریں کہ مرزا صاحب نے اپنے علم کلام سے کسی نصرانی عقیدے کا رد کیا تھا یا کچھ عیسائی ان کی تبلیغ سے مسلمان بن گئے تھے تو ظاہر ہے کہ اس بات کا حدیث کی اطلاع سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ افراد کا عیسائیت سے اسلام میں آتے رہنا تو برابر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آج بھی جب کہ مرزا موجود نہیں یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ لیکن کیا مرزا غلام احمد کے ہاتھوں نصرانیت مرٹ چکی اور ابن اللہ کا عقیدہ پارہ پارہ ہو چکا؟

تاویلات کی بازیگری کوئی کتنی ہی دکھلائے مگر حدیثوں میں مسیح موعود کے جس آفاقی کارنامے کا ذکر ہے اس کا تو تصور اور وہم وگمان بھی مرزا کی شخصیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

مزید دیکھئے محولہ بالا احادیث میں نیز دیگر متعدد احادیث میں یہ آیا ہے کہ مسیح موعود کے عظیم کارنامے کے نتیجے میں جنگ وجزیہ ختم ہو جائے گا اور مال و دولت کی کثرت ہوگی کہ اسے قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ کیا قادیانیت کے دام فریب میں گرفتار ہونے والے بتائیں گے کہ اس خصوصیت کو وہ مرزا صاحب کی ذات سے کیسے جوڑتے ہیں؟

حدیثوں کی رو سے حضرت عیسیٰ یعنی مسیح موعود دجال کو قتل کریں گے — عقلِ کل حضرات منکشف فرمائیں کہ کیا ان کے مرزا آنجہانی یہ کارنامہ انجام دے چکے یا اس کی فرصت پائے بغیر دنیا سے چل بسے؟ دجال تو بڑی چیز ہے۔ اگر مرزا صاحب نے کسی بے ضرر بچے کو بھی قتل فرمایا ہو تو مطلع کیا جائے۔

حدیثوں میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ

" مسیح ابن مریم دمشق کے مشرقی حصے میں سفید
مینار کے قریب زرد رنگ کے دو کپڑے زیب تن
کئے ہوئے اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے

اتر رہے ہوئے اتریں گے"۔

نیز یہ کہ

"دجال کو وہ لُدّ کے دروازے پر پکڑیں گے
اور قتل کریں گے"

لُدّ موجودہ اسرائیل کی راجدھانی سے کچھ ہی میل پر ہے۔

یہ اور اس طرح کی متعدد حدیثی تفصیلات کی جو قادیانی تاویلات ہماری نظر سے گزری ہیں وہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کوئی ہوشمند انھیں قابل ذکر بھی سمجھے۔ اگر یہ ہمارے مطالعہ کی خامی ہو اور کوئی قادیانی صاحب معقول توجیہات پیش فرمانے کی پوزیشن میں ہوں تو ضرور فرمائیں۔ میدان اور گھوڑا دونوں حاضر ہیں۔

مزید نکتوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم اخبار بدر کے مدیر سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہفت روزہ بدر قادیان سے نکلتا ہے۔ خدا جانے کیوں ادارۂ بدر کچھ عرصے سے برابر اپنا پرچہ ہمیں بھیج رہا ہے۔ اس کے سرسری مطالعے سے اور مدیر بدر کے خط سے بھی پتا چلا کہ یہ موصوف تجلی کو زیر مطالعہ رکھتے ہیں۔ اب تو وہ باقاعدہ خریدار بھی بن گئے ہیں۔ ۱۲ فروری ۷۶ء میں انھوں نے اداریہ لکھا:-

"ماہنامہ تجلی دیوبند کا بڑا بول"

ہم اس لاحاصل اداریہ پر مفصل نقد کر کے صفحات سیاہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس میں سوائے لفظی اسراف کے کچھ نہیں ہے۔ البتہ مدیر موصوف سے خیر خواہی کے طور پر کچھ مختصراً عرض کریں گے۔

آپ نے فرمایا:-

" اسی نوّے برس سے یہ علماء حضرات جماعت احمدیہ اور اس کے بانی پر کفر کے فتوے دے دیکر انھیں دائرۂ اسلام سے خارج بتانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے مگر احمدی مسلمان کے مسلمان

ہی رہے۔ اس لئے کہ عقیدے کا معاملہ خالصۃً دل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے"۔

فاضل دوست! یہ بچوں جیسی بات ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ایک شخص بلا وضو نماز پڑھے اور مفتی اس پر یوں کہے کہ تیری نماز نہیں ہوئی تو یہ شخص جواب دے کہ تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے نماز تو ہو ہی گئی۔ میرا عقیدہ ہے کہ بلا وضو نماز ہو جاتی ہے اور عقیدے کا تعلق دل سے ہے۔ لہٰذا تم جھوٹے میں سچا۔

اور اے مدیر مکرم! مسلمان ہونا نہ ہونا کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو سینگ کی طرح ماتھے پر اُگ آتی ہو۔ نہ وہ ایسی صفت ہے کہ محض زبان سے چند الفاظ ادا کر دینا اس کے لئے کافی شافی سمجھا جائے۔ عیسائی اپنے آپ کو شدومد سے عیسائی کہتے ہیں لیکن ہم سب مسلمانوں کا دعویٰ اور ایمان ہے کہ وہ حقیقتۃً دین عیسوی کے پیرو نہیں ہیں۔ قرآن میں اللہ وضاحت کرتا ہے کہ مسیح بن مریم عیسیٰؑ نے خالص توحید کی دعوت دی۔ ان باطل عقائد کی نہیں دی جنھیں عیسائیوں نے دل سے گھڑ کر دین عیسوی کا جزو لازم بنا لیا ہے۔ آنجناب نے جو منطق استعمال فرمائی اس کی رو سے تو عیسائی سچے ہوئے اور ہم سب مسلمان جھوٹے۔ اور نعوذ باللہ ہمارا قرآن بھی جھوٹا۔ آنجناب کا یہ کہنا کہ احمدی مسلمان مسلمان ہی رہے ایسا ہی ہے جیسے یوں کہا جائے کہ مسلمانوں کے فتویٰ کفر کے باوجود عیسائی عیسائی ہی رہے۔ یا بے وضو پڑھی ہوئی نماز نماز ہی رہی چاہے مفتی کچھ بھی فتویٰ دیتا رہے۔

آگے آپ نے لکھا۔

"کسی شخص کو اختیار نہیں کہ دوسرے کے عقیدے کے بارے میں اپنی ہی مرضی کا فیصلہ دے"۔

یہ جملہ بھی بے عقلوں ہی کے لکھنے کا تھا۔ اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ علماء نے آپ کے جس عقیدے کو کفر کی بنیاد بنایا ہے وہ عقیدہ آپ کا ہے ہی نہیں تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ آپ تو ڈنکے کی چوٹ مرزا غلام احمد کو نبی اور مسیح موعود کہتے ہیں۔ یہی آپکی جماعت کا سنگ بنیاد ہے۔ یہی وہ باطل عقیدہ ہے جو ختم نبوت

کے قطعی اور اٹل عقیدے کی ضد ہے۔ اس عقیدہ منکرہ کا حاملین پر جو فتویٰ علماء نے دیا وہ اپنی مرضی اور خانہ زاد رائے کے تحت نہیں دیا بلکہ وہ صرف قرآن وحدیث کے ناقل ہیں۔ یہ فتویٰ اور فیصلہ تو اللہ اور اس کا رسولؐ صادر کر چکا ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور محمدؐ کی خاتمیت پر ایمان لانا اسلام کے وہ بنیادی اصول ہیں جن کو پوری طرح تسلیم کئے بغیر کوئی آدمی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ لوگ اسی لئے بار بار یہ اعلان فرمائے جاتے ہیں کہ ہم خاتمیت کے منکر نہیں لیکن اسی کے ساتھ آپ آجکل کے ایک نبی پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ کم وبیش ایسا ہی ہے جیسے شکارپور میں ایک صاحب سڑک کی نالی پر بیٹھے پیشاب کر رہے تھے۔ باہر کے دو آدمی قریب سے گزرے اور ان میں کا ایک دوسرے سے کہنے لگا۔

"سنا تھا یہاں احمق بستے ہیں"!

پیشاب کرنے والے صاحب یہ سنتے ہی تیزی سے اٹھے اور جلدی سے بولے ——"نہیں صاحب پہلے بستے تھے، اب نہیں بستے۔"

حالانکہ یہ ارشاد فرماتے ہوئے وہ بھول ہی گئے کہ ان کا پاجامہ قدموں میں اٹکا ہے!۔

تو آپ سوچئے کہ رسول اللہؐ کے ختم نبوت کا عقیدہ اور مرزا غلام احمد کو بھی نبی ماننے کا تخیل ایک ہی وقت میں اگر جمع ہوسکے تو دنیا کی ساری ڈکشنریوں سے تضاد اور تناقض کے الفاظ نکال دینے پڑیں گے۔ نہیں اور ہاں کو ایک ماننا پڑے گا۔ دہریت اور اسلام میں یکسانیت تسلیم کرنی ہوگی۔

اور اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو چاہے عقیدہ رکھیں کسی اور کو کیا حق ہے کہ ہمارے بارے میں فیصلہ دے تو یہ بھی کسی عقل والے کے کہنے کی بات نہیں۔ قرآن نے نہ صرف یہ کہ دوسروں کے عقائد پر کھل کر فیصلے دیئے ہیں بلکہ متعدد کفار کے نام بھی ثبت دوام کر دیئے ہیں۔ اسلام تبلیغی مذہب ہے تبلیغ کہتے ہی اس کو ہیں کہ صحیح عقائد کی اشاعت اور غلط عقائد کی تردید کی جائے۔ آپ حضرات کا حال یہ ہے کہ دعویٰ مسلمان ہونے کا کرتے ہیں مگر عقیدہ علانیہ طور پر خلافِ اسلام رکھتے ہیں یعنی مرزا کو نبی اور مسیح موعود مانتے ہیں۔ اسلام کسی کی بھی جاگیر نہیں۔ اسلام کا تفصیلی علم جنھیں ہو انھیں علماء کہا جاتا ہے اور علماء کے سوا بھلا کس کو حق ہو سکتا ہے کہ اسلام اور کفر کی حدبندی کرے۔ وضاحت فرمائے اور مخلوق خدا کو صراط مستقیم دکھلائے۔ حق تو در اصل آپ کو نہیں ہے کہ خود کو مسلمان کہیں۔ آپ یہ دھاندلی اختیار نہ کرتے تو علماء بھی آپکی طرف سے زیادہ فکرمند نہ ہوتے۔ سیکڑوں اور گمراہ فرقے موجود ہیں، ایک آپ بھی سہی۔ لیکن آپ نے ظلم یہ کیا کہ اسلام سے بنیادی انحراف کے باوجود اپنے مسلمان ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے اور برابر پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بایں ظلم وجسارت آپ الٹا علماء کو الزام دیتے ہیں کہ انھوں نے ناحق آپ کے خلاف فتویٰ صادر کیا۔ گویا قرآن وحدیث تو آپ کی جاگیر تھے کہ ان سے جس طرح چاہیں کھیلیں اور علماء کا فرض تھا کہ منہ میں قفل ڈالے بیٹھے رہیں۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے یقیناً ایسے ہی وقت کے لئے وضع ہوا ہے

آگے آپ نے لکھا:-

"مذہب اور عقیدے کے بارے میں ہر شخص
اپنے طور پر آزاد ہے کسی کو حق حاصل نہیں
کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی دوسرا اسکے
عقیدے یا مذہب کا فیصلہ کرتا پھرے۔"

عقل کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑنے کا محاورہ آپ نے سنا ہوگا۔ یہ بہت ہی بھولے بھالے محترم! کیا اللہ اور رسولؐ نے کفار عرب کے کفر پر نکیر وتحدید کرنے سے پہلے ان سے ان کی مرضی دریافت کر لی تھی۔ کیا حضرت موسیٰ نے فرعون سے پوچھا تھا کہ تیری مرضی کیا ہے میں تجھے کافر کہوں یا نہ کہوں؟

آپ بھول رہے ہیں جس اصول کو آپ نے دنیا بھر کا "مسلّم" اصول قرار دیا ہے وہ یہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص کو عقیدے اور مذہب کی آزادی حاصل ہے"۔ اس میں اور آپ کے بیان کردہ اصول میں بڑا فرق ہے۔ تلوار تو آپ پر علماء بھی نہیں اٹھا رہے ہیں کہ

کیوں کہ تم مرزا کو مسیح موعود مانتے ہو۔ انھوں نے کبھی ارادہ نہیں کیا کہ قادیانیوں کو ڈنڈے کے زور سے تبدیلیٔ عقائد پر مجبور کریں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ تم چاہے کچھ عقیدہ رکھو چاہے دس نئے پیغمبر گھڑ لو۔ چاہے قرآن و حدیث کے کچھ بھی معنی نکالتے جاؤ مگر دنیا کو یہ فریب مت دو کہ ہم مسلمان ہیں — مسلمان وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی نبی کی بعثت ممکن نہ سمجھے اور قرآن و حدیث سے بیہودگی نہ کرے۔ دنیا میں کب کس نے یہ اصول بنایا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ دوسرے کسی شخص یا گروہ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا مجاز نہیں۔ قرآن اور حدیث میں اس کے سوا کیا ہے کہ بعض عقائد کی تحسین اور بعض کی تردید کی گئی ہے۔ آنجناب بھی اس شخص کے غیر مسلم قرار دینے میں تامل نہیں کریں گے جو خدا کے وجود کا منکر ہو۔ تو کیا آپ کا یہ فعل جرم ہوگا اور اس پر یہ کہا جائے گا کہ آپ کو دوسروں کے عقیدے اور مذہب کے بارے میں فیصلہ دینے کا کیا حق ہے۔ ہاں یہ آپ نے صحیح لکھا

"اسلام ہی وہ پیارا مذہب ہے جس نے ہر شخص کو مذہب و عقیدے کی پوری پوری آزادی دیئے جانے کا برملا طور پر اعلان کیا ہے"۔

مگر آپ بھول گئے کہ اسلام ہی وہ پیارا مذہب ہے جو بت پرستوں کو کافر اور خدا کے منکروں کو ملحد اور ختم نبوت کے باغیوں کو زندیق قرار دیتا ہے۔ یہ بحث ہم یہاں نہیں اٹھائیں گے کہ مسلمانوں کو ہرگز یہ آزادی اسلام نے نہیں دی کہ جو چاہے عقیدہ رکھو۔ مسلمان عقائد کفر اختیار کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ یہ آزادی کہ جو چاہے عقیدہ رکھو ان لوگوں کے لئے ہے جو مسلمان نہیں ہیں۔

بہر حال اسلام کی دی ہوئی آزادی کو علماء سلب نہیں کرتے بلکہ دنیا بھر کے معروف و مسلم اصول کے تحت وہ آپ کے اختیار کردہ عقائد کے بارے میں اسی طرح اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں جس طرح اللہ اور رسولؐ نے فرعون، ابوجہل، ابولہب اور دیگر اہل کفر کے بارے میں ظاہر کی ہے۔ یہ آپ سے کس دیوانے نے کہہ دیا کہ اسلام نے علماء اسلام کے ہونٹوں پر مہریں لگا دی ہیں کہ خبردار تم کوئی اظہار خیال نہ کرنا خواہ امت مسلمہ کے کچھ افراد کیسا ہی نامعقول عقیدہ گھڑتے اور شائع کرتے رہیں۔ تم گمراہ کرنے والوں کی نشاندہی مت کرنا۔ تم فریب کاروں کا فریب مت کھولنا۔

آپ نے ایک سے زائد بار یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ عام صاحب ہندوستان میں احمدیت کی مقبولیت سے شدید طور پر خائف ہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ خوف سے آخر آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر یہ لفظ اس مفہوم میں بولا گیا ہے جو اردو لفظ "ڈر" سے سمجھ میں آتا ہے تو بالکل بے معنی ہے کیونکہ ہماری خیریت میں کیا فرق آسکتا ہے۔ اگر ملک میں قادیانیوں کی گنتی سو سے بڑھ کر ہزار اور ہزار سے بڑھ کر لاکھ دس لاکھ ہو جائے۔ ہمیں جانی یا مالی کوئی بھی نقصان قادیانیت کے فروغ سے نہیں۔ پھر خوف کیا معنی؟ اور اگر اس مفہوم میں بولا گیا ہے جس کے لئے اندیشہ، تشویش اور فکر جیسے الفاظ مستعمل ہیں تو بے شک غلط نہیں ہے۔ جو بھی دین آدمی کو پسند ہوگا وہ چاہے گا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے اختیار کریں اور باطل ادیان مٹ جائیں۔ قرآنی بیان کے مطابق حضورؐ کو لوگوں کے کفر کا اس قدر غم تھا کہ گویا فرط غم سے ہلاک ہو جائیں گے ان کے غلام کی حیثیت سے ہمیں بھی غم اور فکر ہے کہ قادیانیت کی باطل آئیڈیالوجی فروغ نہ پائے اور ایک بھی مسلمان قادیانیت قبول کر کے مسلمانوں کی تعداد کم کرنے کا باعث نہ بنے۔ اللہ نے ہمیں ایک قلم اور ایک جریدہ دیا ہے۔ اسلام کا تھوڑا سا علم دیا ہے۔ اس لئے ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل سے غافل نہ ہوں۔ اسی فریضہ کا احساس ہے جسے آپ "بڑا بول" قرار دے رہے ہیں۔

آپ نے اس خوش فہمی کا اظہار فرمایا

"احمدیت چونکہ سر تا سر صداقت اور حق و صداقت میں مقبولیت اور اثر و نفوذ کی زبردست قوت ہوتی ہے اسلئے باوجود شدید قسم کی مخالفت کے

احمدیت کی قبولیت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ دیگر علماء کی طرح عامر عثمانی صاحب جماعت احمدیہ کی مقبولیت سے اندر ہی اندر مرعوب ہیں"

ہم سمجھتے ہیں اگر کسی عقیدے اور مشن کا وسعت پذیر ہونا ہی اس کے برحق ہونے کی دلیل ہو تو کمیونزم تو احمدیت وقادیانیت سے لاکھوں گنا بڑھ کر برحق ہونا چاہئے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ خدا کے انکار اور مادیت کی پرستش کا یہ فکر و عقیدہ روز بروز کتنا پھیلتا چلا گیا اور آج کتنے کروڑ انسان اسکی زلف کے اسیر ہیں۔ کئی کئی ممالک اسی کو دین مملکت بنائے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بہتیرے باطل وفاسد نظریات کا روز افزوں ترقی کرنا روز کا مشاہدہ ہے۔ قبر پرستی پر نظر ڈال لیجئے۔ قبروں کے کسی بھی میلے میں آپ کو پچھلے سال سے زیادہ مجمع نظر آئے گا۔ عملی برائیوں کا بھی یہی حال ہے ہر طرف اضافہ ہی اضافہ۔ تو کیا یہ سب "حق و صداقت" کے جلوے ہیں! کاش آپ نے حقیقت پسندانہ فکر و نظر سے کام لیا ہوتا۔ انبیاء جب بھی آئے ہیں مخلوق کو سراپا حق و صداقت ہی کی دعوت دیتے آئے ہیں۔ لیکن معلوم ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی ہی قوم کی جفاؤں اور نافرمانیوں کا شکار رہے۔ انکی دعوتِ حق باطل کے شور و شر میں گم ہو گئی اور ان میں سے کتنوں ہی کو اہل باطل نے قتل کر ڈالا۔ اس سے اس کے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ کسی نظریے اور دعوت کا پھیلنا نہ پھیلنا اس کے برحق ہونے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ احمدیت کو اول تو اتنا زیادہ فروغ نہیں ہوا جتنا آپ تاثر دے رہے ہیں لیکن ہوا بھی ہو تو اس سے اس کی حقانیت کا ثبوت مہیا نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کچھ زیادہ ہی کامیابیاں حاصل کرتا چلا گیا ہے۔

اپنے اداریہ میں اور جو گل افشانیاں آپ نے کی ہیں انھیں نظرانداز کر کے آخر میں ہم صرف ایک گل افشانی پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے عامر عثمانی کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

" وہ جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کردہ زبردست دلائل اور علم کلام کے لاجواب اثرات سے بھی کم خائف نہیں ہیں"

ہم عرض کریں گے کہ عامر عثمانی کو جو فکر و تشویش ہے وہ عام برادران اسلام کی کم علمی اور کم فہمی کی بناء پر ہے۔ وہ اتنی بصیرت نہیں رکھتے کہ قادیانی پروپیگنڈے اور علم کلام کی خامیوں کا پورا ادراک کر سکیں۔ ورنہ جہاں تک قادیانی علم کلام اور دلائل کی مضبوطی کا تعلق ہے عامر عثمانی اس کے دیدار سے آجتک محروم ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ہم جناب سے گزارش کریں گے کہ آئیے ایک مرتبہ نئے سرے سے افہام و تفہیم کر لی جائے۔ افہام و تفہیم کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم جو کچھ اعتراض کریں اسے نظرانداز کر کے آپ دوسرا راگ الاپتے چلے جائیں۔ بحث کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نمبروار ایک ایک آئیٹم کو لیا جائے اور منفی و مثبت دونوں پہلوؤں سے گفتگو کر کے آگے بڑھا جائے۔ آپ تجلی کی مختلف بحثوں پر نظر ڈالیں۔ ہم صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے موقف کے ایجابی دلائل پیش کریں بلکہ فریق ثانی اپنے موقف کے جو دلائل پیش کر رہا ہے اس کا بھی علمی رد کرتے ہیں اور کوئی ایسا نکتہ نظرانداز نہیں کرتے جس سے ہمارے موقف پر غبار آتا ہو۔ آپ حضرات کا طریقہ اس کے مختلف ہے۔ مثلاً "قادیانیت کے جیب و گریباں" کا عنوان دے کر ہم آپ کے بعض دلائل پر نقد کر رہے ہیں۔ آپ کی طرف سے دو آیات اپنے موقف کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ ہم نے علمی و تحقیقی دلائل کے ساتھ واضح کیا کہ آپ نے ان آیات کا غلط مفہوم لیا عقلی و نقلی کسی بھی اعتبار سے یہ مفہوم نہیں نکلتا اور آپ نے ان سے جو بھی استدلال کیا ہے معقولیت سے بعید ہے۔ اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ یا تو ہمارے اس علمی نقد کا معقول جواب لائیں ورنہ تسلیم کر لیں کہ نقد درست ہے اور آئندہ کبھی ان آیات سے حجت نہ پکڑیں۔ مگر آپ لوگ نہ یہ کرتے ہیں نہ وہ بلکہ اپنی ہانکے چلے جاتے ہیں اور جب جی چاہے پھر ان ہی آیات سے نرالی مفہوم نکالنا شروع کر دیتے ہیں جن کی فیصلہ کن تردید ہو چکی۔

دیکھئے آپ کے پاس بدر ہے اور ہمارے پاس تجلی۔ اگر

واقعی آپ کا خیال ہے کہ قادیانیت کی جھولی میں معقول و مؤثر دلائل کا کچھ سرمایہ موجود ہے تو آیئے ہم نئے سرے سے ایک ایک آئیٹم پر گفتگو کرلیں۔ آپ ہماری تحریر بعد میں نقل کریں اور ہم آپ کی تحریریں تجلی میں نقل کرتے جائیں گے۔

سب سے پہلا آئیٹم ہم یہ رکھتے ہیں کہ مسیح موعود کی آمد والی جن حدیثوں کے بل پر آپ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود تسلیم کئے بیٹھے ہیں ان میں صاف صاف عیسیٰ ابن مریم کے نزول کا ذکر ہے۔ ان کی دیگر خصوصیات پر گفتگو بعد میں ہوگی سب سے پہلے اسی نام کے تعلق سے افہام و تفہیم کو کسی آخری فیصلے تک پہنچایا جائے۔ کسی اور شوشے سے خلط مبحث نہ ہو اور غیر متعلق شقیں درمیان میں نہ لائی جائیں۔ اگر آپ نے قابل فہم دلائل سے واضح کردیا کہ قادیان کے مرزا غلام احمد ہی کو چودہ سو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ ابن مریم کہا تھا تو ہم آپ کی بات تسلیم کرکے دوسرا آئیٹم لیں گے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے خلاف الزام قتل کے دس دلائل موجود ہوں تو محض ایک دلیل کے رد ہوجانے سے بقیہ نو دلیلوں کا رد نہیں ہوجاتا بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک بھی دلیل قابل قبول باقی نہ رہے ورنہ جرم ثابت مانا جائے گا۔ اسی طرح قادیانیت کے خلاف جتنے دلائل ہمارے پاس موجود ہیں ان سب ہی کو نمبر وار غلط ثابت کرنا آپ کا فرض ہوگا۔ اور اگر آپ اس پہلے آئیٹم ہی کی معقول توجیہ و تشریح نہ کرسکے تو دوسری موشگافیاں قطعاً بیکار ہوں گی۔ بہت شور سنا کرتے تھے کہ قادیانیوں کا علم کلام ایسا ہے اور ویسا ہے۔ جب تجسس کیا اور زحمت مطالعہ اٹھائی تو پتا چلا کہ یہ شور لیس پروپیگنڈے کے قبیل سے تھا۔ حقیقت اس کی کچھ بھی نہیں ہے۔

بدعت وشرک

اس وقت ہمارے سامنے ایک ۲۹ صفحات کا کتابچہ ہے جس کا نام ہے:-

"مصلحان قوم اور مسلمانوں سے کچھ صاف صاف باتیں"

یہ دراصل مولانا ابوالحسن علی ندوی کے پمفلٹ "ملتِ اسلامیہ ہند سے کچھ صاف صاف باتیں" کے رد میں لکھا گیا ہے۔ اس کے مصنف ہیں کوئی صاحب محمد مصطفیٰ کمال الدین صاحب یتقی اشرفی جنھیں انجمن اہل سنت وجماعت کے صدر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ ضلع کریم نگر سے چھاپا گیا ہے اور اس کے مختصر تعارف میں بطور تحسین وتائید جو سطور کتابچے میں لکھی گئی ہیں اس کے لکھنے والے بھی اسی انجمن کے سابق صدر ہیں ان بزرگ نے اپنے نام کے آگے بی۔ اے لکھ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیا کہ ان کی وہ عمر عزیز جو تعلیم کی عمر کہلاتی ہے علم دین سیکھنے کے بجائے انگریزی اسکول اور کالج میں گذری ہے لیکن کتابچے کے فاضل مصنف کے نام نامی کے ساتھ آگے پیچھے کوئی ایسا وصفی لفظ نہیں نظر آیا جس سے اندازہ ہوسکے کہ وہ عالم دین ہیں یا عالم دنیا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ عالم دین بہرحال نہ ہوں گے کیونکہ اگر کسی دینی درسگاہ سے سند فراغت حاصل کی ہوتی تو رواجاً اس کا تذکرہ کسی نہ کسی اصطلاحی لفظ سے نام کے ساتھ ضرور آجاتا اور کتابچے کے مندرجات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان گرامی قدر حضرات میں ہیں جو علوم دینیہ میں شاگردی اور عرق ریزی کی زحمت اٹھائے بغیر استاد اور مرشد بن بیٹھتے ہیں۔

"اہل سنت والجماعت" کا اسم مبارک کبھی ماضی بعید میں بڑا رفیع اور وزنی تھا۔ اس نام سے ان عالی مقام ہستیوں کی طرف اشارہ ہوا کرتا تھا جنھوں نے اپنی عمریں علوم دینیہ کی تحصیل میں لگاکر قرآن وسنت سے اصول وعقائد کا استنباط کیا اور عامۃ المسلمین کو معارف دین کے لعل وجواہر دیئے۔ لیکن اب ایک مدت سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ یہ نام اکثر وبیشتر ان لوگوں کی میراث بن گیا ہے جنھیں قرآن وسنت سے کوئی بنیادی دلچسپی نہیں اور علوم دینیہ کی تحصیل جن کے نزدیک کارعبث ہے۔ بس دلچسپی ہے تو قبروں سے۔ تعلق ہے تو بدعتی مشاغل سے۔ عشق ہے تو طریقت وتصوف کے

مبہم وژولیدہ افکار سے رابطہ ہے تو فلاں شاہ صاحب اور فلاں قطب الاولیاء اور فلاں شیخ و مرشد سے اور وابستگی ہے تو ایسے علم کلام سے جس میں نہ آیات ہیں نہ احادیث بلکہ ملفوظات اولیاء ہیں، مکشوفات مشائخ ہیں، نکاتِ تصوف ہیں اور ہر وہ چیز ہے جس کی بنیاد دورِ رسالت، دورِ صحابہ و تابعین اور افکار ائمہ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے کسی نام یا انجمن کے ساتھ "اہل سنت والجماعت" کا لاحقہ دیکھ کر آج آپ بلا تکلف یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ مائل جہل اور کج فکری کے مکروہ چہرے کا ایک حسین نقاب ہے جیسے زہر کی گولیوں پر چاندی کے ورق کی طرح چڑھایا گیا ہے

مولانا علی میاں ندوی کی ذات والاصفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ہند و پاک ہی میں نہیں دنیائے عرب میں بھی الاستاذ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور ان کی گوناگوں صلاحیتوں سے لاکھوں اشخاص متأثر ہیں۔ ان کی مدح کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ لیکن عیب سے پاک ذات تو باری تعالیٰ ہی کی ہے اور عصمت انبیاء پر ختم ہو چکی۔ ہم انصاف نہیں کریں گے اگر یہ کہیں کہ پیش نظر کتابچے کے مصنف مصطفیٰ کمال الدین صاحب نے مولانا موصوف پر جو گرفت کی ہے وہ بے تکی اور لایعنی ہے۔ گرفت یہ ہے کہ ایک طرف تو مولانا موصوف مسلمانوں کے مشرکانہ افکار و اعمال کا ماتم کرتے ہیں۔ قبوری ہنگاموں پر شرک و بدعت کا الزام لگاتے ہیں اور دوسری طرف وہ ان کتابوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتے جن میں خود ان کے بزرگوں اور ان کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں سے ٹھیک ٹھیک ان ہی خیالات و افکار کا اظہار ہو رہا ہے جن پر موصوف معترض اور ماتم کناں ہیں۔

مثلاً مولانا موصوف کے کتابچے سے کمال الدین صاحب نے ایک لمبا اقتباس پیش کیا جو قبوری شریعت کے برگ و بار پر احتجاج اور نکیر سے لبریز ہے۔ پھر "اکابرین کا نذرانہ" نامی کتاب سے کچھ ایسے ٹکڑے نقل کئے جن میں وہی سب کچھ ہے جس پر مولانا موصوف شارحہ نکیر کر رہے ہیں۔ مثلاً

"مفتی صاحب کی نسبت باطنی نہایت قوی اور نہایت ہی زود اثر تھی جس پر ذرا توجہ فرماتے اس کی حالت بدل جاتی .... اب بھی ارباب باطن مزار مبارک سے اس ذوق و حلاوت کو محسوس کرتے ہیں" (اکابرین کا نذرانہ ص ۹۴)

اسی کتاب میں مولوی الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغی کا یہ ارشاد گرامی موجود ہے۔

"اس قبرستان کے بزرگ اب بھی مخلوق خدا کی وہ خدمت انجام دے رہے ہیں جو زندہ بزرگوں سے نہیں ہو رہی ہے"

(اکابرین کا نذرانہ ص ۱۱۲)

نیز — "مفتی صاحب کی قبر کے پاس ایک شخص جس کی بینائی جاتی رہی ان کے وسیلہ سے دعا مانگی اس کی بینائی واپس آگئی جس پر وہ انکی قبر کو پختہ بنایا، پھر اس کو ڈھاکر درمیان کا حصہ خام اور اطراف پختہ ہے"

(اکابرین کا نذرانہ ص ۱۱۲)

ان اقتباسات کو پیش کر کے کمال الدین صاحب بجا طور پر احتجاج کرتے ہیں کہ عرسوں اور قبوری میلوں وغیرہ پر شرک جلی و خفی کا طعن کرنے والے مولانا علی میاں آخر اپنے بزرگوں کے ان نوادرات پر خاموش و مطمئن کیوں ہیں ان سب میں انھیں توحید کے جلوے کیسے نظر آجاتے ہیں ان کے خلاف ان کی زبان اعتراض کیوں نہیں کھلتی۔

یہ ہم نے اپنے الفاظ میں کمال الدین صاحب کی گرفت کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم "اکابرین کا نذرانہ" کس کی کتاب ہے۔ لیکن مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں بطور تحسین ذکر ہونا واضح کرتا ہے کہ یہ ہمارے ہی حلقے اور مکتب فکر کے اسلاف کا تعارف کراتی ہے اور بعید از قیاس ہے کہ مولانا علی میاں اس سے بے خبر ہوں۔

دراصل خود مولانا علی میاں تصوف و طریقت سے قریبی عملی تعلق رکھتے ہیں اور غالباً ایک شیخ وقت کے مرید بھی ہیں۔ پیری مریدی کا سلسلہ حقیقتاً تو ایسا سلسلہ نہیں جو علوم قرآن و سنت سے بے میل ہو اور اس سے وابستہ ہو کر ایک عالم دین فکر صحیح سے دور ہو جائے۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اس سلسلہ میں بعض ایسے تصورات داخل کر دیئے ہیں کہ بڑے بڑے علماء اور اساتذہ بھی انسے آلودہ ہوئے بغیر سلوک کی راہ طے نہیں کر سکتے۔ پانی میں رنگ مل جائے تو کیسے ممکن ہے کہ آپ پانی پئیں اور رنگ کا کوئی حصہ آپ کے حلق سے نہ اترے۔ یہ رنگ پانی کی حقیقت میں داخل نہیں مگر اس میں اس طرح حل ہو چکا ہے کہ گھونٹ بھرتے وقت وہ گلاس کی تہہ میں نہیں بیٹھ سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ استاد مکرم مولانا علی میاں جب وقت علمی شان میں ہوتے ہیں تو توحید و رسالت کے بنیادی افکار و خیالات ان کے قلم سے پھوٹ پڑتے ہیں اور شرک و بدعت کے لئے ان کی زبان تیغ رواں بن جاتی ہے۔ لیکن جب اس شان پر تصوف و طریقت کے رنگ کا غلبہ ہوتا ہے تو یہ تیور ماند پڑ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ مولانا مدظلہ تصوف و طریقت کے رخ پر کیا طرز فکر پسند فرماتے ہیں۔

یہ ہمارا ذاتی خیال و تأثر ہے۔ ہم کیا اور ہمارے علم و فہم کیا۔ ہو سکتا ہے ہم نے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ صحیح بات اپنے بارے میں مولانا ہی بتا سکتے ہیں اور زیر بحث کتابچہ ان ہی سے جواب کا طالب بھی ہے۔ ہم جو کچھ یہاں کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کتابچے کے مصنف نے جن خیالات و افکار اور رسوم و عقائد کو اسلام سے جوڑ کر ان کی تحسین و تعریف کی ہے وہ ہرگز ہرگز اسلام سے مربوط نہیں ہیں اور جن بزرگوں نے اس کتابچے پر تقریظیں لکھ کر یہ گل افشانی کی ہے کہ یہ کتابچہ صحیح اسلامی عقائد کا آئینہ دار ہے انھوں نے محض وقت برباد کیا ہے۔

تقریظیں —— جو اس کتابچے کے آخر میں شامل ہیں ان حضرات کی تحریر فرمودہ ہیں۔

(۱) قدوۃ المشائخین الحاج مولانا سید محمد فرید پاشا (۲) مولانا سید شاہ نعیم الدین حسینی بندہ نوازی (۳) مولوی سید نور الدین قادری منشی فاضل۔

ان حضرات کے اسماء گرامی کے ساتھ جو خطابات وغیرہ دیئے گئے ہیں ان سے تو ہمیں دلچسپی نہیں۔ خطابات گھر کی مایا ہیں جس کا جی چاہے پیٹ بھر کر جسے چاہے القاب و آداب سے نواز سکتا ہے۔ ہمیں دلچسپی ان علمی کارناموں سے ہے جو واقعتہً یہ اندازہ کراتے ہیں کہ کون شخص علم و آگہی اور فہم و دراست کے کس مرتبہ و مقام پر ہے ان بزرگوں میں سے کسی کا بھی کوئی ایسا کارنامہ ہمارے سامنے نہیں جس سے ان کے علم و تفقہ کا سراغ پاتھ آئے۔ البتہ تقریظوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس خوبصورت الفاظ اور خوش فہمیوں کا ذخیرہ تو وافر ہے مگر قرآن و سنت کے انوار ساطعہ اور دلائل روشن کا کوئی سرمایہ نہیں۔ یہ سب حضرات اس خیال پر متفق ہیں کہ خیر القرون کے طور طریق سے بغاوت اور قرآن و سنت کے محکمات سے انحراف کر کے جو "قبوری شریعت" مسلمانوں نے ایجاد کر لی ہے وہی عین حق ہے اور مردہ پرستی ہی اسلام کی سب سے بڑی معراج ہے۔ حد یہ ہے کہ تقریظ نگار نور الدین قادری صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کا جھنڈا بھی اٹھائے ہوئے ہیں یعنی شرک بالجہر اور علانیہ توحید دشمنی بس یہی طرۂ امتیاز ہے جس کی بنا پر یہ حضرات بڑی شان سے اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت کہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کہہ کر انھوں نے اس پاکیزہ اصطلاح کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔

کہنا جو کچھ ہے وہ ہمیں تقریظ نگاروں سے نہیں بلکہ مصنف سے ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ مولانا علی میاں جیسے شہرۂ آفاق عالم و استاد کو درس شریعت دینے والے لائق مصنف کا اپنا مبلغ علم کیا ہے انھوں نے قرآن و حدیث کن کن استادوں سے پڑھا ہے۔ اور

اگر نہیں پڑھا تو کیا اپنے ہی طور پر ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے خود کو صدیقی اور اشرفی لکھ دینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ آپ قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی سب کچھ لکھوا لیجئے۔ انجمن اہل سنت وجماعت کا صدر بن جانا بھی علم و تفقہ کی دلیل نہیں۔ لوگ تو آجکل مڈل فیل ہو کر وزیر اور گورنر بنجاتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے لوگ پرائمری بھی پاس نہیں ہوتے۔ اللہ دے بندہ لے۔

تجسس ہمیں اس لئے ہے کہ کتابچے میں دعوے تو بہت ہیں مگر کہیں کسی آیت یا حدیث سے کوئی استدلال نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا کھلا حکم ہے کہ اے مسلمانو! جب تم میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو جائے تو قرآن و حدیث کی طرف رجوع کیا کرو۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔

دعووں میں ہر شخص آزاد ہے۔ قادیانی کیا کچھ دعوے نہیں کرتے۔ بریلویوں، دیوبندیوں اور دوسرے سب مکاتب فکر کے پاس دعووں کے دفتر ہیں لیکن ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ مجرد دعوے کوئی قیمت نہیں رکھتے جب تک ان کے لئے قوی دلائل نہ ہوں۔ ہم نے آجتک ایسا کوئی دعوے نہیں کیا جس کے لئے مضبوط دلیل نہ دی ہو۔ فاضل مصنف کو شاید علم ہی نہیں کہ دلیل کہتے کسے ہیں۔ انھوں نے بہت تیر مارا تو یہ کیا کہ ایک دو عبارتیں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز رحمہما اللہ کی نقل کر دیں اور مطمئن ہو گئے کہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان عوام میں ہیں جو نہیں جانتے کہ دین و شریعت میں دلیل و حجت کسے کہتے ہیں اور بزرگانِ دین کے اقوال کی کیا حیثیت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ یا شاہ عبد العزیز نبی تو نہیں تھے دونوں ماضی قریب کی شخصیت ہیں حالانکہ دین کی تکمیل دورِ رسالت میں ہو چکی اور اسلامی عقائد و ضوابط کا گوشوارہ خیر القرون میں تیار ہو چکا۔ بعد کا کوئی بزرگ چاہے وہ کتنا ہی مقدس ہو اگر طے شدہ اصول و عقائد کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرتا ہے تو دین میں اس کی کوئی قیمت نہیں ممکن حد تک اس کی تاویل کریں گے اور تاویل نہ ہو سکے تو اسے دیوار پر دے ماریں گے۔ کیا حقیقت ہے کسی ایسے قول کی جو اساسی مسلمات کے خلاف ہو۔

یہ سب ہم نے اس مفروضے کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ دونوں بزرگوں کے ارشادات میں واقعتہً کوئی چیز بدعات کے حق میں پائی جا رہی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اول تو ہر وہ کتاب معتبر نہیں جس کا انتساب شاہ ولی اللہ کی طرف کر دیا جائے۔ شاہ صاحب انسان ہی تھے۔ غیر معصوم اور غیر نبی۔ وہ ماں کے پیٹ سے عالم فاضل نہیں پیدا ہوئے تھے تدریجی تارتیج کے ساتھ رفتہ رفتہ وہ بڑے بنتے گئے اور عظمت کے بلند مقام تک پہنچنے میں انھیں زینہ بہ زینہ بلند ہونا پڑا کون کس بنیاد پر دعویٰ کر سکتا ہے کہ تدریجی ارتقاء کے اس پورے زمانے میں انھوں نے جو بھی رائے ظاہر کی وہ محکم اور فیصلہ کن ہی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بازار میں ان کی متعدد کتابیں ہیں جن میں ایک دوسرے سے متصادم باتیں پائی جاتی ہیں مثلاً الانتباہ فی سلاسل اولیاء میں وہ طواف قبر تک کی ترغیب و تعلیم دیے جاتے ہیں لیکن البلاغ المبین اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتابوں میں اس کی سخت مخالف ان کا مسلک ہے۔ لہذا ماننا ہوگا کہ اعتماد کے قابل ان کی صرف وہ کتابیں ہیں جو علم و عقل کی پختگی کے بعد لکھی گئیں اور ان میں قرآن و حدیث سے استفادہ کیا گیا۔ ان کی بھی یہ پوزیشن نہیں کہ جو کچھ ان میں ہے وحی کے درجے میں ہے۔ ہرگز نہیں۔ خطائے فکری کا امکان شاہ ولی اللہ سے لے کر شاہ عبد القادر جیلانی تک ہر بزرگ میں پایا جاتا ہے۔ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم تک خطائے اجتہادی سے بالاتر نہیں تھے۔ لہذا زبدۃ النصائح اور انوار ساطعہ اور دررِ ثمینہ اور اسی نوع کی دیگر کتب میں شاہ ولی اللہ یا شاہ عبد العزیز اگر ملیدوں پر فاتحہ خوانی اور میلاد وغیرہ کی مدح و ستائش میں کچھ لکھ جائیں تو اسے دلیل و شہادت کے طور پر وہی پیش کر سکتا ہے جسے دلیل و شہادت کے معنی معلوم نہ ہوں۔ اور جو یہ نہ جانتا ہو کہ قانونِ شریعت اس طرح کے اقوال سے

منافی نہیں ہوا کرتا۔

علماءِ حق نے شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبدالعزیزؒ جیسے بزرگوں کے ارشادات کی مناسب تاویلیں بھی پیش کردی ہیں لیکن ہم اس راہِ دراز کو اختیار کرکے وقت برباد کرنا نہیں چاہتے۔ اختلافی مسائل میں گفتگو کا یہ طریقہ معقول ہے ہی نہیں کہ قرآن و حدیث اور ماہرینِ فن کے ارشادات سامنے موجود ہیں مگر ہم فلاں شاہ صاحب اور فلاں قطب صاحب کے ملفوظات اٹھائے لئے آرہے ہیں۔ کتاب و سنت اصل ہیں ان کی طرف آؤ تاکہ توہمات کا غبار چھٹے اور بے ریب سچائی ابھر کر سامنے آئے۔

شاہ ولی اللہؒ نے فیوض الحرمین میں اپنا واقعہ لکھا

"جب میں مکہ مکرمہ میں تھا تو ولادت النبی صلی اللہ تعالیٰ کے دن لوگ مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوکر درود شریف پڑھ رہے تھے اور ان واقعات و کرامات کا ذکر کیا جارہا تھا جو آپ کی ولادت شریفہ کے وقت اور قبل نبوت ظہور پذیر ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ اچانک نور پھیل گیا اور میں یہ بتا نہیں سکتا کہ میں نے اس نور کو اپنے جسم کی آنکھ سے دیکھا یا باطن کی آنکھ سے دیکھا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ظاہر و باطن کے درمیان کیا معاملہ تھا۔"

مزید یہ ——— "جب میں نے اس معاملہ پر غور کیا تو میں اس حقیقت کو پاگیا کہ وہ انوار ملائکہ تھے جو ایسی مجلسوں میں حاضر ہونے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔"

نیز ——— "میں نے دیکھا کہ انوار ملائکہ اور انوارِ رحمت کا ایک دوسرے سے خلط ملط ہورہا تھا۔"

ان عبارتوں کو مصنف نے محافل میلاد کی تحسین و تائید میں نقل کیا اور اپنی طرف سے یہ اضافہ بھی فرمادیا کہ ان محفلوں میں رسول اللہؐ بھی تشریف لاتے ہیں۔

ہر شخص دیکھ لے کہ یہ مضمون تو شاہ صاحب کی عبارت میں موجود نہیں۔ تاہم یہ فرض ہی کرلیا جائے کہ شاہ صاحب ایسا خیال فرماتے ہوں گے تو ہم محترم مصنف اور ان کے تقریظ نگاروں سے عرض کریں گے کہ شاہ ولی اللہ کا کشف دمکاشفہ قطعاً حجت نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ شیطان انھیں دھوکا دے گیا ہو۔ امکان کو تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ حضورؐ کی ولادت شریفہ اور قبل نبوت کی اکثر و بیشتر روایات ناقابل اعتبار ہیں روایت کو جانچنے کے لئے ایک مستقل فن موجود ہے۔ کسی بڑے سے بڑے شخص یا گروہ کا مجرد یہ یقین کرلیں کہ فلاں فلاں روایات صحیح ہیں کوئی قیمت نہیں رکھتا اگر اس فن کی کسوٹی صحت کی تصدیق نہ کررہی ہو۔ میلاد کی محفلوں میں زیادہ تر بے بنیاد روایات بیان کی جاتی ہیں اور بے بنیاد باتوں کا بیان ایسا کارِ خیر نہیں ہوسکتا کہ فرشتے اس پر سرو جنبیں اور انوار مقدسہ کی ان پر بارش ہو۔ جھوٹ کی عین فطرت میں سیاہی ہے۔ ہر وہ روایت جھوٹ ہے جسے فن کی میزان بے وزن قرار دیدے۔ اگر واقعتہً یہ التزام کیا جائے کہ محفل میلاد میں صرف صحیح و ثقہ روایات بیان ہوں تو حضورؐ کی پیدائش اور قبل نبوت کی کرامتوں کا ذکر و بیان گھنٹہ بھر بھی نہیں چل سکتا۔ لہٰذا رونق محفل کے لئے رطب و یابس کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ جھوٹ اور سچ کی اس مخلوط محفل کو فرشتوں کی تحسین و تائید اور اللہ کی حمایت حاصل ہوگی۔ شاہ ولی اللہ صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بڑھ کر تو نہیں ہوسکتے۔ ابن مسعودؓ ان لوگوں کو مسجد سے بھگا دیتے ہیں جو ذکر اللہ اور درود خوانی کے لئے مسجد میں جمع ہونے لگے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو ابھی تو رسول اللہؐ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ابھی سے تم نے بدعت بازی شروع کردی! یہ واقعہ قوی روایات سے ثابت ہے اور تجلی ہی میں

جو الے بھی پیش کئے جا چکے ۔ تو اے بزرگو اور بھائیو! اگر مسجد میں درود خوانی و ذکر اللہ کے لئے محفل جمانا اتنے بڑے صحابی کے نزدیک بدعت قرار پاسکتا ہے تو یہ محافل میلاد کیسے عرش سے اتر کر آئی ہیں کہ ان پر بدعت کا اطلاق نہ ہو جب کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین ان کے تصور تک سے نا آشنا تھے۔

شیطان وہ فنکار ہے کہ جب چاہے جبّہ و عمامہ پہنکر بڑی پر نور داڑھی کے ساتھ کسی کبھی شیخ و قطب کے روپ میں آسکتا ہے ۔ ادھر سے ادھر تک روشنی پھیلا سکتا ہے بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ جا اسے میرے بندے! تجھے عبادات معاف کیں کیونکہ تو مقام محمود پر فائز ہو گیا۔ اس لئے کسی کا بھی کشف یا رویت خیالی یا خواب دوسروں کے لئے بالکل حجت نہیں ۔ ہم شاہ ولی اللہ کی بزرگی کو جانتے ہیں مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ بزرگوں کا پیچھا شیطان کچھ زیادہ ہی کرتا ہے وہ واقف ہے کہ ایک بزرگ کے دل میں ایک ہی باطل خیال ڈال دینا بڑی شاندار کامیابی ہے ۔ کیونکہ لاکھوں ارادتمند دھوکے میں پڑیں گے اور قیامت تک ایک عیب ہنر بن جائے گا گناہ ثواب سمجھ کر کیا جائے گا۔ کسی کو توبہ کا بھی خیال نہیں آئے گا۔

خدا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی قبر کو نور سے بھر دے خوب کہا تھا انھوں نے کہ

"یہ محفلیں تو کرشن کنھیا کے سوانگ اور جنم دن جیسی ہیں ۔"

اس قول پر محترم کمال الدین صدیقی اشرفی کو بہت غصہ آیا ہے ۔ اس غصہ کی جھونک میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر ہم ابھی کلام کریں گے اور بتائیں گے کہ موصوف اور ان کے ہم مسلک حضرات کا مذاق و مزاج دین کے معاملہ میں کس قدر بگڑ گیا ہے ۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبند کے اکابرین میں ہیں انھوں نے اپنے شیخ کی ایک کتاب کو جلا ڈالا تھا ۔ یہ قصہ بہت دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی بقول شاعر ؎

لذید بود حکایت دراز تر گفتم

افسوس یہ ہے کہ قلت صفحات کی بنا پر قارئین کو اگلے ماہ کا انتظار کرنا پڑے گا ۔ کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ قادیانیت پر توجہ مرکوز کر دینے کے بعد ہم تیموری شریعت کا پیچھا چھوڑ دیں گے ۔ اس کا پیچھا تو اس وقت تک کیا جائے گا جب تک انگلیوں میں قلم پکڑنے کی سکت ہے ۔ ہماری تو روز کی دعا ہے کہ اے اللہ فرشتۂ اجل ہماری روح ایسے ہی وقت قبض کرے جب ہمارا ناچیز قلم تیری توحید اور تیرے سچے نبیؐ کی تعلیمات مبارکہ کی حمایت میں بدعات و توہمات کے بخیے ادھیڑ رہا ہو۔

ایک ایسا شاہکار جسے آپ پڑھتے پڑھتے ہنس پڑیں گے

سچی کہانی نمبر

مُلّا ابن العرب مکی کے قلم سے

تلخ و شیریں حقیقتیں طنز و مزاح کے لباس میں۔

ایک طویل کہانی جو انتہائی عجیب بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔

عورتوں کی مسجد • بھٹکل کا مسلم پرسنل لا کنونیشن • من گھڑت روایتیں • اخبارات میں آیات و احادیث • کوڑھی کا غسل میت • زچہ کی موت • کوڑھی کی امامت • باعقل یا بے عقل امام • خطبۂ جمعہ میں خلفاء کے نام اور نماز کے بعد دعا • پہلی آیات کے نزول کی بحث • ایک نام کی تحقیق • اہل سنت والجماعت کون ہیں؟ • ترقی • اختلاف صحابہؓ • حدیث کا حوالہ۔

عورتوں کی مسجد

سوال :- از محمد عارف بھٹکلی۔

عرض ہے کہ کچھ مدت سے شہر بھٹکل میں خالص عورتوں کے لیے مسجد بنانے کا پروگرام چل رہا ہے اور اس تعمیری پروگرام پر کافی بحث بھی چل رہی ہے۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے قبل میں آپ سے مخاطب ہوں اور عرض ہے کہ وہاں پر غیر مسلموں کا گذر ہوگا جہاں پر یہ مسجد بنانے کا پروگرام ہو رہا ہے۔ چاہیے کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ کام لیا جائے۔

قدیم زمانہ سے اب تک کے موجودہ زمانہ میں۔ دنیا میں یا ہندوستان میں اسلام کی روشنی میں علماء کے فتوی سے کہیں بھی خالص عورتوں کو باجماعت نماز پڑھانے کے لیے مسجد بنائی گئی ہے یا بنانے کا حکم ملتا ہے۔ بنی تھی یا نہیں؟ اس سلسلے میں اسلام کے احکام اور شریعت کا کیا حکم ہے۔ مہربانی فرما کر تجلی کے ذریعہ جواب دیجئے فقط۔

جواب :-

یہ ملت کی بدقسمتی ہے کہ دین پسند طبقوں میں بھی کچھ لوگ ایسے پائے جا رہے ہیں جو مسلمان خواتین کو مسجدوں اور عیدگاہوں میں لانا ثواب کا کام تصور کرتے ہیں حالانکہ اسلامی اخلاق اور دینی مصالح کا شعور رکھنے والا کوئی بھی ذی ہوش مسلمان اس کی ممکنہ اور معلومہ قباحتوں سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔

تاریخ یہ ہے کہ زمانِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عورتوں کو مسجد میں آنے اور شریک جماعت ہونے کی اجازت تھی مگر پانچوں وقت نہیں۔ صرف فجر اور عشاء میں جبکہ اندھیرا ہوا کرتی تھی اور عشاء قرات کو پہنچتی ہے۔ اس طرح یہ توقع ہو گیا کہ عورتوں کا مردوں کی نظر میں آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں فرماتے تھے۔ اب یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ دو وقت حاضری کی اجازت نماز سکھانے ہی کے لیے تھی نہ کہ یہ بتانے کے لیے کہ عورتوں کا مسجدوں میں شریک جماعت ہونا زیادہ ثواب کا کام ہے۔

پھر یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ تقویٰ، پاک بازی، دینداری
اور خدا ترسی کے لحاظ سے وہ کیسا بے نظیر دور تھا۔ حضور صلعم
کی موجودگی نے مسلمان معاشرے کو حرام و مکروہ اُمور سے
کس درجہ متنفر کر دیا تھا۔ غیر مسلم بھی کسی غنڈہ گردی کی جرأت
نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکستوں پر شکستیں
کھا چکے تھے۔ ایسے ماحول میں عورتوں کا تاریکی میں شریک
جماعت ہو جانا کسی فتنے کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن حضور ہی کے اقوالِ شریفہ نے یہ بات کھول دی
کہ جماعت عورت پر واجب نہیں ہے بلکہ عورت کو زیادہ
ثواب گھر میں نماز پڑھنے پر ملتا ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدینؓ
کے دور میں عورتوں کا شریک جماعت ہونا بند ہو گیا اور فجر
و عشاء بھی وہ گھروں ہی میں پڑھنے لگیں۔ اس کے بعد سے
آج تک پوری دنیا میں کہیں بھی ایسی عام مسجد اور شریک جماعت
ہونے کا رواج نہیں۔ تمام علماء و فقہاء اس پر اتفاق کر چکے
ہیں کہ عورتوں کو گھروں ہی میں نمازیں پڑھنے دو۔ مساجد میں بلا کر
فتنوں اور خرابیوں کو دعوت مت دو۔

ایسی صورت میں ہر ذی فہم خود فیصلہ کر لے کہ کسی بھی مقام
پر اگر کچھ لوگ خاص عورتوں ہی کی مسجد تعمیر کرنے کی فکر میں لگ
گئے ہیں تو اسے حماقت اور لغویت کے سوا اور کیا کہیں گے
زیادہ صحیح عنوان اس کے لئے ہم تو "شیطنت" سمجھتے ہیں۔
گنہگار ہو گا وہ شخص جس نے اس غلط کام میں ہاتھ بٹایا۔

بنگلور کا مسلم پرسنل لا کنونشن

سوالؒ:۔ از سلیم احمد بمبئی۔

ابھی بنگلور میں جو مسلم پرسنل لا کنونشن ہوا ہے اس
میں ہندوستان کے بیشتر معروف و غیر معروف علماء شریک
ہوئے مگر آپ جناب نظر نہیں آئے۔ میں اور میری طرح آپ
کے ہزاروں ارادتمند یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا آپ کو
بلایا ہی نہیں گیا، یا آپ دعوت کے باوجود خود ہی شریک نہیں
ہوئے۔ معاملہ نجی اور انفرادی نہیں اس لئے تجلی ہی میں جواب
عنایت فرمائیں تاکہ آپ کے تمام عقیدت مندوں کو صحیح بات
کا علم ہو جائے۔

جواب:۔

ناچیز کے پاس بھی دعوت نامہ آیا تھا مگر اپنی مصروفیات کی
بناء پر نہیں جا سکا۔ مصروفیات کو نظرانداز کر کے جاتا اگر یہ سمجھتا کہ
میرا جانا دین و ملت کے حق میں مفید ہو گا لیکن افادیت سمجھ میں
نہیں آئی اس لئے کیا حاصل ایسی تگ و دو سے جس کے بعد
یہ کہنا پڑے ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ......

دیوبند سے اتنے لوگ گئے تھے کہ ان پر بھیڑ کا اطلاق
ہو سکتا ہے۔ اور بھی مقامات سے کم نہ گئے ہوں گے۔ ان سب
کے ہوتے مجھ ناچیز کا وہاں ہونا نہ ہونا ایک ہی بات تھی۔
خدا کرے کہ وہ وقت اور دولت جو مجموعاً اس کنونشن پر صرف
ہوئی ہے ضائع نہ جائے بلکہ دین و ملت کے حق میں بارآور
ثابت ہو۔ میرا ناچیز وجود بعض نازک طبع حضرات کے لئے
کانٹا بن جاتا ہے اس لئے بھی جانے سے پرہیز کیا۔ مجھے
ایسی کوئی تمنا نہیں ہے کہ لوگ مجھے عالمِ دین کی حیثیت سے
جانیں نہ اس کی پرواہ ہے کہ ایک اس طرح کے کنونشن میں
مجھے نہ پا کر لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہو کہ عامر نالائق کا شمار
تو اہلِ علم کی کسی بھی صف میں نہیں ہے۔

لوگوں کا خیال درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ مجھے وہاں
نہ دیکھ کر بہت سے اپنے "دوستوں" کو دلی مسرت ہوئی ہوگی جبکہ
بڑی گھٹن اور ذہنی اذیت ہوتی اگر میں وہاں جا پہنچتا۔ اس طرح
میں اپنے بعض مؤمن بھائیوں کو اذیت سے بچانے اور مسرت
سے بہرہ ور کرنے کا سبب بن گیا ہوں، یہ بھی کارِ خیر ہے۔

آج کی دنیا نفاق اور تنگ دلی اور تعصبات اور خود غرضی
اور مکاری کی ہے۔ مجھے ایسی دنیا کی محفلوں اور ہنگامہ آرائی
سے کہیں زیادہ عزیز اپنا وہ کونہ ہے جہاں بیٹھ کر قلم کے ذریعہ
میں دین و صداقت اور حق و انصاف کی حمایت کر سکتا
ہزاروں تک اپنی بات پہنچا سکتا ہوں اور بدعات و خرافات
سے لڑ سکتا ہوں۔ واللہ المعین۔

...ن گھڑت روایتیں

...ال :- از سید ایوب ۔ حیدر آباد

ایک شیعی مقرر منظر حسین طاہر یوں فرماتے ہیں کہ :-

"مسلمانوں کے تمام فرقے اس تاریخی حقیقت پر متفق ہیں ...دوستوں یا ہمعصروں میں حضرت ابو بکر رضؓ ایمان لائے، طبقہ ...ان میں حضرت خدیجہ رضؓ نے اسلام قبول کیا اور بچوں میں حضرت ...رضؓ مشرف بہ اسلام ہوئے"

حضرت علی رضؓ کے تعلق سے خطیب اہل بیت نے فرمایا کہ "اسلام تو وہ قبول کرے گا جو مسلمان پیدا نہ ہوا ہو۔ او...رت محمدؐ نے بعد ولادت حضرت علی رضؓ جب ان کو گود میں اٹھایا ...مولود (حضرت علیؓ) نے حضرت محمدؐ کو قرآن سنایا اور اس ...ت پر حضرت علی رضؓ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بھی موجود تھیں"

...ل مقرر نے جب اس روایت کو سنایا تو ان کے ہم مسلک ...ستاروں نے صدائے تحسین بلند کی اور درود بھی پڑھا۔ میں نے دو تین دن کے بعد یعنی ۸ر فروری ۷۵ء کو طاہر ...حب کو ایک مراسلہ اپنے دوست مولوی محمد علی صاحب ...ی کے ذریعہ روانہ کیا جس کا جواب ہنوز موصول طلب ہے ...دہ مراسلہ میں میں نے مذکورہ روایت کی تاریخی سند مانگی تھی

آپ سے گذارش ہے کہ از راہ کرم اپنے ماہنامہ میں مذکورہ ...روایت کی تاریخی حقیقت مع سند درج فرمائیں۔

...راب :-

ہمارا خیال یہ ہے کہ فاضل مقرر کو اس روایت میں اتنا ...مافہ اور کر دینا چاہیے تھا کہ جس وقت نومولود حضرت علیؓ ...آن سنا رہے تھے اس وقت میں منظر حسین طاہر بھی وہیں ...جود تھا۔ یا اس اضافے پر لوگوں کے بے ہوش ہو جانے کا ...طرہ محسوس ہوا ہو تو یوں کہہ دیتے کہ میری روح عالم ارواح ...ے یہ منظر صاف صاف دیکھ رہی تھی۔

انھوں نے ایسا کوئی اضافہ نہیں کیا لہٰذا یہ نامراد سوال ...بجود اٹھ کھڑا ہوا کہ چودہ سو سال پہلے کا یہ نادر واقعہ ان کے علم میں کیسے آیا۔

آپ اپنے خط کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ بھولے پن کی انتہا ہے۔ مجلس وعظ و خطابت کی ایسی روایتیں ثبوت و سند کی محتاج نہیں ہوا کرتیں۔ ان کا تو بس یہ مقصد ہوا کرتا ہے کہ جتنے لوگ بے وقوف بن سکیں خاموشی سے بن جائیں۔ جو نہ بن سکیں وہ گھر بیٹھیں۔ بحث کی کیا گنجائش۔

روایتیں ہزاروں گھڑی گئی ہیں۔ ایسی ہی یہ بھی ایک گھڑنت ہے۔ شیطان ایسی ہی چیزوں سے دماغوں کی مٹی پلید نہ کر دیتا تو دین میں اتنے فرقے کیسے بنتے۔ آپ خواہ مخواہ مجلس عزا میں گئے۔ یہ مجلسیں صرف ان لوگوں کے لئے ہوتی ہیں جو فرط عقیدت اور عالم غفلت میں بے چون و چرا ہر روایت کو ہضم کرتے چلے جائیں جیسے ہمارے یہاں مجالس میلاد میں فضول سے فضول روایت پر بھی بے مغز اور غبی لوگ سر دھنتے اور واہ واہ پکارتے ہیں۔

اخبارات میں آیات واحادیث

سوالؔ :- از سید اسد اللہ حسینی یادگیر

(۱) آج کل یہ بات عام ہو گئی ہے کہ اخبارات و رقعات شادی بیاہ میں قرآن کی آیات، احادیث یا ان کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ خصوصاً اخبارات کو دینی معلومات کی اشاعت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ اشاعت کا فریضہ تو ادا ہو جاتا ہے لیکن دوسری جانب اسی کی بے حرمتی ہوتی رہتی ہے کہ ہر شخص ان اخبارات کو احتراماً محفوظ رکھنے کا تو مکلف نہیں ہوتا۔ نتیجۃً دونوں باتیں اپنے اپنے معیار پر قائم نہیں رہ سکتیں یعنی (۱) اشاعت (۲) احترام۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا ہر وقت خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ صحیح راستہ اختیار کرنا ہو تو کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟۔

جواب :-

جس اندیشے کا آپ نے ذکر فرمایا وہ بے بنیاد نہیں ہے لیکن اشاعت اسلام اور دینی مباحث کے سلسلے میں اخبار

ورسائل کا آیات واحادیث شائع کرنا ایک شدید ضرورت ہے جس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کا پیکٹ ڈاک خانے کے حوالے کر دیا جاتا ہے حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ڈاک خانوں میں پیکٹوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ وہ ناپاک ہاتھوں سے بھی گذر سکتے ہیں۔ زمین پر بھی پھینکے جا سکتے ہیں۔ پھٹ جانے کا مرحلہ بھی آ سکتا ہے لیکن ان تمام اندیشوں اور ممکنہ قباحتوں کے باوجود فقہاء نے اسے جائز قرار دیا کیونکہ اس کے بغیر قرآن کی ترویج واشاعت میں آجکل بڑی دشواریاں پیش آتیں لہٰذا اخبارات ورسائل میں آیات واحادیث کی اشاعت کو حرام تو نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن کچھ ہدایات ضرور کی جا سکتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ جو اخبارات ورسائل اصلاً مذہبی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ زیادہ مواد عوامی دلچسپی کا دیتے ہوں وہ آیات و احادیث سے احتراز کریں۔ اگر کسی مضمون میں ضرورت ہی پڑ جائے تو بجائے متن کے فقط آیت نمبر یا رکوع یا سورت کا حوالہ دیدیں یا محض ترجمے پر اکتفاء کریں۔ ترجمے اور متن کا حکم ایک نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ پڑھنے والے مسلمان کسی اخبار کو ردّی میں بیچنے سے پہلے اس کا جائزہ لے لیا کریں۔ اگر آیات واحادیث سے مزین اوراق انھوں نے ردّی میں بیچ دیئے تو اس کی ذمہ داری شائع کرنے والے پر نہیں خود ان پر ہوگی۔

کوڑھی کا غسل میت

سوال :-

جذامی میت کے غسل اور تجہیز وتکفین کیسے کی جائے۔ جبکہ مرض ہی ایسا خطرناک ہوتا ہے کہ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ چاہی ہے؟

جواب :-

مرض بے شک متعدی ہے اور کراہت انگیز بھی لیکن یہ کیوں یقین کر لیا گیا کہ بعد مرگ بھی اس کی وہی خطرناکی باقی رہ گئی ہوگی جان نکل جانے کے بعد عین ممکن ہے کہ مرض کی بھی جان نکل گئی ہو یعنی اس کے تعدیہ والی صلاحیت فنا ہو گئی ہو۔

علاوہ ازیں اسلام کی یہ تعلیم تو نہیں کہ جو شخص جذام یا کسی اور متعدی مرض میں گرفتار ہو جائے اسے ایڑیاں رگڑنے کے لیے تن تنہا چھوڑ دو۔ یہ شقاوت جذام سے بھی زیادہ گندی اور مضر ہے۔ کوڑھیوں کے اعزاء بہرحال ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ کھلاتے پلاتے ہیں، قریب رہتے ہیں۔ یہی انسانیت کی تعلیم بھی ہے۔ پھر آخر کوڑھی کی میت کو غسل دینے میں اتنا خوف کیوں؟

حضورؐ نے پناہ مانگی ہے تو ہم اور آپ کب ایسے امراض سے پناہ نہیں مانگتے۔ پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان سے محفوظ رکھے لیکن جب اللہ کی مشیت اپنے کسی مسلمان بھائی کو مبتلا ہی کر دے تو حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اسے بے یار ومددگار چھوڑ دو اور مر جائے تو غسل دینے میں بھی لیت ولعل کرو۔

زچّہ کی موت

سوال :- ایضاً

یہاں عام طور پر یہ دستور پڑ گیا ہے کہ وہ عورت جو زچگی کے باعث فوت ہو جائے اُس کی قبر میں چالیس گھڑے پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ دریافت پر اس عمل سے نفاس سے خلاصی بتائی گئی۔ جسے سن کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی بات فقہ کی کتب میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فقہ کی دیگر کتب میں ہو لیکن چونکہ خلش کو مٹانا ہے اس لیے اس مسئلہ میں آپ کی جانب رجوع ہوں۔ اُمید کہ اس کا کوئی صحیح حل نکل آئے۔

جواب :-

میرے لیے یہ نئی اطلاع ہے۔ خدا جانے یہ طریقہ کس عقلمند نے نکالا ہوگا۔ شرعی اعتبار سے اسے ہم ایک فضول رسم کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

کوڑھی کی امامت

سوال :- مریض برص کی امامت کیسی ہے۔ تفصیل سے روشنی ڈالیں؟

جواب :- مسئلہ یہ ہے کہ امام میں ایسی کوئی چیز نہ ہونی چاہیے جو

مقتدیوں کے لیے نفرت وکراہت کا باعث بنتا ہو جہاں کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز واقعۃً ایسی ہو جس سے کراہت و وحشت طبیعت انسانی کا مقتضا ہو۔ کوڑھ بہت بڑا مرض ہے لیکن اس کے مختلف اسٹیج ہیں۔ بعض مراحل میں یہ بہت کراہت انگیز شکل اختیار کرلیتا ہے بہرحال اگر امام جذامی ہے اور ہیئت وحالت واقعی ایسی ہوگئی ہے کہ سلیم الطبع لوگوں کو انقباض وکراہت کا احساس ہوتا ہے تو اس کی امامت مکروہ ہے۔

بدعقل یا بے عقل امام

سوال:۔

بعض ائمہ مساجد نماز پڑھاتے ہیں۔ پڑھتے نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ جب وہ امامت کرتے ہیں تو ارکان نماز کی ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر فرماتے ہیں۔ حالانکہ نماز جماعت ہلکی کرکے پڑھانے کا حکم ہے اور نفری نماز یعنی انفرادی نماز کو اپنی استطاعت کے مطابق حدود احکام میں رہ کر طوالت کرسکتے ہیں۔ یہ اس کے بالکل برعکس کرتے ہیں یعنی جماعت کی نماز کو غیر معمولی طوالت اور اپنی انفرادی نماز کو بالکل مختصر یعنی طوفانی رفتار سے ادا کرلیتے ہیں۔ باوجود حکمت وموعظت کے افہام وتفہیم سے بھی یہ اپنی عادت سے باز نہیں آتے۔ ایسوں کی اقتدا کے بارے میں اظہار رائے فرمائیں۔

جواب:۔

ایسے لوگ اپنی عقل کی کمی کے باعث معذور ہیں۔ ان کی بے عقلی انھیں نصیحت قبول کرنے سے روکتی ہے۔ کوئی آدمی خود اپنی منفرد نماز میں خواہ لمبی پڑھے یا مختصر لیکن امامت کی حالت میں اسے اختصار ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگر مذکورہ امام باوجود سمجھانے کے باز نہیں آتے تو انھیں چھٹی دیدی جائے۔

لاٹری کی شرعی حیثیت

سوال:۔ از محمد انیس مالیگاؤں

میرے ایک دوست جو نئی تہذیب سے متاثر ہیں۔ کہتے ہیں کہ لاٹری جائز ہے اس لیے کہ اس کے ذریعہ کسی غریب شخص کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے جو ضرورت مند ہو۔ مثال کے طور پر بیان کرتا ہے کہ میرے گاؤں میں ایک ایسے شخص نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا کہ ٹھیک سے دو وقت کا کھانا بھی اس کو نہیں ملتا تھا۔ مگر لاٹری کھلی تو آج لاکھوں کا مالک بن گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عالم لوگ جو کہتے ہیں کہ لاٹری حرام ہے اس سے بہت سے بوڑھوں بچوں کی آہ لینا ہے یہ غلط ہے۔ کیونکہ ایک ایک روپیہ سے کوئی مر نہیں جاتا۔ مگر اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا اگر کوئی ان فوائد کا انکار کرکے قرآن وحدیث سے لاٹری کی حرمت ثابت کرے تو میں مان لوں گا

جواب:۔

آپ کے دوست بہت ناسمجھ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر غنیمت ہے کہ قرآن وحدیث کا کچھ نہ کچھ اعتماد واحترام ان کے دل میں پایا جاتا ہے اور وہ اس پر آمادہ ہیں کہ قرآن یا حدیث سے ثبوت مل جانے پر میں بات مان لوں گا۔

ان سے کہیے کہ بھائی علماء جائز وناجائز اور حلال وحرام کے جو قوانین بیان کرتے ہیں وہ دل سے گھڑ کر نہیں کرتے بلکہ قرآن وحدیث ہی کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں کچھ علماء جواز کا فیصلہ دیں اور کچھ عدم جواز کا تب تو یہ خیال بھی کیا جاسکتا ہے کہ قرآن وحدیث میں اس مسئلہ کو صاف صاف بیان نہیں کیا گیا لیکن جن مسائل پر علماء کا اتفاق ہے وہ کویا یہی ہیں جن کے بارے میں اللہ یا رسولؐ نے صاف صاف فیصلہ صادر کیا ہے۔

لاٹری ایسے ہی مسائل میں سے ہے۔ یہ بلاریب وشک جوا ہے اور جوے کا حرام ہونا قرآن وحدیث میں صاف صاف بیان ہوا ہے۔

اپنے دوست کو کسی مترجم قرآن میں سیقول کا پارہ کھول کر یہ آیت دکھلائیے:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ — اے رسول! لوگ تم سے شراب اور جوے

وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔

ہر سمجھدار آدمی اس آیت سے اس فیصلہ پر پہنچ سکتا ہے کہ کسی چیز میں کچھ فوائد کا پایا جانا اس کے جائز ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ شراب اور جوے میں بعض فوائد کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس لیے حرام قرار دے رہا ہے کہ فائدوں کے مقابلہ میں ان کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔

آپ کے دوست نے لاٹری کا جو فائدہ بیان کیا اگر اسے بغیر کسی حجت کے مان ہی لیا جائے تب بھی وہ جوا ہونے کی بناء پر حرام ہی رہتا ہے۔ قرآن ہی فیصلہ دے رہا ہے کہ کسی فائدہ کا پایا جانا جوئے یا شراب کو حلال نہیں کر سکتا۔

لیکن وہ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ فائدہ بیان کرنے میں انھوں نے کم فہمی اور بچکانے پن سے کام لیا ہے۔ کروڑوں آدمی لاٹری کے ٹکٹ خریدتے ہیں اور انعام صرف گنے چنے لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ باقی سب کی رقم ڈوب جاتی ہے۔ پھر جن لوگوں کو انعام ملتا ہے ضروری نہیں کہ وہ فاقہ کش اور فقیر و مسکین بھی ہوں۔ ان کے گاؤں میں اگر کسی مفلس کے نام لاٹری نکل آئی تو یہ محض اتفاق ہے ورنہ انعام نکلنے کا کوئی معیار نہیں ہے وہ کسی دولتمند کے نام بھی نکل سکتا ہے اور کسی متوسط حیثیت والے کے نام بھی۔ آپ کے دوست کو یہ ایک اتفاقی مثال تو خوب نظر آئی مگر یہ نظر نہ آیا کہ بے شمار لوگ سالہا سال تک ٹکٹ خرید خرید کر انعام کی امید لگائے رہتے ہیں اور سوائے مایوسی و نقصان کے ان کے حصہ میں کچھ نہیں آتا۔

ایک روپے کی کوئی بڑی حیثیت نہیں یہ بات ٹھیک ہے لیکن اول تو یہ سوچنا چاہیئے کہ جس شخص کو دو وقت کا کھانا بھی نہ مل رہا ہو اس کے لیے ایک روپیہ بھی خاصی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ جس شخص کی مثال انھوں نے دی اسی جیسے اور بھی لاکھوں آدمیوں نے اسی لاٹری کا ٹکٹ خریدا ہوگا اور وہ سب انعام سے محروم رہے۔ تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس شخص نے بغیر کسی محنت اور تجارت کے اپنے ہی جیسے لاکھوں غریبوں کے روپے پر قبضہ کر لیا حالانکہ جتنا مستحق یہ تھا اتنے ہی مستحق وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے اسی کی طرح ایک ایک روپیہ دے کر ٹکٹ لیا تھا۔

دوسرے یہ سوچنا چاہیئے کہ ایک ٹکٹ کی قیمت اگرچہ ایک روپیہ ہوتی ہے لیکن بے شمار لوگ فرداً فرداً بہت سے ٹکٹ خرید ڈالتے ہیں تاکہ انعام پانے کا زیادہ سے زیادہ امکان پیدا ہو۔ سو سو اور دو دو سو ٹکٹ خرید لینے کی بھی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ لہٰذا اس جوئے کو بڑے سے بڑے پیمانے پر بھی کھیلنے کی گنجائش موجود ہے۔

تیسرے یہ سوچنا چاہیئے کہ نفع کی جو مثال آپ کے دوست نے دی ہے اس کی رُو سے تو چوری اور رشوت خوری کو بھی جائز ہونا چاہیئے۔ ایک غریب آدمی کسی لکھ پتی کے ہزار روپیہ چرا لیتا ہے تو لکھ پتی کا کچھ بھی نہیں بگڑا اور غریب کا کام بن گیا۔ اسی طرح رشوت کے لین دین میں دینے والے کا مقصد حل ہو جاتا ہے اور لینے والے کی جیب گرم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا آپ کے دوست سرقہ و رشوت کو بھی حلال قرار دیں گے۔

جہاں تک حکومت کی آمدنی میں اضافے کا تعلق ہے تو اگر یہ بات لاٹری کو جائز کرنے کے لیے کافی ہو تو شراب نوشی کو جائز کرنے کے لیے اور بھی کافی ہونی چاہیئے۔ لاٹری میں تو یہ بھی امکان ہے کہ جتنا انعام دینا ہے اتنے ٹکٹ فروخت نہ ہوں اور حکومت انعام بانٹ کر نقصان میں رہے لیکن شراب کے معاملہ میں یہ بھی امکان نہیں۔ اس کے پرمٹ جاری کر کے تو حکومت نفع ہی نفع کماتی ہے۔ پھر کیا آپ کے دوست یہ مشورہ دیں گے کہ سب کو خوب شراب نوشی کرنی چاہیئے اور میخانے کھولنے چاہئیں۔

جوئے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلا محنت دولت کمانے کے خواب دکھلاتا ہے۔ سٹہ، ریس، لاٹری اور جوئے کی دیگر اقسام میں یہی تو ہوتا ہے کہ داؤ پر تھوڑی رقم لگاؤ اور دفعتاً بڑی رقم جیتنے کی امید رکھو۔ یہ ذہنیت صحت مند اقتصادیات کے لیے مہلک اور معاشرے کے لیے تباہ کن ہے۔

اس میں چند افراد محنت و اتفاق سے دوسرے بے شمار افراد کے پیسے پر قبضہ کر لیتے ہیں جیسے آپ نے لاٹری میں دیکھا کہ کروڑوں انسانوں کی جیب سے رقم نکلی اور چند افراد کو بٹ گئی کیوں بٹ گئی ؟ — محض قرعہ اندازی سے محض اتفاق سے۔ ہر ٹکٹ پر ہر شخص کی مساوی رقم لگی ہوئی تھی لیکن بغیر کسی معقول وجہ کے یہ رقم کچھ لوگوں کی جیبوں میں چلی گئی اور باقی سب دیکھتے رہ گئے۔ اسی کا نام ہے جوا۔ نہ کوئی چیز بکی نہ خریدی گئی محض روپے نے روپے کو جیتا۔ آپ کے دوست اگر ذرا بھی سلامتی عقل کے ساتھ غور فرمائیں تو وہ محسوس کریں گے کہ لاٹری ایک کھلا جوا ہے اور جوے کی حرمت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

خطبۂ جمعہ میں خلفاء کے نام اور نماز کے بعد دُعا۔

سوال :-

ہمارے محلے کی مسجد میں امام صاحب نے خطبۂ جمعہ میں جو چاروں خلفاء (ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ) کے نام ہیں وہ نہیں پڑھے تو نماز کے بعد سب مصلی ان پر بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ تم نے چاروں خلیفہ کے نام نہیں لیے اس لیے نماز نہیں ہوئی۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت میں فرض و سنت نفل پوری ہونے کے بعد امام صاحب کو دعا کرنی چاہیئے اس کے بغیر جماعت نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ جماعت کا حکم ہی اس لیے دیا گیا کہ دعا بھی جماعت سے کی جائے۔

جواب :-

ہمارے زمانے کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ لوگ اہم سے اہم معاملہ میں بغیر علم و تحقیق کے فتوے اور فیصلے دینے شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ سوائے فساد و انتشار کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

آپ نے جن مصلیوں کا ذکر فرمایا وہ بھی اسی جرم کے مرتکب ہیں کہ شرعی مسائل کا علم بالکل نہیں اور نا جیسے اہم مسئلہ میں فتویٰ جھاڑنے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا صحیح طریقہ کار یہ ہونا چاہیئے تھا کہ بعد فراغت نماز امام صاحب سے دریافت کرتے کہ آپ نے خطبہ میں خلفائے راشدین کا ذکر خیر کیوں نہیں فرمایا۔ امام صاحب جو کچھ جواب دیتے اسے کاغذ پر لکھ کر کسی مستند اور معروف دار الافتاء کو بھیجتے کہ اس پر فتویٰ صادر کیا جائے۔ جو فتویٰ آتا اسے دل و جان سے قبول کرکے کوئی قدم اٹھاتے۔

غور سے سنیے کہ شرعی قوانین کیا ہیں۔

خطبۂ جمعہ میں فرض صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر دیا جائے۔ مثلاً خطبہ کی نیت سے "سبحان اللہ الحمد للہ" کہدیا تو خطبہ کا فریضہ ادا ہو جائے گا اور نماز جمعہ درست ہوگی۔

دو خطبے پڑھنا اور ان کے درمیان کچھ دیر بیٹھنا چہرے کو حاضرین مسجد کی طرف رکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا، قرآن کی کوئی آیت شامل خطبہ کرنا اور وعظ و نصیحت کے کچھ مضامین لانا ان میں سے کوئی چیز خطبہ کے لیے فرض یا واجب نہیں بلکہ یہ سب چیزیں سنت ہیں یعنی ان پر عمل کر لیا تو خطبہ مکمل اور حسین و جمیل قرار پائے گا۔ نہ عمل کیا تو خطبے کو حسین و جمیل قرار نہ دے سکیں گے مگر فریضہ پھر بھی ادا ہو جائے گا۔ رہا خلفائے راشدین یا ازواج مطہرات یا بعض اور صحابہ کے نام کا معاملہ تو ان کا شامل خطبہ کرنا سنت بھی نہیں ہے صرف مستحب ہے یعنی ایسا فعل جسے کر لیا جائے تو ثواب مل جائے گا نہ کیا جائے تو گناہ اور قصور کچھ نہیں نہ خطبے میں کوئی نقص آئے گا۔

جب یہ بات ہے تو وہ لوگ جاہل اور غیر ذمہ دار کہے جائیں گے جو یہ فضول باتیں کر رہے ہیں کہ خطبہ میں خلفائے راشدین کے نام نہ لینے کی وجہ سے نماز جمعہ ہی نہیں ہوتی۔

اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیا جائے کہ جس طرح شریعت کے کسی حرام کو حلال کر لینا گناہ ہے اسی طرح کسی غیر ضروری کو ضروری اور مستحب کو واجب و فرض قرار دے لینا بھی گناہ ہے شریعت نے جس فعل و عمل کو جس درجے میں رکھا ہے وہی درجہ اس کے لیے مناسب ہے اور ہم اسے گھٹائیں بڑھائیں گے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ خدا نخواستہ شریعت میں کچھ نقص تھا یا اللہ اور رسول سے بھول ہو گئی تھی جسے اب ہم درست کر رہے ہیں۔

ما[illegible] نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے :۔

من ا[illegible] رخصۃ وب وجعلہ عزماً ولم یعمل بالرخصۃ فقد اصاب منہ الشیطٰن من الاضلال

یعنی جو شخص کسی مستحب کام پر اصرار کرے اور اسے لازمی قرار دے دے مجبوری تو شیطان کے پھندے میں پھنس گیا۔

مستحب کام کو ضروری نہ سمجھ لینا چاہیئے اور کبھی کبھی اسے ترک بھی کر دینا چاہیئے جبکہ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہونے لگے کہ وہ ضروری کام ہے۔

امام صاحب نے اگر اسی نیت سے خلفائے راشدین کے نام چھوڑ دیئے ہیں تو کچھ برا نہیں کیا۔ لیکن اگر وہ خطبہ میں خلفائے راشدین کی تعریف پسند نہیں کرتے تو اگرچہ یہ بری بات ہے مگر اس سے نماز پر پھر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ تحقیق کے بعد اگر یہ ثابت ہو کہ امام صاحب شیعی ذہنیت رکھتے ہیں اور صحابۂ کرام رضی کی مدح انھیں ناپسند ہے تو انھیں امامت سے ہٹا دینا ہوگا مگر یہ نماز اپنی جگہ بلا شبہ ہو چکی جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے۔

سوال ۳ :۔ دعاء کے متعلق بھی ایک عجیب بات موجود ہے یہ وہی فتنہ ہے جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا یعنی شریعت سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی زبان چلا دینا۔

نماز سلام پر مکمل ہو جاتی ہے۔ دعاء مانگنے نہ مانگنے کا کوئی تعلق نماز کے ہونے نہ ہونے سے نہیں ہے۔ نماز کے بعد دعاء کو فرض یا واجب یا سنت تو کسی بھی عالم نے نہیں کہا۔ یہ صرف مستحب ہے اور مستحب بھی ایسا کہ بعض اہل علم اسے بدعت تصور کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جماعت کے متصل بعد دعا مانگی ہو یا اس کی ہدایت فرمائی ہو۔ اس کے برخلاف اکثر اہل علم یہ کہتے ہیں اور یہی بات ہمارے نزدیک صحیح ہے کہ نماز کے بعد دعاء مستحب ہے۔

مستحب کا مطلب آپ نے جان ہی لیا کہ ایسا عمل جس کا کرنا مفید ہو لیکن نہ کرنا مضر نہ ہو۔ جماعت کے بعد امام نے دعاء نہیں مانگی تو یہ ہرگز نہ کہہ سکیں گے کہ اس نے گناہ کیا۔ رہی نماز تو ہم بتا ہی چکے کہ وہ تو سلام پر مکمل ہو چکی۔ دعاء سے اس کے نقص و کمال اور حسن و قبح کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے جس شخص نے یہ کہا کہ دعاء کے بغیر نماز ہی نہ ہوگی وہ پرلے سرے کا جاہل بھی ہے اور کم عقل بھی۔ اسے توبہ کرنی چاہیئے کہ اس نے شریعت پر الزام لگایا اور بغیر علم کے زبان کھولی۔

پہلی آیات کے نزول کی بحث

سوال :۔ از نیاز احمد متو ناتھ بھنجن اعظم گڑھ

تجلی بابت جنوری ص۳۲ جواب ۲ کے تحت جو کچھ آپ نے رقم فرمایا ہے اس سے سائل کی خلش نہیں دور ہو سکتی، یہ تو اس بات کا جواب ہوا کہ حضرت جبرئیل نے اقرأ کیوں فرمایا، جبکہ اصل خلش ما انا بقارئ فرمانے پر ہے اگر قراءت کا مطلب یہی ہے کہ میرے کلام کو سننے کے بعد لوح حافظہ پر مرتسم ہونے والے نقوش کو ذہن و دماغ سے پڑھ کر زبان کی طرف منتقل کیجیے تو اس کے لیے ابجد شناسی کی کیا ضرورت تھی یہ تو امی کے بھی بالکل امکان میں ہے، اس مطلب کا جواب ما انا بقارئ باعث خلش ہے، اس لیے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل کوئی تحریر لائے تھے۔ مودودی صاحب نے یہی بات لکھی ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

جواب :۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت جبرئیل اس پہلی وحی کے آغاز میں کوئی تحریر لائے تھے تو بے شک سائل کی وہ الجھن تو دور ہو جاتی ہے جو لفظ اِقرأ کے جواب ما انا بقارئ سے پیدا ہو رہی ہے مگر جو نئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں ان پر بھی غور کر لیا جائے۔

پہلی بڑی الجھن یہ ہے کہ آغاز وحی کی تمام متعلقہ تفصیلات روایتوں میں موجود ہیں حتیٰ کہ جو نفسیاتی اور جذباتی ردِ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا اس تک کا نقشہ روایاتِ صحیحہ نے ہو بہو کھینچ دیا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں تحریر کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے نزول کا یہ واقعہ حضور خود اپنی زبان مبارک سے زوجۂ محترم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو سناتے ہیں۔ قدرتی بات تھی کہ اگر جبرئیل نے کوئی تحریر پیش کر کے اِقرأ کہا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بھی تذکرہ فرماتے۔ تذکرہ نہ فرمانا اس پر دال ہے کہ تحریر پیش نہیں ہوئی تھی بلکہ جبرئیل [illegible] مخروده

کلام الٰہی میں لفظ اِقْرَأ اسی طرح محاورۃً استعمال ہوا تھا جس طرح قرآن میں دیگر سیکڑوں محاورات استعمال ہوتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ما انا بقاری بھی محاورۃً ہی فرمایا تھا۔

دوسری الجھن یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو امّی (بے پڑھا لکھا) رکھنا اور اس شان و وصف کا اعلان فرمانا اللہ کی معلوم و معروف حکمت ہے۔ اس وصف نے آپؐ کی عظمتوں میں چار چاند لگائے ہیں اور غیر مسلموں کے لیے وسواس و شبہات کا دروازہ بند کیا ہے چنانچہ قرآن میں اللہ نے ساری دنیا کو کھول کر بتایا کہ محمد رسول اللہ ناخواندہ ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ پہلی وحی تحریری شکل میں بھیجے جبکہ اس کی کوئی ضرورت بھی لاحق نہیں تھی۔

تیسری الجھن یہ ہے کہ اگر وحی کا تحریراً ہی بھیجنا قرین حکمت تھا تو پھر صرف پہلی وحی تک یہ محدود کیوں رہا۔ بعد کا تمام قرآن تحریراً کیوں نہ بھیجا۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن پورا کا پورا حضرت جبرئیلؑ صرف زبان کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل کرتے رہے اور تحریر کا کوئی واسطہ موجود نہیں رہا۔

چوتھی الجھن یہ ہے کہ روایت صحیحہ کے بموجب ان پہلی آیات کے نزول کے وقت حضرت جبرئیلؑ نے تین مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچا تھا۔ دو مرتبہ آپ نے اِقْرَأ کا جواب یہی دیا کہ ما انا بقاری (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں)، تیسری مرتبہ بھینچنے پر آپ نے کیا کہا یہ روایت میں موجود نہیں ہے۔ اگر تیسری بار بھی آپ نے ما انا بقاری کہا ہوتا تو روایت اسے واضح کرتی۔ صاف ظاہر ہے کہ تیسری بار آپ نے ان پہلی پانچوں آیات کو زبان سے دہرا دیا ہوگا۔ یا اس وقت نہ دہرایا ہو تو بہرحال حضرت خدیجہؓ کے آگے دہرایا ہوگا۔ قرآن میں ان آیات کا شامل ہونا قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ آیات جبرئیلؑ سے منتقل ہوکر حضورؐ کی زبان پر آئی ہیں۔ اب اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ آپ کے خیال کے مطابق جو تحریر جبرئیلؑ لائے تھے اسے حضورؐ نے پڑھ لیا ہو یا پڑھ نہ سکے ہوں بلکہ جبرئیلؑ کی زبان سے ادا شدہ الفاظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہوں۔

ان میں سے ہر ایک صورت الجھنیں رکھتی ہے۔ اگر پہلی صورت فرض کرلیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ حضرت جبرئیلؑ کے بھینچنے سے حضورؐ میں تحریر پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ یہ بات ناممکن نہیں ہے اللہ جب جس طرح چاہے کوئی بھی صلاحیت کسی بندے میں پیدا فرما سکتا ہے لیکن اس صلاحیت کا پیدا ہو جانا اُس وصفِ خاص کا خاتمہ کردے گا جسے اُمّیت کہتے ہیں یعنی حرف ناشناسی کی حد تک ناخواندہ ہونا، حالانکہ یہ قطعیات میں سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر ناخواندہ رہے۔ کبھی آپ میں لکھنے یا لکھا ہوا پڑھنے کی صلاحیت موجود نہیں رہی۔ لہٰذا یہ بات مانی نہیں جا سکتی کہ آپ میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہو۔ یوں بھی نہیں مانی جا سکتی کہ ایسی صلاحیت کا پیدا کرنا اللہ اسی وقت پسند فرماتا جبکہ آئندہ بھی سارا قرآن تحریراً ہی اسے بھیجنا ہوتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورۂ قیامۃ میں اللہ جل شانہٗ کیا فرما رہا ہے :-

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔	(اے نبی) نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے۔ وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینے میں اور پڑھنا تیری زبان سے پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتے کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ پورے قرآن کا طریق نزول کیا رہا ہے۔ جبرئیل کلام خداوندی کو زبان سے پڑھتے تھے اس پر ابتدءً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد کر لینے کے خیال سے یہ روش اختیار فرمائی کہ ساتھ ساتھ اسے دہراتے رہیں۔ ایسا دہرانا جو اگرچہ دل ہی دل میں ہوتا ہے مگر زبان بھی اس میں حرکت کرتی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اے رسول! یہ مت کرو تم بس غور سے سنا کرو۔ اس قرآن کو تمہارے حافظے میں محفوظ کر دینا اور پھر تمہیں اس کا اہل بنانا کہ اسے دوسروں کو سنا سکو ہمارے ذمہ ہے۔ تم اسے بھول نہیں سکتے۔ ساتھ ساتھ دہرانے کے بجائے توجہ سے سن لینا ہی کافی ہے۔

یہ آیات نص قطعی ہیں اس امر واقعہ کے لیے کہ جبرئیلؑ حضورؐ تک

سامنے ۔۔۔ کرتے تھے زبانی سناتے تھے۔
اب اگر ۔۔۔ کہ پہلی پانچ آیات تحریراً پیش ہوئیں اور فرشتے کے کھینچنے نے حضورؐ میں تحریر پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تو آخر کیا فائدہ ہوا اس صلاحیت سے اور کیوں صرف چند ابتدائی آیات کے لیے اللہ نے تحریر کو ذریعہ بنایا۔

اور اگر دوسری صورت مانیں یعنی تحریر کو پڑھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہوئی ہو بلکہ جبرئیلؑ کی زبانی قراءۃ ہی نے آیات کو حضورؐ کے سینے میں محفوظ کر دیا ہو تو تحریر اور بھی لا حاصل ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی نہ بھولیے کہ اقرأ جبرئیلؑ کا اپنا نہیں اللہ تعالیٰ کا لفظاً و حکم ہے۔ کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ جو اللہ حضورؐ کا ناخواندہ ہونا نہ صرف جانتا ہو بلکہ آپ کو زندگی بھر ناخواندہ ہی رکھنے کا فیصلہ کر چکا ہو وہ پہلی پانچ آیات بشکل تحریر بھیجے اور کہے کہ انھیں پڑھو۔ پھر حضورؐ یہ فرمائیں کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تب بھی وہی حکم دہرائے کہ نہیں ضرور پڑھو۔ زبان سے دہرانے میں بہ سبب خوف جو رکاوٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آ رہی تھی اسے دور کرنے کے لیے تو پڑھنے کے حکم کی تکرار موزوں سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ کسی صلاحیت کے نہ پائے جانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا مگر جو صلاحیت موجود ہی نہیں تھی وہ تو تکرارِ حکم سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔

یہ ہے ان الجھنوں اور اشکالوں کی تفصیل جو تحریر والا مفروضہ قبول کرنے کی شکل میں پیدا ہوتی ہے۔ مولانا مودودی نے بیشک یہ قیاس فرمایا کہ تحریر پیش کی گئی ہوگی لیکن ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ آپ یا سائل اگر متذکرہ الجھنوں کا کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں تو شوق سے کریں۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں ہمیں یہ اصرار ہو کہ آپ اور سائل ہماری ہی رائے کو قبول فرمائیں۔ البتہ یہ نہ بھولیں کہ تحریر والا خیال شاذ ہے اور جمہور امت وہی رائے رکھتے ہیں جو ہماری ہے۔

ایک نام کی تحقیق

سوال:-

"بدایۃ المجتہد جلد اول ص۲۳ مصری نسخہ پر ابن رشدؒ نے مسح علی الخفین کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے چند ائمہ مسالک کے اسمائے گرامی نقل کیے ہیں اس میں ایک نام "مزنی" آیا ہے۔ بعض قدیم نسخوں میں "مری" را کے ساتھ ہے چونکہ نام نہیں معلوم ہو سکا ہے اس لیے تعیین نہ ہو سکی۔ اگر آں جناب اس میں رہنمائی دے سکیں تو باعثِ ممنونیت ہو۔"

جواب:-

خط سے آپ کو جواب دے چکا ہوں۔ خیال ہوا کہ بدایۃ المجتہد اہلِ علم اور طلبا عربی میں کافی پڑھی جانے والی کتاب ہے اور اس کی کوئی شرح یا کوئی حاشیہ موجود نہیں ہے اس لیے آپ ہی کی طرح بعض اور لوگوں کو بھی اس نام کے سلسلہ میں پریشانی ہو سکتی ہے لہٰذا کیوں نہ اپنا جواب منظرِ عام پر ہی لے آؤں۔

یہ صحیح نام یہاں "مری" ہے (بغیر نقطہ کی را سے) مزی جہاں چھپا ہے غلط چھپا ہے۔ المری ظاہری مذہب کے ایک محدث ہیں جو ابو علی غسانی اور عبد الباقی بن محمد وغیرہما سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ ان کا پورا نام ہے محمد بن الحسین بن احمد بن محمد الانصاری المری شہرت محمد الانصاری کے نام سے ہے۔ ابن رشد یا ان کے بعد کے مصنفین جب صرف مری یا المری لکھیں تو سمجھ لیجیے کہ یہی ظاہری محدث ان کا مشارٌ الیہ ہیں۔ یہ ۴۶۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۳۲ھ میں المریۃ میں انتقال کیا ان کی معروف تالیف ہے "الجمع بین الصحیحین"۔

کوئی زیادہ تفصیل میں جانا چاہے تو ان کے حالات ابن بشکوال کی الصلۃ میں ص۵۲۴ پر اور بغدادی کی ایضاح المکنون جلد اول کے ص۳۶۶ پر مل جائیں گے۔ بغدادی ہی کی ہدیۃ العارفین میں بھی جلد دوم کے صفحہ ۸۰ پر ان کا تعارف موجود ہے۔

جہاں تک لفظ مزی (نقطوں والی زا سے) کا تعلق ہے اس نام کے بھی متعدد علماء گذرے ضرور ہیں اور ان میں مشہور ترین شخصیت حافظ جمال الدین یوسف بن المزی کی ہے لیکن یہ تو پیدا ہی ابن رشد کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ غالباً ساتویں صدی ہجری کا نصف آخر ان کا زمانۂ ولادت ہے جبکہ ابن رشد علیہ الرحمۃ ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے بھی پہلے دنیا سے سدھار گئے ضرورت تھی کہ بدایۃ المجتہد پر بھی کوئی حاشیہ عربی ہی میں

جایا جاتا یا مفصل شرح لکھی جاتی۔ بڑے کام کی کتاب ہے۔ ممکن ہے
ابھی کسی نے حاشیہ یا شرح لکھی بھی ہو اور وہ منظر عام پر آئے
بغیر ضائع ہو گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وہ جوابات جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے

اہل سنت والجماعۃ کون ہیں؟"

"اہل سنت والجماعۃ" کی تعریف و توضیح ان لوگوں سے پوچھئے
جو خود کو بڑی شان سے اہل سنت والجماعۃ کہکر دوسروں پر گمراہی
اور بدعقیدگی کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ پھر ان کی پیش فرمودہ
تعریف و توضیح سے ہمیں بھی مطلع کریں تو خوشی کی بات ہو۔

سب سے زیادہ زور شور سے اپنے آپ کو اہل سنت
والجماعۃ آج کل قبوری شریعت کے حاملین کہہ رہے ہیں۔ بریلی
بے چارہ تو بدنام ہے ہی۔ اجمیر، حیدر آباد، کشمیر۔ ان سب میں
قبر پرستی اور پیر پرستی کا کاروبار خوب ترقی پر ہے اور اسی لیے
سب سے زیادہ اہل سنت والجماعۃ انہی مقامات پر پائے
جاتے ہیں۔

ہم تو سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ مُردوں کو نہیں صرف خدائے
حیّ وقیّوم کو پوجتے ہیں اور اس کے آخری رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان
رکھتے ہوئے ان احکام وعقائد کو جزو ایمان سمجھتے ہیں جو قوی وصحیح احادیث
سے ثابت ہوں جب کسی مسئلہ میں ہمارا اور کسی اور کا اختلاف ہو تو
حکم قرآنی کے بموجب قرآن وحدیث ہی کو قاضی اور منصف اور حرفِ آخر
مانتے ہیں۔ اس کے برخلاف آج کل کے اکثر نام نہاد اہل سنت والجماعۃ
کا رویہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے بجائے اختلافی مسائل میں صوفیوں
اور پیروں اور شاہوں کے حوالے دینے شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے
نزدیک دین میں مشائخ اور صوفیاء اور اربابِ طریقت کے افکار حجت
ہیں اور ہمارے نزدیک وہ فقہاء و مجتہدین مقتدا ہیں جنہوں نے عرق ریزی
کے ساتھ قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور پھر اس علم کے سرچشمے سے
دینی احکام وفرامین اور قواعد وضوابط اور معتقدات ونظریات
نکالے۔

ناموں کے لیبل بے کار ہیں۔ اصل شے ہے قرآن وحدیث کی
مکمل فرمانبرداری اور بدعات سے پرہیز ونفرت۔ وہی سچا مسلمان ہے
جو خدا اور رسول ﷺ کے ارشادات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔

ترقی

مغربی ممالک نے جو کچھ "ترقی" کی ہے وہ مادّیات کی ترقی ہے
حالانکہ یہ ترقی کسی بھی انسان کو سو پچاس سالوں سے زیادہ کام نہیں
دیتی۔ اخلاقیات کا ان ممالک میں جو کچھ حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں
اخلاق کی درستگی اور روحانی ترقی مذہب ہی سے وابستہ ہے اور
مذہب بھی اکیلا اسلام ہی ہے کیونکہ دوسرا کوئی مذہب انسان کے
نفسِ امّارہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔

اختلافِ صحابہؓ

اللہ نے ذہنوں کی ساخت رکھی ہی ایسی ہے کہ ان میں اختلاف
ہو اور پر ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا دار الامتحان ہی کیسے کہلاتی اور
صحیح فکر وعمل پر انعامات کیوں ملتے۔ صحابۂ کرامؓ ہماری آپ کی طرح
انسان ہی تھے۔ ان میں اختلافات کا رونما ہونا کوئی عجوبہ نہیں
خلافِ قیاس نہیں۔ تشویشناک نہیں۔

حدیث کا حوالہ

کشمیر کے جن بزرگوں نے یہ شکایت کی کہ "تجلی" کا ایڈیٹر علمِ حدیث
اپنے جوابات میں حدیث کا حوالہ نہیں دیتا، ان سے کہیئے کہ تجلی کا وہ
کسی بھی ایک سال کا فائل پڑھ دیکھیں ضروری مواقع پر انہیں حدیث
کے حوالے مل جائیں گے۔ البتہ بے ضرورت حوالے دینا ہمارے نزدیک
مناسب نہیں۔ نہ ہم یہ پسند کرتے ہیں کہ ضعیف اور غیر ثقہ روایات
سے کام چلائیں۔

پھر ان بزرگوں سے یہ عرض کیجئے کہ حدیث وقرآن کی تفہیم ان
سے کی جاتی ہیں جو حدیث وقرآن سے کچھ واقفیت بھی رکھتے ہوں
کشمیر میں جو بے شمار بدعات رائج ہیں ان کے خلافِ شرع ہونے
پر ہم بے شمار عقلی ونقلی دلیلیں پیش کر چکے ہیں۔ ہمارے جواب میں
آج تک جن بزرگوں نے بھی اعتراض فرمایا ہے وہ قرآن وحدیث
سے تو کچھ نہ لا سکے بس شیخ فلاں اور شاہ فلاں کے حوالے

کردیجئے جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (اگر تمہارا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو یعنی قرآن وحدیث سے فیصلہ حاصل کرو)۔

اب مثلاً آپ نے ایک کشمیری وظیفے کے الفاظ لکھے ہیں۔ اسی طرح "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کا وظیفہ ہے۔ شاہ عبدالقادر یا شاہ مخدوم یا شاہ فلاں کو پکار پکار کر کچھ مانگنا اس کے جواز پر آج تک کسی اللہ کے بندے نے قرآن یا حدیث سے کوئی ثبوت نہیں دیا بلکہ وہی غیر علمی روش رہی کہ فلاں بزرگ اس کی تلقین کرتے تھے اور فلاں شاہ صاحب نے اسے جائز بتایا ہے۔ بتائیے ایسے لایعنی اور فضول جوابات پر ہم کیا قرآن اور کیا حدیث پیش کریں۔

اللہ تعالیٰ علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحؒ کو آخرت کی نعمتوں سے نوازے وہ بہت بڑے محدث تھے۔ کاش ان سے کچھ کم درجے ہی کا کوئی محدث آج کل کشمیر میں ہوتا تو ہم احادیث کے ذریعہ اس سے افہام وتفہیم کرتے لیکن ہمارے علم کی حد تک کشمیر محدثین سے خالی ہو چکا۔ اگر ہمارا علم غلط ہے اور قبوری شریعت کے حلقے میں وہاں واقعتہً کوئی محدث پایا جاتا ہے تو ہم بڑے شوق سے حدیث ہی کی بنیاد پر اس سے گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ حدیث پر جان قربان۔ مگر غیر معتبر سندوں سے آئی ہوئی روایات کو ہم اہمیت نہیں دیتے جبکہ قبوری شریعت والوں کا یہ حال ہے کہ جتنی ضعیف وکمزور روایات ہیں سب ان کے یہاں وحی کے درجے میں رکھ دی گئی ہیں اور صحیح وقوی احادیث سے انھیں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔

کتاب	پیسے	روپے
فرعون وکلیم کی داستانِ کش مکش		
قافلۂ سخت جاں ..... مجلّد	۵۰	۸
ستو بڑے آدمی .... 〃	-	۶
عرب کا چاند ایک تاریک غار میں	-	۳
خلافت معاویہؓ و یزید مجلّد	-	۸
نظام سلطنت (اکبر نجیب آبادی)	-	۱۰
فصل الخطاب 〃	۵۰	۴
فلاح ملت .. (رد بدعت میں ایک عجیب کتاب)	-	۵
اورنگ زیب عالمگیر ہندو کی نظر میں۔ غیر مجلّد ۴/۔ مجلّد	۵۰	۵

کتاب	پیسے	روپے
ایک اہم دینی دعوت (مولانا ابوالحسن علی ندوی)		۱
پریشانیوں کا شرعی علاج	۵۰	۲
جواہر الایمان	۵۰	۷
میری نماز مجلّد عکسی	۲۵	۲
آسان نماز	۷۵	۱
منتخب تقریریں مجلّد (مولانا منظور نعمانی)	-	۶
مکتوبات حضرت علیؓ۔ اردو مع عربی	-	۱۰
حدیث دفاع۔ اردو مجلد	-	۱۲
عبقات اردو اسمٰعیل شہیدؒ	-	۱۶
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	۵۰	۱۲
الترغیب والترہیب اردو	-	۱۵
تاریخ گجرات	۵۰	۱۲
تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر	۰۰	۱۳
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۲۵	۶
حیات ڈاکٹر ذاکر حسینؒ	-	۱۰
خلافت راشدہ اور ہندوستان	۵۰	۱۰
دین الٰہی کا تاریخی پس منظر	۷۵	۸
شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات	-	۱۰
قرآن اور تصوف	-	۵
قصص القرآن مکمل غیر مجلد		۵۱
لغات القرآن مکمل 〃	۵۰	۵۷
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۷۵	۸
بزم پیغمبرؐ مجلّد۔ مولوی مقبول سیوہاروی	۲۵	۴
چاند کے ٹکڑے ٹکڑے 〃	۵۰	۱
عجائبات ہند 〃	۲۵	۱
گنجینۂ اسرار (عملیات، علامہ انور شاہ کشمیریؒ)	-	۴
تاریخ دیوبند (اضافہ شدہ)	-	۱۰
سوانح محمد علی جناح	-	۳
نسخۂ عجیب	۲۵	-

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبد الوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبد الوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی بدعت کے دشمن اور دین وملت کے خیر خواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمۂ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ——— ساڑھے چار روپے۔ ۴/۵۰

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۸۰ پیسے

معجزہ کیا ہے؟ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف۔ معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم وتفقہ کی روشنی میں گفتگو۔

قیمت مجلد ——— ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

فنِ اسماء الرجال از مولانا تقی الدین مظاہری۔ علم الحدیث کا مدار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن اسماء الرجال پر منحصر ہے لہٰذا حدیث رسولؐ سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کیلئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔

قیمت ——— ایک روپیہ ۷۵ پیسے۔ ۱/۷۵

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر "جدوجہد آزادی"

کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ ان تمام اُمور پر نہایت وقیع ودلچسپ اور مبصرانہ مضامین۔ نظم ونثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔

قیمت ——— پانچ روپے ۲۵ پیسے۔ ۵/۲۵

(پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے)

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم ترین بستی ہے۔ اس کی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کروٹیں دیکھیں اور اب دار العلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ صفحات ۵۱۲ قیمت مجلد۔ دس روپے۔

جمالِ مصطفےٰ درد قریشی کی نعتوں کا دلکش مجموعہ۔

قیمت ——— ایک روپیہ

شہدائے بدر شہدائے بدرؓ کے مختصر حالات وکوائف

قیمت ——— ایک روپیہ۔

دین وشریعت اردو ایڈیشن۔ قیمت مجلد ۔۔۔
انگریزی ایڈیشن ۱۰/-

امتِ مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات واقدامات۔ دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت ——— دو روپے۔

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مولانا مودودی کی مجلس

ایک صاحب نے مولانا محترم سے سوال کیا کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا محترم نے فرمایا کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء سو فی صد قیاس پر مبنی ہے۔ مشاہدہ صرف ایک فیصد ہے۔ اس نے غور کیا کہ کسی چیز کا خالق نظر نہیں آتا۔ ایک چیز بنتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس نے سب چیزوں کو دیکھا اور پھر قیاس کیا کہ ہر چیز کی پہلے ابتدا ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں ارتقاء ہوتا ہے۔ اسی نظر سے اس نے انسان کو دیکھا۔ اس نے انسان کو لنگڑا [illegible] کمزور اور طاقتور مختلف کیفیتوں میں دیکھ کر یہ قیاس کر لیا کہ اس کی ابتدا بندر سے ہوئی ہے۔ وہ بندر سے ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ ڈارون نے یہ قیاس کیا کہ یہ دنیا پودے کی مانند ہے جو پہلے چھوٹا سا ہوتا ہے اور پھر مختلف قوتیں حاصل کر کے پھلتا اور پھولتا ہے اور جب یہی قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں تو وہ خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا محترم نے فرمایا کہ اس نظریے کو جرمنی، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور جاپان کے تقریباً پچانوے فیصد فلاسفر اور سائنسدان رد کر چکے ہیں۔ اور کئی ایک ممالک میں اس نظریے کی اشاعت پر پابندی ہے۔ روس اور چین میں بھی اب یہ نظریہ مقبول نہیں رہا۔

ایک نوجوان نے مولانا محترم سے غیر مسلموں میں اسلام پھیلانے کے طریق کار کے بارے میں سوال کیا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ اسلام پھیلانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ خود پکے مسلمان بنیں تاکہ لوگ آپ کو دیکھ کر یہ جان جائیں کہ اسلام ایک آدمی میں ایسی اور ایسی صفات پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ انہیں اسلامی لٹریچر بھی دیں۔ یہ لٹریچر کسی خاص فرقے کی نمائندگی نہ کرتا ہو بلکہ محض اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بحث کرتا ہو۔ اگر آپ فرقہ بندی کی بنیاد پر تیار شدہ لٹریچر انہیں پڑھنے کے لئے دیں گے تو وہ اس کشمکش میں پڑ جائیں گے کہ وہ مسلمانوں کے کس فرقہ کو قبول کریں۔ بس اس بات پر کلام کیجئے کہ ہم صرف مسلمان ہیں۔ ہمارا مذہب اسلام ہے اور اسلام ہی تمام انبیاء کا دین ہے۔ اسلام ہی ہر شعبۂ زندگی میں انسانی مسائل کا رہنما ہے۔

نائیجیریا سے آنے والے ایک نوجوان نے پوچھا کہ کیا تفہیم القرآن کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے؟

مولانا محترم نے فرمایا کہ تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دو جلدیں اور بھی شائع ہونے والی ہیں۔ ترجمے کا کام بہت تیز رفتاری سے [illegible]

جاری ہے۔

مولانا محترم نے فرمایا تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے کی یہ پانچ جلدیں اردو کی دو جلدوں سے تیار ہوئی ہیں — تفہیم القرآن کا پورا انگریزی ترجمہ پندرہ سولہ جلدوں پر مشتمل ہوگا۔

انہی نوجوان نے پوچھا کہ کیا تفہیم القرآن میں ختم نبوت کے فیصلے کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔؟

آپ نے فرمایا کہ تا حال انگریزی میں شائع نہیں ہو سکا البتہ عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

سائل نے دریافت کیا کہ کیا ضمیمے کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مل سکتی ہے۔؟

مولانا محترم نے فرمایا کیوں نہیں۔ آپ کو اجازت دیدی جائے گی لیکن ترجمہ کرنے کے بعد ذرا مجھے دکھا دیں۔

ایک سائل نے پوچھا کہ کیا اسلام میں لائف انشورنس گروپ انشورنس اور پراپرٹی انشورنس جائز ہے؟

مولانا محترم نے فرمایا انشورنس ایک سراسر ناجائز چیز ہے۔ یہ تو سرمایہ داروں اور حکومت کے لئے عوام کی جیبوں سے پیسہ نکالنے کا ایک مکارانہ فن ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا چاہئے۔ اور اگر بچنے کی کوئی راہ نہ ہو جیسے گروپ انشورنس یا کار انشورنس کو حکومت نے لازم کر رکھا ہے تو اس کے لئے دعا بھی کی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس وبا کو ختم کردے اور اسلامی حکومت لانے کے لئے کوشش بھی کی جائے تاکہ یہ نظام درست ہو۔

ایک سوال تھا کہ کیا پنجاب اسمبلی کی سود کے خلاف قرارداد سے حکومت سودی لین دین بند کردے گی؟

مولانا محترم نے فرمایا، سود ختم کرنا مرکزی حکومت کا کام ہے۔ پنجاب اسمبلی نے تو پنجاب پبلک کو خوش کرنے کے لئے ایک قرارداد پاس کردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت باوجود سوشلزم کا نعرہ لگانے کے اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت کرنے کے سرمایہ داری نظام ہی کو ترقی دیتی چلی جا رہی ہے۔ چاہئے یہ تھا کہ سود اور انشورنس وغیرہ کو ختم کردیا جاتا لیکن یہاں عجیب سے سوشلسٹ حکمران ہیں جو سرمایہ داری کو چیخ چیخ کر برا بھی کہہ رہے ہیں اور خود اسی نظام کو ترقی بھی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ عوام استحصال کی چکی میں پسے چلے جا رہے ہیں اور یہ سوشلسٹ حکمران عوام کی ہڈیوں پر اپنے عالی شان محلات تعمیر کر رہے ہیں۔

آپ نے اسی ضمن میں مزید فرمایا کہ اگر حکومت سود کو ختم کرنا چاہے تو پانچ سال کے اندر اندر اندرونی اور بیرونی طور پر ختم کر سکتی ہے۔ اور اپنے وسائل بھی کشادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مولانا محترم نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ کیا کیا جائے، ہماری حکومت تو اپنے وسائل بڑھانے کی بجائے گداگر بن کر رہ گئی ہے اور ایسے گداگر کا بھیس پال لیا ہے جو خود تندرست و توانا ہے اور محنت کر کے اپنا خاندان کا پیٹ پال سکتا ہے۔ مگر تن آسانی نے اسے بھیک مانگنے پر لگا دیا ہے۔

(رپورٹنگ کی ذمہ داری ادارہ ایشیا پر ہے)

قرآن ۔ تفسیریں ۔ پارے ۔ حمائلیں ۔ دعائیں

قرآن پاک مترجم
مع تفسیر عکسی ۔ ترجمہ مولانا محمود الحسن (شیخ الہندؒ)
اور تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۔ مجلد ریگزین ۔/۳۵
" " مجلد اعلیٰ چرمی کونہ پشتہ ۔/۴۰

قرآن پاک مترجم نمبر ۸۱
عکسی ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ
جلی حروف ۔ عمدہ کتابت و طباعت ۔ مجلد ریگزین
سائز [illegible] —— ۔/۲۵

قرآن پاک مترجم نمبر ۵۵۵
عکسی بادو ترجمہ مترجم مولانا تھانویؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ ۔ تاج کمپنی کے قرآن کا عکس ۔ مجلد ریگزین ۔/۳۰

قرآن پاک مترجم نمبر ۶۴ کلاں
عکسی ترجمہ: مولانا تھانویؒ
سائز ۲۹×۲۲ کشادہ حروف ۔ صاف ستھری کتابت و طباعت ۔ مجلد ریگزین —— ۔/۲۴

قرآن پاک مترجم نمبر ۶۴
عکسی ترجمہ: مولانا تھانویؒ
سائز [illegible] تحت اللفظ سے چھوٹے حروف مجلد خوبصورت ہر لحاظ سے معیاری ۔
مجلد ریگزین ۔ " " —— ۔/۲۰

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۳
عکسی ہر سطر کے نیچے لائن کاغذ کتابت طباعت سب عمدہ ۔ سائز ۳۰×۲۰ (تحملی سائز) ریگزین عمدہ —— ۔/۲۰
قسم دوم ہلکے کاغذ پر —— ۔/۱۸

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۱۲۶
عکسی ۔ ہر صفحہ آیت پر ختم ۔ کاغذ، کتابت، طباعت ، جلد سب عمدہ ۔
سائز ۳۰×۲۰ مجلد ریگزین —— ۔/۱۶

قرآن پاک بلا ترجمہ نمبر ۵۳
عکسی ۲۰×۱۶ مبتدیوں اور بچوں کے لئے نہایت عمدہ مجلد کرشچ قسم اول ۵۰/۱۱
قسم دوم —— ۵۰/۱۰

حمائل مترجم نمبر ۲
عکسی سائز ۱۶×۲۰ ترجمہ: مولانا تھانویؒ حاشیہ پر مختصر تفسیر ۔ ہر لحاظ سے اچھی مجلد کرشچ ۔/۱۵

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۳
عکسی ۳۰×۲۰ سائز ہر سطر کے نیچے لائن روشن حروف ۔ ہر لحاظ سے معیاری ۔ مجلد کرشچ ۔/۱۰

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۶
عکسی کارڈ سائز ۔ باریک عمدہ سفید کاغذ پر مجلد پلاسٹک ۔ حفاظ کے لئے عمدہ ۔ ۵۰/۸

حمائل بلا ترجمہ عکسی
سائز ۲۳×۱۸ ہر صفحہ آیت پر ختم کتابت، کاغذ اور طباعت عمدہ ۔ مجلد کرشچ —— ۵۰/۰

قرآن پاک ۳۰×۲۰ سائز کے پارے ۔ تمام پارے الگ الگ مجلد جو مساجد میں رکھوائے جاتے ہیں مکمل ۔/۵
قرآن پاک ۲۲×۱۸ کے تمام پارے الگ الگ مجلد جو مساجد میں رکھوائے جاتے ہیں مکمل —— ۔/۵

(ان کے علاوہ ہر قسم کے عکسی و غیر عکسی پارے تفاسیر تیسیرا القرآن اور نمازیں وغیرہ مناسب حروف پر بھیجے جاتے ہیں پارے کلاں غیر عکسی ۲۵/ روپے سیکڑہ پارے عکسی گلیزڈ کاغذ پر ۳۲/ روپے سیکڑہ)

پچھلے ماہ کی قسط سے ذیل کا مضمون قلت صفحات کے باعث کم کرلینا پڑا تھا۔ اس بار یہ حاضر ہے انشاء اللہ اگلے ماہ سے یہ کتاب ابتداء سے پیش کی جائے گی۔ (ادارہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خاندان

— ۴ —

قریش کی تجارت اور انکی ترقی

قریش کی وہ تجارت جس کا ذکر سورۂ قریش میں بِرِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (گرمی اور جاڑے کے سفروں) کے نام سے اللہ کے ایک فضل کے طور پر کیا گیا ہے، اس کا خیال بھی سب سے پہلے ہاشم ہی کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے تینوں بھائیوں، عبدِ شمس، مُطّلب اور نوفل کے ساتھ ملاکر یہ منصوبہ بنایا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں اور مکے کی منڈی میں اندرونِ مُلک کے تجار خریداری کے لئے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کرچکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اِسی وجہ سے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ عرب کے دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے خدام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب ان کے احسان مند تھے۔ انھیں اس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے راہگزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کرسکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اسکیم میں اپنے تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبدِ شمس نے، یمنی امراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں[1]۔ اس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اسی بنا پر یہ چاروں بھائی متجرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہوگئے اور جو روابط انھوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے ان کی بنا پر اِن کو اصحابُ الاِیلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے معنی "الف پیدا کرنے والوں" کے ہیں۔

اِس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے

---

[1] طبری کا بیان ہے کہ ہاشم نے شام اور غسان اور روم کے بادشاہ سے، عبد شمس نے نجاشی سے، نوفل نے ایران کے بادشاہ سے اور مطلب نے شاہان یمن سے تجارتی مراعات اور سفر میں حفاظت کے پروانے حاصل کیے۔ (طبری [illegible])

وہ مواقع حاصل ہوئے اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب
براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ
دانش و بینش اِتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا
قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی
وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا
سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ ان بین الاقوامی تعلقات
کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم
الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لئے استعمال
ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لوگ نہ تھے
جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا تھا کہ "قریش قادۃ الناس" قریش لوگوں کے لیڈر
ہیں۔ (مسند احمد، مرویاتِ عمرو بن العاص) اور حضرت
علیؓ کی روایت بیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

كان هذا الامر في حمير فنزعه الله منهم فجعله في قريش — پہلے عرب کی سرداری قبیلہ حِمیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے سلب کر کے قریش کو دیدی۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے
کہ مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آ گیا۔ اگر اُس وقت
ابرہہ اس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبہ کو ڈھا دینے میں
کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی
دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ
متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو
اِس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے
ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکے تک حبشیوں
کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور
مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی
اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں
وہ قصی بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے
اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے
سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج
کو تباہ و برباد کر دیا اور مکے سے یمن تک سارے راستے میں
جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر گر کر مرتے چلے گئے
تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے
سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا اور اس کے ساتھ قریش کی
دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں
کو یقین ہو گیا کہ ان لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے وہ بے
کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر
ہر علاقے سے گذرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا
انھیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی اماں میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا
تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا۔

(تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ قریش)

عبدالمطلب بن ہاشم ہاشم اپنے تجارتی سفروں کے سلسلے
میں اکثر شام جاتے ہوئے مدینے ٹھیرا
کرتا تھا اور وہاں قبیلۂ خزرج کی ایک عورت سے وہ پہلے
ہی شادی کر چکا تھا جس سے اس کے دو بچے حَیَّہ (لڑکی) اور
ابو صَیفی (لڑکا) پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور سفر میں اس نے
خزرج ہی کے ایک خاندان بنی نجار کی ایک عورت سلمیٰ
بنت عمرو بن زید کو بازار میں ایک اونچے مقام پر بیٹھے
دیکھا جو حکم دیتی جا رہی تھی کہ اس کے لئے کیا خریدا جائے
اور اس کی طرف سے کیا بیچا جائے۔ ہاشم کو اس کے حسن و جمال
اور اس کی شان و شوکت اور فراست و ذہانت نے بہت
متأثر کیا اور اس سے شادی کی درخواست کی۔ وہ کسی سے
اِس شرط کے بغیر شادی کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی
کی مختار رہے گی اور کسی شخص کو پسند نہ کرے گی تو علیحدگی اختیار
کر لے گی۔ ہاشم نے اس کی شرط مان لی اور اس نے ہاشم
کی خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کو دیکھ کر اس کا پیغام
قبول کر لیا۔ مدینے ہی میں دونوں کی شادی ہوئی اور یہیں
اس خاتون کے بطن سے حضورؐ کے دادا عبدالمطلب تقریباً
۴۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ اس سفر میں ہاشم جب غزہ پہنچا
تو بیمار ہو گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس طرح عبدالمطلب
جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک اپنی ماں کے پاس مدینے ہی
میں رہے۔ ہاشم نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کے

بعد اُس کا بھائی مُطّلب اُس کی جگہ سقایہ اور رفادہ کا متولی ہوگا اور وہی اس کے اہل و عیال اور اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرے گا۔ اُس وقت سے بنی ہاشم اور بنی المطلب یک جان و دو قالب ہو گئے اور آخر تک رہے۔ اس کے برعکس بنی عبدِ شمس (جن میں سے بنی اُمیّہ تھے) اور بنی نوفل ایک دوسرے کے حلیف بنے اور بعد تک رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت میں جب قریش کے سب قبیلوں نے آپ کا مقاطعہ کیا اور شعبِ ابی طالب میں آپ کو محصور کر لیا تو بنی ہاشم کے ساتھ بنی المطلب بھی اس محصوری میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے، بخلاف اس کے بنی نوفل اور بنی عبدِ شمس نے مخالفین کا ساتھ دیا۔

عبد المطلب (جن کا اصل نام شَیبہ تھا اور اپنی خوبیوں کے باعث شَیبۃ الحمد بھی کہلاتے تھے) مدینہ میں پرورش پا رہے تھے کہ ایک مرتبہ ثابت بن منذر (جو حضرت حسّان رضی بن ثابت کا باپ تھا) مکے گیا اور مُطّلب سے ملا جن کے ساتھ اس کا پہلے سے میل جول تھا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کہا کہ تم کہیں اپنے بھتیجے شَیبہ کو دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ بڑا شاندار، پُر ہیبت اور خوب رو جوان اٹھا ہے۔ یہ حالات سُن کر مُطّلب بے تاب ہو گیا اور جا کر بھتیجے کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر لے آیا۔ قریش کے لوگوں نے اس نوجوان لڑکے کو مُطّلب کے ساتھ آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ عبد المطلب ہے، مطّلب نے لوگوں کو ڈانٹا بھی کہ یہ میرے بھائی ہاشم کا لڑکا شَیبہ ہے، میرا غلام نہیں ہے مگر "عبد المطلب" کا نام کچھ ایسا مشہور ہوا کہ اصلی نام اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کچھ مدت کے بعد مُطّلب ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں یمن گیا اور وہیں مر گیا۔ عبد المطلب اُس کے جانشین ہوئے اور سقایہ و رفادہ کے دونوں منصب اُن کو مل گئے۔ ابنِ سعد اُن کی تعریف میں لکھتا ہے کہ "وہ قریش میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ تنومند، سب سے زیادہ سنجیدہ و بردبار، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ اُن برائیوں سے دور تھے جو مردوں کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں"۔ ابنِ ہشام کا قول ہے کہ "ان کو اپنی قوم میں عزت و شرف کا وہ مرتبہ حاصل ہوا جس تک ان کے آبا میں سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ ان کی قوم ان سے محبت کرتی تھی اور لوگوں میں وہ بڑی منزلت رکھتے تھے۔"

طبری نے لکھا ہے کہ عبد المطلب کے چچا نوفل نے ہاشم کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں سے ایک حصہ غصب کر لیا تھا۔ عبد المطلب نے پہلے اپنی ددھیال والوں سے مدد مانگی مگر انھوں نے چچا اور بھتیجے کے جھگڑے میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔ پھر عبد المطلب نے اپنی ننھیال (مدینے کے بنی عدی بن نجار) کو مدد کے لئے۔ اس پر ان کا ماموں ۸۰ آدمی لے کر مکہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی نوفل سے اپنے بھانجے کا حق دلوایا۔ اس کے نوفل بھی بنی ہاشم کے خلاف بنی عبدِ شمس سے مل گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت تک بنی نوفل اُسی جتھے میں شامل رہے جو بنی ہاشم کا مخالف اور بنی عبدِ شمس کا حامی تھا۔ عبد المطلب نے جب یہ دیکھا کہ بنی نوفل انکے مخالف جتھے سے جا ملے ہیں تو انھوں نے خزاعہ کے سرداروں سے بات چیت کی اور ان کے ساتھ محالفت (اتحاد اور امداد باہمی) کا معاہدہ کر لیا اور کعبہ میں جا کر انھوں نے باقاعدہ معاہدہ کی تحریر لکھی۔ ابن سعد کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بنی خزاعہ نے عبد المطلب سے خود درخواست کر کے باہمی دوستی و معاونت کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے میں بنی المطلب اور بنی ہاشم دونوں خاندان شریک ہوئے اور بنی عبدِ شمس اور بنی نوفل اس سے الگ رہے۔ یہ معاہدہ دار الندوہ میں لکھا گیا اور کعبے میں آویزاں کر دیا گیا۔ اس کے مطابق عبد المطلب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ بنی خزاعہ کے ساتھ ہمیشہ دوستی نباہنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب شرائطِ معاہدہ میں سے ایک شرط یہ طے

کہ قبائلِ عرب جانتے ہیں جو جا ہے فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک ہو جائے تو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

عبدالمطلب کا زمزم کو از سرِ نو برآمد کرنا

یہ فخر بھی جناب عبدالمطلب کو حاصل ہوا کہ زمزم جسے جرہم بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں از سرِ نو برآمد ہوا۔ ابن اسحاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ خواب میں جناب عبدالمطلب کو زمزم کا مقام بتایا گیا اور انھیں ہدایت کی گئی کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس کنواں برآمد کر لیں۔ اس وقت ان کا کوئی بیٹا حارث کے سوا نہ تھا۔ اسی کو لے کر وہ کدال پھاوڑا لئے ہوئے وہاں پہنچے اور کھدائی شروع کر دی۔ جب پانی نمودار ہوا تو عبدالمطلب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس سے قریش کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمزم نکل آیا ہے۔ وہ سب اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ "اے عبدالمطلب یہ تو ہمارے باپ اسماعیل کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے۔ ہمیں اس میں اپنے ساتھ شریک کرو۔" انھوں نے جواب دیا "میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خاص طور پر مجھے دیا گیا ہے تم میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔" وہ جھگڑے پر آمادہ ہو گئے عبدالمطلب نے کہا "اچھا تو کسی کو حکم بنا لو۔" انھوں نے بنی سعد بن ہذیم کی کاہنہ کا نام تجویز کیا جو شام کے بالائی علاقوں میں رہتی تھی۔ عبدالمطلب نے یہ بات مان لی اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر وہ بنی امیہ اور قبائلِ قریش میں سے ہر قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک بے آب و گیاہ بیابان آیا جہاں عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔ انھوں نے اپنے ہم سفر دوسرے اہلِ قریش سے پانی مانگا۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہاں پانی کا دور دور کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ ہم اگر اپنے پانی میں تمھیں شریک کریں تو ہم بھی اسی ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں گے جس کا تمھیں خطرہ ہے۔ آخر کار عبدالمطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابھی ہمارے ہاتھ پاؤں میں کچھ جان ہے۔ آؤ ہم میں سے ہر ایک اپنے لئے ایک گڑھا کھود دے اور جو جو مرتا جائے اس کو اسی گڑھے میں دفن کیا جاتا رہے۔ چنانچہ ہر ایک نے گڑھا کھود لیا اور سب موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ پھر عبدالمطلب نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نے اپنے آپ کو یونہی موت کے حوالے کر دیا۔ آؤ ہمت کر کے چلیں، شاید کہیں ہمیں پانی مل جائے۔ یہ کہہ کر سب کوچ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب عبدالمطلب نے اپنے اونٹ کو اٹھایا اور اس کا پاؤں زمین پر پڑا تو یکایک اس کے نیچے سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ اس پر عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اتر کر خوب پانی پیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لئے۔ پھر عبدالمطلب نے ان دوسرے اہلِ قریش کو، جنھوں نے پانی دینے سے انکار کیا تھا، پکارا اور کہا آؤ، اللہ نے ہمیں پانی دے دیا ہے تم بھی پیو اور پانی بھر لو۔ چنانچہ وہ آئے سب پانی سے سیراب ہوئے اور پھر کہا کہ "اے عبدالمطلب، خدا ہی نے ہمارے خلاف تمھارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ خدا کی قسم اب ہم زمزم کے معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں گے۔ جس خدا نے تمھیں اس بیابان میں پانی دیا ہے اسی خدا نے زمزم بھی تمھیں عطا کیا ہے۔ اب اپنے پانی کی طرف بخیر و خوبی واپس چلو۔" اس طرح سب اس کاہنہ کے پاس جانے کے بجائے مکے واپس ہو گئے۔

یہ سقایہ کا منصب جس میں اب سب سے اہم زمزم کی سقایت تھی، زندگی بھر عبدالمطلب کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ ان کے بیٹے ابوطالب کو ملا۔ مگر ابوطالب اپنی فیاضی کے باعث اپنی مالی استطاعت سے بہت بڑھ کر حاجیوں کو پانی، شربت، دودھ وغیرہ پلانے میں خرچ کرنے لگے جس کی وجہ سے انھیں کئی مرتبہ اپنے بھائی عباس سے قرض لینا پڑا اور اسے ادا نہ کر سکے۔ آخر کار حضرت عباس نے شرط لگائی کہ اب اگر آپ ادا نہ کر سکیں گے تو سقایت کا منصب

آپ کو میرے لئے چھوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سقایت حضرت عباس رضؓ کو مل گئی۔ یہ زمانۂ قبل اسلام کی بات ہے زمانۂ اسلام میں بھی یہ منصب بنی عباس ہی میں رہا۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ زمزم کی کھدائی کے وقت جب عبدالمطلب نے دیکھا کہ ان کے ساتھ صرف ان کا ایک بیٹا ہے اور قریش سارے گھیر کر آگئے ہیں تو انھوں نے نذر مانی کہ اللہ مجھے دس بیٹے عطا کرے جو میری حمایت کے لئے کھڑے ہو سکیں تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے پاس اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا پوری کی اور دس بیٹے ان کو دیئے اور وہ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ آخر کار ایک روز عبدالمطلب نے سب کو جمع کیا اور اپنی نذر کا اُن سے ذکر کیا۔ سب نے کہا اللہ سے جو نذر آپ نے مانی ہے اسے پورا کیجئے۔ اس پر عبدالمطلب سب بیٹوں کو لے کر کعبہ میں ہُبل نامی بُت کے پاس گئے جہاں فال نکالی جاتی تھی اور فال اس بات کے لئے نکلوائی کہ ان دس میں سے کس بیٹے کو قربان کریں۔ اس میں نام جناب عبداللہ کا نکلا جو عبدالمطلب کے سب سے خوبصورت اور باپ کو سب سے زیادہ پیارے بیٹے تھے۔ عبدالمطلب بلا تکلف عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اور چھری لے کر اساف و نائلہ کی طرف لے چلے تاکہ وہاں ان کو ذبح کر دیں۔ قریش کے لوگ یہ دیکھ کر اپنی اپنی مجلسوں سے دوڑ پڑے اور کہنے لگے "عبدالمطلب یہ کیا کرتے ہو؟ اگر تم نے ایسا کیا تو آئے دن کوئی نہ کوئی اپنے بیٹے کو لا کر ذبح کرنے لگے گا۔ چلو، حجاز کی فلاں عرّافہ (سیانی) کے پاس چلو اور وہ جو کہے وہی کرو۔ ممکن ہے کہ وہ اس مشکل کا کوئی حل بتا دے۔" اس تجویز کے مطابق یہ لوگ مدینے پہنچے اور وہاں معلوم ہوا کہ وہ عرّافہ خیبر میں ہے۔ وہاں جا کر اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا تمھارے یہاں آدمی کی دیت کیا ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا دس اونٹ۔ وہ بولی واپس جاؤ اور اب فال اس بات پر نکالو عبداللہ کو قربان کیا جائے یا دس اونٹوں کو؟ اگر پھر لڑکے کے نام کی فال نکلے تو دس اونٹ اور بڑھاؤ اور پھر فال نکالو۔ اس طرح دس دس اونٹ بڑھا بڑھا کر فال نکالتے چلے جاؤ۔ جب اونٹوں پر فال نکل آئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمھارا رب بیٹے کے بجائے اتنے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔ عرّافہ کی یہ بات قبول کر کے سب لوگ پلٹے اور فال نکالنی شروع کی۔ ۱۰-۲۰-۳۰ حتی کہ ۹۰ تک فال عبداللہ ہی کے نام کی نکلتی رہی۔ آخر ۱۰۰ اونٹ پر پہنچ کر فال اونٹوں پر نکلی۔ چنانچہ ۱۰۰ اونٹ ذبح کئے گئے اور لوگوں کو اذنِ عام دے دیا گیا کہ جو جتنا گوشت چاہے لے لے۔

اس طرح ایک مرتبہ پھر آلِ ابراہیمؑ میں قربانی کا وہ واقعہ دہرایا گیا جو مکّہ میں اس مبارک خاندان کی آبادی کے آغاز کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اگرچہ روح اور معنی کے اعتبار سے دونوں واقعات میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کارخانے کی حکمتیں عجیب ہیں۔ پہلے اس خاندان کے اُس فردِ اوّل کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی تھی جسے عرب میں دینِ اسلام کی دعوت کا آغاز کرنا تھا۔ اب اُس آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی جسے تمام عالمِ انسانی میں اُسی دعوت کو پھیلانا تھا پہلی قربانی کا فدیہ ایک مینڈھا تھا اور دوسری کا فدیہ ۱۰۰ اونٹ۔

جناب عبداللہ کی شادی

جناب عبداللہ ۲۵ سال کے تھے جب ان کے والد نے ان کی شادی بنی زہرہ بن کلاب کی ایک خاتون آمنہ بنت وہب بن عبدِ مناف سے کر دی، جو اپنی قوم کی بہترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ چند مہینے کی ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد جب کہ بی بی آمنہ حاملہ تھیں، وہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ فلسطین کے شہر غزہ گئے۔ وہاں سے پلٹ کر جب مدینہ پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ ساتھیوں سے کہا کہ تم مکہ واپس جاؤ اور میں اپنی دادی کے خاندان بنی عدی بن نجار میں ٹھیرتا ہوں۔ ایک مہینہ وہاں ٹھیرے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور دارالنابغہ میں دفن کر دیئے گئے۔ ساتھیوں نے مکہ پہنچ کر

جب عبدالمطلب کو ان کی بیماری کا حال سنایا تو انھوں نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینے بھیجا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

یہ صحیح ترین روایت ہے جسے عموماً اہلِ علم نے تسلیم کیا ہے۔ ورنہ کسی روایت میں یہ ہے کہ ان کا انتقال اُسوقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸ مہینے کے تھے۔ کسی میں سات مہینے اور کسی میں دو مہینے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن معتبر اور مسلم یہی ہے کہ حضورؐ ابھی بطنِ مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اِسی چیز کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۔ اے نبی! کیا ہم نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟

(اضافہ از مؤلف)

عالم عربی کا المیہ

قرآن حکیم کے مطالعہ اور قانونِ فطرت کی روشنی میں تحلیلی تجزیہ جائزہ اور محاسبہ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے گوہر بار قلم سے۔ قیمت —— چار روپے

رویت ہلال کا مسئلہ

پچاس سے زیادہ کتبِ حدیثِ رسولؐ، حدیث، شرح و تفسیر، فقہ و اصول فقہ اور فتاویٰ کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ۔

قیمت —— چار روپے

بنیادی قرآنی تعلیم

بچوں سے لیکر بڑوں تک اور عورتوں کے لئے بھی نہایت مفید کتاب۔ قرآنی تعلیم زینہ بہ زینہ۔ ہر مسلمان گھر کیلئے تحفہ۔ قیمت —— پانچ روپے ۵/-

میں گواہی دیتا ہوں

روس کے جبری محنت کیمپوں اور قید خانوں کی حیرتناک اور لرزہ خیز داستان ایک ایسے ادیب کے قلم سے جو خود ایک قیدی کی حیثیت سے مدت تک اس پر اسرار اور ظالمانہ جکڑ بند کا شکار رہا۔ (۵۲۰) صفحات۔ قیمت چار روپے ۴/-

چین میں اسلام کا ماضی اور حال

یہ کتاب آپ کی معلومات میں فکرانگیز اضافہ کرے گی۔ قیمت چالیس پیسے ۴۰/-

سوویٹ سفارت خانے میں

برما میں متعین ایک روسی ڈپلومیٹ کے تجربات۔ دستاویزی اور واقعاتی حقائق سے لبریز

قیمت —— دو روپے ۲/-

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل ہر سہ حصہ

مولانا علی میاں ندوی کی وہ تالیف جسے تمام دنیائے اسلام میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے ان اسلاف کے کارناموں سے روشناس کراتی ہے جو اپنے انداز میں دین کی خدمت کا خوب خوب حق ادا کر گئے ہیں۔ قیمت مکمل و مجلد چوبیس روپے ۲۴/-۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور انکی فقہ

اردو زبان میں پہلی بار ایک جامع اور عمدہ کتاب جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ پر لکھی گئی۔ سوانح اور حالات۔ قیمت غیر مجلد آٹھ روپے ۷۵ پیسے۔

مسند امام اعظمؒ

یہ کتاب آپ کو بتلائے گی کہ فقہ حنفی اور احادیث رسولؐ میں کتنا گہرا اور بنیادی ربط ہے۔ ۵۲۲ احادیث کا ذخیرہ فقہی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے جس سے ہر خاص و عام کو مطلوبہ مسئلے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا عبدالرشید نعمانی کا لاجواب مقدمہ بھی ہے اور قاری احمد کے قلم سے امام ابوحنیفہ کے حالات بھی۔ ایک کالم میں عربی مع اعراب اور دوسرے کالم میں اردو ترجمہ۔ قیمت مجلد سولہ روپے ۱۶/-۔

سو بڑے آدمی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے سو بڑے آدمیوں کا مختصر تعارف کراتی ہے۔ دلچسپ اور معلومات سے پُر۔

قیمت —— چھ روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

ادب و تنقید

مجیب الرحمٰن۔ (آرہ)
عامر عثمانی

تبصرہ

واجب الاحترام جناب عامر عثمانی صاحب زید مجدہٗ
سلام و عقیدت

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

آپ یقین فرمایئے میں عرصہ سے آپ کی ژرف بینی و وسعت علمی کا قائل ہوں اور آپ کی صدق بینی و صاف گوئی کا معترف۔ ادھر مسئلہ طلاق پر آپ نے جس محققانہ اور عالمانہ انداز سے مبسوط بحث کی ہے اور جو مدلل محاکمہ فرمایا ہے وہ انشاء اللہ تاریخ میں آپ کی سعیٔ جمیل کے طور پر محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے آمین!

تجلی بابت نومبر ۸۱ء میں "کھرے کھوٹے" کے عنوان سے پروفیسر حفیظ بنارسی کے مجموعۂ کلام "بادۂ عرفان" پر آپ کا تبصرہ نظر سے گذرا۔ مجھے اس تبصرے میں کچھ باتیں محلِ نظر معلوم ہوئیں اور مجھے ان سے اختلاف ہے۔ آپ عالی ظرف ہیں اور مبنی برحقائق باتوں کو خواہ وہ آپ کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، خندہ پیشانی سے شائع کرتے رہے ہیں، لہٰذا اس امید قوی پر اپنے معروضات پیش کر رہا ہوں کہ آپ انھیں بھی تجلی کے صفحات میں جگہ دیں گے۔

میرے ناقص خیال میں اگر کسی قاری نے اس تبصرے سے غلط اثرات لیئے ہوں تو دور ہو جائیں گے۔

ادب میں تبصرہ نویسی اور تنقید نگاری کے دو الگ شعبے ہیں، ہر چند کہ تبصرہ میں تنقید کا عنصر بھی موجود رہتا ہے مگر تبصرے کی حدیں تنقید کے ساتھ ساتھ تعریف و تعارف اور مصنف سے جذبۂ ہمدردی کے اظہار سے آگے نہیں جاتیں۔ میرا خیال ہے آپ کی صاف گوئی اور مزاج کا کھرا پن ادبی پیرایۂ بیان کی نزاکتوں کو برداشت نہیں کرتا۔

تجلی

تمہیداً جو توصیف و تحسین آنجناب نے اس ناکارہ کی فرمائی اس کے لیے شکرگذار ہوں اور شرمندہ بھی۔ شرمندہ اس لئے کہ آنم کہ من دانم تحقیق، ژرف نگاہی اور علم بڑی چیزیں ہیں میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اہل علم کے دسترخوان سے ریزے چننے والا اور ارباب دانش کی جلائی ہوئی شمعوں کی روشنی میں آگے بڑھنے والا۔ البتہ یہ درست ہے کہ صاف گوئی اور حق و صداقت

میری فطرت بھی ہے اور معمول بھی۔ اس نعمت کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

تبصرے اور تنقید میں اصولاً کیا فرق ہوتا ہے اس کے لیے کسی استاد فن کی تحریر و تقریر کا آپ حوالہ دیتے تو میں ضرور اسے تلاش کر کے پڑھتا لیکن آپ کے اپنے اس خیال سے میں متفق نہیں ہوں کہ تبصرہ نگار کو صرف تعریف و تعارف اور جذبۂ ہمدردی کے اظہار سے آگے نہیں جانا چاہیئے۔ میرے نزدیک تبصرہ نگار کا دیانتدارانہ فرض یہ ہے کہ عیب و ہنر دونوں بیان کرے۔ تبصرے کو اشتہار نہ بنائے نتیجے میں کتاب کی تحسین غالب رہتی ہے یا تنقیص اس کی پروا اسے نہ کرنی چاہیئے۔ آپ دراصل ان عام تبصروں سے مانوس ہیں جو عموماً دوسرے جریدوں میں نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ تفصیل و تنقیح نہیں ہوتی جو تجلی کے تبصروں میں ہوتی ہے۔ ان کا حال اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ تبصرہ نگاروں نے کتاب کے ورق الٹے جستہ جستہ کہیں کہیں سے دیکھا اور ایک مجمل و مبہم سا تبصرہ لکھ ڈالا جو بارہا مغالطہ انگیز اور گمراہ کن ہوتا ہے۔

ناچیز کے پیش نظر مصنف کے علاوہ ہزاروں قارئین کی بھی خیر خواہی ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کتاب کے عیوب کو چھپا کر میں ان بے شمار قارئین کو اندھیرے میں رکھوں جو میرے اعتماد پر کتاب خرید سکتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ اکیلے مصنف کی ہمدردی میں ہزاروں دوسرے بھائیوں کی بدخواہی کی جائے۔ میں وقت نکال کر کتاب کو پورا پڑھتا ہوں اور دوران مطالعہ جو عیوب و محاسن دائرۂ ادراک میں آتے ہیں انھیں ایمانداری سے حوالۂ قلم کر دیتا ہوں۔ یہ تو ممکن ہے اور واقع بھی ہے کہ مجھ سے نااہلی کے باعث کسی عیب یا حسن کی تشخیص میں غلطی ہو جائے۔ مگر اس امکان خطا کے ڈر سے میں اپنے ضمیر کا خون نہیں کر سکتا۔ میرے لیے تبصرے کی یہ تخصیص ناقابل قبول ہے کہ گفتگو بس تحسین و تعریف ہی کے دائرے میں محدود رہے، عیوب بیان نہ ہوں۔

آن جناب نے اگر مجھ پر اعتراضات وارد کرنے کے عوض یہ طالبعلمانہ روش اختیار کی ہوتی کہ فلاں بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یا فلاں بات میری سمجھ میں اس طرح آئی ہے تو میں بڑے مشفقانہ انداز میں آپ کی تشفی کرتا لیکن آپ نے تو دفعتاً استاد اور جج کی پوزیشن اختیار کر لی ہے جو خود کو متعلقہ مسائل پر حاوی تصور کرتے ہوئے بلاتکلف فیصلے اور نصیحتیں صادر کرتا چلا جاتا ہے۔ جب یہ بات ہے تو مجبوراً مجھے بھی آپ کے اعتراضات کا تجزیہ اسی انداز میں کرنا ہوگا کہ آپ کی خوش فہمی دور ہو اور آپ محسوس کر لیں کہ واجبی علم اور مناسب تفقہ کے بغیر جب زبان کھول جاتی ہے تو آدمی لغویت ہی پھیلاتا ہے اور اپنا بھرم خود کھو دیتا ہے۔ بقول سعدی علیہ الرحمہ:-

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کو اپنی سوجھ بوجھ پر اتنا بھروسہ ہے کہ مراسلہ کی اشاعت بھی چاہ رہے ہیں۔ سر آنکھوں پر۔ اب یہ گلہ آپ نہ کر سکیں گے کہ تجلی کے نالائق ایڈیٹر نے خواہ مخواہ آپ کو رسوا کیا۔ بجائے خواہش اشاعت کے اگر جوابی لفافہ بھیج کر آپ تشفی چاہتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا

مکتوب نگار

آمدم بر سر مطلب، کیا سپاٹ اشعار غالب جیسے بڑے شعراء کے یہاں بھی نہیں ملتے اور اکثر اشعار سے نو مشقی کا تاثر نہیں پیدا ہوتا؟ حفیظ صاحب کے اس مصرعہ

"اس قدر ہم سب پہ ہیں احسان رب العٰلمین"

سے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ "احسان بصیغۂ واحد کہا تھا تو "ہے" نظم کرنا چاہیئے تھا، "ہیں" جمع کا متقاضی ہے۔ یعنی احسانات۔"

یہاں پر میں عروض و قواعد کی ادق بحث میں نہیں جانا چاہتا اور نہ اس کا اہل ہوں، تاہم چند اشعار اساتذہ کے ضرور پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ آں جناب ان کے متعلق کیا فرمائیں گے جن کی حیثیت مسلم ہے

آتش ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مومن ؎

ترجمان التماس شوق ہے تغیر رنگ
جوں زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

صیغۂ واحد و جمع کے مختلف استعمال ملاحظہ ہوں:-

آتش ؎

حرص و ہوا الہٰی نہ دل میں مرے رہے
تیرے مقام خاص سے کر جائیں عام کوچ

آتش ؎

معرفت میں تیری ذات پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

میں سمجھتا ہوں یہی شاعری کی زبان ہے اور شاعر اس سے خوب واقف ہے۔

تجلّی

اگر سپاٹ اشعار غالبؔ و مومنؔ جیسے بڑے شعراء کے یہاں بھی ملتے ہیں تو کیا اب کسی تبصرہ نگار کو سپاٹ شعروں کی طرف انگلی ہی نہیں اٹھانی چاہیئے؟ یہ تو عجیب منطق ہوئی۔

محترم بھائی۔ میرے نزدیک تو مصنف کی اصلی ہمدردی اور بہی خواہی یہی ہے کہ غلط سلط واہ واہ کے بجائے اسے صحیح مشورے دیئے جائیں اور کھول کر بتایا جائے کہ کن کن خامیوں پر خصوصی توجہ دے کر اسے کمالِ فن کی تحصیل کرنی ہے۔ غالبؔ و مومنؔ میرے عہد میں زندہ ہوتے اور ان کے مجموعے میرے پاس تبصرے کو آتے تو بلا شبہ میں ان پر بھی اسی انداز میں تبصرہ کرتا۔ کسی شاعر و ادیب کا بڑا ہونا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اس کی کوتاہیاں کمال بن گئیں۔

رہی واحد و جمع کی بحث۔ تو میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اصول و قواعد کے رُخ سے کہا ہے۔ اس بحث کو اَدَق کہکر آپ نے دامن چھڑا لیا حالانکہ دقت و غموض اور پیچیدگی تو اس میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اسم اگر واحد ہے تو حرفِ رابطہ یا فعل کو بھی واحد ہی ہونا چاہیئے اور جمع ہے تو جمع۔ اس میں جو مستثنیات ہیں وہ بھی اہلِ زبان و لغت کی نظروں میں ہیں۔ آپ اگر یوں کہیں:۔

"زید کا مجھ پر بہت احسان ہیں!"

یا ـــــ "زید کے مجھ پر بہت احسانات ہے!"

تو بہرصورت اس پر اعتراض واقع ہوگا چاہے آپ کتنی ہی تاویلیں کیئے جائیں۔ جو شعری نظائر آپ نے دیئے ہیں ان کے بارے میں سنیئے:۔

پہلی اصولی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی شاعر خواہ کتنا ہی شہرت یافتہ اور بلند پایہ ہو خطاؤں سے بالاتر نہیں ہوا کرتا۔ نہ یہ گمان کرنا درست ہے کہ اس کے یہاں جو خامی پائی جائے اسے بھی اس لیئے حسن شمار کر لو کہ وہ بڑا شاعر ہے۔ نیز یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھیئے کہ بڑا شاعر اچانک ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مدتوں کی مشق کے بعد رفتہ رفتہ درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے دورِ ابتدائی یا دورِ وسطیٰ کے اشعار میں خامیاں بھی ہوں گی۔ یہ اشعار دیوانوں اور مجموعوں میں قیدِ تاریخ کے ساتھ تو نہیں چھپتے کہ تمام ہی اشعار کو اس کے بڑے پن کا نمائندہ سمجھ لیا جائے۔

اس اصولی نکتے کے بعد اپنے نظائر کی طرف آیئے۔

(۱) آتشؔ کے اس شعر میں لفظ ہزار ہا نے جمع کا تقاضا پورا کر دیا لہٰذا شجر کا واحد ہونا قابلِ اعتراض نہ رہا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یوں کہا جائے۔

"وہاں ہزار ہا آدمی جمع تھا"

یہ جملہ محاورۃً اس لیئے درست ہے کہ ہزار ہا نے جمع کا اقتضاء پورا کر دیا لہٰذا ضروری نہیں کہ "تھے" کہا جائے۔ "تھا" بھی صحیح ہوگیا۔ تھا اور ہے عربی قاعدے سے افعالِ ناقصہ ہیں جو کبھی کبھی افعالِ تامہ کا بھی فائدہ دیتے ہیں۔ زیر بحث مصرعہ میں "ہیں" جمع کا طالب تھا۔ احسان واحد لایا گیا حالانکہ یہاں جمع کا اقتضاء پورا کرنے والا کوئی اور لفظ موجود نہیں۔

(۲) یہ نظیر درست نہیں۔ آپ نے اُردو اور فارسی کا فرق نظر انداز کر دیا۔ اردو میں بہتیرے الفاظ جمع کے محل میں بھی واحد ہی استعمال ہوتے ہیں جیسے:۔

ظالم نے کتنے دل توڑ دیئے۔
فلاں کے تو بے شمار عاشق ہیں۔
وہاں ہر طرف پہاڑ نظر آئے۔

دل، عاشق، پہاڑ۔ یہ سب اپنی لفظی شکل میں واحد ہی ہیں مگر یہاں مقامِ جمع میں استعمال ہو رہے ہیں۔ مومنؔ کے متذکرہ شعر میں لفظ "عاشق" اردو روزمرہ کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے لہٰذا واحد ہو کر بھی جمع کے معنی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن جس شعر پر میرا اعتراض ہے اس میں احسان کی اضافت

دیا۔ الطلبین کی طرف فارسی قاعدے سے کی گئی ہے۔ لہٰذا فارسی قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے واحد اور جمع کے فرق کا لحاظ کرنا معیارِ ادب کا تقاضا ہوگا۔ یوں بات تو دیہاتیوں کی بھی سمجھ ہی لی جاتی ہے۔ ناچیز نے اپنے تبصرے میں جمع اور واحد کی مطابقت کا مشورہ پیش کیا تھا۔ مزید لے دے نہیں کی تھی مگر شاباش ہے آپ کی ذکاوت حس کو کہ یہی گراں گذرا اور اعتراض کی محفل سجادی۔

(۳) تیسری نظیر کے طور پر آتش کا جو شعر آپ نے پیش کیا یہ کیونکر آپ کے دعوے کی شہادت ہے یہ مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ شعر عیب دار ہے۔ اناڑی پن کا مظہر ہے۔ پہلا مصرعہ بڑا سست ہے۔ دوسرا ژولیدہ۔ آتش یا فلاں اور فلاں کے نام سے آپ مرعوب ہوں تو ہوں بندہ بزبانِ غالب ع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

آتش یا انیس و دبیر یا غالب و میر کسی کے بھی شعر کو وہی مقام دیا جائے گا جو قواعدِ فن اور ذوقِ سلیم تشخیص کرے گا۔ آپ نے اس شعر میں "حرص و ہوا" کے نیچے خط کھینچا ہے۔ معلوم نہیں اس سے آپ کا کیا منشاء ہے۔

(۴) اس شعر میں آپ نے "ہیں ہوش و حواس" کے نیچے خط کھینچا تو اس کا بھی منشاء مجھ پر نہیں کھلا۔ ہوش و حواس دو چیزیں ہیں۔ اردو میں تثنیہ اور جمع دونوں کے لیے "ہیں" استعمال ہوتا ہے لہٰذا یہاں "ہیں" کا استعمال عام قاعدے کے مطابق ہی ہے۔ آپ اسے "واحد و جمع کے مختلف استعمال" کی مثال کیسے بنا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہاں آپ نے غیر ضروری طور پر اپنی سخن فہمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مکتوب نگار

اس مصرع

"عرش کی رونق فرش کی زینت صلی اللہ علیہ وسلم"

سے متعلق آپ نے خود لکھا ہے کہ "یہ مضمون بہتیرے شاعر باندھتے آئے ہیں" لہٰذا میں مثالیں نہ دوں گا۔ آپ فرماتے ہیں "اچھا ہوگا کہ یہ فاسد مبالغہ آرائیاں بریلوی مکتب فکر کے لیے چھوڑ دی جائیں" آپ کو یہ نہ لکھنا چاہیے تھا۔ کیونکہ مختلف مکاتبِ فکر ایک دوسرے کے خلاف بہت کچھ لکھ سکتے ہیں اور لکھتے رہے ہیں۔ بہرطور یہ نیش زنی بہ مقتضائے طبیعت ہی سہی

تجلّی

آپ تجلی کے خریدار ہیں۔ پھر بھی یہ سامنے کی بات آپ نے نظر انداز کردی کہ تجلی اصلاً مذہبی جریدہ ہے۔ اس میں شعر و ادب کا جو بھی عنصر ہے ضمنی و ذیلی ہے۔ مقصدی مقام تبلیغ دین کو حاصل ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ تجلی کا تبصرہ نگار ایک مومن شاعر کی زبان سے ایمان سوز بات سنے اور ٹوکے بغیر گذر جائے۔

آپ مجھے سکوت کا درس اس دلیل سے دیتے ہیں کہ

"مختلف مکاتب فکر ایک دوسرے کے خلاف
بہت کچھ لکھ سکتے ہیں اور لکھتے رہے ہیں"

مگر یہ کیا دلیل ہوئی۔ اس دلیل سے تو ہر شخص کو اپنے عقائد و افکار کی تبلیغ ہی بند کردینی چاہیے۔ اور تعجب ہے کہ تجلی کے قاری ہوتے ہوئے بھی آپ یہ احساس نہ فرماسکے کہ میرے اعتراض کا تعلق کسی معمولی جزئیے اور فروعی مسئلہ سے نہیں ایک انتہائی اہم اور بنیادی صداقت سے ہے۔ بہتیرے شاعر اگر جہالت کی بنا پر ایک مہلک اور واہی عقیدہ دہراتے چلے آتے ہیں تو اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ اب ہر مومن شاعر اسے بشوق دہراتا رہے۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ یہ خدائے عزوجل کی ذاتِ گرامی کا معاملہ ہے۔ وہی مستویٔ عرش ہے۔ وہی زینتِ فرش ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی تعریف جو غلط سلط ہو خود حضورؐ کی ہدایت کے خلاف ہے۔ لہٰذا تجلی جیسے دینی پرچہ کے تبصرہ نگار کو بہرحال ایسی لغو و فاسد گل افشانیوں پر احتجاج کرنا ہی پڑے گا۔ آپ اگر باطل سے مصالحت و مفاہمت کا نام رواداری اور تحمل رکھتے ہیں تو آپ جانیں۔ مجھے خدا کے حضور اپنا حساب پیش کرنا ہے آپ کا نہیں۔ اور اس اعتراض کے درجِ ذیل جملے نے تو لطف ہی دے دیا۔

"یہ نیش زنی بہ مقتضائے طبیعت ہی سہی!"

یاد تو آپ کو بھی ہوگا۔ مشہور شعر ہے ؎

نیشِ کژدم نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

بچھو کا ڈنک مارنا کینے کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ تو
اس کی طبیعت کا جبلی اقتضاء ہے)

گویا تجلی کا نالائق تبصرہ نگار اور ایڈیٹر بچھو کی فطرت رکھتا ہے۔ اس ذرہ نوازی کا شکریہ مگر یہ بھی غور کریں کہ کیا یہ ذرہ نوازی اس حسن عقیدت سے مطابقت رکھتی ہے جس کا اظہار آپ نے تمہید میں فرمایا ہے۔

مکتوب نگار

اس مصرعہ میں

"واہ رے امانت واہ رے صداقت صلی اللہ علیہ وسلم"

آپ لکھتے ہیں "واہ کی ہا نہ صرف دب گئی بلکہ قتل ہو گئی" حیرت ہے حفیظ صاحب کے مذاقِ شعری نے یہ قتلِ ناحق کیسے گوارہ کیا"

خدا کا شکر ہے کہ آپ "مذاقِ شعری" کے وجود سے واقف ہیں اور ماشاء اللہ خود بھی شعر کہتے ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ جس ہا کے قتلِ مفروضہ پر آپ کو حیرت ہے وہ واقع ہی نہیں ہوا، اس لیے کہ واہ سے الف علت غائب ہوتی ہے نہ کہ ہا اور وہ باقی رہ جاتا ہے جو صحیح و جائز ہے۔ کیا فرمائیں گے آپ حضرت امیر خسرو کے ان اشعار میں اللہ کی ہا سے متعلق ؎

زدور نیست میسر نظر بروئے تو مارا
چہ دولتے ست تعالی اللہ از قدِ تو قبارا
ہر کہ شبے زندہ داشت ہمدم روح اللہ است
نان چہ ربائی ز خوانش چاشنیٔ جاں طلب

تجلی

آپ شاید سو رہے ہیں۔ "واہ" کا الف شروع یا آخر میں نہیں ہے جو حرف علت بنا کر گرا دیا جائے۔ ایک بھی مثال آپ نے ایسی نہیں دی جس میں درمیان سے کوئی حرف خواہ مخواہ قتل کر دیا گیا ہو۔ یہ محض دھینگا مشتی ہے جس کا مظاہرہ آپ فرما رہے ہیں۔

ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ آپ قمیص کی ایک آستین پوری رکھیں اور ایک صرف کہنی تک۔ پھر اسے پہن کر بازار میں چلے جائیں تو اگرچہ یہ فعل ناجائز تو کسی بھی قانون کی رُو سے نہیں مگر لوگ ضرور ہنسیں گے۔ اسی طرح آپ مغلئی پاجامے پر کوٹ زیب تن کر لیں، تو فعل ناجائز کے مرتکب اگرچہ نہیں ہوئے مگر کیا خندۂ استہزاء سے بھی بچ جائیں گے؟ حرف کا دبنا ایک عیب ہے۔ بعض حروف کے دبانے کو شعراء نے جائز تو بنا لیا ہے مگر یہ دبنا حسن نہیں عیب ہی شمار ہوگا۔ اچھے شعر کی تعریف یہ نہیں ہے کہ شاعر نے اس میں کوئی ناجائز حرکت نہ کی ہو بلکہ اچھا شعر اسے کہتے ہیں جو عیوب سے پاک ہونے کے علاوہ لفظی و معنوی محاسن اپنے اندر رکھتا ہو۔ کسی طرح اگر "واہ" کو "وَہ" پڑھنے کا جواز نکال ہی لیا جائے تو شعر کو شعر بے شک مان لیا جائے گا مگر یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک بھینگا اور چیچک رُو آدمی، آدمی تو بے شک ہوتا ہے مگر کیا حسین و جمیل بھی ہوتا ہے۔

امیر خسروؒ کے دونوں شعر آپ نے فضول نقل کیے۔ پھر امیر خسرو ہوں۔ عرفی و نظیری ہوں، غالب و مومن ہوں، عیب جس میں ہے عیب ہی کہلائے گا۔ خطا اور نقص کے لیے نقص و خطا ہی کو وجہ جواز بنانا نادانی کی بات ہے دانائی کی نہیں۔

مکتوب نگار

صلح و صفا ہو جنگ و جدل ہو خواہ وہ کوئی بزم عمل ہو
آپ نے کی ہے سب کی صدارت صلی اللہ علیہ وسلم حفیظ

میری گذارش ہے کہ بزم کے لیے صدارت کا لفظ رعایتاً بھی صحیح ہے۔ "قیادت" "صدارت" سے بہتر ہرگز نہ رہتا بلکہ غلط ہوتا۔ صلح و صفا اور جنگ و جدل کا استعمال یہاں غلط کس معنی میں ہے؟

شیخ فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں ؎

خواجۂ دنیا و دیں گنج وفا — صدر و بدر ہر دو عالم مصطفےٰ

عصر حاضر کے مشہور شاعر عبدالعزیز خالد لکھتے ہیں ؎

محمدؐ انجمن کن فکاں کا صدر نشیں۔ محمدؐ افسر آفاق و سرورِ عالم

تجلی

یہ بات آپ نے کچھ ڈھنگ کی کہی۔ میرا ذہن لفظ "جنگ و جدل" کی طرف منعطف ہو گیا تھا اور اسی بنا پر مجھے صدارت کے بجائے "قیادت" بہتر معلوم ہوا مگر آپ نے "بزم" کے لفظ کو

مرکز نظر بنایا اور بے شک اس کی نسبت سے "صدارت" موزوں ہے دراصل "جنگ وجدل" کو چونکہ "رزم" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور "رزم" کا استعمال "بزم" کے بالمقابل ہوتا ہے اس لیئے مجھے ذہنی مغالطہ لگا۔ آپ کی تصحیح قبول ہے۔ اگرچہ "صلح و وفا" پر میرا اعتراض اپنی جگہ قائم ہے۔

مکتوب نگار

"ساقیِ کوثر مالکِ جنت ......"

لکھنے کو آپ گناہِ کبیرہ فرماتے ہیں اور سَو بار استغفار پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو "انعمت علیکم نعمتی" فرمایا ہے۔ کیا جنت اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے، بہر حال یہ ایک اختلافی مسئلہ اور دشوار بحث ہے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر اقبال نے گھبرا کر کہا تھا ع

شعر مرا بہ مدرسہ کے برد

تجلی

خطا معاف! آپ کے اس اعتراض نے مجھے آپ کے اخلاص اور سنجیدگی سے بھی خاصا بدگمان کر دیا ہے۔ مخلص اور سنجیدہ آدمی دوسرے کی بات کو سمجھنے کی مناسب کوشش کرتا ہے پھر اسے کوئی بات غلط معلوم ہو تو اسے رَد کرنے کے لیئے ایسی دلیل دیتا ہے جو واقعی دلیل کہلا سکے۔ یہاں آپ نے نہ تو میری پوری بات پر توجہ فرمائی نہ اعتراض کرتے ہوئے یہ پروا کی کہ میں جس کتابِ الٰہی سے ایک فقرہ بطور آیت نقل کر رہا ہوں اسے کم سے کم کھول کر ہی دیکھ لوں۔ ذمہ دار اور سنجیدہ آدمی اٹکل پچو باتیں نہیں کرتا۔ پھر قرآن مجید کا معاملہ تو بہت ہی خاص ہے۔ یہ ہم سب مؤمنوں کے نزدیک خدا کا کلام ہے۔ اس کے سلسلہ میں بھی اگر ہم صد درجہ لاپرواہی اور خود رائی کا مظاہرہ کرنے لگیں تو اسے بھیانک المیہ کہیں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ مراسلہ میں دو جگہ آپ نے آیات نقل کی ہیں اور دونوں جگہ نہ صرف یہ کہ ان سے استدلال درست نہیں بلکہ الفاظ تک آپ نے غلط نقل کیئے ہیں۔ گویا قرآن نہیں کھولا بلکہ ذہن میں جو آیا بے تکلف لکھ ڈالا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے تقریباً سولہ سطروں میں شاعر کو ایک حقیقتِ ثابتہ قطعیہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ دین کی اصل معرفتِ باری تعالیٰ ہے حتیٰ کہ رسولوں کی اہمیت بھی اسی لیئے ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ کی ذات و صفات اور احکام و فرامین کا صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ اللہ ہر شے کا مالک ہے۔ اور آخری نبی سمیت تمام انبیاءؑ اس کے بندے ہیں۔ بندہ کوئی بھی ہو اللہ کا محتاج اور مملوک ہی ہوگا جنت اور دوزخ پر بھی اللہ ہی کو ملکیت تامہ حاصل ہے۔ کوئی ہستی ایسی نہیں جسے اللہ نے جنت اور دوزخ کا مالک بنا کر یہ اختیار دے دیا ہو کہ جسے چاہے جنت میں بھیجو اور جسے چاہے دوزخ میں ڈالو۔ انبیاء و صلحاء کی زیادہ سے زیادہ حیثیت یہ ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں خدا کی اجازت کے بعد کسی کی سفارش و شفاعت کر سکیں یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں کسی قسم کا حقِ ملکیت حاصل نہیں ہے ورنہ مالک تو اپنی چیز کو خود جسے چاہے دے سکتا ہے۔

یہ روشن اور بے غبار صراحت سامنے ہوتے ہوئے بھی آپ کا یہ فرمانا کہ یہ ایک اختلافی اور دشوار بحث ہے بڑی حیرت ناک بات ہے۔ یہ کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسلمان شاعر اپنے شعر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہے اور میں اس پر معترض ہوں تو آپ یوں فرمائیں کہ یہ تو ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ کروڑوں عیسائی حضرت عیسیٰ مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں لہٰذا تجھے اعتراض نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

جو لوگ یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ کے سوا بھی کوئی ہستی جنت کی مالک ہے وہ حقیقۃً مومن نہیں ہیں مشرک ہیں۔ ان کی اس خام خیالی سے توحید کا مسئلہ مؤمنین کے لیئے اختلافی نہیں بن جاتا۔ آپ نے کمال یہ کیا کہ بجائے سبق لینے کے الٹی وکالت اس خیالِ باطل کی شروع کر دی جو بلا ریب و شک باطل ہی باطل ہے۔

اور وکالت میں آپ نے سوچے سمجھے بغیر یہ الفاظ بطور آیت قرآنی نقل کر دیئے "انعمت علیکم نعمتی"۔ حالانکہ نہ یہ الفاظ قرآن میں کہیں آئے ہیں نہ ان کا مفہوم بیان کرنے میں آپ نے علم و عقل سے کام لیا نہ ان سے استدلال میں متانت کا لحاظ رکھا۔ قرآن مجید کی سورۂ مائدہ کھولیئے۔ اس کی تیسری آیت کا ٹکڑا یہ ہے:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین بایۂ تکمیل کو پہنچا دیا اور اپنا احسان تم پر پورا کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

ان قرآنی کلمات کا ایک حصہ کبھی پہلے کی تلاوت کے نتیجے میں آپ کی یادداشت میں موجود تھا اسی کو مراسلہ تحریر فرماتے وقت آپ نے یہ فکر کیے بغیر سپردِ قلم کر دیا کہ میری یادداشت کہیں غلطی تو نہیں کر رہی ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اتممتُ کے بجائے انعمتُ لکھا جانا سہوِ قلم ہے اور میں نے قرآن ہی سے آیت نقل کی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اگر قرآن آپ نے کھولا ہوتا تو یہ غلط فہمی آپ کو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے حبیبؐ کو خطاب فرمایا ہے۔ نہ وہ جہل قسم کا استدلال آپ اس سے کر سکتے تھے جو آپ کے مراسلے میں موجود ہے۔ آیت تو صاف کہہ رہی ہے کہ اللہ کا خطاب تمام ہی بندوں سے ہے اور نعمت اس میں اسلام کو فرمایا گیا ہے۔ یہاں اُس تُک بندی کی گنجائش ہی نہیں جو آں جناب نے کی۔ عربی سے آپ واقف ہوتے تو یوں بھی علیکم دیکھ کر سمجھ جاتے کہ خطاب تنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ بہت سے افراد سے ہے۔ صرف رسول اللہؐ سے ہوتا تو علیکَ کہا جاتا۔

پھر اپنے استدلال کی لغویت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن میں دسیوں جگہ اللہ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ ہی میں تین جگہ فرمایا۔

(۱) اے بنی اسرائیل ان احسانات (نعمتوں) کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے (آیت ۴۰)

(۲) یہی الفاظ جوں کے توں، ۴۷ ویں آیت میں دیکھ لیجیے

(۳) پھر یہی الفاظ ۱۲۲ ویں آیت میں ہیں

اور سورۂ مائدہ میں ہے۔

يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ۔ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ۔ میرے اس احسان کو یاد کرو جو تجھ پر اور تیری والدہ پر ہوا ہے۔

کیا کوئی آدمی ہوش و حواس کی حالت میں ان آیات سے یہ یہ مراد لے سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یا حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کو اللہ نے مالکِ جنت بنا دیا تھا۔ آپ روزانہ نماز میں یہ بالفاظِ قرآنی یہ دعا کرتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ. آپ کی منطق کی رُو سے تو اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی راہ پر چلا جنھیں تو جنت کا مالک بنا چکا۔

اک دم نامعقول باتیں۔ جنت بلاشبہ اللہ کی نعمتوں میں ایک زبردست نعمت ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نعمت عطا کیے جانے کا ذکر کرے وہاں اول تو بات اسی نعمت و احسان تک محدود ہوا کرتی ہے جس کا یا جن کا اشارہ قرآن کے سیاق و سباق سے مل رہا ہو۔ جیسے اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ والی آیت میں نعمت سے مراد اسلام ہے نہ کہ تندرستی اور رزق اور لباس اور باغ جنت وغیرہ۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی نعمتیں ہی ہیں مگر ان پر یہ آیت صادق نہیں آرہی ہے۔ دوسرے نعمت دیئے جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جسے نعمت دی گئی اسے مالک و مختار بنا دیا گیا۔ زندگی، صحت، ہدایت، اصابتِ فکر، جذباتِ نیک، یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں مگر جسے عطا ہوتی ہیں اسے یہ اختیار نہیں مل جاتا کہ جسے چاہے یہ نعمتیں منتقل کرتا رہے۔ اس میں اور نعمت میں مالک اور مملوک کی نسبت پیدا نہیں ہوتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "ساقیِ کوثر" کہنا بالکل صحیح ہے کیونکہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی نے حضورؐ کے سپرد کیا ہے لیکن مالکِ جنت کہنا بدترین قسم کا غلو ہے جس کی لغویت ہر وہ مؤمن محسوس کر سکتا ہے جس کی عقلِ سلیم فاسد نہ ہو گئی ہو۔ اقبال علیہ الرحمہ کو آپ نے بے کار اس بحث میں گھسیٹا۔ وہ باوجود عاشقِ رسولؐ ہونے کے کوتاہ فہم اور مبالغہ پسند نہیں تھے کہ حضورؐ کو خدا کے تخت پر بٹھانے کی جسارت کرتے۔

مکتوب نگار

اللہ کے نام پاک سے مشتق ہے اس کا نام
محمود ہے خدا تو محمد ہیں مصطفےٰ

اور یہاں پر مجھے مولانا جامیؒ یاد آ رہے ہیں ؎

سلامٌ علیک اے ز اسماء حسنیٰ ؛ جمالِ تو آئینۂ اسمِ اعظم

عبدالعزیز خالد نے بھی اپنے طویل نعتیہ قصیدہ منحمنّا میں لکھا ہے ؎

محمود و حامد و احمد محمد و محمود ⁂ کریم و میر کرام و مکرم و اکرم

پھر اک مخصوص مکتب فکر والوں پر آپ نے "احد بے میم والا مشرکانہ چکر" کہکر طنز فرمایا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

میم کہ در احد ست چوں بخرد بنگری
ہست بنقش احد خاتم پیغمبری

خسرو ہی نہیں "اسلام کے مایۂ ناز مفکر ڈاکٹر محمد اقبالؒ" جو "کوئی دقیانوسی مولوی نہ تھے" بلکہ "ان کا شمار دنیائے اسلام کے نہایت بلند پایہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد میں تھا" یوں فرماتے ہیں ؎

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار خود کو چھپا چھپا کر

کیا عجب اسلام کا یہ مایۂ ناز مفکر اقبال اس حدیثِ نبویؐ سے بخوبی آشنا رہا ہو۔

"اول ما خلق اللہ نوری والخلق کلھم من نوری وانا من نور اللہ"

تجلّی

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تصورِ توحید آپ کے قلب و روح میں نہیں اترا ہے بلکہ اس کی حیثیت محض ایک روایتی عقیدے کی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو توحید سوز خیالات سے بدکنے اور بدمزہ ہونے کے بجائے آپ ان پر فریفتہ نہ ہوتے۔ اس مقام پر بھی میں نے تبصرے میں گیارہ سطریں وضاحت کی خاطر سپردِ قلم کی تھیں۔ آپ نے ان سب سے آنکھیں بند کرلیں اور خواہ مخواہ بیت بازی شروع کردی۔ جامی، خالد، اور خسرو کے جو اشعار آپ نے پیش کیے ان میں آخر کہاں ہے کہ نامِ محمدؐ اللہ کے نام سے مشتق ہے اشتقاق ہی کے لفظ پر میرا سارا اعتراض تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ اللہ کے جو نام حدیث میں آتے ہیں ان میں "محمود" کوئی نام نہیں لیکن اگر معنیٰ کے لحاظ سے اس نام کو اللہ کا نام کہہ بھی دیں تو اس نام کو مصدر بنا کر حضورؐ کے نامِ پاک کو اس کا مشتق بنانا "جزئیت" کا اشتباہ پیدا کرتا ہے۔ وہی جزئیت جس کی ایک بدترین شکل نصرانیوں کے "ابن اللہ" والے عقیدے میں پائی جاتی ہے۔

اس تفصیل کو آپ نے نظر انداز کردیا اور بے سمجھے بوجھے وہ اشعار نقل کر ڈالے جن میں جزئیت اور اشتقاق کا کوئی مفسدہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ ملاحظہ فرمائیے خالد صاحب نے حضورؐ ہی کو احمد اور محمدؐ کے علاوہ محمود بھی کہا۔ گویا ان کے نزدیک "محمود" خدا کا نام نہیں حضورؐ ہی کا وصفی نام ہے۔ اللہ کے لیے تو حمید منقول ہے اور دیکھ لیجئے کہ خالد صاحب نے حضورؐ کو حمید نہیں کہا حالانکہ اگر کہنا چاہتے تو "محمود" کے عوض حمید رکھدینے سے مصرعہ جوں کا توں رہتا۔

امیر خسرو نے احمد کے میم سے جو شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے اس میں شرک کی کوئی پرچھائیں نہیں۔ ذرا بھی ایسا اشتباہ نہیں کہ وہ اس مشرکانہ طرزِ فکر کا شکار ہوگئے ہوں جو بعد میں چل پڑا ہے۔

ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ کسی بھی شاعر یا ادیب یا عالم کے کسی مرموز یا ذو معنی قول کی مراد اس کے دیگر خیالات و افکار کی روشنی میں طے کی جاتی ہے۔ آج جو لوگ "احد بے میم" کا لطیفہ پیدا کرتے ہیں ان میں عموماً وہ لوگ ہیں جو شرک و بدعقلی کی اس سطح تک آ پہنچے ہیں ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

ان کے ملفوظات و فرمودات میں عموماً اس طرح کی باتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
لا تطرونی کما أطرت النصاری عیسی ابن مریم۔
(مجھے بڑھاؤ چڑھاؤ مت، جیسے کہ نصرانیوں نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو بڑھایا چڑھایا)

ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے حاظر وناظر تھے، اللہ نے انھیں سارے کارخانۂ قدرت کا مالک بنا دیا تھا وغیر ذلک۔ ایسے لوگ جب "احمد بے میم" کا شوشہ چھوڑیں گے تو قدرتاً یہ مشرکانہ تصورات ہی پر مبنی ہوگا اور اس پر شدید نکیر کی جائے گی۔ لیکن جن لوگوں کے عام ملفوظات وفرمودات سے یہ ظاہر ہو جائے کہ حضور کے بارے میں وہ غلو اور افراط و تفریط میں مبتلا نہیں ہیں ان کی زبان پر جب احمد بے میم کی بات آئے گی تو اسے ایک شاعرانہ نکتہ کہکر صحیح محمل اور تاویلِ حَسَن کے معیار پر اتارا جائے گا۔

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ جہاں تک ہمیں علم ہے مشرکانہ عقائد کا شکار نہیں تھے لہٰذا ان کے شعر کی توجیہہ دوسرے انداز میں کی جائے گی لیکن اگر آپ یا کوئی اور یہ ثابت کردے کہ وہ احمد کی میم کو محض پردہ تصور کرکے ذاتِ رسول کو خدا سمجھ بیٹھے تھے تو ان پر بھی بلا ریب وشک الزام شرک عائد کیا جائے گا اور قرآن وحدیث کی محکم نصوص کے سامنے ان کے باطل تصور کی کوئی... اہمیت نہ ہوگی۔

اقبال علیہ الرحمہ کا جو شعر آپ نے پیش کیا وہ ان کے دورِ ابتدائی کا معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص بھی سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھتا ہو وہ کلام اقبال کے ترقی یافتہ اور پختہ رنگ سے اسے ہٹا ہوا محسوس کرے گا۔ شعراء اپنی پختگی سے قبل جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کی بعد والی شخصیت کا نمائندہ نہیں ہوا کرتا۔ مزید یہ کہ اقبال کی نظم ونثر دنیا کے سامنے ہے۔ اس میں دور دور تک ایسے افکار وخیالات کا پتہ نہیں جن سے شرک کی تراوش ہو اور جن میں خدا اور رسول کے درمیان جزئیت یا حلول کا عقیدۂ فاسد جھلکتا ہو۔ لہٰذا منقولہ شعر کے بھی وہ مشرکانہ معنی نہیں نکالے جائیں گے جو بدعتیوں پر چل گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض سطحی اور بے مغز باتیں اپنی ظاہری دلکشی کی بنا پر مقبولِ عام ہو جاتی ہیں پھر وہ لوگ بھی جو بعد میں بڑے بن گئے مشق وتمرین کے ابتدائی مراحل میں ان باتوں کو زبان پر لے آتے ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کی بے اصل بات اپنی ظاہری دلکشی اور ندرت کی بنا پر مقبولِ عام ہو گئی اور نہ جانے کتنے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اسے تقلیداً دہرا دیا۔ اسی طرح یہ "احمد بے میم" کا لطیفہ ہے۔ قرآن وحدیث کی رُو سے یہ کوئی چیز نہیں۔ ہاں قوتِ متخیلہ اور مزاجِ شعری کے لیے اس میں خاصی دلکشی ہے لہٰذا کسی نے میم کو پردے سے تشبیہ دی کسی نے میم کو زینہ بنایا اور یہ معنی پیدا کیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تک پہنچانے کا زینہ ہیں وغیرہ وغیرہ

ان تمام شاعرانہ نکتہ آفرینیوں کو واہ واہ سے نوازا جا سکتا ہے اگر مشرکانہ خیالات ان کی پشت پر نہ ہوں۔ چنانچہ اقبال نے منقولہ شعر میں غزل کی زبان میں جو کچھ کہا وہ محض روایتی انداز سے ہے محض خوشنما الفاظ کا گھروندا اور بس۔ ایسا شعر وہ اُس وقت نہیں کہہ سکتے تھے جب وہ حقیقۃً "مفکرِ اسلام" بن چکے تھے۔

اور مکرم دوست! اقبال کے سر ایک خانہ ساز حدیث کو مڑھ کر آپ نے ان کی روح پر بڑا ستم ڈھایا۔ آپ کی جسارت حیرت ناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی کہ علم الحدیث سے مکمل طور پر ناواقف ہوتے ہوئے بھی کس اطمینان اور قطعیت کے ساتھ کچھ فقرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ کاش آپ اتنی ہی احتیاط برت لیتے کہ حدیث کی کوئی معروف کتاب کھول کر دیکھ لیں کہ کہاں کیا الفاظ آئے ہیں۔ آپ کو معلوم تو ہوگا کہ ابتدا میں غلط کار لوگوں نے بے شمار روایات حدیث کے نام سے گھڑ لی تھیں اور ان کی اس شرارت میں کچھ سادہ لوح زہاد و واعظین بھی نیک نیتی سے شریک ہو گئے تھے تاکہ حدیث کے نام سے لوگوں کو نکوکاری پر ابھارا کریں۔ اس وقت اربابِ علم وتحقیق اُٹھے اور حدیث کی جانچ پرکھ کا فن وضع کیا۔ واہی روایات کو الگ پھینک کر صحیح روایات کے مجموعے مرتب کیے۔ اس معلوم صورتِ حال کا ادنیٰ تقاضہ کم سے کم یہ تو ہونا ہی چاہیئے کہ آپ یا کوئی بھی شخص جب اِدھر اُدھر سے کوئی روایت سنے تو اسے حدیثِ رسول ماننے سے قبل یہ ڈھونڈھ لے کہ وہ کس کتابِ حدیث میں آئی ہے۔ اسے ادنیٰ اور کم سے کم تقاضا میں نے اس لیے کہا کہ کسی روایت کا محض درجِ کتاب ہو جانا اس کی صحت کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ اربابِ علم وفہم اصولِ فن پر جانچ کر ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ صحیح ہے یا ضعیف یا موضوع۔ مگر عوام جانچ پرکھ کی اہلیت نہیں رکھتے اس لیے انھیں بہرحال وہ کچھ تو کرنا

ہی چاہیئے جو وہ کر سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر کسی بات کو منسوب کر دینا جہنم کا راستہ ہے تحقیق میں آدمی دھوکہ کھا جائے تو قابلِ معافی ہے لیکن تحقیق ہی نہ کرے اور سُنی سنائی اڑاتا رہے تو وہ بڑا مجرم ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا:-

کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع۔	آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بلا تحقیق بیان کر ڈالے۔

آپ شاید نہ بتا سکیں کہ یہ فقرے جنھیں آپ بڑے اطمینان سے حدیث نبویؐ کہہ رہے ہیں کون سی کتاب میں آئے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ میری یہ تحریر پڑھ کر آپ تلاش فرمائیں اور پھر کہدیں کہ یہ تو میں نے فلاں کتاب میں دیکھے تھے۔ جس وقت آپ ایسا کہیں گے اس وقت میں آپ کو بتاؤں گا کہ تین فقروں میں سے اس روایت کا پہلا فقرہ ضعیف سندوں سے مروی ہے اور باقی دو فقرے من گھڑت ہیں۔ فاسد ہیں۔ مشرکانہ ہیں۔ انھیں جو شخص حدیث نبویؐ باور کرتا ہے وہ شدید ذہنی و روحانی امراض کا شکار ہے اور علم الحدیث اس کے بس کا روگ نہیں۔

اقبالؔ کو آپ قبر میں بھی چین نہیں لینے دیں گے۔ ان کے منقولہ شعر کا اس مفروضہ روایت سے بھلا کیا جوڑ ہے۔ اور اگر آپ یا کوئی اور زبردستی جوڑ لگائے گا تو مجھے یہ کہنے میں کبھی تامل نہ ہوگا کہ حدیث کے معاملہ میں اقبالؔ سند نہیں ہیں۔ امام غزالیؒ کا نام نامی آپ نے سنا ہوگا۔ کتنے بڑے شیخ اور عالم اور مصلح مگر محققین انھیں فن حدیث میں کمزور کہتے ہیں اور ان کی بیان کردہ بہتیری حدیثوں کو غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ پھر بھلا ڈاکٹر اقبال کی کوئی رائے حدیث کے سلسلہ میں حجت کیا ہو سکتی ہے۔ آپ نے خدا جانے کس عالم میں یہ مراسلہ لکھا ہے۔ کاش نہ لکھتے۔

(باقی آئندہ)

پاکستان میں قادیانی جماعت کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کی تحریک چلی تو ہمارے ملک کے اخبار و رسائل نے بھی اس بحث میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے اپنے خیالات و آراء کا اظہار شروع کر دیا انہی میں لکھنؤ سے نکلنے والا شہرۂ آفاق اور نہایت ہی موقر ہفت روزہ "صدق جدید" بھی شامل ہے یہ پرچہ کسی اعتبار سے بھی عام جرائد میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس کے فاضل مدیر جناب مولانا عبدالماجد دریا بادی کئی امتیازات کے حامل ہیں، آپ کے قلم نے ہزارہا صفحات پر خدمتِ دین کے مدتوں نہ مٹنے والے نقوش ثبت کئے ہیں۔ مغربی تہذیب کے گنے چنے نقادوں پر بجا طور پر آپ کا شمار ہوتا ہے آپ کے قلم نے اردو اور انگریزی زبانوں میں تفسیر کی تکمیل کی ہے انگریزی تفسیر لکھ کر آپ نے تمام علماء پر عائد ہونے والے فریضہ کو ادا کیا ہے، جو یقیناً آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اور آپ اس کے لئے سب کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں دین کی ایسی کامیاب خدمت کرنے والی کوئی شخصیت اگر یکایک اپنے منصب سے ہٹ کر کسی ایسے فرقہ کی حمایت کرنے لگے جس کی گمراہی مُسلَّم ہو تو یہ چیز لوگوں کے لئے شدید حیرت کا سبب بن جاتی ہے، اور لوگ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں جب مذکورہ بالا تحریک چلی اور پھر اسکے نتیجہ میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا تو جہاں تمام دنیا کے علماء نے اس پر نہایت اطمینان و مسرت کا اظہار کیا وہیں اس سے بالکل مختلف اثر مولانا موصوف کے دل و دماغ پر پڑا، مولانا نے اس فیصلہ پر اپنی سخت بیزاری اور شدید غم و غصہ کا اظہار فرمایا۔ مولانا کے بیانات کو پڑھ کر یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یا اللہ یہ وہی مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی ہیں جو مدتوں سے دین کی خدمت میں مصروف ہیں، مولانا کے ذہن کو سمجھنے کی خواہش کے ساتھ ہم نے صدق کی فائلوں کا مطالعہ شروع کیا، اور اس مطالعہ کے نتیجہ میں وہ چیز سامنے آئی جو تمام علماء کے طرز فکر کے بالکل برعکس تھی لیکن اس کو اپنی توقعات

کے سراسر خلاف ہونے کے باوجود اس لئے مان لینا پڑا کہ صدق جدید کی نئی اور پرانی فائلیں بہرحال اسی کے مان لینے پر ہمیں مجبور کر رہی تھیں صدق کے تفصیلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاً اور فطرتاً ایک کامیاب صحافی اور بہت بڑے ادیب ہیں، لیکن عقائد و ایمانیات کے بارے میں وہ بس سرسری انداز میں سوچنے کے عادی ہیں اور اس قسم کے مسائل کو خصوصی اہمیت دے کر ان میں گہرے غور و فکر کے زیادہ قائل نہیں۔ یوں اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیکر اگر وہ اس قسم کے مسائل میں کبھی سوچنے پر آگئے ہیں تو بڑی گہرائیوں میں جا پہنچے ہیں اور اپنی ذہانت کا لوہا منوا لیا ہے۔ لیکن مولانا کا عام رویہ عقائد و ایمانیات کے بارے میں غور و توجہ والا رہا ہے۔ اسی لئے ہمیں مولانا کے یہاں یہ نظر آتا ہے کہ کبھی مولانا نے توجہ فرمائی تو بڑی بھرپور رائے کا اظہار فرما دیا لیکن دوسرے کسی وقت اسی مسئلہ میں کوئی دوسرا انداز اختیار فرمایا اور پہلے مختلف انداز کی کوئی توجیہہ بھی ضروری نہیں سمجھی۔ آگے چل کر ہم قادیانیت کے سلسلہ میں اس کا ایک آدھ نمونہ پیش کریں گے

اگرچہ ہمارے اس مضمون کے محرک مولانا عبدالماجد صاحب کے افکار ہوئے ہیں پھر بھی ہمارے اس مضمون میں ان پر گفتگو کی نوعیت بس ضمنی ہی رہے گی، اصل بحث قادیانیت اور اس کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے ایمان و عقیدہ اور دعویٰ نبوت کے بارے میں ہی ہوگی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں میں جو تدریجی مراحل نظر آتے ہیں یعنی مجددیت، ملہمیت، محدثیت اور پھر مسیحیت و نبوت، ہم ان سب پر الگ الگ بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ جو کتابیں اور مضامین اب تک اس جماعت کے رد میں لکھے گئے ہیں ان میں عموماً ان مراحل کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ ہم بات کو آسان اور مختصر کرنے کے لئے صرف مرزا صاحب کے دعوی نبوت کی حقیقت پر بحث کریں گے۔ کیونکہ مرزا جی کے دعووں کی [illegible] آخری منزل یہی تھی اور باقی مراحل درمیانی منزلوں کے قبیل کی چیزیں تھیں۔

پہلی بات

اس بات پر تو مرزا جی کے دوست اور دشمن سب ہی متفق ہیں کہ مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کا عنوان "نبوت" کے لفظ کو بنایا تھا۔ اس نبوت کی مرزا جی یا ان کی جماعت جو بھی تاویل کر لیں، لیکن اتنی بات صاف ہے کہ اس نبوت پر ہر انسان کے لئے ایمان لانا مرزا جی ضروری قرار دیتے تھے اور اس کے منکر کو کافر اور جہنمی کہتے تھے۔ آئندہ صفحات میں آپ مرزا کی عبارتیں ملاحظہ فرما لیں گے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مرزا جی نے اپنے دعوی نبوت کی بنیاد اور دلیل قرآن یا حدیث کے کسی بیان کو نہیں بتلایا بلکہ صرف اس چیز کو بتلایا ہے جو ان کے زعم میں بطور وحی کے اُن کے اوپر اترتی تھی۔ اس سلسلہ میں مرزا جی کا بیان ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

"اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مجھکو مسیح ابن مریم سے کیا نسبت ہے، وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ اور مقربین سے ہے اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزئی فضیلت قرار دیتا تھا۔ مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی اُس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا۔ مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے اُمتی"

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۹)

یہ ہے مرزا صاحب کا بیان اپنی ذات کے متعلق اپنے عقیدے کی تبدیلی کے بارے میں، مرزا جی کو جو اپنے نبی ہونے پر ایسا سچا یقین حاصل ہوا کہ بس ایمان و عقیدہ بن گیا، اس کا واحد ذریعہ مرزا جی نے اپنی ذاتی وحی کو بتلایا ہے۔ اسکے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں۔ اور پھر نبوت بھی مرزا جی کو وہ ملی ہے جو معمولی درجہ کی نہیں۔ اگرچہ اُنکو ایک پہلو سے اپنے اُمتی ہونے کا بھی اقرار ہے، پھر بھی اس وحی جدید کے طفیل ترقی درجات کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی اور رسول سے بھی بہت اوپر پہنچے ہیں۔ سوچنے والے اگر انصاف سے سوچیں تو اس ایک عبارت ہی سے مرزا جی کے دعویٰ نبوت کا سارا مسئلہ طے ہو جاتا ہے، اور مزید کسی بحث کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی، مگر چونکہ اس مسئلہ میں قادیانی جماعت

بہت زیادہ مکر و فریب سے کام لیتی ہے اس لئے ہم کسی قدر تفصیل ضروری سمجھتے ہیں۔

مرزا جی کیسے نبی بنے، اس کی نوعیت اور ترتیب مرزا جی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہو جاتی ہے ——— لیکن مرزا جی کے لئے اپنی نبوت پر یقین و ایمان کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مرزا جی کو الہام تو اسی نوعیت کے ہوا کرتے کہ گویا وہ حضرت عیسیٰ ؑ سے خود کو برتر سمجھیں، ہر دن سو بار اللہ کی پناہ مانگا کرتے، پھر کسی دن اللہ کا کرنا ایسا ہوتا کہ انہیں اچانک کسی آیت کا مفہوم کسی معتبر تفسیر میں کچھ اس طرح کا مل جاتا کہ رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے باوجود آپ کے بعد بھی نبی آسکتے ہیں یا اس مفہوم کی کوئی صحیح حدیث ان کو مل جاتی اور پھر اس تفسیر یا حدیث کی تائید پا کر وہ اپنے الہام کو وحی الٰہی کا درجہ دیدیتے اور اس کو حقیقت پر محمول کر کے خود کو نبی اور اپنی ذات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے افضل و برتر سمجھ لیتے۔ اگر معاملہ کی نوعیت فی الواقع یہ رہی ہوتی تو پھر مرزا جی کی طرف سے صفائی دینے والوں کے کہنے کے لئے یہ بات رہ جاتی کہ انہوں نے تفسیر یا حدیث کا مفہوم یہی سمجھا تھا کہ کسی جدید نبی کے آنے کی گنجائش ہے اور اسی لئے انہوں نے اپنے الہاموں کو وحی کا درجہ درجہ دیدیا تھا۔ اور پھر یہ غلط بحث دو چار قدم چل سکتی کہ مرزا جی بدنیت نہیں تھے، بلکہ اُن سے تاویل میں غلطی ہوئی اور تاویل کی اس غلطی کے سبب انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا ——— لیکن مرزا صاحب اس سب بکھیڑے میں نہیں پڑتے۔ وہ سیدھے سیدھے اپنی نبوت و رسالت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی کامل فضیلت کی بنیاد قرآن و حدیث کے بجائے بس خود پر بارش کی طرح برسنے والی وحی کو بتلاتے ہیں۔ اب مرزا جی کے اس صریح اعلان کے بعد اُن کے بہی خواہ ان کی صفائی میں چاہے جو تاویلیں کرتے پھریں، مرزا جی بہرحال اُن کی ان تاویلوں سے بالکل بے نیاز ہیں۔

مرزا جی کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ ہم نے اخذ کیا ہے کہ مرزا جی وحی محمدی سے بالکل بے نیاز ہو کر کاملاً اپنی وحی کو حرف آخر سمجھتے تھے اور یہی سمجھنے کا مطالبہ وہ ساری دنیا سے بھی کرتے تھے ممکن ہے کہ کوئی اس کو ہماری ناانصافی یا زیادتی پر محمول کرے اس لئے ہم اپنے نکالے ہوئے نتیجہ کی توثیق و تصدیق کرنے والا مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا ایک بیان پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"اپنے منکروں کے متعلق حضرت مرزا صاحب ؑ نے بھی خوب فرمایا کہ۔ نادانو! میں تمہارے طمانچے کھانے کے لئے نہیں آیا۔ جب میری سچائی پر خدا نے گواہی دے دی اور زمین و آسمان نے الوقت پکارا اور قرآن شریف کی سب آیات اور احادیث کی اکثر علامات پوری ہو گئیں، تو پھر تمہیں چاہیئے تھا کہ مجھے قبول کرتے اور بجائے اس کے کہ مجھے اُن حدیثوں کے ساتھ ناپتے حق یہ تھا کہ ان حدیثوں کو میرے ساتھ ناپتے اور جو احادیث میرے مطابق نہ اترتیں اُن کی تاویل کرتے یا ضعیف قرار دیکر چھوڑ دیتے کیونکہ میں خدا کی وحی کے ساتھ بولتا ہوں اور حکم و عدل ہو کر آیا ہوں مبارک وہ جو اس نکتہ کو پہچانتا اور ہلاک ہونے سے بچ جاتا ہے"۔

(مرزا بشیر الدین کی کتاب تبلیغ ہدایت صفحہ ۳۰۵ و ۳۰۶)

آپ نے دیکھ لیا کہ مرزا صاحب کس صفائی کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ نادانو! حدیثوں کو میرے دعوے کے صدق و کذب کا معیار مت بناؤ، بلکہ خود میری ذات کو حدیثوں کے صحیح و غلط ہونے کا معیار بناؤ کیونکہ مجھ پر وحی آتی ہے اور میں حکم و عدل بنکر آیا ہوں جو احادیث کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ بھی اپنی وحی سے کرے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جو حدیثیں میرے دعوے کی تصدیق نہ کریں تم اُن کو کسی بھی بہانے اصل سے موڑ دو یا کسی طرح ضعیف ٹھہرا کر اُن کو چھوڑ دو۔ یعنی حدیثوں کے ساتھ چاہے جو سلوک کرو مگر میری وحی پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دو اور اس پر بالکل اسی طرح ایمان لاؤ جیسا میں کہتا ہوں ——— کہاں ہیں وہ لوگ جو اب تک یہی فرماتے جاتے ہیں کہ مرزا جی بڑے شریف آدمی تھے انہوں نے اسلام کے ساتھ کبھی کوئی بدتہذیبی نہیں کی بلکہ تھوڑا بہت وہ اسلام کی اشاعت اور نیک نامی ہی [illegible] وہ یہاں تک ملاحظہ فرمائیں کہ مرزا جی کسی معذرت کے بغیر [illegible] بے باکی اور ڈھٹائی کے ساتھ ان لوگوں کو نادان کہہ رہے ہیں جو احادیث رسولؐ کی روشنی میں مرزا صاحب کے دعووں کو دیکھنے کے عادی

ہیں۔ اب تو یہ بات سمجھ میں آجانی چاہئیے کہ مرزا جی نے بھولے پن یا کم سمجھی کی بنا پر دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا، بلکہ پوری طرح سوچ سمجھ کر نبوت جدیدہ کی تحریک چلائی تھی۔ یقیناً دنیوی اعتبار سے مرزا جی کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ان صریح اعلانوں اور صراحتوں کے باوجود مرزا جی کو اہلِ قلم اشخاص کی ایک اچھی خاصی ٹیم میسّر آتی رہی ہے جو انکی طرف سے اپنے اور پرائے سے بھڑ جانے کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ بھکنے کے لئے ہر وقت تیار رہنے والوں کے سامنے خود بر سبیلِ وقت وحی الٰہی کے نزول کی احتیاج وضرورت مرزا صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

"یہ کس قدر لغو اور باطل عقیدہ ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے اور آئندہ قیامت تک اس کی کوئی بھی امید نہیں، صرف قصّوں کی پوجا کرو پس کیا ایسا مذہب کچھ مذہب ہو سکتا ہے جس میں براہِ راست خدا تعالیٰ کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا، جو کچھ قصے ہیں اور کوئی اگرچہ اس کی راہ میں اپنی جان بھی فدا کرے، اس کی رضا جوئی میں فنا ہو جائے، اور ہر ایک چیز پر اس کو اختیار کرے تب بھی اس پر اپنی شناخت کا دروازہ نہیں کھولتا اور مکالمات ومخاطبات سے مشرف نہیں کرتا —— میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں مجھ سے زیادہ بیزار ایسے مذہب سے اور کوئی نہ ہوگا۔ میں ایسے مذہب کا نام شیطانی مذہب رکھتا ہوں نہ کہ رحمانی اور میں یقین رکھتا ہوں کہ ایسا مذہب جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور اندھا ہی رکھتا اور اندھا ہی مارتا اور اندھا ہی قبر میں لے جاتا ہے۔"

(ضمیمہ براہین احمدیہ ج ۵ ص ۱۸۳)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مرزا جی فرما رہے ہیں کہ اگر جدید وحی پر اور خدا کی شناخت اور معرفت کے اس جدید ذریعہ پر ایمان نہیں لایا گیا تو یہ سراسر اندھا پن ہے اور وہ مذہب جو وحی کے سلسلہ کو اپنے بعد قیامت تک ممنوع قرار دیتا ہے وہ رحمانی مذہب نہیں ہے بلکہ شیطانی مذہب ہے ایسا مذہب محض قصہ کہانی ہے اور اس کے ماننے والے قصّوں کے پجاری ہیں وحی کے سلسلہ کو قیامت تک کے لئے بند بتانے والے مذہب سے مرزا صاحب پوری دنیا میں سب سے زیادہ بیزار ہیں پھر اسی مضمون کو مرزا صاحب اسی کتاب میں دوسری جگہ، اس مہذّب اور فصیح و بلیغ عبارت میں ادا فرماتے ہیں کہ:-

"بلکہ صریح معلوم تھا کہ اُن کی طرف سے وحی کے دعووں پر تکفیر کا انعام ملے گا اور سب علماء متفق ہو کر درپئے ایذا وبیخ کنی ہو جائیں گے، کیونکہ اُن کے نزدیک بعد سیدنا جناب ختمی پناہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وحی پر قیامت تک مہر لگ گئی ہے اور بالکل غیر ممکن ہے کہ اب کسی سے مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ ہو۔ اور اب قیامت تک امّتِ مرحومہ اس قسم کے رحم سے بدنصیب کی گئی ہے کہ خدا تعالےٰ اُن کو اپنا ہمکلام کر کے ان کی معرفت میں ترقی بخشے اور براہِ راست اپنی ہستی پر ان کو مطلع فرمائے بلکہ وہ صرف تقلیدی طور پر گلے پڑا ڈھول بجا رہے ہیں، اور شہودی طور پر ایک ذرّہ معرفت اُن کو نصیب نہیں۔"

(براہین احمدیہ ج ۵ ص ۵۴)

رسول پاک پر نازل ہونے والی مقدس وحی الٰہی جو قرآن وحدیث کی شکل میں آج امّت کے ہاتھوں میں موجود ہے اور جو امّت کا واحد سرمایۂ حیات ہے اُس کو مرزا صاحب بڑی بے باکی اور پوری بے حیائی کے ساتھ "گلے پڑا ڈھول" جیسے مہذب الفاظ سے یاد فرما رہے ہیں اور یہ تمام کارروائی محض اس غرض سے ہو رہی ہے کہ کسی طرح اسکو چھوڑ کر امّت مرزا جی اور اُن کی مصنوعی وحی ونبوت پر سو جان سے قربان ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ جب یہ بات ہے تو مرزا جی اپنی کتابوں کے سیکڑوں صفحات میں اپنی وحی ونبوّت اور رسالت کے ثبوت میں بہت سی آیات اور احادیث کیوں پیش کرتے ہیں اس کی ضرورت ان کو کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں گذارش ہے کہ یہ حیلہ تاویلات، نکات بعد الوقوع کے قبیل سے ہیں، جن کا ڈھونگ مرزا جی نے بڑی دھوم دھام سے رچا رکھا ہے، اور انصاف یہ ہے کہ جھوٹی نبوت کے مدعی کا اتنا حق تو بہرحال ماننا ہی

پڑے گا کہ وہ اپنی نبوت کے بارے میں عجیب غریب تاویلات کی ایسی بھول بھلیاں تعمیر کرے جو اچھے اچھوں کو چکر میں ڈال دے کیونکہ اگر وہ اتنا بھی نہیں کرتا ہے تو اُس کا دعویٰ نبوت و رسالت تین دن بھی بقید حیات نہیں رہ سکتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے یہ دکھایا ہے کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ قرآن و سنّت میں تاویل کی غلطی کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ براہِ راست اپنی ذاتی وحی کی بنیاد پر یہ عمارت کھڑی کی تھی اور اس کا واحد مقصد تھا نبوتِ محمدی کو آؤٹ آف ڈیٹ ٹھہرا کر مسلمانوں کو اسلام سے ہٹانا ـــــ اسی لئے انہوں نے قرآن و سنت کو فرسودہ قصے اور گلے پڑا ڈھول تک لکھ ڈالا ـــــ بس جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں تھے کہ مرزا جی نے بھولے پن سے دعویٰ نبوت کر دیا تھا اور جدید وحی و نبوت کے امکانات ان کو قرآن و سنت کی صحیح مُراد کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے نظر آئے تھے، وہ اب اپنی غلط فہمی کو دور فرمالیں، کیونکہ لسلامتی ہوش و حواس مرزا صاحب کی عبارتوں میں اس خیال کی کوئی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔

اس تمہیدی بحث کے بعد اب اپنی نبوت کے باب میں مرزا صاحب کے دعوے ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول اور نبی ہیں"

(اخبار بدر ۵ مارچ ۱۹۰۸ء)

اخبار بدر کی یہ عبارت ہم نے مرزا صاحب کے فرزند اور خلیفہ کی کتاب "حقیقۃ النبوۃ" سے نقل کی ہے۔ واضح رہے کہ مرزا جی کا نبوت کا یہ اعلان ان کی وفات سے صرف تین ماہ قبل کا ہے کیونکہ مرزا صاحب کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو ہوئی ہے۔

(۲) "میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں" (مرزا صاحب کا آخری خط مندرجہ اخبار عام ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء)

یہ خط ٹھیک اُس دن شائع ہوا جس دن مرزا صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔

(۳) میں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اُس نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے۔" (تتمہ حقیقت الوحی صفحہ ۶۸)

نبی نام رکھنے کا مطلب مرزا صاحب کی اصطلاح میں نبی بنانا ہوتا ہے۔

(تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ براہینِ احمدیہ ج ۵ ص ۲۳۱ تا ص ۲۳۳)

(۴) "سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا"

(دافع البلاء ص ۲)

اب ایک اقتباس براہینِ احمدیہ کی جلد پنجم سے اور ملاحظہ فرمایئے جو اگرچہ طویل ہے مگر معاملہ کی نوعیت کو زیادہ صاف کرتا ہے اور ساتھ ہی مرزا صاحب کے شریفانہ طرز کلام کا بھی اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

(۵) خلاصہ یہ کہ میں حق پر ہوں اور نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ کے موافق میرا دعویٰ ہے اور ہزار نشان[1] میری سچائی کے گواہ ہیں، اور آئندہ بھی طالب حق کیلئے نشانوں کا دروازہ بند نہیں اور جو کچھ مخالفوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ فلاں پیشگوئی پوری نہیں ہوئی یہ ان کی نابینائی ہے ورنہ سب پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہیں اور بعض پوری ہونے والی ہیں۔ ہاں چونکہ ان کی نظر تعصب کے گرد و غبار کی وجہ سے موٹی ہے اس لئے وہ پیشگوئیاں جو بہت کھلی کھلی ہیں ان کو ماننی پڑتی ہیں اور جو پیشگوئیاں کسی قدر دقّتِ نظر کی محتاج ہیں وہ ان کے نزدیک گویا پوری نہیں ہوئیں، لیکن ایسی پیشگوئی شاید دس ہزار میں سے ایک ہو، پس کس قدر لعنت کا داغ اس دل پر ہے کہ دس ہزار پیش گوئی سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتا اور بار بار کتے کی طرح عو عو کرتا ہے کہ فلاں پیش گوئی پوری نہیں ہوئی اور نہ صرف اس قدر بلکہ سخت بے حیائی کے ساتھ گالیاں بھی دیتا ہے، ایسا انسان اگر پہلے نبیوں کے وقت میں بھی ہوتا تو کیا اُن کو قبول کر لیتا ہرگز نہیں کیونکہ ہر نبی کی کوئی نہ کوئی پیشگوئی کا فروں پر مشتبہ رہی ہے۔"

---

[1] نشان مرزا صاحب کے کلام میں معجزہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "ایسے امتیازی امر کا نام معجزہ یا دوسرے لفظوں میں نشان ہے۔" (براہین احمدیہ پنجم صفحہ ۴۷)

(ضمیمہ براہین احمدیہ جلد ۵ ص ۱۲۷ مطبوعہ ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء)

یہ عبارت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ عبارت اعلان کرتی ہے کہ مرزا صاحب اپنے زعم میں ایک عظیم الشان اور مستقل نبی ہیں اسی لئے فرماتے ہیں کہ اگر ہزاروں پیش گوئیوں میں سے ایک آدھ پوری نہیں بھی ہوئی تو کون حشر برپا ہوگیا، کوئی نبی نہیں گذرا جس کی کوئی نہ کوئی پیش گوئی کافروں پر مشتبہ نہ رہی ہو۔

اور اپنی کتاب "چشمۂ معرفت" میں فرماتے ہیں۔ کہ

(۶) "پس یقیناً سمجھو کہ یہ وہی دن ہیں جو خدا کے کہلاتے ہیں۔ اگر مجھ سے ٹھٹھا کیا گیا تو یہ نئی بات نہیں دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یاحسرة علے العباد ما یأتیھم من رسول الّا کانوا بہ یستھزؤن (یعنی بندوں پر افسوس کہ کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس سے انھوں نے ٹھٹھا نہیں کیا"

(کتاب مذکور صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹)

مرزا صاحب کی ایک وحی جس کے معنی مرزا صاحب نے غلطی سے "طاعون" بتائے تھے طاعون کی شکل میں پوری نہیں ہوئی تو پنجاب میں برپا ہونے والے زلزلہ کو مرزا صاحب نے اپنی اُس وحی کا مصداق قرار دیدیا اب کوئی مرزا صاحب کے مرید و معتقد رہے ہوں گے، انہوں نے مرزا صاحب سے اس مصداق کی تبدیلی کے بارے میں جو سوال کیا اور مرزا صاحب نے جو جواب دیا اُس کا ادعاءِ نبوت ملاحظہ ہو۔

(۷) قولہ (یعنی سوال) اگر الہام عفت الدیار[1] الخ کی نسبت قطعی طور پر علم نہیں دیا گیا تھا کہ زلزلہ کے متعلق ہے تو پھر ایسے الہام سے کیا فائدہ تھا"

"اقول (یعنی جواب از مرزا جی) افسوس آپ کو سنت اللہ کی کچھ خبر نہیں، نبی کے لئے کسی پیش گوئی کے کسی خاص پہلو کا قطعی علم ہونا کہ ضرور اسی پہلو پر ظاہر ہوگی، ضروری نہیں۔

(براہین احمدیہ ج ۵ ص ۸۹)

ایک سوال اور اس کا جواب۔

"قولہ۔ حضرت کی عمر شریف کس قدر ہے اور حضرت جو بشارت دیتے ہیں کہ حضرت کے ذریعہ اسلام نہایت ترقی کرے گا کہ یہ ترقی حضرت کی حین حیات میں وقوع میں آئے گی یا کیا؟ اسکی تشریح کا امیدوار۔"

(۸) "اقول۔ عمر کا اصل اندازہ تو خدا تعالےٰ کو معلوم ہے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے اب اس وقت تک سن ہجری ۱۳۲۳ میری عمر ستر برس کے قریب ہے۔ واللہ اعلم۔

اور میں نہیں کہہ سکتا کہ پورے طور پر ترقی اسلام کی میری زندگی میں ہوگی یا میرے بعد میں، ہاں میں خیال کرتا ہوں کہ پوری ترقی دین کی کسی نبی کی حیات میں نہیں ہوئی۔

...... سو میں خیال کرتا ہوں کہ میری نسبت بھی ایسا ہی ہوگا مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے بار بار وحی قرآنی ہوچکی ہے۔" واما نرینّک بعض الذی نعدھم اونتوفینّک۔" اسی نے مجھے یہی امید ہے کہ کوئی حصہ کامیابی کا میری زندگی میں ظہور میں آئے گا۔"

(براہین ج ۵ ص ۱۹۳)

(۹) "اب ظاہر ہے کہ ان الہامات میں میری نسبت برابر بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ خدا کا مامور ہے خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہے جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔"

(انجام آتھم بار دوم ص ۶۲)

یہاں تک مرزا جی کے دعویٰ نبوت کے ثبوت میں خود مرزا جی کی چند عبارتیں پیش کی گئیں جو اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اور کسی شرح کی محتاج نہیں اگر ان سے بھی مرزا جی کا دعویٰ نبوت ثابت نہیں ہوتا تو کوئی ہمیں بتائے کہ ان میں کیا بات کہی گئی ہے اور ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اب مرزا جی کی نبوت کا ثبوت اُن کے صاحبزادہ مرزا بشیر الدین کی زبانی سنئے، اور دیکھئے کہ ان کو اپنے

---

[1] واضح رہے کہ مرزا صاحب کو اکثر الہام یعنی وحی دوسروں کی عبارتوں میں ہوا کرتی تھی مثلاً قرآن کی آیتوں کی شکل میں بعض حدیث میں لفظی تبدیلیوں کے ساتھ یا اقوال کی عبارات میں یا شعراء کے مصرعوں اور شعروں میں، چنانچہ عفت الدیار حضرت لبید کا جو عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کو صحابیت کا شرف بھی بعد میں حاصل ہوا تھا یہ انکے مشہور قصیدہ کا

والد کی نبوت پر کیسا راسخ یقین اور کیسا ایمان ہے اور دوسروں سے اسکو منوانے پر ان کو کتنا اصرار ہے۔

مرزا محمود احمد صاحب نے امیر امان اللہ خان شاہ افغانستان کو مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان لے آنے کی دعوت دیتے ہوئے ایک بڑا تفصیلی خط لکھا جو کتابی شکل میں دو سو تراسی صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اس میں امیر مرحوم کو دعوتِ ایمان دیتے ہوئے خلیفہ صاحب لکھتے ہیں۔

"پس باوجود ان شواہد کے آپ کے دعوے کو قبول نہ کرنا اور آپ پر ایمان نہ لانا کسی طرح درست اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہو سکتا، اور درحقیقت وہ شخص جو اسلام سے محبت رکھتا ہو اور رسولِ کریم کا عاشق ہو اور اپنے ذاتی مفاد پر اسلام کے فوائد کو مقدم رکھتا ہو اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اس قدر وضاحت کے بعد خاموش رہے اور حق کے قبول کرنے میں دیر لگائے اور یہ دلائل جو اوپر بیان ہوئے، آپ کی صداقت کو ثابت نہیں کرتے تو پھر اور کونسے دلائل ہیں جن کے ذریعہ پہلے انبیاء کی صداقت ثابت ہوتی ہے اور جن کی بناء پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اگر ان سے بڑھکر بلکہ سوائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے باقی سب نبیوں کے متعلق اتنے دلائل بھی نہیں ملتے جو بیان ہوئے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اگر ایمان صرف ماں باپ سے سنی سنائی باتوں کو دہرا دینے کا نام نہیں بلکہ تحقیق و تدقیق کر کے کسی بات کو ماننے کا نام ہے تو پھر دو باتوں میں سے ایک کو ضرور اختیار کرنا پڑے گا یا تو سب نبیوں کا انکار کرنا پڑے گا یا حضرت اقدس مسیح علیہ السلام کے دعویٰ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اور میں اے بادشاہ آپ جیسے فہیم اور ذکی فرمانروا سے یہی امید کرتا ہوں کہ آپ مؤخر الذکر طریقہ کو اختیار کریں گے"

(دعوۃ الامیر ص۲۴۲ و ۲۴۳)

ان ہی مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے مذاہبِ عالم کے نام سے لندن میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں پڑھنے کے لئے جو خطبہ تیار کیا تھا وہ "احمدیت یعنی حقیقی اسلام" کے نام سے کتابی شکل میں اسی وقت شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے اپریل ۱۹۳۴ء میں شائع ہونے والا دوسرا ایڈیشن ہے اس کتاب میں خلیفہ دوم نے جس چیز کو حقیقی اسلام ثابت کرتے ہوئے لندن کی آبادی کو اس پر ایمان لانے کی پرزور دعوت دی ہے وہ رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا قرآن والا اسلام نہیں بلکہ وہ، وہ "اسلام" ہے جس کو لیکر مرزا غلام احمد صاحب قادیان میں تشریف لائے تھے۔ اس کتاب کی بھی دو ایک عبارتیں مرزا جی کی نبوت متعلق ملاحظہ فرمائی جائیں۔

"یہ تو ایک اشد مخالف کی تحریر کردہ رائے ہے اس رائے کے علاوہ بھی ہر ایک شخص جو آپ کا جاننے والا ہے وہ آپ کی نیکی کا قائل اور معترف ہے۔ قادیان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، ہندو بھی، آریہ بھی، سکھ بھی، اور غیر احمدی مسلمان بھی، قادیان کے دروازہ بٹالہ میں سکھوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے، یہ سب لوگ آپ کے دشمن ہیں، بلکہ جس قدر دشمنی ان لوگوں کو ہے اور کسی کو شاید نہ ہو گی کیونکہ نبی اپنے شہر اور علاقہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

(کتاب مذکور ص ۱۰۵)

ایک دوسری عبارت ملاحظہ ہو:۔

"اے بھائیو! میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی رحمت آج اسی طرح جوش میں آئی ہوئی ہے جس طرح سے آج سے سیکڑوں سال پہلے جوش میں آئی تھی۔ داؤد کے وقت میں جوش میں آئی تھی، موسیٰ کے وقت میں جوش میں آئی تھی اسحاق کے وقت میں جوش میں آئی تھی، ابراہیم کے وقت میں جوش میں آئی تھی، نوح کے وقت میں جوش میں آئی تھی اور اسکی معرفت کا سورج اسی طرح آج بھی چڑھا ہے جس طرح پہلے نبیوں کے زمانہ میں چڑھتا تھا،

(کتاب مذکور ص ۲۶)

اور بھی مرزا بشیر الدین صاحب اپنی ایک دوسری کتاب میں فرماتے ہیں:۔

"ہم دلی یقین سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین اور خدا کا آخری نبی ماننے کیساتھ حضرت مرزا صاحب کو بھی دو وجہ الیسیر اور بکمال شرح صدر خدا کا نبی اور

رسول تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت مرزا صاحبؑ کی نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ظل اور اسکی تابع ہے اور اس کی شاخ ہے، نہ کہ کوئی آزاد اور مستقل نبوت اور ایسی نبوت آنحضور کے لئے موجب ہتک نہیں بلکہ آپ کے افاضۂ روحانی کا کمال ثابت کرتی ہے اور دنیا پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ صرف نبی ہی نہیں بلکہ نبی گر بھی ہیں اور آپؐ ایسا عالی مرتبہ رکھتے ہیں کہ آپؐ کے خادم بھی آپ کے فیض سے نبوت کا درجہ پاسکتے ہیں۔ (تبلیغ ہدایت مصنفہ مرزا البشیر الدین صفحہ ۲۲۳)

اور یہی مرزا بشیر الدین صاحب ایک جگہ مرزا جی کے بارے میں بایں انداز اظہارِ خیال فرماتے ہیں کہ:۔

" شاید آپ لوگوں میں سے اکثر اس امر سے واقف ہوں کہ آپؑ ہندوستان کے اس گوشہ کے رہنے والے تھے جس پر سکھ حکمران تھے جن کے زیرِ حکومت علم کا نشان نہ تھا، آپ کسی مدرسہ میں نہیں پڑھے۔ دس دن کے لئے بھی آپ نے کسی درسگاہ میں تعلیم نہیں حاصل کی۔ آپ کے والد صاحب نے معمولی مدرسوں کے ذریعہ سے چند ابتدائی کتب آپ کو پڑھوادی تھیں، مگر جب آپ کو اللہ تعالےٰ نے مقامِ نبوت سے ممتاز کیا تو ایک ہی رات میں آپ کو علم اس شان کے ساتھ سکھا دیا کہ عرب اور مصر کے علماء اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے، آپ نے عربی میں بڑی تحدی کے ساتھ کتب لکھی ہیں اور مخالفوں کو بار بار چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ آپ کی تصنیفات کو انسانی علم کا نتیجہ بتاتے ہیں تو اُن کے مقابلہ میں ایسی ہی کتب لکھ کر دکھادیں۔ مگر باوجود بار بار چیلنج دینے اور مقابلہ کی دعوت دینے کے ایک شخص بھی مقابلہ میں نہیں آیا۔" (احمدیت یا حقیقی اسلام ص ۴۲ و ۴۳)

یہاں تک مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی جو عبارتیں پیش کی گئیں اُن کے بعد کسی سوچنے سمجھنے والے آدمی کے لئے مرزا جی کے دعویٔ نبوت میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اس کے بعد اب ہم دکھائیں گے کہ مرزا صاحب صرف مدّعیٔ نبوّت ہی نہیں تھے بلکہ وہ خود کو بہت سے اولوالعزم رسولوں سے افضل و برتر بھی سمجھتے تھے چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:۔

سیدنا یوسف علیہ السلام پر اپنی فوقیت اور برتری جتلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

" اور میرا بھی یہی کلمہ ہے جس کو خدا تعالےٰ نے آج سے پچیس برس پہلے براہین احمدیہ میں لکھدیا فرق یہ ہے کہ یوسف بن یعقوب اپنی اُس دعا کی وجہ سے قید ہوگیا، مگر خدا نے براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۰ میں میری نسبت فرمایا "یعصمك الله من عنده وان لم يعصمك الناس" یعنی خدا تعالےٰ تجھے خود بچالے گا اگرچہ لوگ تیرے پھنسانے پر آمادہ ہوں" سو ایسا ہی ہوا کہ مسمّی کرم دین کی فوجداری مقدمہ میں ایک ہندو مجسٹریٹ کا ارادہ تھا کہ مجھے قید کی سزا دے مگر خدا تعالیٰ نے کسی غیبی سامان سے اُس کے دل کے اس ارادہ کو رد کردیا اور یہی ظاہر کردیا کہ وہ آخر کار سزا دینے کے ارادہ سے قطعاً ناکام رہے گا پس امت کا یوسف یعنی یہ عاجز اسرائیلی یوسف سے بڑھکر ہے کیونکہ یہ عاجز قید کی دعا کرکے بھی قید سے بچالیا گیا، مگر یوسف ابن یعقوب قید میں ڈالا گیا اور اس امت کے یوسف کی بریّت کے لئے پچیس برس پہلے ہی خدا نے گواہی دیدی اور بھی نشان دکھلائے، مگر یوسف اپنی بریّت کے لئے انسانی گواہی کا محتاج ہوا۔"

(براہین احمدیہ ج ۵ ص ۷۶)

ناظرین اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اللہ کے سچے اور پیارے نبی سیدنا و مولانا یوسف علیہ السلام کے بارے میں مرزا جی کی ان بیہودہ گوئیوں کو نقل کرتے ہوئے ہمارے دل کی کیا کیفیت ہوگی اگر مرزا کی بدتہذیبیوں کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے پر ہم مجبور نہ ہوتے تو یہ خبیث عبارت کبھی قلم کی زبان پر لانے کے قابل نہیں تھی۔ ہم یہاں مولانا عبد الماجد دریابادی سے خدا کا واسطہ دے کر بصد ادب عرض کرتے ہیں کہ مولانا کچھ تو خیال فرمائیں اور دیکھیں کہ اس بدتہذیب بے ادب اور انبیاء علیہم السلام کی جناب میں گستاخیاں

کرنے والے گندہ کیرکٹر آدمی کی طرف سے اب تک مولانا جو رد فرما رہے ہیں، یہ کہاں تک مناسب ہے؟ ہمارے خیال میں یا تو مولانا نے پہلے یہ جیسی عبارتیں دیکھی نہیں ہیں یا بغیر توجہ کے ان پر سے گزر گئے، ورنہ کسی مسلمان کے بس میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ان بیہودہ گوئیوں کو دیکھ کر بھی اپنا آغوش اس قسم کے بیہودہ آدمیوں کے لئے وا کئے رہے گا۔

اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی برتری جتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خدا نے اس امت سے مسیح بھیجا جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔"
(حقیقۃ الوحی ص ۱۴۸)

اور دوسری جگہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پر اپنی برتری اور فوقیت کا بایں الفاظ اعلان فرماتے ہیں۔

"جس طرح مثیل موسیٰ (یعنی رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم) بہت سی باتوں میں موسیٰ سے بڑھ کر ہے ایسا ہی مثیل عیسیٰ (مرزا جی) بہت سی باتوں میں عیسیٰ سے بڑھ کر ہے۔"
(نقل از مباحثہ راولپنڈی ص ۲۱۶)

اور "چشمہ معرفت" نام کی کتاب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

" اور خدا تعالےٰ نے اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ میں اس کی طرف سے ہوں، اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر ہزار نبیوں پر بھی تقسیم کر دیئے جائیں تو ان کی بھی ان سے نبوت ثابت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ یہ آخری زمانہ تھا اور شیطان کا مع اپنی ذریت کے آخری حملہ تھا اس لئے خدا نے شیطان کو شکست دینے کے لئے ہزار نشان ایک جگہ جمع کر دیئے لیکن پھر بھی جو لوگ انسانوں میں سے شیطان ہیں وہ نہیں مانتے اور محض افترا کے طور پر ناحق اعتراض کر دیتے ہیں۔" (چشمہ معرفت ص ۳۱۷)

اس کتاب پر تاریخ طباعت ۲۰ مئی [illegible] پڑی ہوئی ہے یعنی اسکی اشاعت مرزا صاحب کی وفات سے کچھ روز پہلے ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی تصنیف بھی [illegible] کے بعد ہوئی ہے یعنی مرزا صاحب کی وفات سے چند ماہ پیشتر (باقی آئندہ)

شعر و سخن

شـ۱۹۶۰ء کی منتخب شاعری — کمار پاشی اور پریم گوپال متل کی مرتب کردہ۔ مجلد۔ تین روپے ۳/-

صنوبروں کا شہر — سہیل احمد زیدی کا مجموعہ کلام۔ قیمت مجلد —— سوا دو روپے ۲/۲۵

سینہ برشفیلہ — محمود سعیدی کا مجموعہ کلام۔ قیمت —— ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

کلیات اختر شیرانی — شاعر رومان اختر شیرانی کا مجموعہ کلام مجلد —— چھ روپے ۶/-

دامان باغباں — بعض منتخب شعراء کا کلام تنقید و تبصرہ کے ساتھ۔ قیمت —— پانچ روپے ۵/-

کلام اصغر گونڈوی — جگر مرادآبادی کے استاد اصغر گونڈوی کا مجموعہ کلام۔ قیمت —— تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵

شعر و شعور — معروف اسلام پسند شاعر حفیظ میرٹھی کے نغمہ ہائے لطیف۔ مجلد —— تین روپے ۳/-

نیم باز — نوجوان لیکن پختہ گو شاعر عنوان چشتی کا مجموعہ سخن قیمت مجلد —— چار روپے ۴/-

شعلۂ طور — جگر مرادآبادی کے گلہائے تغزل۔ قیمت مجلد —— سات روپے [illegible]

آزادی کا ادب — مقالوں، افسانوں، ڈراموں اور نظموں کی ایک دلچسپ تنقیدی کتاب۔ قیمت مجلد —— تین روپے ۳/-

مکتبہ تجلی دیوبند یوپی

[illegible] مرزا جی کی [illegible] ان کے [illegible] ہو کر سکتی ہیں۔

قسط ۳

دوسری حدیث

قادیانی صاحب فرماتے ہیں:-

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو بکر افضل ھذہ الامۃ الا ان یکون نبی (کنوز الحقائق فی حدیث خیر الخلائق) حضرت ابو بکر رض اس امت میں سب سے افضل ہیں سوائے اس کے کہ بعد کوئی نبی (امت میں) ہو (تو اس سے افضل نہیں ہوں گے)۔"

اس کے بعد رقمطراز ہیں:-

ایک تیسری حدیث میں وارد ہے:- ابو بکر خیر الناس بعدی الا ان یکون نبی (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۳۷ وطبرانی وابن عدی فی الکامل بحوالہ جامع الصغیر سیوطی مش) کہ حضرت ابو بکر میرے بعد سب انسانوں سے بہتر ہیں بجز اس کے کہ آئندہ کوئی نبی ہو۔"

پہلی مغالطہ انگیزی تو موصوف کی یہ ہے کہ انھوں نے ایک ہی حدیث کو دو حدیثوں کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ دلائل وشواہد کی گنتی بڑھ جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ محدثین کی اصطلاح میں احادیث کی گنتی سندوں پر منحصر ہے یعنی ایک ہی حدیث اگر دس مختلف سندوں سے مروی ہوگی تو وہ اسے دس حدیثیں کہیں گے۔ اسی اعتبار سے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں محدث کے پاس پانچ لاکھ حدیثیں تھیں اور فلاں کے پاس تین لاکھ۔ معلوم ہے کہ یہ گنتی اصلاً سندوں کی گنتی ہے نہ کہ حدیثوں کی۔ حدیثیں تو کل بھی ایک لاکھ نہیں ہیں چہ جائیکہ کئی لاکھ۔

جو حدیث قادیانی صاحب پیش فرما رہے ہیں وہ چونکہ دو سندوں سے مروی ہے اس لئے محدثین کی مخصوص اصطلاح کے اعتبار سے تو اس پر دو حدیثوں کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن جس موقع پر وہ عوام الناس کے آگے اپنے دلائل کی فہرست رکھ رہے ہیں وہاں ایک ہی

حدیث کو دو حدیثیں باور کرانا بلاشبہ مغالطہ دینا ہے۔ فقہاء جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے کی حمایت میں کوئی حدیث پیش کرتے ہیں تو ان کا یہ طریق کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی حدیث اگر دس سندوں سے مروی ہو تو وہ یوں کہیں کہ ہماری رائے کے حق میں دس حدیثیں موجود ہیں۔ سندیں خواہ کتنی ہی ہوں مقامِ استدلال میں ایک ہی حدیث کہلائے گی۔ دَورِ صحابہؓ سے آج تک یہی اسلوب چلا آرہا ہے مگر شاباش ہے قادیانی مبلغ کو کہ مقامِ استدلال میں بھی وہ ایک حدیث کو دو مختلف حدیثیں کہہ کر الگ الگ نمبر دے رہے ہیں۔ یہ طریقہ بازی گروں اور شعبدہ بازوں کا ہو سکتا ہے اہلِ علم اور اربابِ دیانت کا ہرگز نہیں۔

دوسری مغالطہ انگیزی یہ ہے کہ انصوں نے اردو ترجمہ غلط کیا پہلے متن کا صحیح ترجمہ یہ ہے :-

"ابو بکر اس امت میں سب سے افضل ہیں لیکن یہ بات نہیں کہ وہ نبی ہوں۔"

اور دوسرے متن کا صحیح ترجمہ یہ ہے :-

"ابو بکر میرے بعد سب سے بہتر ہیں مگر انبیاء سے بہتر نہیں۔"

اس دوسرے متن میں بعدی (میرے بعد) کا لفظ آیا ہے بس اس سے موصوف نے یہ نکتہ نکالا کہ ابو بکر جن لوگوں سے افضل نہ ہوں گے وہ حضورؐ کے بعد آنے والے لوگ ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ بعد میں انبیاء آئیں گے۔

ذرا اہلِ انصاف سوچیں کہ ہر جگہ اگر لفظِ بعد کا یہی مطلب نکال لیا جائے تو اس مشہور ترین مصرعہ کے کیا معنی ہوں گے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور اردو میں بھی عموماً بولا جاتا ہے کہ اللہ کے بعد رسول کا درجہ ہے۔ کیا اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ لیا جا سکتا ہے کہ پہلے اللہ میاں کا انتقال ہو پھر حضورؐ کو بڑا مانا جائے۔ یا جب ہم کہتے ہیں کہ بادشاہ کے بعد وزیر کا درجہ ہے تو کیا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اس وقت کے لئے ہو رہی ہے جب بادشاہ کا انتقال ہو جائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پہلے اور بعد کا تعلق کبھی زمانے سے ہوتا ہے تو کبھی رتبے سے۔ بھائی کا حق بھانجے سے زیادہ ہے۔ استاد پہلے ہے اور دوسرے بعد میں۔ اس طرح کے فقروں میں وہ تقدم و تاخر پیشِ نظر نہیں ہوتا جس کا تعلق زمانے سے ہے بلکہ درجے اور مرتبے کا بیان ہوتا ہے۔

یہی صورت حدیث کے فقرے میں ہے۔ حضورؐ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تب ابو بکرؓ سب سے افضل ہوں گے بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ مرتبے کے اعتبار سے میں پہلے ہوں اور ابو بکر مجھ سے بعد۔ جب یہ مطلب طے ہو گیا تو اگلے فقرے الا ان یکون نبی کا تعلق بھی زمانے سے نہیں بلکہ فقط مرتبے اور درجے سے ہوگا۔ مفہوم یہ نکلے گا کہ ابو بکرؓ میرے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں البتہ انبیاء سے افضل نہیں ہیں۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ انبیاء کب کس زمانے میں آئے۔ جو بھی نبی خواہ کسی زمانے میں آیا ہو ابو بکرؓ اس سے افضل نہیں ٹھہریں گے ہاں غیر انبیاء میں وہ ہر انسان سے افضل مانے جائیں گے۔

رہا "یکونَ" کا معاملہ تو اسے بھی سمجھ لیجئے۔ عوام کی تفہیم مقصود ہے۔ کَانَ یَکُوْنُ نحو کی اصطلاح میں افعالِ ناقصہ کہلاتے ہیں۔ کَانَ ماضی کا صیغہ ہے اور یکون مضارع کا۔ کَانَ کا لفظی ترجمہ ہے — "ہوا" یا "تھا" یعنی جو فعل پہلے واقع ہو چکا ہے اور یکون کا لفظی ترجمہ ہے — "ہوگا" — یعنی وہ فعل جو آگے ہوگا یا زمانۂ حال میں ہو رہا ہے۔

الّا ان یکون نبیٌ میں چونکہ یکون آیا ہے اس لئے قادیانی صاحب بڑے اطمینان سے یہ ترجمہ کر رہے ہیں کہ

"بجز اس کے کہ آئندہ کوئی نبی ہو۔"

آئندہ کا لفظ وہ یکون ہی کے اعتبار سے لائے اور ثابت بنالی جو صریحاً ان کے خیال کی تائید کرتی ہے۔

مگر یہ شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں۔ عربی کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ یہ افعال عربی میں طرح طرح سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ دور نہ جائیے قرآن ہی کو کھول لیجئے۔ سورۂ بقرہ میں احکامِ حج بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

فمن کان منکم مریضًا الآیہ (پھر تم میں سے جو مریض ہو تو اس کے لئے فلاں فلاں حکم ہے)۔

یہاں کان موجود ہے مگر زمانۂ ماضی کا مفہوم نہیں دے رہا ہے بلکہ آگے قیامت تک کے احکام اس کے ذریعہ بیان ہو رہے ہیں۔

وَ اِنْ کُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ (اور اگر ہو تم سفر میں) یہ کنتم بھی ماضی ہی کا صیغہ ہے۔ کان سے جمع حاضر بنایا گیا ہے مگر دیکھ لیجئے احکام آئندہ کے لئے دیئے جا رہے نہ کہ ماضی کے لئے۔

قرآن سے ایسی بچاسوں نظیریں بہ آسانی مل جائینگی کہ صیغہ ظاہراً ماضی کا ہے مگر بات حال اور مستقبل کے لئے کہی جا رہی ہے۔

اسی طرح یکون میں ہر جگہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ زمانۂ مستقبل مراد ہو۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ یومِ قیامت کے تعلق سے فرما رہا ہے کہ جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ اے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو معبود بنا لو تو عیسیٰؑ جواب دیں گے:۔

سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ۔ "اے اللہ تو پاک ہے بھلا مجھے یہ کہاں زیبا تھا کہ ایسی بات کہتا جس کا مجھے حق نہیں۔"

اب یہاں ملاحظہ کیا جائے کہ یکون بھی اور اقول بھی مضارع کے صیغے ہیں مگر ان کا تعلق نہ حال سے ہے نہ مستقبل سے بلکہ ہزاروں برس پہلے کے ماضی سے ہے۔ حشر کا دن ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک ایسے سوال کے جواب میں جو ان کی پچھلی دنیاوی زندگی سے متعلق ہے جواب دے رہے ہیں کہ اے پروردگار بھلا مجھے کہاں زیبا تھا کہ ایسی بات کہتا۔

بس اسی طرح الا ان یکون نبیؐ کا یہ مطلب لینے میں کوئی چیز مانع نہیں کہ ـــ "ابوبکر ان انسانوں سے افضل و بہتر نہیں جو نبی ہو چکے ہیں۔" اور اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ ابوبکر کو یکون کی ضمیر محذوف کا مرجع قرار دے کر یہ معنی کئے جائیں کہ ـــ "ابوبکر تمام انسانوں سے تو بہتر ہیں مگر نبی نہیں ہیں۔" اس صورت میں آپ سے آپ معلوم ہو جائے گا کہ وہ انبیاء کو مستثنا کر کے باقی انسانوں سے افضل ہیں۔

منظرِ عبرت

اب ہم مزید تحقیق کی طرف بڑھتے ہیں۔ پیچھے آپ دیکھ چکے کہ موصوف نے پہلے متنِ حدیث کے لئے کنوز الحقائق کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب کا صرف نام لکھ دیا اور نہ تو جلد اور صفحہ لکھا نہ یہ بتایا کہ یہ کس مصنف کی ہے غمازی کر رہا ہے کہ موصوف نے کہیں اِدھر اُدھر سے نقل اڑا لی ہے خود کتاب نہیں دیکھی ورنہ جس طرح انھوں نے دوسرے متن کے لئے کتابوں کا مفصل حوالہ مع جلد اور صفحہ دیا اس کا بھی دیتے۔ یہ وطیرہ وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جو بھی بات کہیں سے اپنے مفید مطلب ملے جھٹ سے لے لو۔ اس کی پرواہ مت کرو کہ وہ حقیقۃً کیا درجہ رکھتی ہے۔ حق پسند ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے سچائی کا سراغ لگاتے ہیں۔

ہم سے سنئے کہ کنوز الحقائق علامہ عبد الرؤف المناوی کی تصنیف ہے اور یہی وہ بزرگوار ہیں جنھوں نے سیوطی کی الجامع الصغیر کی شرح فیض القدیر کے نام سے حوالۂ قلم کی ہے۔

ورق الٹ کر دیکھئے۔ قادیانی مجیب نے حدیث کے متنِ ثانی کے لئے کنز العمال کے علاوہ سیوطی کی جامع الصغیر کا بھی حوالہ دیا ہے۔ کنز العمال پر گفتگو ہم بعد میں کریں گے پہلے یہ سن لیجئے کہ اسی جامع صغیر کی شرح فیض القدیر میں کنوز الحقائق کے مصنف علامہ مناوی اس حدیث کے

ذیل میں کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔

ہمارے آگے فیض القدیر کا وہ ایڈیشن ہے جو مصر کے المکتبۃ التجاریہ نے ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۶ء چھاپا تھا۔ اس کی جلد اول صفحہ ۹۴ پر زیر بحث حدیث کی شرح میں علامہ مناوی نے ارشاد فرمایا:۔

ھو افضل الناس الا نبی والمراد جنس

گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں پہلے اور بعد کی کوئی بحث نہیں بلکہ مقصودِ کلام یہ ہے کہ انسانوں میں جو انسان انبیاءؑ کی جنس میں ہیں ان سے تو ابوبکرؓ افضل نہیں ہیں باقی سب انسانوں سے افضل ہیں۔

اس کے بعد علامہ جملہ کی نحوی ترکیب کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں وھذا البعدیۃ رتبیۃ یعنی یہاں جو بعد کا لفظ آیا اس سے زمانے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ رتبے کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح مطلب یہ بنا کہ ——— "حضورؐ کے مرتبہ علیا کے بعد ابوبکرؓ کا درجہ ہے البتہ انبیاء سے ان کا درجہ زیادہ نہیں ہے۔ نبی جتنے بھی ہیں سب غیر انبیاء سے زیادہ درجے والے ہیں۔"

کیا یہ منظر عبرت ناک نہیں ہے کہ کنوز الحقائق سے قادیانی صاحب نے حدیث تو نقل کر دی لیکن اس حدیث کی جو مراد کنوز الحقائق کے مصنف بیان فرما گئے ہیں اسے غائب کر دیا اور اس سے مختلف مراد اپنے لفظوں میں پیش کر دی۔

مزید دیکھئے۔ علامہ مناوی نے یہیں یہ بھی کہا ہے کہ اگر بعد سے مراد زمانے والی بعدیت لی جائے تو حدیث کی مراد یہ ہوگی کہ بعد میں جو حضرت عیسیٰؑ یا حضرت خضرؑ آنے والے ہیں ان سے ابوبکرؓ افضل نہیں۔

حضرت خضر کا آنا بھی بعض روایات سے نکلتا ہے اور اگرچہ حضرت خضرؑ کا نبی ہونا مسلّم نہیں پھر بھی جمہور کی رائے یہی ہے کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہ الگ بحث ہے حضرت خضرؑ کا آنا اس طرح ثابت نہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ کا نزول۔ علامہ مناوی کا مقصد یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضرت خضرؑ بھی دنیا میں ظاہر ہوں اور انھیں نبی فرض کر لیا جائے تو ابوبکرؓ ان سے افضل نہیں قرار پائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اس جامع صغیر کی شرح میں جس کے قادیانی صاحب نے حدیث کا دوسرا متن نقل کیا وہی علامہ مناوی جو کنوز الحقائق کے مصنف ہیں حدیث کے دو ممکن مفہوم بیان کر رہے ہیں اور یہ دونوں مفہوم عین ہمارے عقائد کے مطابق ہیں اور قادیانی صاحب کے عقیدہ و خیال کی تردید کرنے والے ہیں۔ اس کے باوجود بیچارے کم علم عوام کو خوب خوب دھوکا دیا جا رہا ہے۔

حدیث کی فنی حیثیت

مزید یہ بھی سنئے۔ علامہ مناوی یہیں یہ بتانے کے بعد کہ اس روایت کو طبرانی اور ابن عدی اور دیلمی اور خطیب نے بیان کیا ہے فرماتے ہیں:۔

"اس حدیث کی تخریج کرنے والے ابن عدی نے تشریح کی ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ اس کے علاوہ عکرمہ پر اس حدیث کے تعلق سے نکارت کا الزام لگایا گیا ہے۔ ہیثمی نے اسے طبرانی سے منسوب کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ اس کی سند میں اسماعیل بن زیاد الایلی ہے جو ضعیف ہے۔"

سن رہے ہیں آپ۔ اور المیزان میں حافظ ذہبی کی وضاحت یہ ہے۔

تفرد بہ اسماعیل ھذا فان لم یکن ھو وضعہ فالآفۃ ممن دونہ۔

یعنی استادِ فن امام ذہبی کے نزدیک یہ تو طے ہے کہ یہ حدیث من گھڑت ہے لیکن یہ وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس نے گھڑی ہے۔ اسماعیل بن زیاد الایلی کے سوا اس کا ایک بھی بنیادی راوی نہیں۔ حافظ ذہبی کا ارشاد ہے کہ یا تو یہ اسی کی گھڑنت ہے یا پھر کسی اور نے گھڑی ہوگی۔

ابن عدی اور ہیثمی اور ذہبی کی آرا کی تصدیق اس زینے سے بھی ہوتی ہے کہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مسند امام شافعی، مسند احمد، مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد وغیرہ سبھی نے ابوبکر صدیقؓ کے فضائل بیان کئے مگر یہ حدیث کسی نے نہیں لی۔

اب اے عوام و خواص! آپ انصاف کریں یہ پوزیشن جس روایت کی ہو اسے قادیانی صاحب بڑے اطمینان سے حرفِ آخر کے انداز میں پیش فرما رہے ہیں اور ترجمہ بھی من مانا کر رہے ہیں جب کہ حضورؐ کے بعد کسی بھی نبی کی بعثت محال ہونا ایک دو تین چار حدیثوں سے نہیں بلکہ بیسیوں صحیح حدیثوں سے اور متعدد آیاتِ قرآنیہ سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔

کنزالعمّال

قادیانی صاحب نے دوسرے متنِ حدیث کے لئے کنزالعمال کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ کنزالعمال میں اس کے مصنف علی متقی نے جو حدیثیں جمع ہیں ان کے ساتھ انھوں نے اپنی علیحدہ سندیں نہیں دی ہیں بلکہ دوسری کتبِ حدیث سے نقل کا اہتمام کیا ہے۔ ابھی آپ نے ماہرینِ فن کی زبان سے سنا کہ زیرِ بحث حدیث کی ہر سند کا سلسلہ اسماعیل بن زیاد تک ضرور پہنچتا ہے اور یہ راوی اس حد تک ضعیف ہے کہ اس پر حدیثیں گھڑنے کا الزام عائد ہوا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث خواہ کنزالعمال میں آئے خواہ طبرانی اور الکامل اور جامع صغیر میں اس کا ساقط الاعتبار رہنا مسلّم رہتا ہے۔ کوئی بے بنیاد بات چاہے سو جگہ نقل ہو جائے وہ بے بنیاد ہی رہے گی جب کہ اس کا اصل عیب اساتذہ نے کھول دیا۔

پھر ذرا یہ بھی دیکھئے کہ کنزالعمال ہی میں دوسری متعدد حدیثیں ایسی موجود ہیں جو حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کی خبر دے رہی ہیں اور سند کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ قادیانی صاحب انھیں نہیں دیکھتے کیونکہ مقصد اظہارِ حق نہیں بلکہ دوسروں کو مغالطے میں ڈالنا ہے۔

طول سے بچنے کیلئے ہم کنزالعمال سے ایک ہی حدیث نقل کریں گے جو ہر پہلو سے کافی شافی ہے۔

قادیانی صاحب نے اپنی نقل کردہ حدیث کے لئے کنزالعمال جلد ۹ کا حوالہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے سامنے کوئی اور ایڈیشن ہو۔ ہمارے آگے دائرۃ المعارف حیدرآباد والا ایڈیشن ہے جس کی چھٹی جلد میں یہ حدیث آئی ہے۔ اسی جلد کے صفحہ ۱۰۵ اور صفحہ ۱۱۳ پر ذیل کی حدیث ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ گویا ذیل کی حدیث ٹھیک اسی جلد میں موجود ہے جسے موصوف کھولے ہوئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَثَلِی وَمَثَلُ الانبیاءِ	میری اور دیگر انبیاء کی مثال ایسی ہے
کَمَثَلِ قصرٍ اَحسنَ بُنیانُہٗ	جیسے ایک محل کہ وہ نہایت عمدگی سے
تُرِكَ منه موضعُ لَبِنَةٍ	بنایا گیا مگر اسمیں ایک اینٹ کی جگہ
فَطافَ به النُّظّارُ	چھوڑ دی گئی۔ پھر تماشائیوں نے اس کے
یتعجّبون من حُسنِ	گرد گھوم پھر کر دیکھا تو اس کی حسین تعمیر سے
بُنیانِہٖ الّا موضعَ تلكَ	بہت محظوظ ہوئے مگر انھیں یہ بھی کھٹکا
اللَّبِنَةِ فکنتُ انا	کہ آخر ایک اینٹ کی جگہ خالی کیوں ہے
سَدَدْتُ موضعَ اللَّبِنَةِ	پس میں نے اپنی ذات سے اس خلا کو پر کیا
فَتَمَّ بِیَ البُنیانُ	اور میرے آنے سے یہ تعمیر پوری طرح مکمل ہوگئی
وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ۔	اور میرے ہی ذریعہ رسولوں کا اختتام کر دیا

صاحبِ کنزالعمال نے یہ متن ابن عساکر سے نقل کیا ہے۔ حال یہ ہے کہ یہی روایت الفاظ کے ذرا ذرا سے فرق سے بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی آئی ہے۔ بخاری میں دو سندوں سے، مسلم میں چھ سندوں سے، مسند احمد میں کم از کم چار سندوں سے کئی کئی سندیں ہیں۔ مثلاً مسلم کی ایک سند میں خاتمے پر یہ الفاظ بھی ہیں۔ فانا اللَّبِنَةُ وَ اَنا خاتمُ النَّبِیّین (یعنی میں ہی آخری اینٹ ہوں اور میں انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم کرنے والا ہوں)

یہ بھی [illegible] ہے کہ تمام سندیں فقط ایک صحابی پر ختم نہیں ہوتی ہیں بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت اُبَیّ بن کعبؓ چار صحابہ روایت کرنے والے ہیں۔ جملہ اسناد کی مضبوطی کا اندازہ اسی سے کر لیجئے کہ ماہرین و اساتذہ میں سے کسی نیک نے بھی اس حدیث کی صحت پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی ہے۔

ہم یہاں ختم نبوت کی خبر دینے والی جملہ احادیث و آیات بیان نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف ان معدودے چند کا ذکر کر رہے ہیں جو قادیانی تلبیس اور مغالطہ انگیزی کے اثبات میں ضروری ہیں۔ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ ایک ہی صحیح و قوی حدیث کیا قطعی طور پر یہ نہیں بتا رہی ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد امتی یا غیر امتی، تشریعی یا غیر تشریعی کیسا بھی نبی مبعوث ہونے والا نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے تو اسی نبوت کے ساتھ جو انھیں حضورؐ سے پہلے مل چکی ہے۔ ان کی نبوت تمثیل نبویؐ کے اعتبار سے وہ اینٹ ہے جو قصرِ نبوت میں حضورؐ کی بعثت سے قبل فٹ ہو چکی۔

اور آیت خاتم النبیین سے بھی قطعی طور پر ہر طرح کی نبوت کا دروازہ بند ہو رہا ہے۔ اگر قادیانی حضرات پھر بھی یہ گردان کئے چلے جائیں کہ دروازہ صرف تشریعی نبوت کا بند ہوا ہے، غیر تشریعی امتی نبی اب بھی مبعوث ہو سکتا ہے تو ہر ذی عقل دیکھ لے کہ اسے سوائے ہرزہ سرائی اور فضول گوئی کے کیا نام دیا جا سکے گا۔ یہ بھی اہلِ فہم کو معلوم ہے کہ جو انبیاء مستقل شریعت لے کر آتے رہے انھیں اصطلاحاً رسول کہا گیا۔ قرآن اگر حضورؐ کو صرف خاتم الرسل کہتا تب تو کسی درجے میں یہ چرب زبانی کی بھی جا سکتی تھی کہ صاحبِ شریعت انبیاء اب نہیں آئیں گے مگر امتی اور غیر صاحبِ شریعت آ سکیں گے جنھیں رسول نہیں نبی کہا جاتا ہے لیکن جب خاتم النبیین فرمایا گیا تو عین منطوقِ کلام اور عین مقصد و مدعا ہی یہ نکلا کہ صاحبِ شریعت انبیاء تو در کنار اب کوئی غیر صاحبِ شریعت نبی بھی آنے والا نہیں۔ کسی بھی ایسے بندے کو نبوت تفویض نہیں جائے گی جو رسول اللہؐ کے بعد پیدا ہو۔

الحمد للہ۔ کتابچے کے اس تمام مواد کا شافی کافی تجزیہ ہو گیا جو قرآن و حدیث سے متعلق تھا۔ اب بزرگانِ دین کے اقوال کا نمبر آتا ہے جنھیں کتابچے میں سجا بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اور عوام کے لئے ان میں دھوکا کھا جانے کا وافر سامان موجود ہے۔ انشاء اللہ ابھی ہم اس طلسم فریب کا بھی پردہ چاک کرتے ہیں۔ وھو المستعان۔

ادب و ثقافت

ایک منزل کئی قافلے حج کا ایک پرسوز، دلچسپ اور ایمان افروز سفرنامہ یعقوب سرورش کے قلم سے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

کینسر وارڈ ایک روسی ناول اردو لباس میں۔ اس کے مصنف ایک نامور نویسندہ جو ہیجان پیدا کر دیا گیا — قیمت تین روپے۔ حصہ دوم چار روپے۔

پتھر کے دیوتا چھ حیرت انگیز کہانیاں۔ غیر ملکی ادب کا شاہکار۔ ترجمہ سلیس۔ ایک روپیہ۔

چین کا بدلتا سماج دنیا کے نامور مصنفین کی تصنیف کردہ اس کتاب کو اردو لباس پہنا کر مترجمین نے ایک قابل مطالعہ ذخیرۂ معلومات مہیا کر دیا ہے۔ قیمت۔ صرف ایک روپیہ

آج کا چین اس کتاب کے مترجم روزنامہ الجمعیت کے مدیر شہیر جناب عثمان فارقلیط ہیں۔ لہٰذا قلم کی شگفتگی اور زبان کی چاشنی سے اس کا ہر ورق معمور ملے گا۔ قیمت۔ ایک روپیہ۔

ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرزمین چین میں نام ہی مضامین کی غیر معمولی نوعیت اور کشش کا اندازہ کیجئے۔ قیمت ایک روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند یوپی

ملا ابن العرب مکی

مگر یہ ظالم دنیا مجھے بن باس بھی نہیں لینے دے گی۔ بن باس لینے کی دو ہی صورتیں قابل عمل ہو سکتی تھیں۔ یا تو زوجہ کو اس کے بھائی کی تحویل میں دے کر گھر میں قفل لٹکا یا جاتا یا پھر زوجہ سے گزارش کرتا کہ بھاگوان آپ بھی ساتھ چلیئے۔ افریقہ کے جنگلوں میں آپ بن کی چڑیا بن کر اور میں بن کا چڈا بن کر چہکا کریں گے لیکن موجودہ احوال میں دونوں ہی صورتیں خارج از بحث تھیں کیونکہ مسز حافظ بجا اپنے چیلنج کے مطابق میری چھاتی پر سوار تھیں اور سوار بھی ایسی ویسی نہیں۔ دیسی پانوں کا ایک بجا سہ روزانہ صاف۔ حالانکہ میں اور میری زوجہ پان بس تبرکاً ہی کھاتے ہیں ــــ مسز بجا کی پان خوری کا سرسری اندازہ تو ان کے اگالدان نما منہ سے ہر شخص ہی کر سکتا تھا مگر نوبت ایک بجا سہ تک پہنچ گئی یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب عنایت منزل سے لوٹتے ہوئے شیخ عبدالرحمان کی دکان کے آگے سے گزرا۔ انھوں نے آواز دے لی۔ پان چھالیہ کے بڑے تاجر ہیں۔ جیرے پرانے مشفقین میں ہیں۔

"آداب عرض کرتا ہوں ملا بھائی۔ کہاں ہیں آپ کئی دن سے۔ زیارت ہی نہیں ہو رہی ہے۔"

"مت پوچھیے قبلہ۔ اپنے کفن دفن کا انتظام کرتا پھر رہا ہوں۔ حالات بڑے ہی ناگفتہ بہ جا رہے ہیں۔"

"اللہ بہتر کرے۔ اور یہ مہمان کہاں کے بلا لیے ہیں آپ نے؟"

"کیسے مہمان" میں چونکا۔

"مہمان ہی ہونگے، نہیں تو اتنا پان چھالیہ کیوں جا رہا ہے۔"

"کتنا ــ کیا مطلب؟"

"دیسی پانوں کا چار روپے والا بجا سہ روز جا رہا ہے چھالیہ ڈیڑھ کلو جا چکی کتھہ ــــ"

"دل تھام کے شیخ صاحب۔ آپ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔"

"کیسا خواب۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"کون لے جا رہا ہے؟"

"ارے صاحب وہی آپ کا ملازم لڑکا چھنو۔"
"کل کتنا حساب ہوا؟"
"چالیس روپے ستر پیسے" انھوں نے کھاتا دیکھ کر بتایا
"بس تو آٹھ آنے بھینٹ دوں گا۔ جب تک پوری ادائگی نہ ہو جائے کوئی سودا ہرگز نہ دیجئے گا۔"

ان کا جواب جو بھی رہا ہو اسے سننے کی تاب کسے تھی۔ انگاروں پر چلتا گھر پہنچا۔ شامت دیکھئے زوجہ تو نظر نہ آئی مسز بچاما کا مبارک مکھڑا عین صحن میں مثل آفتاب جہاں تاب نظر آیا۔ یعنی اس سے شعاعیں پھوٹیں اور میری کھوپڑی میں برچھی کی طرح اتریں۔ وہ پان کا بیڑا منھ میں دبائے چھالیہ کتر رہی تھیں، کالے بلکہ جامنی سورج سے شعاعیں جدید شاعری میں پھوٹتی ہیں مگر ان کے موٹے موٹے ہونٹوں پر کھیلیں کرتی ہوئی پان کی لالی جدید اور قدیم ہر قسم کی شاعری کی ایسی تیسی کیئے دے رہی تھی۔

میں ان سے الجھے بغیر زوجہ سے دو دو باتیں کرنا چاہتا تھا مگر زوجہ کہاں پائی جا رہی ہے یہ منکشف ہونے سے پہلے ہی مسز بچاما نے مجھے للکارا۔

"بھیا سے صاف صاف سن لی ہو جمعہ جمعہ ہم بریانی ضرور کھائن۔ تمہارے اس گھروا میں تو بھلے کو چاول بھی نصیب نا ہوون"
"آپ مجھے کھا جائیں بوا جیدن۔ کل ہی تو آپ نے زردہ نوش کیا تھا۔ دو دن پہلے مسالے کے چاول کھائے تھے۔"
"بھیا بریانی کی بات تو کچھ اور ہی ہوون۔ اب تو تمہارے کنستروا میں چاول بھی خلاص ہو گئن"
"مجھے بھی خلاص ہی سمجھو فتنۂ عالم۔ نسیمہ کہاں ہے؟"
"ہائے دیا۔ کیسے بھتا بھتی نام لیوت ہو جورو کا۔ ہمرے مانجی جی ایسا کرت تو زبان ہی گدی سے کھینچ لیون۔"
"تمہارے مانجی جی جنت الفردوس میں حوروں سے کلیلیں کر رہے ہیں۔ تم بھی خدا کے لیے راستہ ناپو۔"

اتنے میں نسیمہ کمرے سے نکل کر جائے واردات پر آئی۔ واردات ابھی ہوئی نہیں تھی مگر ہو سکتی تھی۔ میں دل ہی دل میں گھونسہ بنا کر سوچ رہا تھا کہ مسز بچاما کے کم سے کم سامنے والے دانت تو توڑ ہی دیئے جائیں اور وہ سروطے پر انگلیاں چلاتے ہوئے میری طرف اس طرح گھور رہی تھیں جیسے جوابی حملے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہیں۔

"میں کہتا ہوں ایک بچا سار وزکہاں جا رہا ہے۔" میں نے لہجے میں حتی المقدور شوہرانہ دبدبہ پیدا کرتے ہوئے نسیمہ کو مخاطب کیا۔ اس نے جواباً بڑے اطمینان سے میرے سراپا پر نظر ڈالی پھر اسٹول پر ٹک کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی
"تو آج آپکو عنایت منزل نے جلدی کیسے چھوڑ دیا؟"
"موقعہ محل سمجھا کرو۔ میں پان چھالیہ کی بات کر رہا ہوں"
"ان گھریلو باتوں سے آپ کا بھلا کیا واسطہ۔ دس پچاس بھی روز خرچ ہو سکتے ہیں۔"
"میری بلا سے۔ دام دلوانا اپنے بھائی صاحب سے۔"
"کیا قدر افزائی ہے۔ گویا اب تک تو ہا ذا لکا سارا حساب آپ ہی چکاتے رہے ہیں۔"
"ارے تو بھائی صاحب کے نام پر ٹینشن کیوں ہو جاتی ہے میں نے ان صاحب بہادر کو گالی تو نہیں دی۔"
"کل بہت بگڑ رہے تھے کہ میں کب تک فضول خرچیاں برداشت کیئے جاؤں گا۔ حد ہونی چاہیئے فضول خرچی کی۔"
"اس طرح کی گیدڑ بھبکیاں وہ سال میں بیس پچیس مرتبہ ضرور دے لیتے ہیں۔ ماشاءاللہ وضع کے پابند ہیں۔ خیر مائی سوئٹ ڈارلنگ اب تو تم جانو یا وہ جانیں۔ میں حسرت نصیب بن باس کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ آس پاس کے سارے جنگل تو کھیت بن گئے مجبوراً افریقہ جانا پڑے گا۔ اللہ کے فضل سے محلے میں تبلیغی جماعت آئی ہوئی ہے بسم اللہ اسی سے کروں گا۔ ایک چلہ پھر دوسرا چلہ پھر تیسرا چلہ۔ اسی طرح چلہ پہ چلہ بمبئی یا کلکتہ تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ پھر انشاءاللہ کوئی جہاز اپنی دُم میں لٹکا ہی لے جائے گا۔"
"دُم میں کیوں لٹکیں گے۔ خیر سے تبلیغی جماعت والوں کو تو پاسپورٹ آسانی سے مل جاتا ہے۔ مزے سے گدے دار سیٹ پر بیٹھ کر جائیے گا۔"
"پاسپورٹ کے علاوہ بھی ایک ضروری چیز ہوتی ہے جانِ حیات! جسے ٹکٹ کہتے ہیں اور ٹکٹ خریدنے کے لیے جو چیز

مردودی ہے اس کا نام ہے پیسہ۔ لاؤ تم دلادو دو چار ہزار۔"

"قاری قمرالہدیٰ کے پاس کونسا پیسہ تھا۔ روٹی کے بھی لالے تھے پھر دیکھو تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ دو مرتبہ عرب ممالک ہو آئے۔"

"یہ حضرت شیخ کے فیضانِ خاص کا اثر ہے۔ مجھ مردود پر شیخ کی توجہ کیوں مبذول ہونے لگی۔ تمہارے بھیا صاحب نے تو نہ جانے کیا کیا لکھ کر سارے اولیاء اللہ کو ناراض کر دیا ہے صوفی بہرام بتا رہے تھے کہ خواجہ معین الدین اجمیری اور شاہ عبدالقادر جیلانی تک ان سے بیزار ہیں۔ پھر بتاؤ"

"میں کیا بتاؤں، میری تو سمجھ میں یہ آتا ہے کہ آپ اب واقعی تبلیغی جماعت کے ساتھ لگ جائیے۔ بن باس سے جو فائدہ آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہی بستیوں میں رہ کر بھی حاصل ہو جائے گا۔"

"خیر اب میری استانی بننے کی کوشش مت کرو۔ غالباً میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک بچا سا روز میری برداشت سے باہر ہے۔"

"ہائے ہائے تو ہمارے مردوا کو ڈھونڈ کر لائے دو نا۔ بڑے آئے برداشت والے۔ ہو نہ ہو مار ہی ڈالا ہے بجروا کو۔ ٹھینگے سے۔ ہم بھی ایک سے لاکھ تک تمہارا پیچھا نا ہی چھوڑن پان تو ہمری جان ہے کیسے نا کھاوِن۔"

اسی وقت دروازے کی کنڈی کھٹکی۔ جا کر دیکھا ہو لیا تو حافظ نکسیر کھڑے ہیں دانت نکالے۔ مار ڈالا یہ ظالم اس وقت کہاں آمرا۔

نکسیر اُن کا نام نہیں ہے تخلص ہے۔ نام تو زعفران علی ہے۔ ولد میزبان علی۔ میزبان علی مرحوم سے میری شناسائی پیران کلیر شریف کے عرس میں ہوئی تھی۔ نرگس بیگم کے مجرے میں وہ بھی تھے اور میں بھی۔ کسی من چلے نے نرگس بیگم کو آنکھ ماری وہ تو جواب میں بڑی خندہ پیشانی سے مسکرائی! مگر میزبان علی آنکھ مارنے والے سے لپٹ پڑے۔ دراصل وہ بہت دنوں سے نرگس بیگم کو دل کی محراب پہ سجا چکے تھے۔ اسی داخلی عمل کو شاعر لوگ عشق بھی کہہ دیتے ہیں مگر ترقی یافتہ تصوف میں اس کا نام ہے خوش عقیدگی۔ نام کچھ بھی رکھیئے رقابت اس میں نوشتۂ تقدیر ہے لہٰذا کسی رقیب روسیاہ کا آنکھ مارنا وہ کیسے برداشت کر لیتے۔ مگر رقیب روسیاہ ان سے زیادہ جاندار ثابت ہوا اس کے ساتھ کچھ حمایتی بھی تھے۔ بس پھر مرحوم کی اچھی خاصی تواضع ہو گئی۔ وہ تو کہیئے میں نے منت خوشامد کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا ورنہ مشکل ہی تھا کہ ان کے ہاتھ پیر سلامت رہ جاتے

یہ تھا ہمارے تعلقات کا نقطۂ آغاز۔ پھر یہ نقطہ پھیلا تعلقات بڑھے۔ شدہ شدہ وہ مجھے اپنے گاؤں کھڑک پور بھی لے گئے۔ یہاں ان کے بال بچے تھے۔ زمین تھی۔ ہل بیل تھے۔ زعفران علی نکسیر ان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ باپ ہی کی طرح دانشور اور متواضع۔ مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئے۔ بڑی خاطر مدارات کی۔ میں وقتاً فوقتاً وہاں جاتا رہتا تھا۔ پھر میزبان علی کا انتقال ہو گیا تو زمین جائداد بٹ گئی۔ حالات بدل گئے۔ نکسیر میاں نے شاعری چھوڑ کر چوپال ہی میں بچوں کا مکتب قائم کر لیا۔ میں اب بھی گاہے گاہے ان کے یہاں ہو آتا ہوں مگر اب عرصہ سے جانا نہیں ہوا تھا۔

بہرحال سلام دعا کے بعد انھیں بیٹھک میں بٹھایا اور تشریف آوری کا مدعا پوچھا تو کہنے لگے

"مجھے سنو روپے ادھار چاہئیں۔ بڑی مجبوری پڑ گئی ہے"

"خدانخواستہ کیا معاملہ ہے!"

"ہماری بھانجی سعیدہ خاتون کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس پر پچھلے سال سے آسیب کا اثر چل رہا ہے۔ بہت علاج معالجے کرائے مگر آسیب نہیں گیا۔ اب اتفاق سے لوہانے میں ایک شاہ صاحب اُترے ہوئے ہیں۔"

"اُترے ہوئے ہیں — کوہ ہمالیہ سے یا براہِ راست آسمان سے؟"

"یہ تو پتا نہیں" انھوں نے معصومیت سے جواب دیا "ہر طرح کا علاج معالجہ کرتے ہیں۔ بہت لوگوں کو فائدہ ہوا ہے"

"کیا نام"

"بلغم شاہ سروردی"

"دماغ خراب ہوا ہے — یاد کر کے بتاؤ"

"حاجی گلاب سے تو یہی نام سنا تھا۔"

"ارے ہاں — بے غم شاہ سہروردی۔ میں نے بھی کسی سے سنا تھا۔ خیر پھر"

"ہم وہاں سعیدہ کو لے کر گئے تھے۔ انھوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر بتایا ہے کہ بڑا جنگلی آسیب ہے۔ پرانا ہو گیا ہے۔ آسانی سے نہیں جائے گا۔ ہم نے بہت التجا کی تو انھوں نے کہا کہ خیر ہم علاج تو پکا کر دیں گے مگر ایک سو اکیس روپے یا ساٹھ پیسے خرچ ہوں گے"

"تو ان کے لیے چاہئیں تمھیں سو روپے"

"ہاں جی۔ ادھر کے پیسوں کا تو انتظام ہمارے پاس ہے سو روپے آپ دے دیں۔ اللہ نے چاہا فصل پر اتار دوں گا"

"خیر عزیزم اتارنے وتارنے کا تو فکر نہیں۔ مگر — مگر میں ذرا مطمئن ہونا چاہتا ہوں مجھے بھی کسی دن بے غم شاہ کی زیارت کرادو"

"کیوں نہیں۔ آج ہی چلیے۔ آپ ساتھ ہوں گے تو مجھے بھی خیر رہے گی۔ شاہ صاحب بڑے جلالی معلوم ہوتے ہیں آنکھیں لال لال۔ ڈاڑھی یہ بڑی۔ بڑا رعاب پڑا تھا مجھ پر"

"ٹھیک ہے آج ہی چلیں گے۔ تم ایسا کرو ابھی لوٹ جاؤ۔ گھر سے سعیدہ کو ساتھ لے کر بس کے ذریعہ چھپیرے پہنچ جاؤ۔ میں وہیں آرہا ہوں۔ پھر لوہانے ساتھ چلیں گے"

انھیں رخصت کر کے میں گھر میں لوٹا۔ وہی حسن عالمتاب کا جلوہ جوں کا توں روبرو تھا میں کمرے کے اندر گھسا چلا گیا اور وہیں زوجہ کو بلایا۔

"میں تو آج لوہانے جا رہا ہوں۔ تم خدا کے لیے کسی طرح اس مصیبت کو گھر سے نکالو"

"کہاں نکالوں۔ اس کا کون بیٹھا ہے شہر میں"

"زہر دے دو شب تاریک کی بچی کو — میرا مطلب ہے کچھ کرو تو۔ اس کے تھوبڑے کو دیکھتے دیکھتے میرا مذاقِ شعری تباہ ہوا جا رہا ہے۔ کڑوے کڑوے خواب آتے ہیں۔ تحت الشعور لاشعور کے سینے سے لپٹ کر آہ و بکا کرتا ہے"

"جناب گھر میں ٹلتے ہی کتنی دیر ہیں۔ مجھے دیکھیے۔ دن رات کھانے اور ملاقاتیں بھی سنتی ہوں اور پاندان کا قتلِ عام بھی دیکھتی ہوں۔ ان کے شوہر جب تک نہیں لوٹیں گے یہی سب جھیلنا پڑیگا"

"ارے کیوں جھیلنا پڑے گا۔ ہم کوئی ٹھیکیدار ہیں زمانے بھر کے۔ وہ مردود کہیں گل چھرے اڑا رہا ہوگا۔ مل جائے تو مار مار کے ایسا بھرتہ بناؤں کہ صورت بھی نہ پہچانی جائے اخبث کی"

"کہاں سے مل جائے۔ آپ کو زوبی وغیرہ سے فرصت ملے تو کہیں ڈھونڈیں — نہیں میں طعنہ نہیں دے رہی ہوں۔ آپ ڈھونڈنے نکلتے تو اتا پتا لگ ہی جاتا"

"اسی لیے تو ادریس تبلیغی جماعت کی سوچ رہا ہوں بستی بستی پھروں گا کہیں نہ کہیں سراغ لگ ہی جائے گا"

"تو آج لوہانے جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ تعجب ہے نکسیر جیسے گدھوں سے آپ کی کیسے بنتی ہے"

"تم کیا جانو اس کی جنس"

"آواز ہی سے گدھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر نکسیر تخلص جس کا ہوگا وہ آدمیوں کی جنس سے تو ہو ہی نہیں سکتا"

"کیا عیب ہے اس تخلص میں"؟ میں نے ایسا برا منھ بنایا جیسے اپنے عزیز خاص کی تضحیک گراں گذری ہو۔

"کیا عیب ہوتا۔ زکام رکھ لو۔ کینسر رکھ لو۔ ملیریا رکھ لو۔ آپ کیوں نہیں رکھ لیتے اپنا تخلص جاڑا بخار"

"میں شاعر نہیں ہوں ورنہ اپنا تخلص دُمدار ستارہ رکھتا تم تو شعر کہتی ہو نسیمہ کیا تخلص ہوا۔ شفق، چاندنی، مہکار، خوشبو کچھ تو ہو۔ اللہ قسم دلہن رکھ لو۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ جہاں دلہن نہ کھپے دُلھن فٹ کر دو جیسے غالب نے کہیں کہیں اسدؔ بھی فٹ کیا ہے"

"کیا ہم اس کمرے میں شعر و ادب پہ جھک مارنے جمع ہوئے ہیں — چلیے باہر چلیے۔ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی"

"روسیاہ کی ناز برداریاں کر کر کے تم نے اور سر پہ چڑھا لیا ہے ہم میاں بیوی ہیں کوئی اٹھائی گیرے تو نہیں سوچا کرے جس کا جو جی چاہے"

"مجھے ہانڈی بھی چڑھانی ہے" یہ کہکر وہ کمرے سے نکل گئی۔

چھپیرے کے بس اسٹاپ پہ نکسیر میاں ملے مگر تنہا۔ فرمانے لگے

"باجی تو بہت خوش ہوئیں یہ سن کر کہ آپ شاہ صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہلوایا ہے کہ آپ جب مطلق ہو جائیں تو سعیدہ کو لے جائیے گا۔ آج تو بے فضول ہوتا لانا۔"

"ٹھیک کہا باجی نے۔ میرا دماغ آجکل گھانس کھا رہا ہے لو وہ بس بھی آگئی۔"

لوہانے پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ یہ کافی بڑا گاؤں ہے۔ کھاتے پیتے لوگ بستے ہیں۔ ایک دو مکتب اور پرائمری اسکول بھی ہیں۔ شاہ صاحب مکھیا کے پکے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مکان کے اردگرد بہت سی خالی زمین تھی، جہاں اچھا خاصا مجمع نظر آیا۔ چند خواتین بھی تھیں۔ زیادہ تر تو دیہاتی ہی معلوم ہو رہے تھے مگر کچھ شہری بھی تھے۔ تین خواتین تو یقیناً شہری تھیں۔

جس کمرے میں شاہ صاحب کا قیام تھا اس کا اصل مکان کے علاوہ بھی ایک دروازہ تھا جس کے آگے خستہ حال سے تخت پر ایک ملاجی تشریف رکھتے تھے۔ کھچڑی ڈاڑھی، شہری لباس۔ نکسیر میاں نے بتایا کہ یہ شاہ صاحب کے دربان ہیں۔ پہلے انھیں نام بتایا جاتا ہے۔ یہ اندر جا کر شاہ صاحب سے اجازت لاتے ہیں تب کوئی اندر ملنے جا پاتا ہے۔

"تو چلو تم اپنا نام بتاؤ، تم تو مل ہی چکے ہو فوراً بلوا لیئے جاؤ گے۔ میں بھی ساتھ گھسا چلا جاؤں گا۔"

"یوں نہیں ہونے کا۔ وہ تو جسے اجازت دیں گے وہی اکیلا جائے گا۔"

"اچھا تو میرے لیئے بھی اجازت لے لو۔ کہو کہ میرے رشتے کے بھائی مشتاق احمد بھی قدم بوسی کے لیئے حاضر ہوئے ہیں۔"

آگے بڑھ کر نکسیر میاں نے ملاجی سے اسی طرح کہدیا۔ وہ ناک میں منمنا کے بولے۔

"ابھی تو شاہ صاحب عبادت کر رہے ہیں۔ آدھ گھنٹہ لگے گا۔ آپ وہاں بیٹھیے۔" ملاجی نے اس شکستہ حال چبوترے کی طرف اشارہ کیا جس پر گھنیرے برگد کا سایہ تھا اور کئی لوگ اس پر بیٹھے باتوں سے دل بہلا رہے تھے۔ وہ تینوں شہری خواتین بھی وہیں تھیں۔ ایک ان میں بوڑھی تھی ایک ادھیڑ ایک جوان سال۔

جوان سال کا چہرہ اترا ہوا سا تھا۔ کمزوری کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے چباتی جیسے عادتاً ایسا کر رہی ہو۔ ان کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں۔

"بھیا فرقان نے تو یہی کہا تھا کہ شاہ صاحب بڑے پہنچے ہوئے ہیں ـــ" یہ ادھیڑ نے بوڑھی سے کہا تھا۔

"پہنچے ہوئے تو ہوں گے مگر بعضا جنّات بھی بڑا ہٹی ہوتا ہے۔ یاد نہیں تمھیں تمیزن کے آسیب نے حافظ عبدل کا کیا حال بنایا تھا۔"

"مگر پھر حافظ جی نے ہار تو نہیں مانی تھی۔ دیکھ لو تمیزن اب اچھی خاصی ہے۔"

"ارے وہ تو مولوی اگر گل کے فلیتوں سے اچھی ہوئی ہے"

"خالہ جان میرا تو جی نہیں ٹھکتا۔" جوان سال بولی "تم مجھے دلّی والے ڈاکٹر کو دکھلا دو۔ مرض بھی تو ایسے ہوتے ہیں کہ آسیب کا دھوکہ ہوتا ہے۔"

"اری چپ رہ۔ تیرا تو دماغ وحیدے نے خراب کر دیا ہے۔ اللہ کا نہ رسول کا۔ دو بول انگریزی کے کیا پڑھ لیئے سمجھتا ہے لاٹ صاب بن گیا ہوں۔"

اس گفتگو میں مجھے مزا نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال آدھ گھنٹہ گذرا اور ملاجی کے توسط سے شاہ صاحب کی اجازت حاصل ہوئی۔ کمرہ مختصر سا تھا۔ ایک تخت پر شاہ صاحب بیٹھے تھے۔ برابر میں دو تین مونڈھے پڑے تھے جس وقت ہم اندر پہنچے شاہ صاحب گردن جھکائے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں چلا رہے تھے۔ گول ڈاڑھی شاندار چہرہ پُرنور۔ کمرہ اگربتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ انھوں نے ہماری طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھ جانے کو کہا اور گردن جھکی ہی رہی۔ شاید آنکھیں بھی بند تھیں۔ ہم مونڈھوں پر ٹک گئے۔

چند منٹ بعد انھوں نے تسبیح مصلّے پر رکھدی اور ہماری طرف مڑے۔

"کہو میاں زعفران علی۔ سعیدہ خاتون کو بھی لائے ہو؟" یہ کہتے کہتے ان کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں اور دفعتاً ان کے چہرے پر اضطراب کے آثار جھلکے۔ خود میرے کاسۂ سر میں بھی ایک

لہر سی اٹھی جیسے یادداشت کے کسی کونے میں کیڑا کلبلایا ہو۔

"حضور اسے تو پھر لاؤں گا۔ یہ میرے بھائی صاحب آپ کی زیارت کرنا چاہتے تھے۔" نکسیر میاں بولے۔

"جاؤ۔ اس وقت تم دونوں چلے جاؤ۔ بس جاؤ" انھوں نے رُخ بدلتے ہوئے کہا، لہجہ بڑا خراب تھا جیسے کوئی بھکاری کو دُھتکار دے۔ نکسیر میاں تو گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن میں اس رویّہ پر کچھ دیر غش غش کرنا چاہتا تھا۔ ذہنی افق پر ایک بجلی سی کوندرہی تھی۔

"تم جاؤ عزیزم باہر بیٹھو۔ میں بھی آتا ہوں" میں نے نکسیر میاں کو ہاتھ سے دھکیلا۔ وہ بلا تأمل باہر نکل گئے شاید خوف زدہ ہوگئے تھے۔

"تم بھی جاؤ — فوراً جاؤ۔ شاہ جنّات بغلم بغول کا نزول ہو رہا ہے۔ بھسم ہوجاؤ گے" شاہ صاحب رُخ پھیرے پھیرے کہہ رہے تھے۔

"حضور۔ بس دو منٹ۔ بہت دُور سے دیدار کی پیاس بجھانے آیا ہوں کیا ایک نگاہِ سعادت آثار مجھ غریب الدیار پر نہیں ڈالیں گے" یہ کہتے ہوئے میں نے خود جھک کر ان کے روئے زیبا کا خاص الخاص دیدار کیا اور دفعتاً میرا ہاتھ ان کی ڈاڑھی پر جا پہنچا۔

"مردود — چار سو بیس — دھوکے باز" یہ انھوں نے نہیں میں نے کہا تھا کیونکہ ڈاڑھی امید کے مطابق میرے ہاتھ میں آگئی تھی یہ الگ بات ہے کہ اس کے سرے کا ایک تار ابھی ان کے کان میں الجھا ہوا ہو۔

"ارے۔ ارے۔ او بھائی۔ ابے چھوڑ" انھوں نے جھٹکا دیا۔ تار بھی الگ ہوگیا۔

"بچا مے۔ تم بہت ہی خبیث الزماں ہو۔ اب دیکھو تمہاری کیسی تکا بوٹی ہوتی ہے"

"قسم قرآن کی ملّا بھائی چپ رہو — لاؤ ڈاڑھی مجھے دے دو۔ تمہارے سر کی قسم کمیشن تمھیں بھی دوں گا"

"مجھے کمیشن نہیں چاہیئے۔ تم گھر چلو۔ وہ تمہاری گل بکاؤلی بیگم بھوے یہاں مری پڑی ہیں —"

"مرجانے دو مُسری کو۔ ذرا آہستہ بولو۔ قسم قرآن کی دلہ کفن میں جتنا خرچ ہوگا دُگنا وصول کر لینا بلکہ ابھی لے جاؤ بیشگی"

"پیشگی کے بچے۔ وہ تو تمھیں بھی مار کر مرنے والی نہیں۔ ایک بچا سا روزہ چبا رہی ہے۔ جمعہ جمعہ بریانی مانگتی ہے۔ میرا اسلف اڑا کر رکھ دیا"

"تو دیکھو ایسا کرو۔ تم اب جاؤ۔ کل میں پہنچ جاؤں گا۔ یار دھندا تو اب ہی چلا ہے سمجھا کرو" وہ زیرِ لب کنکناتے رہے

"جانِ من۔ یہ ترٹی کسی اور کو دینا۔ تمھیں لیئے بغیر تو میں یہاں سے سرکوں گا بھی نہیں۔ تمہارا کیا اعتبار۔ میں اُدھر گیا تم اِدھر سٹکے"

"کیا بات کرتے ہو۔ تمہاری جان کی قسم بلکہ چلو پیرِ دستگیر مولا علی کی قسم۔ کیا اب بھی یقین نہیں کرو گے"

"تمہاری قسموں میں اور مینڈک کی ٹرٹر میں کوئی فرق نہیں۔ شاہِ جنّات کی قسم تمھیں ساتھ لیئے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اپنی کبوتری خانم کو میرے دڑبے سے نکالو۔ پھر جو چاہے کرتے پھرنا"

وہ چند ثانیئے چپ رہے۔ ڈاڑھی مجھ سے جھپٹ کر انہوں نے پھر آویزاں کرلی تھی، پھر میرے کان کے قریب منھ لا کر سرگوشی

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں طلاق دے دوں۔ تم کہیں اور اس کا نکاح کرا دو —"

"طلاق تو تمہارا باپ بھی اسے نہیں دے سکتا۔ وہ کب ماننے والی ہے"

"ارے تو میں لکھ کر دیئے دیتا ہوں۔ مانے گی کیسے نہیں۔ تم سے طاقتور تھوڑی ہے"

"میرے فرشتے بھی اس سے کُشتی نہیں لڑ سکتے"

"یار تم نے تو جانے کتنی بار کہا ہے کہ اس کے ہونٹ بڑے پیارے ہیں۔ چال قیامت کی ہے۔ بولی الحمدللہ۔ تو تم ہی جوکر لو اس سے نکاحِ ثانی۔ شریعت میں تو چار تک کی اجازت ہے"

"زیادہ بکواس مت کرو ڈارلنگ بچا با۔ مونگ تو زندگی بھر وہ تمہاری چھاتی پر دلے گی۔ عشق کی ڈوری میں باندھ کر لائے تھے تم اسے۔ یہ ڈوری تمہارے لیے بجلی کا تار ثابت ہو کر رہے گی"

"لعنت بھیجو میاں۔ کیسا عشق وشق۔ وہ تو ہماری مت

ملی گئی تھی ''

''اچھا بس اُٹھ جاؤ''

''ہائیں . یعنی ابھی تو اتنے گاہک باہر کھڑے ہیں ۔ زعفران علی بھی روپے لایا ہوگا ، قسم قرآن کی آج کی آمدنی میں آدھا تمہارا ''

''آمدنی تو میں کراؤں گا تمہاری '' یہ کہتے ہوئے میں نے ان کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا ۔

''ارے ۔ ارے ۔ یار کیسے دوست ہو ۔ گریبان چھوڑ دو میں منع تو نہیں کر رہا جانے سے ''

''ہاں بس خیریت اسی میں ہے چلے چلو ''

''تو سانس تو لے لو ۔ بھائی میں تمہارے پیر پکڑوں ۔ گاہکوں کا بھگتان کر لینے دو ۔ بس دو تین گھنٹے میں ساتھ چلیں گے ''

''میری موجودگی میں تم کسی کو نہیں ٹھگ سکتے ۔ مردود زمانے بھر کے خدا کا بھی کچھ خوف کر لو ''

''اب یار ایسے ولی اللہ تو تم بھی نہیں ۔ خدا بھی گرانی کو دیکھ رہا ہے ۔ اسی نے تعویذ میں اثر رکھا ہے ''

''اسی نے مجھے بھی بھیجا ہے کہ تمہارے جبڑوں پر ایک درجن گھونسے رسید کر دوں ۔ کان کھول کر سنو ۔ میں باہر بیٹھا ہوں ۔ پندرہ منٹ میں تمھیں میرے ساتھ چلنا ہے ۔ سولہواں منٹ ہوا تو سب کے سامنے تمہاری ڈاڑھی اکھیڑ لوں گا ۔ پھر سوچ کتنی مرمت ہوگی ۔ لوگ کپا ہی چبا جائیں گے ''

''ٹھیک ہے ۔ تم جیتے ہم ہارے ۔ جاؤ میں سامان سمیٹ لوں ''

دس منٹ بعد دربانی کرنے والے ملاجی نے اعلان کیا کہ شاہ صاحب آج کسی اور سے نہیں ملیں گے ۔ وہ کل تک کے لئے سالار گنج جا رہے ہیں ۔ وہاں قل کی برجی میں ارواحوں کا ختم شریف ہے ۔ شاہ صاحب صدارت کریں گے ۔

روح کی جمع ارواح تو علم میں تھی ۔ جمع الجمع ارواحوں سن کر طبیعت خوش ہوگئی ۔ بارہویں منٹ پر تکسیر میاں آگئے میں پیچھے شاہ بے غم بیچ میں قطار بنائے بس اڈے کی طرف چلے جا رہے تھے ۔ کچھ معتقدین نے بھی ساتھ چلنا چاہا مگر شاہ صاحب نے سختی سے منع کر دیا ۔ تکسیر میاں حیران پریشان تھے کہ ہو کیا

رہا ہے ۔ بس میں بیٹھنے کے بعد میں نے انھیں بتایا

''یہ شاہ بلغم سردردی نہیں ، حافظ بجاما ہیں ۔ تم اپنے گھر جاؤ ۔ آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر سعیدہ کو کسی شاہ صاحب کے پاس مت لے جانا ۔ بلکہ ہاں اپنی باجی سے کہنا کہ سعیدہ کو ساتھ لے کر میرے یہاں آجائیں میں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھلاؤنگا''

فضا ابن فیضی

اداس دیکھ کے وجہ ملال پوچھے گا
وہ مہرباں نہیں ایسا کہ حال پوچھے گا

جواب دے نہ سکو گے پلٹ کے ماضی کو
ہر ایک لمحہ وہ چبھتے سوال پوچھے گا

دلوں کے زخم دہن میں زباں نہیں رکھتے
وہ کس سے ذائقۂ اندمال پوچھے گا

ہر اک صحیفۂ بے رہنگی ہے، کون یہاں
کسی سے حرفِ لبِ خدوخال پوچھے گا

نصیب ان کا ہے خوں گشتگی و دل ریشی
ہنروروں کو نہ اوجِ کمال پوچھے گا

تو حرفِ عشق و بصیرت ہے، لبِ نبی سی لینا
زمانہ تجھ سے بھی تیرا خیال پوچھے گا

مجھے تراش کے رکھ لو کہ آنے والا وقت
خزف دکھا کے گہر کی مثال پوچھے گا

مسائلِ رخ و گیسو ہیں اب بھی بحث طلب
مجھی سے عشق، حدیثِ جمال پوچھے گا

یہاں تعیّنِ اقدار بھی ضروری ہے
خود اپنے مشک کی قیمت غزال پوچھے گا

یہ ایک پل، جو ہے مجہول شخص کی صورت
مزاجِ آگہی ماہ و سال پوچھے گا

یہ کیا خبر تھی کہ سینے کے داغ کو دیں گے
کوئی جو محنتِ فن کا مآل پوچھے گا

ابن حسن بزمی

ہر سجدہ نہیں ہوتا ممنونِ پذیرائی
کیسے تجھے سمجھاؤں اے ذوقِ جبیں سائی

اس رنگ سے کرتے ہیں وہ انجمن آرائی
ہنگامہ کا ہنگامہ تنہائی کی تنہائی

پھر مجھکو سہارا دے اے تابِ شکیبائی
پھر ان کا خیال آیا پھر جان پہ بن آئی

تشہیرِ محبت کا الزام نہ دو مجھکو
یہ بات زمانے تک میں نے نہیں پہنچائی

ہر راہ گذر ان کی منزل پہ پہنچتی ہے
ہر شکل میں کرتے ہیں وہ حوصلہ افزائی

دنیا مجھے اپنے سے بیگانہ سمجھتی ہے
اب اور کہیں لے چل اے ذوقِ شناسائی

اے صبحِ نشاطِ دل آخر کوئی حد بھی ہے
آنکھوں میں شبِ غم کی تصویر اتر آئی

دنیائے محبت سے کیا کچھ نہ ملا بزمی
مایوسی و ناکامی بربادی و رسوائی

محمد عبدالسمیع حافظ

منزلِ دار و رسن سے متبسم گذرے
اللہ اللہ یہ جرأت ترے دیوانوں کی

غمِ دوراں کو غزل میں جو سمو سکتے ہوں
اب ضرورت ہے ہمیں ایسے غزل خوانوں کی

کیسے یہ لوگ تھے کیا شانِ وقار رکھتے تھے
ہر زباں پر ہے کہانی ترے دیوانوں کی

لالہ کاری ہے مرے خون کی گلشن گلشن
آبرو میں نے بڑھادی ہے گلستانوں کی

شہر حیرت سے ہے انگشت بدنداں حافظ
جدّتیں دیکھ کے اردو کے غزل خوانوں کی

کسی بھی انسان کے لئے اس دعوے کا راستہ کھول دیا کہ وہ
قریب کے حضرت مسیح کی طرح پیدا ہوگیا ہے۔ آخر جب
پیدائش مسیح کی توجیہ عقلی کسی موجود جاری قانونِ فطرت
سے ہوگئی ہے تو قیامت تک ہزاروں ایسی پیدائشوں کو ناممکن
یا خلافِ عقل کیسے کہا جا سکتا ہے۔

یہ خرابیاں مذہب کے کلی اور مشترک تصور کے رخ سے
تھیں۔ خصوصاً اسلام کے رخ سے یہ خرابی بھی پیدا ہوئی کہ قرآن
کا بیان مشتبہ ہوگیا۔ قرآن صریح الفاظ میں پیدائشِ مسیح کی
جو تفصیلات پیش کرتا ہے اس میں ایک لفظ بھی موجود ہے اور
ایسے الفاظ بھی موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ عجوبہ قوانینِ فطرت
اور موجود اسباب و علل کے تحت پیش نہیں آیا بلکہ خدا نے اپنی
قدرتِ کاملہ کا مظاہرہ کیا جو کسی سبب و علت کی پابند نہیں
جو ہر آن نیا قانون اور نئی تکنک پیش کرنے پر مکمل قابو یافتہ ہے۔
قرآن کا ایک ایسا سلیم العقل طالب علم جسے کہ مذکورہ فلسفیانہ
توجیہ کی قباحتوں کا احساس نہ کرے اور اسے کوئی معقول دلیل
تصور کر ڈالے یہ تسامح اور چوک ہے۔

ایسی ہی چوک فاضل دوست سے مثال ۵ میں ہوئی ہے
مردے زندہ کر دینے کے وصف عیسوی کے سلسلہ میں آپ
نے کہا۔

"یہی حال احیائے موتیٰ کا ہے بعض جانور (مثلاً
کھٹمل) مر کر بھی مثل ہیات کی طرح بالکل خشک
ہو جاتے ہیں اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتے
ہیں لیکن جب انھیں (ان کے) مناسب حالات
میں رکھ دیا جاتا ہے تو ان میں پھر سے جان آجاتی
ہے۔"

یہ بھی وہی مادہ پرستانہ رجحان ہے جو خدا کی کن فیکونی قدرت
پر اعتماد کرنے کے بجائے ہر واقعے کو جاری قوانینِ فطرت کے چوکٹے
میں فٹ کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ کسی خاص بندے کے لئے
اللہ نے کوئی بہت ہی مخصوص و منفرد قانون وضع کیا جس سے
دوسرے محروم رکھے گئے۔ وہ نہیں مانتا کہ خدا سبب و مسببیت
کی بندش سے یکسر بالاتر ہو کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ معجزے

کے پیچھے ادھیڑ کر اسے ایک معمولی واقعہ دکھلا دینا چاہتا ہے۔ تعجب
ہے فاضل مضمون نگار نے اس پہلو پر توجہ نہیں فرمائی۔ وہ کھٹمل
کا بیان اس مقصد سے نقل کر گئے کہ دیکھئے احیائے موتیٰ کے عیسوی
معجزے کی عقلی بنیاد بھی فراہم ہوگئی۔ اب مردے کا زندہ ہونا محالِ
عقلی نہ رہا۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ محالِ عقلی تھا ہی کب۔ معقولات کا کونسا
صغریٰ کبریٰ ہے جو اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ جو خالق انسان کو عدمِ
محض سے وجود میں لایا وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ اپنے کسی خاص
بندے کے توسط سے مُردوں کو زندہ کر دے۔ تازہ مُردے میں اس کے
سوا کیا کمی آتی ہے کہ روح نکل گئی۔ جسم تو موجود ہی ہے۔ روح کو پھر
جسم میں لوٹا دینا اس بالاتر ہستی کے لئے محال کیسے ہوگا جس نے
جسم کو بھی خلعتِ وجود عطا کیا تھا اور روح کو بھی۔

کھٹمل جیسے جانوروں کی مثال سے معجزۂ عیسوی کو موجود
قوانینِ فطرت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش نامعقول تو ہے ہی مذاقِ
سلیم اور وجدانِ صحیح کے لئے بھی مکروہ و گراں ہے۔ ان جانوروں
کا دوبارہ جی اٹھنا مادی اسباب و علل کی جس تکنک کا رہینِ منت ہے
اس کا ہرگز کوئی عقلی و نقلی تعلق معجزۂ عیسوی سے نہیں ہے اور اس
طرح کی فلسفہ آرائیوں کو ہمیں بہت ژرف نگاہی اور احتیاط سے
جانچنا پرکھنا چاہیئے۔

ہم دیکھتے ہیں آجکل بعض لوگ خلائی سفروں کو معراجِ رسول
کے جوازِ عقلی کا مقدمہ بنا رہے ہیں۔ یہ بھی ایک شاعری ہے
خلائی سفر کیا چیز ہے۔ روشنی کی رفتار تو شہرۂ عام کے مطابق
ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ ہے مگر جن لوگوں نے اس
رفتار کی تشخیص کی وہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ خلا میں ایسے بھی بیشمار
ستارے موجود ہیں جن کی روشنی اسی رفتار سے چل کر کروڑوں
سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآنی عقیدے کے
مطابق یہ سارا خلا تو آسمانِ اول سے نیچے ہی ہے۔ حضور شبِ
معراج میں اس سے کہیں آگے گئے۔ پھر کیسے جوازِ عقلی مہیا ہوگیا
اس سفر کا جبکہ روشنی کی رفتار سے چل کر بھی صرف پہلے آسمان
تک پہنچنا لاکھوں برسوں کا کام ہوا۔ خوب سمجھ لیا جائے کہ معجزات
کی عقلی توجیہات طبعی قوانین کی روشنی ہی کرنا ایک فضول اور

غیر منطقی حرکت ہے۔ معراج کسی جاری و موجود قانونِ طبعی اور اصولِ فطرت کے تحت نہیں ہوئی۔ وہ مخصوص ترین اعجازِ قدرت ہے اور اسی لئے اس پر معجزہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہی حال تمام ثابت معجزات کا ہے۔ کل اگر کوئی آدمی فلسفہ کی جگالی کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ فلاں فلاں لکڑی بعض طبعی مؤثرات کے تحت جاندار سانپ بن جاتی ہے تو ہم خوش ہو کر یہ نہیں کہیں گے کہ عصائے موسویؑ کے لئے جوازِ عقلی فراہم ہو گیا ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ فلسفی صاحب جھک مار رہے ہیں۔

مولانا حکیم عبد الوہاب ظہوری کے قیمتی مضمون میں چند سطریں بہت کھٹکیں۔

"تمام پھلوں اور اجناس سے بننے والی شراب جن میں نشہ آور جز ایتھائل الکوحل ہے وہ خمر کے ذیل میں آئے گی لیکن دوسری منشیات جن میں نشہ آور جزء الکوحل نہیں ہوتا ان کا مسئلہ مختلف ہوگا۔ مثلاً بھنگ افیم وغیرہ کی تھوڑی سی مقدار یا اس کے مثل (یعنی غیر نشہ آور مقدار) حرام نہ ہوگی بلکہ حرمت اور حد صرف نشہ کی صورت میں واجب ہوگی۔ لیکن الکوحل کے ایک قطرے کا استعمال بھی ناجائز ہے خواہ وہ عملاً نشہ طاری نہ کر سکے۔ یہ ایک مثال ایسی ہے جس میں سائنس کی ایک تحقیق اہلِ فقہ کے لئے معاون ثابت ہوئی۔" (ص ۹)

اس سے پتا چلا کہ محترم حکیم صاحب منشیات کے بارے میں قانونِ شریعت سے واقف نہیں ہیں۔ یہ انکشاف اہلِ علم قارئین کے دلوں سے مضمون کی وقعت گھٹا دے گا۔

کیا فقہ کا یہ اصول موصوف کو نہیں پہنچا کہ کل ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام من ای نوع کان۔ (جس شے کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل سے قلیل مقدار بھی حرام ہے خواہ وہ شے کسی بھی قسم سے ہو۔ یعنی کھانے کی ہو پینے کی ہو۔ نباتات میں سے ہو۔ مصنوعات میں سے ہو۔)

اس اصول کی بنیاد حدیث ہی ہے۔ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکر و مفتر (حضور نے) ہر نشہ لانے والی اور فتورِ عقل پیدا کرنے والی شے کی مخالفت فرمادی ہے) اس حدیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ شے بالفعل نشہ پیدا کر رہی ہو۔ مراد یہ ہے کہ اس میں نشہ آوری کی صلاحیت موجود ہو۔ جن چیزوں کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرتی ہے ان کی قلیل سے قلیل مقدار میں بھی لازماً مذکورہ صلاحیت کا کچھ نہ کچھ حصہ اور جوہر پایا جانا قدرتی ہے۔ لہٰذا یہ قلیل مقدار بھی بفرمانِ رسول حرام ٹھیری، اسی لئے بھنگ، افیم، گانجا ہر ایک کی معمولی سے معمولی مقدار بھی حرام ہے خواہ وہ اس مقدار میں نشہ آور نہ ہو۔

الکوحل کے تعلق سے جو فارمولا محترم نے پیش کیا اس کا فقہ اسلامی سے کچھ تعلق نہیں۔ فقہ میں حلت و حرمت کا معیار کسی شے کے اجزاء ترکیبی یا کسی خاص جزو طبعی پر نہیں ہے بلکہ اثرات پر ہے۔ حلت و حرمت کی معلوم مصالح کا تعلق اس سے ہے ہی نہیں کہ کسی شے کا جو ترکیبی عنصر نشہ پیدا کرتا ہے اس کا نام الکوحل ہے یا الجواہر یا البریان۔ یہ تو محض نام ہیں۔ مصالح ناموں سے نہیں اثرات و نتائج سے وابستہ ہیں۔ نبیذ کی مثال لے لیجئے۔ جن حالتوں میں وہ نشہ آوری کی صلاحیت سے مطلق خالی ہوتی ہے ان حالتوں میں خود حضورؐ نے اسے شوق سے استعمال کیا ہے لیکن اجزاء طبعی کے تغیر و تحول کے ان مراحل سے گذرنے کے بعد جو اس میں نشہ آوری کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں حرام ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کا ایک قطرہ بھی حلت کے دائرہ میں نہیں رہتا۔ شریعت کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ تغیر و تبدل نے اس میں کونسا جزو یا نیا عنصر پیدا کر دیا اور اس کا نام کیا ہے۔

الکوحل گیہوں، انگور اور بعض دوسری چیزوں میں قدرۃً پایا جاتا ہے مگر یہ اشیاء کسی بھی مقدار میں نشہ آور نہیں کیونکہ ان کے اندر پایا جانے والا الکوحل ان کیمیائی اور داخلی مراحل سے نہیں گذرا جو نشہ لانے کی صلاحیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جب بھی یہ ان مراحل سے گذر جائے گا حرمت آجائے گی۔ اس معاملہ میں سائنس

ریسرچ اہلِ خبرہ کے لئے ذرا بھی معاون نہیں نہ اعانت کی کوئی ضرورت ہے۔ عام مشاہدہ و تجربہ جب یہ بتا رہا ہو کہ فلاں شے فتورِ عقل اور سکر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو سائنسی تجزیاتی اصطلاحات ہی اس کے کچھ بھی وجوہ بیان کرے فقہاء کی قوتِ فیصلہ اور قانونِ شرعی کی قوتِ اظہار اس کی ذرا بھی محتاج نہیں رہ سکتی۔

موٹی سی بات ہے کہ ہمہ گیر اسلامی شریعت کا کوئی بھی قانون پیچیدہ آلات اور سائنسی تکنکوں پر منحصر نہیں ہونا چاہیے کن اشیاء میں ایتھائل الکوحل پایا جاتا ہے یا نہیں اور کس مقدار میں پایا جاتا ہے اسے جاننے اور جانچنے کے لئے تجربہ گاہ کی ضرورت ہے۔ آلات و ادویات کی ضرورت ہے۔ حالانکہ بین ملت کے شرعی قوانین فقط ایسا معیار چاہتے ہیں جو ہر دور ہر مقام پر انسان کی قدرتی صلاحیتوں کے بس ہی رہے۔ کوئی چیز کسی مقدار میں نشہ آور ہوتی ہے یا نہیں ہوتی یہ فیصلہ ہر آدمی کا مشاہدہ اور تجربہ کر دیتا ہے۔ اس کے لئے آدمی کے حواس اور قوتِ ذہنی بالکل کافی ہیں، کسی آلے اور سائنسی فارمولے کی ضرورت نہیں اسی لئے حضور نے معیارِ حرمت کسی شے کا مسکر و مفتر ہونا طے فرمادیا۔ خدا جانے فاضل مضمون نگار یہ اصول کہاں سے نکال لائے کہ جن اشیاء میں ایتھائل الکوحل پایا جائے وہی بہ اعتبارِ حرمت خمر کے ذیل میں آئیں گی اور دیگر منشیات اس سے مستثنیٰ ہوں گی۔

کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس رائے سے مدیرِ محترم شہاب الدین صاحب بھی متفق ہیں۔ اگر ہیں تو ہمیں اس کے دلائل چاہئیں۔ ہم تو آج تک قانونِ شریعت کی روشنی میں یہی سمجھتے آئے ہیں کہ بھنگ افیم چرس گانجا وغیرہ کی بھی قلیل سے قلیل مقدار حرام ہے خواہ وہ بالفعل نشہ آور نہ ہو۔

اس مضمون میں ایک جگہ لفظ "تحقیقاتیں" استعمال ہوا ہے یہ قطعاً مناسب نہیں۔ تحریکاتیں، تاریخاتیں، تکلیفاتیں اگر غلط ہے تو اسے بھی غلط ہونا چاہیے۔

کتابتی اغلاط سے کسی کو مفر نہیں۔ مضامین میں آیات کثرت سے ہیں اور کہیں کہیں عمدہ ہے پھر بھی کئی جگہ خرابی پیدا ہوگئی جیسے ص۱۰۷ پر ایک آیت دو سطروں میں منقسم ہو کر یوں لکھی گئی۔

وامرت لا

عدل بینکم

زیر زبر نہ ہوتا تو نقص تھا ہی۔ بڑا نقص یہ رہا کہ ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ اب سوائے حفاظ یا علماء کے ہر قاری یہاں "لا" پڑھے گا یعنی لائے نفیِ جنس۔ حالانکہ یہاں لَا تو بالکل ہی غلط ہے۔ صحیح یوں ہے وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ گویا ناقص کتابت نے "اَعْدِلَ" کا الف الگ کرکے پہلی سطر میں لام سے جوڑ دیا۔

ص۱۱۱ پر لَا انْفِصَامَ کے عوض لَا انْفِظَامَ چھپ گیا۔

ہمیں امید ہے کہ شہاب الدین صاحب جلد اس طرح کی فروگذاشتوں پر قابو پالیں گے اور ندائے فرقان مفید ترین جریدہ بن جائے گا۔ اسلام دوست بھائیوں کو ہم پھر ایک بار اس کی قدر افزائی پر توجہ دلاتے ہیں۔

مکتوباتِ علمیہ

- مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے کچھ خطوط کا مجموعہ۔
- مرتبہ:- جناب مولوی شاہد سہارنپوری۔ • صفحات ۱۶۸ لکھائی چھپائی معمولی۔ • قیمت مجلد چھ روپے ۶/-

---

صاحبِ مکتوبات کسی تعارف کے محتاج نہیں شیخ الحدیث ہونے کے علاوہ وہ مشہور شیخِ طریقت بھی ہیں اور تبلیغی جماعت کے سرپرست بھی یہ مجموعہ ان کے ایک سو تین خطوط پر مشتمل ہے جسے مولوی شاہد صاحب نے ترتیب دیا ہے اور نظر ثانی حضرت شیخ الحدیث کے داماد اور مظاہر العلوم کے صدر المدرسین جناب محمد عاقل صاحب نے فرمائی ہے۔

مرتب کے حرفِ اولیں کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مختصر لیکن فاضلانہ مقدمہ ہے۔ یہ خطوط شیخ الحدیث کی علمی بحثوں اور نصائحِ نکتہ سنجیوں پر مشتمل ہیں جن سے معرفت

درسین اور طلبائے عربی بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ترتیب صحاح ستہ کی رعایت سے ہے یعنی پہلے وہ خطوط جن کا تعلق بخاری سے ہے۔ پھر مسلم پھر ابوداؤد، پھر ترمذی، پھر نسائی، پھر ابن ماجہ۔ تفصیل یوں سمجھئے۔

بخاری سے متعلق مکتوبات	۲۵
مسلم سے متعلق	۸
ابوداؤد سے متعلق	۴
ترمذی سے متعلق	۱۲
نسائی سے متعلق	۱۴
ابن ماجہ سے متعلق	۱۰

یہ کل ۷۲ ہوئے۔ باقی ۵۸ متفرق نوع کے ہیں۔ یہ بھی کتبی رنگ سے خالی نہیں۔ ۷۲ میں تین کو چھوڑ کر بقیہ ۶۹ جناب عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی کو لکھے گئے ہیں جو صاحب درس و تدریس بزرگ ہیں۔ ان کے زیادہ تر اشکالات تو کتبی اعتبار سے معقول ہیں مگر کچھ بچکانے اور غیر ضروری بھی ہیں جن پر خود حضرت شیخ الحدیث نے بھی اظہار حیرت کیا ہے۔

حضرت شیخ کے خطوط منہ سے بول رہے ہیں کہ ان کا لکھنے والا فن حدیث سے گہری مناسبت رکھتا ہے اور اس کے نکات و معارف پر اس کی اچھی نظر ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ حضرت شیخ کو مولانا خلیل احمد سہارنپوری جیسے محدث کی طویل صحبت و رفاقت حاصل رہی۔ پھر ان کے والد ماجد خود ایک ممتاز عالم تھے جنہیں مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے فقیہ و محدث بزرگ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے حضرت گنگوہی کے گرانمایہ علمی افادات بڑی محنت سے جمع کئے تھے جن سے ان کے لائق چشم و چراغ مولانا مذکور نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور بفضلہ تعالیٰ وہ آج اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ بے شمار طلباء خود ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں علم زد فزد۔

محترم مکتوب نگار کی کسی بھی تحقیق سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اعتراف بہرحال کرنا ہوگا کہ ہر جگہ ان کی علمی دیانت یکساں قائم رہی ہے۔ [illegible] [illegible] سے سمجھتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آ گئی ہے۔ [illegible] [illegible] کے منافی

نہیں۔ حسرت یہ رہی کہ صاحب مکتوب کی زبان وانشاء میں کچھ بھی ہوتا۔ شگفتگی و رعنائی ہوتی۔ ایک خطوط خاص مکتبی نوع کے جنھیں اساتذہ بھی بعض کتابیں سامنے رکھے بغیر نہ سمجھ سکیں۔ دوسرے زبان بے مزا اور کہیں کہیں بالکل ٹھس۔ پھر کتابتی اغلاط نے بات اور بگاڑ دی۔ بے شمار اغلاط میں سے چند نمونے:

ص۲ پر الخطاب فیہ الواسع ابن حبان۔ حالانکہ یہ بواسع ہونا چاہیے

ص۱۱ پر کوھہ کی جگہ کوھم۔ چھپ گیا۔

ص۲۶ پر:- فاعل کے بجائے قاعل اور دنیوی کے بجائے دینوی اور احدھم کے بجائے امن ھم اور یقوم کی جگہ یقوم پڑھنا پڑا۔

احیانًا کے عوض جہانًا — الاولی کے عوض الالی — بریکوالعتباس کے عوض غیر بالعتباس — راس المال کے عوض راس الماس — فی نہوال کے عوض فی نہ وال — قاھر کے عوض قاہر — [illegible] کے عوض یزیدہ — تخییر کے عوض تخیر — الانبیا کے عوض الانبیا — معنی کے عوض معن — قرأت القرآن کے عوض فتد قرأۃ القرآن۔

یہ نمونے ہیں۔ غلطیاں اس قدر ہیں کہ ہم نے اکتا کر نشان ہی لگانا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ کاتب اصولی کے کرتے ہیں لیکن ذمہ داری ناشر پر بھی ہے جو اس مجموعہ کے مرتب ہیں۔ نسائی شریف کے متعلق دو خطوں کی ترتیب میں مرتب سے چوک ہوئی ہے نمبر ۱۳ کا سوال و جواب حقیقۃً نمبر ۱۲ پر ہونا چاہیئے اور ۱۲ کا نمبر ۱۳ پر۔ مرتب نے محسوس نہیں کیا کہ نمبر ۱۲ کے جواب میں حضرت شیخ نے لکھا ہے — مطلب میرے خیال میں وہ ہے جو پہلے عرض کر چکا [illegible] اس مضمون کی طرف ہے جو نمبر ۱۳ میں ہے۔ اس طرح ترتیب الٹ گئی۔

فاضل مرتب نے ایک جگہ [illegible] کر دیا۔ [illegible] [illegible] سے انہوں نے [illegible] ایک فہرست [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

لیکن حضرت شیخ کا مکتوب [illegible] [illegible] [illegible]

لیکن اس میں انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے مولانا [illegible] کی تحریر پڑھنے کا موقع نہیں ملا لہٰذا مناسب ہو کہ مولانا مناظر احسن گیلانی سے مراجعت فرمائیں۔

اسے بھی چھوڑیئے پھر انہی پندرہ عریضوں ہی پر اکتفا دو مقامات غالباً اسی کے ہیں۔ ص۱۲۶ و ص۱۲۸ دو جگہ "شیخ الہند" کا لفظ آیا ہے۔ پہلے خط میں مکتوب نگار لکھتے ہیں۔

"حضرت مولانا شیخ الہند مدظلہ کے اشارے سے یہ خط خدمت عالی میں ارسال ہے۔"

دوسرے میں لکھتے ہیں کہ فلاں فلاں سے اور شیخ الہند سے نیاز حاصل ہوا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیوبند کے مشہور بزرگ اور استاد مولانا محمود الحسن کا خطاب شیخ الہند تھا اور غیر منقسم ہندوستان میں سیاسی جوار بھاٹا کے ہمہ گیر خروش کی بنا پر یہ خطاب بچے بچے کی زبان پر اسی طرح چڑھ گیا جیسے مولانا آزاد کے لئے ابوالکلام کی کنیت۔ لاکھوں آدمی ایسے ہوں گے جو نام نہیں جانتے مگر اس خطاب کو جانتے ہیں۔ ایسی صورت میں مکتوبات علمیہ کا کوئی بھی قاری اس کے سوا کچھ نہیں سمجھے گا کہ ان دونوں جگہ اسی شہرت یافتہ شیخ کا ذکر ہے۔ لیکن حقائق یہ ہیں کہ دونوں ہی خط ۱۳۶۱ھ کے بعد کے ہیں جبکہ حضرت شیخ الہند کا انتقال ۱۳۳۹ھ میں ہو چکا ہے۔ گویا پہلے خط سے ۲۲ سال پہلے اور دوسرے خط سے ۲۹ سال پہلے۔ اب یہ توقع تو ہم نہیں کر سکتے کہ مکتوب نگار حضرت شیخ الہند کی قبر میں گھس کر ان سے ملاقاتیں فرماتے ہوں گے۔ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی اور "شیخ الہند" ہیں ——— مگر کون؟ یہ معمہ رہا۔ جناب مرتب کم سے کم حاشیہ پر ہی تصریح کر دیتے کہ یہ دوسرے شیخ الہند کون ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں خوب جانتے رہے ہوں گے ورنہ مکتوب نگار سے ضرور پوچھتے کہ مرحوم و مغفور شیخ الہند کے بعد یہ نئے بزرگ اس نام کے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ انہوں نے متعلق تعرض نہیں کیا تو یہ جانتے ہی جاننے کی دلیل ہے۔ پھر کیا دشواری تھی کہ مرتب ان سے دریافت کر کے وضاحت کر دیتے۔ کمال ہے کہ مولانا عاقل صاحب کی بھی توجہ اس اعجاز کی طرف نہیں گئی۔

دوسری الجھن تحیر کے قبیل سے ہے۔ ایک سائل مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ فلاں و فلاں کی صراحت سے ایک سوال پوچھتا ہے۔ حضرت شیخ نے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دانست میں ترجمان القرآن کسی پرچہ کا نام ہے جو ان کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس پر حیرت زیادہ ہوتی کہ خود سائل کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمان القرآن کوئی "پرچہ" نہیں ایک سے زائد جلدوں کی کتاب ہے۔ مرتب اس مغالطہ پر حاشیہ میں تنبیہ تو کیا کرتے خود وہ بھی اشاریہ میں ص۱۶۱ پر ترجمان القرآن کا نام دے کر اس کے آگے بریکٹ میں "رسالہ" لکھ گئے ہیں۔ نظر ثانی کرنے والے بزرگ بھی اسی پر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ٹیم کی ٹیم کی یہ شان بے خبری عجائبات ہی میں شمار ہونی چاہیئے۔

حضرت شیخ الحدیث میں جہاں اور بے شمار خوبیاں ہیں وہیں تواضع اور انکساری کی خوبی بھی تحریروں سے نمایاں ہے۔ مگر کہیں کہیں یہ چونکا بھی گئی۔ مثلاً ص پر ایک خط کا جواب دیتے ہوئے آخر میں انہوں نے فرمایا۔

"میں ایک جاہل آدمی ان علماء کے اقوال میں ترجیح کا واہمہ بھی نہیں کر سکتا۔"

اس پر حضرت کے داماد مولانا عاقل صاحب نے عربی حاشیہ بھی دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت نے تواضعاً فرمایا اور ایسی تواضع کی مثالیں اس زمانہ میں بڑی نادر ہیں اور یہ تواضع اس حدیث رسولؐ کے مطابق ہے کہ جس نے تواضع اختیار کی اسے اونچا اٹھائے گا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس حاشیہ سے اتفاق نہ کر سکے۔ ہر شے کے کچھ حدود و قیود ہوتے ہیں [illegible] ہیں۔ حضورؐ نے بے شک تواضع، انکسار، فروتنی کی ترغیب دی لیکن یہ بھی ہدایت فرمائی کہ کفران نعمت اور تصنع و ریا سے بچو۔

پہلا اشکال تو یہی ہے کہ حضرت محترم اپنے [illegible] شدہ حواشی میں جگہ جگہ علمائے سلف کی مختلف آراء میں ترجیح کا عمل اختیار کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ عمل ان کے نزدیک اہم

خطرناک اور قابلِ پرہیز تھا کہ اس کا واہمہ تک انھیں نہ ہو سکے تو پھر اس کا ارتکاب جگہ جگہ ان سے ہو کیسے گیا۔ دوسرے الفاظ یہ بات خطرناک ہے کہ ان جیسا عالم جو شیخ الحدیث کی حیثیت میں اونچی کتابوں کا درس دے رہا ہو کسی کو یہ تاثر دے کہ علمائے سلف اور مجتہدین و فقہا عظمت کا ایسا درجہ رکھتے ہیں کہ استاد کا بھی ان کی مختلف آراء میں کسی رائے کو ترجیح دینا ان کی توہین کے مرادف ہوگا۔ تکریم و تعظیم کا یہ پیرایہ "اکابر پرستی" کا مغالطہ پیدا کرتا ہے جبکہ پرستش تو سوائے خدا کے کسی کی ہے ہی نہیں۔ اپنی عقل و درایت کو مفلوج کر ڈالنے کی ترغیب اصالتاً ہو یا ذیلاً کوئی مفید بات نہیں کہی جا سکتی۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ لفظ "جاہل" کوئی خوبصورت لفظ نہیں۔ ان جیسے بلند مرتبہ شیخ الحدیث کے تعلق سے تو یہ گالی ہی محسوس ہوتا ہے۔ اگر یہ لفظ بناوٹ کے نہیں بلکہ صاف گوئی کے جذبے سے نکلا ہو تو خود موصوف کو شدید طور پر یہ محسوس ہونا چاہیئے تھا کہ ایک جاہل آدمی ہو کر میرا شیخ الحدیث بن جانا [illegible] اور انصاف کے کس خانے میں آتا ہے۔ جاہل [illegible] یا بے بضاعت یا ناچیز یا کم فہم جیسا کوئی [illegible] حق ادا کرتا۔ مکروہ اور ناموزوں الفاظ تو اللہ اور رسول کو پسند نہیں۔ اللہ نے علم کی نعمت دی اور ہم اس نعمت کی تحدیث کے طور پر بجائے اپنے آپ کو کورا جاہل کہدیں تو شاید یہ ناشکری اور تقصیر ہی کے زمرے میں آئے گا۔ ہمیں تو یہ لفظ حضرت شیخ الحدیث کے قلم سے وحشت انگیز محسوس ہوا اور دوں کا تاثر جو بھی ہو۔ یہ تواضع کا تقریباً ایسا ہی نمونہ ہے جیسے کوئی عالم خود کو کم فہم یا بے بضاعت یا طالب علم کہنے کے بجائے پاگل کہنے لگے۔

تبصرے کا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب عوام کے مطلب کی بالکل نہیں خواص بھی صرف وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مدرسی کر رہے ہوں۔ ویسے علمی لحاظ سے بڑی وقیع ہے۔

ٹھیک اس وقت جب یہ آخری کاپی پریس جا رہی تھی، ریڈیو سے یہ المناک خبر نشر ہوئی کہ کسی نے حجاز کے شاہ فیصل کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ایک کوہِ غم ہے جو امتِ مسلمہ پر اچانک آپڑا ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔ ——— (عامر عثمانی)

تقاریرِ امام غزالی قیمت مجلد تین روپے ۳/

معارف الحدیث مولانا منظور نعمانی کی مشہور تالیف۔ منتخب احادیث نبوی اردو ترجمہ تشریح کے ساتھ۔ مکمل غیر مجلد ـــ اکیاون روپے

حصہ اول ـــ آٹھ روپے پچاس پیسے

حصہ دوم ـــ دس روپے

حصہ سوم ـــ بارہ روپے پچاس پیسے

حصہ چہارم ـــ نو روپے

حصہ پنجم ـــ گیارہ روپے

مکمل مجلد ـــ ۶۳ روپے پچاس پیسے

اسلام کیا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی وہ مشہور کتاب جس میں اسلام کا تفصیلی تعارف اس انداز سے کرایا گیا ہے کہ ہر استعداد کا آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قیمت مجلد ـــ ساڑھے تین روپے ۳/۵۰

نفسِ مناظرہ سنی شیعہ مباحث میں ایک بے بہا کتاب جو عقائد اہلِ سنت کی صحت اور عقائد شیعہ کے سقم و ضعف کو روشن دلائل کے ذریعے ذہنوں میں اتارتی ہے ـــ طرزِ تحریر سلیس اور دلچسپ اور لب و لہجہ شایانِ شان۔ استدلال علمی مگر عام فہم۔ جلد اول خلافت و امامت اور قصۂ قرطاس کی بحثوں پر مشتمل۔

قیمت ـــ سات روپے

جلد دوم، فدک، متعۃ النساء اور تحریف پاک سے متعلق۔

قیمت مجلد ـــ چھ روپے۔ مکمل تیرہ روپے

قابل دید کتاب ہے شائقین فائدہ اٹھائیں

اسلام کا نظامِ امن اسلام کی پاکیزہ ترین اصطلاح "جہاد" کی آڑ لیکر اسلام کے دشمنوں نے بدامنی، فتنہ انگیزی، خوں آشامی اور انتقام پسندی کے جو الزامات اسلام کے خلاف گھڑ رکھے ہیں ان کا تسلی بخش جواب قرآن و سنت اور واقعات کی روشنی میں۔

قیمت مجلد ـــ بارہ روپے

اصلاح الرسوم مسلمانوں میں جو فضول رسمیں رواج پا گئی ہیں ان کی تردید و مذمت میں مولانا اشرف علیؒ کی مشہور کتاب۔

قیمت مجلد ـــ دو روپے پچاس پیسے

مکمل لغات القرآن قرآن کے تمام ہی الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تحقیق پر سلف و خلف نے اب تک جو لکھا ہے اس کی روشنی میں عرق ریزی سے تیار کی ہوئی یہ رفیع الشان کتاب اپنے موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے ہر لفظ کی تشریح میں وہ سب جمع کر دیا گیا ہے جس سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں ہے لکھائی چھپائی کاغذ سب معیاری، ہر جلد کے الفاظ کی فہرست ہم رشتہ۔

جلد اول

جلد دوم — یہ پورا سیٹ غیر مجلد

جلد سوم — ستاون روپے پچاس پیسے

جلد چہارم

جلد پنجم — چھ جلدوں میں مجلد

جلد ششم — اکہتر روپے پچاس پیسے

رحمۃ للعالمین حضورؐ کی سیرت پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی یہ مشہور زمانہ کتاب معرکۃ الآرا سمجھی گئی ہے۔ تحقیقی مستند اور دلچسپ مضامین سے مالا مال بعد کے سارے ہی سیرت نگاروں نے اسے ایک ثقہ ماخذ کی حیثیت سے اپنا رہنما بنایا ہے۔ اس کا ورق ورق مفید مطالب کا گنجینہ ـــ تین جلدوں میں مکمل

کاغذ سفید، کتابت و طباعت روشن

قیمت چھتیس روپے ۳۶/

قرآن محکم

آیات کے نسخ پر ایک علمی دلچسپ بحث۔ قیمت مجلد۔ تین روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

بیادگار

شہنشاہِ تحقیق۔ نقّادِ اعظم

الحاج حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

ادارہ

مولانا عامر عثمانیؒ کے انتقال پُر ملال پر تمام
قارئین تجلی کی خدمت میں درد و غم سے معمور تعزیت
پیش کرتا ہے ۔ اور یہ گذارش کرتا ہے کہ آپ
حضرات صبر و ضبط سے کام لیں اور وقتاً فوقتاً
مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کرتے رہیں

وہ ایک تارا جو ضو فگن تھا حیات کے مغربی افق پر
سیاہی شب کے پاسبانو خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ اک سفینہ جو ترجماں تھا بہت سی غرقاب کشتیوں کا
ہماری حالت پہ ہنسنے والو ہنسی اڑاؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ ایک دل جو دمک رہا تھا خلوص ایماں کی تابشوں سے
خلوص ایماں کے دشمنوں کو خبر سناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

ہمارا کام
اندھیروں میں چراغ جلانا ہے:

حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ
لیجئے کہ وہ بجائے خود "حق" ہے وہ ایک ایسی مستقل اقدار
کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہیں اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب
بھی وہ حق ہی ہے کیونکہ اس کا حق اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے
دنیا کا ماننا یا نہ ماننا سرے سے حق و باطل کے فیصلے کا معیار نہیں ہے اگر دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام
نہیں ہے بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا مصائب حق پر نہیں بلکہ اہل حق پر
آتے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ انھیں بہر حال حق پر ہی قائم
رہنا ہے اور اسی کا بول بالا کرنا ہے۔ وہ مصائب میں تو ضرور مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن "ناکام" کبھی نہیں ہو سکتے
احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ساری عمر دین حق کی طرف دعوت دینے میں
کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ کیا ہم انھیں ناکام کہہ سکتے ہیں؟ نہیں ناکام تو وہ قوم ہوئی جس
نے انھیں رد کر دیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔
لوگوں کا رد و قبول ہرگز حق و باطل کا معیار نہیں ہے لوگوں کی اکثریت اگر اندھیروں میں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا
چاہتی ہے تو خوشی سے بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتی رہے۔ ہمارا کام بہر حال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے
اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے۔ ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم
بھٹکنے یا بھٹکانے والے لوگوں میں شامل ہو جائیں خدا کا احسان ہے کہ اس
نے ہمیں اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی اس کے
احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ جلاتے
جلاتے مر جائیں

مفکر اسلام:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
احوال واقعی .... حسن احمد صدیقی ۶
آغاز سخن .... شمس نوید عثمانی ۲۳
رسول اللہ کا مقام .... مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ۲۹
خانہ کعبہ کی مرکزیت .... مولانا قاری محمد طیب ۳۷
غزلیں .... مولانا عامر عثمانی رح ۴۱ ۴۲
بحث و نظر ۴۴
کیا ہم مسلمان ہیں .... شمس نوید عثمانی ۵۲
تجلی کی ڈاک .... حسن احمد صدیقی ۵۵
عنوان حیات .... عمر فاروق عثمانی ۶۳
قادیانیت کی حقیقت .... مولانا عارف سنبھلی ۶۵
قادیانیت مذہب و انسانیت کی ضد .... عبد الحمید صدیقی ۷۶
کھرے کھوٹے .... مولانا عامر عثمانی و حسن احمد صدیقی ۸۵
امریکہ۔ انگلینڈ
نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس
انڈونیشیا سے بذریعہ
بحری ڈاک : دو پونڈ۔
بذریعہ ہوائی ڈاک چار پونڈ
بحرین۔ افریقہ
سعودی عرب۔ قطر
وغیرہ بذریعہ بحری
ڈاک ایک پونڈ دس
شلنگ۔ بذریعہ
ہوائی ڈاک
تین پونڈ
تجلی
ماہنامہ
دیوبند
ایڈیٹر۔ حسن احمد صدیقی
اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔ پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔ پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔
منی آرڈر بھیجکر وی۔ پی خرچ سے بچ جائیں گے
سالانہ بیس روپے ۲۰
فی کاپی دو روپے ۲
اسلامی پریس دیوبند

۱۲؍اپریل ۸۵ء کی شب میں قریباً بارہ بجے حضرت مولانا عامر عثمانی طاب اللہ ثراہ کے انتقال کا جو دل فگار اور افسوسناک حادثہ پیش آچکا ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جسے مذہب سے ادنیٰ درجہ کی بھی دلچسپی ہو اور اخبار و رسائل کا مطالعہ کرنا جس کا ضروری مشغلہ ہو۔ مرض وفات اور تکفین و تدفین سے متعلق تمام جزئیات اخبارات میں آچکی ہیں۔ ملک کے بیشتر جرائد میں اس دل شکن اور غم انگیز حادثہ کی اطلاعات شائع ہو چکی ہیں مختلف مقامات پر تعزیتی جلسے منعقد کئے جا چکے ہیں۔ متعدد شہروں میں ایصال ثواب کی ہم تا دم تحریر جاری ہے تعزیتی مضامین اور مرثیے اخبارات میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ مرحوم کی اسلام پرستانہ صلاحیتوں اور دینی خدمتوں، تنقیدی پیش رفتوں اور دماغی مدح و ستائش پر تو اب تک نہ جانے کتنے مضامین، مقالے اور بیانات منظر عام پر آچکے ہیں۔

غرضیکہ اس تحریر و تقریر کے دور میں وہ سب کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے جو کسی عظیم اور محبوب شخصیت کے سانحۂ ارتحال پر ہونا چاہیئے۔

ان سب باتوں کے بعد اب میرے پاس لکھنے کیلئے کچھ نہیں رہ جاتا۔ میں سر زمین حیرت پہ کھڑا سوچ رہا کہ کیا کہوں اور کیا لکھوں ——— دل کا ایک تقاضہ یہ بھی کہ مولانا مرحوم کا مختصراً تعارف ہی کرا دوں، لیکن یہ بات قرین صواب اور منجملہ تعقل معلوم نہیں ہوتی اسلئے کہ تعارف اس شخص کا کرایا جاتا ہے جس شخص سے لوگ متعارف اور واقف نہ ہوں۔ جس ہستی کو ملک کا بچہ بچہ جانتا ہو۔ جو بیرون ملک میں بھی اپنی شناسائی اور مقبولیت کا علم گاڑ چکا ہو۔ جسکی شخصیت تحریر کے ملبوسات میں شہر در شہر گاؤں در گاؤں بکھری ہوئی ہو اسکا تعارف کرانا کسی تحصیل حاصل جیسی کھلی ہوئی حماقت کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتا۔

دل اور جذبات کا ایک تقاضا یہ ہے کہ مولانا

مرحوم کی علالت اور بمبئی تشریف لیجانے کے بارے میں واضح تفصیلات پیش کروں۔ لاریب فیہ کہ اسی موضوع پر بے شمار اخبارات میں بسط و تفصیل کے ساتھ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے لیکن مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ تجلی کے صفحات میں جو کچھ بیان کیا جائے گا وہ نسبتاً زیادہ معتبر اور قابل اعتبار ہوگا۔ بے شک مرحوم کے بارے میں احوال و واقعات کی صحیح ترین تصویر تجلی ہی پیش کر سکتا ہے۔ اس لئے کوئی حیرت کی بات نہیں اگر اخبارات کی اطلاع اور مختلف قلم کاروں کے مضامین پڑھنے کے بعد بھی تجلی کے قارئین تجلی کے منتظر ہوں۔ اور ان واقعات کی تصدیق و تائید کا انتظار کر رہے ہوں جو بارہ اپریل سے ابتک ان گنت اخبار و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

لیجئے سنئے :- اس روح فرسا اور اندوہناک داستان کا آغاز کچھ اس طرح ہوا تھا ——— میں نگینہ ضلع بجنور کے ایک عربی مدرسہ، مدرسہ قاسمیہ میں مدرس کی حیثیت سے درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ چند ہی ماہ قبل میرا تقرر وہاں ہوا تھا۔ یہ چند ماہ میں نے بڑی ذہنی کشاکش میں گذارے تھے۔ میں اس ملازمت سے مطمئن نہیں تھا اس کی اولین ترین وجہ یہ تھی کہ نگینہ میں چند شر پسند اور فرقہ پرست قسم کے لوگ بھی موجود تھے۔ اس قسم کے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ کونسا ایسا مقام ہوگا جہاں شیاطین کی جلوہ طرازیاں اور فرعونیت کی تخریبیں نہ ہوں یہ لوگ جماعت اسلامی کے خون کے پیاسے تھے اور یہ سب تخریب کار حضرات الا ماشاء اللہ جمعیۃ علماء سے متعلق تھے۔ ان ہنگامہ پسند ہستیوں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ میں مولانا عامر عثمانی مرحوم کا داماد ہوں اور جب ان کا داماد ہوں تو کسی نہ کسی درجہ میں جماعت اسلامی سے متاثر بھی ضرور ہوں گا۔ اس لئے یہ لوگ مجھے گمراہ، بد دین اور بدکردار تصور کیا کرتے تھے اور میرے خلاف باقاعدہ ایک تحریک چلانے اور پروپیگنڈہ کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ یہ بات جب میرے علم میں آئی تو مجھے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اور اسی وقت میں نے مولانا مرحوم کو ایک خط لکھا اور اس میں تمام صورت حال تحریر کر ڈالی ——— مرحوم نے اس خط کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے لکھا تھا :-

"حسن میاں! مجھے یہ بتاؤ کہ تم خود جماعت اسلامی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ یہ جماعت تمہارے نزدیک برحق ہے یا نہیں۔ اگر تم اس جماعت کو حق پرستوں کی جماعت تصور کرتے ہو تو پھر مخالفین سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو۔ اگر تمہارا تعلق اپنے پروردگار کے ساتھ مضبوط ہے تو پھر دنیا بھر کے تمام شیاطین مل کر بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ——— حق و صداقت کی راہ اختیار کرو تو قدموں تلے کانٹے نہ بچھائے جائیں۔ تنقید و طنز کے پتھر نہ اچھلیں۔ اختلاف کی آندھیاں نہ چلیں، ہو نہیں سکتا۔ اور اگر تم جماعت اسلامی کے طرز فکر سے خود متفق نہیں ہو تو پہلی فرصت میں ان لوگوں کے طور طریقے اپنا لو۔ دھاندلی بازی۔ انانیت اور جہل مرکب میں از خود گرفتار ہو جاؤ۔ غل غپاڑہ مچاؤ۔ جھوٹ بولو۔ الزام تراشی کا فن سیکھو۔ اوہام و اکاذیب کی اشاعت کرو۔ یہ لوگ تم سے خوش ہو جائیں اور تمہیں اپنا بھائی سمجھ کر سینہ سے لگا لیں گے"۔

مولانا مرحوم نے اس خط میں اس بات کا وعدہ بھی کیا تھا کہ میں نگینہ آؤں گا۔ حالات کا جائزہ لوں گا۔ ماحول کو پرکھوں گا۔ اگر مجھے وہاں کا ماحول اور وہاں

باشندے گو اس خاطر مجبور نہ ہوئے تو میں تمہیں اپنے ساتھ دیوبند لیتا آؤں گا ——— یہ خط انہوں نے مجھے ۲۵ مارچ کو تحریر کیا تھا۔ ۲۸ مارچ کو مجھے یہ خط موصول ہوگیا تھا۔

۳۰ مارچ کو ابراہیم صاحب (مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے) اچانک نگینہ پہنچے اور انہوں نے یہ دلفگار اطلاع پہنچائی کہ بھائی عامر صاحب پر زبردست ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا ہے۔ تمہیں فوراً طلب کیا گیا ہے۔ یہ افسوسناک اطلاع سنکر ہمارے دل و دماغ کی جو کیفیت ہوئی تھی اسے احاطۂ تحریر میں لانا نہ ضروری نہ ممکن۔

مختصر یہ کہ اسی روز رات کو ہم لوگ نگینہ سے دیوبند کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور علی الصبح چار بجے ہم دیوبند پہونچ گئے۔ مرحوم جاگ رہے تھے۔ تیمار دار بیٹھے ہوئے تھے اور حسب توفیق فریضۂ خدمت انجام دے رہے تھے ہم دونوں میاں بیوی کو مولانا نے سینہ سے لگایا۔ اور ان کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو جاری ہو گئے ——— کافی دیر تک ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتے رہے پھر انہوں نے اپنے ہوش حواس سمیٹتے ہوئے اور لب و لہجہ پر قابو پاتے ہوئے کہا ———

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

یہ مصرعہ انہوں نے متعدد بار پڑھا۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے ہماری خیریت دریافت کی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہوں نے رندھی ہوئی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"میری خاطر کتنے لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے"

ذرا اندازہ لگایئے کس قدر وسیع و عظیم تھا وہ انسان جو موت کے بستر پر بھی اپنی تکلیف سے کہیں زیادہ دوسرے لوگوں کی پریشانی اور بے آرامی کا احساس تھا ——— اس وقت بھی اپنا نہیں دوسروں کا غم تھا۔ دوسروں کی پریشانی کا قلق تھا۔

بے شک آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ مرض کی ابتدا کس طرح اور کب ہوئی۔ اس لئے میں اس بارے میں بھی کچھ تفصیل پیش کئے دیتا ہوں۔

۲۹ مارچ کی شب میں دارالعلوم دیوبند میں ایک ادبی نشست تھی۔ اس میں مرحوم کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ اس نشست میں انتہائی کامیابی کے ساتھ انہوں نے سامعین کی فرمائش پر کئی غزلیں سنائیں۔ سامعین کا اصرار تھا کہ کچھ اور سنائیں لیکن مرحوم بہت زیادہ تھک چکے تھے، انہوں نے مزید فرمائش پوری نہیں کی اور بیٹھ گئے۔ دوران نشست میں ہی انھیں اپنے پورے بدن میں درد کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ حتی الامکان برداشت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ بچپن ہی سے بہت متحمل اور صبر و ضبط کرنے والے انسان تھے۔ بڑی بڑی تکالیف اور صدمات وہ مسکراتے ہوئے سہہ لیا کرتے تھے۔ زندگی میں ان کے ہونٹوں پر کوئی ایسا جملہ نہیں آیا تھا جس سے بزدلی اور بے صبری ٹپکتی ہو اور جس پر ناشکری کا اطلاق روا ہو سکتا ہو ——— وہ دل و دماغ کے انتہائی مضبوط انسان تھے۔ لیکن درد خون کی طرح ان کی رگ رگ میں رواں ہو چکا تھا ——— بات ناقابل برداشت ہو چکی تھی ——— وہ اٹھے اور دارالعلوم سے باہر آ گئے ——— وہ ڈاکٹر کے جانا چاہتے تھے۔ راستہ میں شاید وہ ایک جگہ گر نے بھی ——— اور پھر خدا ہی جانے وہ کونسی غیبی قوت تھی جس نے انھیں ڈاکٹر تک پہنچانے میں کامیاب کیا ——— حالت اس درجہ خراب ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی زندگی سے تقریباً مایوسی ہو گئی ——— انہوں نے مرض کی تشخیص کی، انجکشن وغیرہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرحوم کی حالت سنبھلی اور زندگی کی کچھ امید محسوس ہوئی ——— مرحوم کے متعلقین اور احباب بے ساختہ خدا کا شکر ادا کرنے لگے ——— کس قدر پریشان اور افسردہ تھے دیوبند کے وہ عوام جنھیں نہ علم سے کوئی واسطہ نہ عمل سے۔ لیکن وہ مرحوم کو اس حالت میں دیکھ کر کچھ اس طرح مغموم دکھائی دے رہے تھے جیسے

ان کا اور مرحوم کا صدیوں پرانا رشتہ ہو جیسے مرحوم ان کی زندگی کا آسرا ہوں ۔

رات ڈاکٹر صاحب کے مکان پر ہی گذاری ۔ اگلے دن صبح کو انھیں پلنگ پر لٹا کر لایا گیا ۔

ہر بات کو اگر احاطۂ تحریر میں لایا جائے تو مضمون غیر معمولی وسیع اور طویل ہو جائے گا ۔ اور قارئین تجلی اس شمارہ کو احوال واقعی نمبر تصور کرنے لگیں گے ۔ ویسے ہر بات کا اظہار و بیان غیر مناسب بھی ہے اور غیر مفید بھی ۔ اسلئے آئیے اب آگے بڑھیں ۔

۳ر اپریل سے ان کی طبیعت رو بصحت ہونے لگی لمحہ بہ لمحہ کمزوری اور نقاہت میں بھی افاقہ محسوس ہونے لگا چہرے پر بشاشت اور رونق پھر عود کر آئی تھی، ۴ر اپریل کی شام کو اہل خانہ سے کہنے لگے، نو تاریخ کو مجھے بمبئی کا سفر کرنا ہے دعا کرو کہ اس تاریخ تک صحت یاب ہو جاؤں اندازہ کیجئے کہ وہ کس قدر حلیم، نڈر، باہمت اور صاحب جرأت اور پختہ ارادے انسان تھے ۔ بمبئی جانے کا ارادہ اس وقت تک برقرار تھا جب کہ وہ کروٹ بھی از خود نہیں لے سکتے تھے ۔

سبھی اہل خانہ نے اتفاقی طور پر کہا ـــــ پانچ دن میں طبیعت ٹھیک ہونے کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں ہے، ہارٹ اٹیک کا مریض [illegible] سے کبھی نہیں اٹھ پاتا ۔

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا ـــــ تم شاید میرے مالک کی قدرت اور اختیارات سے صحیح معنوں میں واقف ہی نہیں وہ اگر چاہے تو ان چند دنوں میں میری طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے اور میں بمبئی جا سکتا ہوں ۔

کس قدر یقین اور اعتماد تھا انھیں خدا کی قدرت کاملہ پر ! ـــــ شاید اتنا یقین اور اتنا گہرا اعتماد دنیا میں گنتی کے چند مسلمانوں ہی کو ہو گا ۔

پھر ان کی خوش نصیبی تھی کہ شدید کمزوری کے لمحات میں بھی ان کی کوئی نماز قضا اور ضائع نہیں ہوئی ۔ تمام نمازیں وقت پر ادا کرتے رہے کبھی بیٹھ کر اور کبھی اشاروں سے لیٹ کر نماز ادا کرتے ہوئے اس قدر رویا کرتے تھے کہ دیکھنے والوں پر بھی رقت طاری ہو جاتی ۔ ہر دل کانپ اٹھتا اور ہر شخص کی پلکیں بھیگ جاتیں ۔ اس لئے کہ جو آنسو ان کی آنکھوں سے بہا کرتے تھے وہ محض پانی کے قطرے نہیں، بلکہ انمیں خونِ دل کی سرخی اور سوز جگر کا التہاب بھی شامل تھا ۔ اور قاعدہ ہے کہ اگر آنسو "سفید لہو" کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر جو کی آنکھوں سے بہنے والے پانی کی نہیں تو ان میں متأثر کرنے اور لرزا دینے کی جادوئی تاثیر ہوا کرتی ہے اور ایسے قیمتی آنسوؤں کو دیکھ کر مضبوط دل و دماغ والے حضرات کی بھی دنیائے احساس تڑپ اٹھتی ہے ۔ ضبط کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور ان کی آنکھوں سے بھی وہی آنسو رواں ہو جاتے ہیں جن کے ہر ہر قطرے میں دل و جگر کا لہو بھی شامل ہوتا ہے ۔ وہ رو رو کر اپنے معبود حقیقی سے اپنی خطاؤں کی معافیاں طلب کرتے رہے اور ساتھ ہی اپنی صحت کی دعائیں بھی مانگتے رہے سچے آنسو اور دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں ۔ پھر ایسے انسان کی دعا جس نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کے سوا کسی کو مختار کل تصور نہیں کیا ۔ جس نے کبھی کسی کو خدا کا شریک نہیں سمجھا جس نے زندگی بھر جو کچھ بھی مانگا براہ راست اپنے مالک حقیقی سے مانگا کبھی ان کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا جو نفع و نقصان پہنچانے کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے اور جو آیت قرآنی کے بموجب کھجور کی ایک گٹھلی کے بھی مالک نہیں ہیں ۔

مرحوم نے اپنے پروردگار سے کسی کا توسل اور وسیلہ اختیار کئے بغیر دعائیں مانگیں اور دعائیں معجزانہ طریقے پر قبول ہو گئیں ۔ مرحوم دیکھتے ہی دیکھتے چار دن میں صحتیاب ہو گئے ۔ چلنے پھرنے کی تباہ شدہ صلاحیتیں مرحوم کی ذات میں عود کر آئیں ۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں ۔

متعلقین اس تیاری سے خوش نہیں تھے۔ ۹ تاریخ قریب آتی رہی۔ مرحوم کی خوشی اور مسرت میں اضافہ ہوتا رہا اور متعلقین کی تشویش میں۔ اس سفر اور ارادۂ سفر سے خوش کون تھا۔ سراسیمگی کس پر طاری نہیں تھی — اندیشے کس کے دل و دماغ میں نہیں مچل رہے تھے۔ پریشان کون نہیں تھا۔

مرحوم کو ہر ایک نے سمجھایا۔ اقارب نے اس سفر سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ معالجین نے غصہ و ناراضگی کا اظہار کیا۔ دوست و احباب بگڑے لیکن انھوں نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ وہ مختلف قسم کے دلائل پیش کرتے رہے اور یہ باور کراتے رہے کہ ان کا یہ اقدام عین عقل کے مطابق ہے آخری دلیل ان کی یہ تھی کہ اگر میری موت ہی مجھے صدائیں دے رہی ہو تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے بمبئی جانے سے نہیں روک سکتی لہٰذا میں جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صاحبزادے مولوی اسلم صاحب سے انھیں خصوصی تعلق تھا۔ ہمیشہ ہی سے انھیں اپنا چھوٹا بھائی خیال کیا کرتے تھے اور کتنے ہی معاملات میں ان سے مشورے بھی کیا کرتے رہتے تھے اور اکثر معاملات میں ان کی گذارشات کو ترجیح دینے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن اس معاملہ میں ان کی تاکیدات اور گذارشات کی پرواہ نہیں کی۔ مولوی اسلم صاحب نے ہر زاویہ سے سمجھایا۔ دلائل پیش کئے، خوشامدیں کیں۔ لیکن بے سود مرحوم اپنی ضد پر اڑے رہے۔ انھوں نے موصوف کی نصیحت اور گذارشات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی غیر مرئی قوت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اس لئے میں جانے کے لئے مجبور ہوں سارا وقت مجھے سمجھانے اور میری خوشامدوں میں ضائع کیا جا رہا ہے اگر اتنا وقت میرے لئے دعائیں مانگنے میں صرف کیا جائے تو بہر لحاظ بہتر ہوگا۔ جاؤں گا ضرور۔ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کسی کے سمجھانے سے اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

۹ تاریخ آگئی۔ وہ اپنی ضد پر اڑے رہے مجبوراً ہم سب کو ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سفر کی ضروری تیاریاں تو مکمل ہو ہی چکی تھیں۔ ۹ تاریخ کی صبح کو مرحوم بیحد خوش اور ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے روانگی سے چند گھنٹے قبل انھوں نے مجھے اور اپنے برادر خورد عمر فاروق عثمانی (منیجر مکتبہ تجلی) کو اپنے کمرے میں بلایا اور مکتبہ وغیرہ سے متعلق کچھ حسابات سمجھانے لگے ان کاپیوں کی نشاندہی کی جن میں حسابات تحریر تھے بینک اور تجلی سے متعلق بھی بہت سی باتیں سمجھائیں — یہ تک فرمایا اگر میں بمبئی سے واپس نہیں آ ہو سکا تو تم لوگوں کو فلاں فلاں کام انجام دینے ہیں۔ فلاں فلاں ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ وراثت کے بارے میں فرمانے لگے۔ وراثت کے سلسلہ میں وصیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں خود ہی وارثین کے حصے مقرر کر دیئے ہیں قرآن سامنے رکھ کر وراثت تقسیم کر دینا۔

بینک سے متعلق ایک کاغذ اپنی اہلیہ کو دیا اور فرمایا کہ اگر میں نہ لوٹ سکا تو میری موت کے چھ ماہ بعد تمہیں اتنی رقم بینک سے مل جائے گی۔ یہ کاغذ سنبھال کر رکھ لینا۔ مہر کی رقم بھی انہوں نے اہلیہ کے نام بینک میں جمع کرا رکھی تھی۔ حالانکہ مدتوں پہلے ان کی اہلیہ نے مہر معاف کر دیا تھا۔ لیکن مرحوم کہا کرتے تھے کہ میں اس حق کو ضبط کرنا نہیں چاہتا جو میرے مذہب کا مقرر کردہ ہے۔ بیشک تمہاری محبت کا تقاضا تو یہی تھا کہ تم مہر معاف کر دو لیکن میری غیرت اور دین نوازی کا تقاضا یہ ہے کہ میں مہر ادا کروں۔

وہ ہمیشہ سے سیدھا سادا لباس پہنا کرتے تھے قیمتی کپڑوں سے انہوں نے ہمیشہ ہی احتراز کیا تھا۔ گھر والوں کے لئے کپڑے لاتے تو نہایت عمدہ اور قیمتی لیکن اپنے لئے دو ڈھائی روپے میٹر والا کپڑا خریدا کرتے تھے لیکن اس آخری سفر کے لئے انہوں نے شیروانی کا کپڑا

اور شیری کوٹ کی شیروانی تیار کرائی، جوتا بھی نیا خریدا غرضیکہ ہر چیز نئی تھی۔ عمدہ تھی۔ قیمتی تھی۔

نیا لباس اور نیا جوتا پہن لیا۔ شیروانی زیب تن کرلی عطر لگایا۔ سرمہ ڈالا اور اس طرح وہ سراپا دولہا بن گئے اس وقت وہ بے حد مسرور تھے۔ ان کے چہرے سے خوشیوں کا نور ہویدا تھا۔

روانہ ہونے سے کچھ دیر قبل انہوں نے اپنی اہلیہ سے عرض کیا۔ آج سے بیس برس پہلے تم دلہن بنکر اس دنیا میں آئی تھیں اور آج بیس برس کے بعد میں دولہا بن کر اس گھر سے جا رہا ہوں۔

غور کیجئے کتنے معانی پوشیدہ ہیں اس ایک جملے میں — ان کا یہ جملہ سن کر اہل خانہ چونک پڑے۔ سب نے ایک بار پھر سفر کو ملتوی کر دینے کا اصرار کیا۔ لیکن نتیجہ صفر ہی نکلا۔ وہ نہیں مانے۔

چلتے وقت انہوں نے گھر کے ہر ہر فرد کو سینہ سے لگا کر پیار کیا — سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، ہر چہرہ اداسی کا مرکز بنا ہوا تھا — سب کو اداس اور گریاں دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے۔

کتنا عجیب سفر ہے — میں ہنس رہا ہوں اور تم سب رو رہے ہو۔

آج میں سوچتا ہوں کتنے کرّوفر کے ساتھ اور شاہانہ انداز میں وہ موت کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ ادنیٰ درجہ کا بھی تو خوف اور اندیشہ نہیں تھا۔ چہرہ شگفتہ تھا۔ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ لبوں پر تبسم کروٹیں لے رہا تھا —— حسب عادت بات بات پر ہنس رہے تھے۔ لطیفے سنا رہے تھے اور کتنا ہی طرح ایسے ایسے جملے کہہ رہے تھے جو شاید دنیا کی ہر دولت سے زیادہ انمول اور قیمتی تھے۔ جو خلوص اس لائق ہیں کہ انھیں کو فوز و تسلیم سے لکھ کر دنیا کے چپہ چپہ پر آویزاں کر دیا جائے۔

میں ان تمام جملوں کو احاطۂ تحریر میں ضرور لاتا لیکن مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ

آپ روداد پڑھتے پڑھتے اکتا جائیں۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ تطویل سے پہلو تہی کی جائے اور واقعہ سے متعلق چند باتیں اور لکھ کر قلم کو روک دیا جائے۔

راقم الحروف اور چند لوگ صبح نو بجے دیوبند سے دہلی کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ مرحوم کا ارادہ دیوبند سے بذریعہ کار دہلی تک جانے کا تھا۔ کار کی رفتار یقیناً تیز ہوا کرتی ہے اس لئے ہمیں یقین تھا کہ مرحوم ہمارے بعد روانہ ہوں گے لیکن ہم سے پہلے ہی دہلی پہنچ جائیں گے دہلی کے لئے مظفر نگر سے بس پکڑنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ دیوبند سے مظفر نگر گئے۔ مظفر نگر کی بس فوراً ہی مل گئی تھی۔ لیکن مظفر نگر سے دہلی جانے والی بس فوراً نہیں مل سکی۔ کافی دیر تک کوفت اور انتظار کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ گیارہ بجے بس ہاتھ آئی۔ تین بجے کے قریب ہم لوگ دہلی پہونچ گئے۔ ہمیں صرف توقع نہیں بلکہ یقین تھا کہ مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گئے ہوں گے۔ چنانچہ ہم مفتی صاحب کے دولت خانے پر پہنچے، وہاں جا کر مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔ فکر لاحق ہوئی۔ جہاں جہاں ان کے آنے اور ٹھیرنے کی توقع تھی، فوراً ہی وہاں وہاں پہنچے۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کی۔ لیکن ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا کہ یہاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ انھیں چار بجے تک لازماً دہلی پہونچ جانا چاہئے تھا۔ جس گاڑی میں ان کی سیٹ ریزرو تھیں وہ دہلی سے چار بجکر بیس منٹ پر روانہ ہو جاتی ہے۔ ادھر ادھر تلاش و جستجو کے بعد ہم لوگ اسٹیشن پہنچے۔ خیال ہوا تھا کہ شاید سیدھے پلیٹ فارم پر ہی نہ جا پہنچے ہوں۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہی ثابت ہوا وہ وہاں بھی نہیں ملے۔ ساڑھے چار بھی بج گئے وہ نہیں آئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ ٹکٹ کینسل کرا دئیے گئے۔ دماغ تو ہم وسوسوں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ تشویش ہی تشویش، اندیشے ہی اندیشے۔ تفکرات ہی تفکرات۔

کیا ضرورت پیش آئی ۔ ابھی تک کیوں نہیں پہونچے ۔ عصر سے پہلے ہی تھے یا نہیں ۔ راستہ میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہوئی   غرضیکہ دل و دماغ میں تفکرات کا ایک طوفان برپا تھا ۔ ہم سب کے چہرے پھیکے پڑ گئے تھے ۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں ہم اسٹیشن سے واپس ہوئے ۔

مغرب کے وقت پل بنگش پر پہنچکر ہمیں معلوم ہوا کہ مرحوم بمع متعلقین تشریف لا چکے ہیں ۔ تشویش دور ہوئی ، دل کو یک گونہ اطمینان ہو گیا   ہم نے دل ہی دل میں پروردگار کا شکر ادا کیا ۔ لیٹ ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کار   جو درحقیقت بے کار تھی ۔ راستہ میں شدید بیمار ہو گئی تھی ۔ مرض کی تشخیص اور علاج میں کئی گھنٹے برباد ہو گئے ۔

جن صاحب نے ہمیں مرحوم کے دہلی پہونچنے کی اطلاع دی تھی ان سے ہم نے کہا   "ٹکٹ تو کینسل کرا دیئے گئے تھے ۔ گاڑی بھی روانہ ہو گئی ، اب کیا کیا جائے ۔

انھوں نے جواب دیا ۔ بھائی صاحب (ماہر عثمانی) نے یہاں پہنچتے ہی کل صبح کی گاڑی میں سیٹ ریزرو کرانے کا حکم دے دیا تھا ۔ ادر چار و ناچار ہمیں ان کے آگے سر نیاز خم کرنا ہی پڑا   چنانچہ سیٹ ریزرو ہو چکی ہیں ، گاڑی صبح ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوگی ۔

رات بارہ بجے تک ہم سب لوگ جاگتے رہے اور مولانا مرحوم کے پاکیزہ ہنسی مذاق سے لطف اور حظ اٹھاتے رہے ۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے ہماری آنکھ ذرا دیر میں کھلی ، لیکن مرحوم حسب عادت چار بجے اٹھ گئے تھے ۔ جس وقت ہماری آنکھ کھلی وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے انھوں نے گھڑی دیکھ کر فرمایا اٹھ جاؤ ورنہ نماز کا وقت تنگ ہو جائے گا ۔ ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے   نماز سے فراغت کے بعد

ہم سب نے مولانا کو گھیر لیا ۔ پھر وہی ہنسی مذاق اور ہنگامے کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔

دوران گفتگو میں شمیم صاحب (مولانا مرحوم کے حقیقی چچا زاد بھائی) نے کہا ، بھائی صاحب ! ابھی حال ہی میں شمیم کرہانی صاحب کا انتقال ہوا ہے ۔ مشاعرے کے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ اچانک دل کی حرکت بند ہو گئی ۔ ان کی موت کا روح فرسا منظر آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے ۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں خدا نخواستہ   آپ کے ساتھ بھی کوئی غیر معمولی حادثہ پیش نہ آ جائے ۔ لہذا ہماری گزارش قبول کر لیجئے اور سفر کا ارادہ ترک کر دیجئے ۔

شمیم صاحب کی بات سنکر مرحوم اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے تھے ۔

" سفر ملتوی نہیں کر سکتا ، جو قضا و تقدیر کو منظور ہوگا ہو جائے گا ۔ بس دعائیں کرتے رہنا   روکنے کی کوشش مت کرو "

تھوڑی دیر خاموش رہکر انہوں نے فضا میں یہ فقرہ اچھالا تھا ۔

" آاں زندگی بھر یاد کرو گے کہ عجب دیوانہ تھا آدمی تھا "

آٹھ بجے سب لوگ اسٹیشن پر موجود تھے ۔ مولانا کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں ۔ مولانا نے اپنی اہلیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حدیث میں یہ آیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے اور فریق ثانی پھر کسی اور سے رشتہ نکاح قائم نہ کرے تو جنت میں ان دونوں کا ملن کرا دیا جاتا ہے ۔ میں تو تمہیں بہر اعتبار پسند کرتا ہوں اگر تم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری بنکر رہنا چاہتی ہو تو میرے بعد کسی اور سے ازدواجی رشتہ قائم نہ کرنا ۔

یہ بات سنکر تھا ایک بار پھر بوجھل اور اداس ہوگئی۔ ہم لوگ ایک بار پھر گہری اداسی میں ڈوب گئے تھے۔ مرحوم بھی اس وقت کچھ کھوئے کھوئے اور افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ افسردگی اور اداسی کا سلسلہ نہیں ٹوٹا تھا کہ گاڑی آگئی اور مرحوم گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے حمائل شریف مجھے دی اور مندرجہ ذیل آیت کے بارے میں فرمایا ذرا تلاش کرنا کس سپارے میں ہے

قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ
اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ
عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

میں نے ابھی حمائل ہاتھ ہی میں لی تھی کہ گاڑی نے بذریعہ سیٹی چلنے کا اعلان کیا۔

مرحوم نے حمائل واپس لے لی اور فرمایا تم لوگ ترجاؤ میں خود تلاش کروں گا۔ چنانچہ ہم لوگ گاڑی سے اتر گئے۔ انہوں نے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ دعائیں دیں۔ اور اپنے لئے دعاؤں کا تقاضا کیا۔ انہوں نے بڑی حسرتناک نظروں سے اپنی اہلیہ کو دیکھا۔ ان کے لبوں پر بدستور تبسم جلوہ گر تھا۔ لیکن مجھے ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ گاڑی سرکنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

یہ تمام واقعات اپریل کی دس تاریخ تک پیش آئے تھے۔ اسی تاریخ میں شام کو ہم دہلی سے دیوبند واپس آگئے۔ گیارہ اپریل کی شام عصر بعد ان کا ٹیلیگرام موصول ہوا کہ میں بخیر و عافیت بمبئی پہونچ گیا ہوں اور تادم تحریر بخیر ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہم مطمئن ہوگئے۔ شکرانے کے طور پر ایک بکرا ذبح کرکے غریبوں میں تقسیم کرادیا گیا اور میں اسی رات کو نگینہ روانہ ہوگیا۔

۱۳ اپریل کی دوپہر کو مجھے ٹیلیگرام موصول ہوا۔ جس میں تحریر تھا۔ عامر عثمانی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ چھوٹا سا فقرہ پڑھ کر میرے دل و دماغ کی جو کیفیت ہوئی تھی اس کو بے روح کے الفاظ اردو میں نہیں سمیٹا جا سکتا ویسے اس کا صحیح اندازہ آپ لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھتے ہی جو کیفیت آپ حضرات کی ہوئی ہوگی بالکل وہی کیفیت میری بھی ہوئی تھی میری آنکھوں سے اسی طرح آنسو جاری ہوگئے تھے جس طرح آپ حضرات کی آنکھوں سے جاری ہوئے ہوں گے میں بھی بالکل اسی طرح لرز اٹھا تھا جس طرح آپ لرز اٹھے ہوں گے

افسوس اس بات پر نہیں تھا کہ میرے خسر کا انتقال ہوا ہے۔ میرا باپ روپوش ہوگیا ہے۔ افسوس اور دکھ اس بات کا تھا اور ہے کہ ایک عالم دین اس دنیا سے چل بسا ہے۔ ایک بہترین نقاد ہمیں داغ مفارقت دے گیا ہے، اور نقاد بھی ایسا جو واحد اور منفرد تھا۔ جو یکتا اور یگانہ تھا۔ دور دور تک جس کا کوئی ثانی نہیں، بدل نہیں، مماثل نہیں۔

منٹوں میں یہ خبر نگینہ بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خدا کے بندے تعزیت کے لئے آنے لگے۔ ان کے چاہنے والے کہاں نہیں تھے۔ کہاں نہیں ہیں۔ نگینہ میں بھی ان لوگوں کو ان سے والہانہ عقیدت تھی ——— محبت تھی پیار تھا۔

دن کا بقیہ حصہ بڑی پریشانی سے گذرا۔ گاڑی رات کو ۹ بجے ملتی ہے۔ خدا خدا کرکے ۹ بجے اور ہم میاں بیوی پھر دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے۔ صبح سات بجے دیوبند کے پلیٹ فارم پر اترے اور اترتے ہی ہمیں یہ اطلاع ملی کہ لاش یہاں نہیں آسکی لہٰذا انہیں بمبئی ہی میں سپرد خاک کردیا گیا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احوال و واقعات کو بھی قلم بند کر دیا جائے جو بمبئی میں پیش آئے۔ یہ تمام تفصیلیں مولانا کے سالے ابراہیم صاحب سے معلوم ہوئی تھیں، جو مولانا کے ہمراہ بمبئی تک گئے تھے اور انہیں دفن کرنے کے بعد دیوبند واپس آئے۔

حمائل ان کے پاس موجود رہی تھی۔ جس میں ان کا اکثر وقت قرآن حکیم کی تلاوت میں گذرا۔

بمبئی میں وہ دو دن رہے۔ انہوں نے وہاں احباب اور معتقدین کی محافل میں عجیب و غریب باتیں کیں جو درحقیقت اپنی موت کی پیشین گوئیاں تھیں جنھیں سنکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی موت کی آمد کا علم و ادراک ہو گیا تھا۔

بمبئی کے مشاعرے میں انہوں نے چند قطعے اور ایک غزل کے چند اشعار پڑھے، ایک بجے وہ اپنا کلام سامعین کی خدمت میں پیش کر کے واپس اپنی قیامگاہ پر تشریف لے آئے۔

حسب عادت صبح چار بجے وہ بیدار ہو گئے۔ اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد وہ قلم و کاغذ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنی بیوی کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا ــــ یہ ان کی آخری تحریر تھی اس کے بعد انہوں نے قلم ہاتھ میں نہیں لیا۔ اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو اپنے خدا پر کس قدر بھروسہ تھا۔ کتنا اعتماد تھا۔ وہ خدا کی عظمت و کبریائی کے کس درجہ قائل تھے۔

یہ خط آپ عامر عثمانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے چھ صفحوں پر مشتمل یہ خط ان کے ایمان و اعتقاد کی مفصل اور جامع تصویر اور ان کے زندگی بھر کے کردار و عمل کا آئینہ دار ہے ــــ آپ کی دلچسپی کے لئے اس خط کو ہم من و عن شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پونا کے مشاعرے میں شرکت کرنے کا ارادہ وہ ترک کر چکے تھے۔ انہوں نے خط میں بھی یہ بات لکھی تھی کہ بمبئی کے مشاعرے میں ہی شرکت کی خواہش تھی۔ اب مزید پر ہیزی کرنا نہیں چاہتا۔ لہذا پونا جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں۔ لیکن شومئ قسمت دیکھئے کہ کسی محبّ نے بے پناہ اصرار کیا اور انھیں پونا جانے کے لئے آمادہ کر ہی لیا۔ مرحوم ہفتہ کے روز تین بجے پونا کے لئے روانہ ہو گئے اور سات بجے پونا پہونچ گئے۔ رات کو مہمان خصوصی جناب محسن صاحب (مرکزی نائب وزیر داخلہ) کی تقریر کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ دو تین شاعروں کے بعد مولانا نے گلزار دہلوی (ناظم مشاعرہ) سے عرض کیا، مجھے پڑھنے کا موقعہ جلد عنایت فرما دیجئے میری طبیعت خراب ہے اور میں آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ ــــ حسب گذارش گلزار صاحب نے جلد ہی مولانا کا تعارف کرایا اور ان سے اپنا کلام بلاغت نظام پیش کرنے کی فرمائش کی۔ مرحوم نے مائک کے قریب جاکر فرمایا ــــ میں بیمار ہوں بیٹھ کر پڑھ سکوں گا۔ مائک جھکا دیا گیا اور مرحوم نے بیٹھ کر اپنا کلام نذرِ سامعین کرنا شروع کیا ــــ انہوں نے پہلے چند قطعے پیش کئے، پھر وہ نظم پڑھی جو ان کی کامیاب ترین ذہنی تخلیق ہے اور جو خود مرحوم کو بے پناہ محبوب تھی یہ نظم آپ عامر عثمانی نمبر میں جلوہ گر ہونے والی ہے۔ آپ اس کو پڑھنے کے بعد خود بھی اندازہ کر لیں گے کہ واقعتہً اس کا ایک ایک بند، ایک ایک مصرعہ انمول اور بے نظیر ہے۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے میں شعریت اور تغزل کے خزینے پنہاں ہیں۔

نظم انتہائی کامیاب رہی۔ مرحوم نے سامعین اور ناظرین سے بے پناہ داد وصول کی ــ نظم سے فراغت کے بعد مرحوم اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئے اور اپنا سر گاؤ تکیے پر رکھ لیا۔ جیسے کہ بہت زیادہ تھک گئے ہوں۔ اس وقت وہ بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ انھوں نے تین بار اللہ، اللہ، اللہ کہا اور پھر بالکل خاموش ہو گئے۔ نقاہت اور کمزوری ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے

شیروانی اتارنے کی کوشش کی جو اتار دی گئی ———
ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو تشویش ہوئی۔ ابراہیم صاحب نے
پنکھا جھلنا شروع کیا۔ وقار احمد صاحب نے کمر سہلائی
دوسرے صاحبان بھی ہوا کرتے رہے اور تشویش و پریشانی کا
اظہار کرتے رہے۔ ڈاکٹر بھی اسٹیج پر موجود تھے ان کی رائے
اور مشورے کے مطابق مولانا کو اتار لے گئے۔ ڈاکٹر
صاحبان نے انجکشن لگائے، دوائیں دیں۔ لیکن مرحوم
کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی ہی رہی۔ اس لئے متفقہ طور پر
یہ طے ہوا کہ انھیں ہسپتال لیجایا جائے — چنانچہ
بذریعہ کار انھیں ہسپتال لے گئے۔ لیکن وہاں پہنچکر
معلوم ہوا کہ مولانا کی روح پرواز کر چکی ہے اور وہ
اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو چکے ہیں ———
ایک بار پھر پڑھ لیجئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی لاش کو دیوبند لانے کی ہر ممکن کوشش
کی گئی۔ لیکن کچھ قانونی پیچیدگیاں حائل ہو گئیں اور
حسب خواہش ان کی لاش کو دیوبند نہیں لایا جا سکا
رات بارہ بجے کے قریب ان کا انتقال ہوا تھا اور اگلے
دن دوپہر بارہ بجے ناریل باڑی قبرستان میں انھیں
سپرد خاک کر دیا گیا۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا عامر عثمانی رح کی وفات اہل دیوبند کے لئے
ایک بہت بڑا حادثہ اور ایک روح فرسا قیامت تھی۔ بچہ
بچہ سوگوار اور ماتم کناں تھا۔ در و دیوار سے اداسیاں
ٹپک رہی تھیں۔ ہر گھر اور گھر کا ہر فرد متاثر، افسردہ اور
رنجور تھا۔ ہر دل تڑپ رہا تھا، ہر آنکھ رو رہی تھی،
ہر چہرہ اداس تھا اور ہر نفر اپنے ماحول میں ایک ایسا خلا
محسوس کر رہا تھا جسے پر نہیں کیا جا سکتا، جس کی تلافی
ممکن نہیں۔

ان کی وفات کی اطلاع سننے کے بعد ان
حضرات کی آنکھیں بھی خون دل سے لبریز ہو گئی تھیں
جو ان کے ہمدرد تھے نہ خیر خواہ۔ نہ مونس تھے نہ معتقد
نہ دوست واضح ہوئے کہ وہ ہم رشتہ تھے
بہر اعتبار کل ان کی زندگی میں بھی ان کے بدخواہ تھے
اور آج ان کی موت کے بعد بھی ان کے بدخواہ ہی ہیں
ان کے دشمنوں کے چہروں پر بھی غم کے اندھیرے
بکھرے ہوئے تھے۔ اداسیاں جلوہ طراز تھیں
اور یہ اس بات کی واضح علامت تھی کہ مولانا عامر
عثمانی رح کی وفات ایک ایسا سانحہ تھی جس سے ہر شخص
فطری طور پر اور خواہی نخواہی متاثر تھا۔ یا دل ناخواستہ
بھی ہر قلب رونے اور ماتم کرنے پر مجبور تھا۔

تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا
بیرون دیوبند سے بھی ان گنت لوگ کشاں کشاں
تعزیت کے لئے چلے آ رہے تھے۔ حکیم الاسلام حضرت
مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع
کلکتہ میں ملی تھی۔ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی موصوف
دیوبند پہنچے اور تعزیت کی غرض سے مرحوم کے گھر
تشریف لائے۔ انہوں نے مرحوم کی بے پایاں خدمات
جانبازانہ استدلال، جرأت، بیباکی اور قوت تحریر کا
اعتراف کرتے ہوئے اس غم اور صدمہ کا اظہار کیا۔ جو
مرحوم کی وفات سے واقعتہً انھیں پہنچا تھا اور جسکے
غیر معمولی اثرات و مظاہر ان کے چہرے پر بھی محسوس
کئے جا رہے تھے۔ ہم نے قبلہ مہتمم صاحب کو مرحوم کا وہ
آخری خط دکھایا جو انھوں نے ۱۲ اپریل کی صبح کو یعنی
دوسرے جہاں میں منتقل ہونے سے اٹھارہ گھنٹے پہلے
لکھا تھا اور جو ان کے انتقال کے تین روز بعد ان کی اہلیہ کو ملا
اس خط کو پڑھنے کے بعد موصوف نے خوشی اور مسرت
کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔
اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو اپنے
پروردگار سے بے لوث اور والہانہ تعلق تھا۔ حضرت
قبلہ مہتمم صاحب صرف یہ نہیں کہ تعزیت کے لئے تشریف
لائے بلکہ اگلے دن انھوں نے مرحوم کے گھر آکر ایک
مفصل تقریر بھی کی جو ضبط کے قواعد پر

تھی دلی اور مرحوم کی غیر معمولی خدمات کو سراہتے ہوئے
بتایا کہ وہ مرے نہیں، مومن مرتا نہیں، ایک جہاں سے
دوسرے جہاں میں منتقل ہو جاتا ہے   مزید یہ بھی
فرمایا کہ غریب الوطنی کی موت منجملۂ شہادت ہے۔
آپ لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور ضبط و تحمل
سے کام لینا چاہیے۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلمین بھی کثیر تعداد
میں تعزیت کرنے کے لئے آئے اور رنج و غم کا اظہار
فرمایا۔ آج اس حادثہ کو ایک ماہ سے زائد ہو چکا ہے
لیکن اب تک بیرون دیوبند سے لوگ تعزیت کے لئے
آ رہے ہیں۔ ٹیلی گراموں اور تعزیت ناموں کا تو کوئی
شمار ہی نہیں۔ ملک اور بیرون ملک سے تعزیتی خطوط
برابر موصول ہو رہے ہیں۔ اور خدا ہی جانے یہ سلسلہ
کب تک چلے گا۔ تعزیت ناموں کا ڈھیر دیکھ کر مرحوم
کی قدر، عزت اور حیثیت و مقام کا اندازہ لگانا
کچھ مشکل نہیں۔

بعض تعزیت کرنے والوں نے درد و کرب میں
ڈوبے ہوئے ایسے ایسے جملے لکھے ہیں کہ کوئی بھی انسان
انہیں سنکر روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ
ان جملوں کو ہدیۂ ناظرین کریں لیکن ان جملوں کو نقل
کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ چند صفحات اور سیاہ کر دئیے
جائیں اور یہ بات چند وجوہ سے مناسب و ممکن نہیں
اس لئے ہم دل کی بیتابیوں اور جذباتی تقاضوں کا
گلا گھونٹ کر صرف ایک خاتون کا مکالمہ نقل کرنے پر
اکتفا کر رہے ہیں۔

یہ خاتون اپنے زہد و تقویٰ، طہارت و تقدس
اور نیک نیتی کے اعتبار سے دیوبند بھر میں مشہور رہیں۔ نام
بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بس اتنا سمجھ لیجئے
حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ کی زوجۂ محترمہ
ہیں کئی بار تعزیت کی غرض سے تشریف لائیں اور انہوں
نے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ عامر بھائی کے انتقال سے

دلی صدمہ پہنچا۔ صبر نہیں آتا۔ ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے میرے ہی گھر کا کوئی فرد چل بسا ہو۔ واقعہ یہ ہے
کہ ان کی رحلت سے صرف ان کے بچے یتیم نہیں ہوئے
ایک دنیا یتیم ہو گئی ہے۔ ایک تاریخ یتیم ہو گئی ہے
وقت یتیم ہو گیا ہے، امتِ مسلمہ یتیم ہو گئی ہے — وہ
روایات یتیم ہو گئی ہیں جن کا سلسلہ زینہ بہ زینہ۔ منزل
بہ منزل حق و صداقت کے عظیم میناروں سے جا کر
مل جاتا ہے

میں کم و بیش چودہ سال سے مرحوم کے مکان میں
مقیم ہوں۔ انھیں قریب اور بہت ہی قریب سے دیکھنے
کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہ
دعویٰ کروں کہ مرحوم کے بارے میں جتنی واقفیت مجھے
تھی کسی دوسرے کو نہیں تھی۔ انھیں مجھ سے اچھوتا اور
خاص اخلاص قسم کا تعلق تھا۔ وقتاً فوقتاً علم و عمل کے
بارے میں جس قدر زرّیں اور قیمتی نصیحتوں کی سوغات
سے مجھے نوازا تھا شاید ہی کسی اور کو نوازا ہو۔ وہ صرف
قائم مقام باپ ہی کے نہیں تھے بلکہ وہ میرے لئے ایک
بہترین قائد تھے اور ایک ذی فہم مشاور بھی۔
ان ہی کی ہدایت، ترغیب و تلقین اور نصیحت و
فہمائش کی روشنی میں میں نے زندگی گزارنے کا صحیح راستہ
اور صحیح خطوط متعین کئے تھے۔
مرحوم ہی نے مجھے ان بلند پایہ ثابت شدہ حقائق
سے روشناس کرایا تھا جو قطعاً میری نظروں سے
اوجھل اور میرے شعور و فہم کی دسترس سے باہر تھے۔
میں مرحوم سے اکثر جماعتِ اسلامی کے بارے میں
بحثیں کرتا۔ بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات میں وہی
گندا اور جارحانہ رویہ اختیار کرتا جو جماعت اسلامی کے
سلسلہ میں مخالفین اور حاسدین کا رویہ ہے اور جس پر
بغض و عناد، تہمت و بہتان، کذب و افترا اور طوفانِ
بدتمیزی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن مرحوم ہمیشہ سنجیدگی

حبدۂ تحمل، لب و لہجہ کی نرمی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ قائم رکھتے ہوئے حقیقت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور ایسے دل و دماغ سے ان شکوک و شبہات کو مٹانے کی سعی کیا کرتے تھے. جو جماعت سے متعلق تھے اور جو ناواقف حضرات اور متعصبین کی تحریریں پڑھ کر جن کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئے تھے ان کی پیہم نصیحتوں اور کوششوں کے بعد ایک دن میں یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو گیا کہ موجودہ وقت میں جماعت اسلامی ہی وہ واحد جماعت ہے جو زندگی اور وقت کے تمام تر تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہی ہے. جو اسلامی روایات سے واقف ہے اور دنیاوی معاملات سے. جو مذہبی نشیب و فراز سے بھی واقف ہے اور سماجی اونچ نیچ سے بھی جس کا نقطۂ نظر بھی خالص اسلامی ہے اور طریقۂ کار بھی۔

مرحوم جماعت اسلامی کے رکن نہیں تھے —— انھوں نے باضابطہ اور باقاعدہ کبھی جماعتِ اسلامی سے تعلق قائم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ جماعت کے ذمہ داروں کی طرف سے متعدد بار پیش کش کی گئی۔ لیکن انھوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ وہ جماعت کے امیر اور سرگرم کارکن بننے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے لیکن دل کی گہرائیوں سے انھوں نے جماعت اسلامی کو برحق، جماعت اسلامی کی دعوت کو قابلِ قبول اور جماعتِ اسلامی کے اصول و ضوابط کو خالص اسلامی تصور کیا اور اسلامی باور کرایا۔ وہ اپنے گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر قلم و کاغذ کے ذریعہ جماعت کا دفاع کرتے رہے اور ان لغو اور کھلے اعتراضات و الزامات کا جواب دیتے رہے جو کج فکری، کم علمی اور کوتاہ فہمی کی وجہ سے جماعت پر چسپاں کر دیئے گئے تھے اور علمی اور حقیقی نقطۂ نظر سے جن کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

مرحوم نے بظاہر جماعتِ اسلامی کے مؤید و طرفدار تھے لیکن درحقیقت پس پردہ وہ اسلام کے پرستار اور حامی تھے، جو تمام اقوام اور پوری کائنات کے لئے مبعوث کیا گیا ہے —— جو واقعتاً سچا، پاکیزہ اور فطری مذہب ہے۔

وہ آخری دم تک اسلام کی حمایت اور طرفداری کرتے رہے۔ اسلام کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں کے سامنے ہمیشہ ایک مردِ مجاہد کی طرح سینہ سپر ہو گئے اور طاغوتی قوتوں کا سر کچلتے رہے۔ اسلام کی بیخ کنی ہر شکل اور کفر و الحاد کے ناخداؤں سے برسرِ پیکار رہے۔

ایک طرف قادیانی تھے، دوسری طرف بریلوی حضرات۔ ایک طرف خدا بیزار طبقہ تھا تو دوسری جانب اسلام کے وہ نادان دوست دندنا رہے تھے جو بظاہر اسلام کے شیدا ہی تھے جن کی نیتیں بھی پاک و صاف تھیں، نظریات بھی مشرکانہ نہیں تھے لیکن جو اسلام کو مستقل اور غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے اور جو حقیقتاً دین کی بنیادوں کو ڈھانے یا کھوکھلا کرنے میں ہمہ تن مصروف و منہمک تھے۔

مرحوم ہر کفر زدا اور دین بیزار فرقے سے ٹکراتے رہے اور آخری سانس تک اس کارزارِ حیات میں مصروف جنگ رہے۔ متفرق محاذوں کی مخالف قوتوں نے ان پر یلغار کی، غیظ و غضب کے شعلے برسے، تیر زہر آلود کئے گئے۔ ملامتوں کے پتھرا چھلے، گالیوں کی بوچھار ہوئی، کفر کے فتوے داغے گئے

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن انھیں حق و صداقت کی راہ سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹانے میں کوئی طاقت، کوئی نا پاک حربہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ انھوں نے ایک ہی محاذ سے تن تنہا سب کا مقابلہ کیا —— گمراہیوں کی دھجیاں اڑا دیں اور کفر و شرک کے دامن داغدار کو تار تار کر دیا۔

انھوں نے مصلحت پرستی کی کمزور روش کو کبھی نہیں کیا۔ جب اندر جو کچھ کہا برملا بے لاگ، ڈنکے کی چوٹ اور انتہائی بے باکانہ اور جرأت آمیز لہجہ میں کہا۔ تیغ و قرطاس

تاریخ و تمدن کی پرواہ کئے بغیر کہا۔ جب کہتے کھری کھری اور دو ٹوک۔ برملا اور بے خوف۔ قطرہ برسرعام اور بے جھجک کہتے۔

وہ نہ کبھی حالات سے خوف زدہ ہوئے نہ یا اسد بن کی تعصب آمیز بدگفتاریوں سے۔ کتنی ہی بار انھیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں، بدتمیزی کے غیر معمولی مظاہرے ہوئے، ظالمانہ حملے کیے گئے۔ مکتبہ تجلی کو نذر آتش کرنے کی ناپاک سازش بھی کی گئی۔ یہ سب کچھ باقاعدہ منظم پلان اور پروگرام کے تحت کیا گیا۔ لیکن کوئی دھمکی، کوئی وارننگ، کوئی اقدام انھیں خاموش اور مجبور نہ کر سکا۔ انھیں حق پرستی کی راہوں میں مصلحت پسند نہ بنا سکا۔ وہ انتہائی بہادری، بیباکی اور جفاکشی کے ساتھ ایمان و عقائد کی سرحدوں کی حفاظت اور دفاع کرتے رہے۔ سزائیں اور مخالفتیں انھیں ہراساں اور خوف زدہ نہ کر سکیں —— انھوں نے ظلم و ستم سہنے، وقت اور ارباب قوت و اقتدار کا عتاب برداشت کرنے کے بعد بھی نہ قلم توڑا نہ کاغذ پھاڑا۔ نہ اپنے کئے پر شرمندہ ہوئے نہ مصلحت سے کام لیتے ہوئے زبان پر قفل چڑھایا۔ وہ حسب معمول حق و باطل کے فرق کو واضح کرتے رہے۔ وہ ثابت کرتے رہے کہ ہر سفید چیز دودھ اور ہر چمکدار شے سونا نہیں ہوتی۔ ہر مقدس اور معصوم چہرا قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ ہر مذہب، ہر عقیدہ، ہر تصور ہر فلسفہ، ہر بزرگ کی ہر بات اس لائق نہیں ہوتی کہ آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیا جائے اور عملاً اسے نص قطعی کا مقام دیا جائے۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے دنیا ان سے خفا تھی زمانہ ان کا دشمن تھا۔ اپنے اور پرائے مخالف تھے لیکن انھیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انھیں صداقت اور سچائی سے پیار تھا۔ اور وہ سچائی کی خاطر دنیا بھر کی مخالفتیں اور تلخیاں خریدنے کے لئے تیار رہتے تھے —— اس وقت علامہ اقبالؒ کے دو شعر بیساختہ یاد آگئے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

جو لوگ مولانا عثمانیؒ کے صرف نام سے یا صرف شکل صورت سے متعارف تھے ان کے ساتھ ملاقات و تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا وہ یقیناً اس فکر میں اور غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ عامر عثمانی کرخت اور پتھریلے مزاج کا آدمی ہوگا۔ اور عام مولویوں کی طرح بدخلق، بداطوار، اکھڑ دماغ اور اکڑفوں،

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی جو شخص احقاق حق اور ابطال باطل کے وقت سنگ آہن کا مجسمہ بن جاتا تھا وہی شخص باہمی معاملات، آپسی معاہدوں، سماجی محفلوں میں انتہائی نرم خو نرم گو اور سراپا انکسار و عجز محسوس ہوتا تھا۔

کفر و باطل اور گمراہیوں کے علمبرداروں سے مقابلہ کرتے وقت وہ از سرتا پا پتھر کی ڈھال اور لوہے کی تلوار بن جاتے تھے لیکن مومنین اور مسلمین کے روبرو وہ انتہائی نرم گفتاری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور ان کے لب و لہجہ سے ہمدردی، اپنائیت محبت و اخوت اور محبانہ پیار کی بو آیا کرتی تھی

اگر علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ان کی غلطی ثابت نہ ہوتی تو علمائے دین سے دنیا بھر کی ذہنی صلاحیتیں حرکت میں آ کر بھی ان کے قلم کو ساکت اور ان کی زبان کو خاموش نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن جب ان کی غلطی اور بھول چوک ثبوت کے درجہ تک پہونچ جاتی تو وہ انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اور تجلی کے صفحات پر ہی علی الاعلان اپنی کم علمی اور زود نگاری کا اعتراف کر لیا کرتے تھے یہ شعر ان کی مستغنا طبیعت پر حرف بحرف صادق

آتا ہے —!

جن سے دل کہسار میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جن سے دہل جائیں وہ طوفان

چونکہ ان کی زندگی کی مخصوص جھلکیاں عجیب و غریب واقعات، قیمتی اقوال اور شخصیت و مزاج سے متعلق نوع بہ نوع حقیقتیں ہم مولانا عامر عثمانی نمبر میں پیش کریں گے اس لئے اگر اس مضمون میں کچھ تشنگی سی ہو تو آپ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیے گا۔

کچھ اور ضروری باتیں

ناچیز کا ترتیب دیا ہوا پہلا شمارہ حاضر ہے۔ اس بات کی قطعاً توقع ہی نہیں ہے کہ آپ اسے دیکھتے ہی واہ واہ کر اٹھیں گے، بلکہ از خود مجھے اس بات کا احساس ہے تو مرحوم کی تحریروں کے سامنے میری تحریر زیادہ گوئی کی حیثیت رکھتی ہے ...... اور یہ بالکل بیداری ہے جیسے روح افزا کے عادی کو گڑ کا شربت

پلا دیا جائے اور شمارے میں آپ کی قوتِ حس معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی، نقائص و معائب محسوس کرے گی۔

نظر ثانی کے بعد مضامین کاتب کے حوالے کئے گئے تھے پھر بھی اگر کوئی نقص، کوئی عیب، یا کوئی علم و ادب سے متعلق ایسی غلطی باقی رہ گئی ہو جو قابلِ گرفت اور ناقابلِ نظر انداز ہو تو ہمیں ضرور مطلع فرما دیا جائے گزارش اور التجا ہے کہ نکتہ چینی اور تنقیص و تنقید کی راہ اختیار کرنے کی بجائے سہو اور چوک کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائیں۔ اس طرح ہم آپ کے مشکور بھی ہوں گے اور کچھ نہ کچھ آپ کے اجر و ثواب بھی ہاتھ آئے گا۔

اگر کسی بھی وقت آپ نے دلائل و براہین کے ذریعہ ہماری کوئی غلطی ثابت کر دی تو ہم بصد خلوص اور نہایت عدہ پیشانی سے اعتراف کر لیں گے اور مولانا عامر عثمانی کی تقلید اتباع کرتے ہوئے تجلی کے صفحات میں بر ملا اس کا اعلان کریں گے۔

لیکن یہ بات اس شرط کے ساتھ مشروط ہے جب ہماری غلطی حجت و بیان کے توسط سے ثابت کی جائے۔ خواہ مخواہ کے اعتراضات کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

بعض حضرات نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے کہ تجلی کا وہ معیار باقی رکھا جائے جو مرحوم کی زندگی میں تھا۔ اندازِ تحریر بھی بالکل وہی ہو جو مرحوم کا تھا —— یہ مشورہ نہ غلط ہے نہ غیر مناسب —— لیکن اسے ہمارے دینی بھائیو! —— فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ مرحوم کے طرز و اسلوب کو ہو بہو اپنا لیا جائے۔ اور ان کے اندازِ نگارش کی نقل کاپی کر لی جائے۔

مرحوم پچیس برس کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کے بعد علم و ادب کی بلندی تک پہنچے تھے —— وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک عمر اور ایک وقت درکار ہے۔ ہمارا دل خود اس بات کا متقاضی اور خواہشمند ہے کہ جلد از جلد اسلوبِ تحریر اور طرزِ تفہیم پر مکمل دسترس اور قابو پا لیا جائے اور تجلی کو اسی رنگ ڈھنگ میں پیش کیا جائے جس رنگ ڈھنگ میں مرحوم پیش کیا کرتے تھے — ہمیں ایک فیصد نہیں بلکہ سو فیصد یقین ہے کہ آپ ہمیں اگر کام کرنے کے کچھ وقت اور مہلت عنایت فرمائیں — اور فی الوقت ایسے مطالبات پیش نہ کریں جن کا پورا کرنا یا تو ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہیں یا ان مطالبات کے لئے کچھ وقت درکار ہے تو ہم اپنی تمام تر صلاحیتیں اور انتھک محنت اور جدوجہد کرتے ہوئے اپنے اس قادرِ مطلق اور کارسازِ حقیقی سے امید ہے کہ وہ مرحوم مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے زورِ قلم کو ہماری شکستہ و کمزور تحریر میں منتقل فرما دے —— مرحوم نے جس تیرہ و تار معیاروں میں تجلی کو روشن کیا جس کی تابناکی اور اجالا زندگی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو حسرت کی آغوش میں

پاتے ہوئے ایک عالم کو منور کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہم نے قادرِ مطلق کے بھروسہ پر یہ حوصلہ کیا اور تجلی کو اپنے ناتواں ہاتھوں میں لیا ہے کہ جس طرح اس نے مولانا مرحوم کی قدم قدم پر مدد فرمائی ہے، وہ ہماری بھی دستگیری فرماتا رہے گا۔ مادی اور اخلاقی اعتبار سے ہم اپنے دینی بھائیوں سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں مفید مشوروں سے نوازیں اور تجلی کے ساتھ اسی طرح تعاون فرماتے رہیں جیسا کہ آپ ہمیشہ فرماتے رہے ہیں۔

مرحوم کی عادت تھی کہ تجلی سے متعلق جب کوئی الجھن پیش آتی تو وہ بے تکلف قارئین سے اس کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ اور قارئین کا احسان و کرم یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ بروقت اپنے مفید مشوروں سے نواز کر کسی قابلِ قبول طریقہ کی نشاندہی کر دیا کرتے تھے ——— اور اس طرح الجھنوں کو رفع دفع کرنے میں قارئین کا بڑا دخل ہوتا تھا ——— ہم بھی یہی طریقہ اپنائیں گے جب کوئی الجھن اور پیچیدگی درپیش ہوگی ہم آپ کے جذبات و احساسات کو جھنجوڑیں گے۔ اور آپ کا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ آپ ہماری آواز پر لبیک کہیں اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر تشکر و امتنان کا موقعہ عطا فرمائیں۔

ایڈیٹر تجلی اور قارئین کے مابین قطعاً وہ رشتہ قائم نہیں ہے جو دوکاندار اور گاہک کے درمیان ہوتا ہے۔ دکاندار اپنے نفع و نقصان کا تذکرہ کبھی گاہک سے نہیں کرتا اور نہ ہی اپنی دکانداری کے معاملات میں ان سے مشورے طلب کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بیوقوف گاہک تو ہوتا ہی نہیں اس لائق کہ اس سے مشورے کئے جائیں اور عقلمند گاہک کبھی صحیح مشورہ دے نہیں سکتا۔ در اصل گاہک بالکل اسی طرح خود غرض، مفاد پرست و مصلحت کیش ہوتا ہے جس طرح خود دکاندار۔ اگر کوئی دکاندار تاجروں کی روایات کو نظر انداز کر کے کسی تجارتی معاملہ میں اپنے گاہکوں سے مشورہ کر بیٹھے تو یقیناً اسے زبردست نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ اور یہ نقصانات اس درجہ تجوری شکن ہوں گے کہ حضرت دکاندار آئندہ مشورہ کرنے کا خیال بھی دل میں لائیں گے اور لفظ مشورہ ہی سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہو جائے گا۔

تجلی دال آٹے کی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ ایڈیٹر تجلی کی مثال شوپ کیپر کی سی ہے اور نہ ہی قارئین کو گاہکوں کا بازاری خطاب دیا جا سکتا ہے۔

ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ ایڈیٹر اور قارئین ایک مربوط برادری کی حیثیت رکھتے ہیں ——— اور جس طرح برادری کے چھوٹے بڑے افراد پیچیدہ مسائل کو نمٹانے کے لئے آپس میں مشورے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں اسی طرح ایڈیٹر اور قارئین کے مابین بھی باہمی مشوروں کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہنا چاہئے۔ مشورہ ایک مفید چیز ہے۔ قرآن حکیم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ تم آپسی معاملات میں صحابہ سے مشورہ کیا کرو۔

ثابت ہو گیا کہ مشورہ ایک اچھی عادت ہے اور یہ ثابت ہو ہی چکا کہ ایڈیٹر تجلی اور قارئین پر دکاندار اور گاہک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمارا آپس میں مشورہ کرنا خلافِ عقل و روایت قرار نہیں پا سکتا۔

چنانچہ فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ مولانائے مرحوم کی طرح وقتاً فوقتاً آپ سے مشورے کرتے رہیں گے اور ان الجھنوں اور گتھیوں کو سلجھاتے رہیں گے جن کو آپ کے مشوروں کے بغیر سلجھانا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ دشوار تر ہوتا ہے۔

فی الحال ہمیں صرف ایک زبردست الجھن درپیش ہے۔ مرحوم کو ماضی قریب ہی میں اس الجھن سے سابقہ پڑ چکا ہے اور اس کو دریدہ تو مالک حقیقی کے ہاتھ سلجھایا

لیکن بظاہر اس کو سلجھانے میں قارئین کے مشورے اور قارئین کا ملا تعاون ہی دستگیر ثابت ہوا تھا۔

الجھن یہ ہے کہ کاغذ کا کوٹا آیا ہوا ہے اور رقم تجلی کا کچھ کیش موجود ہے لیکن بینک میں ایک قیدی کی حیثیت سے۔ چار پانچ ماہ تک اس کی رہائی کی کوئی توقع نہیں ـــــ کچھ آئینی مجبوریاں حائل ہیں۔ کہیں اور سے رقم مہیا کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر کوئی صورت سمجھ میں آتی ہے تو اس کا اظہار کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بس فیصلہ آپ حضرات پر چھوڑ دیا ہے اس یقین کے ساتھ کہ آپ حضرات کبھی غلط مشورے نہیں دیتے تو بس آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں؟

کاغذ بلیک سے خریدنا ناممکن تو نہیں لیکن یہ اقدام ہماری بنیادیں ہلا دے گا۔ ہماری بنیادوں سے مراد تجلی کی بستیاں دیں۔ یعنی اگر بلیک سے کاغذ خرید خرید کر تجلی چھاپا گیا تو ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا ـــ اور ہمارا دیوالیہ نکلنے کے بعد تجلی کس مپرسی کا شکار ہو کر بجھ جائے گا۔ اس کی ایمان پرور روشنی معدوم ہو جائے گی۔

اور بھلا ـــــ کیا آپ یہ گوارہ کرلیں گے کہ وہ چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے جس نے کفر و نفاق کی تاریکیوں کو دور کیا ہے۔ جس نے دہریت و الحاد کے اندھیرے تھرتھراتے ہیں۔ اور جس کی مقدس روشنی میں روحیں سفر کرتی ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ آپ مولانا عامر عثمانی رح کی موت گوارہ کرسکتے ہیں، حسن احمد صدیقی کی موت گوارہ کرسکتے ہیں لیکن تجلی کی موت گوارہ نہیں کرسکتے ـــــ اگر یہ خیال مبنی برحقیقت ہے تو پھر ہمیں کوئی ایسا مفید مشورہ دیجئے کہ مسئلہ حل ہو جائے اور یہ ذہنی الجھن دم توڑ دے۔

ہمیں صرف آپ کے مشورے ہی نہیں بلکہ مالی تعاون کی بھی درکار ہے۔ اس نازک موقع پر اگر کچھ رقم بطور قرض ہی مہیا ہو جائے تو آپ کا محبوب تجلی خطرات سے نکل جائے گا۔

بہرحال یہ قارئین کے امتحان اور آزمائش کا وقت ہے خدا ہی جانے کون فیل ہو اور کون پاس اور کون امتیازی نمبر

حاصل کرے "اول" کہلانے کا مستحق قرار پائے۔

ایک ضروری بات نوٹ کر لیجئے۔ گزشتہ کوشش کے سلسلہ میں قارئین نے بطور قرض رقمیں ارسال کی تھیں اور بعض نے بطور ہدیہ و تعاون۔ جن حضرات نے بطور قرض روپیہ دیا تھا وہ فوراً اپنے نام و پتے اور اپنی کل اور ادا کردہ رقم سے مطلع کریں۔ قسط واران کی رقم لوٹا دی جائے گی۔ مرحوم کے ذمہ کسی کا روپیہ باقی نہیں رہنا چاہئے یہی ہماری خواہش ہے اور یہی مرحوم کی وصیت تھی۔

اگلا شمارہ مولانا عامر عثمانی نمبر ہوگا۔ ہم اس شمارے کو بہتر سے بہتر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعا کیجئے کہ مشیت ہماری مدد کرے اور ہم خواہش اور ارادے کے مطابق سابقہ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے یہ اہم شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ یہ شمارہ کم و بیش دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس کی قیمت ایک اندازے کے مطابق چھ روپے ہوگی۔ مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ شمارہ مفت پیش کیا جائے گا ـــــ جو حضرات مستقل خریدار نہیں ہیں وہ فوراً توجہ دیں۔ اور سالانہ چندہ ارسال کرکے مستقل خریداروں کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ کاغذ کی کمی کے باعث یہ نمبر انتہائی محدود اور قلیل تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے جو حضرات صرف اس نمبر کو خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ فوراً آرڈر دے کر اپنا نام بک کرالیں ممکن ہے کہ بعد میں فرمائش کی تعمیل نہ ہو سکے اور آپ کو خواہ مخواہ شکایت کی زحمت ہو۔

ایک اور افسوسناک اطلاع

اپریل کے شمارے میں آپ نے مولانا عامر عثمانی کا دیا ہوا ایک اعلان پڑھا ہوگا ـــــ کہ تجلی کے کاتب صاحب بستر مرگ پر پڑے ہوئے ہیں ان کی صحت کے لئے دعا کی جائے۔

قابل تاسف بات یہ ہے کہ مولانا ملک کے انتقال کے بائیس روز بعد وہ بھی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے

...وانا الیہ راجعون!

بڑے ہی اچھے، بے تکلف اور منکسر المزاج انسان تھے اللہ مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازے۔ پچیس سال سے تجلی کی کتابت کر رہے تھے۔ اور یہ پچیس سالہ رشتہ محض ایک کتابت اور رسالہ کے توسّل سے ہی نہیں بلکہ بچپن سے ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ ان کے بے پایاں ربط وضبط پر بڑی حیرت ہوا کرتی تھی۔ جہاں جاتے ایک ساتھ جاتے۔

بچپن میں ایک بار تجویری تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہ دونوں ساتھ ہی گئے۔ اور اب دنیا سے بھی دونوں ایک ہی ساتھ رخصت ہو گئے۔

مولانا عامر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مودودیت اور وہابیت کیا بلا ہے۔ میں نہیں جانتا ——— میں تو تمہارے پیچھے ہوں جہاں تم جاؤ گے وہیں میں بھی پہونچ جاؤں گا۔

اسم با مسمّٰی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خلیق اور ——— وضعداری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

مولانا عامر عثمانی رہ کے ہارٹ اٹیک کو سنکر انتہائی رنجیدہ وافسردہ خاطر ہوئے اور بھرائی آواز میں دعا کی کہ اے اللہ! میری عمر بھی بھائی عامر کو دیدے، دنیا کو ابھی ان کی ضرورت ہے ورنہ مجھ جیسے نہ جانے کتنے غریب انسان بے یار و مددگار ہو جائینگے۔ لیکن مشیت الٰہی یہی تھی کہ پہلے عامر عثمانی ایڈیٹر تجلی اور ان کے بعد یہ منشی متین صاحب کاتب تجلی اپنے ازلی اور دائمی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

منشی متین صاحب مرحوم کی اقتصادی حالت ایک طویل عرصے سے انتہائی کمزور چل رہی تھی اور اس طویل بیماری نے ان کے رہے سہے حالات کو اور بھی زیادہ ابتر و کمزور بنا دیا تھا ——— مرحوم کے پس ماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ نو بچے ہیں۔ جن میں دو لڑکیاں شادی کے قابل ہیں اور باقی بچے نو عمر اور معصوم ہیں۔ دو لڑکے صرف اس قابل ہیں کہ اپنی ہی کفالت کی ذمہ داری ادا کر سکیں ——— لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے ——— لہٰذا اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ کاتب تجلی منشی متین صاحب کے پس ماندگان کی امداد و تعاون فرما کر اجر دارین حاصل کریں

شمس نوید عثمانی

کیا خبر تھی کہ "تجلی" کے جو اولین صفحات گذشتہ تقریباً ۲۵ سال سے ملک اور بیرون ملک کے بے شمار انسانوں کی ضیافت میں مدیر تجلی کے ندرت نگار قلم سے "آغاز سخن" بن کر روح و دل کی کتنی ہی انجمنوں میں چراغاں کرتے چلے آرہے تھے وہی صفحات اتنی جلد اور اس قدر اچانک مولانا عامر عثمانی مرحوم کی مرگ ناگہاں سے "انجام سخن" بن کر رہ جائیں گے!! اور یہ الفاظ اسی شخص کو ان صفحات میں قلمبند کرنے ہوں گے کہ جسے ابھی ابھی حیدرآباد وغیرہ کے ایک طویل ادبی و علمی سفر کے بعد آپ مرحوم نے اپنا "محبوب ترین بھائی" کہہ کر یاد کیا تھا! — کل جس ہستی نے محض بربنائے شفقت و خلوص مجھ جیسے ناکارہ کے متعلق یہ قیمتی الفاظ سپرد قلم کئے تھے وہ تو فی الواقع ان الفاظ کا مصداق نہیں ہے لیکن اس دلدوز حادثے سے ہم سب دلفگار بہن بھائی خود مولانا عامر عثمانی مرحوم کے لئے ہزارہا انسانی قلوب کی طرف سے فی الواقع "محبوب ترین ہستی" اور اس کا خراج عقیدت وصول کر رہے ہیں — ۱۲ اپریل گذشتہ کو پونا کے [illegible] علمی جہاد میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری محاذ پر باطل کے خلاف قلم کی تلوار چلاتے ہوئے جس طرح اپنی جان جاں آفریں کے پائے ناز پر نثار کی ہے اور — اور جس دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کی سپردگی میں جینے اور خود اپنے وطن کے فکری مخالفوں سے ٹکرانے کے بعد اپنی تدفین و تکفین کی آخری رسوم بھی اسی دعوت کے روحانی بھائیوں کے ہاتھوں دور افتادہ بمبئی میں تکمیل پذیر ہو کر خدا کی مشیت سے بیٹھ کر اپنی دائمی خوابگاہ کا مقام پایا ہے، یہ سب کچھ غالباً خدا کی طرف سے بھی ایک خاموش اعلان ہے اس بات کا کہ ان کی یہ موتی زندگی زمین ہی نہیں، آسمانوں میں بھی قبول کر لی گئی اور کیا عجب ہے کہ خدا نے انہیں محبوبیت کی نعمت عطا کر کے اہل زمین کے مقدس دلوں میں اس "محبوبیت" کا مقام عطا فرمایا ہو — جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کسی خوش نصیب بندے کا عجز کی بندگی اور محبت بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل سے کہتا ہے کہ "میں اس بندے سے محبت کرتا ہوں اس لئے تم بھی اس سے محبت کرو" اور پھر فرشتوں کی مخلوق دنیا میں حضرت جبرئیل یہ اعلان فرماتے ہیں کہ فلاں بندہ خدا کا اور اسی لئے میرا محبوب ہو گیا ہے اس لئے تم بھی اس کو اپنا محبوب بنالو، اور پھر شدہ شدہ یہ آسمانی کیفیت اہل زمین کے قلوب کے

تا نازل ہو رہی ہے تو اللہ سے تعلق رکھنے والوں کے سینوں میں اس آدمی کو شانِ محبوبی عطا ہو جاتی ہے — محمد اللہ ثم الحمد للہ کہ ملک اور بیرونِ ملک یہاں جہاں مرحوم کی رحلت کی آواز پہنچ گئی ہے پریس اور خطوط اور تاروں کے ذریعہ محبت بھرے دلوں کی کس قدر خوں چکاں دھڑکنیں "تجلی" کی اس الم نصیب تجلی گاہ تک روزانہ سیلِ رواں کی طرح بہتی چلی آ رہی ہیں — یہ خونِ دل و جگر یہ آنسو! — یہ خدا کی رحمت و مغفرت کے عظیم آثار! بتائیے تو بھلا کہ آپ کے اور ہمارے عامر عثمانی صاحب مرحوم کے لئے اس عظیم تر آخر کونسی شے ہو سکتی ہے کہ جس کی آرزو کی جائے؟ —

ہمارے غمزدہ دلوں کو اللہ تعالیٰ نے مرحوم کی حقیقی کامرانی کے کس قدر روشن آثار، کتنے قابلِ صد رشک نشانات دکھا دیئے ہیں — یہ آثار نہ صرف خارجی دنیا میں بلکہ خود مرحوم کی زندگی کے آخری ایام کی داخلی دنیا میں بھی ہمیں بار بار اس طرح دکھائے گئے کہ سچ پوچھئے تو اب اس حادثہ کو کوئی حادثہ اور اس نقصان عظیم کو "نقصان و صدمہ" کہتے ہوئے دل ڈرتا ہے کہ کہیں خدا کی اس عظیم شانِ رحمت کے سلسلہ میں۔ ناسپاسی کا جرم بن جائے۔

دیوبند کی اہم ادبی محفل میں ۲۹ مارچ کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے دینی جوہر دکھاتے ہوئے انھیں قلب کا پہلا دورہ — شدید ترین دورہ پڑا تو میں دل گرفتگی کے عالم میں رامپور سے دیوبند پہنچا لیکن — آہ! اے ناظرینِ تجلی! یقین کیجئے کہ میں نے یہاں آ کر یہ ایک عجیب روح افزا منظر دیکھا کہ ان کا جسم جتنا شدید بیمار تھا ان کی روح اتنی ہی عظیم ترین حد تک صحت مند نظر آ رہی تھی؟ جسمانی دکھ اور اس کے آخری انجام کی باتیں تو بہت سے لوگ دیکھ چکے اور بے شمار انسان سن چکے لیکن ان کی آخری ایام کی وہ جھلک تو ہم ان کی پسماندگان نے دیکھی کہ جس میں زندگی کا ڈوبتا ہوا سورج دائمی زندگی کے ابھرتے ہوئے نہ جانے کتنے چاند سورج ان کے قلب و روح کے ہر افق سے ضوفشاں دیکھ کر ان کا زوال خود ہی ماند ہو رہا تھا! — — آئیے! میں اس کی صرف ایک جھلک آپ کو دکھانے کی کوشش کروں۔

کیا ایک بندۂ مومن کی سب سے بڑی کامیابی یہی اور صرف یہی نہیں ہے کہ وہ راہِ حق میں تن من کی اتنی قربانیوں کے باوجود آخری لمحہ میں یہ محسوس کر کے رو پڑے کہ وہ راہِ حق کا کوئی حق ادا نہ کر سکا؟ — یہی تو علامت ہے اس بات کی اس کے سامنے خداوند ذوالجلال کی بارگاہِ عالی اپنی ان خصوصی عظمتوں کے ساتھ بے حجاب ہو گئی ہے کہ جن کے قدموں میں سب کچھ نذر کرنے والا بھی یہ سوچتا ہے کہ وہ کچھ بھی نذر نہیں کر سکا — اور یہ کیفیت 'یہ انفعال و ندامت اور سب کچھ کر کے اور کچھ نہ کر سکنے کی "حیرتِ تکش" والی ایمانی کیفیت عامر عثمانی صاحب مرحوم کے ہر بُن مو سے ٹپکی پڑ رہی ہے ہائے وہ لمحات جنھیں میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گا کہ جب میں ان کے قریب بیٹھا تھا اور ٹھیک اس وقت مرحوم ایک طرف جسمانی نقاہت کی آخری شدت اور دوسری طرف ایمانی اضطراب کی آخری کیفیت میں یہ محسوس فرما رہے تھے کہ جس رب العالمین سے ملاقات کی تڑپ ان میں ابل پڑی ہے اسی کی شایانِ شان کارنامۂ بندگی رد۔ اپنے نقطۂ نظر سے ایسا انجام نہ دے سکے جو خود ان کی نظر میں کوئی موزوں تحفہ بن سکے۔ اس قابلِ رشک ایمانی عالم میں انھوں نے مجھے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے لیٹے لیٹے بغل گیر کرتے ہوئے زار و قطار روتے ہوئے یہ قطعہ پڑھا جو انھوں نے ایک بار بخاری شریف کے دوران مطالعہ میں اپنے قلب پر زندگی میں "نازل" ہوتا پایا تھا۔ اور جو موت کی آہٹ سن کر ان کی طرف سے سکراتِ موت کا جاں نواز مرہم بن جانے والا تھا!۔

نہ زہد و تقویٰ نے یاوری کی، نہ کام کوئی کمال آیا
حساب کے دن یہ سب عبادت حسابِ ضربِ تقسیم حساب ہوتی

ہمارے دامن میں وہ تو کچھ تھے ندامت چند آنسو
کسی نے قبول کر کے ہمارے عذرِ عمل جلا دی

یہ پڑھا اور ہچکیوں سے روتے ہوئے کہا "شمس! یاد رکھنا

میرے اور تیرے پاس کچھ بھی چھپا ہے! کچھ بھی نہیں ہے سبھی کچھ کر کے یہ ریت کہا تاکہ میں کچھ کر گیا ہوں؟"

مرحوم کی بیوہ نسیم فاطمہ صاحبہ کا نیز میری بیوی خدیجہ نوید مشتاق کا بیان ہے کہ انھوں نے علالت کے دوران ہرنماز کے بعد مرحوم کو اپنے رب کے سامنے ربنا لاتؤاخذنا ...... والی قرآنی دعائیں اس حال میں کرتے ہوئے دیکھا کہ دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب ان کی ریش مبارک کو تر کر رہا ہے۔ پھر ایک بہار رخ تھا جو ان کے خاتمہ بالخیر کا حسن وجمال دکھاتا ہوا سامنے آیا — مرحوم ابھی حال قریب کے ایک سفر میں جنوبی ہند میں کمیونزم کے سرخ طوفان کے دھاروں کو اپنی ایک بہت ہی کامیاب نظم سے پسپا کر کے آئے تو اس سے جہاں اہل دل کے حلقوں میں عظیم پذیرائی کا ابال آیا وہاں مخالفین کے سنگ دل الحاد کے دائروں میں غیظ وغضب کا طوفانی ردعمل برپا ہوا۔ اس کے بعد بمبئی، پونا وغیرہ میں آل ایشیا مشاعرہ کے انعقاد کی خبریں گرم ہوئیں اور مرحوم کی خدمت میں ان کا دعوت نامہ موصول ہوا تو مرحوم قلبی دورے کی خطرناکیوں کے باوجود طے کر چکے تھے کہ افتاں وخیزاں ایک بار پھر اس جنوبی ہند میں الحادی طاقتوں سے ٹکرانے کے لئے ضرور جائیں گے۔ قلبی دوروں کا پہلا تخریبی اثر انسان کے اعصاب پر ہوتا ہے اور انسانی عزیمت پر اوس سی پڑ جاتی ہے مگر یہاں یہ عالم تھا کہ یہ خوفناک بیماری بیمار کے بالیں پر کھڑی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ بیمار حق وباطل کے اس معرکہ زار میں کود پڑنے کے لئے جسم وجاں کی ساری باقی ماندہ طاقتیں سمیٹ رہا ہے اور بال وپر پھیلا رہا ہے۔ پھر — جب حیرتناک معجزۂ رحمت کی شکل میں چند دن میں ان کی تباہ شدہ توانائیاں لوٹ آئیں اور معالجوں اور مشیروں کے تمام مشوروں کو بالائے طاق رکھ کر جب مرحوم بمبئی جا پہنچے تو وہاں سے ان کا جو پانچ صفحوں کا خط ان کی بیوہ کے نام آیا ہے اس کا نقطۂ ایمان توکل کے ایک سربفلک ہمالیہ سے کم نہیں — نیز اقبال ڈائری میں ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے آخری الفاظ ان الفاظ پر ختم ہوتے ہیں کہ "توکلت علی الحی الذی لا یموت" میں نے اس زندۂ جاوید کا سہارا لے لیا کہ جو کبھی مرنے والا نہیں ہے۔" اور بقول ان کے ان الفاظ نے ان کے اندروں میں ایمان کامل کی ایسی طاقت بھر دی تھی کہ وہ پہاڑوں سے ٹکرا جانے کو تیار تھے۔

انشاء اللہ تجلی کی کسی قریبی اشاعت میں ان کی ان تحریروں کو آپ بچشم خود ملاحظہ فرمائیں گے تو پوری طرح اندازہ ہوسکے گا کہ ان کے آخری ایام میں ایمانی قوت کس قدر شباب پر تھی۔

سوچئے! کیا کسی مومن کے لئے اس سے حسین ترین موت کی آرزو کی جاسکتی ہے اس عہد بے حسی میں! بیشک انسانی نفس کے لئے ان کی مرگ ناگہاں اور غریب الوطنی کی موت میں بڑا درد ہے، لیکن غور فرمایئے کہ اس میں کتاب وسنت کے نقطۂ نظر سے کس قدر فخر وسرور کا سامان بھی ہے!

کیا ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ خدا کی راہ میں مرنے والا اپنے وطن سے جتنی دور اپنی آخری آرام گاہ، قبر پاتا ہے اتنی ہی وسیع وعریض جنت اسے ملتی ہے — پھر یہاں تو انھیں خدا وطن سے اتنی دور لے گیا کہ جس سے آگے خشکی کی سرحدیں ہی بحر ہند کے کناروں سے جا ملی تھیں۔ بمبئی کے ساحلی شہر میں ان کی قبر کا مفہوم کیا یہ نہیں کہ انھیں آخری درجہ کی آخری وسعتوں والی جنت دی گئی شاید! — واللہ اعلم بالصواب — سو فیصدی بات تو کسی مرنے والے کے متعلق کہی نہیں جاسکتی اس لئے کہ کتاب وسنت ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے — آپ کو یاد ہوگا کہ مدینہ میں جب ام العلاء نے حضرت عثمان بن مظعون کے متعلق ان کی مغفرت کے متعلق یقینی جملہ کہہ دیا تھا تو اس پر اللہ کے رسول نے فرمایا "آخر تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟ میں اللہ کی قسم فیصلہ کن انداز میں

نہیں کہہ سکتا، اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں، کہ قیامت کے دن مجھ پر اور تم پر کیا گزرے گی" اس لئے فرط عقیدت میں ہمیں ہمارے جذبات کم از کم اس عامر عثمانی کے متعلق ایسی کسی لب کشائی، خامہ فرسائی میں بے لگام نہ کرنے دیں کہ جس نے عمر بھر ہمیں اور آپ کو کتاب و سنت ہی کی غلامی کا درس خون جگر سے لکھ کر دیا تھا۔

ہاں حسن ظن کی ساری راہیں کھلی ہیں اور ان راہوں پر قدم قدم پر خدا کی مشیت سے مرحوم پر رحمت ہے کہ اس کے جو آثار بکھیر دئیے ہیں وہ تو بارگاہ خدا کے لائق وگل محسوس ہوتے ہیں اور ان سے مغفرت اور بندہ نوازی کی ایسی جاں نواز، قابل رشک خوشبو آ رہی ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش مرحوم جیسی موت ہمیں نصیب ہو سکتی!

ہماری خطا کارانہ ایمانی حس بھی جب اردو کے اس فقرے "بے وقت موت" میں ایمان سوز وحشت ناکیاں محسوس کرتی ہے تو پھر مولانا عامر عثمانی کے رشحات قلم سے سالہا سال دینی فیضان پانے والے ناظرین تجلی خود مولانا مرحوم ہی کے سلسلہ میں ان بھیانک الفاظ کو بھلا کیسے استعمال کرنے لگے! ایسے جذبات اور ایسے اظہارات کا استعمال کسی بھی معنوی تاویل سے "مسلمان" نہیں ہو سکتا اس کی خالص کافرانہ نوعیت اپنی جگہ قائم بھی رہتی ہے اور اس کا فوری مہلک اثر ایسے خداوندی فیصلوں پر نامبوری اور بے اطمینانی کی زہریلی تخم ریزی کئے بغیر نہیں رہتا — اس لئے آئیے ہم اور آپ اپنے رب کے اس فیصلے پر وہی پاکیزہ دعائیہ الفاظ استعمال کریں جو ایمانی کارواں کے آخری میر کارواں نے ایسے موقعے کے لئے تلقین فرمائے ہیں۔

" اَللّٰھم ارضنا بقضائك و بارك لنا فیما قدرت لنا " خدایا اپنے فیصلہ پر ہمیں مطمئن اور راضی فرما دے اور آپ نے ہماری تقدیر میں جو لکھ رکھا ہے اس میں ہمارے لئے خیر و برکت پیدا فرما"۔

کوشش کی گئی تھی کہ مرحوم کی لاش دیوبند لائی جائے اس لئے پونا سے بمبئی لایا گیا جہاں ہوائی جہاز سے اس کو دیوبند لانے کا ارادہ تھا، مگر ایسی قانونی دشواریاں پیش آئیں کہ اب مزید تاخیر مناسب نہ تھی اس لئے انہیں جماعتی بھائیوں کے ہاتھوں بمبئی ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ہمارا خیال ہے کہ ایسی شخصیات کے حادثۂ فاجعہ پر اگر آدمی "بے وقت موت" والے جذبات کو دل میں اور الفاظ کو زبان پر جگہ دیتا ہے تو اس سے نہ صرف ایمان بلکہ عمل کی صالح توانائی بھی زہر آلود ہو کر رہتی ہے۔ ایمان کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ گویا یہ ان الفاظ کے پردے میں ہیر پھیر کے ساتھ آدمی خدا سے یہ کہتا ہے کہ ابھی اس انسان کی ضرورت تیری دنیا کو تھی اور تو نے اس کو قبل از وقت اپنے پاس بلا کر معاذ اللہ "ظالمانہ" نہیں تو کم سے کم "غیر حکیمانہ" کام کیا ہے — یہ ذہنیت کتنی ہی دبی ہوئی اور لاشعوری قسم کی بھی کیوں نہ ہو ایمان — اس ایمان کے لئے سم قاتل ہے کہ جس کے متعلق حضور صحابہ نے یہ بتا دیا تھا کہ تقدیر پر ایمان ہی ایمان کا وہ جوہر ہے کہ جو ضائع ہو گیا تو ایمان کی جان ہی نکل گئی۔ ایمان تو حمد و شکر کا دوسرا نام ہے اور مندرجہ بالا ذہنیت بارگاہ خداوندی کے لئے اک گونہ عدم اعتماد کی تحریک اور شکوہ و شکایت کا دفتر کھول دیتا ہے۔ اور — عملی توانائی اس لئے تباہ ہوتی ہے کہ اس انداز کی ذہنیت کچھ اہم کام کرنے والے کی توجہات کو سینے سے لگا کر انہیں اور آگے بڑھانے کی تیز و تند ذمہ داریوں سے فرار کا ایک خوبصورت چور دروازہ اپنے لئے کھول لینا چاہتی ہے — گویا وہ کہتی ہے کہ جو کام مرنے والے نے کیا تھا اس کو وہی کر سکتا تھا اور اب کوئی دوسرا آدمی نہ اس کام کی حفاظت کر سکتا ہے اور نہ اس کو کسی رخ سے آگے بڑھا سکتا ہے — جیسا اب خود اس خدا کی قوت تخلیق ہی مر گئی ہو کہ جس نے مرحوم میں ان صلاحیتوں کو تخلیق کیا تھا اس لئے اب وہ کسی دوسری ہستی میں ان صلاحیتوں کو پیدا ہی نہیں کر سکتا کہ جو اس کام کو جاری رکھنے کے لئے درکار ہوں گی۔

یہ ہے وہ حیات کش ایمان سوز ذہنیت جس کا

چھوٹا سا نام "شخصیت پرستی" ہے۔ اور جس کے خلاف خود مولانا مرحوم نے عمر بھر کا قلم اور قلم کا جہاد کیا تھا۔ اس لئے اگر خدانخواستہ ہم میں سے کسی کے گوشۂ قلب میں شیطان نے ایسے وسوسے ڈالے ہوں تو پہلی فرصت میں ان کی جڑوں پر تیشہ چلا دیں اور شخصیت پسندی کو شخصیت پرستی کے بجائے "خدا پرستی" کی اس انقلاب انگیز، حیات خیز سمت میں موڑ دیں کہ جس خدا نے کل مولانا مرحوم سے کام لیا تھا وہ اس بات پر قادر مطلق ہے کہ اگر چاہے تو مٹی کے بے جان ذروں سے اس کام کو آگے بڑھانے کا کام لے لے۔

خدا پرستی کا یہی وہ زاویۂ فکر ہے کہ جو ہمیں ایک طرف شخصیت پرستی کے منجدھار میں اسیر ہونے سے بچاتا ہے تو دوسری طرف خود پرستی کی بنیادوں پر مرحوم کی حقیقی محبت میں کمی بیشی کے جرم سے بھی روکتا ہے کوئی شک نہیں کہ مولانا مرحوم نثر و نظم، مزاح اور سنجیدہ نگاری، جذبات اور خیالات کی جس رنگا رنگ ہمہ جہاتی عبقریت کے مالک تھے اس کا کوئی نعم البدل جائے نظر تک نظر نہیں آتا ——— انھوں نے جس دھن اور سپردگی اور جاں فشانی کے ساتھ دین و ملت کے عقیدہ و عمل کے خزانوں کی پاسبانی کی اس کا تصور بھی کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی دوسرا انسان شایان شان موجود نہیں۔ انھوں نے بھی خود اپنے متعلق آخری عاجزانہ کیفیت اور خدا کی توفیق کی اپنے اوپر باران رحمت کے بعد تحدیث نعمت کے آہنگ نے خود یہ بھی مطلع کہا تھا جو اس داستان کا خلاصہ خود تھا ہے۔

حقیر خاک کے ذرے تھے آسماں ہوئے
وہ لوگ جو در جاناں کے پاسباں ہوئے

لیکن ——— بزرگو! اور دوستو! بھائیو! اور بہنو!! یہ نظام فطرت کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس نے ہر شے اپنے وجود میں انفرادیت کی عظیم ترین شان رکھی ہے جس طرح اربوں کھربوں انسانوں میں ہر فرد کے انگوٹھوں کا نشان منفرد ہے، اسی طرح قلبی اور صلاحیتوں کی دنیا میں بھی اس نے دو آدمی بھی بالکل یکساں نہیں بنائے۔ اس لئے بڑا کام ہو یا چھوٹا مگر "ہر مرد ہر کارے"! اب وہ کام کوئی دوسرا ٹھیک اسی رنگ اور آہنگ میں ہرگز نہ کر سکے گا جو مرحوم جیسا ہمہ جہتی عبقری انسان کر گیا ——— لیکن ہمارا یقین ہے کہ اس رنگ اور اس آہنگ میں ان سے اسی حد تک خدا کو کام لینا تھا اور اب وہ اسی کام کو جس نئے رنگ اور نئے آہنگ میں لینا چاہے گا وہ آدمی ابھی آسمانی اسکیم میں پہلے ہی طے کر چکا ہوگا اور اگر ہماری طلب اس کے در پر اس کام کے تسلسل کے لئے اسی طرح دعا اور تدبیر اور تعاون کا ہاتھ پھیلائے رہی تو یہ آسمانی اسکیم جلد یا بدیر فرش خاک پر ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو کر رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اس مقام پر یہ سوالیہ نشان آپ سب کے اذہان میں ابھر رہا ہوگا کہ آخر عالم اسباب میں تجلی کے لئے کیا تنظیم کیا گیا ہے؟ ——— تجلی کے جن دوستوں نے تعزیتی خطوط میں مجھے اس بار ذمہ داری اٹھانے کا مشورہ دیا ہے وہ بیچارے یہ نہیں جانتے کہ میں "عالم دین" سرے سے ہوں ہی نہیں! خود بھائی صاحب (مولانا عامر عثمانی مرحوم) نے زندگی کے آخری ایام میں ہماری آخری ملاقات کے وقت اشک آلودہ الفاظ میں یہ فرمایا تھا مجھ سے کہ "دیکھ! مجھے بھول جانا ——— مگر میرے تجلی کو کبھی نہ بھولنا!" اور وہ اس سے زیادہ یوں بھی مجھ سے کچھ اور نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں دیوبند میں نہیں رامپور میں ہوں، اور رامپور میں ملازمت کے علاوہ وہاں سے اپنے غیر مسلم بہن بھائیوں تک ہندی رسالہ "مارگ دیپ" کے ذریعہ اپنے سب کے رب کا پیغام پہنچانے کی تڑپ کو اپنے لئے پسند کر چکا ہوں ملازمت ترک کی جا سکتی ہے مگر یہ کام میری زندگی کا بنیادی کام ہے جو میری نظر میں ایسا ہے کہ جسے چھوڑنا سچ

ں میں نہیں۔ اس نے مرحوم بھائی کی وہ وصیت ہی میرے یوں تعاون اور رہ وہ کار کا موزوں ترین اظہار تھا اور شاء اللہ میں تجلی کے صفحات بھی برابر رہا ہے آپ کو مرحوم وہ باقی ورثہ منتقل کرتا رہوں گا جو خود ان کی قربتوں ے ذریعہ مجھے ان سے ہی ملا تھا۔

رہا اب اس کی ادارت اور سربراہی کا مستقل کام سو بحمد للہ اس بارے میں خود مرحوم کی نظر انتخاب بھی ہستی پر پڑ چکی تھی وہی اس نظام کی باگ ڈور سنبھال رہا ہے —— یہ ہیں جواں سال مولانا حسن احمد فاضل دیوبند جو مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی اور مرحوم کے داماد ہیں۔ اور ایک عرصہ تک انھیں خود مولانا مرحوم کے یہاں مقیم رہ کر ان سے اخذ و اکتساب کا طویل موقعہ ملا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرحوم نے بمبئی کے آخری سفر پر جاتے ہوئے بھی اسی آرزو کا اظہار کیا تھا اور بمبئی میں بھی کسی کے استفسار پر فرمایا تھا کہ یہی جواں سال عالم دین اور حافظ قرآن اور صاحب قلم ہستی مرحوم کا جانشین ہوں گے۔ تنہا مرحوم کا ان پر نظر انتخاب ڈالنا ہی شاید اس ہستی کا مکمل تعارف ہے۔ میں نے پھر بھی ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کی طرف جو اشارہ کیا اسے مزید تفصیلات کے ذریعہ مکمل کرنا غیر ضروری بھی ہے اور ناموزوں بھی —— البتہ اتنا عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ ہستی ایک ایسے باپ کی زندہ نشانی ہے جو ہمارے خاندان میں اپنی للہیت اور خدا شناسی میں ممتاز ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

خدا کرے بھائی صاحب مرحوم کی نظر انتخاب اور ایسے مرحوم باپ کی روحانی توریثی خصوصیات اور آپ سب کی دعائیں اور تعاون مل کر تجلی ہی کے آئندہ صفحات میں عزیز گرامی حسن میاں (فاضل دیوبند) کے قلب و قلم کا وہی ان کا امید اور آرزو سے بڑھ چڑھ کر اپنا عملی تعارف کرا سکیں۔

مولانا مرحوم کی بیوہ نسیم فاطمہ صاحبہ اپنی اور اپنے سارے یتیم گھرانے کی طرف سے (جس میں ماشاء اللہ تین کم عمر لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں) اور اپنے غمزدہ تمام قریبی عزیزوں کی طرف سے آپ کو یہ اطمینان دلاتی ہیں کہ وہ اپنے گھر کے اس قیمتی سربراہ کے نقصان عظیم پر ان کے لائق صبر و رضا سے کام لیتی رہیں گی اور دنیا میں مرحوم نے اپنا جو علمی اور روحانی چراغ "تجلی" کی شکل میں چھوڑا ہے اسے اپنے خون دل و جگر سے روشن رکھنے کی آخری جد و جہد کرتی رہیں گی —— ہاں مرحوم کی مغفرت اور ان کے مشن کی زندگی کے لئے وہ آپ سب سے ایسی مسلسل دعا چاہتی ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے تو سیدھی عرش الٰہی تک رسا ہوتی ہے وہ خاص طور سے مولانا کے تیرہ سالہ لڑکے دانش عثمانی کی صالحیت کے لئے دعا کی طالب ہیں۔

اے عشق تری آن پہ ہم سادہ دلی سے ❊ سوغاتِ صد لعل و گہر بار دیا ہے
ہونٹوں کی ہنسی لے کا سکونِ رخ کی سنا ❊ جب کچھ نہ رہا پاس تو سر وار دیا ہے

مولانا ماہر عثمانی رح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یہ اس کتاب کا ایک باب ہے جو میری مختلف کتابوں اور مضامین سے سیرتِ پاکؐ پر مرتب کی جا رہی ہے۔ اسمیں جہاں "اضافہ از مولف" لکھا گیا ہے وہ نیا اضافہ ہے اور جہاں کوئی عبارت میری کتاب سے نقل کی گئی ہے وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے)

(ابوالاعلیٰ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بات تاریخی طور پر مسلّم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی اس شاخ سے تھا جو اُن کے بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیلؑ سے چلی ہے اور بنی اسمٰعیل کہلاتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت سے اس معاملہ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ آپ کے ذکرِ مبارک کو حضرت ابراہیم و اسماعیل کے حالات سے ہی شروع ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر نہ یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عراق کا یہ خاندان اندرونِ عرب کے ایک دور دراز مقام، مکّہ کیسے پہنچا ہے، اِن قبیلہ اہلِ توحید کی بنا کیسے پڑی، اور عرب کے اکثر و بیشتر قبائل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا رشتہ تھا جس کی وجہ سے آپ اس ملک میں ایک غیر معروف نہیں بلکہ خوب جانی بوجھی شخصیت تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ عراق کے رہنے والے تھے۔ اُن کا وطن اُر، عراق کے نمرود خاندان کا دارالسلطنت، سنہ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں جو عام محققین کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کا زمانہ سمجھا جاتا ہے یہ ایک بہت بڑا مرکز تمدن و تجارت تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ اس قوم کے شرک کا گڑھ بھی یہی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اس قوم میں شرک کی مخالفت اور توحید کی دعوت کا آغاز کیا تو ملک کی حکومت، ساری قوم، ان کا اپنا خاندان، حتیٰ کہ ان کا باپ بھی اُن کا دشمن ہو گیا، اور جب وہ سب اُن کو ڈرا دھمکا کر اس کام سے باز رکھنے میں ناکام ہو گئے تو آخرکار انھوں نے متفق ہو کر آنجنابؑ کو زندہ جلا دینے کے لیے آگ

میں جو مظالم کئے گئے تھے اُن میں خود اُن کا باپ بھی شریک تھا (منتخبات تلمود از ایچ پولانو، لندن صفحہ ۳۰ تا ۴۲)۔ نیز یہ بات خدا کی کسی شریعت میں بھی جائز نہ تھی کہ کوئی شخص اپنی سگی بھتیجی سے شادی کرے، کجا کہ ایک نبی اس کا مرتکب ہو۔

(اضافہ از مولف)

حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغی سرگرمیاں | حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لئے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لئے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کئے۔ شرقِ اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو، اور اندرونِ عرب میں ایک بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالےٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں:- ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور عرب کے جو قبائل نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لئے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے اور حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لئے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُن کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت بھی اُن کے اندر گم کردی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اِن کے تبیع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا، تو پہلے یہودیت اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیئے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دنیا میں اُس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لئے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی جو بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی جسے قرآن میں اللہ تعالےٰ نے بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلایا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المقدس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لئے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(تفہیم القرآن جلد اوّل۔ البقرہ حاشیہ ۱۲۳)

حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش | اولادِ ابراہیم کی دوسری شاخ، بنی اسرائیل میں جو دوسرے عیوب پیدا ہوئے ان میں سے ایک عیب یہ بھی تھا کہ تاریخ کو مسخ کرکے ہر فخر کو وہ اپنے لئے مخصوص کرنے لگے، اور جن جن دوسری قوموں سے تاریخ کے دوران میں ان کی کشمکش یا رقابت رہی ان سب کا منہ کالا کرنے کی انہوں نے بھرپور کوشش کی۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک حضرت لوطؑ

۱۔ چونکہ حضورؐ کے دور تک ڈھائی ہزار سال کے دوران میں اولادِ اسماعیل کے مختلف خاندانوں نے اہلِ عرب کے دوسرے بہت سے خاندانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کئے تھے، اس لئے جیسا کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، یہ دوسرے خاندان بھی اس مقدس خاندان کے ساتھ رشتہ داری کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اپنے نسب ناموں میں اس کا ذکر کرتے تھے (حاشیہ از مؤلف)

بھری ہوئی ایک خندق میں پھینکدیا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور آپ اس خندق سے زندہ و سلامت نکل آئے۔ یہ قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے ملاحظہ ہو الانبیاء آیات ۶۸-۶۹۔ العنکبوت، آیت ۲۴ - والصّٰفّٰت ۹۷-۶۸)

قرآن مجید کا بیان ہے کہ اس کے بعد آپ اپنا وطن چھوڑ کر سرزمین شام و فلسطین کی طرف ہجرت کر گئے جو اس زمانہ میں ارض کنعان کہلاتی تھی، اس ہجرت میں اُن کے بھتیجے حضرت لوطؑ ان کے ساتھ تھے کیونکہ وہی ان کی قوم میں سے ایمان لائے تھے اور بعد میں اللہ تعالےٰ نے ان کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا۔ دوسری رفیق حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ تھیں جنھوں نے مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیا۔ اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات حسب ذیل ہیں :-

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الصّٰفّٰت ۹۷-۹۹)

انہوں نے آپس میں کہا "اسکے لئے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ میں پھینکدو۔" انھوں نے اسکے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انھیں کو نیچا دکھا دیا اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (یعنی ہجرت کرتا ہوں) وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ..... فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (العنکبوت ۲۴-۲۶)

پھر اس قوم کا جواب اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "قتل کر دو یا جلا ڈالو اس کو" آخرکار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا .... اسوقت لوط نے اسکو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) مانا اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ زبردست اور حکیم ہے۔

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۷۱)

اور ہم اسے (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کیلئے برکتیں رکھی ہیں[1]۔

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء ۷۴)

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا (یعنی نبوت عطا کی)

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ (الصّٰفّٰت ۱۳۳)

اور لوط بھی ان لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد ان کی قوم کا کیا انجام ہوا، اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں نہیں آئی ہے، مگر سورۂ توبہ آیت ۷۰ میں اس کا ذکر بھی ان قوموں میں کیا گیا ہے جو عذاب میں مبتلا کی گئیں۔

رہی یہ بات کہ ہجرت میں حضرت لوطؑ کے ساتھ حضرت سارہ بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھیں، تو اس کی تصریح اگرچہ قرآن میں نہیں کی گئی، لیکن قرآن کے بعض بیانات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم شادی شدہ تھے اور ان کی اہلیہ ہجرت میں ان کے ساتھ شریک تھیں۔ مثلاً سورۂ صافات میں ہے کہ ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی "رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ" میرے پروردگار مجھے صالح اولاد عطا فرما" یہ دعا ایک شادی شدہ آدمی ہی کر سکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ وطن سے ہجرت کرتے وقت یہ دعا کر رہا ہو۔ بائیبل کے تاریخی بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس ہجرت میں حضرت سارہ شامل تھیں۔ لیکن اس سلسلہ میں بائیبل کے دوسرے بیان بالکل بے سروپا ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہے کہ حضرت سارہ حضرت لوط کی حقیقی بہن اور حضرت ابراہیمؑ کی بھتیجی تھیں جن سے انہوں نے نکاح کیا تھا، اور اس ہجرت میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اُن کا باپ بھی شریک تھا (پیدائش، باب ۱۱ فقرات ۲۷ تا ۳۲) حالانکہ صرف قرآن ہی نہیں خود بائیبل بھی شہادت دیتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید [illegible]

[1] برکت والی زمین اور بستیوں سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے سورۂ اعراف آیت ۱۳۷، بنی اسرائیل آیت ۱ اور الانبیاء آیت ۸۱ میں بھی اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (تفہیم القرآن، جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۳۱)

[illegible] تھے اور کسی دعوت کے کام پر حضرت ابراہیمؑ نے ان کو مامور کر کے اس سدوم میں نہیں بھیجا تھا بلکہ دونوں چچا بھتیجوں میں جھگڑا ہو گیا تھا اور چچا نے بھتیجے کو الگ کہیں اور جا بسنے کے لئے کہہ دیا تھا (پیدائش باب ۱۳ فقرات ۵ تا ۱۲)۔ دوسری اس سے بھی گھناونی مثال یہ ہے کہ بائیبل کی رو سے جب قوم لوط پر عذاب آیا تو حضرت لوط اپنی دو بیٹیوں کو لے کر وہاں سے نکل گئے، اور اپنے چچا کے پاس نہیں گئے جو ارض سدوم سے قریب ہی فلسطین کے شہر حبرون میں رہتے تھے، بلکہ ایک غار میں جا کر رہنے لگے۔ وہاں معاذاللہ ان کی دونوں بیٹیوں نے ان کو شراب پلا کر ان سے ہم آغوشی کی جس سے دونوں حاملہ ہو گئیں۔ ایک سے موآب پیدا ہوا جو موآبیوں کا باپ ہے اور دوسری سے بن عمی پیدا ہوا جو بنی عمون کا باپ ہے (پیدائش، باب ۱۹ فقرات ۳۰ تا ۳۸)۔ یہ ڈھنگ ہے جس سے بنی اسرائیل نے موآبیوں اور عمونیوں کے خلاف اپنے دل کا بغض نکالا ہے، کیونکہ بعد کی تاریخ میں ان قبیلوں سے اُن کی سخت کشمکش برپا رہی ہے۔

ایسا ہی معاملہ ان لوگوں نے بنی اسماعیل سے بھی کیا ہے۔ بائیبل میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہؑ، حضرت سارہؓ کی کنیز تھیں۔ حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ بے اولاد ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ آپ میری لونڈی کے پاس جائیں تاکہ میرا گھر تو کسی طرح آباد ہو، چنانچہ اُن کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ سے تمتع کیا اور اُن سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ (پیدائش، باب ۱۶ فقرات ۱ تا ۳ - ۱۵ - ۱۶)۔ حالانکہ بائیبل کی اسی کتاب پیدائش کے باب ۱۲ فقرہ ۱۶ میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت کے فرعون نے بہت مال مویشی اور غلام اور کنیزیں حضرت ابراہیمؑ کو ہدیے میں دی تھیں جن میں سے ایک حضرت ہاجرہ بھی تھیں۔ اس لئے حضرت ہاجرہ کو حضرت سارہ کی کنیز قرار دینا خود بائیبل کی رو سے غلط ہے اور ان سے تمتع کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ حضرت سارہ کی اجازت کے محتاج نہ تھے۔

پھر بائیبل بیان کرتی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فلسطین ہی میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ جب وہ چودہ برس کے تھے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت سارہ سے حضرت اسحاق پیدا ہوئے (پیدائش باب ۱۶ فقرات ۲۴ تا ۲۶۔ اور باب ۲۱ فقرات ۱ تا ۵)، اس کے بعد بائیبل کہتی ہے:۔

"اور وہ لڑکا (یعنی حضرت اسحاق) بڑھا اور اس کا دودھ چھڑایا گیا اور اضحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ابراہام نے بڑی ضیافت کی۔ اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابراہام سے پیدا ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث بہت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے۔ جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان .... تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اسکے ساتھ رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور اسکے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اسکے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو

پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھکو کیا ہوا؟ مت ڈر، کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤنگا۔ پھر خدا نے اسکی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جاکر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیرانداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اسکی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی (پیدائش باب ۲۱ فقرات ۸ تا ۲۱)

یہ پوری جھوٹی داستان اس لئے گھڑی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا عرب اور مکہ اور کعبہ اور زمزم سے کوئی تعلق سرے سے ظاہر ہی نہ ہو، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے سفر عرب پر بالکل پردہ ڈال دینے اور حضرت اسماعیلؑ کے ۱۴ برس تک فلسطین میں قیام اور اس کے بعد بالآخر بیابان فاران میں ان کے رہنے اور وہاں پانی کا کنواں برآمد ہونے اور مصر کی کسی عورت سے ان کی شادی ہونے کا ذکر اسلام کی تاریخ کے اس پورے باب پر خط نسخ پھیر دیتا ہے جس کا تعلق بنی ابراہیم کے عربی مرکز سے ہے۔ بائیبل میں فاران کے بیابان کا جو ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اس کی رو سے وہ فلسطین کے جنوب، وادی عربہ کے مغرب، دشت سینا کے شمال اور مصر و بحر روم کے مشرق میں واقع تھا، عرب کے جبال فاران سے اسکا کوئی تعلق نہ تھا جہاں مکہ واقع ہے۔ اس پر مزید حضرت سارہ اور حضرت ابراہیمؑ کی جو گھناؤنی سیرت اس داستان میں پیش کی گئی ہے، اور جس میں ساتھ ساتھ خود اللہ تعالےٰ کو بھی ملوث کر دیا گیا ہے اس سے خود بنی اسرائیل کے اخلاقی تصورات کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ایک پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کی بیوی اور دوسرے پیغمبر (حضرت اسحاقؑ) کی والدہ اس صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ وہ سوکن کے نوجوان بیٹے کا ہنسنا تک برداشت نہیں کرتیں اور شوہر کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اسے اور اسکے لڑکے کو اپنی وراثت سے محروم کر کے گھر سے نکالدے۔ شوہر جو ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں، اس شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ وہ اپنے ۱۵-۱۶ برس کے بیٹے کو اس کی ماں سمیت صرف روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ دیکر بیابان میں چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اسکی پروا نہیں کرتے کہ یہ مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہمیں دکھائی جاتی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے جد امجد حضرت اسحاق اور اس کی ماں کی خاطر حضرت ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرماتا ہے کہ اسحاقؑ کی ماں سوکناپے کے جلاپے کی بنا پر ان سے جس ظلم کی فرمائش کر رہی ہیں اس کا وہ ارتکاب کر ڈالیں۔ یہ ساری داستان خود اپنی شہادت کی بنا پر جھوٹ کی ایک پوٹ ہے۔ تاریخ کے باعزت نام سے اس کو موسوم کرنا لفظ تاریخ کی توہین ہے۔

اسکے مقابلے میں صحیح تاریخ ہمکو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس کی تائید چار ہزار برس کی متواتر روایات کرتی ہیں جو اہلِ عرب میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی ہیں۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وطن سے ہجرت کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے دعا کی تھی کہ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "میرے پروردگار، مجھے صالح اولاد عطا فرما" (الصّٰفّٰت ۱۰۰)۔ دعا ایک طویل مدت گذرنے کے بعد پوری ہوئی جبکہ حضرت ابراہیمؑ بہت بوڑھے ہو چکے تھے چنانچہ قرآن مجید ہی میں حضرت ابراہیمؑ یہ قول نقل کیا گیا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ "شکر ہے خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کئے" (ابراہیم-۳۹)۔ ان دونوں صاحبزادوں کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے پیدا ہونے کی بشارت دے دی تھی۔ پہلے حضرت اسماعیلؑ کی بشارت ان الفاظ میں دی کہ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ "پس ہم نے اسکو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی" (الصّٰفّٰت ۱۰۱)۔ اور اسکے کئی سال بعد جب حضرت اسماعیلؑ جوانی کے قریب

پہنچ چکے تھے، دوسرے صاحبزادہ کی بشارت یوں دی وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ۔" اور فرشتوں نے ان کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) ایک ذی علم لڑکے کی خوشخبری دی"۔ الذّٰریٰت ۲۸)۔ یہ دوسری بشارت جب دی گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۔"کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ بھلا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت ہے جو تم دے رہے ہو؟ (الحجر -۵۴)، اور حضرت سارہ کا بشارت سنکر یہ حال ہوا فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ۔ "اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بوڑھی بانجھ" الذّٰریٰت ۲۹)۔ ان آیات کی بنا پر بائیبل کے اس بیان کو صحیح سمجھا جاسکتا ہے کہ ۸۶ سال کی عمر میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت اسماعیلؑ اور سو سال کی عمر میں حضرت اسحاق پیدا ہوئے (پیدائش باب ۱۶۔ اور باب ۲۱۔ فقرہ ۵)

حضرت اسماعیلؑ کا مکہ میں آباد کیا جانا

اوپر کے بیان سے یہ بات معلوم ہوچکی کہ حضرت اسماعیلؑ اپنے والد ماجد کے پہلے بیٹے تھے جو بڑھاپے میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک عام باپ کو اس عمر میں اولاد نصیب ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اس بچے کو دھیمے پہلو ہی نہیں بلکہ چودہ[۱۴] برس تک اکلوتا بھی تھا، سینے سے لگا کر رکھتا اور آنکھوں سے اس کا اوجھل ہونا گوارا کرتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے جن کے لئے سب سے مقدم چیز وہ دعوتِ حق تھی جس کی خاطر انہوں نے وطن میں مظالم سہے، ہجرت کی، دیارِ غیر کی برسوں خاک چھانتے پھرے، اور ہر جگہ خدا کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقتیں اور محنتیں خرچ کردیں۔ اس عزیز و محبوب بچے کی پیدائش کے بعد ان کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ عرب میں دعوت و توحید کے اس مرکز کی بنا ڈالیں جہاں سے دنیا میں آخری نبوت کا ظہور ہونا تھا اور جسے قیامت تک کیلئے اس دعوت کا مرکز رہنا تھا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کو اس مقام کی نشان دہی کردی تھی جہاں اس مرکز کی تعمیر مطلوب تھی، چنانچہ سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ۔" یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی"۔ (آیت ۲۶)، اس ہدایت کے مطابق اللہ کے اس عظیم بندے نے اپنے چھوٹے بچے کو، جو ابھی دودھ ہی پی رہا تھا، اس کی حیرت انگیز صبر و توکل رکھنے والی ماں کے ساتھ ٹھیک اس مقام پر لے جاکر بظاہر بے سہارا چھوڑ دیا جہاں آخرکار اُن کو خانۂ کعبہ تعمیر کرنا تھا۔

بخاری میں اس واقعہ کو حضرت عبداللہؓ بن عباس سے حدیث تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس روایت میں جس طرح ابن عباسؓ نے جگہ جگہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں وہ حضورؐ سے سنکر بیان کر رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو، جبکہ ابھی وہ دودھ پی رہے تھے لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زمزم نکلا۔ مکہ کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں، اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہوگئے۔ وہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں اے ابراہیمؑ کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہ نے کئی مرتبہ کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر دیکھا[۱] آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انہوں نے بس اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا، اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آبیٹھیں۔ حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف، (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخرکار انھیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا، رخ کیا اور

[۱] پلٹ کر دیکھنے کی وجہ بے دردی اور بے پروائی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر خلیل ہی سہی، بہرحال تھے تو انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اسے غیر معمولی لے رہے تھے کہ پہاڑوں کے درمیان ایک سنسان وادی میں اپنے دودھ پیتے بچے اور اسکی ماں کو چھوڑے جا رہے تھے، اُس وقت ان کے دل پر جو کچھ گذر رہی ہوگی اس کا اندازہ اس صورت حال کو تصور کر کے ہر شخص کرسکتا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ بیوی اور بچے کی طرف پلٹ کر دیکھتے تو ممکن ہے کہ دل بھر آتا اور ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اسلئے سینے پر پتھر رکھ کر چل پڑے اور جب پیچھے آنے والی بیوی نے بار بار پوچھا تو اسکی طرف دیکھے بغیر بس ہاں کہہ دیا۔

اللہ تعالےٰ سے عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ "پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گذار بنیں" (ابراہیم ۳۷) ادھر اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہوگیا تو انھیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لئے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، مگر کوئی نظر آیا۔ پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انھوں نے سات مرتبہ (صفا اور مروہ کے درمیان) کیا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں[۱] آخری مرتبہ جب وہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں "چپ رہ" (یعنی شور مچانا بند کر) اور غور سے سننے لگیں۔ پھر آواز آئی۔ انھوں نے کہا "اے شخص، تو نے اپنی آواز مجھے سنا دی، کیا تیرے پاس میری فریادرسی کے لئے کچھ ہے؟" یکایک انھوں نے زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع اور ابن جریج کی روایت میں ہے کہ جبریلؑ کو دیکھا) کہ وہ اپنی ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہے ہیں، یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ لپ بھر بھر کر وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی ابل ابل کر اوپر آتا رہا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اسماعیلؑ کی ماں پر رحمت فرمائے، اگر وہ زمزم کو اسی حالت پر چھوڑ دیتیں (یعنی چاروں طرف مٹی ڈال کر اسے نہ گھیر لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔" اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے ان سے کہا "ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ دونوں تعمیر کریں گے اور اللہ اس گھر کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہ حالت کچھ مدت رہی تھی کہ قبیلۂ جرہم[۲] کے کچھ لوگ کدا کی طرف سے آئے اور مکہ کے نیچے کی طرف ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ ایک مقام کے گرد اڑ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "یہ پرندہ تو پانی پر چکر لگا رہا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اس وادی سے گزرے ہیں مگر یہاں کوئی پانی نہ تھا۔" پھر انھوں نے اپنے ایک دو آدمی بھیجے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانی موجود ہے انہوں نے واپس جاکر ان لوگوں کو اس کی خبر دی۔ وہ آئے اور حضرت اسمٰعیل کی والدہ کو وہاں پایا انہوں نے کہا کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس اتر جائیں؟ انہوں نے کہا ہاں، مگر پانی تمہارا نہیں بلکہ میرا ہے انہوں نے یہ بات مان لی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس چیز نے اسماعیل کی ماں کو ملنسار پایا اور خود بھی چاہتی تھیں کہ کچھ انسان یہاں آباد ہوں۔" چنانچہ وہ لوگ وہاں ٹھیر گئے اور اپنے خاندان والوں کو بھی وہاں بلالیا یہاں تک کہ کئی خاندان وہاں بس گئے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی لوگوں میں پلے بڑھے اور انہی سے عربی زبان سیکھی[۳]۔ جرہمیوں کو یہ لڑکا بہت پسند آیا اور وہ چاہنے لگے کہ انہی کے ہاں اس لڑکے کی شادی کر دو۔

بیٹے کی قربانی کا واقعہ

حضرت ابراہیمؑ اپنے پیارے بیٹے اور

۱؎ یہ اس واقعہ کا اہم ترین تاریخی ثبوت ہے۔ کعبہ کی تعمیر کے بعد جب سے حج کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانہ میں شروع ہوا اسوقت سے آجتک سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان اس واقعہ کی یاد میں سعی بین الصفا والمروہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ ہزاروں برس کا متواتر عمل ہے جو بلا انقطاع اسوقت سے آجتک ہو رہا ہے اس واقعہ کا ایسا ثبوت ہے جس سے بڑھ کر کسی تاریخی واقعہ کا ثبوت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اسکے برعکس بائیبل بیابان فاران کا جو واقعہ بیان کرتی ہے وہاں نہ پہلے کبھی اس طرح کی سعی ہوئی نہ آج ہوتی ہے۔ ۲؎ یہ یمن کے قدیم قحطانی عربوں کا ایک قبیلہ تھا۔ ۳؎ عربی حضرت ابراہیمؑ کی زبان نہ تھی کیونکہ وہ عراق کے رہنے والے تھے۔ اور پھر کنعان میں آباد ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کی زبان بھی عربی نہ تھی کیونکہ وہ مصری تھیں۔

بیوی کو اس وادی میں چھوڑ کر ان سے بے پروا نہیں ہو گئے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً خبر گیری کے لئے آتے اور کچھ مدت تک قیام کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ اپنی بیوی اور دودھ پیتے بیٹے کو چھوڑتے وقت دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا "اے میرے رب، اسکو پرامن شہر بنا دے"۔ ٹھیک اس دعا کے مطابق وہی سنسان مقام ایک بستی بن چکا تھا اور یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس دوران میں اس جگہ بسنے والے جُرہمیوں کے اندر اسلام کی تبلیغ بھی ضرور کی ہوگی۔ اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ انسانی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، یعنی حضرت ابراہیمؑ اپنے بڑھاپے کی اولاد اپنے پہلوٹے اور اکلوتے بیٹے کو، ایسی حالت میں جبکہ وہ جوانی کی عمر کے قریب پہنچ رہا تھا، اپنے رب کا اشارہ پاتے ہی قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔

(الصّٰفّٰت - ۱۰۲ تا ۱۰۷)

پھر وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے کہا "بیٹا میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا "ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے"۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے اس کو ندا دی کہ "اے ابراہیمؑ، تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

یہ واقعہ مکہ میں پیش آیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ جس مقام پر بیٹے کو قربانی کے لئے لے گئے تھے وہ منیٰ کا مقام تھا جہاں آج تک اسی تاریخ (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانیاں کی جا رہی ہیں۔[1] نیز یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب حضرت اسماعیلؑ کی عمر بارہ، تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور حضرت اسحاق ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کیونکہ اسی سورہ صافات میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ "اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" (آیت ۱۱۲)۔

مذکورہ بالا آیات میں چند امور تشریح طلب ہیں جن کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اسے ذبح کر رہے ہیں لیکن اسوقت انہوں نے خواب کا مطلب یہی سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے صدق ایمانی کا امتحان لینے کے لئے بیٹے کی قربانی طلب فرما رہا ہے، اس لئے وہ ٹھنڈے دل سے اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

(۲) صاحبزادے سے پوچھنے کا مقصد یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کروں ورنہ نہ کروں بلکہ حضرت ابراہیمؑ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جس صالح اولاد کے عطا کرنے کی دعا مانگی تھی وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے؟ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان دینے کے لئے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاق و روحانی حیثیت سے بھی واقعی ان کا سپوت ہے۔

(۳) حضرت اسماعیلؑ کا یہ کہنا کہ "جس چیز کا آپ کو حکم دیا

[1] منیٰ لے جانا اس لئے ضروری تھا کہ مکہ میں اُس وقت آبادی ہو چکی تھی اور حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ہاجرہ بھی وہاں موجود تھیں۔ اسی وجہ سے آپ مکہ کے باہر منیٰ کی سنسان پہاڑیوں میں بیٹے کو لے گئے۔

خانہ کعبہ کی مرکزیت

مدینہ منورہ میں کی گئی ایک تازہ تقریر

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی یہ تقریر علوم شرعیہ کے ادیر والے ہال میں ۲ محرم ۱۳۹۵ھ بروز بدھ بعد از نماز عصر ہوئی جس میں سیکڑوں علماء، دمشائخ اور زدار و حجاج نے شرکت فرمائی جس انداز سے حضرت نے تقریر کے مبادی بیان کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار یا پانچ گھنٹوں کی تقریر تھی۔ افسوس کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے آپ نے اجمالی بیان فرمایا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے حضرت قاری صاحب کو تقریر کرنے کی دعوت دی تھی اور وہ خود بھی موجود تھے۔

(خطبہ مسنونہ کے بعد) اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انّ اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین۔ فیہ اٰیات بیّنٰت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمناً الی آخر الآیۃ)

بزرگان محترم! اس وقت آپ الحمد للہ کہ اول عالم میں موجود ہیں جو مرکز عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے اور اصل عالم بھی ہے۔ میں نے چار الفاظ استعمال کئے۔ کہ خانہ کعبہ اوّل عالم، مرکز عالم، وسطِ عالم اور اصل عالم ہے۔ سب سے پہلا مقام دنیا میں یہی ہے۔ اور اصل سب کی یہی ہے۔ اور عالم شاہد کے بیچوں بیچ بھی ہے۔ اور مرکز بھی یہی ہے۔

یہ چار چیزیں ہیں، ان میں بعض امور تو نص قطعی سے ثابت ہیں یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے اور بعض چیزیں آثار صحابہ سے ثابت ہیں یعنی حدیث مرفوع اس میں یا ہے نہیں یا ہمارے علم میں نہیں لیکن آثار صحابہ کے اندر ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے تو ارشاد فرمایا انّ اوّل بیت وضع للناس سب سے پہلا گھر خدا کا جس کو اللہ تعالیٰ نے وضع کیا لوگوں کے لئے وہ مکہ میں ہے تو امکہ کے معنے مکہ کے ہوں یا بکہ کے معنی اس موضوع کے ہوں کہ جس میں بیت اللہ واقع ہے اور اسکے ارد گرد لوملہ ہے ہیں۔ یہ اختلاف اقوال ہے بہرحال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو عبادت کے لئے بنایا گیا ہے وہ مکہ میں ہے جس کا نام بیت اللہ ہے۔ جب اللہ نے ارادہ کیا کہ اس عالم کو پیدا کیا جائے تو ان میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی۔ جیسا کہ آثار صحابہ سے واضح ہوتا ہے کہ پورے عالم میں پانی پانی تھا۔ یعنی عناصر اربعہ میں سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا کیا۔ تمام عالم میں پانی پانی تھا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں اور اس سے ساری کائنات بنائی جائے۔ اس پانی میں جہاں بیت اللہ واقع ہے ابھری ہوئی تھی جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔ اس کے بعد پانی میں کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا۔ جب سمندر کا پانی ٹکراتا ہے تو اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمندر جھاگ پتھر کی طرح سخت۔ تو پانی نے جب ٹکرانا شروع کیا تو غلظت اور گاڑھا پن واقع ہوئی اور گاڑھے پن نے سختی اختیار کی اور ایک اینٹ کے برابر سختی پیدا ہوئی --- اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اینٹ کے برابر زمین بنی اور وہی بیت اللہ کا حصہ ہے اس کے بعد حق تعالیٰ نے اسکو بڑھانا اور پھیلانا شروع کیا۔ تو پھیلتے پھیلتے زمین بن گئی اور اس حد پر آکر رک گئی جس حد پر آج موجود ہے کتنے دنوں میں مکمل ہوئی یہ تو اللہ جانتا ہے قرآن

میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں لیکن اس وقت مدت سے بحث نہیں ۔
بہرحال یہ معلوم ہوا کہ بیت اللہ اصل ہے ساری زمین کا، اور اس سے ساری زمین بنی اور ہم آپ جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس مٹی سے پیدا کیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کلکم بنوا دم و ادم من تراب۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی اصل مٹی ہے تو ہم سب کی اصل بھی مٹی ہوئی۔ اس لئے انسان کو مشت خاک کہا جاتا ہے۔ مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

قدرت خدا کی دیکھئے تو انسان دیکھئے
کیا تکلفات ہیں مشتِ غبار میں

ایک ایک مٹھی بھر مٹی نے کیا کیا تکلفات کئے، کتنا دنیا کو سجایا اور کہاں تک پہنچایا۔ تو حق تعالیٰ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ سب کی اصل بیت اللہ ہے یہ قاعدہ ہے کل شئی یرجع الی اصلہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف دوڑتی ہے اگر شاخیں ہیں تو جڑ کی طرف رجوع کریں گی۔ پانی ہے تو اپنے مرکز کی طرف رجوع کریگا۔ زمین اپنے مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطری طور پر رجوع کرتی ہے۔ اسے کہنے کی ضرورت نہیں پیش نہیں آتی۔ جیسے بیٹے کو کشش ہے باپ کی طرف۔ آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھائی باپ کی طرف رجوع کرو۔ طبعی کشش ہے آپ کہیں یا نہ کہیں تو اسی طرح خلقۃً تمام انسانوں کو طبعاً رجوع ہے بیت اللہ کی طرف البتہ بعض کے علم میں ہے اور بعض کے علم میں نہیں۔ جب ان کے علم میں آجائے تو ان میں کشش ہو جائے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی شخص کی اولاد ہوئی بچہ پیدا ہوتے ہی باپ بھاگ گیا۔ بچہ جوان ہوا اب اگر کہیں باپ سامنے آئیگا تو طبعی کشش بچے کے اندر تو ہوگی۔ مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے۔ جب تک پہچانا نہ جائے جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ جس کی طرف طبعی کشش ہے تو شخص بھی آجائے گا تو فطرۃً ہر انسان جانتا ہے کہ اسے اپنے اصل کی طرف کشش ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے آکر تعارف کرا دیا کہ جس اصل کی طرف تمہیں طبعی کشش ہے وہ یہی چیز ہے تو جن کے علم میں نہیں تھا، پیغمبروں کے کہنے سے وہ سمجھ گئے۔ ایمان لے آئے تو کشش بھی ہے اور کشش میں ساتھ ہے۔ معرفت بھی ہے، پہچان بھی ہے۔ غرض

خلقۃً رجوع ہے انسان کا بیت اللہ کی طرف۔ حق تعالیٰ نے اپنی کشش پیدا فرمائی کہ عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً رجوع نہ ہوتا۔ زور زبردستی سے لوگ رجوع کرتے فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالےٰ نے ایسی جگہ کو مرکزیت بنا دیا کہ جس کی طرف طبعی کشش ہے۔ طبعی کشش جیج میں رکھدی تاکہ اس مرکز کی طرف رجوع ہو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کروڑوں اربوں انسان من کل فج عمیق ہر گھاٹی وادی سے نکل نکل کر سفر کی سختیاں برداشت کرتے ہیں محنتیں اٹھاتے ہیں۔ خلافِ طبع چیزیں برداشت کرتے ہیں۔ مگر آتے ہیں تو پوری کشش سے آتے ہیں۔ فطری کشش بھی ہے شرعی کشش بھی ہے۔ عقلی کشش بھی ہے کئی کششیں جمع ہو گئیں۔ فطری کشش تو یوں ہے کہ اصل ہے انسان کا۔ عقلی کشش یوں ہے کہ فرع اصل کی طرف رجوع کرتی ہے اور یہ معقول بات ہے اور شرعی کشش یہ انبیاء علیہم التسلیمات نے تعارف کر دیا کہ یہی ہے وہ بیت اللہ جو تمہاری اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گذرے جنہوں نے طواف نہ کیا ہو بیت اللہ کا جب سارے انبیاء نے طواف کیا تو لازمی طور پر ان کے اقوام و امم نے بھی طواف کیا۔ کہ یہ ہماری اصل ہے۔ صرف آپ ہی کی اصل نہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ سارے اولادِ آدم کی اصل ہے اور یہ تحت الثریٰ سے لیکر ساتویں آسمان تک ہے۔ اس کی بنیادیں دس بیس پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں تحت الثریٰ تک بنیادوں کا ذکر ہے تو بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے بلکہ تحت الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا ہے وہ سب بیت اللہ ہے اور اسی طرح اوپر کی طرف عرش تک بیت اللہ ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے اور وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ واقع ہے اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے۔ تو ہر آسمان ہی قبلہ ہے جیسا کہ ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں اوپر رودے جائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تو ہر لٹو محاذی ہے دوسرے لٹو کا، تو اسی طرح سیدھ میں واقع ہے قبلہ۔ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے وہ سیدھا بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے بلکہ عرش سے لیکر تحت الثریٰ تک یہ تمام فضا قبلہ ہے یہی وجہ ہے اگر آپ آسمانوں میں پہنچ جائیں

اور نماز پڑھیں بیت اللہ کی طرف تو مشکل نہیں پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے کہ قبلہ کی طرف جھکیں بلکہ آپ سیدھے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا ہوگا جیسا کہ زمین پر پڑھتے ہیں اسلئے کہ وہاں بھی سامنے بیت اللہ ہے۔ اور اگر آپ سمندروں کی تہ میں پہنچ جائیں یا زمین کے عمق میں چلے جائیں اور وہاں نماز پڑھیں تو آپ کو الٹے سجدے نہیں کرنے پڑیں گے کہ بیت اللہ تو اوپر ہے بلکہ سیدھے کھڑے ہوکر نماز پڑھیں کیونکہ بیت اللہ آپ کے سامنے ہے۔ بیت اللہ اوپر سے لیکر نیچے تک ایک کیل کی مانند ہے۔ ایک نوراتی لاٹ ہے کہ جس کے اردگرد یہ سارے جہاں کا چکر کاٹ رہے ہیں چکی کی پاٹ کی طرح حق تعالیٰ نے اسکو برکت بناکر تاکہ اس کے وجود پایا جائے اور وجود کے دھارے چاروں طرف برابر پھیلے۔ مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چار طرف برابر پھیلے۔ مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چار طرف برابر ہوتی ہے۔ اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچ جائیں گے مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا برابر برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔ وجود کو جب حرکت دی گئی کہ پیدا کیا جائے زمین کو تو اس مرکز کو وجود تجلی بخشی۔ یہ بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ تجلی گاہ ربانی ہے اس پر حق تعالیٰ کی تجلی جو اقرب الی الذات ہے موجود ہے۔ اس تجلی کو سجدہ کرنا ہے۔ تجلی معنی درحقیقت عکس کے ہیں۔ بیت اللہ آئینۂ جمال خداوندی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے عکس کو اتارا ہے۔ عکس اور اصل میں یہ حیثیت ہوتی ہے جو حرکت ذات کرتی ہے وہی عکس کرتا ہے۔ اگر ذات ہنس رہی ہے تو عکس بھی ہنس رہا ہے اگر اصل ٹھہر جائے گی تو عکس بھی ٹھہر جائے گا فرق ہوتا ہے قوت و ضعف کا ورنہ حرکت و سکون میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جارہا ہے اسے کر ڈالئے" یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو اللہ کے حکم اور بمنزلہ وحی سمجھتے تھے، اگر ان کا یہ خیال صحیح نہ ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ فرماتے کہ یہ محض خواب ہے حکم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان آیات میں ان کے اس خیال کی تردید فرما دیتا۔ یہ بات منجملہ ان دلائل کے ہے جن کی بنا پر اسلام میں نبی کے خواب کو یکے از اقسام وحی مانا جاتا ہے۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے چت نہیں لٹایا بلکہ پیشانی کے بل لٹایا، تاکہ بچے کا منہ دیکھ کر پدرانہ شفقت ہاتھ میں لرزش نہ پیدا کر دے، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ نیچے سے ہاتھ ڈال کر گلے پر چھری چلائیں۔

(۵) قبل اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرتے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا" اس بنا پر بالکل بجا اور درست تھا کہ خواب میں یہ نہیں دکھایا گیا تھا کہ آپ نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دکھایا گیا تھا کہ آپ ایسا کر رہے ہیں، اس لئے جب آپ نے وہ بات پوری کر دی جو خواب میں دکھائی گئی تھی تو ارشاد ہوا کہ تم نے خواب سچ کر دکھایا اور اس عظیم آزمائش میں پورے اتر گئے جس میں ہم نے تم کو ڈالا تھا۔ ہم اپنے نیک بندوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ جیسی تم کو دی ہے کہ تمہارے ہاتھ سے بیٹے کو قتل کرائے بغیر یہ مظاہرہ تم سے کرا دیا کہ تم ہماری محبت میں اپنی اولاد تک کو قربان کر سکتے ہو۔

(۶) بڑی قربانی سے مراد وہ مینڈھا بھی ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کے فدیئے میں ذبح کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے ان کو لا کر دیا، اور وہ قربانی بھی ہے جو اس وقت سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد تک حج کے زمانے میں کی جاتی رہی اور پھر حضور کے عہد سے آج تک حج اور عید الاضحیٰ کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان کر رہے ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

اہلِ ہوس کیا ساتھ نبھاتے سخت کٹھن تھی منزل منزل
عشق تو آخر عشق ہی ٹھہرا، راہیں ڈھونڈیں مشکل مشکل

جب بھی وہ نزدیک ہوئے ہیں، دل کا ایسا حال ہوا ہے
جیسے نیا ڈگمگ ڈگمگ جیسے دیپک جھلمل جھلمل

یہ بھی ایک لطیفہ کہئے وہ قسمت کو کوس رہے ہیں
جن بیچارے نیک دلوں نے موتی ڈھونڈے ساحل ساحل

ہم سے تیرے ہجر کے لمحے کیا بتلائیں کیسے کاٹے
پل پل یہ محسوس ہوا ہے! اب ڈوبا دل، اب ڈوبا دل

ان آنکھوں نے چین کبھی لوٹا، نیند کبھی لوٹی صبر کبھی لوٹا
اور بیٹھا ہر سوئی سوئی، کھوئی کھوئی، غافل غافل

دولت کی پوجا کو دنیا زیست کا حاصل ٹھہراتی ہے
لیکن میں سو بار کہوں گا زہریلا ہل، زہریلا ہل

ہانپ رہے ہیں میرے ساتھی اور ابھی آغازِ سفر ہے
شور بپا ہے اُف یہ مراحل، اُف یہ مراحل، اُف یہ مراحل

آج کے رانجھے آج کے مجنوں، سب لفظوں سے کھیلنے والے
بھول گئے محمل والے کو، ورد زباں ہے محمل محمل

تم سے چھٹ کر سب کچھ پایا لیکن دل کا چین نہ پایا
دیکھ پھیرے ہم جا جا کے ڈھونڈا پھر ہم منزل منزل

کتنے ہی احباب کا ہم نے معیارِ اخلاص یہ دیکھا
دل بیگانوں سے وابستہ، تن اپنوں میں شامل شامل

جیت سے چھوٹ کے کتنے قیدی ماضی ماضی چیخ رہے ہیں
چیخ رہے ہیں مانگ رہے ہیں طوق و سلاسل طوق و سلاسل

فتح و ظفر یا غلبہ و کثرت کوئی نہیں معیارِ صداقت
ہر حالت میں ہر صورت میں حق حق ہے اور باطل باطل

میری تازہ لاش پہ عامرؔ دنیا نے جب شور مچایا
وہ اک سمت اشارہ کر کے وہ بھی چیخے قاتل قاتل

ماتھے پر تحریر ہے غم کی خشک ہیں لب آنکھیں نم ہیں
ہم سے ہمارا حال نہ پوچھو ہم تو سراپا ماتم ہیں

روحیں بے کل ذہن پریشاں سینے کربِ مجسّم ہیں
اور بظاہر اس دنیا کو کیا کیا عیش فراہم ہیں

ٹیسوں میں اک لذت پنہاں کربِ خلش میں کیف نہاں
عشق نے جو بھی زخم دیئے ہیں آپ ہی اپنا مرہم ہیں

وہم و گماں کے شیش محل ہیں ریت کے تودوں پہ قائم
اور یقیں کے تاج محل کی بنیادیں مستحکم ہیں

کتنی ہی لمبی ہو شبِ غم تارے گن گن کیوں کاٹیں
اپنے ہی سینے کی خراشیں، داغ ہی دل کے کیا کم ہیں

اس سے بڑھ کر دورِ ترقی سعادت کیا ہو گا
آج لٹیروں کے ہاتھوں میں اونچے اونچے پرچم ہیں

آج کے دورِ علم و ہنر میں مہر و وفا کا نام نہ لے
آج پرانے وقت کی ساری قدریں درہم برہم ہیں

فکر و نظر کیا، قلب و جگر کیا، سب ہیں اسیرِ زلفِ بتاں
سچ تو یہ ہے صحنِ حرم میں صرف ہمارے سر خم ہیں

بنا ہے جن کی چشمِ بصیرت، ان کو یارا دراک کہاں
جلوۂ نو کی تنویروں میں کتنے اندھیرے مدغم ہیں

جو محرومِ ذوقِ طلب ہیں جن کے دل بیدار نہیں
ان کیلئے ساری تفصیلیں، ساری تشریحیں مبہم ہیں

کل تک جن کی تشنہ لبی کو دریا بھی ناکافی تھے
آج وہی اربابِ عزیمت شکر گزارِ شبنم ہیں

حسن سراپا نور و لطافت، عشق سراپا مستی و کیف
خلوتِ غم کا حال نہ پوچھو ہم بھی یہاں نامحرم ہیں

گل چینوں کا شکوہ بے جا، صیّادوں کا ذکر فضول
سب بے رحمن کے مالی عامرؔ صیدِ نفاقِ باہم ہیں

در بحث عقائد

بحث و نظر

مکتوب نگار

تری تعلیم نے رہبانیت کو جرم ٹھہرایا
غمِ دوراں کو بھی جزوِ غمِ جاں کر دیا تو نے
حفیظ

یہاں آپ نے "غمِ جاں" کو کس بناء پر مہمل کہہ دیا؟ یہ غمِ جاناں کا محل کیسے ہو گیا؟ اسی لیے نہ کہ دوراں اور جاناں قافیہ ہیں۔ مہمل تو اسے کہتے ہیں جس کے کوئی معنی نہ ہوں، کیا "غمِ جاں" کے کچھ معنی نہیں۔ راہب تو جاناں کو بھی چھوڑ کر کوہ و بیاباں کی راہ لیتا ہے، کس کے غم میں اور کس کی نجات کے لیے!

تجلی

محض لفاظی کسی درد کی دوا نہیں۔ معقولیت تو جب تھی کہ آپ پہلے "غمِ جاں" کا مفہوم بیان کرتے پھر ثابت فرماتے کہ یہ مفہوم یہاں کس طرح موزوں ہے۔ اس کے بجائے آپ اناپ شناپ جو جی میں آئے کہتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ شاعری میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں متقابل مفہوم میں ادا کیے جاتے ہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں "غمِ جاناں" یہاں کیوں درست تھا۔

خطاب رسول ﷺ سے ہے لہٰذا "غمِ جاناں" کہیں گے تو جاناں کا مصداق ہوگا ذاتِ رسول ﷺ اور "غمِ جاناں" سے مراد ہوگی حضور ﷺ کی محبت۔ شاعر دوسرے مصرعہ سے پہلے مصرعہ کی توجیہہ و تشریح کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت میں دنیا کے جھگڑوں سے کٹ کر کونے میں بیٹھ رہنا یا کوہ و صحرا کے دامن میں عبادتیں کیے جانا رہبانیت ہے جسے آپ ﷺ کی تعلیم نے ممنوع قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیم نے تو دنیاوی علائق اور دنیاوی سرگرمیوں کو بھی عینِ اسلام اور عینِ عبادت بنا دیا جبکہ ان میں ہر قدم پر آپ ﷺ کی پسند اور مرضی کا خیال رکھا جائے۔ اہلِ ایمان شادی بیاہ بھی کرتے ہیں۔ بال بچوں میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ سیاست، تجارت، زراعت سے بھی واسطہ رکھتے ہیں۔ ان تمام مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں جن پر "غمِ دوراں" کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن ہر مرحلے اور معاملے میں انہیں احکامِ شرعیہ اور تعلیماتِ دینیہ کا خیال رہتا ہے۔ یہی ہے اسلام اور اسی کو شاعر ان الفاظ بیان کر رہا ہے کہ "تیری تعلیم نے غمِ دوراں کو بھی غمِ جاناں کا جزو بنا دیا۔" یعنی یہ غمِ دوراں کوئی معیوب اور مکروہ چیز نہیں۔ تعمیلِ دین ہی میں شامل ہے۔

مگر "غمِ جاں" سے یہ مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔ آں جناب شاید "مہمل" کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ مہمل صرف وہی لفظ نہیں ہوتا

جس کے لغۃً کوئی معنی نہ ہوں بلکہ بامعنی اور صحیح لفظ بھی مہمل بن جاتا ہے جب اسے بے جگہ استعمال کیا جائے۔ جیسے

"زید نے بکر کو روٹی کھا لو ریل کا ڈبہ"

ان میں کوئی لفظ فی نفسہٖ مہمل نہیں لیکن فقرہ مہمل ہے۔ اسی طرح "غم جاں" کے فی نفسہٖ کچھ نہ کچھ معنی بن سکتے ہیں مگر جہاں یہ استعمال ہوا وہاں مہمل رہا۔

مکتوب نگار

شق ہوا مہتاب لوٹ آیا فلک پر آفتاب
دیکھیے اعجازِ فرمانِ محمد مصطفےٰ — حفیظ

معجزۂ رجعتِ شمس سے آپ نے انکار کیا، غنیمت ہے کہ شق القمر کو تسلیم کرتے ہیں۔ معجزات کے سلسلے میں "فرمان" کا لفظ غلط کیسے ہوا؟ فرمان بمعنی حکم نہ کہ دعا، کیا شق القمر کے لیے پہلے سرکارِ دوعالم نے ہاتھا اٹھا کر دعا فرمائی تھی یا سیدھی انگلی کا اشارہ ہی کافی ہوا، کیا یہ اشارہ حکم نہ تھا۔ ابوجہل کی مٹھی میں کنکریوں نے کس کی ایماء سے کلمہ پڑھا تھا، معجزانہ قوت تو اللہ تعالیٰ نے بیشتر نبیوں کو دی تھی، کیا یہ قوت بخشیدہ انبیاء کے اپنے ارادہ وحکم کے تابع نہ تھی؟۔

تجلّی

طعن کی بدترین قسم۔ اگر ایک شخص کسی غیر مستند روایت کا انکار کرے تو کیا اس پر یہ طنز کرنا چاہیئے کہ "پھر تو تم فلاں صحیح روایت کا بھی انکار کرسکتے ہو"۔ آپ نے تجلّی "طلاق نمبر" پڑھا ہے۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ تجلّی کا تبصرہ نگار علم الحدیث سے بالکل ہی کورا نہیں ہے۔ اس اندازے کے بعد آپ کے لیے اس حسنِ ظن کی گنجائش تھی کہ رجعتِ شمس والی روایت کو اس نالائق نے یوں ہی بلاتحقیق رد نہ کیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے آپ پر کہ جھٹ سے طعنہ کس دیا۔ میرے محترم! شق القمر کا معجزہ قابلِ قبول سندوں سے منقول ہے اس لیے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ رجعتِ شمس کا معجزہ بھی ایسی ہی سندوں سے منقول ہوتا تو بلاتکلف مان لیا جاتا۔ مگر آپ چاہتے ہیں کہ ہر شخص لنگڑیوں کی طرح ہر روایت بلانقد ونظر مانتا چلا جائے تو یہ روش آپ کو مبارک۔

اور افسوس اس مسلّمہ حقیقت سے بھی آپ گریزاں ہیں کہ ہر معجزہ صرف اور صرف فرمانِ خداوندی کا ظہور ہوا کرتا ہے انبیاء علیہم السلام کے اختیار کی چیز نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ گریز ثابت کرتا ہے کہ معجزے کے موضوع پر آپ نے کچھ نہیں پڑھا۔ اچھا قرآن تو آپ نے پڑھا ہی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں کو لے لیجیے۔ یدِ بیضا اور عصائے موسوی۔ کیا قرآن ہی میں وضاحت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ تو جادوگروں کی جادوگری سے خوفزدہ ہوگئے تھے۔ اللہ ہی نے انھیں وحی دی کہ یوں کرو اور یوں کرو۔ حضرت موسیٰؑ کے اختیار کا تو کیا، خیال تک کا دخل دونوں معجزوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہوجانے کا قصہ قرآن میں ہے وہاں بھی صاف صاف اللہ کا حکم موجود ہے نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی کسی قوت وقدرت کا۔

چاند کی طرف انگلی اٹھانا آپ کو اس لیے مغالطہ دے رہا ہے کہ آپ ایک مسلّمہ حقیقت کو فراموش کیے ہوئے ہیں، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی جسے وحیِ غیر متلو یا وحیِ غیر ملفوظ یا وحیِ خفی کہا جاتا ہے۔ اگر آپ نے چاند کی طرف انگلی اٹھائی اور وہ شق ہوا تو اس کی ہدایت بلاشبہ بذریعہ وحی آپ کو ملی ہوگی۔ ابوجہل کی مٹھی میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا یا بکری کے تھنوں میں دودھ کا بڑھ جانا یا تھوڑا کھانا بہت آدمیوں کو کافی ہوجانا، اس طرح کے تمام معجزات کے بارے میں ان اساطین اہلِ علم کا جن سے مجھے اور آپ کو دین پہنچا ہے قطعی فیصلہ ہے کہ یہ محض اور محض اللہ کی قدرت وحکمت کے مظہر تھے پیغمبرؐ کے اختیار، صلاحیت اور قوت وقدرت کا ان میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ان اساطین کے روشن دلائل میرے علم میں ہیں، مگر یہاں انھیں دُہرا کر طول دینا نہیں چاہتا۔ وہ شخص قرآن وحدیث سے بے خبر ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ معجزات خود انبیاء علیہم السلام کے اختیار وقصد سے ظہور میں آتے تھے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ویسے یہاں ایک بات اور سن لیں۔ ابوجہل کے ہاتھ میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا آپ ثابت نہ کر سکیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سارا علم حدیث محض واعظوں اور میلاد خوانوں کی روایات پر مشتمل ہے۔ کاش آپ جانتے کہ ان حضرات نے کیسی کیسی لغویتیں پھیلائی ہیں۔

مکتوب نگار

"السلام اے نوربخش بزم امکاں السلام" حفیظ کا پیرایہ بھی آپ کو غلو سے خالی نظر نہ آیا۔ اللہ نور السموات والارض سے کون انکار کرے گا لیکن اس آیت کریمہ سے بھی تو انکار ممکن نہیں "لقد جاءکم من اللہ نورٌ وکتابٌ المبین" کیا حضور انور ﷺ کے نور من نور اللہ ہونے سے آپ کو انکار ہے؟

تجلی

مشکل یہ ہے کہ حدیث و قرآن تک آپ کی دسترس نہیں مگر اپنی سمجھ اور انکل کے قاضی بنائے بیٹھے ہیں۔ یہاں بھی آپ نے آیت قرآنی کو نہایت بے فکری و غیر ذمہ داری سے نقل کیا اور کچھ احساس نہ فرمایا کہ کس قسم کی غلطی آپ سے صادر ہو رہی ہے۔ سورۂ مائدہ کھول کر دیکھئے۔ یہاں لقد نہیں ہے صرف قد ہے۔ خیر اسے تو آپ اپنا سہو قلم کہہ سکتے ہیں لیکن اسے کیا کہیں گے کہ مُبین پر آپ نے الف لام داخل کر دیا۔ یہ تین باتوں کی دلیل ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ نے قرآن کھولے بغیر آیت لکھی۔ دوسرے یہ کہ آپ کی یادداشت بہت گڑبڑ ہے تیسرے یہ کہ آپ اپنے دین کی سرکاری زبان سے ناواقف ہیں۔ اگر واقف ہوتے تو یہ ادراک کر لیتے کہ کتاب یہاں موصوف ہے اور مبین صفت۔ صفت اور موصوف یا تو دونوں مُعرّف باللام ہوتے ہیں یا دونوں لام سے خالی۔ کتاب بغیر الف لام کے ہو اور مبین پر الف لام لگ جائے یہ وہی شخص تصور کر سکتا ہے جو عربی سے کورا ہو۔

رہا وہ استدلال جو آپ نے اس آیت سے کیا ہے وہ بھی بچوں جیسا ہے۔ میں یہاں قدرے تفصیل اختیار کرتا ہوں تاکہ کچھ اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے۔

ہر لفظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں اور پھر اسے کبھی کبھی لغوی معنی سے ہٹا کر بطور استعارہ یا کنایہ یا مجاز یا تشبیہ استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لفظ "نور" کے لغوی معنی ہیں روشنی یعنی وہ چیز جو سر کی آنکھوں کو کارفرما بنا کر مادی اشیاء کا نظارہ کراتی ہو یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ایسی چیز ہے جسے چھو کر یا چکھ کر یا سونگھ کر نہیں دیکھ سکتے۔ کان بھی اس کے سلسلہ میں بے کار ہیں۔ یہ صرف آنکھوں سے محسوس کی جاتی ہے اور یہ نہ ہو تو آنکھیں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ اس کا کوئی ٹھوس جسم نہیں صرف پھیلاؤ اس کی حدیں معین کرتا ہے۔ یہ خاص حدوں سے بڑھ جائے تو بینائی کو بھسم بھی کر دیتی ہے۔

لیکن لفظ نور ہمیشہ اسی حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ مجازاً و کنایۃً و استعارۃً کے طور پر متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ تقریباً چالیس جگہ استعمال ہوا ہے اور مقام و محل کے اعتبار سے اس کے مختلف مصادیق و مفہوم ہیں۔ مثلاً یہ قرآن کے لئے بھی استعمال ہوا۔ توریت کے لئے بھی رسول کے لئے بھی۔ اسلام کے لئے بھی۔ صالحیت کے لئے بھی روشنی کے لئے بھی۔ قدرت و اختیار کے لئے بھی۔ اب جو لوگ قرآن کا صحیح فہم نہیں رکھتے یا اسے غلط طور پر اپنے کسی عقیدے اور رجحان کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ تو بلا تکلف یہ حرکت کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں کہ علم البلاغۃ کی لطیف صنعتوں کو نظر انداز کر کے جہاں جو چاہے مطلب لے لیں مگر صاحب علم، فہیم اور خدا ترس لوگ یہ مجرمانہ حرکت نہیں کرتے۔ مثلاً بریلوی مکتب فکر کے لوگ یہ منطق استعمال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں نور کہا گیا اور نور ٹھوس نہیں ہوتا لہٰذا رسول اللہ کا سایہ کیسے ہو سکتا تھا۔ گویا انھوں نے قرآنی بیان کو بجائے استعارے کے لغوی مفہوم میں لے لیا حالانکہ یہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے لغو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ٹھوس جسم تھا جسے چھوا بھی جا سکتا تھا اور چھوا جاتا تھا۔ آپ کی موجودگی میں رات کو چراغ بھی جلتے تھے حالانکہ اگر لغوی مفہوم میں وہ

نور ہوتے تو چراغ کی کیا ضرورت رہ جاتی۔

دس تنبیہ کے بجواب میں آیت کی طرف آئیے جسے پیش کر کے آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ "کیا حضور انورؐ کے نور من نور اللہ ہونے سے آپ کو انکار ہے؟" یہ ابہام اس لیے ہے کہ نور کی مراد واضح نہیں ہوتی۔ آیت مذکورہ میں نور کا مصداق کون ہے اس میں اہل علم کے مابین اختلاف ہے۔ لیکن جو لوگ اس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں بھی ایسا سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہؐ نعوذ باللہ عین نور ہیں بلکہ وہ یہ مفہوم لیتے ہیں کہ حضورؐ کی ذات بابرکات سے دنیا کو ہدایت کی روشنی ملی۔ آپؐ کے ذریعہ قرآن ملا۔ آپؐ کا اسوہ مشعل راہ بنا۔ آپ کی تعلیمات نے صراط مستقیم کو واضح کیا اس مفہوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً نور ہی تھے۔ کون مؤمن اس میں ذرہ برابر شبہ کر سکتا ہے۔ لیکن اعتراض میں نے جس مصرعہ پر کیا ہے اس میں "بزم امکان" کے الفاظ ہیں جس کا مصداق فقط یہ ہماری چھوٹی سی دنیا ہی نہیں پوری وسیع وعریض کائنات ہے۔ اس پوری کائنات کو نور حیات اور نور وجود سے نوازنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ حضورؐ کی ذات نورانی کا کوئی تعلق اس بیکراں نظام کی بقا اور نجات سے نہیں۔ آپ کی بعثت انسانوں کو راہ ہدایت دکھانے کے لیے ہوئی تھی لہٰذا اس ہدایت کو نور سے تعبیر کریں گے تو اس کا دائرہ عالم انسانیت تک ہی محدود ہوگا نہ کہ تمام عالم امکان تک۔ یہ تھا وہ پہلو جس کی بنا پر میں نے غلو کا الزام لگایا اور شاعر کو ٹوکا۔

رہا "نورٌ من نور اللہ" ہونے کی بات۔ تو جب تک اس کی وضاحت نہ کی جائے میں جواب کیا دوں۔ مِن عربی میں حرف جر کہلاتا ہے جس کے اردو معنی ہیں "سے"۔ یہ متعدد مطالب کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی مثال اردو میں سمجھیے

"میں نے یہ کھلونا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے"

یہاں "ہاتھ سے" بنانے کا مطلب ہے کہ ہاتھ اس کی ساخت میں بطور آلے اور اوزار کے استعمال ہوئے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ ہاتھ کا جزو ہے اور اس میں وہی خصوصیات ہیں جو گوشت پوست کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔

مگر جب یوں کہیں کہ — "یہ کھلونا میں نے اپنے کھیت کی مٹی سے بنایا ہے"!

تو "مٹی" سے بنانے کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ مٹی اس کی ساخت میں آلے اور اوزار کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ ہوگا کہ اس کا خمیر مٹی کا ہے۔ یہ وہی طبعی خواص رکھتا ہے جو مٹی کے ہیں مٹی ہی اس میں بطور خام مادے کے استعمال ہوئی ہے۔

اب آپ بتائیے نورٌ مِن نور اللہ (اللہ کے نور سے ایک نور) کا آپ کیا مطلب لیتے ہیں۔ اگر یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نورانی کو اللہ نے اپنے کمال قدرت سے پیدا کیا ہے تو اگرچہ یہ بات بالکل درست ہے اور اس سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں ہو سکتی لیکن یہ مطلب ان الفاظ کو غلط طور پر نکالا گیا ہے کیونکہ پیدا کرنے اور بنانے کے وصف کے لیے قدرت وصنعت کے الفاظ درست ہیں "نور" کے نہیں۔ تاہم اس مطلب پر ہر مسلمان صاد کرے گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مطلب میں حضورؐ ہی کی کچھ تخصیص نہیں۔ کائنات کی تمام ہی اشیاء اللہ رب العزت نے اپنی قدرت سے پیدا کی ہیں۔

اور اگر آپ وہ مطلب لیتے ہیں جو "مٹی کے کھلونے" والی مثال میں پیش کیا گیا یعنی اللہ کے نور کی حیثیت ذات محمدیؐ کے لیے خمیر اور خام مادے کی ہو تو اس سے میں نہ صرف انکار کرتا ہوں بلکہ اسے کفر وشرک قرار دیتا ہوں۔ یہ اس لیے کہ ہم تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ازلی ابدی ہے باقی تمام چیزیں اس نے عدم محض سے پیدا کی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ اب اگر یہ مان لیں کہ ذات محمدیؐ کا مایۂ خمیر اللہ کا نور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ ذات عدم محض سے پیدا نہیں کی گئی بلکہ خدا ہی کی طرح ازلی و ابدی ہے خود آپ بھی سوچیے۔ آپ نے اول ما خلق اللہ نوری والی روایت پیش فرمائی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے میرا نور تخلیق کیا تو اس سے خود ہی ثابت ہو گیا کہ حضورؐ سراسر مخلوق ہیں۔ اللہ کا نور تو مخلوق نہیں وہ تو اس کی ذات کے لوازمات میں سے ہے۔ اگر یہی نور حضورؐ کا جسم اطہر تیار کرنے میں بطور خمیر استعمال ہوا ہو تو اسے تخلیق کہاں کہیں گے

یہ تو کھلی ساخت ہوئی یعنی ایک پہلے سے موجود شے کو کوئی شکل و ہیئت عطا کرنا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس عقیدے سے اللہ اور رسول کے مابین کم و بیش اسی نوع کا تعلق نکل آیا جسے عیسائی حضرات "ابن اللہ" کہکر اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰؑ کے مابین پیدا کرتے ہیں۔ ہزار بار خدا کی پناہ!

مفید ہوگا اگر یہاں اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مفہوم ذہن نشین کر لیا جائے۔ نور یہاں سر کی آنکھوں سے نظر آنے والی روشنی کے معنی میں نہیں بولا گیا۔ اللہ اور اس کے نورِ ذاتی کو تو آدمی کی آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ نیز اللہ کے نور کی موجودگی میں ہی ہم سب پر کالی راتیں بھی آتی ہیں اور روشن دن بھی۔ راتوں کے اندھیرے میں ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے اگر چاند یا تارے یا چراغ اور قمقمے روشنی نہ دیں حالانکہ اللہ کا نور اس وقت بھی یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دوسری بہت سی آیتوں کی طرح یہاں بھی لفظ "نور" بطور استعارہ استعمال ہوا ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان کی تمام رونقیں اللہ ہی کے فیضِ قدرت سے ہیں یا یہ کہ نورِ وجود ہر شے کو اللہ ہی سے ملا ہے۔ انبیاء و صلحاء ہوں، ملائکہ ہوں، سورج چاند ہوں۔ سب کو ظاہری و باطنی روشنی اللہ ہی کے نور سے میسر آئی ہے۔ وہی سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور باقی رکھنے والا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب طائف کے بدبختوں نے ظلم کا نشانہ بنایا تھا تو آپؐ نے جو دعا فرمائی تھی اس کا ابتدائی ٹکڑا یہ ہے اعوذ بنور وجهك الذی اشرقت له الظلمات (اے اللہ میں تیرے روئے مبارک کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے اندھیرے اُجالوں میں بدل جاتے ہیں) گویا جہالت کی جو سیاہیاں اہلِ طائف کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں انھیں ظلمات سے تعبیر فرمایا اور ایمان و ہدایت کو نورِ الٰہی سے۔ علاوہ ازیں رات کے اندھیرے میں آپ بارہا اللہ تعالیٰ کو انت نور السمٰوات والارض کہکر پکارا کرتے۔ یہاں تک کہ آپ کبھی کبھی یوں بھی کہتے۔ اے اللہ میرے نور میں اضافہ کر۔ اے اللہ مجھے سراپا نور بنا دے۔ بالکل ظاہر ہے کہ ان معروضات سے آپ کا منشاء یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ مجھے آدمیت کے دائرے سے نکال کر روشنی جیسا بسیط بنا دے بلکہ یہ ہوا کرتا تھا کہ میرے ایمان و یقین کو زیادہ کر دے میرے باطن کو معنوی روشنی سے بھر دے۔ مجھے سراپا ہدایت بنا دے۔

اب یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی، نیکی اور بدی، ایمان اور کفر کا تعلق انسانوں اور جنوں کے سے ہے حیوانات و نباتات اور تمام ہیں فطرت یعنی سورج، چاند، آسمان اور زمین سے نہیں۔ لہٰذا جب یہ فرمایا گیا کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا نور ہے تو مراد یہ ہوئی کہ یہ سارا کارخانۂ عالم اسی کی قدرت سے قائم ہے۔ مگر جب یہ فرمایا گیا کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (اے لوگو۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا اور روشن کتاب آئی) تو یہاں "نور" کا تعلق جسمانی بقا اور وجود و قیام سے نہیں ہوگا بلکہ ہدایت اور صراط مستقیم اور ایمان سے ہوگا چاہے اسے رسولؐ مراد لیں چاہے دینِ اسلام مراد لیں۔ بہرحال "نور" کا مطلب ہوگا قلب و دماغ کو منور کرنے والا ایمان اور معرفتِ رب۔

اس وضاحت سے منقح ہوگیا کہ زمین و آسمان اور بزمِ امکاں کو نورِ وجود دینے والا تو صرف اور صرف اللہ ہی ہے نہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہاں عالمِ انس و جن کے تعلق سے رسولؐ کو نور یا نور پھیلانے والا یقیناً کہہ سکتے ہیں اور کہنا چاہئیے۔

مکتوب نگار

"تو چراغِ فرش بھی ہے عرش کی قندیل بھی" حفیظ

یہ سچ ہے کہ ہر شخص عالم و فاضل اور علومِ دینیہ کا منتہی نہیں ہے بالخصوص شعراء کا عام طبقہ، پھر بھی ثقہ حضرات تک عقیدت و فرطِ محبت میں بہت سی ایسی باتیں بطرزِ مبالغہ کہہ چکے ہیں، مثلاً حکیم مومن خاں مومن دہلوی حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ سے علمِ دین کی سند رکھتے تھے اور مفتی صدر الدین آزردہ ایک عالمانہ حیثیت کے قائل تھے۔ مذہباً وہ نہایت ہی راسخ العقیدہ اہلِ حدیث تھے بلکہ یوں کہیئے کہ متعصب اہلِ حدیث تھے۔ غیر اہلِ حدیث کو بے راہ روی کا مرتکب سمجھتے تھے۔ اپنے متعلق فرماتے ہیں ؎

ارباب حدیث کا ہیں قرا ئیں ہوں۔ تقلید کے منکرین کا سہو غیر ہوں
مقبول روایت منفرد قیاس ۔ یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

دیکھا ساتھ ان احقاد تقدمن دیکھیے "عرش کی قندیل" کس
طرح اور کیسے لکھتے ہیں ؂

مقصد ہے جو بے آل عبا کا پایا ۔ واں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایا
قندیل ہے عرش کی جو ہر جان شہید کیا ہو گا فنا و شہدا کا پایا

تجلی

اس طرح کے وسوسے دراصل اس لیے آپ کے قلب میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں کہ وہاں توحید و رسالت کے تصورات صاف نہیں ہیں۔ یہ بات جاننے اور سمجھنے کے لیے کہ "عرش کی قندیل" وسیع تر معنی میں صرف باری تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں، اسے سمجھنے کے لیے بڑا علم و فضل نہیں چاہیے۔ یہ تو اسلام کی بنیادی اور عام وضاحتوں میں سے ایک ہے۔

یہاں مومن خاں کا ذکر و تعارف دے کر آپ نے خواہ مخواہ کلام کو طول دیا۔ ان کے جو شعر آپ نے نقل فرمائے ان سے بھی کوئی بات نہیں بنتی۔ توحید و رسالت کے بنیادی تصورات قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔ ان کے باب میں کسی مومن خاں اور سید فلاں کی کوئی سند نہیں۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑا شیخ اور مجتہد بھی اس دائرے میں لغزش کرے گا تو ٹوکا جائے گا۔ مومن ایک اچھے شاعر تھے اور بس۔ جو شخص یہ کہے کہ "قیاس معتبر نہیں وہ حقیقۃً مطیع پیغمبر بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ قیاس کی حجیت تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ تقلید کے منکرین کا "تیر بہ قیاس" ناعقلمندی کی نہیں کم فہمی اور بددماغی کی علامت ہے۔ آپ نہ جانے سوجھ بوجھ کی کس تاریک وادی سے بول رہے ہیں۔

مکتوب نگار

حفیظ صاحب کا مصرع ہے

"شعلۂ جوالہ میں مثل گل خنداں رہا"

آپ نے شعلۂ جوالہ کی جو تعریف کی ہے اس کی تائید مومن دہلوی کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؂

کیا کہیے گرمیاں دل بے تاب کی کہ ہے
سینے میں ایک شعلۂ جوالہ جائے داغ

مگر یہ کیا کہ شعلۂ جوالہ ظرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔ شعلوں میں گھر جانے کی مثالیں مل جائیں گی۔

تجلی

شعلوں میں گھر جانا اور بات ہے یعنی بہت سے شعلے آدمی کے اردگرد پھیل گئے۔ مگر تنہا شعلۂ جوالہ کو ظرف بنانے کی کوئی مثال آپ پیش نہ کر سکے۔ آگ ظرف بن جاتی ہے کیونکہ وہ وسیع المصداق ہے۔ شعلۂ جوالہ وسیع المصداق نہیں۔

مکتوب نگار

نہ پوچھو ان کا مقدر ہے کس قدر بیدار
حفیظ جن کو مدینہ میں نیند آتی ہے

یہاں پر مجھے ایک مشہور شعر یاد آ گیا ؂

دکھا دے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولیٰ تری رحمت برستی ہے

مدینۃ النبی میں جو مسکن رحمت ہو اور جہاں دن رات اللہ کی رحمت برس رہی ہو، عاشق رسولؐ کو نیند آ جائے تو کیا کم خوش نصیبی کی بات ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال لکھتے ہیں ؂

ہست شان رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

حفیظ کے مندرجہ بالا شعر میں نیند کو خواب غفلت سمجھنا بڑی ناسمجھی ہے، خصوصاً پہلے مصرع کی موجودگی میں ذم کے پہلو کا کیا سوال۔

تجلی

محترم بھائی۔ شاعری محض منطق اور زبان و لغت کی تابع

نہیں اس کے لیے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح بھی چاہیئے۔ بد مذاق آدمی کے لیے ایک بہت اچھا اور ایک بالکل معمولی شعر بھی یکساں ہو سکتا ہے۔ اسی بد مذاقی کا مظاہرہ آپ یہاں فرما رہے ہیں۔

لفظ "نیند" جہاں موت اور سونے کے معنی میں مستعمل ہے وہیں بطور استعارہ غفلت کے معنی میں بھی بہت استعمال ہوتا ہے

"میں تین ماہ حرمین میں رہا مگر وقت بس سونے میں گذرا"

اس کا مطلب یہ ہے کہ شایانِ شان عبادات سے غافل رہا۔ حفیظ کا مصرعہ

حفیظ جن کو مدینے میں نیند آئی ہے

ذہن کو یکایک اسی معداق کی طرف لے جاتا ہے "نیند" جب موت کے لیے بولتے ہیں تو عموماً اس کے ساتھ کوئی وصفی لفظ بڑھاتے ہیں۔ جیسے ــــ "وہ ابدی نیند سوگیا" کوئی شخص مرجائے تو یوں نہیں بولا جاتا کہ "فلاں کو نیند آگئی"۔

یہاں نیند کے ساتھ شاعر نے کوئی وصفی لفظ استعمال نہیں کیا لہٰذا "موت" کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اتنا قرین قیاس نہیں جتنا خوابِ غفلت کی طرف منتقل ہونا۔ یہی تھی میری گرفت۔ میں نے خود ہی عرض کر دیا تھا کہ شاعر کی مراد یہاں شاید "موت" ہے مگر الفاظ ذم کا شبہ پیدا کر رہے ہیں۔ اب کسی کا ذوق و وجدان کُند ہو کر رہ جائے اور یہ کھلی بات اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا میرے پاس کیا علاج۔

آپ کہتے ہیں کہ مدینۃ الرسول میں عاشقِ رسول کو نیند آ جائے تو یہ خوش قسمتی کی بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ الفاظ کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ طبعی مفہوم میں تو نیند ہر اس شخص کو کسی نہ کسی وقت آ ہی جائے گی جو مدینے میں کچھ دنوں قیام کرے خواہ وہ عاشقِ رسول ہو یا عشق سے تہی دامن۔ یہ نہ خوش نصیبی کی بات ہے نہ بد نصیبی کی۔ صحابہؓ بھی سوتے تھے۔ تابعین بھی۔ ہاں مدینے میں انتقال کر جانا عاشقِ رسولؐ کی بے شک خوش نصیبی ہے لیکن انتقال کے لیے "نیند" کے ساتھ کوئی وصفی لفظ بڑھانا ضروری ہے۔ یہ آج تک کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ کوئی صاحب مدینے میں رحلت فرما گئے ہوں اور اس بات کا تذکرہ کوئی ثقہ آدمی بایں الفاظ کرے کہ

"فلاں صاحب کو مدینے میں نیند آگئی"

آپ نے اقبال کے جو دو شعر نقل کیے اس میں دوسرا شعر تو محلِ گفتگو کے اعتبار سے زائد ہی ہے۔ اور پہلے شعر میں صاف "میرم" کا لفظ موجود ہے۔ گفتگو موت میں نہیں نیند میں ہے اگر میں نے یوں کہا ہوتا کہ عاشقِ رسولؐ کا مدینے میں انتقال کر جانا خوش نصیبی نہیں ہے تب اقبال کا یہ شعر پیش کرنا برمحل ہوتا مگر آپ محل بے محل کا فرق ہی نہیں سمجھتے۔

مکتوب نگار

ہر لمحہ سحر کے لیے تیار رہو۔ دنیا سے گذر کے لیے تیار رہو۔ حفیظ آپ فرماتے ہیں "موت کے لمحے کو سحر (صبح) سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ میری گذارش ہے کہ محاورے الگ الگ ہیں۔ دیکھیے میر تقی میر کیا فرماتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا — میر

تجلی

آپ دراصل اپنی قابلیت کے زیادہ سے زیادہ اظہار کے موڈ میں ہیں حالانکہ شعر فہمی کا بڑا تعلق حسنِ مذاق اور صحتِ وجدان سے ہے۔ میر تقی کا شعر آپ نے نقل تو کر دیا مگر اس کی رعایاتِ لفظی کا ادراک نہیں کر سکے۔ انھوں نے پہلے ہی بتا دیا کہ میرا عہدِ جوانی رو رو کٹا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رو رو کٹنے کا مطلب ہے آلام و مصائب میں مبتلا رہنا۔ آلام و مصائب کے دنوں کو بطورِ استعارہ "رات" سے تعبیر کرنا عام بات ہے۔ ہمارے ملک کی جو عام حالت ہے اسے رات اور شبِ سیاہ جیسے الفاظ سے ظاہر کرنا تو آج شعراء و ادباء کا معمول سا بن گیا ہے۔ لہٰذا میر نے جواز پیدا کر دیا کہ اپنے عہدِ جوانی کو "رات" سے تعبیر کر دیں۔ پھر "پیری" کو انھوں نے شبِ جوانی کی صبح سے تعبیر کیا۔ یہ بھی دلنشین

بات ہے۔ رات گذر جائے تو صبح ہی آتی ہے۔ جوانی کو رات قرار دے دیا تو اس کے گذرنے کے بعد جو زمانہ "پیری" آیا اسے صبح کہنے کا جواز پیدا ہوگیا۔

آپ نہ جانے کس عالم میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میر تقی نے "موت" کو صبح کہا ہے حالانکہ موت کو انھوں نے "آرام" سے تعبیر کیا ہے اور صبح کا مصداق بوڑھاپا ہے۔

مکتوب نگار

"قطعات تاریخ انطباع"

میں لفظ انطباع جس کے متعلق ارشاد ہے کہ اردو میں اس کا استعمال ہی نہیں، کو بھی آپ نے "نادرست" فرمایا ہے۔ قمر سنبھلی نے تو اپنے مصرع میں یہ لفظ لایا ہی ہے، میر مہدی مجروح کے دیوان کی طباعت پر مرزا غالب نے بھی تاریخ کہی تھی جو ان کے کلیات میں اس عنوان سے موجود ہے

"تاریخ اختتام انطباع دیوان فیض عنوان....." ص ۵۱۶

کیا اردو زبان عربی و فارسی الفاظ سے دامن کشاں رہ سکتی ہے؟

تجلی

آپ نے قسم کھالی ہے کہ میری معروضات کو پوری توجہ سے دیکھے بغیر اعتراض جڑے جائیں گے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ "انطباع" کے معنی طبع ہونے کے آتے ہی نہیں۔ یہ کہا تھا کہ اردو میں اس کا استعمال نہیں۔ یہ لفظ مروج اور مانوس نہیں۔ آپ غالب کی نظیر اٹھالائے۔ مبتدی بھی جانتا ہے کہ غالب جس عہد کے شاعر ہیں اس عہد میں فارسی ایسی ہی عام تھی جیسی آج اردو۔ غالب اردو سے بڑھ کر فارسی کے شاعر ہیں۔ ان کی اردو شاعری میں بھی پورے پورے مصرعے فارسی پروانہ کے موجود ہیں اور یہ فقرہ بھی جسے آپ نے نقل کیا پورا کا پورا فارسی ہے۔ اگر انھوں نے کبھی لفظ "انطباع" استعمال کرلیا ہے تو اس سے بھی اتنا ثابت ہوا کہ قواعد کی رو سے یہ لفظ "چھپنے" کے معنی میں استعمال ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ثابت نہیں ہوا کہ یہ اردو میں مروج اور مانوس بھی ہے۔ اکیلے غالب کا یا کسی اور ایک دو شخصوں کا اتفاقاً اسے استعمال کرلینا میرے ان الفاظ کی تردید نہیں کرتا کہ اس لفظ کا استعمال اردو کی حد تک شاذ ہے۔

اردو میں عربی فارسی کے الفاظ بے شک بہت ہیں اور مزید بھی لائے جاسکتے ہیں مگر خواہ مخواہ نہیں۔

مکتوب نگار

"آرد نہ خمار کے نعت حفیظ"

حضرت علامہ قتیل داناپوری کے اس مصرع پر آپ عجب انداز سے چونکے ہیں اور لکھتے ہیں "بھلا خمار کے کیا چیز؟" افسوس یہ مصرع ہی آپ کے پلّے نہ پڑا، وہ یوں کہ "خمار کے" آپ نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور خمار کے نیچے زیر دیکر نقل بھی کیا ہے اگرچہ اصل کتاب میں ایسا غلطی نہیں ہے۔

ہاں تو آپ نے جس "کے" کو جم و کے یعنی جمشید و کیخسرو والا "کے" سمجھ لیا ہے وہ نہیں ہے بلکہ کے بمعنی کب کے آیا ہے مثلاً

کے آدمی و کے پیر شدی" آپ برابر بولتے پھرے گے۔

خسرو لکھتے ہیں ؎

کمال تو کے ضبط گردوں شود - بدولاب دریا تہی چوں شود

فیضی کا شعر ہے ؎

کے بود یا رب کہ رو در یثرب و بطحیٰ کنم
گہ بمکہ می روم گہ در مدینہ جا کنم

اس کا دوسرا شعر اور بھی پر لطف ہے مگر حرفِ ندا کے ساتھ ہے اس لیے شاید آپ کو خوش نہ آئے ؎

یارسول اللہ بسوئے خود مرا راہے نما
تا ز فرق خود قدم سازم ز دیدہ پا کنم

تجلی

میرے سامنے جو نسخہ تھا اس کے "خمار" کے نیچے ایک نشان سا تھا جو بادی النظر میں زیر پڑھا گیا۔ اسی لیے مصرعہ مہمل بن گیا۔ آپ کی تنبیہ کے بعد میرا اشکال رفع ہوگیا۔ لیکن یہ

آپ نے لفظ "کے" کی مثالیں پیش فرمانے میں کلام کو طول دیا ہے اس کی کیا ضرورت تھی۔ فارسی میں "بے" کے معنی "بغیر" کے آتے ہیں یہ کونسا اختلافی مسئلہ یا دقیق نکتہ تھا کہ مثالوں کی حاجت ہوئی اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

"یارسول اللہ" کے تعلق سے آپ نے جو جھلی لی ہے وہ اسی مرضِ باطنی کی نمود ہے جو دین وعقائد سے لاپروائی کی صورت میں آپ کے اندر موجود ہے بجا ہے آپ کو اس کا احساس بذاتِ خود نہ ہو۔

شاعری میں ہم سب نہ صرف دور افتادہ محبوب کو خطاب کرتے رہتے ہیں بلکہ شجر و حجر تک کو مخاطب بنا بیٹھتے ہیں۔ یہ ایک ادبی اسلوب اور جذباتی پیرایہ ہے جس پر کوئی بھی خوش مذاق کھٹن محسوس نہیں کرتا۔ کھٹن اس وقت پیدا ہوگی جب یہ شبہ ہو جائے گا کہ شاعر صرف شاعری نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنے عقیدہ و مسلک کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ عقیدہ شرک ہے کہ رسول اللہ ہر جگہ موجود ہیں یا وہ ہماری ہر بات سن لیتے ہیں فیضی کا "یا رسول اللہ" والا شعر اعتراض سے بالاتر ہے اگر وہ فقط شاعری تک محدود ہے لیکن سخت قابلِ اعتراض ہے اگر واقعی شاعر یہ سمجھتا ہے کہ اسے مدینے بلانا اور سفر کی توفیق دینا رسول اللہ صلعم کے اختیار کی بات ہے۔

مکتوب نگار

مجھے افسوس ہے کہ بات میں بات آتی گئی اور میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا۔ کیا امید کروں کہ ان معروضات کو بھی برخلوص سمجھ کر آپ یہ اندازِ دگر نہ لیں گے اور مجھے میری کوتاہیوں سے ازراہِ مہربانی و عطوفت آگاہ فرمائیں گے۔ زیادہ حدِ ادب۔ والسلام۔ عقیدت گذار مجیب الرب عفی عنہ خریدار ۴۴۶۶ معرفت ہارون اینڈ برادرس کرمن ٹولہ آرہ (بہار)۔

تجلی

محض اظہارِ افسوس سے کچھ نہ ہوگا۔ تہیہ یہ کیجیے کہ آئندہ کسی بھی مسئلہ میں اس وقت دخل دیں گے جب اس کی کچھ تحقیق بھی کر لیں گے۔ تنہا خلوص کسی مرض کی دوا نہیں۔ آپ کی سب سے بڑی اور بنیادی کوتاہی یہ ہے کہ جن مسائل میں مطلق نظر نہیں رکھتے ان میں بھی استاد اور شیخ کی طرح گفتگو کر گذرتے ہیں۔ اس افتادِ طبع کو بدلیے انشاء اللہ پھر کوتاہیاں بہت کم ہوں گی۔ فقط والسلام۔

آپ کا بہی خواہ — عامر عثمانی

شمس نوید عثمانی

کیا، ہم مسلمان ہیں؟

دو پتھر بھی ٹکراتے ہیں تو اس ٹکراؤ سے ایک چمک پیدا ہوتی ہے تو جب دو بچیر مختلف انداز کے انسانی یقین ـــــ ایمان وکفر، حق و باطل ٹکرائیں تو اس کے ساتھ ہدایت کا سورج طلوع ہونا ہی چاہیئے

اور ـــــ یہ ایک ٹھوس تاریخی سچ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی نے عرب کی تاریخ کو سیاہ ترین رات میں ایسا ہی سورج نکلتے دیکھا تھا۔ کیسا عجیب و غریب نورانی سیلاب تھا وہ! کہ جو اسکے دھاروں میں آملا پار ہوگیا اور جو اس سے دور بھاگا وہی غرق ہوگیا! یہ روشنی کا حسین سیلاب بھی دو یقینوں کے ٹکراؤ سے تو پیدا ہوا تھا ایک طرف عرب اور اس کے گرد و پیش کی دنیا بھر کے وہ باطل یقین تھے جو پکار پکار کر خود کہہ رہے تھے کہ ہم باطل ہی باطل ہیں۔ خوف اور نسل کی پوجا کہہ رہی تھی کہ میں کھلا ہوا باطل ہوں مجھے خون کی عظمت کے نام پر گھڑا گیا تھا مگر میری ہی راہ میں انسانی خون کی ایسی آبروریزی ہوئی کہ خون شراب سے زیادہ سستا ہوگیا ـــ شراب کو انسان اپنے جسم میں بھر رہا تھا مگر آدمی کا خون زمین پر بہہ رہا تھا۔ پتھریلے بتوں کی پوجا کہہ رہی تھی کہ ہمارے پجاریوں کا دل بھی پتھر ہوگیا! ـــ وہ ہمارے سامنے سر جھکاتے ہیں مگر خود اپنی بیٹیوں کو جیتے جی دفن کر ڈالتے ہیں۔ اُف! کیسی تاریکی تھی: طوفانی تاریکی!!

لیکن پھر ـــ پھر وہاں ایک انسان کے اندرون ہی سے ایک بالکل دوسرے ہی انداز کا سچا یقین ابل پڑا ـــ اپنے زخموں پہ مسکرا لینے والا مگر دوسروں کے درد پہ رونے والا انسان! اسکی تقریر کتنی مختصر تھی "اے انسانو! ایک حقیقی خدا کے ہو کر سارے نقلی خداؤں سے کٹ جاؤ: اور دونوں دنیاؤں میں اپنی بگڑی بنالو" لیکن کتنی گہری تھی اس کے یقین کی دھڑکن کہ اس نے خدا کی قدرت سے شیطنت اور درندگی کی صدیوں کو زمین بوس کر دیا لمحوں میں برسوں کا اور چند برسوں میں صدیوں کا کام ہوگیا ـــ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی کایا پلٹ گئی ـــ بدترین درندگی بہترین انسانیت میں ڈھل گئی ـــ جیسے جہنم جنت میں تبدیل ہوگیا!۔

کس قدر گہرا اور کس قدر بیکراں یہ دوسرا سچا یقین تھا! باطل یقین نے اس کو بھی سینے کی طرف سے آزمایا تو دیکھا کہ بدر و احد کے میدانوں میں اس یقین نے سارے زخم سینے پر ہی کھائے لیکن اسی اسی زخموں سے باغ و بہار سینوں میں اسی دن ایمان و یقین کا جوبن دیدنی تھا! باطل یقین نے اس دوسرے سچے یقین کو پیٹھ کی سمت سے آزمایا تو دیکھا کہ جلتے ہوئے سنگریزوں پر پابجولاں گھسٹتا ہوا بلالؓ مکہ کی فضاؤں کو محض اسی یقین کی سرمدی لے سے سرشار کیے چلا جاتا ہے۔ "احد! احد! ایک ہے: بس ایک ہے!!" اور انگاروں کی سرخ سیج پر خبابؓ بن ارت کی پگھلتی ہوئی چربی "لا الٰہ الا اللہ" کا فیصلہ کن اعلان، باطل شکن نعرہ ہی ثبت کیے چلی جارہی ہے۔

یہ تھا عالم ان کے یقین کا کہ جنھیں کسی نے اس کا یقین نہ جانے کس دل سے دلایا تھا۔ تو پھر کیا حال ہوگا خود اس ہستی کے اتھاہ یقین کا کہ جس نے دوسروں کو یہ یقین خود اللہ سے لے کر دیا تھا! سمندروں کی تھاہ لینے والے پیمانے بھی اس اندرونی سمندر کی گہرائیوں کو ناپتے ہوئے ادھیڑے رہ جاتے ہیں، اہل زمین کو تو کیا آسمان والے بھی اس سمندر کی تہ تک نہ جاسکے۔ یاد کیجیے وہ سنسنی خیز لمحہ کہ جب اس یقین کا پیکر، ہاں اس کا حسن رسالتؐ شب معراج میں عرش کی سمت محو پرواز تھا تو سدرۃ المنتہیٰ پر فرشتوں کا سالار کارواں بھی پکار اٹھا تھا کہ بس

اے محمدؐ! میری بھی پرواز کی انتہا ہو چکی"۔ لیکن خود اسکی ہستی کی پرواز کی گویا یہاں سے اصلی ابتدا ہونے والی تھی۔ کچھ اسی طرح ہم زمین والے جب اس کے یقین کی بلندیوں اور اسکے ایمان کی گہرائیوں کو پانا چاہتے ہیں تو خدا کی قسم! تصور کے بال و پر ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں مگر اس یقین کی بلندی کا سرا ملتا ہے نہ گہرائی کی تھاہ گرفت میں آپاتی ہے

لیکن اگر کوئی چاہے تو اس یقین کی بلندیوں اور ایمان کی گہرائیوں کو محسوس کرنے کی ایک ــــ صرف ایک ہی راہ موجود ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جس کی زندہ نظر اس کی شخصیت پر پڑ گئی وہ خود بھی اس یقین سے کیسا سرشار ہو کر رہ گیا اور پھر جس کسی کی روح نے اس دیکھنے والے کو دیکھ لیا تو وہ بھی اس یقین کا پروانہ بن کر رہ گیا۔ وہ حسن یقین چھپ گیا مگر اس طرح اس پر اس کے دیکھنے والوں کے یہ سلسلے بعد دیگرے اس حسن کے حجابات بنتے گئے اور جتنے حجابات حائل ہوتے گئے یقین کا حسن اتنا ہی بے حجاب ہوتا چلا گیا۔ آیئے! کہ اس وقت ایک ایسا ہی انسان ہماری سمت تاریخ کے جھروکوں سے جھانک رہا ہے۔ اور اس کی زندگی کی صرف ایک جھلک میں اتنا ہی حسن یقین ہے کہ اگر کوئی اسکو دیدۂ دل میں لے لے تو پھر ساری دنیا کے دلوں پر اس یقین کا نور تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ ہستی ہے عروہؓ بن زبیر!

عروہؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ان کی تجلی دیکھنے والوں کو دیکھا تھا۔ ان میں ایک عظیم عورت تھی اور دوسرے چند مرد تھے۔ حضرت عائشہؓ ــ حضرت زید بن ثابت ــ حضرت اسامہؓ ــ حضرت سعیدؓ بن حکم بن حزام ــــ اور ابو ہریرہؓ حسن رسالت کے ان پردوں کی راہ سے عروہ بن زبیر میں اس یقین کی روشنی منتقل ہوئی تو انھیں کیا سے کیا بنا کر رکھ دیا! ان کی زندگی کا صرف ایک واقعہ اس کا اندازہ کرانے کے لئے کافی ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ بندگی کی راہ پر جادہ پیمائی کرنے والے پاؤں پر آزمائش کی گھڑی آئی ایک پھوڑے کی شکل میں! پھوڑا بڑھتا اور پکتا گیا اور آخر کار وہ خوفناک موڑ آ پہنچا جب معالج یہ آخری فیصلہ سنا رہا تھا کہ "اگر اب یہ پاؤں کاٹ ڈالا نہ گیا تو خطرہ ہے کہ سارا جسم سڑ کر رہ جائے گا"! اور ــــ عروہؓ بن زبیر اس قربان گاہ میں اتر پڑے۔ ان سے کہا گیا "درد سے بچنے کی اسلامی رخصت سے فائدہ اٹھا لیجئے اور شراب پی لیجئے" ــــ مگر ــــ مگر رضائے الٰہی کے

پروانے نے جواب دیا" میرا دل اس کو کیسے گوارا کرے کہ میں خود کو درد کی شدت سے بچانے کے لئے ایک ایسی چیز کا سہارا لوں کہ جو میرے مالک کو اچھی نہیں لگتی! ــــ نہیں! ــ نہیں اے لوگو! میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں . . . ."

جن لوگوں کے کانوں نے یہ آواز سنی ان کی آنکھیں اور عقیدت سے بھر آئیں اور گلوگیر آواز میں کہا گیا "اچھا! اے خدا کے بندے! اگر شراب نہیں تو خواب آور دوا ہی پی لو تاکہ تھوڑی سی دیر کے لئے نیند کی پناہ میں اس آپریشن کے درد سے سکون مل سکے"۔ . . لیکن جواب ملا ــــ اور آہ اے انسانو! کیا جواب ملا! خدا کی قسم اس میں تو عبودیت کا حسن اس طرح بے حجاب ہوتا محسوس ہوا جیسے جنت میں معبود کا حسن بے نقاب ہونے والا ہے، خدا کے جاں نثار نے کہا "بھلا یہ کیسے ممکن ہے لوگو! اس طرح تو میں درد پر صبر کی لذت سے محروم ہو جاؤں گا . . . . میں اس پاؤں کے ہونے پر شکر کی لذت لے چکا اب اسکی جدائی پر صبر کی لذت لینا باقی ہے . . . ."

اور یہ محض الفاظ اور محض جذبات نہ تھے۔ یہ تو اس ٹھوس حقیقت کی آہٹ تھی جو تھوڑی ہی دیر میں سب کی اشک آلود آنکھوں کے سامنے آگئی، پاؤں کاٹا جا رہا تھا اور عروہؓ بن زبیر کے مومنانہ چہرہ پر تسلیم و رضا کی قوس قزح پھیلتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہی پاؤں جو کاٹا جا رہا تھا ہاں وہی ان کے ایمان وجود کو ٹھیرا کے اوپر اڑائے چلا جا رہا ہے کتنا حسین تھا اس دن ان کا دل! یہ تو خدا ہی کو خبر تھی۔ لیکن اس کی جو دھڑکنیں اس وقت ان کے چہرے پر بکھر گئی تھیں ان کو دیکھ دیکھ کر دیکھنے والوں کے سینے ایمان کے نور سے جگمگا نے لگے تھے اور اب اس کی داستان سننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج جیسے پہلی بار انھوں نے "ایمان" کی حقیقت کو دیکھا ہے۔ پہلے چھری سے گوشت کاٹا گیا تو دیکھنے والوں کے کلیجے منہ کو آ گئے مگر جس کے گوشت پر یہ چھری چل رہی تھی اس کی زبان خدا کی پاکی کے گن گا رہی تھی ــــ پھر آری سے ہڈی کو چیرا گیا تو جس درد و کرب کی شدت کو دیکھنے کی بھی تاب لوگوں میں باقی نہ رہی ہاں اس وقت بھی عروہ بن زبیر کی آنکھیں خلا میں نہ جانے کس ہستی کو والہانہ تک رہی تھیں ــــ کیا . . . کیا اس وقت خدا اس وقت اپنے جاں نثار بندے کے سامنے بے حجاب ہو گیا تھا!؟ آہ کون جانے! پھر بہتے ہوئے خون کو روکنے کے لئے پاؤں کٹی ہوئی

ٹانگ کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈالنے کی ساعت آئی تو عروہ بیہوش ہوئے لیکن چیخے بغیر — کسی نے ایک سسکی بھی تو نہ سنی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بندہ جو خدا کی ناپسندیدہ شے کا سہارا لے کر بیہوش ہو جانے کو تیار نہ تھا اسے خود خدا نے اپنی رحمت کے سینے سے لپٹا کر بیہوش نہیں مدہوش کر دیا ہو۔ پھر جیسے ہی ان کو ہوش آیا تو ان کے ہونٹوں سے ایمان کا ایک حسین سرمدی نغمہ نکلا جسے ایک پاؤں کی قربانی دینے والے کو بندگی کے لازوال خزانوں والا دل و دماغ عطا کر دیا گیا ہو انہوں نے فرمایا "میرے اس کٹے ہوئے جسمانی ساتھی کو میرے ہاتھ پر رکھ دیا جائے اسلئے کہ اپنے اس رفیق سے مجھے کچھ کہنا ہے۔۔۔"

——— اور انہوں نے اس کٹے ہوئے پاؤں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس زخم کو اس انداز سے اٹھائے ہوئے ہیں جیسے وہ باغ فردوس کا سب سے حسین پھول ہو! انھوں نے اپنے اس رفیق سے ہمکلام ہوتے ہوئے جو کچھ کہا وہ یہ تھا "قسم ہے اس عزیز ترین ہستی کی کہ جو ظلم و ستم اور غلطی اور عیب کے ہر شائبہ سے پاک اور بلند ہے اور جس کی رحمت نے اتنے عرصہ تک میرے وجود کو بندگی کے سفر میں تجھ پر سوار رکھا کہ میں نے تجھے کبھی بھی اس ہستی، اس پالنہار کے خلاف استعمال نہیں کیا — رخصت اے میرے ساتھی! اس شکر کے عاجزانہ سجدہ کے ساتھ کہ تو میرے جسم میں لگنے کی پوری عمر میں گناہ سے داغدار نہ ہوا۔" تیری رفاقت میرے لئے شکر کا ذریعہ بنی اور تیری جدائی تسلیم و رضا کا! — ہائے کہاں سے وہ الفاظ اور وہ دل لاؤں جو خدا کے اس دوہرے احسان کا حقیقی شکریہ ادا کر سکے!"

آج جس ہستی کی یہ داستان وفا ہم سن رہے ہیں، کل میدان محشر میں اے لوگو! انھیں دیکھنا بھی ہے اور خود کو انھیں دکھانا بھی۔ آہ! اس دن جب اسی جاں نثار بندگی اس خونچکاں بیدردگی کے بالمقابل حضراتِ ذوالجلال کی بندہ نوازیاں اور قدر شناسی کی رعنائیاں بے پردہ ہو رہی ہوں گی اس دن نہ جانے وہ لوگ کہاں اور کس حال میں ہوں گے کہ جن کے سارے جسمانی اعضا ان کے ساتھ قبر میں گئے تھے مگر افسوس اس حال میں کہ ان پر گناہوں کے بھیانک داغوں کے تو انبار ہی انبار تھے، ندامت کے ایک بھی اشک خون کا نشان نہ تھا۔ جن کی پوری زندگی میں ایک لمحہ بھی قیامت سے پہلے ایسا نہ آیا کہ ان کے اوپر توبہ و پشیمانی کی قیامت گذر گئی ہو ۔۔۔ کیا؟ ۔۔۔ کیا ہمیں ایک ایسے آنسو کی آرزو بھی نہیں جس کی قیمت خدا کی نظر میں ایک شہید کے مقدس ترین خون کے برابر ہے؟ اگر نہیں تو آیئے ہم اپنے سارے سوختہ سامان زندہ جنازے اپنی لاش کو اپنے آنسوؤں سے تر کر ڈالیں۔ جسم کی موت پر ایک دوسرے روئیں گے مگر ساری دنیا بھی مل کر روئے تو ایک مردہ جسم بھی دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی لیکن یہ ایمانی اور روحانی میّت ایسی موت ہے کہ اس پر اگر مرنے والا اکیلا رو پڑے تو نہ صرف خود ہمیشہ کیلئے زندہ کر دیا جاتا ہے بلکہ اسکو دیکھنے اور سننے والے سارے اہل زمین بھی اگر دل کی آنکھ کھول کر دیکھیں تو ساری دنیا کو ابدی زندگی کا خزانہ ہاتھ آجائے۔

ہاں اسی ابدی زندگی کے خزانے دن رات آسمانوں میں لٹائے جا رہے ہیں مگر حیف! کہ زلف گیتی کے اسیروں کے حصہ میں کفن سے باہر نکلے دونوں خالی ہاتھوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔ آج وہ اس آسمانی خزانے سے محروم کئے گئے اور کل جب ان کا جنازہ اپنے گھر سے پیوند خاک ہونے کے لئے نکل رہا ہوگا تو زمینی دولت ہاتھ آ کر ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں کھیل رہی ہوگی۔

عروہ بن زبیر نے دو محرومیاں قبول نہیں کی تھیں کہ پاؤں سے بھی محروم ہوں اور اسی محرومی کے درد پر صبر بھی تہی دامن رہ جائیں۔ تو وہ کون بدنصیب ہوگا جو آج ان سے بھی بدتر یہ دونوں محرومیاں اپنے لئے پسند کر رہا ہو؟ نہ اس کی زندگی کو آسمانوں میں قبول کیا گیا ہو اور نہ اس کی میّت کو زمین قبول۔

تجلی کی ڈاک

بال مبارک کی زیارت

سوال ۱:- از سہروردی بیگم۔ حیدرآباد

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال یا مونچھ کے بال جس کو آثار مبارک کہتے ہیں، سال میں ایک بار ۱۲ ربیع الاول کو یہاں جن کے پاس ہیں دکھلاتے ہیں، ان کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں، یہاں اکثر لوگ اس کے دیکھنے کو جائز کہتے ہیں، آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:-

بے شک موئے مبارک اور تبرکات نبویہ موجب خیر و برکت ہیں، اور یقیناً ان کی زیارت کرنے والوں کو اجر و ثواب ملتا ہوگا۔

لیکن فی زمانہ اس میں غلو اور زیادتی کی جاتی ہے، اور یہ طے شدہ بات ہے کہ افراط یعنی حد سے بڑھ جانا نہ عمل میں جائز ہے اور نہ معتقدات میں۔ افراط عموماً عذابِ خداوندی کا سبب بن جاتا ہے۔ بہرحال موئے مبارک کی زیارت فی نفسہ بری بات نہیں، لیکن بھائی لوگوں نے زیارت کے جو طریقے رائج کر لئے ہیں یہ مفاسد سے خالی نہیں۔

موئے مبارک کی زیارت کے لئے سبھی قسم کے مسلمان تشریف لاتے ہوں گے۔ فاسق و فاجر بھی۔ بدکردار و بے نمازی بھی۔ شرابی اور جواری بھی۔ نیز عورتوں کی ٹولیاں بھی ضرور آتی ہوں گی۔ لہٰذا فتنوں کا قوی اندیشہ ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ بالِ مبارک بلا تشکیک و ریب قابلِ صد احترام ہے لیکن اس کی زیارت نہ احکاماتِ شریعت کا جزء ہے اور نہ رسول اللہ صلعم کی محبت کا ثبوت۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو انکی سنتوں پر عمل کیا جائے۔ ترکِ سنت کا تو کسی کو احساس تک نہیں اور بالِ مبارک کی زیارت ضرور ہوگی۔ ڈاڑھی منڈوا کر بالِ مبارک کی زیارت کرنا کم از کم ہلکی بے حرمتی تو ہے، اور ہم اسے حبِ رسولؐ قرار نہیں دے سکتے۔

بعد نماز عید مصافحہ

سوال ۲:- از صغیر احمد مبارکپوری۔

عیدین کی نماز کے بعد عید کی وجہ سے معانقہ کرنے

یا گلے ملتے ہیں یہ بدعت ہے یا سنت ؛

جواب :-

مصافحہ کرنا فی نفسہ سنت اور ایک فعل محمود ہے۔ اس بارے میں کسی کو ذرہ برابر اشکال نہیں۔ اسی طرح معانقہ کرنا یعنی ایک دوسرے سے گلے ملنا بھی احادیث رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے ثابت ہے۔ مصافحہ اور معانقہ سے مسلمانوں میں محبت اور تعلق پیدا ہوتا ہے۔ تجربات اس پر شاہد ہیں۔ گویا کہ عقلی اعتبار سے بھی مصافحہ معانقہ کا سلسلہ مفید اور قابل عمل ہے۔ لیکن مخصوص طور پر عید کے دن، عید کی نماز کے بعد مصافحہ کرنے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے کا سلسلہ جو رائج کر لیا گیا ہے یہ رسمیات کے قبیل سے ہے۔ بعض لوگ اسے سنت کہتے ہیں، اسے سنت تصور کرنا کم علمی اور نادانی کی بات ہے۔ فقہاء نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔

تبلیغی جماعت اور فاضل دیوبند

سوال ۱۱ :- از محمد شفیق قدوائی۔ اکولہ۔

گذارش یہ ہے کہ ہمارے شہر میں دین کے نام پر مختلف جماعتیں کام کر رہی ہیں، جس میں سر فہرست نام جماعت اسلامی کا ہے۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت کا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی جماعتیں مصروف عمل ہیں، جس میں سے ایک جماعت کی سرپرستی حضرت مولانا شمیم احمد قدوائی فاضل دیوبند فرما رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تبلیغی جماعت سے جتنا دین کو نقصان پہنچا ہے کسی جماعت سے نہیں پہنچا حتیٰ کہ رضاخانیوں سے بھی نہیں پہنچا۔ لہٰذا اسی جذبے کے تحت اظہار خیال فرماتے ہوئے وہ عرض کرتے ہیں کہ میں اب تمام پارٹیوں کو حتیٰ کہ رضاخانیوں کو بھی اپنے ساتھ متفق کر کے ان تبلیغی جماعت والوں کے واسطے مساجد کے دروازے بند کرا دوں گا۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ ان کا یہ اقدام کہاں تک صحیح ہوگا اور اگر غلط ہے تو اس شخص کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔

جواب :-

ہم جماعت اسلامی کے رکن نہیں ہیں لیکن جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار سے ہمیں کامل اور مکمل اتفاق ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ موجودہ زمانہ میں جماعت اسلامی ہی وہ واحد جماعت ہے جو تمام نشیب و فراز کو سامنے رکھتے ہوئے خدمت دین اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ تبلیغی جماعت کے طریق کار سے ہم متفق نہیں۔ اور نہ اس کے طریق کار کو ہم نقائص اور معائب سے مبرّا تصور کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت سے یقیناً دین اسلام کو کچھ نقصانات بھی ہوئے ہیں اور یہ نقصانات اس درجہ ظاہر و باہر ہیں کہ انھیں مصرح کرنے اور حاشیہ آرائی کے دائروں میں لا کر یاد کرانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن ہم تبلیغی جماعت کو دائرۂ حق سے خارج تصور نہیں کرتے۔ تبلیغی جماعت بھی جماعت اسلامی کی طرح ایک برحق جماعت ہے، وہ بھی دین کی خدمت اور اسلام کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے، وہ بھی اس لائق ہے کہ اسے سراہا جائے۔

فاضل دیوبند صاحب کا یہ فرمانا کہ جتنا نقصان تبلیغی جماعت سے پہنچا ہے اتنا نقصان رضاخانیوں سے بھی نہیں پہنچا، انتہائی کم علمی، نادانی اور بدشعوری کی بات ہے اسے بغض اور تعصب پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

ہم مولانا شمیم صاحب کو یہ رائے دیں گے کہ وہ تبلیغی جماعت کی ان خامیوں کی اصلاح کریں جو جہالت اور کم علمی کی وجہ سے اس میں پائی جاتی ہیں۔ تبلیغی جماعت ہو یا جماعت اسلامی، اہل حدیث ہوں یا حضرات دیوبندی۔ سب کو بغض اور عناد سے پہلوتہی کرنی چاہئے اور اپنے دماغوں میں توسع اور فراخی پیدا کرنی چاہئے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اصولی طور پر ایک ہی دین کی پیروی کرتے ہیں، ایک ہی رسول کی امت ہیں

ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ پھر آپس میں [illegible] منافرت اور رسہ کشی کیوں ہے؟ مسجد خدا کا گھر [illegible]، گھر کا دیننگ روم نہیں ہے کہ اس کے دروازے کسی کے لئے کھول دیئے اور کسی کے لئے بند کر دیئے جائیں۔ مولانا موصوف کا یہ فرمانا کہ میں تبلیغی جماعت والوں کے لئے مساجد کے دروازے بند کرا دوں گا، کوئی اچھا اور قابل تعریف فیصلہ نہیں ہے۔

مساجد کے دروازے تو ان حضرات کے لئے بھی مقفل نہیں ہونے چاہئیں جن کی سرکشیاں اور شرارتیں بے مثال ہو کر رہ گئی ہیں اور جنھیں بریلوی مکتب فکر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

تبلیغی جماعت سے اختلاف ہونا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ تبلیغی جماعت کی مخالفت کیجئے، ڈٹ کر کیجئے۔ لیکن یہ مخالفت برائے مخالفت اور منجملہ تعصب نہیں ہونی چاہئے بلکہ مخالفت برائے اصلاح ہونی چاہئے۔ تبلیغی جماعت والوں کی توجہ ان حقائق کی طرف مبذول کرائیے جن سے وہ یکسر غافل ہیں۔ وہ نہ مانیں تو معاملہ خدا کے حوالے کیجئے۔ ہم لوگ نصیحت کر سکتے ہیں بس یہی ہماری ڈیوٹی ہے۔ محاسبہ خدا کرے گا۔

ایک ضروری بات یاد رکھیے

خدا اور آخرت کو بھول کر، سنجیدگی اور متانت کا گلا گھونٹ کر جو مخالفت رونما ہوتی ہے اس پر ہٹ دھرمی تمرد اور سرکشی کا اطلاق ہوتا ہے۔ بایں اختلاف سے اصلاح جنم نہیں لیتی۔ دشمنی، عناد اور تعصب سر ابھارتے ہیں۔

ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ آپ فاضل دیوبند صاحب کو سمجھائیے کہ خدارا امت مسلمہ پر رحم کرو۔ پچھلے اختلاف اور گروہ بندیاں کچھ کم نہیں ہیں کہ اب اور نئے محاذ قائم کئے جائیں۔ وہ عالم دین ہیں یقیناً بات ان کے سمجھ میں آ جائے گی۔ لیکن اگر انھوں نے آپ کے سمجھانے کے باوجود بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو پھر آپ یقین کر لیجئے کہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں سیدھے راستہ پر نہیں لا سکتی۔ اسلئے کہ جب کسی مولوی کا ذہن بگڑ جاتا ہے تو پھر وہ بہت بڑی ہوئی چیز ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی اصلاح کسی صورت ممکن نہیں ہوتی۔

غائبانہ نماز جنازہ

سوال ۷۷: از محمد اسمٰعیل حبیب۔ ورنگل

یہاں غائبانہ نماز جنازہ کی بحث ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ شاہ فیصل کی وفات پر مختلف شہروں میں جو غائبانہ نماز پڑھی گئی ہے اس پر کچھ حضرات نے اعتراض کیا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

آپ سے التماس ہے کہ براہ کرم کتاب و سنت و فقہ اور کچھ تاریخی شواہد کی روشنی میں تشفی بخش جواب سے نوازیں

جواب:-

یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ احناف اور مالکیہ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک میت کی موجودگی ضروری ہے۔ میت موجود نہ ہو تو نماز جنازہ درست نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس شوافع اور حنابلہ کے نزدیک نماز جنازہ غائبانہ طور پر ادا کی جا سکتی ہے ان حضرات کے نزدیک میت کی حاضری شرط اور ضروری نہیں ہے۔

ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حبشہ نجاشی کی جب وفات ہوئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا —— اس واقعہ کو مستدل بنا کر شوافع اور حنابلہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ درست ہے، اگر درست نہ ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

یہ استدلال کمزور ہے اور احناف اور مالکیہ اسے صحیح تصور نہیں کرتے۔ احناف کی معقول رائے یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص اور استثنائی واقعہ ہے اس کی پیروی اور تقلید امت کے لئے درست نہیں۔

ممکن ہے کہ مالک حقیقی نے اپنی قدرت کاملہ سے

نجاشی کا جنازہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کر دیا ہو یہ بات محض منجملۂ قیاس اور یہ امکان محض منجملۂ امکان نہیں ہے بلکہ اس امکان کو تقویت دینے والی ایک روایت بھی موجود ہے۔ یہ روایت نصب الرایہ میں مذکور ہے اور اس روایت کو علامہ دیلمی نے نقل کیا ہے۔ حضرت عمران ابن حصینؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے بھائی نجاشی انتقال کر گئے ہیں، چلو اٹھو ان پر نماز جنازہ پڑھو۔ صحابہؓ نے صفیں درست کر لیں اور آنحضورؐ نے نماز جنازہ پڑھائی صحابۂ کرام کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نجاشی کا جنازہ حضورؐ کے سامنے موجود ہے۔

کسی بھی صحیح العقیدہ مسلمان کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ بات خلاف عقل اور ناممکنات میں سے ہے۔ آپ کو ان گنت معجزات عطا کئے گئے تھے۔ تاریخ بھری ہوئی ہے کس کس معجزہ کا ذکر کیا جائے۔ ممکن ہے کہ مالک حقیقی نے اپنی قدرت کاملہ سے کام لیتے ہوئے نجاشی کا جنازہ حضورؐ کے آگے رکھا دیا ہو — اور اس کے بعد آپ نے نماز جنازہ پڑھائی ہو۔ اگر معجزے اور خدا کی قدرت پر کامل ایمان ہو تو اس بات کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ بات بھی بالکل عجیب سی محسوس ہوتی ہے کہ حیات طیبہ میں صرف یہی ایک واقعہ ایسا ملتا ہے کہ جب آپؐ نے غائبانہ طور پر نماز جنازہ ادا کی۔ آپ احادیث کی کتابیں دیکھ ڈالئے، اس واقعہ کے علاوہ آپ کو کوئی دوسرا ایسا واقعہ نظر نہیں آئے گا جو مذکورہ واقعہ کے مماثل ہو۔ کوئی اور دوسری روایت نظر سے نہیں گزرے گی جس سے شوافع اور حنابلہ کے مسلک کی تصویب و توثیق ہوتی ہو۔ اور جسے مذکورہ حضرات اپنا مستدل بنا کر پیش کر سکیں۔

ہمارا دعویٰ ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم نے حدیث کی ہر ہر کتاب پڑھ ڈالی ہے اور تمام اقوال رسول ہمارے ذہن میں مستحضر ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم نے احادیث کی جن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان میں کوئی اور واقعہ یا قول رسولؐ ایسا نظر نہیں آتا جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ غائبانہ طور پر جنازہ کی نماز پڑھنا درست ہے۔

بیر معونہ پر کم و بیش ستر صحابہ کرام شہید کر دئیے گئے تھے۔ صحابہ کرام کا یہ مبارک گروہ زیادہ تر قاریوں پر مشتمل تھا۔ یہ حضرات بہترین حفاظ اور بے مثال قرار تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس غمناک واقعہ سے بیحد متاثر ہوئے تھے۔ ان حضرات صحابہ کے شہید ہونے کی اطلاع آپؐ کو جبریلؑ نے دی تھی۔ آپ کو شدید صدمہ پہنچا۔ آپؐ نے غصہ کا اظہار کیا۔ قاتلون پر لعنت فرمائی اور ان کے حق میں بد دعا کی — لیکن تاریخ گواہ ہے آپ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اگر غائبانہ نماز جنازہ واقعتاً تشریعی حیثیت رکھتی تو کیا وجہ تھی کہ آپ نے ان شہیدوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھی؟۔

خلفائے راشدین کے دور مبارک میں بھی غائبانہ نماز جنازہ کے واقعات کمیاب نہیں بلکہ نلیمبد اور نایاب ہیں۔ تاریخ اور کتب احادیث کا مطالعہ کرنے کے بعد عقل انسانی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ اصول کے اعتبار سے غیر درست ہے۔

نجاشی کی نماز جنازہ ایک مخصوص اور استثنائی واقعہ تھا جس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ احناف اور مالکیہ کے نزدیک چونکہ درست نہیں لہذا جو لوگ حنفی یا مالکی ہوں ان کے لئے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے اماموں کی عملی مخالفت کریں۔ ان کے لئے یہی مناسب اور ضروری ہے کہ وہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے سے احتراز کریں۔

رہے وہ حضرات جو شوافع اور حنابلہ کے مذہب کے پیروکار ہیں ان حضرات کے لئے بے شک نماز جنازہ غائبانہ طور پر پڑھنا درست ہے۔ اور جب یہ حضرات نماز جنازہ ادا کر رہے ہوں ان پر انگشت نمائی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مجتہد کا اجتہاد غلط نکلا

تو اسے ایک نیکی ضرور ہی ملتی ہے۔ ہم امام شافعیؒ کے اس اجتہاد کو قرین فہم تصور نہیں کرتے۔ لیکن ہم انہیں برا بھی نہیں کہہ سکتے ۔۔۔ اور نہ کہنا چاہیئے۔

سوال ۱۳: از حفیظ الرحمٰن خان۔ فیروزآبادی،

اکثر میلاد خواں حضرات سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ جب رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپس تشریف لائے اور سفر معراج کا حال بیان فرمایا تو ایک یہودی نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ جب آپ اللہ رب العزت کے قریب ہوئے تو اللہ کو کس شکل میں دیکھا۔ جواباً حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے اللہ رب العزت کو اپنی شکل میں پایا۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا کوئی اس قسم کی روایت آپ نے کسی معتبر کتاب میں دیکھی ہے۔ اگر نظر سے گزری ہو تو اس کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔

جواب:۔

میلاد کی محفلوں میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں عموماً وہ من گھڑت اور کسی کاریگر کی تخلیق ہوا کرتی ہیں۔ علمی اور تحقیقی حیثیت سے ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اور کوئی بھی فہیم وذکی آدمی اس قسم کی روایات کو قابل التفات تصور نہیں کرتا۔

مذکورہ روایت معتبر کیا ہم نے کسی غیر معتبر کتاب میں بھی نہیں دیکھی۔ جن صاحب نے یہ روایت بیان کی ہے ان ہی سے حوالہ طلب کیا جائے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ روایت بھی اسی قسم کی دوسری بہت سی روایتوں کی طرح کسی فنکار کے ذہن کی اختراع ہے۔ واللہ اعلم۔

سلام اور تکبر

سوال ۱۴: از محمد عبدالرؤف۔ بریم نگر۔

ہمارے یہاں چند ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ ہر کسی کی طرف سے سلام کے منتظر رہتے ہیں، لیکن وہ صاحبان سلام میں پہل نہیں کیا کرتے۔ چند ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات رہتی ہے کہ سلام میں پہل کرنے والا چھوٹے درجہ کا آدمی ہوتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو سلام کے جواب میں سلام ہی کہتے ہیں، وعلیکم السلام نہیں کہتے۔ ازراہِ کرم "سلام" سے متعلق آپ کچھ تفصیلات پیش کریں۔ میں سخت انتظار کروں گا۔

جواب:۔

یہ شکایت صرف آپ ہی کو نہیں بلکہ ان گنت مسلمانوں کو اپنے اہل وطن احباب اور متعلقین سے ہوگی۔ خود ہمارے دیوبند میں بھی ایک نہیں بے شمار اس قسم کے لوگ موجود ہیں جو از خود سلام کرنے میں اپنی ذلت اور ہتک محسوس کرتے ہیں۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ سلام سے احتراز کرنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو علم دین سے ناواقف اور اسلامی آداب واخلاق سے نابلد ہیں بلکہ اچھے خاصے باشعور، ذی علم، فہیم، دانا اور متورع حضرات بھی سلام کے معاملہ میں ابتدا کرنے سے کتراتے ہیں اور از خود سلام کرنے میں اپنی تذلیل اور چھوٹا پن محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تہذیب وآداب کے سرسری مطالعہ سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں میں باہمی سلام ودعا کا سلسلہ اتحاد واشتراک کا بہترین ضامن اور تعلقات کو وسیع اور مضبوط کرنے کا کامیاب اور مؤثر ذریعہ ہے۔

احادیث رسولؐ کے مطالعہ سے یہ بات بھی مصرح ہو جاتی ہے کہ سلام میں پہل کرنے والا، مقابل کی بہ نسبت بہر اعتبار قابل تعریف اور زیادہ ثواب کا مستحق ہے ۔۔۔ سلام کا جو نقد نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے وہ محبت اور رواداری ہے۔ اس سلام کے بدولت دشمنی دوستی میں اور اجنبیت شناسائی اور اپنائیت میں متبدل ہو جاتی ہے۔ ناممکن ہے کہ آپ کسی کو برابر سلام کریں اور وہ آپ کو دکھ پہنچانے کے طریقے سوچتا ہو۔ اگر آپ اس نفرت اور خصومت کی اس دیوار کو گرانا چاہیں جو کسی سبب سے آپ کے اور آپ کے

حریف کے درمیان چشمک بن گئی کھڑی ہو گئی ہو تو دو چار مرتبہ اسے از خود سلام کیجیئے۔ پھر دیکھئے نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہو گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے عقل اور تجربہ جس پر صاد کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ واقعات اس کی توثیق کرتے ہیں۔ اس مضبوط حقیقت کی تائید حدیث رسولؐ سے بھی ہوتی ہے۔ آنحضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ تم لوگ جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتے جب تک ایمان کی تکمیل نہ ہو جائے، اور ایمان کی تکمیل اس وقت تک قطعًا ناممکن ہے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کا سلوک نہ کرنے لگو۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کیا میں تمہارے لئے ایسے طریقہ کی نشاندہی نہ کر دوں کہ اگر تم اس کو اختیار کر لو تو آپس میں دوستی اور محبت کا سلسلہ قائم ہو جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کی اشاعت کرو۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس ماحول میں سلام کا سلسلہ راسخ پذیر ہو گا وہاں نفرت، دشمنی، تعصب بالکل نہیں ہو گا، یا نہ ہونے کے درجہ میں ہو گا۔

اس حدیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عین عقل و نفسیات کے مطابق ہے اور ان گنت ہمارے ذاتی واقعات اس کے صحیح ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ سلام میں ابتدا کرنا عاقبت اور انجام کے اعتبار سے انتہائی مستحسن اور مفید ہے۔ یہ بات محض کورا قیاس نہیں بلکہ عقلی...... دلائل اس کی پشت پناہی کرنے کے لئے موجود ہیں۔

ایک حدیث میں مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ظاہر کئے گئے ہیں۔ منجملہ ان میں سے ایک حق یہ بھی کہ سلام میں پہل کی جائے۔ "پہل" کا لفظ ہم نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے روایات میں پہل کرنے کی صراحت نہیں ہے، لیکن اندازِ بیان اور سیاق و سباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مراد پہل کرنا ہی ہے۔

ابو داؤد کی ایک روایت میں تو بالکل صاف صاف الفاظ میں اس شخص کی افضلیت و رفعت کا اظہار کیا گیا ہے جو سلام کہنے کے معاملہ میں ابتدا کرنے کا عادی ہو۔ اس حدیث کے راوی ابو امامہؓ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے نصیحت و فہمائش کا ہر زاویہ استعمال کر کے اس درجہ سلام کی تاکید کیوں ہے۔ اسلام کا اصل منشا کیا ہے؟ اور انسان از خود سلام کہنے سے کتراتا کیوں ہے؟ آخر دونوں باتوں کی بنیادی وجہ کیا ہے؟۔

خصائل انسانی کا پوسٹ مارٹم اور تعلیمات اسلامی کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اس مہلک بیماری کا ملیا میٹ کرنا چاہتا ہے جسے عام فہم زبان میں تکبّر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انسان کے از خود سلام نہ کرنے کی اوّلین وجہ غرور اور تکبّر ہی ہے۔ جس شخص کے دماغ میں انانیت کے جراثیم اور غرور و استکبار کے عناصر موجود ہوں گے وہ کبھی سلام کرنے میں پہل نہیں کر سکتا۔ اسلام تکبر اور انانیت گوارہ نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماننے والوں کے مزاج میں گھمنڈ اور تمرد کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

اسلام نے صرف یہ بتلانے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ تکبر کیا خطرناک مرض ہے بلکہ اسے نیست و نابود کرنے کے متعدد اور مجرب طریقے بھی بتلائے۔ ان ہی طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سلام میں ابتدا کرنے کو اپنا شعار بنا لیا جائے۔

یہ تصور کہ سلام میں ابتدا وہی کرتا ہے جو چھوٹے درجہ کا آدمی ہو۔ درحقیقت غرور اور گھمنڈ ہی کی اولاد ہے جو آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ میں بہت بڑا ہوں۔

لاثانی ہوں، قابلِ احترام ہوں۔ وہ کبھی کسی کو سلام نہیں
کر سکتا۔ خواہ وہ سلام کی اہمیت و فضیلت سے واقف
ہو ـــ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ نام نہاد علماء کبھی کسی کو
سلام نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس
بات کے مستحق ہیں کہ ہمارا احترام کیا جائے ہمیں جھک کر
سلام کیا جائے۔ ہم کیوں کسی کو سلام کریں۔ آپ یہ نہیں
کہہ سکتے کہ علماء کو سلام کرنے کی فضیلت و اولیت کا علم
نہیں ہوگا۔ ان کی نگاہوں سے ایسی احادیث نہیں
گذری ہوں گی جو سلام کی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں
نہیں۔ بالکل نہیں۔ ان لوگوں کو ان سب باتوں کا
یقینی طور پر علم ہوتا ہے لیکن چونکہ دماغ میں تکبر اور بڑائی
کے ذرات موجود ہوتے ہیں، اس لئے از خود سلام
نہیں کر سکتے۔

احادیث نبوی میں یہ تفصیل دیکھی جا سکتی ہے
کہ اگر سر راہ دو آدمیوں کا آمنا سامنا ہو اور ان میں سے
ایک کسی سواری پر سوار ہو، دوسرا پیدل چلنے والا ہو
تو اسلام تاکید کرتا ہے کہ سلام وہ شخص کرے جو سواری
پر سوار ہے۔ اس لئے کہ اس شخص کو نسبتاً برتری اور
فوقیت حاصل ہے۔ امکانی طور پر گھمنڈ اور بڑائی میں
بھی مبتلا ہو سکتا ہے، اس لئے اسی کو حکم دیا گیا کہ سلام
میں پہل کرے ـــ دیکھا آپ نے کس قدر باریک
رکیک، سبق آموز، اور قابلِ عبرت بات ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب دو ایسے شخص باہم ملاقات
کریں جن میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا
ہو تو سلام وہی کرے جسے برتری حاصل ہے۔ یہ برتری
اور فوقیت کسی بھی اعتبار سے ہو۔ خواہ مال و منال کے
اعتبار سے خواہ علم و کمال کے اعتبار سے، خواہ نسب و
حسب کے اعتبار سے۔ خواہ مراتب و درجات کے
اعتبار سے۔ حقیقت یہ ہے کہ تکبر وہی شخص کر سکتا
ہے جسے کسی قسم کا تفوق اور ترفع حاصل ہے۔ جو بیچارہ
کسی حیثیت کا مالک نہیں وہ کیا تکبر کرے گا ـــ اگر
بے حیثیت آدمی سلام میں پہل نہ کرے تو یہ سمجھئے کہ اسے سلام
کی اہمیت کا علم ہی نہیں۔ وہ جہالت اور ناواقفیت کی وجہ
سے سلام نہیں کرتا نہ کہ تکبر اور گھمنڈ کی وجہ سے۔

آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں
جو سلام کے جواب میں سلام ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔
وعلیکم السلام کہنے میں انہیں دشواری اور زحمت ہوتی ہے
ـــ آئیے قرآن حکیم کی تعلیمات پر نظر ڈالیں۔ آیا وہ
سلام کے جواب کے سلسلہ میں کیا طریقہ اور انداز تجویز کرتا
ہے۔ سورۂ نساء کی ایک آیت ہے:۔

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا
أَوْ رُدُّوهَا۔

(جب کوئی تمہیں سلام کرے تو تم اس سے
اچھے الفاظ میں اسے سلام کرو یا ویسے ہی لوٹا دو)

آیت کا حاصل اور مقصد بالکل ظاہر و باہر ہے۔ تفسیر
اور حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کے پیش نظر
ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب کوئی صاحب ایمان اسے سلام
کرے تو وہ نسبتاً زیادہ اچھے انداز میں اس کا جواب دے
اور زیادہ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرے۔ سلام کے جواب
میں انقباض اور روکھے پن کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔

اس پوری تقریر سے یہ بات آپ کے سمجھ میں آگئی
ہوگی کہ سلام صرف دعا نہیں بلکہ متکبر اور منکسر المزاج
آدمیوں کو پہچاننے کی بہترین کسوٹی بھی ہے۔

جو شخص عاجزی اور فروتنی کا حامل ہوگا وہ سلام
میں ہمیشہ پہل کرے گا، خواہ اس کا مد مقابل عمر اور مرتبہ
کے اعتبار سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم ہر کس و ناکس کو سلام کیا کرتے تھے بلکہ انتہا
یہ ہے کہ آپ بچوں کو بھی اس بات کا موقع نہیں دیا کرتے
تھے کہ وہ سلام میں پہل کر لیں، نظر پڑتے ہی خود ہی سلام
کر لیا کرتے تھے۔

اگر آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ کبھی سلام میں ابتداء
نہیں کرتا۔ اور اگر اسے سلام کیا جائے تو خوش اسلوبی

کے ساتھ جواب بھی نہیں دیتا، صرف "سلام" کہہ کر ٹال دیتا ہے تو یقین سر بسجدہ۔ شخص تکبر کے تپ دق میں مبتلا ہے یا بالکل اجہل واقع ہوا ہے کہ اسے یہ تمیز ہی نہیں کہ جواب دینے کا ڈھنگ اور الفاظ کیا ہونے چاہئیں۔

سورۂ زخرف کی ایک آیت

سوال:۔ از ملک منظور صاحب۔ سرینگر

سورۂ زخرف کی آخری آیت وَقِیْلِهٖ یَا رَبِّ الخ میں واؤ قسمیہ ہے یا عطف۔ اگر قسمیہ مان لیا جائے تو بھی اپنے پلّے کچھ نہیں پڑتا ہے۔ یہ آیت وضاحت چاہتی ہے آپ سے گذارش ہے کہ آپ تجلی کے آئندہ شمارے میں آیت کا مطلب سمجھائیں۔

جواب:۔

یہ آیت واقعۃً ایک مشکل ترین آیت ہے۔ لیکن اگر آپ کوئی تفسیر سامنے رکھ کر غور و فکر فرماتے تو آیت کا مطلب اور حاصل سمجھ میں آجاتا۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر واؤ کو قسمیہ مان لیا جائے تو بھی اپنے پلّے کچھ نہیں پڑتا "تو بھی" کا مطلب یہ ہوا کہ اگر واؤ کو عاطفہ مانا جائے تو بھی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ عاطفہ ماننے کی صورت میں ادنیٰ درجہ کی بھی الجھن پیش نہیں آتی البتہ قسمیہ ماننے کی شکل میں دماغ پر ذرا زور ڈالنا پڑتا ہے مطلب دونوں ہی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

پوری آیت یہ ہے:۔

وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ
قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔

جن لوگوں نے واؤ کو قسمیہ مانا ہے انھوں نے ترجمہ یوں کیا ہے "اور اس کو رسول کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے"۔

اس آیت سے پہلے ایک آیت گذر چکی ہے۔

وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ اللہ کو قیامت کا علم ہے اگر واؤ کے توسط سے اول الذکر آیت کو ثانی الذکر پر عطف مانا جائے تو بات بالکل واضح ہو جائے گی اور ترجمہ یوں ہوگا:۔

"اللہ کو قیامت کا علم بھی ہے اور (علاوہ ازیں) رسول کے اس قول کا علم بھی ہے"

واؤ کو قسمیہ ماننے کی صورت میں ترجمہ یوں کیا جائے گا:۔

"قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ اے رب یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے"

اگر ایمان نہیں لاتے کی جگہ یوں کر لیا جائے کہ:۔

"ایمان نہیں لا سکتے یا ایمان لا کر نہیں دیں گے"

تو الجھن رفع ہو جائے گی اور مطلب دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گا۔

دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مشرکین کے بارے میں دعویٰ کیا تھا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا سکتے اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب ہیں، وہ واقف ہی تھے کہ واقعتاً یہ لوگ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار نہیں کر سکیں گے۔ انھوں نے رسول اللہؐ کے قیاس اور پیش گوئی میں اہمیت اور زور پیدا کرنے کے لئے آپ کے اس قول کی قسم کھائی جس میں رسول اللہؐ نے مطلع یہ فرمایا تھا کہ یہ لوگ ایمان قبول نہیں کر سکتے چنانچہ اگلی آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اے رسول جب یہ لوگ ایمان نہیں لا سکتے تو ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ تم پر سلام ہو۔ یہ عنقریب (اپنا انجام یا حق و باطل کی حقیقت) جان لیں گے (ما حصلہ)

(نوٹ) ابن کثیر اور مولانا تھانویؒ وغیرہ نے واؤ کو عاطفہ مانا ہے۔ شاہ عبد القادر دہلویؒ، شیخ الہند اور مولانا مودودی وغیرہ نے واؤ کو قسمیہ تسلیم کیا ہے۔

از عمر فاروق عاصم ——— منیجر مکتبۂ تجلی

عنوانِ حیات

میرے بڑے بھائی مولانا عامر عثمانی مرحوم کی مرگِ ناگہاں نے جو اثرات میری زندگی پر مرتب کئے اس کی ایک جھلک "عنوانِ حیات" کے عنوان سے حاضر ہے ....!

کل یہ عالم تھا کہ ہر سانس تھا املانِ حیات
اب یہ حالت ہے کہ ہم خود ہیں پشیمانِ حیات

رنج و غم، درد و الم، آہ و فغاں، کرب و بلا
وقت نے آج لگائے ہیں یہ عنوانِ حیات

چھن گئی راحتِ دل، بجھ گئے خوابوں کے چراغ
موت کے ہاتھ میں آیا جو گریبانِ حیات

تیری یادوں میں تڑپتا رہوں، جب تک بھی رہوں
منہ سے کچھ بھی نہ کہوں ہے یہی فرمانِ حیات

تو نے جاتے ہوئے ساحل پہ تو چھوڑا تھا مگر
لوٹ کر صبر و سکوں لے گیا طوفانِ حیات

کاش تو دیکھ بھی سکتا کہ ترے جانے سے
کس قدر ہو گیا تاریک شبستانِ حیات

یہ تو اک وقفۂ آرام ہے جسموں کے لئے
موت پر ختم نہیں وسعتِ دامانِ حیات

اُف یہ طوفانِ حوادث کے تھپیڑے عاصم
چھوٹ جائے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ حیات

٭

آ رہی ہے
تجلی
مولانا عامرؒ عثمانی نمبر
ایک اہم تاریخی دستاویز
جس کا
ملک شدت سے منتظر ہے
ہر لائبریری جسکی ضرورت محسوس کر رہی ہے

دوسری قسط

قادیانیت کی حقیقت

مولانا محمد عارف سنبھلی - استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اگر مرزا صاحب کی وہ عبارتیں جمع کی جائیں جن میں انھوں نے خود اکثر انبیاء علیہم السلام بلکہ ذاتِ اقدس یعنی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونے کے دعوے کئے ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ سردست یہاں ہم ان ہی چند حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مرزا بشیر الدین صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن میں انھوں نے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام پر مرزا جی کی برتری کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

".... چنانچہ اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس غرض کے لئے کہ لوگ اس کے وجود کو پہچانیں اور شک و شبہ کی زندگی سے پاک ہوں حضرت مسیح موعود کو بھیجا تھا، جو کہ اسلام کی تعلیم پر عمل کر کے اس مقام پر پہنچے جس پر قدیم سے نبی پہنچتے چلے آئے ہیں بلکہ بہت سے نبیوں کے مقام سے بھی اوپر قرآن نے اس مقام تک آپ کی رہنمائی کی جس تک ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور مسیحؑ کو رہنمائی حاصل نہ ہوئی تھی۔

(احمدیت یعنی حقیقی اسلام صفحہ ۱۸)

ناظرین ایک بار پھر اس بات کو اپنے حافظہ میں تازہ کر لیں کہ سیدنا ابراہیمؑ و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام پر مرزا جی کی برتری اور فوقیت کی یہ تبلیغ حقیقتِ اسلام کے نام سے انگلستان کے صدر مقام لندن میں کی جارہی ہے اور قادیانیوں کی سرگرمیوں کا یہی وہ پہلو ہے جس کو دیکھ کر کہ اسلام کا نام کسی نہ کسی طرح اور کسی بھی حلیے میں یورپ تک پہنچا دیا گیا، بعض لوگ اس جماعت کی مدح و ثنا کرتے نہیں تھکتے وہ دیکھ لیں کہ حقیقی اسلام کی تبلیغ یورپ کے ملکوں میں کس ملمع زمین کی جارہی ہے

اور دعوۃ الامیر میں لکھتے ہیں:-

"آپ پر اللہ تعالےٰ نے اس کثرت سے اور تواتر کے ساتھ غیب کی خبریں ظاہر کیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اور کسی نبی کی پیشگوئیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی تعداد اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کو تقسیم کر دیا جائے تو کئی نبیوں کی نبوت ان سے ثابت ہو جائے۔

(دعوۃ صفحہ ۱۹۶)

یہاں تک مرزا صاحب کے دعوۂ نبوت کے ثبوت میں جو چند حوالے خود مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادہ اور خلیفہ کی تحریروں سے پیش کئے گئے ان کے بعد اصولاً یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مرزا صاحب نبوت کے مدعی تھے اور نہ صرف نبوت کا ان کو دعویٰ تھا بلکہ بڑے بڑے رسولوں سے اپنے افضل ہونے کا بھی دعویٰ تھا۔ لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ساری امت کا یہ متفقہ فیصلہ اور اٹل عقیدہ ہے کہ آپؐ آخری نبی و رسول ہیں اور اب کوئی نبی و رسول نہیں آئے گا اور قادیانیوں کو چونکہ اس کا عملی تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ مرزا صاحب کی نبوت کا نام سنکر ہی مسلمان ان کے سخت دشمن ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کے مبلغین حسب موقع کئی طرح کی تاویلات سے کام لیتے ہیں، ان مختلف تاویلوں میں سب سے مشہور تاویل یہ ہے کہ مرزا صاحب حقیقتاً نبوت کے مدعی نہیں تھے بلکہ انہوں نے صرف اپنے محدث ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یعنی وہ اس کے دعویدار تھے کہ وہ نبی تو اگرچہ نہیں ہیں، لیکن ان کو کثرت کے ساتھ اور بالکل یقینی اور قطعی قسم کے الہام ہوتے ہیں، قادیانی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ اسی کیفیت کو جس کا اصل عنوان محدثیت ہے، مرزا جی بطور مجاز نبوت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور لوگوں کو اسی مجازی لفظ

"نبوت" کے استعمال سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ گویا مرزا صاحب واقعی دعویدارِ نبوت تھے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا قادیانی جماعت کا یہ اصل عقیدہ نہیں ہے، بلکہ لوگوں کو محض دھوکہ دینے کے لئے حسبِ ضرورت اس تاویل کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم ضرورت سمجھتے ہیں کہ محدثیت کی بحث کو بھی دعویٰ نبوت والی بحث کی طرح مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادہ کے بیانات کی روشنی میں طے کر دیا جائے۔ مرزا صاحب کے اس سلسلہ کے بیانات ملاحظہ ہوں۔

"اس عاجز کے رسالہ فتح الاسلام، توضیح المرام ازالۂ اوہام میں جس قدر ایسے الفاظ موجود ہیں کہ محدث ایک معنی میں نبی ہوتا ہے۔ یا یہ کہ محدثیت جزوی نبوت ہے، یا یہ کہ محدثیت نبوت ناقصہ ہے، یہ تمام الفاظ حقیقی معنی پر محمول نہیں، صرف سادگی سے ان کی لغوی معنوں سے بیان کئے گئے ہیں، مجھے نبوت حقیقی کا ہرگز دعویٰ نہیں، سو مسلمان بھائیوں کی خدمت میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ان لفظوں سے ناراض ہیں تو وہ ان کو ترمیم شدہ تصور فرما کر بجائے اس کے محدث کا لفظ میری طرف سے سمجھ لیں ابتداء سے میری نیت جس کو اللہ خوب جانتا ہے اسی لفظ سے مراد نبوت حقیقی نہیں بلکہ صرف محدث مراد ہے، جس کے معنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ———— متکلم لئے ہیں یعنی محدثوں کی نسبت فرمایا قد کان فیمن قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء۔"

(اشتہار مرزا حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۹۱ و ۹۲)

اس عبارت میں صراحت ہے کہ اگر نبی کا لفظ بولا بھی جاتا ہے تو اس سے مراد محدثیت ہی ہے نبوت ہرگز نہیں ہوتی ———— لیکن اس کے بالکل برعکس اب یہ صراحت بھی ملاحظہ فرمائیے کہ مرزا جی صرف محدث ہونے سے صاف انکار کرتے ہیں اور نبوت کے لفظ سے نبوت ہی مراد لیتے ہیں اور اس پر خصوصی طور پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ان دو برزی اور ظلی معنوں کی رو سے مجھے نبوت اور رسالت سے انکار نہیں اسی لحاظ سے صحیح مسلم میں بھی مسیح موعود کا نام نبی رکھا ہے اگر خدا تعالےٰ سے غیب کی خبر پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام سے اسکو پکارا جائے، اگر کہو کہ اس کا نام محدث رکھنا چاہیئے تو میں کہتا ہوں کہ تحدیث کے معنی کسی لغت کی کتاب میں اظہارِ غیب نہیں مگر نبوت کے معنی اظہارِ غیب ہے۔" (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۲)

اس عبارت میں مرزا صاحب نے پوری صفائی سے یہ اعلان کیا ہے کہ میں صرف محدث نہیں بلکہ نبی و رسول ہوں اور میرا محدث نام رکھنے والے عربی لغت سے نا واقف ہیں وہ تحدیث و نبوت کے لغوی فرق کو نہیں سمجھتے اور تنبیہ فرماتے ہیں کہ اظہارِ غیب خاصۂ نبوت ہے نہ کہ خاصۂ محدثیت۔

اس اظہارِ غیب سے متعلق مرزا صاحب کی ایک عبارت اور پڑھ لیجئے۔ لکھتے ہیں:-

"اب یہ مقام انصاف کی آنکھ سے دیکھنے کا ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسی غیب کی باتیں جو نہاں در نہاں تھیں اس شخص کی طرف منسوب ہو سکیں جو مفتری ہو حالانکہ خدا تعالےٰ اپنے کلام عزیز میں فرماتا ہے کہ ہر ایک مومن پر غیب کامل کے امور ظاہر نہیں کئے جاتے بلکہ محض ان بندوں پر جو اصطفاء و اجتباء کا مرتبہ رکھتے ہیں، ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک جگہ قرآن شریف میں فرمایا ہے لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی اللہ تعالےٰ اپنے غیب پر کسی کو غالب ہونے نہیں دیتا مگر ان لوگوں کو جو اس کے رسول اور اس کی درگاہ کے پسندیدہ ہیں۔"

(ضمیمہ براہین احمدیہ ج ۵ ص ۶۷)

اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ غیب کامل کی اطلاع ہر مومن کو نہیں دی جاتی بلکہ صرف رسولوں کو دی جاتی ہے۔ جس کے ثبوت میں انہوں نے آیت بھی پیش کر دی ہے فرماتے ہیں کہ اس غیب کا اظہار میری طرف کیا گیا ہے۔ اب ہر شخص کے سامنے جو تھوڑی سی سمجھ رکھتا ہو، نتیجہ ظاہر ہے یعنی مرزا صاحب باضابطہ اور جیند قسم کے رسول ہیں یہاں تک تو ہوا نبوت و محدثیت سے متعلق مرزا جی کا نفی و اثبات، اب مرزا بشیر الدین صاحب کی سنئے وہ اس جھگڑے کی تاریخ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:-

"جن کتب میں آپ نے اپنے نبی ہونے سے صریح الفاظ میں انکار کیا ہے اور اپنی نبوت کو جزئی اور ناقص محدثوں کی نبوت قرار دیا ہے وہ سب کی سب بلا استثناء ۱۹۰۱ء سے پہلے کی کتب ہیں اور ۱۹۰۱ء کے بعد کی کتب میں سے ایک کتاب میں بھی نبوت کو جزئی قرار نہیں دیا اور نہ ناقص اور نہ نبوت محدثیت (حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۱۲۰)

پھر لکھتے ہیں:-

۱۹۰۱ء سے پہلے کے حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔ (حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۱۲۱)

پھر لکھتے ہیں:-

"پہلے بھی (یعنی ۱۹۰۱ء سے بھی پہلے) نبی کے نام سے آپ کو پکارا جاتا تھا لیکن آپ اس کی تاویل کرتے رہتے لیکن جب بار بار الہامات میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبی و رسول کے نام سے پکارا تو آپ کو معلوم ہوا کہ آپ واقع میں نبی ہیں غیر نبی نہیں جیسا کہ پہلے سمجھتے تھے اور نبی کا لفظ جو آپ کے الہامات میں آتا ہے صریح ہے قابلِ تاویل نہیں"

ایک عبارت مرزا محمود احمد صاحب کی اور بھی پڑھ لیجئے — امیر امان اللہ خاں مرحوم کو مرزا جی کی نبوت کا فلسفہ سمجھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ محدث موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی بہت سے گذرے ہیں اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ بھی انسان کو محدثیت کے مقام تک ہی پہنچا سکتی ہے تو پھر آپ کو دوسرے انبیاء پر کیا فضیلت رہی اور آپ سید ولد آدم اور نبیوں کے سردار کیونکر ٹھہرے خیر الرسل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ میں بعض ایسے کمالات پائے جائیں جو پہلے انبیاء میں نہیں پائے جاتے تھے اور ہمارے نزدیک یہ کمال آپ ہی میں ہے کہ پہلے انبیاء کے امتی ان کی قوتِ جذب سے صرف محدثیت کے مقام تک پہنچ سکتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے امتی مقام نبوت تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور یہی آپ کی قوتِ قدسیہ کا کمال ہے جو ایک مومن کے دل کو آپ کی محبت اور آپ کے عشق کے جذبہ سے بھر دیتا ہے۔" (دعوۃ الامیر صفحہ ۳۳ و ۳۴)

اس ایک ہی عبارت میں مرزا صاحب کے صاحبزادہ اور جماعتِ قادیان کے امیر المومنین اور خلیفہ نے مسئلہ زیر بحث کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ جماعتِ قادیان مرزا جی کی نبوت کی مدعی نہیں یہاں تو امیر امان اللہ خاں مرحوم کو دعوت ہی اس کی دی جا رہی ہے کہ وہ مرزا صاحب کو محدث نہیں بلکہ نبی تسلیم کر لیں۔

اب تک درج ہونے والی صراحتوں کے بعد مزید کسی ثبوت کی ضرورت تو نہیں رہتی تاہم یہاں پر ہم مرزائیوں اور لاہوریوں کے درمیان ہونے والے اس تحریری مناظرہ کی ایک دو عبارتیں نقل کرتے ہیں جو اس موضوع پر کہ مرزا صاحب نبی بمعنی محدث تھے یا حقیقی معنی میں نبوت کے دعویدار تھے۔ بمقام راولپنڈی ہوا تھا!

قادیانی مناظر لکھتے ہیں -

"میں نے ستر حوالہ جات اور دیگر بیس سے زائد دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نبی ہیں، برحق نبی ہیں خدا ان کو نبی کہتا ہے - رسولِ کریمؐ نے آپ کو نبی ٹھہرایا ہے - آپ نے خود نبوت کا دعویٰ کیا ہے - جماعتِ احمدیہ آپ کو نبی مانتی رہی ہے یہی حقیقت ہے یہی صداقت ہے" (مباحثہ راولپنڈی ۲۴)

یہی مناظر اس کتاب میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"آخر میں میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مفاسد زمانہ پر نگاہ ڈالیں، پھر ان حالات کو دیکھیں الحاد، دہریت، عیش پرستی اور مادیت کے انتشار کو دیکھیں اور پھر بتلائیں کہ کیا ان تمام مفاسد کا علاج کرنا کسی محدث کا کام ہے، یا بہت بڑے عظیم الشان نبی کا، میں سچ کہتا ہوں کہ زمانہ کی حالت گواہی دے رہی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں نبی نہ بھی آیا تھا تب بھی اس زمانہ میں ضرور آنا چاہئے۔ خیال روحانی طور پر مر چکی تھی اس کو زندہ کرنے کے لئے عظیم الشان نبی

کی ضرورت تھی جو موسوی مسیح سے ہر شان میں بڑھ کر ہو سو الحمد للہ کہ ایسا ہی ہوا خدا کا مقدس مسیح موعود آیا اور اس نے کہا کہ میں پہلے مسیح سے ہر شان میں بڑھکر ہوں در فی الواقع وہ بڑھکر تھا مگر افسوس ان پر جو اُس کے مرتبہ کو کم کرے یا صرف ایک محدث قرار دے لیں احباب ائیں کہ آپ کے نزدیک حضرت مسیح موعود کو حضرت عیسیٰ پر ہر شان میں برتری حاصل ہے یا نہیں؟ آپ کے جواب سے حقیقت کھل جائے گی۔"

پھر اس کے بعد مرزا جی کی کتاب "کشتی نوح" سے ایک عبارت نقل کی ہے، اُس کے بعد لکھتے ہیں۔

"خدارا غور کریں، کیا یہ محدث کا کلام ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ تو عظیم الشان نبی کا کلام ہے۔"

(مباحثہ راولپنڈی ۱۶۳ و ۱۶۴)

یہاں تک تو مرزا جی کے نبوت کا مدعی ہونے نہ ہونے اور انکی جماعت کے مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی بات تھی مذکورہ عبارتیں جماعتِ قادیان کے ذمہ داروں اور دکیلوں نے صرف اس غرض سے لکھی ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مرزا جی اُن کے عقیدہ اور ایمان کی رو سے حقیقی نبی تھے، صرف محدث نہ تھے۔ اب آیئے اس مسئلہ سے متعلق جناب محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی رائے کے بارے میں بھی کچھ غور کر لیا جائے کیونکہ ہماری اس تحریر کا محرک اُنھیں کے فکر اور رائے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھ لیجئے کہ قادیانی جماعت نے قرآنِ پاک جو دینِ اسلام کی بنیاد ہے مولانا کی نظر میں کتنی بے دردی کے ساتھ بدل ڈالا ہے اور اس میں کس درجہ تحریف کی ہے مولانا کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

۱۰ رمئی ۱۹۴۸ء کے صدق جدید کی اشاعت ہمارے پیشِ نظر ہے، اس اشاعت میں قادیان سے شائع ہونے والے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ اور تفسیر پر مولانا دریابادی صاحب تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دی ہولی قرآن:- انگریزی جلد ۲ زیرِ اہتمام صاحب ہدایت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب۔

احمدیہ (قادیانیہ) کی طرف سے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن مجید ہے۔ اس کی جلد اول پر تبصرہ ان صفحات میں پچھلے سال نکل چکا ہے یہ اس کی جلد ثانی ہے۔ اس میں نو سورتیں شامل ہیں، سورۂ یونس سے لیکر سورۂ کہف تک۔ ترجمہ و تفسیر کی وہی خصوصیات ہیں جو جلد اوّل کے تبصرہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ جہاں تک حلِ لغات اور تفسیروں پر وسعتِ نظر کا تعلق ہے، مترجم و مفسر کی تلاش و مشقت قابلِ داد ہے اور غیر مسلم دنیا کو قرآن اس حد تک بھی پہنچا دینا ایک قابلِ قدر خدمت دینی ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی سوال "مخصوص" عقائد کا آگیا ہے خواہ وہ بنیادی اور اوّلی ہوں یا فرعی اور ثانوی (اور ایسے مقامات ایک دو نہیں بکثرت ہیں) شارح کا قلم قدرۃً اسلام کے بجائے "احمدیت" کا ترجمان بن گیا ہے۔ اور عام رجحان تحریر یہ ہے کہ حقیقت پر مجاز کو اور ظاہر پر تمثیل و استعارہ کو غالب رکھا گیا ہے"

تبصرہ ختم ہوا۔ مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک فقرہ پر رک کر غور فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ قادیان سے نکلنے والی اس تفسیر قرآن مجید کے متعلق مولانا کے تاثرات کتنے شدید ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں اسلامی عقائد کی جگہ تمام عقائد "احمدیت" فٹ کر دیئے ہیں اور حقائق کو تمثیل و استعارہ کا لباس پہنا دیا گیا ہے گویا قرآن کی مکمل تحریف کر ڈالی گئی ہے پھر مولانا نے بغیر کسی رو رعایت کے یہ بھی صاف لکھ دیا کہ اسلام کے عقائد بالکل جدا ہیں اور احمدیت کے بالکل علیحدہ اور عقائد بھی وہ جو اوّلی اور بنیادی درجہ رکھتے ہیں۔ قادیانیوں کو ملت سے خارج قرار دینے کے باب میں مولانا کی یہ تحریر سند کا درجہ رکھتی ہے جس کے بعد مزید کسی بحث کی احتیاج نہیں رہتی۔

یہاں ہم مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی ایک تحریر نقل کرتے ہیں جو پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی مشہور و معروف کتاب "قادیانی مذہب" جو مقدمہ کے نام سے بھی مشہور ہے اس کے تیسرے ایڈیشن پر مولانا دریابادی تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" قادیانیت کی تردید میں اب تک علماءِ اسلام نے دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں لیکن عموماً وہ تحریریں مولویوں

کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں جو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں اور اس لئے اپنے مقصد میں بھی زیادہ مؤثر نہیں ثابت ہوتی ہیں۔ حال میں سر اقبال اور سر مرزا ظفر علی وغیرہم کی تحریروں کے باعث بحث کار خیر لا ہے، لہذا اب ہمارا جدید طبقہ بھی ادھر متوجہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر الیاس برنی صاحب اس سلسلہ میں السابقون الاولون کا شرف رکھتے ہیں اور وہ ترتیب زمانی میں سر اقبال وغیرہ سے بھی اس باب میں متقدم ہیں۔ ان کی کتاب "قادیانی مذہب" کا یہ جدید ایڈیشن بلحاظ اضافہ و ترمیم ایک جدید اور مستقل کتاب کے حکم میں ہے، اور اس میں قادیانی مذہب کے اسرار کو ایک جدید طرز پر شستہ انداز کیا گیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور دلنشیں بھی۔ اس ضخیم تالیف میں موصوف نے کمال یہ کیا ہے خود بہت ہی کم لکھا ہے بلکہ خود مرزا صاحب (بانی فرقہ) کی تحریروں سے ان کے اقتباسات لے کر انھیں ایک خاص ترتیب اور سلیقہ سے یوں رکھا ہے جس سے مرزا صاحب کے دعوے اور تعلیمات اور خود ان کی زندگی کے خد و خال نظر آ جاتے ہیں۔ رومی اور چینی نقاشوں کے معرکہ کا قصہ چلا آ رہا ہے کہ چینی نقاشوں نے بڑی محنت سے دیوار پر نقش رنگا رنگ بنائے، رومی ہنرمندوں نے اور کچھ نہ کیا صرف یہ کیا کہ مقابل کی دیوار کو صیقل کر کے آئینہ بنا دیا اور جونہی پردہ اٹھا ساری چینی نقاشیاں ہو بہو رومی دیوار پر منعکس ہو گئیں۔ برنی صاحب کا فن نقاشی کچھ اسی قسم کا واقع ہوا ہے۔ انھوں نے مرزا کا چہرہ خود مرزا کے آئینہ میں جلا کر دکھا دیا ہے، اور خود الگ کھڑے ہو گئے ہیں، دلچسپی سے کتاب کا کوئی صفحہ خالی نہیں۔ عبارت کسی خشک علمی یا مذہبی کتاب کی نہیں ناول یا افسانہ کی معلوم ہوتی ہے جا بجا ظرافت کی شوخیاں اور مذہب گرا قسمیں بھی پر ستراں ہیں۔"

(صدق لکھنؤ ۱۹ جون ۱۹۳۶ء)

تبصرہ آپ کے سامنے ہے۔ پروفیسر الیاس برنی کی اس کتاب کے لفظ لفظ بلکہ حرف حرف کی تصدیق مولانا نے اپنے بلیغ الفاظ میں فرمائی ہے وہ آپ نے دیکھ لی اب اس کے بعد آپ یہ بھی سن لیجئے کہ مولانا کی اس مصدقہ کتاب میں اصولی طور پر وہ سب کچھ ہے جو ہم نے اپنے مضمون میں مرزا جی کے دعووں کی تفصیل میں لکھا ہے اور اس کے علاوہ سیکڑوں گنا اور بھی بہت کچھ۔ اگر صرف اس کے مضامین کی فہرست ہی نقل کی جائے تو کئی صفوں میں سمائے۔ اس میں دعوی نبوت بھی ہے، اولوالعزم انبیاء و رسل پر تفضیلت کا ادعا و اعلان بھی۔ انبیاء علیہم السلام کی توہین اور ختم نبوت کا انکار بھی ہے وغیرہ۔ اور اس سب کے بارے میں مولانا دریابادی صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ یہ مرزا کا آئینہ ہے جس میں مرزا کا چہرہ دکھلانے میں الیاس برنی صاحب نے رومی ہنرمندوں والا کمال دکھلایا ہے۔ ممکن ہے برسہا برس پہلے کی یہ تحریر مولانا کے حافظہ سے محو ہو گئی ہو لیکن اب یہ پھر مولانا کے سامنے ہے اور کچھ اسی قسم کا تبصرہ اور تقریظ مولانا موصوف نے سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "قادیانیت" کی بھی فرمائی تھی جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں ورنہ اس کو بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا۔ ہم مولانا کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اپنی ان مصدقہ دونوں کتابوں کے کم از کم ضروری ابواب کو دوبارہ ملاحظہ فرما کر اپنی رائے عالی میں تبدیلی فرمائیں۔

پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی کتاب پر مولانا کے تبصرہ میں جن شخصیتوں کے رد قادیانیت کے میدان میں قدم رکھنے پر مولانا نے اپنے اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا ان میں ایک تو خود پروفیسر برنی صاحب ہیں، دوسری شخصیت ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی ہے اور تیسری سر ظفر علی مرحوم کی۔ ڈاکٹر صاحب کے تجربات و تاثرات قادیانی جماعت کے باب میں رہے بہر شئے کسی باخبر پر مخفی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب محمد اقبال جو ملت اسلامیہ کے ان دو تین اشخاص میں سے ایک ہیں جنھوں نے بہت شدت کے ساتھ اور سب سے پہلے قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا اور اسٹیٹسمین روزنامہ میں مضامین لکھے جن میں ان کو بصراحت اسلام سے جدا ایک فرقہ قرار دیا اور حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ قوم قرار دیں۔

ابھی چند ہی ہفتے پہلے جب حکومت پاکستان نے قادیانیوں کو غیر مسلم فرقہ قرار دیا تو ہمارے محترم مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس فیصلہ پر اپنے شدید رنج و غصہ کا اظہار فرمایا، دونوں ملکوں کا وہ واحد شخصیت ہیں۔ ہم یہاں ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے وہ جملے نقل کرتے ہیں جن میں انھوں نے حکومت ہند سے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ فرقہ قرار دینے کی سفارش کی ہے۔

"میرے نزدیک ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ قوم قرار دیدیں۔ یہ چیز قادیانیوں کی اپنی روش کے بھی عین مطابق ہوگی اور ہندوستانی مسلمان بھی اُن کو اس طرح برداشت کرلیں گے جس طرح وہ دوسرے مذاہب کو برداشت کر رہے ہیں۔

(نقل از قادیانی مسئلہ ص ۲۶ مصنفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

اسٹیٹسمین میں شائع ہونے والے علامہ اقبال کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:-

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں، یعنی وحدت الوہیت پر ایمان انبیاء پر ایمان اور رسول کریم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں، مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے اور رسول کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انھیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہ کر سکا ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا ہے، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام ہو تاکہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

(نقل از کتاب "قادیانیت" مصنفہ سید ابوالحسن علی صاحب ندوی بحوالہ حرفِ اقبال)

یہ ہے ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا فیصلہ قادیانیوں کے بارے میں اور یہی وہ ڈاکٹر اقبال ہیں کہ مولانا کی رائے میں بڑے بڑے علماء کے دفتر کے دفتر قادیانی مسئلہ سمجھانے کے لئے ناکافی تھے مگر ڈاکٹر صاحب وغیرہ کا اسلوب بیان مولانا کی نظر میں اس مقصد کو بحسن و خوبی پورا کرنے والا تھا اب ڈاکٹر صاحب کی رائے اور فیصلہ بھی سامنے ہے اس پر بھی غور فرمالیا جائے۔

ایک اشکال اور اس کا حل

ہمارے مضمون میں مولانا دریابادی کے اس تبصرہ کو پڑھکر جو مولانا نے قادیان سے شائع ہونے والے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن پر فرمایا تھا اور اسی طرح ایاس برنی مرحوم کی کتاب کے لفظ لفظ کی تصدیق کو پڑھنے کے بعد ناظرین کے ذہن میں فطری طور پر یہ اشکال پیدا ہوگا کہ جب قادیانیوں کا سارا معاملہ مولانا کے سامنے ہے اور مولانا اس پر اظہارِ خیال بھی فرما چکے ہیں تو تمام علماء کی طرح مولانا بھی ان کو اسلام سے خارج کیوں نہیں قرار دیتے۔ اب مولانا کو تامل کس بات میں ہے اور مزید کس چیز کا مولانا انتظار فرما رہے ہیں؟ تو اس سلسلہ میں ہم ایک بات شروع میں لکھ آئے ہیں کہ مولانا نے موضوع بناکر اس جماعت کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔ دوسرے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا نے زیادہ تر مطالعہ تو کیا ہے لاہوری جماعت کی کتابوں کا اور وہ فلاح فرماتے ہیں اس سلسلہ کے قادیانیوں کی جانب سے اور اس سب سے بھی پہلے اور سب سے بنیادی

وجہ علماء سے مولانا کے اس جداگانہ طرزِ عمل کی یہ ہے کہ مولانا
کے نزدیک جس نے بھی دل کے یقین کے ساتھ زبان سے ایک
بار کلمۂ شہادت ادا کرلیا ہے اس کے اب اسلام سے خارج
ہونے کا کسی حال امکان نہیں۔ اب خواہ وہ ضروریاتِ دین
کا انکار ہی کیوں نہ کرے یا خدانخواستہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے بعد بھی کسی کو حقیقی نبی مان کر اس پر ایمان ہی لے آئے۔ مولانا کے
نزدیک وہ بہرحال مسلمان ہی رہے گا اور کبھی اسلام سے خارج
نہ ہوگا ہماری اس رائے کو کسی قسم کی مبالغہ آرائی پر محمول نہ فرماتے
ہوئے تفصیل پڑھئے جس سے ہمارے خیال کی پوری تصدیق
ہوجائے گی۔

قادیانیوں کے باب میں مولانا کے اس رویّہ اور ان کی
سرگرمیوں پر اظہارِ پسندیدگی کو بار بار پڑھنے کے بعد کوئی صاحب
مولانا کو بذریعہ خط اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اس سے بعض
مسلمان غلط فہمی میں مبتلا ہوکر ان کے لٹریچر کو پڑھنے لگیں گے
اور اس احتمال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ قادیانی
ہی ہوجائیں۔ اب یہ اشکال اور مولانا کا جواب آپ کے سامنے
پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیں

یہ خط صدق جدید ۶ مارچ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے
مکتوب نگار لکھتے ہیں:-

"صدق کے تازہ پرچے میں "ہنرش نیز بگو" کے تحت
جو کچھ آنجناب نے تحریر فرمایا ہے ہرچند اس کا مقصد
قادیانیوں کے تبلیغی جوش و گرمی کے ہنر کا اظہار ہے، بس،
تاہم اس سے اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال ہے کہ
شاید آپ کو ان کے عقائد و افکار سے بھی کسی درجہ
میں اتفاق ہے ورنہ آپ ان کی تبلیغی سرگرمی کے ساتھ
اس چیز کو نظر انداز فرمادیتے کیونکہ بہرحال وہ تبلیغ اپنے
ہی افکار و عقائد کی کرتے ہیں"

اس سب کا جواب مولانا موصوف صرف ایک جملہ میں
دیتے ہیں جو حسبِ ذیل ہے اور نہایت غور و فکر کا طالب ہے
مولانا لکھتے ہیں:-

"یہ گفتگو اسی میں تو ہے"

یعنی یہ بات طے شدہ نہیں کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ
کرتے ہوں بلکہ مولانا کے نزدیک عقائد ان کے جو کچھ بھی ہوں تبلیغ
وہ بس اسلامی عقائد ہی کی کرتے ہیں۔ لیکن ہم پچھلے صفحات میں
قادیانیوں کے انگریزی ترجمہ قرآن پر "صدق" کے صدق سے جو
تبصرہ مولانا کے قلم سے نکلا ہوا نقل کیا ہے وہ مولانا نے اس خیال
کی کسی طرح گنجائش نہیں چھوڑتا۔

ناظرین اس کے ایک دو جملے پھر ملاحظہ فرمائیں۔
مولانا لکھتے ہیں۔

"لیکن جہاں کہیں بھی سوالِ احمدی" کا آگیا ہے، خواہ
وہ بنیادی اور اوّلی ہوں یا فرعی اور ثانوی (اور ایسے
مقامات ایک دو نہیں بکثرت ہیں) شارح کا قلم قدرۃً
اسلام کے بجائے "احمدیت" کا ترجمان بن گیا ہے"

جس خط اور اس کے جواب کا یہاں تذکرہ ہو رہا ہے
وہ قادیانیوں کے شائع کردہ قرآن پر اس تبصرہ کے صرف دو
دو برس بعد کا ہے۔ اس خط کے جواب میں مولانا اس سے قطعاً
انکار فرماتے ہیں کہ قادیانی اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہوں لیکن
اس موقع پر مولانا کو بالکل یاد نہیں آتا کہ میں دو برس پہلے
ان کے شائع کردہ قرآن کا مطالعہ کرچکا ہوں۔ اسی میں صفحہ صفحہ
پر ان کی تحریف اور بنیادی عقائد کی بکثرت تبدیلی کا تماشہ دیکھ کر
اسی پر صدق میں اظہار رائے بھی کرچکا ہوں پھر اپنے صریح اعلان
اور گواہی کے بعد میں کس طرح اس بات سے انکار کردوں کہ وہ اپنے
عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں، ظاہر ہے اگر مولانا کو ان کی تبلیغ کے بارے
میں مزید کچھ اور معلوم نہ بھی رہا ہوتا تب بھی یہ کھلی بات تھی کہ انہوں
نے انگریزی قرآن اپنے گھر میں محفوظ رکھنے کے لئے تو چھاپا نہیں تھا
وہ بھی تو تبلیغ عقائد قادیانیہ ہی کی غرض سے شائع کیا گیا تھا مگر
تعجب ہے مولانا کو اس خط کا جواب لکھتے وقت اتنا سنگین واقعہ
بھی اتنا سنگین واقعہ بھی یاد نہیں آیا جس میں مولانا نے چند
لفظوں میں قرآن کے بارے میں ان کی جسارت کو ظاہر فرمایا تھا
کتنے صاف اور قطعی الفاظ میں مولانا کے کہ "لیکن جہاں کہیں بھی سوال
احمدی" "عقائد کا آگیا ہے" "جہاں کہیں" اور "احمدی عقائد"
کے فقروں کو ملاحظہ فرمائیے۔ کوئی کسر چھوڑی ہے مولانا نے؟

ان جملوں میں مولانا کے تاثرات قادیانیوں کی اس کارروائی کے بارے میں کتنے شریفانہ ہیں ملاحظہ ہو۔ مولانا کا یہ لکھنا کہ "شارح کا قلم قدرۃً "اسلام" کے بجائے "احمدیت" کا ترجمان بن گیا ہے" یہ قدرۃً" کا لفظ ہمارے جیسے اناڑی کا لکھا ہوا نہیں ہے کہ بے سوچے سمجھے اور کسی شعور و وجدان کے بغیر یونہی لکھ دیا گیا ہو یہ قرآن کے قلم سے نکلا ہے جو ہند و پاک میں انشاء تنقید و ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ قدرۃً کا لفظ بتاتا ہے کہ قادیانی مفسّر کے قلم کو فطری طور پر کرنا ہی یہ چاہئے جو اس نے کیا ہے اس سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی کہ وہ کوئی تحریر لکھے اور اس میں "احمدی عقائد کی تبلیغ نہ کرے ——— لیکن ——— مکتوب نگار کے جواب میں مولانا اپنے اس تبصرہ کے صرف دو برس بعد فرماتے ہیں کہ اسی میں تو گفتگو ہے کہ قادیانی جن کی مدح و توصیف میں کرتا ہوں وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے بھی ہیں یا نہیں ——— پھر سوال یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کرتے تو وہ رات دن کتابیں اور اخبار چھاپتے کس غرض سے ہیں؟ اور تمام ملکوں میں جاجاکر کہتے کیا پھرتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ مولانا کو معلوم نہیں؟ اب رہا یہ سوال کہ ترجمہ و تفسیر میں قادیانیوں کی طرف سے اسلام کے تمام بنیادی عقائد کو ہٹاکر قادیانی عقائد بھر دینے کی گواہی کے صرف دو برس بعد مولانا دریا بادی قادیانیوں کے بارے میں اس طرح کا اظہار خیال کیوں فرماتے تھے جس سے اُن کو تقویت پہنچے تو اس کا جواب سوائے اس کے دوسرا نہیں ہوسکتا کہ جو ہم پہلے لکھ آئے ہیں یعنی یہ کہ اس کا سبب محض عدم واقفیت نہیں ہے بلکہ مولانا کے نزدیک صرف کلمہ گوئی واحد شرط ایمان و اسلام ہے تو پھر اسکے بعد عقائد و عبادات کا نظام آدمی رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا چلائے یا قادیان کے جھوٹے مدعی رسالت کا وہ مولانا کے نزدیک بہرحال مسلمان ہی رہے گا۔ مولانا اس کو ماننے ہی کے لئے تیار نہیں کہ ضروریات دین کے انکار سے کفر بھی ہوسکتا ہے اور ساتھ ہی اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے کہ تمام امت اس کو صریح اور قطعی کفر کہتی ہے۔ وہ دلیل سے کہتی ہے پھر بھی مولانا کے نزدیک اُس کی بات ناقابل سماعت ہے اور مولانا کے خیالات کے ساتھ دلائل اگرچہ نہیں ہیں مگر مولانا نہیں اُسی کو سب سے مقوالیتا چاہتے ہیں۔

اب آگے پھر وہی خط اور اس کا جواب پڑھئے مکتوب نگار لکھتے ہیں۔

"عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شاید جناب کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا ہو کہ قادیانیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا محور و مقصد اپنے مخصوص عقائد بابت نبوت دعوٰے مسیح واتحصار نجات اُخروی برایمان نبوت مرزا ہی ہے اور ان کے تبلیغی پہلو کی تعریف سے اس خاص بدعت و کفر کی توقیر و اشاعت کا احتمال ہے ورنہ عیسائیوں کی تبلیغی کوششیں اور سکھوں کی تنظیم اور خود دیوبندی اقوام کی جدوجہد برائے مقاصد دنیوی بھی تو لائق تقلید ہی ہیں۔"

جواب میں مولانا موصوف فرماتے ہیں۔

"اوّل تو اس میں بھی مضائقہ نہیں جس وقت غیرت دلانے کے لئے کھلے ہوئے اغیار کو بھی مثال میں پیش کیا جاتا ہے اور پھر اقرار شہادتین کا اشتراک کیا کوئی معمولی چیز ہے۔"

یہ ہے جواب مولانا کی جانب سے۔ مکتوب نگار نے لکھا تھا کہ اخروی نجات کے لئے قادیانی لوگ مرزا جی کی نبوت پر ایمان لانے کو شرط قرار دیتے ہیں اور اسی کی تبلیغ کرتے ہیں اور آپ اس تبلیغ کی تعریف فرماتے رہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ سب کچھ ہے، مانا کہ وہ مرزا جی کی نبوت پر ایمان ہی کی تبلیغ کرتے ہوں مگر وہ کلمہ طیبہ کی یعنی شہادتین کا اقرار تو بہرحال کرتے ہیں اور ہمارا ان کا کلمہ کا یہ اشتراک کوئی معمولی چیز ہے کہ مرزا کی نبوت پر ایمان لانے سے وہ ٹوٹ جائے یا کمزور ہی پڑ جائے۔ یہ تمام امت سے بالکل مختلف مولانا کا ذہن ہے جس کے بارے میں ابھی پہلے کہا تھا کہ کلمہ طیبہ کو زبان سے ادا کرلینے کے بعد مولانا کے نزدیک آدمی کوئی بھی عقیدہ و عمل اختیار کرے کہ مرزا قادیانی پر ایمان لے آئے وہ پھر بھی مسلمان ہی رہتا ہے اور ہمارے اُس کے مابین شہادتین کا اشتراک علی حالہٖ قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد مکتوب نگار لکھتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ بعض مسلمان آپ کی ان متواتر کرم فرمائیوں اور قادیانیوں کی سرگرمیوں کی مدح سرائیوں سے متاثر ہو کر ان کے لٹریچر کی طرف رجوع کریں اور اس سے گمراہ کن خیالات اخذ کر کے اس میں ہی داخل ہو جائیں

اب مولانا کا جواب بغور ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں

"ایسے احتمالات تو ہر چیز کے اندر فرض کئے جا سکتے ہیں باقی اللہ اور رسول پر ایمان کے ساتھ ساتھ بعض مسائل کی غلط و رکیک تاویلات کے پھیل جانے کا خطرہ بھی ہو بڑے مقاصد کے سامنے اس چھوٹے خطرے کو گوارا کر لیا جائیگا۔"

مکتوب نگار نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ قادیانیوں کی سرگرمیوں کی مسلسل تعریف و توصیف جو آپ فرما رہے ہیں تو اس سے کچھ مسلمان مرزا جی کی نبوت پر ایمان نہ لے آئیں۔ مولانا جواب میں فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑا کام ہو رہا ہے اس بڑے کام کا مولانا نے نام نہیں بتایا، غالباً مراد ہے یورپ وغیرہ میں قادیانیوں کی زبان پر اسلام کا نام جاری ہو جانا۔ گویا غریب اسلام کی یہی بڑی خوش قسمتی ہے کہ کوئی دین کا باغی اپنے باطلانہ اور کافرانہ عقائد کی ترویج و اشاعت کے درمیان لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اسلام کا نام زبان پر لے آئے ورنہ بیچارے اسلام کو یہ سعادت کہاں نصیب ہوتی کہ برلن اور پیرس میں اس کا نام بھی پہنچ جائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر قادیانیوں کی سرگرمیوں سے رکیک اور غلط تاویلات بھی پھیل رہی ہوں یعنی خواہ دنیا کا یہ عقیدہ بھی کیوں نہ بن رہا ہو کہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی صاحب نبی بن کر تشریف لا سکتے تو اسکے پھیلنے کو بھی گوارا کیا جائے گا۔ اور کچھ مسلمان مرزا جی کی نبوت پر ایمان لے بھی آئیں تب بھی کوئی حرج نہیں یہ بھی گوارا ہے! لیکن کیوں گوارا ہے؟ قرآن و سنت کی کس بنیاد پر؟ دین کے کس اصول پر؟ مولانا اس کا کوئی تذکرہ نہیں فرماتے، کاش! اگر مولانا اپنے دلائل بھی تحریر فرما دیتے تو نیاز مندوں کو استفادہ اور مزید غور و فکر کا موقع میسر آ جاتا۔

یہاں تک پہنچ کر ہم مضمون کو ختم کر ہی رہے تھے کہ خوش قسمتی سے مولانا دریابادی کی ایک قلمی تحریر ہمیں دستیاب ہوئی ہم سمجھتے ہیں کہ قادیانیوں کے مسئلے کو ختم کر دینے اور ان کے عقیدے اور رسولِ پاک کے بارے میں ان کے باطنیانہ ذہن کو سمجھنے میں مولانا موصوف کی یہ چند متفرق جملوں پر مشتمل تحریر بالکل فیصلہ کن ثابت ہوگی، ان جملوں یا مولانا کے اظہار خیال کو نقل کرنے سے پہلے ہم مختصر طور پر مولانا کے ان جملوں کی نوعیت بھی بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب یعنی مرزا غلام احمد صاحب کے فرزند اور جماعت قادیان کے خلیفہ ثانی نے ۱۹۲۴ء میں مذاہب عالم کے عنوان سے منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کے لئے اردو میں "احمدیت یعنی حقیقی اسلام" کے عنوان سے ایک طویل لیکچر تیار کیا تھا، بعد میں چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کے قلم سے انگلش میں اس کا ترجمہ شائع ہوا اس انگلش کتاب کا ایک نسخہ مولانا دریابادی کے کتبخانہ میں بھی آیا۔ دوران مطالعہ مولانا موصوف نے کتاب کے حاشیہ پر کچھ ریمارکس بھی دیئے ہیں ابھی چند دن پہلے جب مولانا موصوف کا ذاتی کتبخانہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں منتقل ہوا تو کتاب مذکور بھی اس میں شامل تھی مولانا کے مذکورہ ریمارکس اسی کتاب کے حواشی پر ہم کو ملے ہیں۔
اس کتاب کا تعارف اور اس کے اقتباسات ہم اس مضمون میں مختلف موقعوں پر پیش کر چکے ہیں جن عبارتوں پر مولانا کے ریمارکس ہیں ان پر مولانا نے خط کھینچ دیئے ہیں اور قوسین سے بھی ان کو نمایاں کر دیا ہے۔ مولانا کے خط کی شناخت ہم نے ان کے قریب ترین اور ان کی تحریر کو اچھی طرح پہچاننے والے بعض حضرات سے کرا کر ممکن حد تک اطمینان کر لیا ہے کہ یہ تحریر مولانا ہی کی ہے۔
جن عبارتوں پر مولانا نے ریمارکس دیئے ہیں ہم ہر عبارت کو نقل کر کے اس سے متعلق ریمارک اس کے نیچے لکھیں گے ہم اپنے اردو داں ناظرین کی سہولت کے لئے اس کتاب کے اصل اردو ایڈیشن سے عبارتیں نقل کریں گے ہم نے انگریزی ترجمہ کو اصل کتاب سے مقابلہ کر کے متعدد مقامات سے بالکل مطابق ترجمہ کو اصل کے مطابق پایا، یہ انگلش ایڈیشن "تالیف و اشاعت قادیان پنجاب" سے شائع ہوا ہے پہلی عبارت یہ ہے
(۱) "یہ سلسلہ نبوت بھی طرح چلا آ رہا ہے جاسکے

نزدیک اسی طرح آئندہ چلا جائے گا اور کسی وقت بند نہ ہوگا کیونکہ عقلِ انسانی اسی سلسلہ کے بند ہونے کے خیال کو رد کرتی ہے۔

(اردو ایڈیشن صفحہ ۶، انگلش ایڈیشن صفحہ ۱۰)

اس پر مولانا اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

"سلسلۂ نبوت مرزا غلام احمد صاحب پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے لئے زمین تیار کی جا رہی ہے۔"

دوسری عبارت:-

(۲) اگر دنیا کسی نبی کی محتاج تھی تو وہ آج اس سے بڑھ کر محتاج ہے۔ مذاہب کی جڑ آج کھوکھلی ہو رہی ہے۔

(اردو ایڈیشن صد انگلش ایڈیشن صلا)

اس پر مولانا کا تاثر حسبِ ذیل ہے ملاحظہ ہو۔

"اس استدلال کی بنا پر مرزا صاحب تمام انبیاء سابقین سے، بشمول حضرت سرورِ کائنات سے افضل وارفع تھے۔"

تیسری عبارت

"مگر اس جگہ ایک سوال ہے اور میرے نزدیک اس سوال کا سمجھنا لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے، مگر اس کے سمجھنے کے بغیر احمدیت کی حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آسکتی اور وہ یہ ہے کہ بانیٔ سلسلۂ احمدیہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ علوم قرآن کی اشاعت کے لئے آئے ہیں اور اپنے آپ کو ایک مسلمان قرار دیتے ہیں اور امتِ محمدیہ میں سے ایک فرد، تو ان کی ضرورت اور سلسلہ کی اہمیت بحیثیت ایک جماعت کے کیا باقی رہ جاتی ہے تب تو ان کی حیثیت ایک عالم یا ایک صوفی کی رہ جائے گی اور سلسلۂ احمدیہ محض ایک علمی جماعت کے دوسرے درجہ کی حیثیت پر جا گرے گا لیکن یہ خیال صداقت سے بہت دور ہوگا اور سلسلہ احمدیہ کو سمجھنے سے بالکل محروم کر دے گا۔

(اردو ایڈیشن صفحہ ۱۷، انگلش ایڈیشن صفحہ ۲۶)

مولانا کا اظہارِ خیال

"احمدیت اسلام کی شاخ نہیں، بجائے خود ایک مستقل مذہب ہے۔"

مرزا بشیر الدین صاحب کی عبارتیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں ان میں سے کسی عبارت میں بصراحت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ مرزا جی نبی و رسول تھے صرف انداز بیان اختیار کیا گیا جس کا مطلب مرزا جی کو نبی تسلیم کرنا نکلتا ہے یا یہ نکلتا ہے کہ کہ موجودہ حالات ایک عظیم الشان نبی کی آمد کے سخت متقاضی ہیں لیکن مولانا نے اِن عبارتوں سے وہ نتیجہ اخذ کیا جو اوپر آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مولانا کے نزدیک مرزا بشیر الدین کی اس کتاب میں۔

(۱) مرزا جی کو نبی ماننے کے ساتھ مرزا جی کے بعد مرزا بشیر الدین کی نبوت کے لئے میدان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) اس کتاب میں مرزا جی کو بشمول نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سابقین سے افضل وارفع ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ احمدیت اسلام کی کوئی شاخ نہیں ہے بلکہ مستقل علیحدہ ایک مذہب ہے

یہ ہے وہ نتیجہ اور خلاصہ جو اس کتاب کے مطالب سے مولانا نے اخذ کیا۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ بس یہی وہ مفہوم و مدعا ہے جس کو علماء اسلام مرزا صاحب اور ان کی جماعت کا عقیدہ و ایمان کہتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ الگ ایک مستقل فرقہ اور گروہ کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا پاکستان کی حکومت نے حال ہی میں فیصلہ دے کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا ہے۔

مولانا کے یہ تاثرات اس وقت کے ہیں جب مولانا براہِ راست قادیانیوں کی کسی کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہونگے چنانچہ آپ قادیانیوں کے ترجمۂ قرآن اور اس کی تفسیر پر مولانا کا تبصرہ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں، لیکن اس کے برعکس جب لوگ دیکھتے ہیں کہ مولانا قادیانیوں کے حق میں بہت نرم رویہ اختیار فرماتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان کے حق میں سفارشی بن جاتے ہیں اور اس سے بھی

بڑھکر علماء کو نصیحت و تنبیہ کرتے ہوئے ان کو قادیانیوں کی تکفیر سے روکتے ہیں تو یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ مولانا ختم نبوت کے قائل نہ ہوں یا مرزاجی یا کسی اور نبوت کے نئے رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی گنجائش سمجھتے ہوں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہم ابھی مولانا کی عبارتیں اقتباس کرکے دیکھ چکے ہیں کہ مولانا نے بھی ان کی عبارتوں سے یہی سمجھا ہے کہ ان عبارتوں میں مرزا کی نبوت کا بھی دعویٰ ہے حتیٰ کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر فضیلت و برتری کا دعویٰ بھی ہے وغیرہ، لیکن پھر مولانا ان کے کفر میں کیوں تردد فرماتے ہیں تو غالباً اس سبب سے کہ مولانا کے ذہن سے مرزاجی اور ان کی جماعت کی یہ چیزیں نکل چکی ہوتی ہیں۔ اور اب مولانا کے سامنے یہ منظر آجاتا ہے کہ خود کے مسلمان کہنے اور کہلائے جانے پر اصرار کرنے والی جماعت کو علماء کافر قرار دے رہے ہیں، مولانا کی نرم دلی اس منظر کی تاب نہیں لاتی اور مولانا اس طرح کا رویہ اختیار فرماتے ہیں اور اگر اس کا کوئی دوسرا سبب ہے تو اس کا اظہار مولانا محترم ہی کرسکتے ہیں۔

نام	تجلی دیوبند
وقفہ اشاعت	ماہانہ
مقام اشاعت	اسلامیہ بازار دیوبند
پرنٹر پبلشر	نسیم فاطمہ (اہلیہ عامر عثمانی مرحوم)
ایڈیٹر	حسن احمد صدیقی
وطنیت	ہندوستانی

ملکیت
نسیم فاطمہ
تصدیق کنندہ
نسیم فاطمہ اور
حسن احمد صدیقی

قادیانیت

عبدالحمید صدیقی

مذہب و انسانیت کی ضد

اِن دنوں جب کہ قادیانی مسئلہ نے مسلمانوں کے اندر شدید اضطراب پیدا کر رکھا ہے اور وہ اس کے حل کے لئے سخت بیتاب نظر آتے ہیں بعض غیر ملکی جو ملّتِ اسلامیہ کے مزاج، اس کے عناصر ترکیبی، اس کے مذہبی احساسات سے ناواقف ہیں مگر دنیائے اسلام کے مسائل سے کسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں، اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے مختلف لوگوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی گفتگو سننے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قادیانی پروپیگنڈے سے خاصے متاثر ہیں لیکن اس تاثر کی وجہ یہ نہیں کہ قادیانیوں کے دلائل وزنی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اندر رہ کر مذہب اور قومیت کے بارے میں ان کا جو زاویہ نگاہ بن چکا ہے اس سے وہ اسلام کے اصل موقف کو صحیح طور پر جان ہی نہیں سکتے۔ انھیں یہ بات تو آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر ان کے وطن کا کوئی دشمن ان کی سرحدوں پر حملہ کرے تو اسے پوری قوت سے نیست و نابود کر دیا جائے یا ان کے اپنے معاشرے کا کوئی فرد یا گروہ اُن کے ملک کے خلاف کوئی سازش کرے تو اسے گولی سے اُڑا دیا جائے لیکن یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی قوم کسی مذہبی عقیدے پر چوٹ پڑنے سے تلملا اٹھے اور اس کے تحفظ اور دفاع کے لئے اپنی ملکی سرحدوں کی حفاظت سے زیادہ بیتاب دکھائی دے۔ چنانچہ جب بھی کسی غیر ملکی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوا ہے اُسے قریب قریب اسی قسم کی الجھن میں گرفتار پایا ہے۔ وہ اپنی اس ذہنی الجھن کے اظہار کے لئے خواہ وہ کوئی اندازِ بیان اختیار کرے مگر اس بات پر اسے سخت حیرت ہوتی ہے کہ عقیدے کا اختلاف لوگوں کے مابین وجۂ افتراق بن جائے اور اس اختلاف کی وجہ سے کوئی قوم اپنی ہی نسل اور اپنے ہی وطن سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے جسد سے الگ کرنے پر نہ صرف مُصر ہو بلکہ اسی میں اپنی عافیت اور اپنے دین اور ایمان کی عافیت سمجھتی ہو۔

اہل مغرب کا یہ استعجاب کوئی نیا نہیں۔ دنیا کی وہ

دنیا کی وہ قومیں جن کی [illegible] رنگ، وطن، نسل اور زبان کے تعصبات سے [illegible] ہے۔ ان کے لئے عقیدہ کی اساس پر کسی جماعیت کا وجود ہمیشہ ناقابلِ فہم رہا ہے۔ آج سے آج سے چودہ سو برس پہلے ابوجہل بھی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر حیران اور ششدر تھا بلال حبشیؓ، صہیبؓ رومی اور بصرہ سے تعلق رکھنے والے حسنؓ تو حضور کی امت کے عظیم افراد شمار کئے جائیں مگر ان کے مقابلہ میں مکہ کی خاک سے جنم لینے والا قریش کا سردار اور حضور سرورِ دو عالم کی برادری کا فرد کافر اور زندیق کہلائے یہ بات جس طرح ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے لئے موجبِ حیرت تھی آج بھی اسلام کے تصورِ اجتماعیت سے ناواقفیت رکھنے والوں کے لئے حیرانی کا باعث ہے۔ یہ اسی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے حصار میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ نقب لگا کر امتِ مسلمہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی رہتی ہیں اور جب ملتِ اسلامیہ ان کی ان ریشہ دوانیوں پر مضطرب ہو کر انھیں ان سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنی مظلومیت کی دہائی دینا شروع کر دیتی ہیں اور یہ واویلا خاص طور پر ان حلقوں میں کیا جاتا ہے جو کسی مذہب کے اندر نقب زنی اور اس کے طریقِ کار اور کسی قوم کے لئے اس کے تباہ کن نتائج کا قطعاً کوئی شعور نہیں رکھتے۔ وہ زندگی کے کسی دوسرے معاملے میں خواہ رواداری کے بنیادی تصور سے بھی آشنا ہوں مگر مذہب کے معاملے میں رواداری کے پُرجوش مبلغ اور داعی ہوتے ہیں اور اسے انسانیت پر ایک صریح ظلم اور زیادتی خیال کرتے ہیں کہ عقیدے کا اختلاف کسی وجہ سے بھی انسانوں کے مابین وجہِ نزاع بن جائے۔

قادیانی اور اسی طرح کے بعض دوسرے باطل گروہ چونکہ اہلِ یورپ کی اس نفسیاتی کمزوری کو اچھی طرح جانتے ہیں اس لئے مسلمان جب بھی اپنے ملی تحفظ کیلئے تگ و دو شروع کرتے ہیں تو یہ گروہ مسلمانوں کو مطعون کرنے کے بجائے اسلام دشمن طاقتوں کی پناہ اور سہارا ڈھونڈنے لگتے ہیں اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان بے بسوں اور مسکینوں پر مذہب کے معاملے میں محض جزوی اختلاف کی بنا پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ اس لئے انسانیت کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ ان مذہبی دیوانوں کے خلاف جتھہ بندی کر کے انھیں تباہ کرنے کی فکر کریں کیونکہ اس مرحلے پر اگر انھیں نہ روکا گیا تو پھر رواداری اور آزادی کا دنیا میں نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ قادیانیوں نے اس وقت اپنی صفائی میں جو زبردست مہم شروع کر رکھی ہے اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس ساری مہم میں ان حلقوں کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے جو مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات کی اصل نوعیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ قادیانیوں کا روئے سخن یا تو مسلم معاشرے کے ان بے دین عناصر کی طرف ہوتا ہے جو اسلام کے پیچھے پہلے ہی سے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں اور اسے مٹا دینے کا ناپاک عزم رکھتے ہیں اس لئے وہ اس باطل گروہ کی خود اس سے بڑھ کر وکالت کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے جب انسان اور انسانوں کے مابین امتیازات ختم ہونے لگیں تو پھر دینی حمیت کا جنازہ نکل جاتا ہے اور قوم مذہبی اعتبار سے راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے جسے باطل کی آندھیاں جس طرف چاہتی ہیں بڑی آسانی کے ساتھ اڑا کر لے جاتی ہیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے یہ اسلام دشمن طاقتیں برسوں سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔

مسلم ممالک اور مسلم معاشرے سے باہر نکل کر یہ لوگ کفر کے ہر دروازے پر کھڑے ہو کر بڑے جذباتی انداز میں اپنی مظلومیت اور بے بسی کی جھوٹی داستانیں سناتے اور مسلمانوں کے خلاف کفار کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں اور دانستہ طور پر ان کے اس باطل خیال کو

تقویت پہنچانے میں سرگرم عمل ہیں کہ دنیا ملت اسلامیہ کے نام سے جس قوم کو جانتی ہے وہ انسانوں کی کوئی تنظیم نہیں بلکہ انسان نما آدم خوروں کی ایک بھیڑ ہے جو چند لاکھ بے گناہ انسانوں پر مذہبی دیوانگی کے عالم میں ناحق ظلم وستم ڈھا رہی ہے۔ قادیانی اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف جو مذموم کارروائیاں کر رہے ہیں چونکہ دنیا ان کے پس منظر اور ان کی حقیقی نوعیت سے ناواقف ہے اس لئے بسا اوقات بھلے اور شریف لوگ بھی ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔

اہل اسلام اور قادیانیوں کے مابین اختلاف اس قدر واضح اور وسیع ہے جس قدر اسلام اور کفر کے درمیان ممکن ہو سکتا ہے۔ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں وہ لوگ جو نبی اکرم صلی اللہ وسلم کو نبی آخر الزماں ماننے والوں اور مرزا غلام احمد قادیانی کو پیغمبر تسلیم کرنے والوں کو مابین چند ظاہری اعمال کے اشتراک کی وجہ سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس اختلاف کی نوعیت فروعی ہے جسے "ملاؤں" کی جہالت اور تنگ نظری نے اصولی اور بنیادی بنا دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے وہ کاذب اور مفتری ہے۔ اس بنا پر جو انسان بھی اس کے ساتھ عقیدت ومحبت کا رشتہ استوار کرتا ہے یا کسی درجہ میں بھی اس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوتا ہے وہ دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہے۔ نبوت کا دعویٰ کوئی شاعرانہ تعلّی یا مجذوب کی بڑ نہیں جسے آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہو۔ یہ حیات انسانی کا نہایت ہی اہم فیصلہ ہے جس پر کسی فرد کی دنیوی فلاح اور آخری نجات کا دارومدار ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص نبوت کا دعویٰ لیکر اٹھتا ہے تو وہ پوری نوع بشری کو سخت آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اگر نبوت کا دعویدار اپنے دعوے میں جھوٹا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ پر سب سے بڑا بہتان باندھتا ہے اور اس وجہ سے وہ خود بھی اور اس کے پیروکار بھی جہنم کی سزا کے مستوجب ٹھیرتے ہیں اور اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہو تو پھر اس کی تکذیب کرنے والوں کی دنیا اور آخرت برباد ہوتی ہے۔ اس دعوائے نبوت کی تصدیق وتکذیب پر الگ ملتیں تشکیل پاتی ہیں اور کفر اور اسلام کے مابین واضح امتیاز پیدا ہوتا ہے یہ دعویٰ کسی فرد اور معاشرے کی زندگی میں کس قدر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس کا مرتبہ ومقام اس موقف کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے جو وہ نبوت کے دعوے کرنے والوں کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ نبوت کے جھوٹے دعویدار کو نبی برحق مان لیتا ہے تو وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے اگر وہ سچے نبی کے دعوائے نبوت کو جھٹلا دیتا ہے تو پھر وہ جہنم کے دائمی عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

اگر آپ نبوت کے بلند مرتبہ و مقام پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام کے مابین تفریق اسلامی عقائد اور تعلیمات کا صحیح شعور اور اللہ کی معرفت اور خود انسان کو اپنی ذات کی پہچان صرف سچے نبی کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر نبوت کا واسطہ درمیان سے ختم ہو جائے یا اگر انسان سچی نبوت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت کے راستے پر چلنے کی کوشش کرے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر صادق پر ایمان اور خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اس کی پیروی اس شخص کی دنیوی اور آخری بھلائی کی واحد ضمانت ہے اور جھوٹے نبی پر ایمان تو کجا کسی اعتبار سے اس کی پذیرائی بھی سراسر کفر اور الحاد ہے اس بنا پر سچے نبی کے پیرو اور جھوٹے نبی کے حلقہ بگوش ایک امت کی حیثیت سے کبھی زندہ نہیں رہ سکتے خواہ ان کے ظاہری اعمال میں کسی حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہو۔ جس طرح تاریکی اور روشنی یکجا نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح نبوت باطلہ سے وابستہ ہونے والے اور پیغمبر صادق و مصدوق کے غلاموں کے مابین کوئی اشتراک ممکن نہیں

ہوسکتا کیونکہ جب بنیاد ہی ایک دوسرے سے الگ اور جداگانہ ہو تو دوسرے معاملات میں اختلاف بالکل ناگزیر ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص دل اور زبان سے اقرار کرتا ہے کہ وہ فلاں مقدس ذات کو نبی برحق سمجھ کر اس پر ایمان لاتا ہے تو اس کی ذمہ داری صرف اس اقرار پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اس اقرار کے ساتھ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ عظیم المرتبت انسان جسے اس نے توحید باری تعالیٰ کے ساتھ خدا کا پیغمبر بھی تسلیم کیا ہے وہی اس کی اور محبت کا سب سے بڑا مرکز و محور اس کے لئے سب سے بڑا ہادی اور رہنما اور فکر و عمل کے لحاظ سے سب سے ارفع و اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا قول حق و باطل کے درمیان قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی دکھائی راہِ ہدایت ہی انسان کو دنیا و آخرت میں فائز المرام کرتی ہے۔ الغرض انسان کو اس زندگی میں جو کچھ بھی مطلوب ہوتا ہے خواہ وہ عقیدے کی صورت میں ہو یا افکار و اعمال کی صورت میں وہ اس کی صحت کے جانچنے کے لئے صرف اسی ذات کی طرف رجوع کرتا ہے جس پر وہ خدا کے رسول کی حیثیت سے ایمان لاتا ہے۔

ایمان بالرسالت کا ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کے ارشد و ہدایت کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے لاتعداد انبیاء مبعوث فرمائے اور حضور پر تکمیل دین اور سلسلۂ نبوت ختم کر کے یہ نازک ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کو سونپ دی اس لئے اس حکیم اور علیم و خبیر ذات نے اس بات کا بھی خاص طور پر التزام کیا کہ حضور سرورِ دو عالم کے بعد کوئی شخص اگر مہبطِ وحی ہونے کا دعویدار ہو تو اُسے کاذب سمجھ لیا جائے کیونکہ اس کی اس حیثیت کو تسلیم کر لینے کے بعد نہ تو اسلام مکمل دین رہتا ہے نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی قرار پاسکتے ہیں اور نہ اُمتِ مسلمہ آخری اُمت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے شخص کی نبوت کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ حضور کے لائے ہوئے دین کی عملاً وہ حیثیت رہ جائے جو سابقہ ادیان کی تھی اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبہ پر فائز ہو جائیں جو حضور کے مقابلے میں سابق انبیاء کا ہے اور اُمتِ مسلمہ اس مقام کی حامل مانی جائے جو پہلے انبیاء کی امم کا تھا۔ انسان چونکہ حق و باطل کا واحد معیار صرف ایک ذات کو قرار دے سکتا ہے اور پیروی کیلئے کامل نمونہ صرف ایک شخصیت کو ہی بنا سکتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان سے ایمان بالرسالت کے تحت جو کچھ تقاضا کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ حضور سے پہلے انبیاء پر سچے دل سے ایمان لائے کیونکہ اس ایمان ہی سے ایک انسان اس حقیقت کا پورے وثوق اور شعور سے اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے اپنے خاص بندوں کو منتخب فرما کر دنیا میں مبعوث فرمایا ہے لیکن فکر و عمل میں پیروی صرف اس مقدس ذات کی کی جائے جسے نبی آخر الزماں کی حیثیت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اب اگر حضور کے بعد کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نبی ہوں تو وہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے دعوے کی صداقت کو تسلیم کرنے اور ان کی عظمت کا اقرار کرنے کے باوجود لوگوں سے بہر حال اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اب نئے نبی مبعوث ہونے تک حق و باطل کا واحد معیار صرف اُسے ہی تسلیم کیا جائے اور زندگی کے ہر میدان میں صرف اسی کی پیروی کی جائے۔

یہاں ہم قادیانیوں کی پھیلائی ہوئی ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ سادہ لوح عوام کو بہکانے کے لئے بڑے معصومانہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو زندگی کے ہر معاملے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں چنانچہ ہمارے نماز پڑھنے کا طریقہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے۔ روزے بھی ہم اسی انداز سے رکھتے ہیں جس طرح کہ دوسرے مسلمان رکھتے ہیں اس کے باوجود تم یہ الزام دھرتے ہو کہ ہم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی

امت سے نکل کر مرزا صاحب کی امت میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ محض ابلہ فریبی اور دھوکہ بازی ہے۔ مرزا صاحب اور ان کے پیرو اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نبوت کا ہر دعوے دار خواہ وہ جھوٹا ہو یا سچا پہلے انبیاء کی تعلیمات کو کالعدم قرار نہیں دے سکتا بلکہ ان میں سے بعض کو اپنی اصلی شکل وصورت میں قائم رہنے دیتا ہے بعض میں مناسب تغیر وتبدل کر کے انھیں اپنی امت کے سامنے پیش کرتا ہے اور بعض کو یکسر منسوخ کر دیتا ہے۔ اب اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والے حضور سرورِ دو عالم ؐ کو کس حد تک اپنا ہادی اور مطاع سمجھتے ہیں اور حضور سرورِ دو عالم ؐ کے مقابلے میں وہ مرزا صاحب کو کس مرتبہ ومقام پر فائز خیال کرتے ہیں تو انھیں ان اعمال کو دیکھنے کی ضرورت نہیں جن پر مرزا صاحب نے صاد کیا ہے بلکہ ان احکام کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جنھیں مرزا صاحب نے منسوخ کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ مرزا صاحب اور ان کے پیرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور ان کے مقام کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ مثال کے طور پر جہاد کے معاملہ ہی میں مرزا صاحب کا موقف اور ان کے پیروؤں کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد بالسیف کی عظمت اور دنیا وآخرت میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو جس انداز سے بیان فرمایا ہے اسے مسلم اور غیر مسلم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں مگر مرزا صاحب نے اسے یکسر منسوخ قرار دیا ہے اور پھر اس کی تنسیخ کا فیصلہ جن الفاظ میں کیا ہے انھیں دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شخص خواہ زبان سے کچھ ہی کہتا رہے مگر زعم باطل میں اپنے ذات کو (معاذ اللہ) حضور ؐ کی ذاتِ اقدس سے بلند تر سمجھتا ہے اور اپنے ذہن میں یہ فاسد خیال پوری طرح بٹھائے ہوئے ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کو منسوخ کرنے کا پورا اختیار دے رکھا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دین کے لئے حرام ہے اب جنگ وقتال
اب آسمان سے نورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ وجہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

اعلان مرزا غلام احمد قادیانی صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم مؤلفہ میر قاسم علی صاحب قادیانی صفحہ ۴۹)

اس ضمن میں نثر کے ایک اقتباس پر بھی غور فرمائیں اور دیکھیں اس تحریر کرنے والا اپنے آپ کو کس بلند مقام پر فائز سمجھتے ہوئے یہ بات کر رہا ہے:-

"سو آج سے دین کے لئے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لئے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھا کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول ؐ کا نافرمان ہے۔"

(اشتہار چندہ منارۃ المسیح ب ت ضمیمہ خطبہ الہامیہ)

جہاد کے موقوف ہونے کو مرزا صاحب اپنی بعثت کا مقصدِ اعظم قرار دیتے ہیں تریاق القلوب کے ضمیمہ اشتہار واجب الاظہار میں لکھتے ہیں:-

"غرض میں اس لئے ظاہر نہیں ہوا کہ جنگ وجدال کا میدان گرم کروں بلکہ اس لئے ظاہر ہوا ہوں کہ پہلے مسیح کی طرح صلح وآشتی کے دروازے کھول دوں۔ اگر صلح کاری کی بنیاد درمیان نہ ہو تو پھر ہمارا سارا سلسلہ فضول ہے اور اس پر ایمان لانا بھی فضول ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۳۳۵)

مرزا صاحب نے اپنے آپ کو جس عظیم مرتبے کا حامل پیغمبر سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کو پہلے انبیاء کے مقابلے میں جس قدر جلیل القدر خیال کرتے ہوئے نوع بشری سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور تنہا اپنی ذات کے ساتھ وابستگی کو ایمان کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے کیا جاسکتا ہے:-

"ہلاک ہو گئے وہ جنھوں نے ایک برگزیدہ رسول کو قبول نہ کیا، مبارک وہ جس نے مجھ کو پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے"

(کشتی نوح ۵۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

یہ مرزا صاحب کے اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے کہ ان کے معتقدین ان کی ذات کو علم و عرفان کا ایک ایسا سرمدی سرچشمہ خیال کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روحانی پیاس بجھانے کے لئے جاری کیا ہے اور جس سے سیراب ہوئے بغیر کوئی شخص بھی فلاح نہیں پا سکتا خواہ وہ نبی آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کا پوری طرح مطیع و فرمانبردار ہی ہو۔

"اے مسلمان کہلانے والو! اگر تم اسلام کا بول بالا چاہتے ہو اور باقی دنیا کو اپنی طرف بلاتے ہو تو پہلے خود سچے اسلام کی طرف آجاؤ جو مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی صاحب) میں ہو کر ملتا ہے۔ اسی کے طفیل آج برد تقویٰ کی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی کی پیروی سے انسان فلاح و نجات کی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے یہ وہی فخر اولین و آخرین ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے رحمۃ العالمین بن کر آیا تھا اور اب اپنی تکمیل تبلیغ کے ذریعہ ثابت کر گیا کہ واقعی اس کی دعوت جمیع ممالک و ملل کے لئے تھی فصلی اللہ علیہ وسلم۔

(اخبار الفضل قادیان ۱۵
مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۵ء)

انسان تڑپ اٹھتا ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ کس طرح ایک بڑا ہوا انسان جو مغربی سامراج کی پیداوار تھا وہ مکروہ فریب اور لاف و گزاف سے کام لیتے ہوئے زندگی کے ہر معاملہ میں اس ذاتِ مقدس کی ہمسری کا دعویٰ کر رہا ہے جو خدا کے بعد اس کائنات میں سب سے بزرگ و برتر ہے۔ مرزا صاحب کے دعاوی کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ ہر منزل پر صرف اس ایک بات کے لئے کوشاں رہے کہ کسی طرح وہ اپنی ذات کیلئے لوگوں کے اندر وہ جذبات و عقیدت پیدا کر سکیں جو مسلمان نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے رکھتے ہیں تاکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بجائے وہ ہادی و مطاع مان لئے جائیں اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے اسوۂ حسنہ کی شمع فروزاں کر سکے۔ مرزا صاحب نے اندر جذبات کی یہ تبدیلی پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے اقدام کئے مثال کے طور پر ایک مسلمان جب بھی حضور سرورِ کائنات کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو وہ ان کی بارگاہِ اقدس میں درود و سلام کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ پھر حضور کے ساتھ ہی محبت اور وابستگی کے صدقہ میں وہ ان ساری خوش نصیب ہستیوں کے لئے مختلف انداز میں دعاگو ہوتا ہے جنھوں نے ہمارے آقا و مولا کو ایمان کی حالت میں دیکھا یا اُن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی سعادت حاصل کی۔ چنانچہ جب بھی حضور کے صحابہ کا نام مسلمانوں کی زبان پر آتا ہے تو ان مقدس ناموں کے ساتھ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دعائیہ کلمہ بھی ان کی زبانوں سے ادا ہوتا ہے اسی طرح سے ازواجِ مطہرات کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے امہات المومنین اور حضور کے اہل و عیال کا تذکرہ کرتے ہوئے اہلِ بیت کے القاب استعمال کئے جاتے ہیں۔ حضور پر درود و سلام اور ان کے وابستگان کے لئے مختلف قسم کے دعائیہ کلمات زبان سے ادا کرنے اور معزز القابات سے انھیں یاد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اور حضور سے تعلق خاطر رکھنے کی بنا پر دوسرے افراد کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ جاگزیں رہے اور اسی محبت کو وہ اپنی زندگی کی بیش قیمت متاع سمجھتے ہوئے سینے میں پالتے رہیں۔ مرزا صاحب نے حضور کے ساتھ مسلمانوں کی اس جذباتی وابستگی کو کم کرنے کے لئے یہ سازش کی ہے کہ اپنی ذات اور اپنے متعلقین اور اہلِ خانہ کے لئے

ان دعائیہ کلمات اور ان معزز القابات کو رواج دیا ہے جو حضور کی ذات اور ان کے وابستگان کے لئے مخصوص ہیں۔ آپ کسی قادیانی سے بات کریں تو وہ مرزا غلام احمد قادیانی کا نام زبان پر آتے ہی سلام و درود بھیجے گا اور اس کے دوست کے لئے رضی اللہ عنہ کا دعائیہ زبان سے ادا کرے گا۔ اسی طرح اس کی بیویاں ازواج مطہرات اور اس کے خاندان والے اہل بیت کے القابات سے یاد کئے جائیں گے۔

مرزا صاحب اور ان کے متوسلین نے صرف افراد کے معاملے میں عوام کے جذبات، محبت و عقیدت کا رُخ موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کی جگہ بعض نئے نئے مقامات کو خلعتِ تقدس پہنانے کی سعی کی ہے جن کا تعلق کسی طرح بھی ان کی ذات سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قادیان اور ربوہ کو اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جس حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے مکہ اور مدینہ کو پیش کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر تو قادیانی مذہب کے ان دو مراکز کے بارے میں یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ اب مکہ، مدینے کی جگہ قادیانیت کے دو شہر ہی انوارِ الٰہی کے مرکز ہیں۔ اسی بنا پر ایک قادیانی بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے :-

"جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے وہ خشک اسلام ہے اسی طرح اس حج ظلی کو چھوڑ کر مکہ والا حج بھی خشک حج رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں پر آج کل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے۔" (پیغام صلح جلد ۲۱ نمبر ۲۳)

قادیانی مذہب کے اندر جذبات کی اس تبدیلی کا رجحان اس قدر شدید اور نمایاں ہے کہ وہ اس تقویم کے مقابلے میں جو حضور سرورِ دو عالم کی نسبت مسلمانوں کے اندر ۱۳۹۴ سال سے رائج ہے۔ نئی تقویم کو رواج دینے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں تاکہ جس تعلق اور نسبت سے بھی ایک مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہو سکتا ہے اس تعلق اور نسبت کو یا تو ختم کر دیا جائے یا اسے اتنا کمزور بنا دیا جائے کہ اس میں زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہیں اور اس کے مقابلے میں مرزا صاحب کی شخصیت کی بنیاد پر نئی نسبتوں اور نئے تعلقات کو معرضِ وجود میں لایا جائے اور لوگوں کو تلقین کی جائے کہ وہ جدید مذہب کے نئے روحانی مراکز کی طرف اپنی ساری توجہات مبذول کریں۔ اب اگر قادیانیت کے سرکاری ترجمان "الفضل" یا اس نئے مذہب کے بعض دوسرے رسائل پر نگاہ ڈالیں تو وہاں تقویم کا ایک بالکل نیا نظام آپ کے سامنے آئے گا جو مرزا غلام احمد کی زندگی کے نشیب و فراز سے وابستہ ہے۔ قادیانیوں نے مسلمانوں کے اندر مروّجہ تقویم کی جگہ مہینوں کے یہ نام تجویز کئے ہیں :-

صلح، تبلیغ، امان، شہادت، ہجرت، احسان، وفا، ظہور، تبوک، نبوت، فتح۔

مندرجہ بالا تصریحات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ قادیانیت اسلام کے دینی نظام کے مقابلے میں ایک نیا دینی نظام قائم کرنے کا عزم رکھتی ہے اس لئے وہ اپنے پیروؤں کو جدید نبوت، جدید مرکز محبت و عقیدت، نئی دعوت، نئے روحانی مراکز، نئے مقاماتِ مقدسہ، نئے مذہبی شعائر، نئے مقتدا، نئے اکابر، نئے عقائد، فکر و نگاہ کے نئے زاویئے افعال و اعمال کے نئے پیمانے، جذبات و احساسات کے نئے رُخ اور نئی اقدارِ حیات عطا کرتی ہے۔ اس کے سامنے معاشرے کی تعمیرِ نو کا ایک اپنا مخصوص نقشہ ہے جو اس نقشے سے بالکل مختلف ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی معاشرے کی تعمیر کے لئے پیش فرمایا تھا۔

قادیانی بھی اس بات کا پورا پورا شعور رکھتے ہیں کہ وہ امتِ مسلمہ سے بالکل ایک الگ اُمت ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں کہ خود مرزا غلام احمد قادیانی کو اس امر کا نہایت واضح طور پر احساس تھا کہ وہ ایک مستقل مذہب کا بانی اور ایک مستقل اُمت کی تشکیل کرنے والا ہے جو دین اسلام اور امتِ اسلامیہ

ت یکسر مختلف ہیں۔ مرزا بشیر الدین نے اپنے ایک خطبہ میں لکھا

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے
الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا:۔

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف
وفاتِ مسیح یا چند مسائل میں ہے۔ اللہ کی ذات،
رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج،
زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک
جز میں ہمارا ان سے اختلاف ہے۔"

(خطبۂ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب مندرجہ اخبار
الفضل مورخہ ۳ر جولائی سنہ ۱۹۳۱ء)

حضرت خلیفۂ اوّل نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں
کا) اسلام اور ہے ہمارا اسلام اور ہے۔

(ایضاً مورخہ ۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء)

اسلام اور قادیانیت میں کس قدر بُعد، بیگانگی بلکہ مخالفت و مخاصمت ہے اس کا اگر جائزہ لینا ہو تو انکار سے ہٹکر جذبات کی دنیا میں اس کا کھوج لگائیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے تصورات میں خواہ کتنا اختلاف ہو مگر جذبات کے دائرے میں ہر فرد دوسرے سے بڑا قریب ہوتا ہے بشرطیکہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے ہاتھوں کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچا ہو۔ کوئی سنگ دل دشمن ہی دوسروں کی تباہی پر خوشی کے شادیانے بجاتا ہے۔ ایک حساس آدمی کا دل تو دشمن کی موت پر بھی تڑپ اٹھتا ہے، کجا کہ وہ ان لوگوں کی بربادی پر غیر معمولی مسرت و شادمانی کا اظہار کرے جن سے وہ تعلق خاطر کا دعویدار ہو۔ چنانچہ دیکھئے کہ افراد، گروہوں اور قوموں کے باہمی شدید اختلاف کے باوجود مصائب کے وقت ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور وہ اگر عملاً ایک دوسرے کی مدد کرنے سے قاصر ہوں تب بھی زبان کی حد تک اظہار ہمدردی ضرور کیا جاتا ہے۔ یہ "شرف" صرف قادیانیوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو امتِ مسلمہ کے ساتھ زبردستی چپکائے رکھنے کے باوجود افتاد کے وقت وہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے بھی کم ہی کرتے ہیں۔ آج تک کسی سفاک سے سفاک شخص نے بھی اپنے دشمن کا جنازہ اٹھتے وقت اپنے گھر میں چراغاں نہیں کیا، کیونکہ اس میں سنگدلی کیساتھ ساتھ رذالت بھی پائی جاتی ہے مگر قادیانیوں نے ہر مرحلے پر امتِ مسلمہ کے معاملے میں اسی سقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جس کی کسی ایسے انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں سقوط بغداد کے المیہ پر مسلمان تو کیا غیر مسلموں نے بھی سخت صدمہ محسوس کیا۔ مسلمانوں کا تو کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو اور کوئی فرد ایسا نہ تھا جو غم سے نڈھال نہ ہوا ہو لیکن اس عظیم صدمے کے وقت صرف قادیانیوں کو غیر معمولی خوشی محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کے اظہار کے لئے قادیان میں بڑے اہتمام کے ساتھ چراغاں کیا۔ الفضل نے ۷ر دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں اس کی تفصیل دی ہے:۔

"حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں کہ میں مہدی موعود
ہوں اور گورنمنٹ برطانیہ میری تلوار ہے جس کے
مقابلے میں علمائے دین کی کچھ نہیں چلتی۔ اب
غور کا مقام ہے کہ پھر احمدیوں کو اس فتح سے
کیوں خوشی نہ ہو۔ عراق، عرب ہو یا شام ہم ہر جگہ
اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔ فتح بغداد
کے وقت ہماری فوجیں مشرق سے داخل ہوئیں۔
ہماری گورنمنٹ برطانیہ نے جو بصرہ کی طرف
چڑھائی کی اس کے محرک خدا تعالیٰ کے فرشتے
تھے جن کو اس گورنمنٹ کی مدد کے لئے خدا نے اتارا۔"

جب فلسطین مسلمانوں کے قبضے سے نکلا تو اس وقت پوری امتِ مسلمہ بحرِ غم میں ڈوب گئی مگر قادیانی خوشی کے شادیانے بجانے میں منہمک ہوئے۔ اسی طرح سمرنا کی تباہی اور

ترکی کی عارضی شکست پر مسلمانوں کے دلوں پر جو زبردست چوٹ لگی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خلافت عثمانیہ کی بربادی ان کی ملی شیرازہ بندی کے لئے نہایت تباہ کن نتائج کی حامل تھی اس وجہ سے ہر مسلمان کی آنکھیں خون کے آنسو لا رہی تھیں مگر قادیانی مسلمانوں کی اس تباہی پر بے حد مسرور تھے۔ اُن کے ان جذبات مسرت کو ۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء کے الفضل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

> ۲۷ر ماہ نومبر کو انجمن احمدیہ برائے امداد جنگ کے زیر اہتمام اور حسب ہدایات حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ربوہ اللہ تعالےٰ گورنمنٹ برطانیہ کی شاندار اور عظیم الشان فتح کی خوشی میں ایک قابل یادگار جشن منایا گیا۔ نماز مغرب کے بعد دار العلوم اور اندرون حصہ میں روشنی اور چراغاں کیا گیا جو بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ احمدیہ بازار کے دونوں طرف اور منارہ مسیح پر گیس کی روشنی کی گئی جس کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ مسیح موعود کے مکان پر چراغ روشن کئے گئے۔ اس کے علاوہ تمام احمدیوں نے اپنے اپنے مکانات پر خوب روشنی کی۔ اس ضمن میں ترکوں کے بارے میں بھی ان لوگوں کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

> "اگر ترکی حکومت مٹتی ہے تو مٹنے دو یاد رکھو کہ ترک اسلام نہیں۔

(الفضل ۲۲ر مارچ ۱۹۱۵ء)

ترکوں کے مقابلے میں انگریز بہادر کی مدح و ثنا دیکھئے

> "واقعات بتا رہے ہیں کہ ترکان آلِ عثمان کا ستارہ غروب ہونے کے قریب ہے ہماری خواہش ہے کہ ایا صوفیہ کی متبرک عبادت گاہ اور ابو ایوب انصاری کی قابل صد احترام سرزمین برطانیہ کے حریت پسند فرزندوں کے ہاتھ آئے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات پر ذرا غور فرمایئے اور پھر اندازہ لگایئے کہ کیا امت مسلمہ کا کوئی فرد یا گروہ اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف نفرت و حقارت کے یہ جذبات اپنے دل میں پال سکتا ہے اور سنگدلی اور قساوت قلبی کا مظاہرہ کر سکتا ہے جو مسلمانوں کے معاملہ میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ امت مسلمہ پر جب بھی افتاد پڑی تو قادیانیوں کے دلوں کو سرور اور راحت حاصل ہوئی اور وفور جذبات میں آپے سے باہر ہو کر ایسی عجیب و غریب حرکات کرنے لگے جن کی کسی معقول آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ انسانوں میں شدید اختلافات کے باوجود مصیبت کے وقت دل ایک دوسرے کے ساتھ دھڑکنے لگتے ہیں کیونکہ ہر انسان کے اندر افکار و تصورات کی سطح سے نیچے ایک انسانیت بھی ہوتی ہے جو مصیبت کے وقت بیدار ہو کر دشمن کے لئے بھی رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ یہود نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جس قدر پریشان کر رکھا تھا وہ تاریخ کی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، پھر اسلام اور یہودیت جو اختلاف ہے وہ بھی کوئی سربستہ راز نہیں مگر اس کے باوجود سرور دو عالم ان کی مصیبت پر پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ حضور سرور دو عالم کے سامنے سے جنازہ لے کر گذر رہے تھے کہ حضورؐ کھڑے ہو گئے، ان کی پیروی میں اُن کے رفقاء بھی کھڑے ہو گئے۔ اُن میں سے ایک رفیق کار نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی ؛

یہ تو یہودیہ کا جنازہ ہے تو اس پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

موت ہر صورت میں موجب رنج ہی ہے۔

قادیانیوں کا مسلمانوں کے بارے میں انتہائی سنگدلانہ طرز عمل دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ملت کے بانی نے مکر و فریب کا یہ سارا دھندہ شروع ہی اس لئے کیا تھا کہ کفار کی تائید و حمایت میں بلکہ اس کی سرپرستی میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اس امت کو تہس نہس کر دیا جائے اور اس وقت تک چین نہ لیا جائے جب تک دنیا میں نبی آخر الزماں کا ایک غلام بھی موجود ہے

ماہنامہ اشاعت الحق کا خاتم النبیین نمبر

مدیر محبوب عالم خاں ۔ صفحات ۶۴ قیمت ڈھائی روپے کتابت طباعت گھٹیا ۔ پتہ :- بارہ پتھر۔ بٹہ مالو۔ سری نگر (کشمیر)

فاضل مدیر نے اگر ہمارے نام ذیل کی سطور نہ لکھی ہوتیں تو شاید تبصرہ کی نوبت نہ آتی۔

"آپ کو خدائے واحد اور نبی آخر محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا واسطہ کہ اس رسالہ کو شروع سے آخر تک حرف بحرف محض خالی الذہن ہوکر ضرور پڑھیں اور پھر تبصرہ فرمائیں۔"

خراب طباعت وکتابت کی چیزیں پڑھنا ہمارے لئے بہت دشوار ہوتا ہے لیکن اسے ہم نے پورا پڑھا اور تبصرہ تفصیلاً اسلئے کر رہے ہیں کہ ہمارے قارئین قادیانی جماعت کے اس طائفے سے بھی واقف ہوجائیں جو بجائے "قادیانی" کے "احمدی" کہلاتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں تھے بلکہ مسیح موعود تھے۔ اس طائفے کو "لاہوری" بھی کہا جاتا ہے اور مدیر موصوف نے ہمیں غالباً اس توقع پر مذکورہ سطور لکھی ہیں کہ ہم اس طائفے کو گمراہ نہیں سمجھیں گے۔

اس خاص نمبر میں مرزا غلام احمد کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے مریدین کی تردید وتغلیط کس شد ومد سے کی گئی ہے اس کا اندازہ درج ذیل سطور سے کیجئے۔

"خلیفۂ قادیان کے مریدوں کی ممتاز خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ خلیفہ کے لئے ہر جھوٹ بول سکتے ہیں، جھوٹی، فرضی، من گھڑت روایات گھڑ لینے میں انہوں نے جاسوسی دور کے راویوں کو بھی مات کر دیا ہے۔" (صفحہ ۱۵)

گویا قادیانیوں کے اس طائفے کے رد میں جیسے مرزا غلام احمد کی خلافت ملی اور جس کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ خاص نمبر ہمارا سمجھا ہے لیکن یہ ہم تو اسے صراط مستقیم کا رہبر نہیں مانیں گے جب تک یہ مرزا غلام احمد کی پیشوائی اور پیری کو دین وایمان بنائے ہوئے ہے۔

نمبر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں، ان سب پر الگ الگ تبصرہ تو بہت طویل ہوگا اس لئے ہم پورے نمبر سے صرف چند اہم چیزیں منتخب کر کے اس امید پر کچھ عرض کریں گے کہ شاید مدیر محترم کوئی فائدہ حاصل کر سکیں اور انھیں احساس ہو کہ گمراہی اور کج روی میں وہ قادیانیوں سے کم نہیں ہیں۔

مرزا غلام احمد نے بڑی کثرت اور شد ومد سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا مجھ پر الہامات نازل فرماتا اور مجھ سے مخاطبت کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ قرآنی آیات کو بھی انہوں نے خود پر چسپاں کر ڈالا۔ مثلاً فرمایا کہ اسمہٗ احمد کے الفاظِ قرآنی کا مصداق میں ہوں سورۂ اسریٰ میں جس مسجدِ اقصیٰ کا ذکر ہے اس سے مراد قادیان کی مسجد ہے من دخلہ کان آمنا بھی اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے وغیرہ ذلک۔ مرزا صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے

کہ ان پر جو الہامات خدا نازل کرتا ہے اس میں صریحاً اسی طرح الفاظ
ہوتے ہیں جس طرح قرآن میں پائے جاتے ہیں - زیر تبصرہ
نمبر میں اس دعوے کا ایک امر مسلّم کے طور پر متعدد جگہ ذکر ہے جیسے
ص۳۳ پر یہ عبارت :-

" یہ سچ ہے کہ وہ الہام خدا نے اپنے بندے پر
نازل فرمایا ہے اس میں اس بندے کی نسبت
نبی اور رسول اور مرسل کے الفاظ بکثرت
موجود ہیں "

اصل خرابی کی جڑ یہی ہے کہ قادیانی ہوں یا لاہوری دونوں
گروہوں نے مرزا کے اس دعوے کو اس حد تک تسلیم کر لیا کہ اسے
وہ جگہ جگہ بطور دلیل استعمال کرتے ہیں - حالانکہ یہی دعویٰ تمام
گمراہیوں کا تخم اور تمام مفسدات کی جڑ ہے -

اہلِ ایمان کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کے بعد ان کے صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین یا کسی مفسر
یا محدث یا فقیہ و امام نے کیا کبھی ایک بار بھی ایسا دعویٰ کیا کہ مجھ پر
اللہ نے یہ الفاظ الہام کئے ہیں - الہام اور کشف اس وحی سے
قطعاً مختلف چیزیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی رہی
ہے - امت کے معروف و مسلّم محققین اور علماء و ائمہ میں سے کسی
ایک کا بھی یہ قول نہیں دکھلایا جا سکتا کہ کشف والہام میں قصور و
خطا کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی اور اسے وحی کی طرح یقینی تصور
کیا جا سکتا ہے - خود مرزا غلام احمد بھی اسی کے قائل تھے چنانچہ
زیر تبصرہ نمبر کے صفحہ ۲۷ پر ان کی ہی یہ عبارت نقل کی گئی ہے -

" میں تو اپنے الہامات جب تک کتاب اللہ پر عرض
نہیں کر لیتا میں ان کو سچ نہیں سمجھتا اور میں جانتا
ہوں کہ جب کبھی الہام قرآن کریم کے مخالف ہو
تو وہ جھوٹ اور الحاد اور زندقہ ہے "

الہام کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ سے آپ
ایک خیال سا دل میں ڈال دیا جاتا ہے - الفاظ کی آمیزش
اس میں نہیں ہوتی، الفاظ خود آدمی کا ذہن منتخب کرتا ہے - پھر
یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ خیال القائے ربانی ہو - عین ممکن ہے القائے
شیطانی ہو - خود مرزا صاحب کے قول سے یہ ظاہر ہے - جو الہام
قرآن کریم کا مخالف ہونے کی وجہ سے بقول مرزا صاحب جھوٹ
اور الحاد ہو گا وہ شیطانی وسوسہ اندازی کے سوا اور کیا ہو گا
کتاب اللہ پر پیش کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس میں خطا کی
گنجائش ہے -

جب صورتِ حال یہ ہے تو آخر یہ یقین کر لینے کی وجہ کیا ہے
کہ مرزا صاحب کو اللہ تعالےٰ با قاعدہ الفاظ کے ساتھ مخاطب
بناتا رہا اور قرآن کی طرح لفظاً لفظاً ان پر الہامات وارد ہوتے
رہے - قرآن وحدیث میں تو ایسا کہیں نہیں آیا اور چودہ سو سالوں
میں علومِ شریعت کا کوئی معروف امام اور شیخ ایسا نہیں گذرا جس
نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اللہ تعالےٰ مجھ سے لفظوں کے ساتھ خطاب
فرماتا ہے - ایسے دعوے کے صریحاً معنی یہ ہوں گے کہ اس خطاب
اور الہام کو "آیات" کا نام دیا جائے اور ان کی حیثیت وہی ہو جو
آیاتِ قرآنیہ کی ہے -

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آپ لوگوں نے مرزا صاحب کے
اس دعوے کو قبول کیسے کر لیا اور اس پر منزل بہ منزل خیالی عمارت
کیسے اٹھاتے چلے گئے - آپ قادیانیوں کے مقابلہ میں مرزا کی طرف
سے یہ صفائی تو پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے خود کو نبی اور رسول اور
مرسل حقیقی معنوں میں نہیں کہا مگر یہ نہیں سوچتے کہ مرزا صاحب
کا یہ دعویٰ بجائے خود محتاج دلیل ہے کہ مجھے اللہ نے ان الفاظ
سے خطاب کیا ہے اور میرے الہام میں یہ الفاظ نازل فرمائے ہیں
آپ بڑے اطمینان سے مرزا کی اس قسم کی عبارتیں
نقل کرتے ہیں -

" نام احمد اور محمد سے مسمّٰی ہو کر میں رسول بھی ہوں
اور نبی بھی ہوں یعنی بھیجا گیا بھی اور خدا سے غیب
کی خبریں پانے والا بھی اور اس طور سے خاتم النبیین
کی مہر محفوظ رہی کیونکہ میں نے انعکاسی ظلّی طور پر
محبت کے آئینے کے ذریعہ سے وہی نام پایا "

مگر نہیں غور کرتے کہ مرزا کہہ کیا رہے ہیں، مرزا دعویٰ کر رہے
ہیں کہ خدا نے میرا نام احمد اور محمد رکھا اور آپ کو کوئی تشویش نہیں
کہ یہ کیا کہہ دیا گیا - آپ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ نبی اور رسول کے
الفاظ اسلام میں مستقل اصطلاحوں کی حیثیت رکھتے ہیں - اصطلاحات

کا استعمال لغت کی مدد سے نہیں کیا۔ خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اصطلاحاً حضورؐ کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض لغت کی آڑ لے کر اپنے ہر بزرگ کو یہی لقب دینے لگے تو اسے فتنہ پرداز اور شریر ہی کہا جائے گا۔ حالانکہ لغوی اعتبار سے ہر شخص کے لئے یہ الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح آپ اپنے لڑکے کا رشتہ کسی کے ہاتھ لڑکی والوں کو بھجوائیں اور یہ کہلوائیں کہ میں رسول بھیج رہا ہوں تو یہ اس لفظ کا گستاخانہ استعمال ہوگا حالانکہ لغتاً یہ اس جگہ درست ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ شخص نبی نہیں کہلا سکتا جسے اللہ تعالیٰ بذریعہ کشف و الہام کوئی غیب کی خبر دیدے۔ آخر چودہ سو سالوں میں اور بھی تو ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ گذر رہے ہیں، ان پر بھی کچھ الہامات ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے تو کبھی دعویٰ نہ کیا کہ ہم نبی ہیں۔ رسول ہیں۔ مرسل ہیں۔ بعض اولیاء نے اگر طریقت کے سلسلہ میں اس طرح کا کوئی فقرہ استعمال کیا ہے تو وہ بھی پیری مریدی کے مطالب کی تفہیم کے لئے کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مرزا صاحب کی طرح کوئی بزرگ اپنے نبی ہونے کا اعلان پر اعلان کرتے چلے گئے ہوں۔ مسلسل اسی اصطلاحی لفظ کا استعمال کرنا اور بعد میں یہ عذر کر دینا کہ ہم نے تو بر بنائے مجاز ایسا کیا ہے اصطلاحات شرعیہ سے مذاق کرنا اور خلق خدا کو مغالطہ دینا ہے۔ پھر یہ دعویٰ کہ خدا ہمیں نبی اور رسول کے الفاظ سے مخاطب کر رہا ہے اور بھی جسارت ہے۔ تعجب ہے کہ اس دعوے کو آپ لاہوری حضرات بھی ایک صداقت ثابتہ مان بیٹھے ہیں حالانکہ اس کی صحت پر قرآن، حدیث اور ائمہ فقہاء کے اقوال میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

مرزا صاحب کا یا آپ کا یہ کہنا مغالطہ دہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ لفظ نبی ہم حقیقی معنی میں نہیں بول رہے ہیں بلکہ یہ ہماری کنایاتی اصطلاح ہے اور اصطلاحات کے سلسلہ میں ہر شخص آزاد ہے۔ مغالطہ دہی اس لئے ہے کہ آپ کو یہ حق اگرچہ حاصل ہے کہ کوئی نئی اصطلاح ایجاد فرمالیں۔ کوئی آپ کو نہیں منع کرتا لیکن جو اصطلاحات پہلے بن چکی ہیں اور ان کا مصداق و مفہوم متعین ہو چکا ہے ان کو ہی کسی اور مفہوم میں استعمال کرنا اور بار بار دہرانا دھوکا دینا ہے۔ "کتاب اللہ" توانجیل بھی ہے توراۃ بھی ہے مگر آج جو شخص کتاب اللہ کے حوالہ سے کوئی بات کہے گا تو اس کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ وہ قرآن کا حوالہ دے رہا ہے اور اگر وہ بعد میں یہ شوشہ چھوڑنے لگے کہ میں نے تو انجیل سے نقل کیا تھا تو اسے مکار کہیں گے۔ "حدیث" لغتاً بات کو کہتے ہیں۔ ہر بات پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن کوئی شخص اگر یوں کہے کہ حدیث میں ایسا آیا ہے تو ہر شخص اس کا یہی مطلب لے گا کہ حضورؐ کا ارشاد بیان ہو رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص بعد میں یوں کہدے کہ میں نے تو ایک راہ چلتے کا قول بیان کر دیا تھا تو اگرچہ لغتاً لفظ حدیث کا اطلاق راہ چلتوں کی بات پر بھی ہو سکتا ہے مگر اس شخص کو فریبی کا لقب دیں گے۔ پھر آخر نبی اور رسول ہی ایسے الفاظ کیوں ہو گئے جنھیں مرزا صاحب اصطلاحی اور شہرۂ آفاق مفہوم سے ہٹا کر برابر استعمال کئے چلے جائیں اور آپ حضرات مطمئن رہیں کہ یہ کوئی بری بات نہیں۔ کوئی غلط حرکت نہیں۔

آپ نے بڑے فخر سے جو کٹے میں نمایاں کر کے مرزا صاحب کی وہ عبارت شائع کی ہے جس میں ایک دعوے کی دلیل یہ ارشاد کی گئی۔

> "تو خدا تعالےٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفےٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا اور نہ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء کا مجھکو خطاب دیا جاتا بلکہ میں کسی علیحدہ نام سے آتا" (ص ۳۹)

یہ دلیل نہیں دعویٰ ہے۔ مرزا صاحب کا پیدائشی نام غلام احمد ان کے والدین نے رکھا ہوگا اس کے بعد خدا نے کب ان کے یہ سب نام رکھدیئے یہی وہ اساسی سوال ہے جس کا جواب خدا جانے آپ لوگ کیا دیتے ہوں گے۔ میری نظر سے تو گذرا نہیں کہ ایسا کونسا ثبوت ہے جس کی بنا پر آپ حضرات نے مرزا صاحب کا یہ عجیب و غریب دعویٰ سر آنکھوں پر رکھ لیا ہے حضور فداہ امی وابی کے بعد چودہ سو سالوں میں یہ پہلے صاحب دیکھنے میں آئے ہیں جنھیں بقول ان کے اللہ نے محمد اور مصطفےٰ اور مجتبیٰ سبھی کچھ کہدیا۔

ڈاکٹر خورشید عالم صاحب اپنے مضمون میں مرزا صاحب کے

ظلی نبوت اور کارِ تجدید کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

"مشہور عالم دین نواب صدیق حسن خانصاحب مرحوم کی کتاب "حجج الکرامۃ" میں گذشتہ تیرہ صدیوں کے مجددین عظام کی مکمل فہرست درج ہے۔" (ص۳۴)

گذارش یہ ہے کہ نواب صدیق حسن مرحوم پیغمبر کب سے ہوگئے کہ جو فہرست مجددین وہ دیدیں وہ امکانِ خطا سے بالاتر ہو۔ کارِ تجدید کوئی نبوت جیسا منصب نہیں ہے کہ کسی بھی مجدد کی نشاندہی اتنی ہی آسانی سے ہوسکے جتنی آسانی سے نبی اور رسول کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے نقطۂ نظر سے فلاں کو مجدد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ فلاں کو آپ حضرات جس صدی کا مجدد مرزا غلام احمد کو قرار دیے بیٹھے ہیں بریلویوں کے نزدیک اس صدی کے مجدد ان کے اعلیٰ حضرت تھے اور مسلمانوں کے متعدد اور حلقوں نے بعض اور حضرات کو مجدد تصور کر رکھا ہے۔

خیر ہم کچھ دیر کے لئے نواب صاحب مرحوم کی دی ہوئی فہرست کو قبول ہی کئے لیتے ہیں۔ مگر کیا ان مجددین میں کوئی ایک بھی ایسا گذرا ہے جس نے اس شد و مد سے اپنے مجدد ہونے کا اشتہار دیا ہو اور بڑے اطمینان سے اپنے لئے نبی اور رسول کے الفاظ بار بار دہرائے ہوں یا کوئی الگ جماعت اسی بنیاد پر بنائی ہو اور وہ ہنگامہ اٹھایا ہو جو مرزا صاحب نے اٹھایا ہے۔

"چودھویں صدی ہجری کے آغاز پر حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے الہامی اطلاع پاکر دنیا کے اطراف و اکناف میں یہ منادی کردی کہ اس صدی کا مجدد اللہ تعالےٰ نے انہی کو چن لیا ہے نیز یہ کہ اس صدی میں سوائے ان کے دوسرا کوئی مجدد نہ ہوگا۔"

ان ہوائی باتوں کو آپ حضرات اس طرح جزو ایمان بنائے بیٹھے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کیا قرآن و حدیث میں کہیں یہ بھی آیا ہے کہ رسول کی طرح ہر مجدد بھی اپنے مجدد ہونے کا اعلان بالجہر کرتا رہے۔ کیا ان تیرہ مجددوں نے جنہیں نواب صدیق مرحوم کے اعتماد پر آپ بھی مجدد مان رہے ہیں۔ یہی سب کیا تھا جو مرزا صاحب کر گزرے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ لوگ اگر فضولیات سے ہٹ کر خالص علمی رخ سے تحقیق فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ ہر صدی کے سرے پر ایک مجدد بھیجے جانے کی حدیث اتنی قوی ہرگز نہیں ہے کہ حجت اور استدلال کے کام آسکے۔ اسے نہ بخاری نے قبول کیا نہ مسلم نے نہ امام ترمذی نہ ابن ماجہ نہ نسائی نے۔ سند کے اعتبار سے وہ صحت کا معیار اعلیٰ نہیں رکھتی اور اس جیسی کسی بھی حدیث پر بڑے بڑے دعووں کی عمارت نہیں اٹھائی جاسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ بہر حال نہیں کہا گیا ہے کہ جو شخص کارِ تجدید انجام دے گا اسے اللہ تعالےٰ مطلع بھی کردے گا کہ تم مجدد ہو۔ اگر کہی گئی ہے تو پیش کی جائے احادیث صحیحہ کی رو سے اللہ تعالےٰ سعید و شقی دونوں طرح کے انسان پیدا کرتا ہے لیکن کسی بھی انسان کو اللہ تعالیٰ یہ نہیں بتاتا کہ تم سعید ہو یا شقی ہو بلکہ انسانوں کا کارنامۂ حیات اور اسوۂ کردار ہی لوگوں کو قیاس دیتا ہے کہ فلاں شخص سعید تھا اور فلاں شقی۔ اسی طرح جو اللہ کے بندے کارِ تجدید انجام دیتے ہیں ان کے کاموں ہی سے ہی لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ مجدد ہیں۔ خود انھیں اللہ تعالےٰ آگاہ کردیتا ہو کہ تم مجدد ہو اس کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے وہ خلاصۃً یہ ہے کہ مجدد سے مراد امت کا کوئی ایسا فرد ہے جو نسبتاً ممتاز ہو اور دین کی اشاعت کا کام انجام دے اور بدعات و منکرات کے خلاف جد و جہد کرے۔ یہی اکثر محدثین کی رائے ہے۔ یہ تو کسی ایک بھی شارح اور محدث نے نہیں کہا کہ تجدید ایک نبوت جیسا عہدہ ہے اور مجدد کو اپنے مجدد ہونے کا اشتہار دینا چاہیئے۔ اشتہار کا سوال تو جب پیدا ہو جب کسی کو یہ علم بھی ہو کہ وہ مجدد ہے۔ یہ علم اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس لئے نہیں دیا جاتا کہ تجدید کوئی نبوت جیسا منصب نہیں ہے۔ دوسری رائے اس حدیث کی شرح میں یہ ظاہر کی گئی ہے کہ مجدد کا اطلاق کسی گروہ پر بھی ہوسکتا ہے جو بدعات و منکرات کے خلاف سرگرم ہوا اور اقامتِ دین کی جد و جہد کرے۔

تیسری بات یہ ہے کہ لوگوں کا بس اعلان ہی اندازہ ہے۔ اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر صدی کے مجدد پر تمام امت کا اتفاق نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ اور اسی بنا پر اللہ اور رسول نے یا مجتہدین وائمہ نے امت پر یہ لازم نہیں کیا کہ وہ اپنے دور کے کسی مجدد پر لازماً متفق الرائے ہو جائے جیسا کہ نبی کے زمانے میں اس کی نبوت پر متفق ہونا سب کے لئے ضروری ہے اور جو منکر ہو اسے کافر کہتے ہیں۔ دیوبندی حلقہ اگر مولانا اشرف علی یا مولانا گنگوہی یا شاہ ولی اللہ یا کسی اور کو اپنے دور کا مجدد مانتا ہے تو یہ ہرگز ضروری نہیں کہ مسلمانوں کے سارے ہی حلقے اس سے اتفاق کریں اور جو اتفاق نہ کرے وہ کافر قرار پائے پھر یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ کچھ لوگوں نے اگر مرزا غلام احمد کو مجدد دیکھ لیا تو دوسروں پر بھی اس ذاتی خیال کو لادیں اور اسے ہدایت و گمراہی کا مسئلہ بنا ڈالیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ الہام کا دعویٰ تو ہر شخص کر سکتا ہے کیسے معلوم ہو کہ مرزا صاحب نے جس الہام کا دعویٰ فرمایا تھا وہ انھیں ہوا بھی تھا یا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا تھا تو یہ کیسے ثابت ہو کہ وہ لازماً خدا کی طرف سے تھا شیطان کی طرف سے نہیں تھا مرزا صاحب کے زہد و تقویٰ کا قصیدہ آپ حضرات جو پڑھتے ہیں اسے تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ تو یقین نہیں کیا جا سکتا کہ شیطان نے انھیں دھوکہ دینے کی کوشش نہ کی ہوگی بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء کے کلام میں یہ تنبیہ ملتی ہے کہ شیطان سے خبردار رہنا شاہ عبدالقادر جیلانی جب ہمیں الطائف بیان کرتے ہیں کہ فلاں فلاں معاملہ میں مجھے شیطان نے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی پھر مرزا غلام احمد اپنے جن خیالات کو الہام کا نام دے بیٹھے ہیں ان کے بارے میں یہ دعویٰ آخر کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ شیطانی وسوسوں سے پاک ہونگے الہام و کشف کو حجت کب کسی واقف شریعت نے مانا ہے۔ آپ ان تیرہ مجددین میں سے جنھیں آپ نے بھی مجدد مان لیا ہے دو چار ہی کے نام لے دیں جنھوں نے اس طرح کا اعلان فرمایا ہو کہ اللہ نے مجھے اس صدی کا مجدد بنایا ہے اور میرے سوا اس صدی میں اور کوئی مجدد نہ ہوگا۔ ایسا اعلان کبھی نہیں کیا

کیونکہ رسول اللہ کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور الہام و مبشرات مشکوک چیزیں ہیں جو صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی یہ محض افسانہ طرازی ہے کہ آخری رسول کے بعد اور با قاعدہ الفاظ کے ساتھ کسی بندے سے خطاب کرے اور اس خطاب میں غلط کا امکان نہ ہو۔

" اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد پر یہ راز کھولا کہ عیسیٰ وفات پا چکے ہیں اور آنے والا عیسیٰ حقیقی عیسیٰ نہیں بلکہ اسکا مثیل ہے جو مقام عیسیٰ پر گامزن ہونے کے باعث عیسیٰ کہلائیگا۔ اور وہ تم ہو"

یہ اگر دلیل ہے تو بے شک آپ جو چاہیں کہتے رہیں لیکن حقیقتہً یہ دلیل نہیں ہے اسلام میں اگر ہم خدا کے الہامات وحقائق کا فیصلہ کیا کرتے تو آج یہ دین دوسرے ادیان کی طرح غتر بود کبھی کا ہو چکا ہوتا تعجب ہوتا ہے کہ جن مضمون نگار کے نام گرامی کے ساتھ "ڈاکٹر" کا شاندار تقیبہ لگا ہوا ہے وہ اتنا بھی ادراک نہ کر سکے کہ اس طرح کی دلیلیں پیش کرنا علم و عقل کا مضحکہ اڑانا ہے۔ بریلوی حضرات اگر یہ "دلیل" دیں کہ ہمارے مجدد پر اللہ نے یہ راز کھول دیا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے مقلدین خارج از اسلام ہیں تو آپ لوگوں کو ہنسی آجائیگی مگر اپنے مجدد صاحب کے دعوۂ الہام کو آپ حضرات کس فراخدلی سے جزو ایمان بنائے بیٹھے ہیں۔

آپ حضرات قرآن و حدیث سے کیسا بیدردانہ مذاق کرتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں ہیں یہاں ہم اسی خاص نمبر سے ایک مثال لیں گے۔

بخاری کی ایک حدیث میں اماممکم منکم کے الفاظ آئے ہیں اس نمبر میں ایک سے زائد جگہ اس کا مطلب بیان کیا گیا ہے کہ

"یعنی وہ عیسیٰ مسلمانوں میں سے ہی مسلمانوں کا کوئی امام الوقت ہوگا" (صفحہ [illegible])

اور آپ کے مبلغین عام طور پر یہی مطلب بیان کرتے پھرتے ہیں چنانچہ اور بعض کتابچوں میں بھی یہ نقطہ گذرا ہے۔ اس طرح آپ لوگ اپنے اس من گھڑت اور واہیات عقیدہ کو کہ نازل ہونے والا مسیح عیسیٰ ابن مریم نہیں ہوگا بلکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا کوئی نیا آدمی ہوگا اور مرزا غلام احمد وہی آدمی ہیں بخاری کی حدیث سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

اگر خدا کا کچھ خوف اور آخرت کی جوابدہی کا کچھ احساس اور ارشادِ رسول کی کوئی وقعت آپ کے دلوں میں ہے تو آیئے ایک حق پسندانہ نظر پوری حدیث پر ڈال لیں۔ یہ حدیث مسلم اور مسند احمد میں بھی آئی ہے، مگر یہاں صحیح بخاری کھول لیجئے جلد اول مطبع اصح المطابع۔ کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۰۔ رسول اللہ نے فرمایا۔

کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم — تمہارا اسوقت کیا حال ہوگا جب تم میں مریم کا بیٹا نازل ہوگا اور تمہارا امام تم میں ہی سے ہوگا۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس حدیث میں حضرت "عیسیٰ" کا ذاتی نام بھی نہیں لیا گیا بلکہ صرف ابن مریم کہنا کافی سمجھا گیا۔ اس سے انتہائی قطعیت اور کمال درجہ صراحت کے ساتھ یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ نازل ہونے والا عین وہی شخص ہوگا جسے ساری دنیا "ابن مریم" کے نام سے جانتی ہے۔

مسیح اور عیسیٰ تو ایسے نام ہیں جو بعد میں ہزاروں لوگوں نے رکھے اور جس کا جی چاہے رکھ سکے مگر "ابن مریم" ہی وہ وصفِ خاص ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی کا نام اور لقب نہیں بن سکتا۔ مرزا غلام احمد کی والدہ کا نام مریم نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس نام کی اور سیکڑوں خواتین امت میں گذری ہیں اور آئندہ بھی گذر سکتی ہیں لیکن ان کے بیٹوں کو ان کی طرف اس لئے منسوب نہیں کیا جاتا کہ وہ سب اپنے باپوں کے نطفوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابنیت کے لئے حسبِ رواج انکے باپوں کا نام لیا جائے گا نہ کہ ماں کا۔ اس کے برخلاف حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ تھا ہی نہیں اس لئے "ابن مریم" کے وصفِ خاص میں وہ ازل سے ابد تک ممتاز و منفرد ہیں۔ کتنی زبردست دھاندلی اور گستاخی اور بد تعلقی ہے کہ حضور تو "ابن مریم" کے نزول کی خبر دیں مگر امت کے کچھ لوگ خرافاتی تاویلوں سے اس منفرد لقب کو ان مرزا غلام احمد پر چسپاں کریں جن کی ماں کا نام مریم نہیں تھا اور جو نازل نہیں ہوئے بلکہ بطنِ مادر سے پیدا ہوئے تھے۔

دوسرے یہ دیکھئے کہ بخاری کوئی ایسی کتاب تو نہیں جس کا سراغ آپ لوگوں نے لگایا ہو۔ یہ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم کتاب ہے اور اس کے بیسیوں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں علماء نے اسے سبقاً سبقاً پڑھایا۔ اور اس کی ہر ہر حدیث کا حق وضاحت ادا کیا ہے۔ اس حدیث کا مطلب عام طور پر اہلِ علم یہ بیان کرتے آئے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو اگرچہ وہ نبی ہیں لیکن اس نبوت کا تعلق دورِ محمدی سے پہلے زمانے سے ہے اس لئے نزول کے وقت وہ شریعت محمدیہ ہی پر عمل پیرا ہوں گے اور نبی کی حیثیت سے انھیں مقامِ امامت حاصل نہ ہوگا بلکہ امام وقت اسی زمانے کے مسلمانوں میں سے کوئی ہوگا جس کے زمانے میں حضرت عیسیٰ نازل ہوں گے۔

دوسرا مطلب جسے کم ہی محدثین نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ نازل ہونے والے عیسیٰ ابن مریم اگرچہ محمد رسول اللہ کے امتی نہیں ہیں بلکہ ان کی نبوت اور شریعت مستقل تھی لیکن نزول کے وقت وہ شریعت محمدیہ کے تبع ہوں گے۔ گویا وہ تم ہی میں کا ایک فردِ امت ہوں گے جسے اس وقت امامت و سربراہی کا موقعہ دیا جائے گا۔

آپ حضرات ان دونوں کے بجائے ایک تیسرا مطلب گھڑتے ہیں۔ یہ کہ عیسیٰ ابن مریم تو وفات پا چکے ہیں وہ نہیں آئیں گے بلکہ امت ہی کا کوئی نو مولود فرد بہ حیثیت مثیلِ مسیح ہو کر اس حدیث کا مصداق بنے گا اور وہ مرزا غلام احمد ہیں۔ یہی مطلب آپ لوگ بیان فرماتے چلے جاتے ہیں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کے علاوہ پہلے بھی کسی عالم اور محدث نے یہ مطلب لیا ہے؟ اگر لیا ہے تو پیش فرمایئے نہیں لیا تو کیا آپ اس خوش فہمی میں گرفتار ہیں کہ پچھلے کسی عالم نے حدیث کا مطلب نہیں سمجھا بلکہ جس نے بھی سمجھا ٹھیک سمجھا ان کی پہلی بار مرزا غلام احمد کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام صحیح

مطلب بتایا ہے؟ کاش آپ لوگ سوچتے کہ مرزا کی غالی عقیدت نے آپ کو بے عقلی و کج فہمی کے تحت الثریٰ میں دھکیل دیا ہے اور علم منطق کا ٹکڑا لیکر سادہ لوح عوام کو فریب دیئے چلے جانا اور دعویٰ یہ کرنا کہ ہم صحیح العقیدہ مسلمان ہیں نامعقولیت کی عجیب و غریب مثال ہے۔

نیا بحر کی فضول بحثیں کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ آپ تنہا اسی ایک مسئلے پر غور فرمالیں کہ حدیثوں میں جس صراحت سے عیسیٰ ابن مریم کے نزول کا ذکر ہے اس کی موجودگی میں مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ٹھیرانا ہوشمندی ہے یا ہوش دشمنی۔ علم ہے یا جہل۔ ہدایت ہے یا گمراہی۔ اگر بعض ناقدین کی طرح جن کے نام آپ وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں آپ بھی یہی کہتے کہ نزول عیسیٰ کی تمام روایات ضعیف ہیں تو اگرچہ علمی نگاہ سے یہ مغالطہ انگیز ہوتا مگر اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگتا لیکن آپ لوگ ان روایات کو ساقط الاعتبار بھی نہیں کہہ سکتے ورنہ مرزا کے دعوے کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔

مسیح موعود میں لفظ موعود جس وعدے کی طرف مشیر ہے وہ وہی وعدہ تو ہے جو مذکورہ حدیثوں میں آیا ہے۔ مرزا صاحب اسی وعدہ کو مبنی برحق مان کر اپنے مسیح موعود ہونے کا اعلان فرماتے ہیں مگر کھیل یہ کھیلتے ہیں کہ حدیث میں جس ابن مریم کا ذکر ہے اسے واہیات تاویلوں کی قتل گاہ میں ذبح کر دیتے ہیں۔ یہ کلام رسول سے تمسخر اور گستاخی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ جو لوگ ان احادیث کو ضعف کی وجہ سے ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں وہ کافر اس لئے نہیں کہ انہوں نے اسے قول رسول نہیں مانا۔ حدیث کو ضعیف کہنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کا قول رسول ہونا مشکوک ہے لیکن آپ لوگ ان احادیث کو قول رسول مان کر اس میں کئے گئے وعدے کے سائے میں مرزا غلام احمد کو مسیح موعود قرار دیتے ہیں اور اس کے باقی سب مضامین سے زندیقوں والا سلوک کرتے ہیں اور واہی تاویلات کے ذریعہ انھیں مسخ کرتے ہیں۔ تو قول رسول کو قول رسول مان کر بھی خواہشات کا ہدف اور تاویلات کا نشانہ بنانا کفر نہیں تو کیا اسلام ہے۔

اصولِ حیات

از:- مولانا احمد نصیر بنارسی۔
• صفحات ۲۴ - سائز خورد • کاغذ سفید۔
• کتابت و طباعت گوارہ۔

کتابچے کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ مؤلف خدمتِ دین کا جذبہ رکھتے ہیں اشاعتِ اسلام اور ابلاغ و تبلیغ سے انھیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ وہ حسن اتفاق سے کسی جامع مسجد کے خطیب بھی ہیں۔ لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں کہ جو شخص خدمت دین کا جذبہ رکھتا ہو اور تقریر کرنے کی صلاحیت بھی اس میں موجود ہو وہ کتاب بھی لکھ سکے۔

خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والے ان گنت لوگ تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر بذریعہ تقاریر امتِ مسلمہ کی خدمت میں مصروف و منہمک ہیں لیکن اگر ان خدام دین کے ہاتھوں میں آپ قلم تھما دیں تو یقیناً اسی فیصد لوگ اپنا نام تک نہ لکھ پائیں گے حالانکہ تقریر کرنے میں وہ بڑی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اندازہ یہ ہوا کہ تقریر کرنے کے لئے علم شرط نہیں ہے البتہ کتاب لکھنے کے لئے علم شرط اور ضروری ہے۔ مولانا نصیر احمد صاحب کا جذبہ قابل قدر ہے مولف تعریف و ستائش کے مستحق بھی ہیں کہ انھوں نے کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے قلم و کاغذ سے رشتہ قائم کرنے کی ٹھانی لیکن مناسب ہوتا اگر وہ اس میدان میں کودنے سے پہلے تحقیق اور مطالعہ کے مراحلے گذر جاتے ۔۔۔ یا کم از کم کتاب مرتب کرنے کے بعد کتاب کو کسی صاحبِ نظر کی نگاہوں سے نکال دیتے۔

کتاب میں بے پناہ غلطیاں موجود ہیں۔ بعض غلطیاں تو ایسی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تصحیح کے متعلق توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ نظرثانی کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ اگر مؤلف خود ہی نظرثانی فرما لیتے تو شاید کتابچہ میں اتنی موٹی موٹی غلطیاں باقی نہ رہتیں۔ ایک دو غلطی نظرانداز کی جاسکتی ہیں۔ لیکن بے شمار ہوں تو بے چارہ تبصرہ نگار کیا کرے ۔۔۔ لیجئے نمونتاً چند غلطیاں ملاحظہ فرمایئے

• خود ہم کو ہمارے اندرونی معاملات نے ہم کو

دین سے لاپرواہ کر رہا ہے۔ (صـ۳)
اندرونی کی [illegible] کا لفظ بر محل ہوتا۔ کتابت کی غلطی یہ ہے کہ "ہم کو" کا لفظ دو مرتبہ لکھ دیا گیا ہے

یا مثلاً:-

چند ایسے اصول اور اعمال صاف اور نہایت
سادہ زبان میں تحریر کیا جاوے جس کو تمام مسلمان
بآسانی اختیار کر سکیں۔ (صـ۷)

اس ایک چھوٹے سے جملہ کے اندر کئی خرابیاں موجود ہیں۔ اعمال کی بجائے احکام ہونا چاہئے تھا۔ احکام نامہ اور اعمال نامہ میں کافی فرق ہے جو مولف نے محسوس نہیں کیا — اگر اعمال ہی کو صحیح تصور کر لیا جائے تو بھی جملہ میں خرابی موجود ہے اعمال عمل کی جمع ہے جمع کی مناسبت سے تحریر کئے جائیں ہونا چاہئے تھا۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ اختیار کر سکیں تحریر فرمایا ہے حالانکہ سمجھ سکیں کا محل تھا۔ اختیار کر سکیں ایک بھاری اور موٹی غلطی ہے۔ تمام مسلمان کا لفظ بھی بیجا طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تمام مسلمان کی بجائے کم تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ ہونا چاہئے تھا۔

یعنی عبارت یوں ہوتی —

چند ایسے اصول اور احکام صاف اور نہایت سادہ زبان میں تحریر کئے جائیں کہ جن کو کم تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ مسلمان بآسانی سمجھ سکیں۔

اکثر جگہ ہے "کو" اور "سے" جیسے حروف چھوٹ گئے ہیں دوسری نوع کی بھی غلطیاں موجود ہیں مثلاً

جب اس نے یہ تسلیم کر لیا تو اب اس پر ہر چیز
ذمہ داریاں واجب ہوتی ہیں۔

واجب کی جگہ عائد ہونا چاہئے تھا۔

یا مثلاً۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہیں وہ
چاہتے ہیں کہ بندہ میری محبت کے علاوہ قلب میں کسی سے
تعلق پیدا نہ کرے۔ (صـ۸)

جملہ تقریباً مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔

صحیح عبارت یوں ہوتا — اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ
مہربان ہیں وہ چاہتے ہیں کہ بندے میرے سوا قلبی طور پر کسی سے
تعلق پیدا نہ کریں۔

یا مثلاً

اگر سال کی زکوٰۃ نکال دیا ہے تو وہ مال مال طاہر
یعنی پاک مال ہو گیا

نکال دیا گیا ہوتا ہے۔ نکال دی ہونا چاہئے تھا۔ مولف بنگالی تو معلوم نہیں ہوتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ کو مذکر ہی تصور کرتے ہیں صـ۹ پر بھی زکوٰۃ … کا تذکرہ ہے اور بالکل اسی انداز میں۔

اور اگر زکوٰۃ نہ نکالا تو اب یہ مال وبال ہو گیا۔

صفحہ یہی ہے اگلی سطر میں لکھتے ہیں

آخرت میں یہ مال وبال بنکر سامنے آوے گا۔

کوئی بھی تعلیم یافتہ اور حسن انشاء میں دلچسپی لینے والا آدمی اس قسم کے جملے ہضم نہیں کر سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا انداز تحریر ذوق سماعت پر بار گراں گذرتا ہے آوے گا کی جگہ اگر آئے گا لکھ دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ آوے گا سے تو گاؤں دیہات کی بو آتی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ جملہ کسی کھیت میں بیٹھ کر لکھا گیا ہو۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

پہلا تو اعمال کا بیان تھا ان کا شکر کا فرا ادا
کرنے والا فاسق و فاجر شریعت اسلامی کی نظر میں ہے

حالانکہ جملہ اسی طرح ہوتا تو ٹھیک تھا۔

یہاں تک تو ایسے اعمال کا بیان تھا جن کا منکر کافر ہے
اور ترک کرنے والا فاسق و فاجر — یہی بات ختم ہو گئی۔

صفحہ ۱۰ پہلی ہی سطر میں "کریں" کی بجائے "لیکن" لکھ دیا ہے یہ بیشک کتابت کی غلطی ہے۔ اس لئے مولف کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

بعض غلطیاں تیسری نوع کی بھی ہیں۔

مثلاً

اسلام نے اسی وجہ سے یہ حکم دیا ہے کہ جس
مسلمان کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات
تولہ سونا یا اس مالیت کا سامان ضرورت سے

زیادہ موجود ہو تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری تھا کہ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب مالِ نصاب پر پورا سال گذر گیا ہو۔ اور یہ مالِ نصاب سال بھر اسی کے قبضہ اور ملک میں رہا ہو۔

ملکیت کے بجائے قیمت کا لفظ ہونا چاہیئے تھا۔ ملکیت سے جملہ لغو ہو کر رہ گیا ہے ضرورت کے ساتھ اگر اصلیہ کا لفظ بھی لگا لیا جاتا تو انسب ہوتا۔

صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں

چار نماز نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند ہیں۔ تین جس کو روز مرّہ آپ ادا فرماتے ہیں۔
(۱) اشراق کی چار رکعت (۲) چاشت کی چار رکعت (۳) اوّابین کی بیس رکعت (۴) تہجد کی بارہ رکعت۔

مؤلف نے اُن نمازوں کی طرف اشارا بھی کر دیا ہے جو رسول اللہ کو پسند تھیں اس کے بعد "تین جس کو روز مرّہ آپ ادا فرماتے ہیں کا مطلب کیا ہوا" یہ لفظِ تین آخر کیوں استعمال کیا گیا ہے۔۔؟ غالباً یہ کاتب صاحب کی حرکت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اوابین کی نفلیں احناف کے نزدیک چھ رکعت ہیں اور یہی بات صحیح روایت سے ثابت ہے۔ مؤلف نے بیس رکعت تحریر کی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ مذکورہ جملہ کو ایک بار پھر پڑھ لیجئے

چار نماز نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند ہیں .... جس کو روز مرّہ آپ ادا فرماتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حال کا ذکر ہے ماضی کا نہیں۔ مؤلف بدعتی بھی نہیں ہیں جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور حاضر و ناظر ہیں پھر موصوف نے اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔

جملہ اس طرح ہوتا تو ٹھیک تھا ——

چار نمازیں نبی کریم کو بہت پسند تھیں جن کو روز مرّہ آپ ادا فرماتے تھے۔

صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں۔

صاحبِ نصاب پر فطرہ واجب ہے۔

بہتر ہوتا اگر یہاں یہ صراحت کر دی جاتی کہ ہر اس شخص پر بھی فطرہ واجب ہے جو اگرچہ صاحبِ نصاب نہ ہو لیکن اس کے پاس غیر ضروری سامان اتنا موجود ہو جس کی مجموعی قیمت نصاب کے برابر ہو جاتی ہو۔

بیشک ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ لیکن فطرہ واجب ہو جاتا ہے فطرے کے بارے میں سال گذرنے کی قید بھی نہیں لگائی جا سکتی۔ جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں حولانِ حول شرط ہے۔

صفحہ ۱۷ پر رقمطراز ہیں۔

فخرِ دو عالم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نے قسم کھا لیا اور قسم توڑنے میں خیر ہو تو قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

بات ٹھیک ہی ہے لیکن لب و لہجہ غلط ہے۔ مؤلف نے شاید ہر مؤنث کو مذکر بنانے کا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ ویسے مؤلف کا قصور بھی کیا کتاب جس دور میں مرتب کی جا رہی ہے اس دور میں تذکیر و تانیث کا فرق تقریباً مٹ چکا ہے مذکر و مؤنث سب برابر کا پس میں سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں فریاد کا حق نہیں۔

مؤلف نے رشوت لینے دینے کو حرام قرار دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا احمد نصر صاحب نے کتاب لکھنے سے پہلے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔ جو بھی نوکِ قلم پر آیا لکھ ڈالا۔ اگر وہ مطالعہ کرتے تو فقہاء کا یہ فیصلہ ان کی نگاہوں سے ضرور گذرتا کہ موجودہ دور میں رشوت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں مجبوری کی حالت میں رشوت دی جا سکتی ہے اور رشوت دینے والا گنہگار نہیں ہوگا۔

البتہ رشوت لینا بیشک حرام ہے اور رشوت دینا کسی صورت میں جائز نہیں۔ اسی صفحہ پر کچھ اور بھی غلطیاں محسوس ہوئیں تبصرہ نگار جنہیں نظر انداز کر رہا ہے

صفحہ ۱۸ پر بدعت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ایسے جس کی شریعت میں کوئی حقیقت اور وجہ نہ ہو۔

یہ بدعت کی بالکل نئی تعریف ہے۔ چلیے اسے جدّت کا نام دے لیجیے ورنہ ہم نے اپنے اکابرین سے یہ سنا ہے کہ دین میں ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں۔ حدیث میں بھی کہا ہے۔ کل محدثۃ بدعۃ۔ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

اسی صفحہ کے اختتام پر نظر ڈالی تو یہ جملہ نظر آیا

امام اوزاعی نے فرمایا کہ شب برات میں اللہ تعالٰی مشرک اور کینہ پرور کی مغفرت نہیں فرماتے۔ تو کینہ پرور سے مراد جماعت سے الگ ہونے والا اور بدعتی ہے۔

امام اوزاعی کا یہ قول تو ٹھیک ہی ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے ہم نے نہیں پڑھا نہیں لیکن مولف نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ کینہ پرور سے مراد بدعتی اور جماعت الگ ہونے والا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ مولف کا اجتہاد ہے۔

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں۔

جماعت سے مراد مومنین کی یا نماز کی جماعت ہو سکتی ہے۔

مطلب یہ ہے یعنی کینہ پرور اسے بھی کہہ سکتے ہیں جو جماعت سے نماز نہ پڑھتا ہو۔ کیا یہ فیصلہ یقینی ہے کہ کینہ پرور کی اتنی جامع تعریف اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔ محترم مصنف صاحب نے کینہ پرور کا یہ عجیب غریب ترجمہ کر کے لغت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں ۔

جب اس کا ادا کرنا واجب تصور کیا جانے لگے تو ایسی صورت میں مستحبات اور مباحات قابل ترک ہو جاتے ہیں۔

یہ جملہ درحقیقت چیستاں کی حیثیت رکھتا ہے جس کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ہم نے بہت بہت غور کیا لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یا ہو سکتا ہے کہ بات خود مؤلف نے بھی سمجھ کر نہیں لکھی ہو، جو ہے کہ جملہ کے آخر میں لکھا۔ واللہ اعلم۔

یعنی بس اللہ میاں ہی اس جملہ کی حقیقت سے واقف ہیں۔

صفحہ ۱۹ پر سنت کی تعریف بایں الفاظ کرتے ہیں۔

ہر وہ کام جس کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو یا کرنے کا حکم پابندی کے ساتھ دیا ہو وہ سنت مؤکدہ کہلاتا ہے اور جس امر کو آپ نے پسند فرمایا ہو اور حکم کرنے کا نہ دیا ہو وہ سنت غیر مؤکدہ ہے اصل میں سنت کی تعریف یہ ہے کہ جس کام کو آپ نے کیا ہو یا کرنے کا حکم دیا ہو یا پسند فرمایا ہو وہ سنت ہے جیسے نماز کی سنتیں وغیرہ۔

مؤلف نے سنت کی تعریف صحیح کی ہے یا غلط۔ اس کا فیصلہ قارئین تجلی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ "اصول حیات" غلطیوں سے بھری ہوئی ایک معمولی درجہ کی کتاب ہے جو اگر فروخت ہو جائے تو حسن تقدیر کہیے۔

(حسن اسعد صدیقی)

فطرت کے اشارے

• از ضیاء الہدیٰ
• صفحات ۲۴ • کاغذ سفید کتابت وطباعت عمدہ

یہ بھی ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے جو صرف سولہ صفحات پر مشتمل ہے اتنا دلچسپ کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس کتابچہ میں مؤلف نے خوبصورت تشبیہات کے ذریعہ حق و باطل سے متعلق کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ طرز فکر عاقلانہ، اسلوب تحریر احسن و اجمل اور لب و لہجہ انتہائی پرکشش اور دلآویز۔ کتابت وطباعت ایسی ہے کہ بس گویا کہ صورت و سیرت ہر دو اعتبار سے اہم اور خوب تر۔

البتہ جو غلطیوں سے کوئی بھی کتاب پاک نہیں ہوتی وہ غلطیاں اس میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

ص ۲ رنگین عینک، خواہش پرستی، تعصب، ہٹ دھرمی اور اپنے دائرہ فکر سے متعلق غلط اندازہ ہے۔

خدا ہی جانے مؤلف محترم کیا کہنا چاہتے ہیں ہونے کو بہت

وبہت غور کیا۔ اس جملہ کو کئی بار پڑھا۔ کافی غور تک کچھ بڑی سمجھائی کیونکہ بات سمجھ میں نہیں پڑتی۔ ممکن ہے کہ حضرت کاتب کی حرکت سے ہی کچھ الفاظ بدل گئے ہوں یا چھوٹ گئے ہوں، اسی وجہ سے جملہ مسخ ہوگیا ہو۔ بہرحال غلطی ضرور ہے مولف کے سر ڈال لئے یا بیچارے کاتب کے

ص۸ پر ایک جملہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

اس کو زندگی کی وسعتیں اور اس کے مسائل کا
حل صاف صاف دکھائی دیتے نظر آتے ہیں۔

دکھائی دیتے اور نظر آتے تو ایک ہی بات ہے تکرار کی کیا ضرورت تھی

ص۸ پر ایک جگہ یوں تحریر ہے۔

غلط نظام زندگی بھی یک وبگرے آتے رہتے ہیں۔

یک نہیں یکے ہونا چاہیے تھا۔

ص۹ پر ہے۔ روشنی اور تاریکی آپس میں گڈمڈ ہوجاتی ہے۔

ہوجاتی ہیں ہونا چاہیے تھا ——

ص۱۱۔ اس کے کیمپ سے افراد نکل نکل کر حق کے کیمپ میں آنے لگتے ہیں۔

جملہ تو یوں ہی ٹھیک ہے لیکن روانی ختم ہوگئی ہے یوں ہوتا بہتر تھا۔ افراد نکل نکل کر حق کے کیمپ میں داخل ہونے لگتے ہیں۔

اسی صفحہ پر آخری سطر میں ہے۔

حق و باطل آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں ایسا کہ...

ایسا کہ نہیں ایسے کہ ہونا چاہیے تھا۔

ص۱۲ پر :- البتہ کچھ دیر توقف کرے اور عقل پر زور دے۔

اس جملہ میں دو لفظوں کی کمی محسوس ہوتی ہے —— جملہ یوں ہونا چاہیے تھا۔

البتہ اگر وہ کچھ دیر توقف کرے۔

اسی صفحہ پر ایک جگہ ہے۔ علم کے نام پر جہالت اور جاہلیت کا۔ حرف عطف کے واسطے سے جہالت کے ساتھ جاہلیت کا استعمال غلط نہیں تو غیر موزوں ضرور ہے

ص۱۳ پر :- ہری ہوئی جنگ جاری رکھتے ہوئے

ہری ہوئی کیا ہوتا ہے ہاری ہوئی ہونا چاہیے تھا۔

صفحہ ۱۶ :- حق کون ہے باطل کون ؟

کون کا لفظ بالعموم ذی روح کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

حق کیا ہے اور باطل کیا۔ ٹھیک رہتا۔

مجموعی اعتبار سے ایک اچھی اور دلچسپ کتاب ہے کوئی تعجب نہیں اگر جلد ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔

اگر حسب خیال دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی تو مذکورہ بالا غلطیوں کی اصلاح کرلی جائے۔

غلطیوں کے ان داغوں سے پاک ہونے کے بعد کتاب کا حسن دوبالا ہوجائے گا۔

احسن احمد صدیقی

مولانا عامر عثمانی علیہ الرحمہ

از: منصف مومن مبارکپوری

ابھی تو قتلِ فیصل سے مرا دل مرغِ بسمل تھا — تصور میں ابھی وہ لاش تھی وہ دستِ قاتل تھا

ابھی طوفانِ غم اٹھتا تھا رہ رہ کر مرے دل میں — ابھی دریا میں شورش تھی ابھی پرشور ساحل تھا

ابھی تک خشک ہونے بھی نہ پایا تھا مرا دامن — کہ غمہائے مسلسل سے ابھی گریاں مرا دل تھا

وقارِ شوکتِ اسلامیاں تھا وہ ملک فیصل — کہ جس کے قتل میں اک عہدِ نو کا قتل شامل تھا

یہ صبر و شکیبائی بھی پیہم مضطربِ دل تھا — بھری محفل میں غمدیدہ یہاں ہر فردِ محفل تھا

کہ اک نابغ نظر علامہ عامر ہو گیا رخصت
جو اک مردِ جواں ہمت محقق اور فاضل تھا

قلمکار و مباحث تھا، سخن سنج و سخن داں بھی — ادیبِ بے بدل تھا عالم نقادِ کامل تھا

وہ نکتہ سنج و نکتہ رس فقیہِ عصرِ حاضر بھی — وہ جو بھی تھا وہ جیسا تھا بڑے لوگوں میں شامل تھا

وہ جو کہتا تھا اکثر ہوتی تھی تسکین مرے دل کی — وہ استدلال میں فرزانہ طرز گفتار قابل تھا

دلائل اس کی تحریریں حقائق اس کی گویائی — الٰہی بخش دے عامر کو وہ اک مردِ عادل تھا

نحیف و زار و نازک جسم تھا اسکا مگر منصف
وہ اپنے کام میں مردِ جواں فعال و کامل تھا

شہنشاہِ تحقیق ۔ نقادِ اعظم
حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب
نوّر اللہ مرقدہٗ

جائے گا۔ اگر کوئی صاحب اپنی ارسال کردہ رقم واپس منگانا چاہیں تو ہمیں واپس کر دینے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوگا۔ وہ رقم بہرحال آپ کی امانت ہے اور جب تک ان کا پرچہ چھپ کر آپ کی خدمت میں نہیں پہونچ جاتا اس وقت تک ہمیں اس رقم کو اپنے مصارف و اخراجات میں کھپا دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ایک ضروری بات یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ رمضان تک تجلی کا سالانہ چندہ بیس روپے رہے گا۔ رمضان المبارک کے بعد چوبیس [24] روپے کر دیا جائے گا۔

عام شمارہ کی قیمت اب بھی ڈھائی روپے ہے، اور رمضان کے بعد بھی ڈھائی روپے رہے گی۔ جن حضرات نے چوبیس روپے یا رسال کئے ہیں ان کی مدت خریداری ایک سال سے زیادہ قائم رہے گی ـــ وہ مطمئن رہیں۔

پیش نظر شمارہ صفحات اور مواد کے اعتبار سے عام ہی شمارہ ہے لیکن اس کی پیشانی پر ہم نے جولائی و اگست دو مہینوں کے نام ڈال دیئے ہیں۔

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ توازن درست ہو جائے گا اور جو انحلا پیدا ہو گیا تھا وہ رفع ہو جائے گا۔ اگلے شمارے انشاء اللہ ٹھیک ٹھیک وقت پر آتے رہیں گے اور مولانا کے انتقال کے بعد اشاعتوں میں جو بے قاعدگی واقع ہو گئی وہ کلیتہً ختم ہو جائے گی۔

سالانہ خریدار اطمینان رکھیں۔ ان کی خریداری کے حساب میں اس پرچہ کو ایک ہی ماہ کا پرچہ شمار کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر جن خریداروں کا چندہ اگست میں ختم ہونے والا ہے ان کے لئے یہ گیارہواں شمارہ ہوگا اور ان کے سال کا اختتام ستمبر کے شمارہ پر سمجھا جائے گا۔ اس طرح خریداروں کے حصہ میں کبھی خسارہ نہیں آئے گا اور اشاعتوں میں گڑبڑ بھی پیدا نہیں ہوگی۔

اس ماہ سے دو مستقل عنوان "دستک" اور "توجہ طلب" کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ پچھلے تمام مستقل عنوانات باقی رہیں گے نیز انشاء اللہ تفہیم الحدیث کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں آپ کی دلچسپی باقی رکھنے کے لئے اور بھی کئی پروگرام پیش نظر اور زیر غور ہیں۔ حالات پر قابو پاتے ہی آپ کو ان پروگراموں سے روشناس کرایا جائے گا اور اس طرح اس رشتہ اور بندھن کو اور زیادہ مضبوط بنانے کی [illegible] کی جائے گی جو آپ کے اور ہمارے درمیان قائم ہے تاکہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکیں ـــ اور [illegible] تعلق ہمیشہ باقی رہے۔

اس شمارے میں آپ [illegible] لٹریچر کو بھی ملاحظہ کریں گے اور انشاء اللہ ہمیشہ ان کے پرلطف اور مزیدار مضامین سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔

اس ماہ جن حضرات کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے ان سے مؤدبانہ اور برادرانہ گزارش ہے کہ وہ فوراً سالانہ چندہ ارسال فرمائیں اور تجلی سے اپنا واسطہ باقی رکھیں۔

تجلی اور مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تجلی بند ہو جائے۔ دفتر تجلی میں تالے پڑ جائیں یہ وقت بڑا نازک ہے۔ اس وقت کے ہر لمحہ کو مدت امتحان سمجھئے اور کوئی ایسا قدم مت اٹھائیے جو آپ کے لئے تو مفید ہو لیکن تجلی کے لئے غیر مفید۔ اس وقت ہمیں چوکنا اور مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔

یعنی کہ:-

ہواؤں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں
مرے دوستو! دیپ بجھنے نہ پائے

قارئین توجہ فرمائیں

تجلی کی ڈاک میں ایک کاپی کے صفحات کے نمبر غلط ڈل گئے ہیں۔ قارئین کو تھوڑی سی زحمت تو ہوگی لیکن از راہ کرم مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ تجلی کی ڈاک کا مطالعہ فرمائیں۔ [illegible]

[illegible] ۱۲۸-۱۲۷-۵۰-۱۲۹-۱۲۲-۴۴

آغازِ سخن

حسن احمد صدیقی

آج کی صحبت میں ہم آپ کی ملاقات ایک ایسے صوفی سے کرا رہے ہیں جو کام کے نہیں صرف نام کے صوفی ہیں. تصوف سے انہیں کوئی واسطہ نہیں بلکہ دور کی وہ نسبت بھی نہیں جو ذرہ کو سورج سے اور قطرۂ شبنم کو سمندر سے ہوا کرتی ہے :-

"ان کا شبھ نام صوفی نذیر احمد کشمیری ہے"

تادمِ تحریر یہ تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ لفظ صوفی کس مرض کی دوا ہے. ممکن ہے کہ برائے فیشن اس لفظ کی فٹنگ کی جاتی ہو. یہ بھی ممکن ہے کہ صوفی بننے کا ارادہ ہو. اور ارادہ چونکہ پختہ اور محکم ہوگا اس لئے پہلے ہی سے صوفی لکھنے کی مستقل زحمت گوارہ کر لی گئی ہو.

امکان اس بات کا بھی ہے کہ یہ خطاب کی حیثیت رکھتا ہو اور خطاب بھی سسرالی جو کسی خاص موقعہ پر برائے تحفہ اور تبرکاً یادگار صوفی صاحب کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا گیا ہو.

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نذیر صاحب کو اپنے نام سے لفظ صوفی فٹ کرنے کا پیدائشی حق حاصل ہو. اگر ان کے والدِ محترم صحیح کے صوفی تھے تو پھر نذیر صاحب کا تخلص صوفی لکھنا گناہ صغیرہ تک نہیں بلکہ انہیں صوفی تصور نہ کرنا کبیرہ گناہ ہے

اور شاید تصوف کی بھرپور توہین.

بہرحال اس بارے میں ہماری تحقیق صفر کے برابر ہے اس لئے متیقن طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ لفظ صوفی کے پیچھے کونسی حقیقت یا ڈرامہ منہ چھپائے بیٹھا ہے.

پچھلے دنوں صوفی صاحب کے مختلف مضامین ہماری نظروں سے گزرے انہیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ صوفی نذیر صاحب ہندوستان کا کوئی بہت بڑا عجوبہ ہی نہیں بلکہ عجائب خانہ کہئے. محاورے کا سہارا لیکر چڑیا گھر بھی کہا جا سکتا ہے.

آپ یہ مت سمجھئے کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں نہیں، ہرگز نہیں، بالکل نہیں. غلط بیانی کا نہ میں قائل ہوں نہ تحمل. زندگی میں کبھی کسی کے بارے میں کوئی ایسا مضمون شائع نہیں ہوا جس کے لفظ لفظ میں حقیقت کا انعکاس نہ ہو. جس میں سچائی نہ ہو. صداقت کی خوشبو نہ ہو.

صوفی صاحب کہیں تو شیر کی طرح غرانے لگتے ہیں اور کہیں بھیگی بلی جیسی معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہیں. کہیں لومڑی کی سی چالاکی دکھلاتے ہیں کہیں الو کی طرح کھلی حماقت اور جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہیں ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہیں اور کہیں کوئل کی طرح شستگی اور ترنم اور مسحور کن لہجے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں.

بقیہ بر صفحہ

مولانا عامر عثمانی مرحوم

باہمی محبت و اخوت

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال :- والذی نفسی بیده لا تدخلوا الجنة حتی تسلموا ولا تسلموا حتی تحابوا افشوا السلام تحابوا۔ وایاکم والبغضة فانها هی الحالقة لا اقول لکم تحلق الشعر ولکن تحلق الدین (اخرجه مسلم وابو داؤد وابن ماجه والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ :-

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم بہشت میں نہ جا سکو گے جب تک مسلمان نہیں ہو گے اور مسلمان اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت و اخوت نہ بڑھاؤ اور سلام کو رواج نہ دو۔ آپس میں محبت کرو اور بغض سے بچو کہ بغض مونڈنے والا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ سر کو مونڈتا ہے بلکہ وہ دین کو مونڈتا ہے۔"

تفہیم :- سب سے پہلے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا چاہئے جسے ہم اپنی تحریروں میں پہلے بھی صراحت کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی بہت سے محاورات ہیں جن کا مفہوم لغت، صرف و نحو اور منطق کے ذریعہ نہیں نکالا جاتا بلکہ محاورات ہی کے اعتبار سے متعین کیا جاتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے بہت لوگ گمراہ ہوئے۔

یہ تنبیہ یہاں اس لئے ضروری ہوئی کہ حدیث بالا میں بھی اللہ کے رسول نے [illegible] کا استعمال فرمایا ہے [illegible] محاورہ ہے کہ [illegible] یعنی خیال [illegible] ہیں:-

"انسان وہ ہے جو مصیبت زدوں کے کام آئے"

یہاں پر ہم نے لفظ انسان بولا جو لغوی کلی ہے۔ اگر محاورے کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ جو لوگ مصیبت زدوں کے کام نہیں آتے وہ نوع انسانی سے خارج ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ مطلب غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ ہمارا منشاء تو اس قول سے یہ ہوتا ہے کہ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے [illegible] انسان [illegible] مذمت [illegible] انسان کامل [illegible] مصیبت زدوں [illegible]

نہیں پا سکا تھا کہ ایک بھی ایک اور مجاہد تقریباً دم توڑتے
نظر آئے۔ ہشام نے مجھے ان کی خبر گیری کا اشارہ کیا اور
میں وہاں پہنچا۔ مگر اتنے ہی میں وہ واصل بحق ہو گئے۔ اب
میں تیزی سے ہشام کے پاس لوٹا مگر یہ بھی اسی طرح اپنے
رب سے جا ملے تھے۔ دوڑ کر اپنے بھائی کے پاس آیا مگر آہ
ان کے ہونٹوں پر بھی ہمیشہ کے لئے مہر سکوت لگ
چکی تھی۔

دیکھا آپ نے۔ یہ تھی محبت و اخوت۔ یہ تھا وہ جذبۂ
دوستی جس نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو واقعی ایک ہی جسم
کے مختلف اعضاء کی حیثیت دیدی تھی۔ یہ کوئی مافوق الفطرت
معجزہ نہیں ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک ماں آج بھی
اپنی بھوک پر اولاد کی بھوک اور اپنے راحت و آرام کو ترجیح
دیتی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک باپ اپنے بچے کے
منہ میں لقمہ دیکر اس سے زیادہ لذت و آسودگی محسوس
کرتا ہے جتنی وہ اس لقمہ کو اپنے منہ میں دیکر کرتا ہے۔
یہ خون کے اشتراک کا نتیجہ ہے عین فطرت کے مطابق
—— ہر وقت کا مشاہدہ —— صحابہ نے شدت تعلق
کے اسی ثمرے کو عقیدہ و فکر کے گہرے اتحاد سے حاصل
کیا تھا، یہ اتحاد اتنا مضبوط اور عمیق تھا کہ خون کے رشتے
بھی ان کے آگے ماند پڑ گئے۔ آپ کو معلوم ہے صحابہ کے
معاملہ میں یہ اتحاد باپ کے پیار اور ماں کی ممتا پر بھی
بازی لے گیا تھا۔ حق یہی ہے کہ دینی تعلق کے سامنے
کوئی رشتہ رشتہ نہیں۔ محبت اور نفرت، صلح اور
جنگ، دوستی اور دشمنی سب کا محور یہی تعلق ہونا چاہئے
اللہ کے رسول نے فرمایا من احب للہ وابغض للہ
واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان
(جس نے اللہ ہی کے لئے محبت اور اللہ ہی کے لئے بغض
کیا اور اللہ ہی کے لئے دیا اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

رشتہ اور ہر مفاد سے بلند تر ہے کہ کسی شخص یا گروہ سے اسلئے
محبت کی جائے کہ وہ ہماری طرح دین حق کا پرستار
اللہ اور رسول کا مطیع اور [illegible] ہمارا بھائی ہے تو اس کا
نام الحب للہ و اللہ کے لئے محبت کرنا ہے۔ اور جب
کوئی فرد یا گروہ اللہ اور رسول کا باغی بن جاتا ہے یا دعوۂ
اسلام کرتے ہوئے اسلام دشمن نظریات کو عملی
و فکری طور پر قبول کر لیتا ہے تو اس سے بغض رکھنا
البغض للہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث باب میں جس بغض
سے روکا گیا ہے وہ ایسا بغض ہے جس کی بنیاد دنیاوی
اغراض و مقاصد، حسد، جذبۂ مسابقت، سوء ظن اور اسی
نوع کے کسی مفسدے پر رکھی گئی ہو۔ رہا وہ بغض جو اللہ کی
خاطر ہو وہ تو نہ صرف محبوب و مستحسن ہے بلکہ اس کا نہ ہونا
ایمان کی کمزوری اور دین سے بے تعلقی کی علامت ہے
اللہ جل شانہ نے جہاں رسول اللہ اور ان کے صحابہؓ کی یہ
خصوصیت بیان کی رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (آپس میں رحم و
مروت کا برتاؤ کرنے والے) وہیں اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ
بھی بیان کی۔ یعنی صداقتوں سے انکار اور اطاعت الٰہی سے
گریز کرنے والوں کے بالمقابل سخت گیر و سخت کوش ہے
بالکل بدیہی بات ہے کہ جسے خیر و صلاح سے جتنی زیادہ
محبت ہوگی فتنہ و شر سے اتنی ہی عداوت بھی ہوگی۔ تاریکی
اور روشنی کا معاملہ ہے۔ ہاں یہ پہلو بہرحال ملحوظ رکھنا
چاہئے کہ بغض و عداوت کا اصل نشانہ کفر و ظلم، فسق
کا فرد و ذریعہ کی ذات نہیں۔ ذات میں اگر کفر و ظلم و فسق
رچ بس جائے کہ اسے ذات سے علیحدہ کرنا ممکن
نہ ہو تب تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہماری عداوت و
نفرت کا رد عمل ذات سے بھی متعلق ہو لیکن جب تک
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بڑھتا رہتا ہے۔

متذکرہ حدیث میں باہم سلام کو رواج دینا، آپس کی محبت کے لئے ایک ضروری وسیلے کے طور پر پیش فرمایا گیا یعنی یہ جو کہا گیا کہ تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت و اخوت نہ بڑھاؤ اور باسلام کو رواج دو۔ اس میں اصل مقصد کی حیثیت محبت و اخوت کو حاصل ہے اور سلام اس کا وسیلہ ہے۔ وسیلے کے علاوہ وہ مظہر اور آئینہ بھی ہے دلی ربط و ضبط کا۔

"سلام" کے موضوع پر ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں یہاں بس یہی بات دہرا دینی کافی ہوگی کہ مسلمانوں کا ایک دوسرے کو سلام کرنا محض ایک تہذیبی رسم نہیں ہے بلکہ اسے ادبِ شرعی اور فریضۂ دینی کی حیثیت بھی حاصل ہے —— بدقسمتی سے بعض دوسرے امور خیر کی طرح سلام کا رواج بھی مسلمانوں میں کم ہو گیا ہے اور کم ہونا ہی چاہئے تھا۔ جب خدا اور رسولؐ سے تعلق کم ہوگا تو ان کی تعلیمات سے بھی رشتہ ٹوٹتا چلا جائے گا۔ دلوں میں دینی رشتے کی اہمیت کا احساس نہ رہا تو ملی اخوت و محبت کہاں سے آئے۔ جن حلقوں میں اب تک سلام باقی ہے وہاں بھی زیادہ تر دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کا اصلی پس منظر غائب ہے یعنی دل سے نہیں محض حلقوم سے آواز ابھرتی ہے اور اس بے نہایت معنویت کا ادنیٰ سا احساس بھی قلوب میں نہیں پایا جاتا جو السلام علیکم کے مختصر الفاظ میں دریا بکوزہ کے مصداق سمائی ہوئی ہے۔ ذرا سوچئے تو سلامتی کی دعا کتنی ہمہ گیر دعا ہے۔ ہر نعمت اس میں شامل ہو گئی اور ہر زحمت خارج ہو گئی۔ سلامتی یعنی مکمل بلائے مراد سے دامن کا بھر جانا اور ہر حزن و ملال کا دور ہو جانا۔ دل سے اگر السلام علیکم نکل جائے تو بہترین دعا ہے کہ ہم کتنے بھی بڑی بڑی دعائیں دیں کسی کو اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ بصیرت کی آنکھ اگر کھلی ہوئی ہو تو اسلامی تعلیمات کی یہ جزوی چیزیں ہی آدمی کو اس حقیقت تک پہنچانے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ اسلام کتنی عجیب چیز ہے۔ ایک ایک کلمے میں مطالب کے دفتر سمو دیا اور ایک ایک لفظ میں صداقتوں کے انبار سمیٹ دیا۔ ظلوم و جہول انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کے ذریعے ایسے الفاظ دنیا کو دیئے جو ایجاز و جامعیت کے حیرتناک نمونے ہیں۔ سلام کا رواج دنیا کی تمام قابلِ ذکر اقوام میں ہے۔ ایک ایک کرکے جائزہ لے ڈالئے کہ کون کیا الفاظ استعمال کرتا ہے انشاء اللہ کہیں یہ جامعیت، یہ یکتائی اور ہمہ گیری نہیں پائیں گے جو السلام علیکم کے ننھے سے فقرے میں ہے والحمد للہ رب العالمین۔

ولٰکن تحلق الدین

تمثیل دنیا کی ہر زبان میں تفہیم مراد کا بہترین ذریعہ سمجھی گئی ہے۔ قرآن اور احادیث بھی امثلہ سے معمور ہیں۔ آپس کا شقاق و افتراق کس بری طرح دین کا صفایا کرتا ہے اس کی تمثیل حضورؐ نے مونڈنے سے پیش کی۔ سر پہ استرا پھر جائے تو بالوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں باہم بغض و منافرت پیدا ہو جائے تو دین کی صفائی ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ سبق بھی ملا کہ کچھ مسلمانوں کا نماز روزہ ادا کرتے رہنا اور جزوی طور پر اسلامی تہذیب اختیار کئے رکھنا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ ان میں واقعۃً دین موجود ہے۔ آج ہم مسلمانوں کا باہمی شقاق و نفاق کس منزل میں پہنچا ہوا ہے کسی سے مخفی نہیں۔ اگر حضورؐ کا ارشاد غلط نہیں ہو سکتا تو ماننا پڑے گا کہ دین مونڈا جا چکا۔ پھر یہ ہمارے نماز روزے، یہ مسجدیں، یہ مدرسے۔ یہ مذہبی جھگڑے اور تفرقے، یہ دینی لٹریچر، یہ تلاوتِ قرآن، یہ درود و سلام، یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ دین نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے نزدیک جس جامع، واضح، بسیط و بیکراں اور محکم حقیقت پر لفظ دین کا بھرپور اطلاق ہوتا ہے۔ وہ تو حقیقتاً ملت کے درمیان سے اٹھ چکا۔ جو کچھ رہ گیا ہے ان کی حیثیت حضرات سے مل کر بنتی ہے تو صرف پانچ صفات دین کے [illegible]

جوارش جالینوس نہیں کہہ سکیں گے۔ حکیم جو نسخہ لکھ دے اسے پورا پورا استعمال کیجیے جب تو ٹھیک لیکن اس میں سے کچھ دوائیں لے کر باقی نظر انداز کر دیجیے تو یہ کہنا مذاق ہی ہوگا کہ ہم نے فلاں حکیم کا نسخہ استعمال کیا۔ ٹھیک یہی معاملہ دین کا ہے۔ دین صرف نماز روزے، درود و سلام، صرف تلاوت، صرف داڑھی اور تسبیح کا نام نہیں۔ یہ چیزیں اس کا جزو ضرور ہیں مگر کل نہیں۔ کل دین تو یہ ہے کہ مسلمان بلوغ سے لے کر مرتے دم تک زندگی کے ہر شعبے، ہر مرحلے ہر گوشے میں صرف اور صرف اسلام کا وفادار ہو۔ لڑے تو اسلام کے لئے لڑے۔ مصالحت کرے تو اسلام کے لئے کرے۔ معیشت، اقتصاد، سیاست، تجارت، رہن سہن، ملازمت، گھریلو زندگی۔ سبھی منازلِ حیات میں اس کے رد و قبول کا معیار صرف اسلام ہو۔ اس کی انا ایک قطرۂ بے مقدار کی طرح ذاتِ واجب الوجود کے سمندر میں گم ہو چکی ہو۔ وہ اپنے رب کے آگے ایسا غلام بن جائے جسے سمعنا و اطعنا کے سوا کچھ آتا ہی نہ ہو۔ جو صرف زبان سے نہیں، دل اور روح کے ساز سے یہ جاں نواز نغمہ بلند کرے إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ (بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری پوری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے۔ وہ اللہ جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے) یہ ہے دین کامل اور یہ ہے وہ نسخۂ شفا جو اسلام کے نام سے اللہ رب العزت نے بندوں کو عطا کیا ہے، اب ہم نابکار بیمار اس نسخہ کے کچھ اجزاء تو لے لیں اور کچھ کو چھوڑ دیں تو یہ کہنا لایعنی ہوگا کہ ہم حکیم مطلق اللہ جل جلالہ و عم نوالہ کا نسخۂ شفا استعمال کر رہے ہیں۔ ہماری پوزیشن تو ان بعض لوگوں کی سی ہوگی جنہیں اللہ تعالیٰ نے ڈانٹا ہے کہ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو) بے شک عقیدۃً ہم سب پورے ہی قرآن اور تمام ہی صحیح احادیث پر ایمان رکھتے ہیں اس لحاظ سے ایمان تو قرار

نہیں پا سکتے کہ ایمان عقیدے کا نام ہے عمل کا نہیں لیکن عقائد کا مظہر اعمال ہی ہوتے ہیں اور اعمال کے اعتبار سے اگر ہم دین کے بعض حصوں کے تارک ہیں تو ہمارا دین ظاہر اور جسم کے اعتبار سے ختم ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کے ایک ہی ورق کا منکر مکمل طور پر کافر ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ ادھ کچرا کافر قرار پائے۔ اسی طرح دین کے بعض حصوں کو دائرۂ عمل سے خارج کر دینے والے جسمانی اعتبار سے مردہ ہی کہلائیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ روح جسم سے نکل جائے تو آدمی مردہ کہلاتا ہے۔ روح نہیں مری مگر جسم سے اس کا تعلق ختم ہو گیا تو موت کا فتویٰ برحق ہوا۔ اسی طرح عقائد کی حیثیت روح کی ہے اور اعمال بمنزلہ جسم ہیں۔ عقائد ہمارے کافرانہ ہوں مگر اعمال سے ان عقائد کا تعلق مضبوط نہ ہو تو اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ روح باقی ہے جسم ختم ہوا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے تمثیل میں "مونڈنے" کو پیش فرمایا ہے۔ ظاہر ہے مونڈنے میں بالوں ہی کا صفایا ہوتا ہے۔ ان کی جڑوں اور ان کیمیاوی عناصر کا صفایا نہیں ہوتا جن سے بال اُگتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے درمیان سے دین اٹھ گیا۔ اگرچہ عقائد کی جڑیں اور اعمالِ خیر کی صلاحیتیں بدستور موجود ہیں۔ دین موجود ہو اور ملتِ مسلمہ کفار سے مغلوب ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ چند افراد و اشخاص کی دینداری مسلّم مگر دیکھنا تو پوری امت کی مجموعی حالت کا ہے۔ غلبہ دین کا ہوگا تو سو پچاس صلحاء و زہاد کی موجودگی اور معاشرے کی بچی کچی دینداری اس المناک فیصلے کو مسترد نہیں کر سکے گی کہ قوم مجموعی طور پر دین کا خاتمہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کا وعدہ ہم پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

من حیث المجموع امت پر مومنین کا اطلاق ہو اور اعلیٰ پھر وہ سربلند نہ ہوں یہ کیونکر ہو سکتا ہے [illegible]

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ایک بہت بڑے بزرگ کا واقعہ مطالعہ میں آیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "سلام" کی غیر معمولی معنویت اور جامعیت نافعہ کے فہم میں ہم نے غلطی نہیں کی۔ جی چاہتا ہے آپ بھی اس واقعہ کو سنیں۔

تقریباً ساٹھ سال قبل ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ ان کی عالی مقامی کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے اساطین علم و زہد ان سے بیعت تھے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں مسلمان بستے ہوں اور کوئی نہ کوئی مرید آپ کا نہ ہو۔ دراصل آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور فریضۂ حج کے قربان جائیے کہ مسلمانوں کی کوئی آبادی ایسی نہیں جہاں سے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مکہ مکرمہ نہ پہنچتا ہو۔

ایک بندہ گوار شاہِ قسطنطنیہ کے خواص میں تھے انھوں نے حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ سلطان المعظم بہت عادل بادشاہ ہیں، آپ پسند کریں تو میں آپ سے ان کا تعلق قائم کردوں۔ حاجی صاحب نے جواب دیا۔

"بھائی اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ میرے معتقد ہو جائیں اور پھر وہی ہو جو آپ کے ساتھ ہوا ہے یعنی مجھے یاد کیجیں۔ مجھ کو جانا پڑے گا۔ بیت السلطان کا قرب ہوگا بیت اللہ سے بعد ہوگا۔ آپ تعریف کرتے ہیں کہ وہ سلطانِ عادل ہیں، اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطانِ عادل کی دعا مقبول ہوتی ہے اگر آپ سے ممکن ہو تو ان سے میرے لئے دعا کرا دیجئے ۔۔۔ لیکن یہ امر آدابِ سلطنت کے خلاف ہے کہ بادشاہ سے کسی درویش کے لئے دعا کو کہا جائے۔ مناسب یہ ہوگا کہ آپ ان سے میرا سلام عرض کردیں۔ وہ جواب میں وعلیکم السلام فرمائیں گے، بس یہ دعا میرے لئے کافی ہے"

یہ چھوٹا سا واقعہ اس توضیح میں بالکل کافی ہے کہ الفاظ کی روح اور معانی مطلوب تک پہونچ جانے والی نظروں میں "السلام علیکم" کی کیا قدر و قیمت ہے۔

مولانا عامر عثمانی
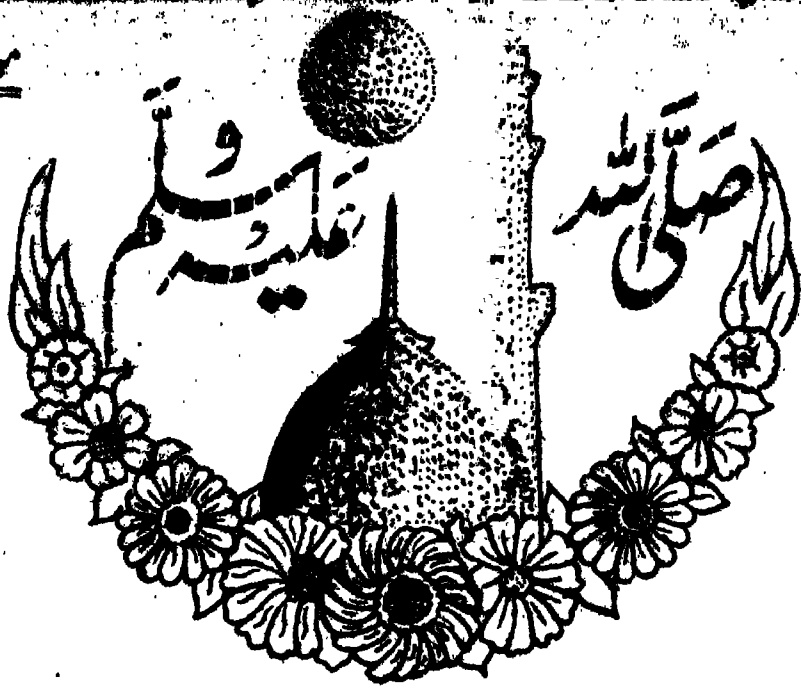
اے کہ تو وادیٔ ظلمت میں ہے مینارۂ نور — میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مرا آئینہ — ہو چکا میرے ہی اوہام کی بوچھار سے چور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مری دنیا میں — روشنی کی نہیں کوئی بھی کرن پاس نہ دور
تحفۂ نعت بھی لاؤں تو کہاں سے لاؤں — زہد سے پاک نہ سینہ، نہ تخیل نہ شعور

اے کہ ٹوٹا ہے ترے فقر سے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

صرف الفاظ کے موتی ہیں مرے دامن میں — ہے مگر تیری محبت کا تقاضا کچھ اور
صرف ایمان کے دعوے ہیں مرے ہونٹوں پر — ہے مگر تیری اطاعت کا تقاضا کچھ اور
ہیں مرے شوق کی معراج درود اور سلام — ہے مگر تیری شریعت کا تقاضا کچھ اور
دل عقیدت کی تب و تاب سے خالی تو نہیں — ہے مگر عشق کی غیرت کا تقاضا کچھ اور

نہ غلامی کا سلیقہ ہے نہ جینے کا شعور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں نے تجھ سے کبھی پیمانِ وفا باندھا تھا ۔۔۔ وہ مگر قصۂ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
بجھ گئی شمعِ جنوں سرد ہوا سوزِ یقیں ۔۔۔ موجِ عصیاں کے تھپیڑوں سے بچا کچھ بھی نہیں
یاد تو آج بھی ہے نعرۂ تکبیر کی گونج ۔۔۔ ایسی یادوں کا مگر ذکر ہی کیا کچھ بھی نہیں
جنسِ اخلاص کو طوفانِ ہوس لے ڈوبا ۔۔۔ اب کوئی قول و قسم، عہدِ وفا کچھ بھی نہیں

میری نظروں سے ہوئی اپنی حقیقت مستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

ہر نئے قرن میں دل اور زباں کے مابین ۔۔۔ فاصلے اور بڑھے، اور بڑھے، اور بڑھے
حسنِ کردار کی پونجی تو گھٹی روز بروز ۔۔۔ جن سے سرکارؐ نے روکا تھا وہی طور بڑھے
اب مرے ہاتھ میں نیزہ ہے نہ تلوار نہ ڈھال ۔۔۔ کیوں نہ پھر اہلِ ستم کا ستم و جور بڑھے
میں تو اک جامِ سفالیں کا بھی حقدار نہیں ۔۔۔ کس لئے میری طرف ساغرِ بلّور بڑھے

خونِ انصاف مشیّت کا نہیں ہے دستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا ۔۔۔ اپنی تاریخ کو خود قتل کیا ہے میں نے
تو نے جس زہر سے بچنے کی ہدایت کی تھی ۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے وہی زہر پیا ہے میں نے
دل کی دنیا ہے تصاویرِ بتاں سے آباد ۔۔۔ صرف ہونٹوں سے ترا نام لیا ہے میں نے
کھا چکی زنگ مرے ذوقِ عمل کی شمشیر ۔۔۔ راستہ خود ہی تباہی کو دیا ہے میں نے

نہ مقدّر کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
اے کہ تو وادیِ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

٭ ٭ ٭

آپ تو [illegible] سمجھیے گا کیا ایسا ادبی شہ پارہ عجائب گھر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیا اس کی حیثیت کسی عجوبۂ روزگار سے کم ہے!

ممکن ہے آپ نے کبھی صوفی صاحب کی ان تحریروں کی زیارت نہ کی ہو جو کسی رسالہ یا اخبار میں دردِ سر کا پیغام لے کر آتی ہیں اور ان گنت ناظرین کیلئے موجب درد و تکلیف بن کر رہ جاتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہماری برادرانہ گذارش ہے کہ صوفی نذیر احمد کی تحریروں کی زیارت ضرور کریں تاکہ تھوڑی بہت دردِ سری کا لطف اٹھانے کے بعد آپ کو یہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی تحریریں واقعتاً اس لائق ہیں کہ ان کی زیارت باقاعدہ اور باہتمام اسی طرح کی جائے جس طرح دلی کے شاہی کھنڈرات کی زیارت کی جاتی ہے۔ یا جس طرح پاگل خانہ کی دیواروں کو تکا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ان کا ایک مضمون ہفت روزہ ترجمان میں شائع ہوا۔ یہ اہلِ حدیث کا پرچہ ہے اپنے مسلک کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے اہلِ حدیث حضرات نے اس کا اجرا کیا تھا پرچہ میں بعض مضامین کام کے بھی ہوتے ہیں خصوصاً اداریہ اس لائق ہوتا ہے کہ اسے پڑھ لیا جائے۔ لیکن کبھی کبھی اس میں ایسے بھونڈے اور کھوکھلے مضامین بھی چھاپ دیئے جاتے ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ جھنجھلاہٹ بھی ہوتی ہے اور اہلِ حدیث حضرات پر رحم بھی آتا ہے کہ انھوں نے یہ بیہودہ مضمون شائع کر کے اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ اپنے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔ اپنی ثقاہت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

بہرحال اسی ترجمان میں صوفی صاحب کا شاہکار جلوہ گر ہوا عنوان سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مضمون ایک خاص آدمی کے خلاف ہے۔ اس خاص آدمی سے ہمیں کوئی دلچسپی ہے یا نہیں یا ہم اس خاص شخصیت کا دفاع کرنا چاہتے ہیں یا نہیں یا اس کی [illegible] دفاع نہیں کرنا چاہتے یا نہیں؟ یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے اور صفحات کی تنگی [illegible] لیکن ان کے

بعض اعتقادی اور ایمانی جملے ایسے بھی نظر سے گذرے جن سے عقائد پر زد پڑتی ہے۔ ان کے اس علمی افلاس سے کم پڑھے لکھے اور ناواقف عوام کے دماغوں میں ضلالت گمراہی کی تاریکیاں داخل ہو سکتی ہیں۔

صوفی صاحب کا یہ مضمون ترجمان کے دو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے طویل کہنا غلط ہوگا۔ مختصر کہنا بھی اگر غلط ہو تو متوسط کہہ لیجئے۔ بہرحال طویل کسی صورت میں نہیں کہا جا سکتا۔

قارئین کو حیرت ہوگی کہ صوفی نذیر صاحب کے اس انتہائی محدود اور متوسط مضمون میں جو صرف دو صفحوں پر مشتمل ہے ہم نے ستر جگہ نشانات لگائے ہیں۔ ان نشان زدہ جملوں پر مکمل کر تنقید کی جا سکتی ہے بلکہ یہ جملے از خود بزبانِ حال چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم پر نقد کیا جائے۔ ہماری اصلاح کی طرف توجہ نہ دینا ہمارے ساتھ ظلم ہے، ناانصافی ہے اور ہمارے خالق شری صوفی نذیر صاحب کے حق میں دشمنی اور بدخواہی کے مرادف ہے۔

ان ستر مقامات پر صوفی صاحب کا قلم ایسی ایسی قلابازیاں کھاتا ہے کہ تحیر بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ اب بیچارہ قلم کیسے کیسے نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ گیا ہے۔

قابلِ ماتم بات ہے کہ جو لوگ علمی اعتبار سے کسی بھی حیثیت کے حامل نہیں ہوتے۔ جن میں بات سمجھنے کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی۔ جو تعلیماتِ اسلامی کا مفہوم و مقصد تک نہیں سمجھ پاتے وہ خود کو ابنِ تیمیہ [illegible] سمجھتے ہیں۔ نہ جانے [illegible] گمان کرتے ہیں۔

نازک موضوعات پر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ [illegible] لکھتے ہیں۔ اور انھیں چھپوا کر اپنی [illegible] یا بانگِ دہل پھیلاتے ہیں اور [illegible] دلیل خود ہی فراہم کر دیتے ہیں۔

نشان زدہ فقروں میں بعض غلطیاں [illegible]

متعلق ہیں۔ بعض [illegible] انتشار سے اور بعض عقل و فہم سے تمام خط کشیدہ جملوں پر تنقید و تبصرہ غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ سب جملوں پر گفتگو کرنا قارئین کے لئے بھی وجہ کوفت ہوگا اور خود لکھنے والا بھی خواہ مخواہ دردسری مول لے گا۔

مقصد تو پورا ہو ہی جائے گا ــــ جس طرح مٹھی بھر چاول پوری پوری اور پوری دیگ کی صحیح پوزیشن اور اصلیت ظاہر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ چند نمونے صوفی صاحب کے پورے مضمون کی حیثیت اور حقیقت کو واضح کر دیں گے ــ اور قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ صوفی صاحب کا یہ مضمون جاہل اور کم علم سادہ مسلمانوں کیلئے روح افزا نہیں زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی عرض کر دیں کہ ہمیں صوفی نذیر صاحب سے ذاتی پرخاش نہیں، کوئی عناد اور تعصب نہیں ــ کوئی بغض نہیں۔

تنقید کرنے کا مقصد فقط یہ ہے کہ صوفی نذیر صاحب آئندہ اتنی فاش اور موٹی موٹی غلطیوں کا مظاہرہ نہ کریں لکھتے وقت محتاط رہیں۔ عدم واقفیت یا جوشِ تحریر کی وجہ سے ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہ کریں جو عقیدے کے طور پر فاجر کی حیثیت رکھتی ہیں اور علم و فہم کے رخسار و دل پر [illegible]۔

صوفی نذیر صاحب نے اپنے مضمون میں "کتاب دین" کا لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ بالکل نئی اصطلاح ہے ہمیں اس اصطلاح پر سخت اعتراض ہے۔ اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ دین صرف قرآن حکیم کا نام نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم [illegible] احادیث کو دین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کتنے [illegible] قرآن میں کہیں نظر نہیں آتے لیکن [illegible] احادیث [illegible] کی وجہ سے انہیں [illegible] [illegible] سمجھا گیا ہے۔

[illegible] قرآن حکیم کو کتاب دین کا خطاب دیا جائے تو یہ خطاب احادیث رسولؐ کے حق میں زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس خطاب سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دین اکمالی اور تکمیلی انداز میں قرآن میں سمایا ہوا ہے۔ احادیث کی حیثیت محض زوائد کی ہے۔ یا نعوذ باللہ احادیث دین کا حصہ ہیں ہی نہیں۔

کس قدر گمراہ کن خیال ہے، کیسی مہمل بات ہے۔ اگر صوفی صاحب کتاب دین کے ساتھ "اور احادیث رسولؐ" بڑھا دیتے تو پھر کسی قسم کے شبہ اور اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ یا اگر وہ "کتب دین" تحریر فرماتے تو اعتراضات جنم نہیں لے سکتے تھے۔ اس صورت میں یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ انہوں نے کتب یعنی کتاب کی جمع تحریر کر کے قرآن اور احادیث کی کتابیں مراد لی ہیں۔ اگر قرآن کو کلام الہی کتاب اللہ، کتاب مبین کہتے ہوئے دقیانوسیت محسوس ہو رہی تھی تو دین کی بنیادی کتاب کہہ کر اپنی جدت پسندی کا اظہار کر دیا جاتا۔

بہر حال کتاب دین کی اصطلاح ایک غلط اصطلاح ہے جو بعض کم فکروں کو گمراہی کے اندر بھی مبتلا کر سکتی ہے۔

ایک جگہ وہ یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:ــ

"اس مختصر بیان کے بعد صدمہ کی چاروں دینی اصطلاحوں کے حقیقی معنی عرض کئے جاتے ہیں تاکہ ایک اوسط درجہ کا مذہبی انسان دہریت کے خطرناک حملہ آوروں کے شر سے بھی اور بد خلقی تخریب کار وں اور تفرقہ و انتشار پھیلانے والوں سے بھی اپنے دین کو محفوظ کر سکے"۔

خدا جانے لفظ صدمہ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ پچھلی عبارتوں میں کہیں صدمہ نام کی کسی چیز کا ذکر موجود نہیں ہے اور جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے آپ پڑھئے اور بار بار پڑھئے انشاء اللہ آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ صدمہ سے کیا چیز مراد لی گئی ہے۔ کوئی کتاب ہے یا کسی کتاب کے مصنف کا نام کسی جلسے یا مجلس کے صدر کی طرف [illegible] یا کسی عقیدہ کی طرف۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مضمون قلم [illegible] صوفی

ناظر صاحب کے ذہن مبارک میں کیا چیز تھی جسے انہوں نے لفظ مذکورہ سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری قابل گرفت بات یہ ہے کہ انھوں نے اوسط درجہ کے مذہبی انسان کا جملہ بول کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھیں ادنیٰ درجہ کے مذہبی لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے بگڑنے سنورنے کا کوئی احساس نہیں۔ ان کے انجام و عافیت کی کوئی پرواہ نہیں۔

اعلیٰ درجہ کے مذہبی انسانوں کو نظرانداز کرنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ خود صوفی ناظر جیسے لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں۔ انھیں قطعًا احتیاج نہیں کہ وہ صوفی صاحب کے زمودات پڑھیں اور ان سے استفادہ کر کے اپنے دین کی نوک پلک درست کریں۔ اپنی عاقبت سنواریں۔ لیکن ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو پس انداز کرنے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر مسلمانوں میں جو تیسرے درجہ کے لوگ ہیں انہوں نے کیا قصور کیا ہے۔ کیا وہ اس بات کے مستحق نہیں کہ انھیں گمراہی سے نکال کر حق کی روشنی دی جائے۔ انھیں صحیح دین سے روشناس کرایا جائے اور انھیں کچھ ایسے حربے اور طریقے بتلائے جائیں جن کی آڑ لے کر وہ خارجی اور داخلی حملوں سے اپنا تحفظ کر سکیں۔ اپنے دین کو بچا سکیں جو ان کے لئے نجات کا پہلا اور آخری ذریعہ ہے۔

تیسری قابل تنقید بات یہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ عبارت میں مسلمان اور مومن کی بجائے مذہبی انسان کا لفظ تحریر کیا شاید وہ اس بات سے واقف نہیں کہ مذہبی انسان کا اطلاق تو یہودیوں، عیسائیوں، سکھوں پر بھی ہوتا ہے اور ان کفار و مشرکین پر بھی ہوتا ہے جو اصنام پرستی کے اندر رینگتا ہیں جو غیر اللہ کو اپنا معبود، حاجت روا اور پروردگار تصور کرتے ہیں۔ بتوں کے سامنے اپنی پیشانی گھستے ہیں سر لٹکتے ہیں۔ یہ بات سرے سے کھلا شرک ہے لیکن ایسے حضرات کو بھی آپ غیر مذہبی قرار نہیں دے سکتے۔ انھیں بھی مذہبی کہا جاتا ہے سمجھا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوفی نذیر صاحب سہو کر

یہ عبارت سپرد قرطاس نہیں کی۔ اتنی مہمل بات سوچنے اور سمجھنے کے لئے نہیں کہی جاتی۔

لیکن اگر انھوں نے غور و فکر کے بعد ایسا جملہ کہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے نزدیک تمام مذاہب برحق ہیں وہ سبھی مذاہب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف اسلام کے شیدائی نہیں ان مذاہب کے بھی شیدائی اور تعریف گو ہیں جو صدیوں سے اسلامی روایات سے متصادم اور برسرپیکار رہیں جن کا ہر کل اور جزو اسلام کے لئے مستقل [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔

صوفی صاحب کی [illegible] باتوں کا کھلا اور غیر مبہم مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو کچھ وہ فرمائیں گے اس کی حیثیت ایک ڈھال کی ہوگی اور اس ڈھال کے ذریعہ ہر مذہبی انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے وابستہ ہو اپنے مذہب کا دفاع کر سکے گا۔ وہ مخالفت کرنے والوں کے داخلی اور خارجی حملوں سے بھی اپنے دین کی حفاظت کر سکے گا۔ خواہ اس کا دین اسلام کے حق میں رقیب و حریف کی حیثیت رکھتا ہو اور خواہ مخالفین اور حملہ آور لوگ سچے اسلام پرست ہی کیوں نہ ہوں۔

کیسی عجیب بات ہے اور کس قدر عجیب و غریب ہے وہ ذہن جو ایسی جہالت آمیز اور احمقانہ باتیں اگلتا ہے۔

بہرحال ان کی مذکورہ بالا عبارت سے کسی بھی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ذکر اسلام اور اسلام کے ماننے والوں کا ہے اور وہ اسلام اور اہل اسلام ہی کا دفاع چاہتے ہیں۔

اس عبارت کے آخر میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"انسان کا ابتدائی فرض یہی ہے"

یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم
لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

دیکھا آپ نے کیسی کھلی سرکشی اور صاف مفہوم قرآن سے انحراف ہے۔ خطاب اہل ایمان سے ہے۔ مخاطب مومن کو کیا گیا ہے اور وہ انسان کا ابتدائی فرض تحریر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قرآن کا روئے سخن صرف

مسلمانوں کی طرف نہیں دیا گیا تھا بلکہ انسانوں کی طرف
ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں انسانوں سے خطاب کرنا چاہا ہے
عمومی طور سے وہاں یا ایہا الناس کے الفاظ استعمال کئے
ہیں۔ اور جہاں یا ایہا الذین آمنوا کے الفاظ آتے ہیں
وہاں صرف اہل ایمان کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ غالباً
مضمون لکھتے وقت صوفی صاحب کے دل و دماغ پر
ایمان نہیں انسانیت سوار تھی۔

انسان کی جگہ مسلمان کا لفظ ہونا چاہئے تھا ——
قرآن نے بھی خطاب عام انسانوں سے نہیں ان حضرات سے
کیا ہے جو ایمان لا چکے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ صوفی نذیر
صاحب نے تفاسیر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔
اگر انھیں آیت کا شان نزول اور آیت کا اصلی مفہوم
معلوم ہوتا اور اس آیت کے سلسلہ میں مفسرین کے اقوال
ان کی نظروں سے گذرے ہوتے اور انھیں سمجھ کر ذہن
نشین کیا گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس آیت میں چھپے ہوئے
فلسفہ کو مسلمانوں کا ابتدائی فرض قرار دیتے۔ انھیں شاید
اس بات کی ہوا بھی نہیں لگی کہ مسلمانوں کا ابتدائی فرض
کیا ہے۔ اور جب اتنی بھی واقفیت نہیں تو کس حکیم نے
مشورہ دیا تھا کہ اہم اور پیچیدہ مسائل پر خامہ فرسائی
کریں۔ [illegible]

ایک جگہ انھوں نے اپنے عقیدہ کی تبلیغ یوں
کی ہے :-

"رب مطلق کے لئے قادر مطلق ہونا ایک
لازمی امر ہے مگر قادر مطلق کے لئے رب مطلق
ہونا ضروری نہیں"

آگے چل کر ایک اور جگہ پھر یوں ہی لکھتے ہیں :-

"رب مطلق کے مفہوم میں قادر مطلق کا مفہوم
ایک لازم کی طرح موجود ہے مگر قادر مطلق کیلئے
رب مطلق ہونا کسی صورت میں لازمی نہیں"

مذکورہ بالا اقتباسوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ صوفی
نذیر صاحب کے نزدیک رب مطلق اور قادر مطلق دو الگ الگ
ہستیوں کے نام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رب مطلق کے
اندر خصوصیت پائی جاتی ہے یعنی رب مطلق صرف ذات باری
کے لئے مختص ہے لیکن چونکہ قادر مطلق کے اندر عمومیت ہے
اس لئے اس کا اطلاق دوسروں کے لئے بھی جائز اور
روا ہے۔

انھوں نے جو بات کہنے کی کوشش کی ہے اسے دوسرے
الفاظ میں صراحت فرمائیے۔ بات پوری طرح جب ہی سمجھ
میں آئے گی۔ یوں سمجھئے کہ نبی اور رسول میں عموم خصوص
من وجہ کی نسبت پائی جاتی ہے۔ ایک اعتبار سے دونوں
لفظ آپس میں مربوط ہیں، ہم معنی ہیں۔ لیکن ان میں ایک
عمومیت لئے ہوئے ہے دوسرا خصوصیت۔

تصریح کے طور پر یہ سمجھئے کہ ہر رسول نبی ضرور ہوگا۔
لیکن ممکن نہیں کہ ہر نبی رسول بھی ضرور ہو۔ اسی طرح ہر
مسلمان کے لئے انسان ہونا ناگزیر ہے، لیکن یہ بات
ناگزیر نہیں کہ ہر انسان مسلمان بھی ہو۔

گویا کہ نبی عام ہے رسول خاص، انسان عام ہے مسلمان
خاص، قادر مطلق عام ہے اور رب مطلق خاص۔

شاید یہ باتیں ذہن کی گہرائی میں اتر گئی ہوں گی اگر قارئین صوفی
صاحب کے مافی الضمیر کا طول و عرض سمجھ گئے ہوں تو اب
نالائق حسن کی سنئے۔ وہ کہتا ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ
رب مطلق اور قادر مطلق دو الگ الگ ہستیاں ہیں، ایک ہی ذات
کے دو نام اور ایک ہی ہستی کے دو خطاب نہیں ہیں۔ وہ شخص
کم فہم ہے، جاہل ہے، بدعقیدہ ہے۔ ایسا شخص چاہے
ظاہری طور پر مسلمان اور خادم اسلام کیوں نہ محسوس ہوتا ہو
لیکن ذہنی اعتبار سے قطعاً مشرک ہے۔ قادر مطلق مختار کل
خداوند قدوس کے ماسوا کوئی نہیں۔ وہی رب مطلق ہیں، وہی
قادر مطلق ہیں اور وہی مختار کل ہیں۔

صوفی نذیر کے اس فاسد عقیدے پر حیرت کی کوئی
وجہ نہیں۔ اس لئے کہ ان کی نشو و نما کشمیر [illegible] کشمیری
خانقاہی بدعات اور مشرکانہ حرکات کا مرکز رہ چکا ہے اس
ماحول میں [illegible] کا دینی عقیدہ [illegible]

ہی کیجئے اور رضا کا خاص فضل وکرم۔

ایک جگہ انھوں نے عقل کی نیا بھی ڈبو دی۔ سنئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

حاجت روائے مطلق کے لئے قدرت کاملہ ایک لزوم و ضرورت ہے مگر قادر مطلق کے لئے حاجت روائے مطلق ہونا ضروری نہیں۔

ہمارے قارئین ہی فیصلہ کریں کیا ایسی مہمل اور احمقانہ بات وہ شخص کہہ سکتا ہے جس کا دماغی توازن درست ہو جسے قدرت کی طرف سے سوجھ بوجھ حاصل ہوئی ہو۔ ارے بھئی جو شخص مختار کل اور قادر مطلق ہوگا وہ مطلقاً حاجت روا کیوں نہیں ہو سکتا۔ اول تو سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ حاجت روائے مطلق اور قادر مطلق ایک ہی ذات ہے۔ ایک ہی ہستی ہے پھر خواہ مخواہ مغالطوں میں ڈالنے سے کیا فائدہ۔

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ صوفی صاحب کے اس حماقت آمیز جملے کو پڑھنے والے قادر مطلق کو حاجت روائے مطلق مانیں یا نہ مانیں لیکن صوفی نذیر صاحب کو جاہل مطلق ضرور تسلیم کرلیں گے۔

ایک جگہ یوں فرمایا:۔

"اللہ کے رسول نے عبادت کا مفہوم دو جملوں میں بتا دیا ہے "الدعاء هو العبادة" دعا ہی عبادت ہے "الدعاء مخ العبادة" دعا ہی عبادت کا مغز ہے۔

یہ فرمانے کے بعد انھوں نے چند سطروں میں کھینچ تان کر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبادت کا اطلاق بس دعا ہی پر ہوتا ہے اور دعا ہی عبادت اور بندگی کے تمام مقام ہے۔ ایسی خرافات کی توقع کسی باشعور آدمی سے نہیں کی جا سکتی۔ ہم واقف ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ دعا کو عبادت کا مغز اور عبادت کی اصلیت قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی نماز، روزے کو طلاق مغلظہ دے کر صرف دعاؤں پر اکتفا کر بیٹھے اور یقین یہی میں مبتلا رہے کہ میں بندگی اور عبودیت کا پورا پورا حق ادا کر رہا ہوں۔

دنیا میں کونسا ایسا بدبخت مسلمان ہوگا جو اپنے مالک سے دعائیں نہ مانگتا ہو۔ جنھیں کبھی نماز روزے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی وہ بھی اپنے من کی مرادیں بارگاہ [illegible] ہی کے سامنے رکھتے ہیں کیا ایسے تمام حضرات کو زمرۂ عابدین میں شمار کر لینا دانشمندی کی بات ہوگی؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دعا کو عبادت کیوں کہا گیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو یہ حکم بہت پسند ہے کہ انھیں قادر مطلق سمجھتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے جائیں، ان سے اپنی ضرورتوں کا اظہار کیا جائے۔ اپنا دکھڑا بیان کیا جائے۔ وہ خوش ہوتے ہیں جب کوئی بندہ اپنی حاجات ان کے سامنے رکھتا ہے اور ان سے مدد چاہتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبالغہ سے کام لیتے ہوئے دعا کی ترغیب دی۔

اب اگر کوئی شخص الدعاء هو العبادة کا غلط مطلب لیتے ہوئے صرف دعا پر تکیہ کرکے بیٹھ جائے اور اللہ سے اپنی ضروریات کا اظہار کرکے خود کو بہترین عابد تصور کرنے لگے تو اس شخص کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے گا کہ وہ اول درجہ کا بیوقوف ہے۔ [illegible]

ایک جگہ تو حد ہی ہو گئی۔ فرماتے ہیں:۔

"یہاں ابتدا ہی میں اس مسلمہ حقیقت کو بیان کر دیا جائے کہ تمام انبیاء کا دین از آدم تا ابراہیم ایک رہا ہے"۔

دیکھا آپ نے یہاں صوفی صاحب نے کھلے لفظوں میں ابراہیم کو زمرۂ انبیاء میں شمار کر لیا ہے۔

ذرا سوچئے کہ اگر یہی کسی جماعت سے پکڑا ہوا کر یہ کہے [illegible] کہ دیانت تمام انبیاء میں پائی گئی اور دیانت [illegible] سے [illegible] تک یہی باقی رہی تو آپ [illegible] کیا [illegible] قائم کریں گے؟ میں بتاتا ہوں کہ آپ [illegible]

بالکل بجا کہ گل ۔۔۔ مسیلمہ ابن کذاب کا چھوٹا بھائی۔

لیکن میں مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ صوفی نذیر صاحب کا مقام چونکہ مجھ جیسے بے بضاعت اور نااہل لوگوں سے بلند اور فائق ہے اس لئے ان کے بارے میں ہرگز ہرگز وہ رائے نہ قائم کی جائے جو میرے بارے میں قائم کی جاتی۔ البتہ ان کی چند کبرآمیز تحریروں کو پڑھ کر یہ تو کہنا ہی پڑے گا کہ وہ تکبر اور خناس کے اندر مبتلا ہیں ۔۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا علامہ اور عقل کل تصور کرتے ہیں۔

ان کا انداز تحریر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "ہمچوں دیگرے نیست" کے زعم اور مرض لاعلاج میں گرفتار ہیں۔ وہ خود کو بین الاقوامی قسم کا عالم گمان کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان کا انداز نگارش اور لب ولہجہ کچھ اس انداز کا ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے براہِ راست انبیاء سے مشورہ کرنے کے بعد قلم و کاغذ سنبھالا ہے لہٰذا اب غلطی اور خطا کا امکان نہیں۔ خدا ہی جانے وہ کس خاص صفت کی بنا پر خود کو لاثانی دانشور اور بے مثال نکتہ داں سمجھتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ ان حضرات کی تحریروں پر آئے دن لے دے کیوں کرتے رہتے ہیں، جن کے سامنے ان کی مثال بالکل ایسی ہی جیسے شتر مرغ کے سامنے مچھر اور پہاڑ کے سامنے ذرہ۔

غلطی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے :-

" ان الذین امنوا والذین هادوا والنصاریٰ والصابئین۔ الیٰ اخرہ۔

اس آیت کریمہ میں انھوں نے والصابئین کو والصاشہین تحریر کیا ہے۔ یعنی انھوں نے ہمزہ کو "با" پر مقدم کیا جب کہ "یا" مقدم ہونی چاہئے تھی اور ہمزہ مؤخر ۔۔ ہم اس غلطی کو کتابت کی غلطی سمجھ لیتے اگر ترجمہ میں ہمزہ کو مؤخر کر دیا جاتا۔ قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ چوک کاتب سے نہیں محترم صوفی صاحب سے ہوئی اور یہ چوک غفلت، بے توجہی اور قرآن حکیم کے معاملہ میں غیر ذمہ داری کی غمّاز مثال ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

" جو لوگ (بذریعۂ محمد) ایمان لائے جو یہودی اور نصاریٰ اور صابئین تھے، جو بھی ان میں سے اللہ پر یوم آخرت پر ایمان لایا۔ اچھے عمل کئے ان کا اجر اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا انھیں خوف و حزن کی ضرورت نہیں"

ترجمہ میں "بذریعہ محمد" کے الفاظ اضافی حیثیت سے لکھے ہیں ان الفاظ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نہ ہی کسی معتبر مفسر نے مذکورہ آیت کے ترجمہ و تفسیر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ کا بڑھانا من مانی باتیں کرنے کے مصداق ہے اور قرآن کے معاملہ میں من مانی جو اسلاف و اخلاف کے ترجموں اور تفسیروں سے متصادم ہو ایک فاش غلطی ہے جسے امت مسلمہ نے غلط اور ناجائز قرار دیا ہے۔

فلھم اجرھم عند ربھم کا ترجمہ "ان کا اجر اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا" کرنا عربی زبان سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کا ترجمہ کیا ہے " انھیں خوف و حزن کی ضرورت نہیں۔ ایک ایسی غلطی ہے جسے عربی زبان کا ایک مبتدی بھی غور و خوض کے بغیر محسوس کر سکتا ہے۔

آگے چل کر وہ قرآن حکیم کی ایک اور آیت نقل فرماتے ہیں اور مندرجہ ذیل طریقہ پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون"

پوری یکسوئی سے دین کی طرف متوجہ ہو جائیے۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ یہی پائدار دین ہے مگر اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ آیات کا ترجمہ کرتے وقت

انہوں نے [illegible] کی [illegible] کر دیا۔ انہوں نے اپنا [illegible] دی ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ان کی [illegible] استعداد کس حیثیت کی حامل ہے۔

اس آیت میں وہ ذالک الدین القیم کا ترجمہ یوں کرتے ہیں :۔ "یہی پائیدار دین ہے"۔

شاید انھیں معلوم نہیں کہ کسی مذہب، عقیدے، روایت اور رسم و رواج کا پائیدار ہونا کوئی کمال کی بات نہیں اور نہ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سچائی اور حقانیت لئے ہوئے ہے۔

شرک کی ابتدا نوح علیہ السلام کے زمانہ سے ہوئی تھی اور شرک آجتک باقی ہے بلکہ قیامت باقی رہے گا۔ کیا شرک کی پائیداری میں کوئی تامل ہو سکتا ہے۔ نفاق کی تولید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں ہوئی تھی لیکن ابھی تک اسکی موت واقع نہیں ہوئی اور نہ اس کے دنیا سے اٹھ جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جب تک دنیا باقی ہے نفاق بھی کسی نہ کسی درجہ میں اور کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے گا، قائم و دائم رہے گا۔

اندازہ ہوا کہ پائیداری تو نفاق اور شرک میں بھی موجود ہے۔ بت پرستی بھی ایک مذہب ہے۔ یہودیت اور نصرانیت بھی ایک مذہب ہے۔ آتش پرستی اور مجوسیت بھی ایک مذہب ہے اور ان سب میں مضبوطی اور پائیداری اس درجہ موجود ہے کہ یہ اس وقت تک نیست و نابود نہیں ہو سکتے جب تک دنیا ہی نیست و نابود ہو جائے۔ پھر کہاں رہا کیا خصوصیت ہوئی اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کو قبول کرو اس لئے کہ یہ پائیدار مذہب ہے۔

آئیے ہم عربی لغات بھی کھنگال لیں۔ اندازہ تو ہو کہ قیم کا ترجمہ پائیدار کرنا لغوی اعتبار سے بھی درست [illegible]

[illegible]

قَیِّمٌ ـــــ [illegible] ، درست کرنے والا، قائم کرنے والا۔

اور یہ ہے قاموس القرآن :۔

قَیِّمٌ ـــــ قائم رکھنے والا۔ نگرانی کرنے والا۔ سیدھا، صحیح۔

اور یہ ہے مولانا وحید الزماں صاحب کی مرتب کردہ القاموس الجدید :۔

قَیِّمٌ ـــــ سیدھا۔ معتدل۔ نگراں۔ قیمتی۔

عربی کی ان لغات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قَیِّمٌ فاعل بھی بن سکتا ہے اور صفت مشبہ بھی۔ اگر کسی عبارت میں فاعل واقع ہو تو اس کا ترجمہ قائم کرنے والا، درست کرنے والا، حفاظت اور نگرانی کرنے والا لیا جائے گا۔ اور اگر صفت واقع ہو تو پھر ترجمہ سیدھا، درست وغیرہ ہوگا۔ اب آپ دیکھ لیجئے آیت کریمہ میں قَیِّمٌ کا لفظ صفت واقع ہو رہا ہے یا نہیں۔

اگر صفت واقع ہو رہا ہے اور واقعتاً صفت واقع ہو رہا ہے تو پھر قیم کا ترجمہ پائیدار یا قائم رہنے والا کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

قیم کا ترجمہ پائیدار کرنا عربی زبان سے ناواقفیت کی دوسری دلیل ہے۔

بس صوفی صاحب کی تحریروں کا اتنا ہی آپریشن کافی ہے اور زیادہ چیر پھاڑ کی ضرورت نہیں۔ قارئین نے یہ اندازہ تو کر ہی لیا ہوگا کہ صوفی صاحب ایک پرائمری سطح کے آدمی ہیں۔ ان کی استعداد محدود اور صلاحیتیں معمولی درجہ کی ہیں۔ ان کی عربی استعداد کا بھانڈا بھی پھوٹ چکا ہے۔

یہ بات قارئین کے لئے یقیناً باعث تعجب ہوگی کہ جو شخص علمی اعتبار سے بے بضاعت ٹھیکرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا وہ وقتاً فوقتاً ان حضرات پر اعتراضات کی بوچھار [illegible] جن کو دنیا علم و [illegible] [illegible] اپنی استعداد اور صلاحیتوں کا لوہا [illegible] جن کا [illegible] [illegible] مسلم ہے۔ جن کی [illegible] اور [illegible] دنیا [illegible] جانتی [illegible] اور عوام و خواص کی تشنگی [illegible]

کانوں میں انڈیل [illegible] ہیں، اس لئے دل دعوتیات کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر اس [illegible] پہ پوری تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے، ممکن ہے کوئی بھٹکا ہوا راہی ہماری اس ناقص و ناممکل [illegible] کو پڑھ کر راہِ راست پر آجائے۔

آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ بدنصیبی سے مسلمانوں کے اندر ایک ٹولی ایسی بھی ہے جو معاشرہ دماحول میں گمراہی اور بدعقیدگی کی غلاظتیں پھیلا رہی ہے۔ یہ ٹولی بہ نیم احادیثِ رسول کو غلط سلط معنی پہناتی رہی ہے اور آیاتِ قرآنی کی لایعنی خودساختہ من گھڑت اور بے جا تاویلیں کرکے سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلا کر اس یکی پگڈنڈی سے ہٹانے کی شیطانی ڈیوٹی انجام دیتی رہی ہے۔ جس پگڈنڈی پر چلنے اور قائم و مستقیم رہنے کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردست تاکید کی تھی، پُرزور اور پیغمبرانہ اصرار فرمایا تھا۔

اس گروہ کا ایک فاسد و باطل دعویٰ یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم یہ تاکید کرتا ہے کہ بزرگوں کا وسیلہ تلاش کرو، خدا تک اپنی دعائیں اور حوائج پہنچانے کے لئے ان کا توسط اختیار کرو۔ بزرگوں کے توسّل تصدق کے بغیر خدا تک رسائی قطعًا ناممکن ہے، مستحیل و محال ہے۔

پھر یہ گمراہ اور گمراہ کن ٹولی اپنی ایجاد کردہ بدعتوں کو شرک سے ضرب دیدیتی ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھانا، مزاروں پر دیئے جلانا، بزرگوں سے استمداد کرنا، ان سے مرادیں مانگنا، انھیں [illegible] سمجھانا، انبیاء و مرسلین کو ہمہ وقت حاضر و ناظر تصور کرنا، [illegible] یہ سب کچھ حاصل ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تمام واہیات اور جہالت آمیز نظریات عقلِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے [illegible] بلکہ ان تمام اصول و کلیات اور آزمودہ الٰہیہ [illegible] متصادم ہیں جو خود حق تعالیٰ نے بہ نفسِ نفیس قرآن مجید میں [illegible] کئے تھے اور جو تمام بنی آدم اور کل نوعِ انسانی کے [illegible] بذریعہ وحی اور بتوسّل انبیاء روئے زمین پر اتارے گئے تھے، جو قرآن و حدیث کی منقدس صورت میں آج بھی موجود ہیں، کل بھی موجود تھے، اور اس وقت تک محفوظ و مصئون اور سالم و اسلم ہی رہیں گے جب تک دلوں میں ایمان و ایقان کی

[illegible] کسی حق اور سچے [illegible] کا [illegible] سی بے جھانکی باقی ہے۔

اور ہم نے جو کچھ بیان کیا [illegible] تمہید کے نام سے موسوم کیجئے [illegible] اصل مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل مسئلہ [illegible] کی طرف اب متوجہ ہوتے ہیں۔ پہلے وسیلہ کی لغوی حیثیت پر نظر ڈال لیجئے۔

وسیلہ کے لغوی معنی یہ ہیں:- تقرب [illegible] درجہ، ذریعہ، سبب، تعلق، علاقہ۔ تحقیق مقصود ہو تو ملاحظہ فرمائیے لسان العرب قاموس اور بیان اللسان۔

امام راغب اصفہانی رح نے مفردات راغب اصفہانی میں لفظ وسیلہ کی [illegible] یوں کی ہے:

الوصیلة التوصل الی الشئ برغبة وھی اخص من الوصیلة لتضمنها لمعنی الرغبة قال تعالی ابتغوا الیه الوسیلة وحقیقة الوسیلة بالعلم والعبادة وتحری مکارم الشریعة وھی کالقربة والواسل الی الله الراغب الیه۔

[illegible] کسی شئے تک رغبت کے ساتھ پہنچنا اور یہ وسیلہ (بالسین) وصیلہ (بالصاد) سے صرف بمعنی رغبت کے خصوصیت رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وابتغوا الیه الوسیلة" اور مراد اس سے صراطِ مستقیم پر علم عبادت اور مکارم شریعت کے بادصف قائم رہنا ہے اس لئے قربت کے معنی صحیح ہیں اور واسل معنے ہوئے اللہ سے رغبت رکھنے والا۔

اگر وسیلے سے مراد کسی بزرگ کی پناہ اور سہارا لیکر اپنے مقامات خدا تک پہنچانا ہوتا تو امام راغب اس کی طرف لازمًا اشارہ کرتے بلکہ بسط و تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالتے۔ ان سے اخفائے اصلیت اور کتمانِ حق جیسے صریح اور بدترین جرم کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

یہ تو ہوئی لغوی حیثیت، اب شرعی مفہوم پر نظر ڈال لیجئے۔ شرعی مفہوم دو مراد لئے جاتے ہیں۔

احادیث صحیحہ سے متریخ ہوتا ہے کہ جنت میں مختلف درجات اور مختلف مقامات ہیں۔ سب سے عظیم و رفیع مقام "وسیلہ" ہے۔ بلندی، ترفع اور تقرب خداوندی کے اعتبار سے کوئی مقام اس سے زیادہ قربت و رفعت کا حامل نہیں ہے۔ یہ وہی مقام ہے جس تک پہنچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دعائیں کی ہیں اور اپنی امت کو بھی تاکید کی ہے کہ حق تعالیٰ سے یہ دعا کیا کریں کہ حساب کتاب کے دن رحمۃ للعالمین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عظیم الشان مقام پر فائز کرے۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا ما الوسیلۃ یا رسول اللہ؟ یا رسول اللہ! وسیلہ کیا چیز ہے؟۔ آپ نے فرمایا اعلیٰ درجۃ فی الجنۃ۔ جنت میں اعلیٰ درجہ کا نام ہے۔

مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا فانہا منزلۃ فی الجنۃ۔ مطلب وہی ہے کہ بہشت کے کسی اعلیٰ ترین درجہ کا نام وسیلہ ہے۔

اگر ذہن و فکر کے اعتبار سے آدمی سرکش اور حق بیزار واقع نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ اس تعبیر و تفسیر کے بعد دوسرے معانی تلاش کرنے اور پھر اس کی ترویج و اشاعت کی جسارت نہیں کر سکتا۔

کیا اہل بدعت کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و تفاسیر کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اگر ہے تو پھر وہ اس مبارک قول اور اس مقدس تفسیر پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اسے پس انداز کر کے کیوں اپنی ہی ہانکے جا رہے ہیں۔

وسیلہ کا دوسرا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کے ذریعہ حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا۔

اس مفہوم کی تصدیق و تائید میں ہم اکابرین کے ان گنت اقوال و تفاسیر پیش کر سکتے ہیں اور ایسے مضبوط اور مستحکم دلائل کا ڈھیر لگا سکتے ہیں جن کی تائید ہمارے دعوے کو حاصل ہے اور جو علمائے دیوبند کے رجحانات کی پشت پناہی کرتے ہیں لیکن زیادہ صفحات سیاہ کرنا ہمیں کئی اعتبار سے غیر مناسب و ناموزوں معلوم ہوتا ہے اس لئے تطویل و طوالت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ہم صرف چند نمونے ایسے پیش کر رہے ہیں جن کے مطالعہ سے ہمارے میلانات کو ثبات و استقامت کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے اور ہمارا مسلک نظریہ آفتاب سے زیادہ روشن ستاروں سے زیادہ منجم اور فولاد کی طرح مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ ان نمونوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہمارے اختیار کردہ مفہوم پر مہر تصدیق ثبت نہ کرنا اس بات کی واضح علامت ہوگی کہ مد مقابل گروہ کھلی بددیانتی سے کام لے رہا ہے اور دیدہ و دانستہ فریب کاری کے اندر مبتلا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ لفظ وسیلہ کی تشریح یوں کرتے ہیں:-

اطلبوا الیہ القرب	درجات میں حق تعالیٰ کا قرب
فی الدرجات بالاعمال	حاصل کرو اعمال صالحہ کے
الصالحۃ۔	ذریعہ۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:-

فالمراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذالک بالعبادات والطاعات (تفسیر کبیر)

حق تعالیٰ کی طرف وسیلہ طلب کرنے سے مراد اس کی رضامندی کا حصول ہے اور یہ عبادات و اطاعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

ملا علی قاریؒ نے مرقات میں علامہ توربشتیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:-

"دراصل اس کے توسل سے کسی چیز کی طرف رسائی نصیب ہو جاتی ہے اور اس کے ذریعہ اللہ کی قربت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے جنت تک پہنچنے والا اللہ کی قربت حاصل کر لیتا ہے اور

بزرگوں کا قرب اختیار کرنے کا نام وسیلہ ہے۔

قرآن حکیم میں صرف دو جگہ وسیلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غیر جانبدار ہو کر اگر اس پر بھی نگاہ ڈال لی جائے کہ آیا وہاں کس نقطہ نظر اور بیان کی وجہ کیا ہے اور وہاں کیا مفہوم مراد لیا گیا ہے۔

پندرہویں سپارہ کا پانچواں رکوع کھولئے یہ آیت نظر آئے گی۔

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ	وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ
يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ	خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک
إِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ	وسیلہ کہ کون سا بندہ بہت نزدیک
أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ	ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہربانی
رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ	کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے
عَذَابَهٗ۔	(ترجمہ شیخ الہند رح)

اس آیت کے اندر ان کم فہم اور شرک زدہ لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس بے بضاعت مخلوق کو لائق بندگی سمجھتے تھے جو خود حق تعالیٰ کے محتاج اور غلام تھی۔ ایک حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایام جاہلیت میں بعض لوگ جنات کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اتفاقاً یہ جنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آئے اور زمرہ مسلمین میں داخل ہو گئے لیکن وہ پجاری لوگ اس کے باوجود بھی انہیں اپنا معبود اور مستعان تصور کرتے رہے اور ان ہی کی عبادت و پرستش میں سر دھنتے رہے۔ بطور تنبیہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور ان لوگوں کو ڈانٹا گیا کہ تم عجیب لوگ ہو کہ جن کو تم نے اپنا خدا تصور کر رکھا ہے وہ تو خود خدا کی بارگاہ میں اپنا سر جھکائے رہتے ہیں اور ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح خدا کی خوشنودی اور قربت کا حصول ہو۔ ان کی نظر ہر وقت اس بات پر لگی رہتی ہے کہ رب العزت کی بارگاہ میں کون زیادہ مقبول و مقرب ہے اور اس کی ہمسری کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔

اگر آپ تدبر و تفکر سے کام لیں گے تو اس نتیجہ تک پہنچنے میں منٹ بھر کی بھی دیر نہیں لگے گی کہ ایام جاہلیت کے [illegible] شریعت کے [illegible] اور

عقیدوں کے اعتبار سے بالکل ہمنوا اور یکجا ہیں۔ وہ حضرات بھی ان بزرگوں کی عبادت و پرستش میں مرے جاتے تھے جن کا سر پانچ وقت پابندی کے ساتھ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی چوکھٹ پر اپنی تذلیل و پسپائی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ جو لمحہ بھر کے لئے بھی خدا کی ذات و صفات میں کسی اور کا اشتراک گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان حضرات کا عالم بھی یہ ہے کہ ایک زمانہ سے شیخ عبدالقادر جیلانی، شاہ معین الدین چشتی اور شاہ فلاں کے مزارات پر اپنی پیشانیاں گھس رہے ہیں۔ انہیں مستعان اور مختار کل باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ پچھلے بزرگ زندگی بھر اسی بات کی تبلیغ و تلقین کرتے رہے تھے کہ اللہ ایک ہے اس کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں۔ وہی قادر مطلق اور مختار کل ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ ان بزرگوں نے خدا کی اطاعت و بندگی میں کبھی کسی بزرگ و اوتار کی شمولیت و تشریک پسند نہیں کی تھی۔ کبھی کسی اور کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا تھا۔ کبھی کسی کو معطی گمان نہیں کیا تھا لیکن ہیہات ان ہی موحدین اور خدا پرست حضرات کے مزاروں پر کفر و شرک کے ایسے ایسے واقعات اور مظاہرے سر ابھارتے رہتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور خدائیت پانی پانی ہو کر رہ جائے۔

قرآن کی چند آیات پیش ہیں ذرا گہری نظر سے انہیں دیکھیے:-

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ	یہ ہماری شان نہیں کہ ہم اپنی
غٰفِلِيْنَ (المومنون)	مخلوق سے بے خبر ہوں۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا	ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے
الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ	اور ہم جانتے ہیں جو خیالات
مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ	انسان کے دل میں پیدا ہوتے
وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ	ہیں اور ہم انسان کے اس قدر
مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔	قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے
(ق)	بھی زیادہ۔
وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ	اور جب آپ سے پوچھے

اور شیخ کا زرق محسوس کرے، آخر اس کا کیا مطلب ہوا؟

سوال:- (ایضاً)

فلاح دین و دنیا کیسی کتاب ہے، کیا اس میں جو مسائل شوکت علی فہمی صاحب نے تحریر کئے ہیں قرآن اور حدیث کے مطابق ہیں۔ پڑھنے کے بعد تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ مسائل جو درج کتاب ہیں قرآن اور حدیث کی ضد ہیں۔

الجواب:-

اگر علم غیب کی صحیح تعریف آپ کے ذہن میں محفوظ ہوتی تو اس قسم کی بچکانہ الجھن کا شکار نہیں ہو سکتے تھے۔ ذہن کے ٹیپ ریکارڈ میں یہ بات محفوظ کر لیجئے کہ علم غیب اسے کہتے ہیں جو حواس خمسہ کی زد سے باہر ہو، حواس خمسہ کے توسط یا کسی خاص ذریعہ اور وسیلہ سے حاصل شدہ علم پر علم غیب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ سے کوئی دریافت کرے کہ علم غیب کسے کہتے ہیں تو آپ کی طرف سے صحیح جواب یہ نہیں ہوگا کہ علم غیب صرف مغیبات سے واقف ہو جانے کو کہتے ہیں بلکہ صحیح اور درست جواب یہ ہوگا کہ کسی قسم کے ذریعہ اور توسل کے بغیر غائب واشیاء کا جو علم حاصل ہوتا ہے اسے غیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اسبابِ علل اور آثار و علائم کا مشاہدہ کرنے کے بعد کسی حقیقت کا ادراک کر لینا اور کسی خاص نتیجہ تک پہنچ جانا علم غیب نہیں کہلاتا بلکہ انھیں بہ فرق مراتب مشاہدہ، تخمینہ، قیاس، تجربہ اور علم سائنس کہہ سکتے ہیں۔

اگر آپ کسی عورت کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر یہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ چند ماہ بعد اس کے بچہ پیدا ہوگا اور واقعتہً ایسا ہو جائے چند مہینوں کے بعد وہ عورت ایک بچہ کو جنم دیدے تو کیا آپ کو عالم الغیب کہنا درست ہوگا۔ ؟

اگر کوئی تجربہ کار ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کردے کہ بس یہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے اس کے بعد یہ دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ اتفاقاً ایسا ہو بھی جائے مریض چند ساعتوں کے بعد وہ دم توڑ دے تو کیا ڈاکٹر صاحب کی غیب دانی پر ایمان لے آئیں گے ؟۔

اگر کالی کالی گھٹائیں دیکھنے کے بعد میں پیش گوئی کروں کہ تیز بارش ہونے والی ہے اور چند منٹوں بعد میرے کہنے کے مطابق موسلا دھار پانی برسنے لگے تو کیا مجھے علامۂ غیب تسلیم کر لیا جائے گا ؟۔

زید کا گزر ایک محلّہ سے ہوا، وہاں ایک اونچی دیوار تھی اس دیوار پر کھڑا ہو کر ایک بچہ پتنگ اڑا رہا تھا۔ زید نے چند لوگوں سے کہا کہ اس بچہ کو اتار لو بڑی ہی غلط جگہ کھڑا ہے اگر گر گیا تو بچ نہیں سکے گا۔ خدا کا کرنا دیکھئے، تھوڑی دیر کے صاحبزادے گر جاتے ہیں اور گرتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اب لوگ زید کو عالم الغیب سمجھنے لگتے ہیں۔ تو کیا زید کو عالم الغیب سمجھنا حقیقی نقطۂ نظر سے صحیح ہے ؟۔

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ زید نے قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے صرف ایک اندیشہ کا اظہار کیا تھا جو اتفاقی طور پر حقیقت کے سانچہ میں ڈھل گیا۔

اس طرح آپ کا، ڈاکٹر کا اور میر التفکر، تخمینہ کے ذریعہ قبل از وقت کسی ہونے والی بات کا ادراک کر لینا اور عقلی گھوڑے دوڑاتے ہوئے علت سے معلول، سبب سے مسبب اور موثر سے اثر کا علم حاصل کر لینا علم غیب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح وہ علم بھی علم غیب تصور نہیں کیا جائے گا جو آلوں اور مشینوں کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر نبض دیکھنے کے بعد بخار کے اتار چڑھاؤ کی صحیح کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا انسان کی نگاہ رگوں میں دوڑنے والی حرارت کا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔ حرارت کا صحیح طور پر اندازہ لگانے کے لئے تھرما میٹر ایجاد کیا گیا۔ یہ وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ سے رگوں میں دوڑنے والی گرمی اور حرارت کا صحیح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے اور بخار کی کیفیت و نوعیت مترشح ہو جاتی ہے۔ کوئی آدمی اگر ڈاکٹر کو اسلئے عالم الغیب کہنے لگے کہ اس نے جسم کے اندر دوڑنے والی حرارت کا بذریعہ تھرما میٹر صحیح طور پر احساس کر لیا تھا۔ کیا جہالت اور نا سمجھی کی بات نہیں ہوگی۔

ہم نے ابھی تک کسی کتاب یا رسالہ میں یہ نہیں پڑھا کہ

کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو گیا ہے جس کے ذریعے یہ واضح ہو جاتا ہو کہ عورت کے شکم میں لڑکی ہے یا لڑکا۔ لیکن ہم اس سے انکار نہیں کریں گے آپ نے جب اخبار میں پڑھا ہے تو بات درست ہی ہو گی۔ مگر یہ ایسی بات نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ پریشان ہوں۔ آلہ تو پھر ایک مضبوط ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہرین تو حاملہ عورت کی چال ڈھال، اس کے چہرے کی چمک، آنکھوں کی ویرانی اور چند مخصوص علامتیں دیکھنے کے بعد اندازہ لگا لیتے ہیں کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

اس حقیقت کو بھی نظر انداز مت کیجیے گا کہ انسانی علم خواہ وہ کتنے ہی مضبوط وسائل اور ذرائع کے توسط سے حاصل ہوا ہو ضروری نہیں کہ ہمیشہ درست اور قیاس وگمان کے مطابق ہی ثابت ہو۔

بعض اوقات انسان کی عقل ایسی ٹھوکر کھاتی ہے کہ اپنی عقل وفہم اور تفکر وتدبر کا اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔ آپ رات دن مشاہدہ کرتے ہوں گے کہ تجربہ کار معالج نے کسی مریض کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کے پھیپھڑوں میں پانی اتر آیا ہے آپ تحقیق کی غرض سے دوسرے معالج کے پاس پہنچتے ہیں۔ وہ آپ کے مریض کے بارے میں تحقیق کے ساتھ کہتا ہے کہ نہیں پھیپھڑوں میں پانی نہیں اترا پھیپھڑے بہر اعتبار محفوظ ہیں یہ تو دوسرا مرض ہے اور وہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ مرض واقعتہً پھیپھڑوں سے متعلق نہیں۔

کیا پہلا معالج، معالج نہیں تھا۔ بے شک معالج تھا لیکن اس کا علم قیاس، تجربہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مرض کی تشخیص قطعی طور پر غلط ثابت ہوئی۔ یہ ہے اس علم کی حقیقت جو ذرائع اور وسائل اور تخمینوں اور تجربوں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

پیٹ پھولی ہوئی عورت کے بارے میں آپ کا یہ قیاس کہ حاملہ ہے غلط فہمی پر بھی مبنی ہو سکتا ہے۔ پیٹ بعض امراض کی وجہ سے بھی پھول جایا کرتے ہیں۔ لہٰذا مشاہدے کے بعد آپ نے جو اندازہ لگایا ہے ضروری نہیں کہ من وعن صحیح ثابت ہو۔ غلطی اور خطا کا امکان بہرحال موجود ہے۔

ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں مایوسی کا اظہار کر دیتا ہے اور صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ بچنے کی ایک فیصد امید نہیں۔ اتفاقاً مریض شفایاب اور صحت مند ہو جاتا ہے اور صحت وزندگی کی دولت لے کر شفاخانہ سے باہر آ جاتا ہے۔ کیا اس قسم کے انوکھے واقعات ہماری دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہوتے رہتے۔؟

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کالے کالے بادل گھر گھر کر آتے ہیں۔ ہمیں گمان ہوتا ہے کہ بارش ہو گی۔ ہم برملا اپنے قیاس وگمان کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن ہماری قیاس آرائیاں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہیں۔ بادل گھر گھر کر آتے ہیں اور یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ایک قطرہ تک برسنے کی نوبت نہیں آتی۔

زید کا اندازہ خلافِ عقل وفہم نہیں تھا۔ تیسری منزل سے گرنے کے بعد ہڈی پسلی باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ہم اس قسم کے واقعات اور عجائبات کا مشاہدہ بارہا خود کر چکے ہیں کہ تیسری چوتھی منزل سے بچہ گرا اور اس کے جسم پر کہیں خراش تک نہیں آئی حالانکہ اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد موت واقع ہو جانے کا ننانوے فیصد یقین ہوتا ہے۔

آپ دن رات ریڈیو سے بارش کی پیشین گوئیاں سنتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات یہ پیشین گوئیاں پوری ہو جاتی ہیں لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریڈیو نے پیشین گوئی کی یو۔پی کے فلاں علاقے میں موسلا دھار پانی برسے گا حالانکہ موسلا دھار تو درکنار اس علاقہ میں چھینٹیں تک نہیں پڑتیں، چند بوندیں تک ٹپکنے نہیں پاتیں۔

اور غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ بارش کی یہ پیشین گوئیاں یوں ہی نہیں کر دی جاتیں بلکہ رصد گاہوں میں بڑے بڑے آلات لگے ہوتے ہیں ان کے ذریعے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سمندر سے مانسون کب اٹھا اور کدھر گیا اور کتنے وقت کے بعد برسے گا اور یہ کہ کن کن علاقوں میں کتنی مقدار میں بارش ہو گی۔

اب دیکھ لیجیے دن رات آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ذرائع اور وسائل، آلات اور علائم کے باوجود بھی انسان حتمی قطعی [illegible]

یقینی نتائج کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا علم وسیلے ان آلات ذریعوں سے حاصل ہونے کے بعد بھی ہر بار محکم، مستحکم اور یقینی نہیں ہوتا۔ اس سے سمجھنے اور اندیشے ہمیشہ ہی حقائق کا جامہ نہیں پہن پاتا۔

لیکن چلئے چھوڑیے ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ آثار و علائم اور اسباب و وسائل کا سہارا لے کر انسان جس متوقع نتیجہ کا ادراک کرے گا وہ محسوس ہوگا یقینی ہوگا۔ پھر بھی اس علم کا ادنیٰ سا تعلق بھی اس علم سے نہیں جوڑا جا سکتا جس کی نفی قرآن حکیم نے کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ان چیزوں کا علم صرف خداوند قدوس کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

آیت قرآنی اور خدائی دعویٰ تو اس وقت ہی غلط ثابت ہو سکتا ہے جب کوئی شخص آثار و علائم اور اسباب و وسائل کے بغیر ہی مغیبات کے بارے میں انکشافات کرتا رہے۔ اور اس کے ہوئے انکشافات مبنی بر حقائق ثابت ہوتے رہیں۔

کیا آپ کی نظروں سے ایسا کوئی آدمی گزرا ہے جو کسی بند کمرے میں بیٹھا ہو۔ اس کمرے میں کوئی سوراخ اور روزن تک نہ ہو کہ جس سے بیرونی اشیاء کا دیدار و تصور کیا جا سکے اور نہ ہی اس کے پاس کسی قسم کا آلہ ہو جس کے توسط سے وہ موسمی تغیرات کا ادراک کر سکے اور وہ بیٹھے بیٹھے وہ پیشین گوئی کرنے لگے کہ دہلی میں بارش ہونے والی ہے ... راس میں آندھی چلنے والی ہے اور فلاں جگہ فساد ہونے کے امکانات ہیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ یہ بھی دعویٰ کرے کہ ہندوستان کے فلاں شہر کے فلاں محلے کے فلاں گھر میں جو فلاں لڑکی رہتی ہے وہ حاملہ ہے اور چند دن بعد اس کے لڑکا تولید ہوگا۔ اور اس کے یہ تمام دعوے اور پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوتی رہیں تو بے شک ہمارے دماغ میں بھی اشکالات پیدا ہو سکتے تھے اور ہم سوچنے لگتے۔ اور قرآن کا دعویٰ ہمیں بھی ناقص، کھوکھلا اور بے معنی محسوس ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص آثار و علائم اور وسائل و روابط کے بغیر کسی ان دیکھی چیز کے بارے میں صاف صاف اور صحیح صحیح کچھ بتا سکے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی آیت پر کسی قسم کا اعتراض یا اشکال وارد نہیں ہوتا۔

الجواب[۳] :-

شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد کا نکاح ہر مسلمان عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کوئی روک ٹوک اور چھوت چھات نہیں۔

کفو اور غیر کفو کا مسئلہ تو اس وقت اٹھتا ہے جب بالغ لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر از خود اپنا نکاح کر لیا ہو اگر نکاح کفو میں کیا گیا ہے تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔ اور غیر کفو میں کیا گیا ہے تو پھر نکاح تو بہر حال منعقد ہو جائے گا البتہ ولی کو فسخ نکاح کا اختیار باقی رہے گا اگر وہ چاہے گا تو نکاح کی اس ڈوری کو توڑ سکتا ہے۔

مثلاً ہندہ نام کی سیدہ لڑکی نے ولی کی اجازت لئے بغیر اپنا نکاح کسی مغل نوجوان سے کر لیا۔ نکاح منعقد ہو گیا لیکن اگر ہندہ کے والی اس نکاح کو فسخ کرانا چاہیں تو فسخ کرا سکتے ہیں۔ شریعت کی طرف سے انہیں یہ اختیار حاصل ہے۔ البتہ اگر ہندہ کا نکاح کسی پٹھان سے ولی کی اجازت سے ہوا ہو تو پھر کوئی رکاوٹ اور حرج نہیں۔ کسی بھی کلمہ گو مرد کا نکاح کلمہ گو عورت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو بات بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ انہوں نے بھی بین السطور یہی بات بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی سیدہ لڑکی بغیر اجازت ولی کے از خود اپنا نکاح کسی پٹھان نوجوان سے کر لے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ نکاح اپنی نسلی پوزیشن سے گھٹ کر ہوا ہے یعنی غیر کفو میں ہوا اور اس صورت میں ولی کو نکاح توڑنے یا باقی رکھنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔

الجواب[۴] :-

ہم نے کبھی مذکورہ کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ لہٰذا کسی قسم کی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

تجلی میں ایک سے زائد بار اس بات کا اعلان کیا

جا چکا ہے کہ ایک بار میں تین سوالوں سے زیادہ مت ارسال کیجئے۔ آپ نے اکٹھے سات سوالوں کے جواب طلب کئے تھے یہ ایک غلط بات ہے آئندہ اس حرکت سے احتراز کیجئے گا۔ آپ کے صرف تین سوالوں کے جوابات دئیے گئے ہیں بقیہ سوالوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

آئندہ کے لئے یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ اگر ایک بار میں تین سوالوں سے زیادہ ارسال کئے تو سبھی سوالوں کو ناقابل التفات تصور کیا جائے گا۔ اور یہ فیصلہ سبھی قارئین کیلئے یکساں ہے، صرف آپ ہی کے لئے نہیں۔

دف اور موسیقی

سوال :۔ از ابواللیث صاحب صدیقی۔

شرعی نقطۂ نظر سے موسیقی کا کیا حکم ہے؟ دف کے جواز کے متعلق احادیث سے کیا ثابت ہے؟ اگر دف جائز ہے تو اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ موسیقی کے جواز کے بھی کچھ پہلو ہیں یعنی وہ بالکلیہ حرام نہیں ہے۔

ایک شادی کے موقع پر جب کچھ عورتیں باجا بجا کر گا رہی تھیں تو ایک صحابی نے نہ صرف سکوت فرمایا بلکہ ایک معترض کو خاموش رہنے کی ہدایت بھی کی۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلے کے تمام اطراف و جوانب پر با تفصیل روشنی ڈالئے

الجواب :۔

ذخیرۂ احادیث میں کوئی روایت ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر موسیقی کو جائز قرار دیا جا سکے لہٰذا شرعی اعتبار سے موسیقی اور گندے گانوں کی سماعت ممنوع اور حرام ہی سمجھئے۔

دف بالکل الگ چیز ہے اس کا سر و جہ موسیقی سے کیا ربط ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ڈھول پیٹے جائیں اعلان کے لئے جس کی شکل اس طرح نہ ہو بس مقصود اعلان و نکاح ہو

دور سے لوگوں کا اجتماع دیکھ کر یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ شاید کسی غمی اور ماتم کی وجہ سے لوگ جمع ہو رہے ہیں لیکن جب ڈھپڑوں کی ڈھپ ڈھپ فضا میں گونجے گی تو دیکھنے والوں کو یقین ہو جائے گا کہ یہ اجتماع خوشی اور مسرت کا اجتماع ہے۔ شادی بیاہ کی تقریب ہے۔

جو روایت آپ نے بیان کی وہ صحیح ہے لیکن اس روایت سے موسیقی کا جواز ثابت نہیں ہو جاتا۔ دف کو رائج پذیر موسیقی طبلوں اور ہارمونیم وغیرہ پر محمول کر لینا بھاری غلطی ہے۔

جو عریاں موسیقی اور اخلاق سوز گانے آجکل فضاؤں میں بکھرے ہوئے ہیں ان کا ایمان شکن اتار چڑھاؤ، فحش الفاظ، رکیک معانی، اسفل جذبات کو بھڑکانے کے لئے از بسکہ کافی ہیں۔

جن گھروں اور محفلوں میں یہ تباہ کن گیت سنے جاتے ہیں وہاں شرم و حیا اور اخلاق و کردار بھی باقی نہیں رہتا چہ جائیکہ تشرع اور تقویٰ۔

اسلام جیسا محتاط اور مقدس مذہب ان گانوں سے لو لگانے کی اجازت نہیں دے سکتا اور ان گانوں اور موسیقیوں کا باقاعدہ اہتمام کے ساتھ سننا ان سے لو لگانے کے مترادف ہے۔

اپنے دوسرے سوال کا جواب ان جوابات کی فہرست میں ملاحظہ کیجئے جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے ہیں۔

حج بدل

سوال :۔ از نعیم جاوید صاحب۔ جہاں آباد۔

حج بدل کیا ہے؟

ایک شخص صاحب استطاعت تھا مگر اپنی زندگی میں اسے حج کی توفیق نہ ہوئی اور مرنے سے قبل اپنے وارثین میں سے کسی کو اپنی جانب سے حج کی وصیت بھی کی۔ اب اگر ان کی موت کے بعد ان کے وارث مرحوم کے نام پر حج بدل کرے تو کیا مرحوم کی فرضیت ادا بھی جائے گی۔ فرض کریں کہ مرحوم صاحب استطاعت نہ تھا، اب اس کی اولاد صاحب استطاعت ہیں

توکیا ان کی اولاد مرحوم کی جانب سے حج بدل کر سکتی ہے؟

الجواب:۔

حج بدل کی تعریف سن لیجئے:۔

اگر کسی شخص پر حج فرض ہو یعنی وہ صاحبِ استطاعت ہو لیکن بذاتِ خود حج کرنے سے معذور ہو تو وہ اپنی طرف سے کسی کو حج کرا سکتا ہے۔ یہ طریقہ شرعی طور پر جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے لے کر آج تک اس طریقہ پر برابر عمل ہوتا آرہا ہے۔

اس بارے میں ضروری تفصیل ذہن نشین کر لیجئے کہ عذر عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عارضی ایک دائمی۔ دونوں ہی صورتوں میں حج بدل کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک اعتبار سے دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں رہے گا۔

اگر عذر عارضی قسم کا تھا تو عذر رفع ہونے کے بعد دوبارہ حج کرنا ضروری ہے۔ جب تک خود حج نہیں کرے گا فرض ادا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے عارضی عذر میں کسی کو اپنی طرف سے حج کے لئے بھیجا اور پھر معاً اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا فرض ادا ہو ہی چکا تھا اس کے ترکہ میں سے حج بدل کرانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

اور اگر کوئی شخص عذرِ دائمی میں مبتلا ہوا اور بظاہر اس عذر کے رفع ہونے کی توقع نہ ہو۔ مثلاً اندھا ہو، ٹانگوں سے بیکار ہو یا فالج زدہ ہو۔ اور وہ صاحبِ استطاعت ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کو حج بدل کے لئے روانہ کرے۔ جیسے سال بعد یا اگلے ہی سال اتفاقاً اور معجزتاً اس کا عذر ختم ہو جائے جس کے بظاہر ختم ہونے کے ذرہ برابر بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ تو اس سے نئے دوبارہ حج کرنا کوئی ضروری نہیں۔ کرنے پر تو ثواب مل ہی جائے گا نہ کرنے پر کسی قسم کا کوئی محاسبہ اور دارو گیر نہیں ہوگی۔

حج کی فرضیت اس کے ذمہ سے اسی وقت ساقط ہو گئی تھی جب اس نے عذرِ دائمی کی حالت میں اپنی طرف سے حج کرا دیا تھا۔

غالباً یہ بات کہنا تو غیر ضروری ہی ہوگی کہ راستہ اور سفر کے تمام اخراجات اسی معذور آدمی کے ذمہ رہیں گے جو حج کرا رہا ہے۔ اتنی سی بات تو سبھی جانتے ہیں۔

اب اپنے سوال کا جواب سنئے:۔

اگر مرنے والا صاحبِ استطاعت تھا لیکن مرتے وقت اس نے حج کی وصیت نہیں کی۔ تو اس صورت میں اس کی طرف سے حج بدل اسی وقت کرایا جا سکتا ہے جب تمام ورثاء راضی ہوں۔ اگر تمام وارثین راضی نہیں ہیں تو حج بدل کرانا غلط ہوگا نابالغ ورثاء کی خفگی اور عدمِ اجازت کو نظر انداز کر دیا جائے گا لیکن اگر اس شخص نے مرنے سے قبل حج کی وصیت کر دی تھی تو پھر وراثت تقسیم کرنے سے قبل حج بدل کرانا انتہائی ضروری ہے اب ورثاء کی رضا اور عدمِ رضا کو نہیں دیکھا جائے گا۔ اگر کسی ایک وارث کی بھی مرضی نہ ہو تب بھی حج کرانا ناگزیر ہوگا ورنہ سب گناہگار رہیں گے۔

اگر مرنے والا صاحبِ استطاعت ہو اور اس کی اولاد اس کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتی ہو تو بخوشی کرا سکتی ہے کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں پیسہ غریب اور نادار مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے یا کسی غریب مسلمان لڑکی کے جہیز وغیرہ کا بندوبست کر دیا جائے۔ مرنے والے پر حج فرض نہیں تھا۔ لہٰذا قیامت کے دن کسی قسم کے محاسبہ اور مواخذہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پس ماندگان کا مقصد تو ایصالِ ثواب ہے جو دوسری صورتوں میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

امام سے ناراضگی

سوال:۔ (ایضاً)

محلے کی ایک اقلیت اگر امام صاحب سے ناراض ہو اور کسی بھی صورت میں اس کی اقتدا کے لئے تیار نہ ہو۔ اختلاف کی نوعیت اتنی شدید ہو کر اقلیتی جماعت کے ذریعہ محلے میں دوسری مسجد تعمیر کئے جانے کی نوبت آگئی ہو تو ان حالات میں

امام صاحب کے لئے دین و شریعت کی روشنی میں کون سا
راستہ بہتر ہے۔ آیا وہ اکثریت کی حمایت کی وجہ برابر دستور
امامت کے فرائض انجام دیتا ہے یا محلے میں باہمی اتحاد و
اتفاق کو پیش نظر رکھ کر اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔
امید کہ کسی قریبی اشاعت میں اس کا تشفی بخش حل
عنایت فرمائیں گے۔

الجواب :۔ (ایضاً)

دیکھا یہ جائے کہ غلطی امام کی ہے بھی یا نہیں۔ اگر یہ ثابت
ہو جائے کہ امام صاحب فی الحقیقت قصوروار ہیں تو پھر یہ دیکھا
جائے کہ قصور اور جرم کس نوعیت کا ہے اگر قابل معافی
ہے تو اقلیت کی خفگی اور ناراضگی بیجا ہے۔
لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ دنیا میں کفر و شرک بدعت و
گمراہی کے ماسوا کوئی جرم ایسا نہیں ہے کہ جو ناقابل تلافی
اور ناقابل معافی ہو۔
فرض کیجیے کہ امام صاحب نے سنیما جیسے گناہ کا ارتکاب
کیا یا اور کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا ہوئے لیکن اب معافی طلب
کر رہے ہیں، اپنے کئے پر شرمسار ہیں اور آئندہ کے لئے
اس تقصیر و خطا کے قریب نہ جانے کا زبانی عہد بھی کر رہے
ہیں تو اس صورت میں امام صاحب کو معاف کر دینا ہی
انسانیت اور اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے۔ ان کی
غلطی کو نظر انداز نہ کرنا، انھیں ستانا اور ذلیل و خوار
کرنے کے درپے رہنا سنگدلی اور درندگی کی دلیل مبین ہے
جو دنیا میں قابل مذمت ہے اور آخرت میں قابل گرفت بھی
ہو سکتی ہے۔
اگر اکثریت امام کی حامی اور طرفدار ہے اور اس بات
پر بضد ہے کہ امام صاحب ہی امامت کے منصب پر بدستور
فائز رہیں تو اقلیت کی مخالفت کو نظرانداز کرنا ضروری اور
ناگزیر ہو جائے گا۔ خواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ قائم
کرنے کی دھمکیاں دیتی ہو۔
اگر امام صاحب باوجود کہ مجرم رہ چکے ہوں یا اگر
ان سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو اس کا صیغہ کے ذمہ داران
سے معافی طلب کر چکے ہوں۔ لیکن محض فتنہ اور انتشار کو
دبانے کی خاطر امامت سے دستبردار ہو جائیں تو ان کا یہ اقدام
انتہائی محمود، مبارک اور لائق صد تحسین ہوگا اور اس پر
اجر و ثواب کا ترتب یقینی ہے۔

ایک روایت کی تحقیق

سوال :۔ از ابو بہار کٹکلی۔
جمعہ کا خطبہ کتاب دیکھ کر پڑھا گیا۔ خطیب صاحب نے
دوران خطبہ میں عاشورہ سے متعلق ایک حدیث بیان کی
یعنی اس حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی عاشورہ کے روز
غسل کرے گا وہ ناگہانی موت سے بچا رہے گا اور جو سرمہ لگائیگا
وہ آنکھوں کے مرض سے محفوظ رہے گا۔ آیا یہ حدیث کہاں تک
صحیح ہے، از راہ کرم جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب :۔

روایات کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ جب تک آپ
اس کتاب کا نام نہ بتائیں یا اس کتاب میں جس کتاب کے
حوالہ سے حدیث نقل کی گئی ہو اس کے نام سے واقفیت نہ
بخشیں تو متیقن طور پر کچھ کہنا خلاف احتیاط اور غیر مناسب
ہی ہوگا۔
تمام روایتیں ذہن میں موجود اور مستحضر تو ہیں نہیں کہ
پٹ سے سوچا اور کھٹ سے روایت کی صحیح پوزیشن ظاہر کر دی۔
اتنا ضرور ہے کہ مستقل طور پر کتابوں کا مطالعہ کرتے
رہنے سے تھوڑا بہت درک اور کسی نہ کسی درجہ میں روایت
شناسی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اور آدمی اَن دیکھی روایت
کے بارے میں بھی بڑی حد تک صحیح رائے قائم کر لیتا ہے۔
آپ کی نقل کردہ روایت کے بارے میں پورے وثوق
کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاوقتیکہ آپ یا خطیب محترم
صاحب حوالہ سے نہ نوازیں۔ ذخیرہ احادیث اور اکابرین
کی کتابیں پڑھنے سے ہمیں اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ اس قسم کی

روایتیں بالعموم من گھڑت اور افسانہ ساز ہوا کرتی ہیں۔

ہم نے احادیث کی کسی معتبر کتاب میں یہ روایت نہیں دیکھی لہٰذا اس کا ضعیف ہونا قطعی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ روایت کسی بندے کی ایجاد ہو۔ واللہ اعلم۔

خطبہ بزبانِ اردو

سوال ۹:— (ایضاً)

جمعہ کے خطبہ ثانیہ کے پڑھتے وقت خطیب صاحب خطبۂ عربی کو زبان اردو کے بیان کرنے لگے۔ اس صورت میں شرعی اعتبار سے خطبہ ہو گیا ہے یا نہیں؟

الجواب ۹:—

خطبۂ جمعہ میں اردو اور عربی کا خلط ملط مکروہ ہے دونوں خطبے عربی ہی زبان میں ہونے چاہئیں۔ فقہاء کے نزدیک عربی زبان بھی شرط اور لازم کی حیثیت رکھتی ہے اردو زبان میں خطبہ دینا یا کسی عربی خطبہ کا ترجمہ اردو زبان میں بیان کر دینا اس روایت کا قتل ہے جو خیر القرون سے مسلسل بہ سلسلہ چلی آ رہی ہے۔

مولانا عامر عثمانیؒ بھی شدت کے ساتھ اسی بات کے قائل تھے کہ خطبۂ جمعہ عربی ہی زبان میں ہوا کرے، اردو زبان میں رائج نہ ہونے پائے۔ ہم بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ جمعہ کے دونوں خطبے عربی زبان میں ہونے چاہئیں اردو زبان میں خطبوں کا رواج اکابرین کی سنت و طریق کے منافی ہے جمعہ کے دن اگر وعظ و تقریر ضروری اور مفید محسوس ہو اور عوام تقریر سننے کے خوگر اور متقاضی ہوں تو خطبوں سے پہلے تقریر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یا نماز جمعہ کے بعد وعظ و تقریر کا سلسلہ عمل میں لایا جائے۔ خطبے تو دونوں عربی ہی زبان میں ہونے چاہئیں۔

اگر کوئی شخص دونوں خطبوں میں سے ایک عربی زبان میں پڑھے اور دوسرا اردو زبان میں تو بھی فرضیت تو ادا ہو ہی جاتی ہے۔ بلکہ خطبہ تو اس صورت میں بھی ادا

وجوب کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ قرآن کی چند آیتیں پڑھ کر نماز جمعہ قائم کر لی جائے۔

شرط اللہ اور رسولؐ کا ذکر ہے باقی تمام تفصیلات تو سنت اور استحباب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر ان تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا تو سنت و استحباب کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا۔

سوال ۱۰:— حافظ محمد یونس خان۔ کلکتہ۔

قرآن حکیم میں حیض کو گندگی قرار دیا گیا ہے۔ حالت حیض میں عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے روک اور بندش لگائی گئی ہے اور حیض سے نمٹنے کے بعد عورت کے ساتھ صحبت و مقاربت کی بلا قید و شرط اجازت دی گئی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حیض سے فراغت کے بعد غسل ضروری ہے۔ کیا واقعتہً غسل سے پہلے صحبت کرنا غلط ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ غسل ضروری نہیں ہے۔ تفصیل کے ساتھ جواب دیں۔

الجواب ۱۰:—

پہلی بات تو یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت تین دن تین رات اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن دس رات ہے۔ یعنی تین دن سے کم اور دس دن سے زائد نہیں آ سکتا۔ اگر دس دن سے زیادہ آیا تو دس دن کے بعد جتنی مدت بھی گذرے گی وہ مدت استحاضہ کہلائے گی۔

خون استحاضہ ایک قسم کا مرض ہوتا ہے، اسکا جاری رہنا نہ رہنا نہ مانع عبادت ہوتا ہے اور نہ مانع صحبت۔ مثلاً یکم جنوری کو حیض کی ابتدا ہوئی اور پندرہ جنوری تک یہ سلسلہ جاری رہا تو فقہ حنفی کی رو سے دس تاریخ تک تو حائضہ ہے اور حائضہ سے صحبت و مقاربت حرام قرار دی گئی ہے نہ ہی حائضہ کو نماز و تلاوت قرآن وغیرہ جیسے کام ادا کرنے دیا گیا ہے لیکن اگر خون دس دن سے تجاوز کر جائے تو دس تاریخ سے پندرہ تاریخ تک وہ مستحاضہ ہے اور استحاضہ کے ایام میں عبادات

...رلیں پردہ رہتے ہی میں خیر اور امن ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مولانا حسین احمد مدنی سے
...ی عقیدت اور حسن ظن رکھیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے
...ے پر بھی تنقید و ملامت کے پتھر نہ اچھالیں۔ ؟

مولانا حسین احمدؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بزرگ حضرات
...تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان حضرات کی بزرگی مسلم، ان کے
...تخلیک و تذبذب ماورا و مافوق ہے۔

لیکن ان کی بزرگی، تورّع اور صداقت و تقدیس کی بنا پر
...سوچنا اور کہنا قطعاً مناسب نہیں ہوگا کہ ان حضرات سے
...طا کا صدور ناممکن ہے، غیر متوقع ہے، بعید از
...عقل ہے۔

بزرگوں سے کبھی لغزش اور بھول چوک نہیں ہوتی۔ یہ
...عقیدہ اور فکر سراسر دیوبندی مکتب فکر کے خلاف ہے۔ اصل
...دیوبندی حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ بزرگانِ دین سے
...ں خطا اور غلط فہمی کا صدور احاطۂ امکان سے خارج نہیں۔

بزرگانِ دین مسلسل عبادت و ریاضت کے ذریعہ بشریت
...اعلیٰ اور ارفع مقام پر تو فائز اور متمکن ہوجاتے ہیں لیکن
...رت عبادات کی وجہ سے ان میں ملکوتیت پیدا نہیں ہوجاتی
... فرشتے نہیں بن جاتے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین انسان سے
...ں خطا اور گناہ کا صدور بالکل اسی طرح ممکن اور متوقع ہے جس طرح
...ی ترین انسان سے خطا اور گناہ کا وقوع امکان و توقع
... دائرہ میں داخل ہے۔

خطاؤں کے مختلف لیول اور درجات ہوتے ہیں — بعض
...طائیں چھوٹی اور معمولی درجہ کی ہوتی ہیں بعض بڑی اور بعض
...ت ہی بڑی ہوتی ہیں۔ اور بعض خطائیں ذلیل اور اسفل ترین
... ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بزرگانِ دین سے ایسی اسفل
...ارذل خطائیں سرزد نہیں ہوتیں جن کا وقوع اور صدور ہم جیسے
...م اور کمتر درجہ کے لوگوں سے ہوجایا کرتا ہے لیکن دوسری
...یت کی غلطیاں ان سے بھی سرزد ہوتی رہی ہیں۔
مولانا مدنیؒ اور مولانا گنگوہیؒ دونوں قابلِ احترام بزرگوں نے

محمد بن عبداللہ نجدی کے بارے میں دو مختلف رائے قائم
کیں۔ ایک نے اچھا سمجھا اور ایک نے برا، ایک نے تحمید و تعریف سے
کام لیا ایک نے تعریض و تنقیص سے۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ دونوں بزرگوں میں سے ایک غلطی پر
ضرور ہے۔ آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قصوروار ٹھیرایئے
اس معاملہ میں دونوں بزرگ دو متضاد اور متضارب رائے
رکھنے کے بعد حق پر نہیں ہوسکتے۔ ایک سے غلط فہمی کا صدور
تو یقینی اور لازمی ہے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے بارے میں جو تحقیقات
سامنے آئی ہیں ان پر گہری اور عمیق نظر ڈالنے کے بعد تو یہی اندازہ
ہوتا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خیالات ٹھوس حقائق
پر مبنی ہیں۔

یہ اجمالی سی بات کرنے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ
اس سلسلہ پر مزید باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ گفتگو
نہ کی جائے۔ اور حق و حقیقت اور صواب و ناصواب جاننے
کے لئے اس دن کا انتظار کیا جائے جس دن ذرہ برابر بھی
کسی معاملہ میں ناانصافی سے کام نہیں لیا جائے گا۔ جس دن
سچ اور جھوٹ، حق اور باطل، غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں
اپنی تمام تر حقیقتوں اور صداقتوں کے ساتھ اجاگر ہوں گی۔

(نوٹ) اس بارہ میں اگر آئندہ کسی صاحب نے خط لکھا
تو اس خط کو ناقابلِ التفات تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا اس موضوع
پر خط لکھنے کے بعد جواب کی امید رکھنا عبث ہی ہوگا۔

نماز کے بعد دعا وغیرہ

سوال ۱۴۷: — از پیرزادہ محمد شفیع۔ سری نگر۔

ہمارے شہر سری نگر میں دو مساجد ہیں — دو
امام صاحبان جو کہ مسلک اہلحدیث سے تعلق رکھتے ہیں، نے
دو مختلف فتوے صادر فرمائے ہیں۔ ایک کہتا ہے نماز فرض
کے بعد کوئی دعا نہیں پڑھنی چاہئے بلکہ سلام کے بعد ہی مسجد سے
چلا جانا چاہئے۔ یہاں تک بھی فرمایا کہ مسجد میں کوئی اور عبادت
تلاوت وغیرہ فاتحہ خوانی سے کرنا بھی ناجائز ہے۔ کیا یہ بات

صحیح ہے؟

الجواب:-

آپ کے سوال میں جو عبارت زیادہ طویل ہو گئی تھی اس لئے ہم نے بخوف طوالت حذف کر دیا ہے۔

جو صاحب یہ کہتے ہیں کہ نماز کے بعد کوئی دعا نہیں مانگنی چاہئے اور سلام پھیرتے ہی فوراً علیحدہ ہو جانا چاہئے ان سے کسی ایسی حدیث کا حوالہ طلب کیجئے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنے سے احتراز کیا ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئ قدیر۔ اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد پڑھا کرتے تھے۔

امت کا اجماع ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے، اگر نماز کے بعد دعا کو مسنون تصور نہ کیا جاتا تو اس قدر پابندی اور التزام کے ساتھ کیوں بعد از نماز دعا پر تعامل چلتا رہتا۔

ہمیں اہل حدیث کی مسجد میں نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا جماعت کے بعد وہاں بھی دعا مانگی گئی۔ اگر اہل حدیث کا عام مسلک یہی ہوتا کہ سلام پھیرو اور بھاگو تو ان کے یہاں لازمی طور پر نماز کے بعد دعا سے انحراف اور اعراض برتا جاتا اور کم از کم ان کی مساجد اور حلقوں میں دعا اور اور عنقا بن کر رہ جاتی، لیکن ایسا نہیں ہے —— فہم و قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا مانگی جائے مقبولیت کے لئے اس سے زیادہ بہتر وقت اور کونسا ہو سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں مساجد میں بجز فرائض کے دوسری عبادت سے احتراز و اجتناب کرنا چاہئے — سنن و نوافل اور قرآن پاک کی تلاوت مساجد میں نہ ہو تو نسبتاً بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سنن و نوافل وغیرہ اپنے مکانوں میں جا کر ادا کیا کرتے تھے مسجد میں سنتیں پڑھنے کا رواج نہیں تھا لیکن چونکہ اب زمانہ مسجد میں سنتیں پڑھنے کا رواج عام ہو گیا ہے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی روک ٹوک فتنہ انگیزی کا باعث بن سکتی ہے اس لئے خاموشی بہتر ہے جو لوگ دریافت کرتے ہیں اور ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کے آرزو مند اور مشتاق ہوتے ہیں ان سے ہماری گزارش اور التجا یہی ہوتی ہے کہ سنتیں وغیرہ اپنے گھروں میں ادا کیا کرو، مساجد میں صرف فرائض کا اہتمام ہونا چاہئے۔

قرآن کی تلاوت گھر ہی میں موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے وہاں برکتوں اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اس لئے بھی زیادہ انسب اور بہتر یہی ہے کہ قرآن مجید اپنے گھروں میں تلاوت کیا جائے تاکہ گھر رحمت خداوندی کے انوار سے جگمگا اٹھیں اور تلاوت کلام پاک کے نتیجہ میں نصیب ہونے والی برکات گھر کے در و دیوار میں رچ بس جائیں۔

مسجد میں قرآن پاک کی تلاوت اس حال میں کہ نمازی اپنی نمازیں پڑھ رہے ہوں، غلط ہے۔ تلاوت سے نمازوں میں خلل واقع ہوگا۔ نمازیوں کا دھیان بٹے گا۔ ان کی توجہ کامل طور پر نماز میں مرتکز نہیں رہے گی۔ اسکی ذمہ داری بڑی حد تک ان ہی حضرات پر آئے گی جو اس وقت با آواز بلند قرآن کی تلاوت میں منہمک و مشغول ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت آہستہ آہستہ کی جائے اس طرح کہ کوئی سن بھی نہ سکے۔ اس طریقہ کو نا معقول ناپسند قرار دیا گیا ہے۔

جہری تلاوت میں جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ سری تلاوت میں حاصل نہیں ہوتا۔ الحاصل قرآن کی تلاوت با آواز بلند کرنی چاہئے اور چونکہ مسجد میں آواز کے ساتھ نمازیوں کی نماز میں خلل پیدا کرنے کا باعث بنے گا اس لئے تلاوت کا التزام گھر ہی میں مناسب اور قرین صواب ہے۔

کوئی روک ٹوک نہیں اور اس سے صحبت و مقاربت کی بھی عام اجازت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عورت کو حیض بالعموم اپنی مخصوص اور متعین عادت کے مطابق ہے۔ بعض کو چار دن۔ بعض کو پانچ دن۔ بعض کو چھ سات دن اور بعض عورتوں کو انتہائی مدت تک یعنی دس دن۔

بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی عادت متعین نہیں ہوتی۔ کبھی پانچ دن آگیا کبھی آٹھ دن اور کبھی دس دن تک آتا ہے،

اس ضروری تفصیل کے بعد اب اپنے سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ اگر حیض دس دن یعنی انتہائی مدت تک آکر منقطع ہوا تو غسل سے پہلے صحبت کرنے میں کوئی قباحت نہیں

مگر عادت کے مطابق آکر رکا یعنی ہمیشہ سات دن آیا کرتا تھا اور حسب عادت ساتویں دن اگر بند ہوگیا تو اس صورت میں اگرچہ غسل کے بغیر صحبت جائز ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ صحبت سے پہلے

تیسری صورت یہ ہے کہ عادت متعین ہی نہیں کبھی چھ دن آیا کبھی چھ دن سے زائد کبھی چھ دن سے کم۔ ایسی عورت کے ساتھ قبل از غسل صحبت کرنا ممنوع اور مکروہ ہے، لیکن حرام کسی بھی صورت میں نہیں۔ انقطاعِ حیض کے بعد صحبت کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔ صرف تیسری صورت میں کراہت اور تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔

ویسے شائستگی اور نظافت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر صورت میں مباشرت سے پہلے غسل کر لیا جائے۔

سوال ۱۱ :- (ایضاً)

میں نے سنا ہے کہ حاملہ عورت کی عدت بچہ کی پیدائش پر ختم ہوتی ہے، کیا یہ بات درست ہے۔ اور اگر اسقاط حمل ہو جائے تو؟ کیا اسقاط حمل سے بھی عدت ختم ہو جائے گی؟

الجواب ۱۱ :-

آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے [illegible] وضع حمل پر پوری ہو جاتی ہے۔ اگر [illegible] شوہر کا انتقال ہو گیا اور اگلے ہی دن [illegible] بچہ پیدا ہو گیا

تو عدت ختم ہوئی اور بیوہ عورت کی شرعی پابندیوں سے آزاد سمجھی جائے گی۔ اور اگر شوہر کے انتقال کے آٹھ ماہ بعد ولادت ہوئی تو آٹھ ماہ تک عدت جاری رہے گی۔ اس عرصہ میں بہت سی پردہ تمام پابندیاں اور قیود و شرائط عائد رہیں گی جو شریعت کی طرف سے ہر عدت گزارنے والی عورت پر عائد کئے جاتے ہیں۔

اسقاط حمل سے عدت کا انقطاع و اختتام اس صورت میں ہوگا جب بچہ کے ہاتھ پاؤں اور انگلیاں وغیرہ بن چکی ہوں اگرچہ بچہ مکمل نہ ہو۔ لیکن اگر ہاتھ پاؤں وغیرہ واضح نہیں ہوئے تو اسقاط حمل سے عدت ختم نہیں ہوگی۔

سوال ۱۲ :- (ایضاً)

میرے دوست کی خالہ جن کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھیں۔ دورانِ تلاوت میں انھیں قرآن مجید میں ایک بال نظر آیا انہوں نے اس بال کو عطر میں بسا کر ایک ڈبیا میں رکھ لیا ہے وہ کہتی ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بال ہے۔ یہی ہمارے دوست کا خیال ہے۔ وہ لوگ اس بال کی باقاعدہ زیارت بھی کراتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے۔

الجواب ۱۲ :- (ایضاً)

آپ مستقل تلاش و جستجو میں لگ جائیے۔ گھر کی کوئی جگہ اور کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آئے گا کہ جہاں بال نہ ہوں۔ سر کے مونچھ کے، داڑھی [illegible] ہزاروں بالوں میں سے نہ معلوم روزانہ کتنے بال گرتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، منڈوائے اور کتروائے جاتے ہیں۔ وہ ہوا سے اڑ کر ادھر سے ادھر جا پڑتے ہیں۔

آپ تجسس سے کام لیجئے جو کتابیں روزمرہ پڑھی جاتی ہیں ان میں جا بجا آپ کو بال نظر آئیں گے۔ ایک قرآن ہی کا کیا اختصاص۔

جو قرآن جزدانوں میں لپیٹ کر طاقوں کی زینت نہیں بنا دیئے جاتے، بلاوجہ اور پابندی کے ساتھ روزانہ

تلاوت کئے جاتے ہیں ان میں بالوں کا پایا جانا حیرت ناک نہیں ہے، بلکہ بالوں کا نہ پایا جانا قابلِ حیرت ہوسکتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جو مزاج عجائب پسند ہوتے ہیں وہ قرآن میں بال دیکھ کر حیرت و تحیر میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر حیرت و تحیر کا اظہار کریں۔

قرآنِ حکیم میں نکلے ہوئے بالوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال سمجھنا، انھیں معطر کر کے ڈبیوں میں رکھنا باقاعدہ ان کی زیارت کرانا علم کی کمی اور عقیدے کے کھوکلے ہونے کی علامت ہے۔

صحیح کے بال مبارک کی تکذیب توہین کرنے سے جو گناہ لازم آسکتا ہے وہی گناہ اس وقت بھی لازم آئیگا جب ہر کس وناکس کے بال کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بال باور کرایا جائے۔ اجہل لوگ اس غلط گمان میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم اس قسم کی جو بھی حرکات کر رہے ہیں یہ سب محبت اور عقیدت کے رجسٹر میں درج کی جائیں گی۔ حالانکہ ان نازیبا حرکات اور غیر ذمہ دارانہ باتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کھلی توہین ہوتی ہے وہ وجہ پاداش اور موجب عذاب بھی بن سکتی ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

آپ کے دوست اور ان کے گھر والے ذہنی طور پر بریلوی حضرات سے متأثر اور قریب تر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کے اس رویہ اور طرز عمل پر صرف حیرت ہی نہیں کی جائے گی بلکہ آنسو بھی بہائے جائیں گے۔ بات رونے ہی کی ہے کہ آدمی صحیح العقیدہ ہوتے ہوئے ان خرافات میں مبتلا ہوجائے جن میں مبتلا ہوجانا ضلالت و گمراہی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور جن پر عذاب خداوندی کا ترتب خلاف قیاس اور منافیٔ عدل نہیں ہوتا۔

لیکن اگر وہ ذہنی طور پر بریلوی حضرات کے مرید ہیں تو پھر ان کا یہ رویہ خلاف دین اور لائق مذمت تو قرار دیا جاسکتا ہے مگر خلاف روایات اور قابلِ اچنبھہ نہیں۔

ابن عبدالوہاب نجدی

سوال ۱۳ :- از سلیم ہوڑہ

ایک کتاب عقائد علمائے کرام دیوبند اور عقائد وہابیہ مصنفہ مولانا مطیع الحق صاحب نظر سے گذری۔ اس میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ انھیں ابن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں صحیح معلومات نہیں تھیں اسلئے ان کو اور ان کے متبعین کو فتاویٰ رشیدیہ میں اچھا لکھدیا ہے اب آپ لکھ رہے ہیں کہ مولانا حسین احمد صاحب کو صحیح معلومات نہیں تھی اس لئے انھیں ابن عبدالوہاب کو برا لکھدیا ہے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ الشہاب الثاقب میں مولانا مدنی ابن عبدالوہاب کو جیسا کچھ برا لکھا ہے وہ اگر عدم تحقیق کی بناپر ہے تو سخت غلطی ہے۔ کیونکہ باقاعدہ طور سے کسی کو برا لکھنا اور بغیر تحقیق کے سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ابن عبدالوہاب تو کوئی غیر معروف و مشہور شخص نہیں تھا کہ اس کے بارے میں خیالات کو ایسی غلطی پر مبنی مانا جائے۔ ذرا غور کر کے جواب دیجئے۔ کرم ہوگا۔

الجواب ۱۳ :-

مولانا عامر عثمانی علیہ الرحمہ اس بارے میں جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل درست ہے۔ اشکال اور تردد کی گنجائش نہیں اگر آپ کا عقیدہ آئینہ کی طرح صاف ہے اور آپ بزرگانِ دین کو معصوم عن الخطا اور محفوظ عن المعصیت تصور نہیں کرتے تو کسی بزرگ کی طرف فکری اور اجتہادی غلطی منسوب کردینے پر اعراض و تحیر چہ معنی دارد؟۔

اب دنیا میں نہ عبدالوہاب نجدیؒ باقی رہے اور نہ مولانا حسین احمد مدنی رح۔ اس لئے احوط اور مناسب تر بات یہی ہے کہ اس مسئلہ کو نہ کریدا جائے۔ اگر آپ اس مسئلہ کو کریدیں گے تو بحث و مجادلہ اور تنقید و تنقیص کی بنیادوں پر مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک بغض محل اور تعمیر ہوجائے گا۔ بعض لوگ مولانا مدنیؒ پر جرح کریں گے اور بعض مولانا گنگوہی پر۔ اور پھر آٹومیٹک طور پر مصلحتوں کا غبار چھٹ جائے گا اور تاریخ وواقعات کے گوشوں سے چھن چھن کر ایسی باتیں سامنے آئیں گی جن کا [illegible]

لانا غلط ادینا جائز ہے۔ اس رقم کو غریب اور نادار مسلمانوں کے مابین تقسیم کر دیا جائے۔ غریبوں اور مفلسوں میں یہ رقم تقسیم کرتے وقت صدقہ وخیرات کی نیت نہیں کرنی چاہئے اس لئے کہ سود حرام ہوتا ہے اور سود کے پیسے کو صدقہ وخیرات کی نیت سے خرچ کرنا بجائے خود ایک گناہ ہے۔

زید کے سرمایہ میں سے واجب شدہ سودی رقم نکلوا کر بلا تأمل بکر کے زیورات نیلام ہونے سے بچائے جاسکتے ہیں۔

درود وغیرہ میں اختصار

اگر کسی صفحہ میں ایک سے زائد بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آرہا ہے تو بغرض اختصار صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے "صلعم" لکھ دینا اور "ص" بنا دینا کافی ہے۔ ہر بار صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا ضروری نہیں۔ اسی طرح "علیہ السلام" کی بجائے "ع" اور "رحمۃ اللہ علیہ" کی بجائے "رح" بنا دینے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔

داڑھی کی مقدار

داڑھی رکھنا واجب ہے۔ اس بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ اختلاف کی وجہ بھی ظاہر دیا ہر ہے اور وہ یہ کہ داڑھی کی متعینہ مقدار احادیث رسول سے ثابت نہیں ہے۔ ویسے قیاس و اجتہاد کے بعد عام فقہاء اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ داڑھی ایک مشت سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ بعض لوگ اس معاملہ میں بڑا تشدد برتتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ اگر کسی کی داڑھی ایک مشت سے کم ہو تو اس پر لعن طعن نہیں کرنی چاہئے۔ داڑھی کا یکمشت سے کم رکھنا قرآن و حدیث کے خلاف نہیں ہے صرف اس قیاس و اجتہاد کے منافی ہے جس کی روشنی میں فقہاء نے یکمشت کو ضروری قرار دیا ہے۔

تعدد ازدواج

بات تو بڑی پیچیدہ اور اہم ہے لیکن تفصیل کا یا لکل موقعہ نہیں۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ قرآن حکیم نے ہر مسلمان مرد کو ایک ساتھ چار شادیوں کی اجازت دی ہے، چند شرائط کے ساتھ۔ ان میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ سب بیویوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا معاملہ کیا جائے۔ دنیا کا قانون بنانے والے خود کو خدا سے زیادہ دانش مند اور عورت کا ہمدرد تصور کرتے ہیں اور مرد سے یہ اختیار چھین لینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک سے زائد شادی کرنا عورت کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس مسئلہ کے کئی پہلو قابل ذکر ہیں لیکن تفصیل کی گنجائش نہیں ہے ـــــ تفصیل درکار ہو تو تجلی کا سلسلہ پرسنل لا نمبر منگا کر پڑھئے۔ یا تعقیب نمبر کا مطالعہ کیجئے۔ یہ دونوں پرچے دفتر تجلی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ

حیدرآباد سے کم و بیش پندرہ سولہ خطوط ایسے موصول ہوئے جن میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھنا مذہبی رو سے کیسا ہے اور یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا مطلب کیا ہے؟

اس موضوع پر مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کم و بیش دس بار بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس لئے تفصیل کی احتیاج محسوس نہیں ہوتی خطوط کے انبار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گذشتہ دنوں اس فتنہ نے حیدرآباد میں بہت سر اٹھایا۔ خطوط بھیجنے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ انتشار اور بے چینی کا طوفان پالن حقانی صاحب کی "بدعت سوز" تقریر کے بعد پھیلا ـــــ موضوع بہت سڑا ہوا ہے اس لئے چند سطریں لکھتے ہوئے بھی انقباض محسوس ہو رہا ہے۔ اتنے بہت سارے خطوط موصول نہ ہوتے تو اس موضوع کی طرف ملتفت اور متوجہ ہونا بھی شاید ممکن نہ ہوتا۔

تفصیل کی تو امید ہی مت رکھیئے۔ مختصراً اتنی گذارش ہے کہ مذکورہ بالا وظیفہ پڑھنا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آدمی بظاہر کچھ بھی ہو ذہنی طور پر مشرک واقع ہوا ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خدا کے علاوہ دوسری ہستیاں بھی اس کی مرادیں پوری کر سکتی ہیں، اس کی امداد کر سکتی ہیں، اسے غیبی طور پر سہارا دے سکتی ہیں۔ وہ شخص یا تو شرک زدہ ہے یا اس کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ اگر واقعی خلل ہے یعنی دماغی توازن ہی صحیح نہیں تو پھر اس کے کسی قول و فعل کا نوٹس مت لیجئے۔ پاگل لوگ ایمان اور عقیدہ کے مکلف نہیں ہوتے۔ ان کی زبانوں سے نکلا ہوا کوئی فقرہ قابلِ گرفت نہیں ہوتا، خواہ اس فقرہ سے رخِ ایمان پر ہی زد پڑتی ہو ——— پاگلوں سے قیامت کے دن بھی کسی قسم کا کوئی محاسبہ اور پوچھ تاچھ نہیں ہوگی۔ آپ ان حضرات کے انجام کی فکر مت کیجئے جو سرے سے مکلف ہی نہیں قرار دیئے گئے۔

لیکن اگر دماغ پر خلل اور فتور غالب نہیں ہوا، دیکھنے میں بھی پاگل اور دیوانے محسوس نہیں ہوتے تو بس پھر سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی کھلے شرک میں مبتلا ہیں، اس گناہ کا شکار ہیں جو نبی کی سفارش سے بھی معاف نہیں ہوتا۔

بے شک آپ ان کی اصلاح کی کوشش کیجئے۔ نہ مانیں تو آپ بھی کوئی دین کے ٹھیکیدار نہیں۔ اپنی راہ پہ چلئے اور ان حضرات کے لئے دعائے خیر کیجئے جو خدا کے علاوہ دوسروں کو بھی مختارِ کل، قادرِ مطلق سمجھتے ہیں۔

اخبارات میں مولانا پالن حقانی صاحب کی تقریر بھی چھپ کر منظرِ عام پر آگئی تھی۔ پالن حقانی صاحب نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ عین حق تھا۔ صداقت اور خلوص پر مبنی تھا

حیدرآباد کی مکہ مسجد میں وہ طغری جس پر یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ مرقوم ہے مستقل توحید کے خلاف ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس طغرے کو محرابِ مسجد سے ہٹا دیجئے۔ زبان پر تو آیت ہے کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے وہ عبارت جلوہ گر ہو جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ :-

"اے عبدالقادر خدا کے لئے کچھ عطا کر"

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

اونٹ کی قربانی

اہلِ حدیث نے اپنے مسلک کی تائید میں جو روایت پیش کی ہے اس کی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ اس روایت سے بلاشبہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی قربانی میں دس افراد کی شرکت کو جائز قرار دیا۔

ہم اس روایت کو صحیح مانتے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ روایت منسوخ ہے اور اس کے منسوخ ہونے کی دلیل مسلم شریف کی مندرجہ ذیل روایت ہے :-

عن جابرٍ قَالَ نَحَرْنَا مَعَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عَامَ الحُدَیبِیَۃِ البَدَنَۃَ عَنْ سَبْعَۃٍ وَالبَقَرَۃَ عَنْ سَبْعَۃٍ ۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سات آدمیوں کی طرف سے اونٹ اور سات آدمیوں کی طرف سے گائے ذبح کی۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات ہی آدمیوں کی شرکت جائز سمجھی گئی ہے نہ کہ دس کی۔ مسلم کی یہ روایت ان تمام روایات پر بھاری ہے جو اہلِ حدیث کی طرف سے مستدل بنا کر پیش کی گئی ہیں۔

اگر اہلِ حدیث حضرات یہ ثابت کریں کہ عبداللہ بن عباسؓ سے سفر کا جو واقعہ تاریخ میں ملتا ہے وہ حدیبیہ کے بعد میں پیش آیا تھا اور مسلم کی یہ مذکورہ روایت ترمذی کی روایت سے منسوخ ہے تو ہم امام اعظمؒ وغیرہ کے مسلک کی تائید میں دوسرے قرائن و شواہد بھی پیش کریں گے۔ فی الحال تو یہی روایت پیش ہے جس کی تکذیب بھی ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کو منسوخ اور ترمذی کی روایت کو ناسخ قرار دیا جائے ٭

٭ ٭ ٭

لیکن یہ کہنا تو غلط اور نارواہی ہوگا کہ مساجد میں فرض نمازوں کے علاوہ ہر قسم کی عبادت خواہ وہ آواز کے ساتھ ہو یا خاموش طریقہ پر ناجائز ہے۔

ناپسندیدہ اور ناجائز میں زمین و آسمان کا فرق ہے بالخصوص نوافل و سنن اور قرآن حکیم کی تلاوت کو مساجد کے اندر ناجائز قرار دیتا ہے وہ الفاظ کے استعمال کرنے میں غیر ذمہ دار اور غیر محتاط واقع ہوا ہے۔ رہا مساجد کے اندر شور و غل کرنا خالص دنیاداری اور بے مصرف باتیں بگھارنا، ہنسی مذاق کرنا غلط در غلط اور انتہائی درجہ کی بے ادبی اور بد تہذیبی ہے۔ جو لوگ مسجد کا ادب و احترام نہیں کرتے احادیث میں ان کے لئے بڑی وعید آئی ہے۔

ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت

سوال ۱۵ :- (ایضاً)

اہلحدیث حضرات ایک جماعت ادا کرنے کے بعد بھی دوسری جماعت دیگر امام صاحب کے پیچھے ادا کرتے ہیں اس میں کیا حقیقت ہے ؟ -

الجواب ۱۵ :-

اگر آپ نے لفظ "جماعت" تحریر نہ کیا ہوتا تو ہم یہ سمجھتے کہ وہ فرائض سے پہلے سنن اور تحیۃ المسجد وغیرہ پڑھتے ہوں گے۔ لیکن لفظ جماعت کی موجودگی میں یہ گمان غلط ہی ہوگا۔

اگر انھوں نے مستقل یہ معمول بنا رکھا ہے کہ پہلے ایک امام کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کریں گے پھر دوسرے امام کے ساتھ تو اسے مجوبہ کہئے یا پاگل پن خیال کیجئے۔ دنیائے مذہب میں یہ ایسی ایجاد ہے جس پر عش عش کیا جا سکتا ہے۔

پچھلی صف میں تنہا کھڑے ہونے کا مسئلہ

سوال ۱۶ :- (ایضاً)

نماز جماعت کھڑی ہوئی اتنا صف مکمل ہوگئی ایک شخص بعد میں آیا وہاں صفوں کے بعد میں اکیلے کھڑے نماز کے ساتھ شامل ہوگیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسکی نماز ناجائز ہوئی اور اس کو از سر نو نماز پڑھنی چاہئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نماز ہوگئی۔ حقیقت کیا ہے ؟

الجواب ۱۶ :-

اگر پہلی صف میں گنجائش نہ ہو تو امام کے رکوع کرنے تک انتظار کیا جائے نیت نہ باندھی جائے ممکن ہے اتنے کوئی دوسرے صاحب بھی آجائیں اگر آجائیں تو خیر — نہ آئیں تو تنہا ہی کھڑا ہو جائے۔ کوئی گناہ نہیں، کوئی حرج نہیں۔ نماز درست ہو جائے گی۔

پہلی صف کے کنارے پر کھڑے ہوئے شخص کو بھی خود پیچھے ہٹا کر اپنے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں مناسب ہے جب اس شخص کے بارے میں یہ یقین ہو کہ یہ مسائل سے واقفیت رکھتا ہے۔ اگر کسی جاہل اور مسائل سے ناواقف یا غیر آدمی کو ہٹانے کی کوشش کی تو جھگڑے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اگر ضرورت محسوس ہو تو پیچھے سے اس شخص کو کہہ دیا جائے جسے معلوم ہو کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے اور مجھے کیوں پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔ جو لوگ یہ فرما رہے ہیں کہ پیچھے کی صف میں تنہا پڑھنے والوں کی نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں اعادہ ضروری ہے وہ اچھی علم ہوتے ہیں۔ ان سے دلیل طلب کیجئے پھر دیکھئے کہ وہ بغلیں جھانکتے نظر آئیں گے۔

وہ جوابات جنکے سوالات حذف کر دئیے گئے

دیوانگی

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں لیکن اس مفہوم میں حقیقت کے باوجود نبی کے آنے کے امکانات پھر بھی باقی ہیں، نبی آسکتا ہے لیکن نبی کے مبعوث ہونے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری رسول ہونے کی حیثیت پر کوئی حرف

اور اشکال پیدا نہیں ہوگا وہ پھر بھی آخری نبی کہلائیں گے تو ایسا شخص انتہائی درجہ کا احمق اور ابلہ ہے۔ ایسے شخص کو مجلۂ عجائبات تصور کرتے ہوئے عبرت کی نگاہ سے دیکھئے ——— اور بس ———

اختلافِ صحابہؓ

صحابۂ کرام کے مابین مناظرے بازی کبھی نہیں ہوئی ان کے درمیان اختلافات کا پایا جانا تعجب خیز اور تشویشناک نہیں ہے۔ بس فرق اتنا ہی ہے کہ ان میں بحث و تکرار کے وقت بھی خدا کا خوف اور محاسبہ و مواخذہ کا احساس رہا کرتا تھا۔ زبان ان کی اپنے کنٹرول میں رہا کرتی تھی۔ ہمارا رویہ جداگانہ ہے۔ محاسبہ اور مواخذہ کا احساس تو درکنار ہم تو لڑتے جھگڑتے وقت یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ہمارے جسموں پر شرعی لباس، چہرے پر گھنی داڑھی ہے اور شرعی لباس اور گھنی داڑھی کی موجودگی میں زبان پر گندے جملوں کا رقص، اعلیٰ درجہ کی بے حیائی، خوفِ خدا اور احتسابِ آخرت کا منظر ہے۔

صحابۂ کرام سوچ کر بولتے تھے۔ اور ڈرتے تھے کہ اگر ایسا ایک جملہ بھی کسی کی زبان سے نکل گیا جو عدل و دیانت کے حق میں قینچی اور چاقو کی حیثیت رکھتا ہو تو قیامت کے دن جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔ اور قینچی چاقو چلنے کے نتیجہ میں دوسروں کے احساسات پر جو زخم آئیں گے اس کی ذمہ داری سرتاسر ہم پر عائد ہوگی۔ ہمارے اسلاف داخلاف بولنے کے بعد سوچ لیا کرتے تھے، اگر ہم نے کسی کے تخالف میں بے انصافی اور بے راہ روی سے کام لیا ہو تو مرنے سے پہلے اس سے معافیاں طلب کرلیں تاکہ یوم محشر میں شرمساری و ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہمارا عالم یہ ہے کہ نہ سوچ کر بولتے ہیں اور نہ بول کر سوچتے ہیں۔ جو منھ میں آگیا بک دیا اور جو بک دیا اس پر دوبارہ غور کرنے کی کبھی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ رہی معافی تلافی تو اس کا تو سوال ہی نہیں۔ معافی تلافی کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایمان اور تقویٰ صرف میک اپ اور ایکٹنگ کے دائروں میں سمٹا ہوا نہ ہو بلکہ دل و دماغ میں سما گیا ہو۔ روح اور احساس میں رچ بس گیا ہو۔ رگ رگ میں گھل کر رہ گیا ہو ——— اور

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ———

کے پیش نظر اس بات کا یقین کامل ہو کہ ایک ایک حرکت کی تصویر بنائی جا رہی ہے۔ ایک ایک جملہ ٹیپ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ اور ہر برائی اور بھلائی کھل کر ہمارے سامنے آنے والی ہے ——— جب تک ہمیں حسابِ آخرت کا پورا پورا یقین حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک ہم کسی کا دل دکھا کر معافی نہیں مانگ سکتے۔ کسی کو گالی دیکر ندامت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ایکبار کسی پر کفر اور گمراہی کا فتویٰ لگا کر اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے ——— ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کریں گے اور ڈٹ کر بیٹھیں گے

صحابۂ کرام ایسی نازیبا حرکات کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ ان سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ ان کا اختلاف خالص علمی قسم کا تھا۔ وہ ذات و اشخاص پر گندے الفاظ کی کیچڑ پھینکنے کی بدتہذیبی کے مرتکب کبھی نہیں ہوتے ———

بینک کے سود کا مسئلہ

بینک میں رقم جمع کرانے کے بعد جو سود واجب ہوتا ہے اسے بینک میں ہی چھوڑ دینا کوئی مناسب اور معقول طرز عمل نہیں۔ یہ روپیہ اگر نہیں لیا جائے گا تو بینک کے وہ ملازمین لے اڑیں گے جن کو خدا اور خدا کے رسولؐ سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ یہ لوگ مزے اڑائیں گے، عیاشی کریں گے اور اسطرح وہ پیسہ غلط جگہ خرچ ہو کر بعض لوگوں کے حق میں موجبِ عذاب بنے گا۔ موجب عذاب بنے یا نہ بنے لیکن اس کا ایضاع بہر حال عمل میں آئے گا۔ اور دشمنانِ اسلام فائدہ اور انتفاع حاصل کریں گے۔

اس لئے فقہاء اور علماء نے اس سلسلہ میں بڑی مناسب راہ نکالی ہے۔ انھوں نے تلقین و تاکید کی ہے کہ بینک سے اپنا سود وصول کر لینا چاہئے اسے بینک میں چھوڑنا تقویٰ اور پرہیزگاری کا تقاضہ نہیں۔ البتہ اس کو اپنے استعمال میں

عبدالحمید صاحب صدیقی

اسلام میں صدقہ و احسان کی اہمیت

اسلام نے زکوٰۃ وغیرہ کے جو قوانین وحقوق مقرر کئے ہیں وہ ان سب سے بڑھ کر جود و سخا کرنے والے انسان کے دل کو ایک ایسے آدمی کا دل بنانا چاہتا ہے جو طلب سے کہیں زیادہ دیتا ہے اور جتنا اس پر خرچ کرنا واجب ہو اس سے کہیں زیادہ خرچ کرتا ہے بلکہ بے طلب و سوال عطا کرتا ہے اور خوشحالی و بدحالی میں شب و روز پوشیدہ طور پر اور علانیہ خرچ کرتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی وہی چیز پسند کرتا ہے جو خود اپنے لئے پسند ہو۔ بلکہ باوجود اپنی تنگ دستی کے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اور مال کو مقصود نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ مال کو لوگوں کے ساتھ علاقہ کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس کا دل خیر و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے وہ رضائے الٰہی اور ثواب کی نیت سے نہ کہ محبت جاہ و شہرت کی خاطر یا حاکم وقت کی سزا کے خوف سے خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چند قوانین اور قواعد ضوابط ہی سب کچھ ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں وہ سطح بیں ہیں اور انسان کی حقیقت سے نا آشنا۔ انسان کوئی مشین نہیں ہے کہ اسے گھمایا جائے تو وہ گھومنے لگے۔ کوئی پہیہ نہیں ہے کہ اسے حرکت دی جائے تو وہ متحرک ہو جائے اور روکا جائے تو رک جائے۔ وہ تو ایک ایسا مجموعہ ہے جو مادہ اور روح، جسم اور جان، عقل اور جذبات اور افکار و احساسات سے مرکب ہے۔ وہ تو ایک ایسا وجود ہے جو سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ جو کسی چیز کو محسوس کرتا اور شعور حاصل کرتا ہے۔ بعض چیزوں کو اختیار کرتا ہے اور انہیں دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے اور بعض کاموں کو کرتا ہے اور بعض کو ترک کرتا ہے اور بعض چیزوں یا لوگوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ان پر اثر انداز بھی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس وجود انسانی کے جو خصائص ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے ساتھ [illegible] کے سامنے [illegible] کی جائے [illegible] اور [illegible] زندگی کے دوسرے قوانین اور [illegible]

(الحشر: ۹)

گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ (المنافقون)

خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے روزی دی تمکو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ تو پھر کہے اے میرے رب! کیوں نہ ڈھیل دی مجھکو تھوڑی مدت کیلئے کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا۔

اور جو نیک عمل تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو خدا کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ

(البلد: ۱۱-۱۸)

مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گذرا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو۔ پھر ان لوگوں میں بھی داخل ہوا جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور (لوگوں پر) شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ یہی لوگ صاحب سعادت ہیں۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا۔ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (الدہر: ۸-۱۰)

اور باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش اور حاجت ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خالص خدا کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکرگذاری کے طلبگار ہم کو اپنے پروردگار سے اس دن ڈر لگتا ہے جو چہروں کو مکروہ المنظر اور دلوں کو سخت (مضطر) کر دینے والا ہے۔

* * *

* * *

* * *

احادیث نبوی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بندہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال۔ اس کا مال تو صرف وہ ہے جو اس نے کھا لیا اور ختم ہو گیا اور جو اس نے پہن لیا اور بوسیدہ ہو گیا اور جو اس نے راہِ خدا میں دیدیا اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس کے پاس ہوگا وہ اسے دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا" (مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارثوں کا مال خود اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے؟" صحابہؓ نے کہا "اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا مال پیارا نہ ہو" آپ نے فرمایا "بے شک تم میں سے ہر ایک کا اصل مال وہ ہے جسے تم راہِ خدا میں خرچ کر کے اللہ کے ہاں ذخیرہ کر لو اور وارثوں کا مال وہ ہے جسے تم پیچھے چھوڑ جاؤ" (نسائی)

عدی ابن حاتم سے روایت ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تم میں سے ہر شخص سے ہم کلام ہوگا اس حال میں کہ اللہ اور اس شخص کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ پھر وہ شخص اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو وہی نظر آئے گا جو اس نے آگے بھیجا ہوگا۔ بائیں طرف دیکھے گا تو بھی وہی نظر آئے گا آگے دیکھے گا تو کچھ نہیں دکھائی دے گا سوائے اس آگ کے جو اس کے سامنے ہوگی۔ لہٰذا آگ سے بچو، اگرچہ ایک کھجور برابر صدقہ دے کر ہی کیوں نہ ہو" (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی میں سے ایک کھجور برابر صدقہ کرے اور اللہ حلال کمائی ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسے بڑے احسن انداز سے قبول کرتا ہے پھر اسے صدقہ کرنے والے کیلئے پالتا رہتا ہے (بڑھاتا رہتا ہے) جیسے تم میں سے کوئی بچھیرے کو پالتا ہے، حتیٰ کہ وہ (صدقہ) ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے" (بخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صدقہ گناہ کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو" (ابو یعلی)

حضرت ابو[illegible] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک
مرتبہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک درہم ایک
لاکھ درہم سے بڑھ گیا۔" ایک شخص نے عرض کی: "اے خدا کے
رسول! وہ کیسے؟" آپ نے فرمایا: "ایک نہایت مالدار شخص
اپنے مال میں سے ایک لاکھ درہم لے اور صدقہ کر دے۔ اور دوسرا
شخص جس کے پاس کل دو درہم ہیں وہ اپنے مال میں سے ایک
درہم صدقہ کر دے تو قلیل المال شخص کا یہ ایک درہم کثیر المال
شخص کے ایک لاکھ درہم سے اللہ کے نزدیک ثواب میں
کہیں بڑھ کر ہوگا۔" (نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم)

عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز ہر شخص اپنے صدقہ کے سائے
میں ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان جنت و دوزخ کا فیصلہ
صادر کر دیا جائے گا۔" (احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم)

قارئین کرام ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی
اور احادیث نبوی مسلمانوں کی عملی زندگی کا دھارا بدلنے میں
بالکل غیر مؤثر ہیں۔ نہیں بلکہ یہ تو انسان کے پاکیزہ ترین احساسات
شریفانہ جذبات، بہترین عزائم اور نیک اعمال میں دلچسپی کی
تحریک و ترغیب میں مشعل راہ اور قوت دافعہ کا حکم رکھتی ہیں
اپنی اس بات کی تائید میں ہم تاریخ اسلام سے چند مثالیں
پیش کرتے ہیں:

مفسرین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت
کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "جب آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ
یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ (ایسا بھی کوئی ہے
جو اللہ تعالٰے کو اچھا قرض دے اور اللہ تعالٰے اسے بڑھا
چڑھا کر دے) نازل ہوئی تو حضرت ابو الدحداح انصاری
رضی اللہ عنہ نے کہا: "یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالٰے ہم سے
قرض طلب فرماتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "ہاں ابو الدحداح!" انہوں
نے کہا: "یا رسول اللہ! اپنا ہاتھ دیجئے۔" پھر ہاتھ میں ہاتھ
لے کر کہا: "حضورؐ! میں نے اپنا باغ اللہ تعالٰے کو قرض دیا۔"
ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ابو الدحداح کے باغ میں چھ سو کھجور
کے درخت تھے اور ان کے بیوی بچے بھی اسی میں رہتے تھے

وہ اسی وقت سیدھے باغ میں آئے اور آواز دی: "اے ام الدحداح
کہاں ہو؟" اس نے جواب دیا: "لبیک"۔ ابو الدحداح نے کہا
"بچوں کو لیکر باغ سے نکل آؤ کیونکہ میں نے یہ باغ اللہ تعالٰے
کو قرض دے دیا ہے" (یعنی راہ خدا میں دے دیا ہے)

امام احمدؒ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی
ہے کہ تمام انصار میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ
مالدار تھے۔ وہ اپنے تمام مال و جائداد میں "بیرحاء" نامی باغ کو جو
مسجد نبویؐ کے سامنے تھا، سب سے زیادہ پسند کرتے تھے
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی اکثر اس باغ میں جایا کرتے
تھے اور اس کے کنویں کا عمدہ میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ جب
آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (جب
تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو ہرگز بھلائی
نہ پاؤ گے)، نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حاضر
ہو کر آپؐ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ! خداوند تعالٰی فرماتا
ہے کہ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ
نہ کرو ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے۔ اور میرا سب سے زیادہ عزیز
مال یہی بیرحاء نامی باغ ہے۔ لہٰذا میں اس کو اس امید میں
کہ جو بھلائی خداوند تعالٰے کے پاس ہے وہی میرے لئے
جمع رہے خدا تعالٰی کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب اے
اللہ کے رسولؐ! آپ کو اختیار ہے جس طرح مناسب سمجھیں
اس کو تقسیم کر دیں۔" آپ خوش ہو کر فرمانے لگے "واہ وا یہ
بہت ہی فائدہ مند مال ہے۔ اس سے لوگوں کو بہت ہی
فائدہ ہوگا۔ پھر فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ تم اس باغ کو
اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔" حضرت ابوطلحہ رضی اللہ
عنہ نے عرض کیا کہ "بہت اچھا" پھر اسے اپنے رشتہ
داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

انفاق فی سبیل اللہ کا یہ سلسلہ ہر دور میں مختلف
درجوں پر جاری رہا ہے اور لوگوں نے تاریخ کے ہر دور
میں اس کے نہایت اعلیٰ و عمدہ نمونے دیکھے ہیں کہ مسلمانوں کے
نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں
کی خوشنودی اپنے خزانوں سے [illegible]

کی بہترین گزران پہلے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔

امام لیثؒ بن سعد کے بارے میں روایت ہے کہ ان کی آمدنی تقریباً ہزار دینار فی یوم تھی، اس کے باوجود ان پر زکاۃ واجب نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے مال کو اتنی دیر اپنے پاس جمع رکھتے ہی نہیں تھے کہ اس پر سال گزر جائے بلکہ جو بھی مال ان کے پاس آتا تھا وہ اسے صدقہ کر دیتے تھے اور راہ خدا میں خرچ کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام لیثؒ ہر روز تین سو ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے سے پہلے بات نہیں کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک عورت نے آپ سے شہد مانگا۔ آپ نے حکم دیا کہ اسے ایک مشکیزہ شہد کا دے دو۔ آپ سے کہا گیا کہ وہ تو اس سے کم شہد پر راضی ہو سکتی تھی۔ آپ نے جواب دیا "اس نے اپنی ضرورت کے مطابق سوال کیا ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے مطابق دیا جو اس نے ہم پر کر رکھا ہے"۔

اسی طرح عبداللہ بن جعفر کے متعلق کہتے ہیں کہ انھوں نے کسی حاجت مند سائل کو اپنے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہیں موڑا تھا۔ ان کے کسی ہم نشین نے یہ رویّہ اختیار کرنے پر برا بھلا کہا تو انھوں نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عادت ڈال دی اور میں نے اس کے بندوں کو ایک عادت ڈال دی۔ اس نے مجھے اس بات کا خوگر بنایا کہ وہ مال و دولت دے اور میں نے اس کے بندوں کو اس بات کا عادی بنایا کہ میں انھیں مال و دولت دیتا رہوں۔ اب میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنی عادت کو چھوڑ دیا تو وہ بھی اپنی عادت کو چھوڑ دے گا۔

خیراتی وقف

صدقات میں سے اسلام نے جن چیزوں کی ترغیب دلائی ہے اُن میں سب سے اہم صدقہ جاریہ ہے۔ دوسرے صدقات کی جزا و ثواب کی نسبت صدقہ جاریہ کی جزا، امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ صدقہ جاریہ کے اثر اور فائدے میں ایک قسم کا دوام اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ثواب صدقہ کرنے والے کی موت کے بعد بھی اس وقت تک اسے پہنچتا رہتا ہے جب تک کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب انسان کا رشتۂ حیات ٹوٹ جاتا ہے تو سوائے مندرجہ ذیل تین اعمال کے تمام اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں:

(۱) صدقۂ جاریہ (۲) نفع بخش علم (۳) دعائے خیر کرنے والا نیک بچہ"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں کچھ زمین ملی۔ آپ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! میرا سب سے زیادہ عزیز اور بہتر مال وہ ہے جو خیبر میں میری زمین کا ایک حصہ ہے (میں اس کو راہِ خدا میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں) فرمایئے کیا کروں؟ آپ نے فرمایا "اصل (زمین) کو اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کی پیداوار (پھل وغیرہ) خدا کی راہ میں وقف کر دو۔" چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقرا، رشتہ داروں، قیدیوں، ناداروں اور مسافروں کے لئے اس زمین کی پیداوار (پھل وغیرہ) اس شرط پر وقف کر دیئے کہ نہ تو انھیں بیچا جائے نہ ہبہ کیا جائے اور نہ ہی وراثت کے طور پر دیا جائے۔ البتہ جو شخص اس وقف کا نگران مقرر کیا جائے اس کے لئے کوئی گناہ نہیں اگر وہ معروف طریقے سے اس میں سے کچھ لے کر کھالے اور اپنی جائز ضرورت...

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زمین کی پیداوار وغیرہ خدا کی راہ میں وقف کر دینے کا حکم دے کر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے خیراتی وقف کے لئے شرعی بنیاد مہیا کر دی ہے جو ہر دور کے مسلم معاشرے میں کافی مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے اور جو مسلمانوں کے دلوں میں بھلائی اور خلوص و خیر کے جذبات کو جاگزیں کرنے کی ایک روشن مثال اور واضح دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرے کی ضروریات میں سے کوئی ضرورت ایسی نہیں تھی جس کے لئے معاشرے کے اہل ثروت نے اپنی دولت کا کچھ حصہ وقف نہ کر دیا ہو۔

یہ اوقاف اپنی وسعت اور تنوع کے اعتبار سے

بجا طور پر نظامِ اسلامی کے لئے باعثِ صد افتخار تھے۔ فقراء اور ناداروں کے لئے محتاج خانے قائم کر دیئے گئے جو اُن کی خوراک اور لباس کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ خیراتی شفاخانے کھول دیئے گئے جو فقراء اور اہلِ حاجت کے لئے علاج معالجے اور دوا دارو کی سہولتیں مہیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے لئے سفر وغیرہ کی سہولتیں بھی مہیا کی گئیں۔

مسلمان اس تلاش میں رہتے تھے کہ معاشرے میں کون کونسی ضروریات ایسی ہیں جن پر خرچ کیا جائے۔ پھر وہ ان کے لئے اپنے مالوں اور جائدادوں کے کچھ حصے وقف کر دیتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے بیمار جانوروں کے علاج اور گم شدہ دبلے آقا، کتوں کی خوراک وغیرہ کے لئے اوقاف قائم کئے۔ جب بے زبان جانوروں کے بارے میں مسلمانوں کا یہ رحمدلانہ طرزِ عمل تھا تو پھر اشرف المخلوقات انسان کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہوگا؟

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں اگر مسلم معاشرے میں یتیموں، شکستہ حال لوگوں، اندھوں، ناداروں اور دیگر مجبور اور آفت رسیدہ محتاجوں کے لئے اوقاف کا ایک نہایت وسیع نظام قائم ہو جائے۔

ہم یہاں صرف عہدِ مملوک کی ایک تاریخی دستاویز کا متن پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ دستاویز "قلادون" کے شفاخانہ کا وقف نامہ ہے۔ وقف نامہ ایک سرکاری کاغذ ہوتا ہے جس پر وقف کرنے والا اپنے وقف کے متعلق ہر چیز تحریر کرتا ہے اور اس کے حدود مقرر کرتا ہے اور مسلمانوں میں سے کسی عادل اور نیک آدمی کو اس پر گواہ بنایا جاتا ہے تاکہ جس شخص کی نگرانی میں وقف ہو وہ ان حدود کا پورا التزام کرے۔ وقف کے نگران کو "ناظر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مذکورہ شفاخانے کے وقف نامے میں لکھا ہے:

"یہ شفاخانہ بیمار مسلمان مردوں اور عورتوں کے علاج معالجے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ خواہ وہ خوشحال دولت مند ہوں یا فقیر محتاج۔ قاہرہ اور اس کے نواحی علاقوں میں رہتے ہوں یا باہر سے آئے ہوئے ہوں۔ اپنی جنسوں اور بیماریوں اور امراض کے اختلاف کے باوصف وہ اس ہسپتال میں اکٹھے یا علیحدہ علیحدہ اور بڑھاپے اور جوانی کے عالم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ مریض مرد اور عورتیں جو فقیر اور محتاج ہوں گے اپنی کامل صحت یابی تک اپنے علاج کے لئے اس میں مقیم رہیں گے اور ہسپتال میں علاج وغیرہ کے لئے جو کچھ مہیا ہوگا وہ ہر اپنے اور پرائے اور مقامی اور مسافر پر بغیر شرط و طور پر خرچ کیا جائے گا۔

اور ناظر اس وقف کی آمدنی سے مریضوں کی ہر ضرورت پر خرچ کرے گا مثلاً بستر، لحاف اور گدے وغیرہ۔ ہر مریض کے لئے اس کے مرض اور حالت کے مطابق چارپائی اور بچھونا مہیا کرے گا۔ تمام مریضوں کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ کے خوف اور اس کی اطاعت کو پیش نظر رکھے گا اور ان کو اپنی رعایا سمجھتے ہوئے اُن کی بھلائی اور بہتری کے لئے پورے خلوص سے جدوجہد کرے گا کیونکہ ہر راعی اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا۔

مریضوں کے لئے مرغ، چوزے اور دیگر گوشت وغیرہ پکانے کا انتظام ہسپتال کا مطبخ کریگا ہر مریض کے لئے جو کچھ پکایا جائے گا وہ اس کے لئے ایک خاص کٹورے میں ڈھانپ کر رکھ دیا جائے گا کوئی دوسرا مریض اس میں سے کچھ نہیں لے سکے گا۔ جب سب مریضوں کے لئے کھانا تیار ہو جائے گا تو ہر مریض کو اس کا کھانا دے دیا جائے گا۔ رات دن کا جو کھانا ڈاکٹر صاحب ان کے لئے تجویز کریں گے وہ انھیں پورا پورا دیا جائے گا۔

ناظر اس وقف کی آمدنی سے ان مسلمان ڈاکٹروں کی تنخواہیں وغیرہ بھی دے گا جو اچھا

عامر عثمانی نمبر ضرور پڑھے گا!

عامر عثمانیؒ نمبر

یہ ثابت کرے گا کہ مولانا عامر عثمانیؒ
تحریکِ اسلامی کے روحِ رواں اور
دارالعلوم دیوبند کی آبرو
تھے

عامر عثمانیؒ نمبر
کا مطالعہ

تمام حق پرست حضرات کیلئے انتہائی ضروری ہے
اگر آپ بھی حق پرست ہیں تو عامر عثمانیؒ نمبر کا دیدار
کئے بغیر آپکو چین نصیب نہیں ہوگا

ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی علمی
اور مذہبی لائبریری عامر عثمانی
نمبر کے بغیر مکمل کہلانے کی
مستحق نہیں ہو سکتی

اگلے شمارے میں عامر عثمانی نمبر کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے

کون تیرے جلوؤں کو آج دیکھ پائے گا
ہر طرف اندھیرا ہے، روشنی کے پردے میں
ہم تو سر کٹا بیٹھے ان کے اک اشارے پر
کتنے بوالہوس نکلے عاشقی کے پردے میں
زندگی کی خوشیوں کو نت نئے طریقوں سے
رہزنوں نے لوٹا ہے رہبری کے پردے میں
ہر چمن میں پھولوں کا چاک چاک سینہ ہے
کون جھانک کر دیکھے، دلکشی کے پردے میں
تیری چشم ظاہر بیں کیسے دیکھ سکتی ہے
مار آستیں ہم نے کتنے ایسے دیکھے ہیں
دشمنی جو کرتے ہیں دوستی کے پردے میں

نہیں ———— میں نے نسیم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ———— ملا ابن العرب مکی کا آخری جملہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس سنجیدگی کی جھلکیاں تھیں جو سالہا سال سے دنیا کو ہنسا رہا ہے۔ ہاں میں سچ مچ رو پڑا تھا ———— میری آنکھیں سچ مچ نم ناک ہو گئی تھیں۔

نسیم نے میری آنکھ کے آنسو پونچھے۔ پھر زیر لب بولی ———— اور آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ آپ کا ملک الموت سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میرا کیا حشر ہوگا؟۔

کیا حشر ہوتا ———— تم میرے ہوتے ہوئے بھی کسی بیوہ سے کسی درجہ میں کم نہیں۔ تم تو مستقل عدت میں ہو ———— پھر وہی لایعنی باتیں۔ میں تو یہ تصور قائم کئے ہوئے تھی کہ بھیا کی موت کے بعد آپ سنجیدہ ہو جائیں گے۔ اور فضول باتوں سے احتراز کریں گے۔ لیکن ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوا۔

جان ملا! ———— جس دن میں سنجیدہ ہو گیا اس دن کم از کم دو ہزار قارئین تجلی کا ہارٹ فیل ہو جائیگا اور ان سب کی موت کی ذمہ داری میری سنجیدگی پر عائد ہوگی ———— لہٰذا پولیس دفعہ ۳۰۲ کے تحت مجھے جیل میں ٹھونس دے گی اور تم سچ مچ بیوہ ہو کر رہ جاؤ گی۔ مختصر بات یہ ہے کہ ملا جی کی خوشامد اور آنسوؤں نے میرے آہنی ارادوں میں بیڑیاں ڈال دیں اور میں گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکا ———— اور صرف یہی نہیں کہ سچ سچ سنبھلنے تک کے چکر کاٹنے کے لئے آمادہ ہو گیا بلکہ دفتر تجلی کی ایک مخصوص ڈیوٹی بھی بخوشی قبول کر لی۔ وہی ڈیوٹی جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے شاہ کھڑے بڑے کے مزار پر فدوی نے رات بھر سر کے بل کھڑے ہو کر ایک وظیفہ کھینچا تھا ———— اور مزار کے ایک جانب بیٹھ کر صوفی مرتخ نے دردناک لہجہ میں یوں سفارش کی تھی ———— یا پیر دستگیر ———— دنیا کا سب سے بڑا وہابی آپ کی بارگاہ میں سر کے بل کھڑا ہے۔ اس کی مراد پوری کر دیجئے۔ عامر عثمانی کا دل نرم کر دیجئے اور اس غریب کو اس ملازمت سے نجات دلا دیجئے جو قطعاً اس جیسے آزاد منش کے شایان شان نہیں۔

اے غریبوں کے والی۔ اگر اس کی مراد پوری نہ ہوئی تو یہ آپ سے بدظن ہو جائے گا۔ اس کے عقائد زیادہ سڑ جائیں گے اور دنیا ایک زہریلے تعفن میں ڈوب جائے گی ———— صوفی مرتخ کی سفارش کے تصدق ایک دن مجھے دفتر تجلی کی خشک ملازمت سے خلاصی مل گئی۔ اور میں آزاد ہندوستان میں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

بہرحال میں نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ صوفی ممکین نوردگیا رہ ہوئے یا نہیں۔ میں نے ان سے کس طرح معذرت کی یہ ایک لمبی داستان ہے جو پھر کبھی موقعہ ملنے پر قلم بند کروں گا۔ اب تو بس یہ گوش گذار کر دیجئے کہ ملا ابن العرب مکی حسب دستور قارئین تجلی کے سروں پر مسلط رہے گا ————

کل حسن احمد صدیقی بھی تشریف لائے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خطوط کی گڈی تھی ———— کہنے لگے ایسے خطوط دیکھ لینا ———— مئی جون کے شمارے میں تمہاری غیر حاضری کی وجہ پوچھی ہے۔ تم ہی ان خطوط کے جواب دینا۔ مجھے تو وقت نہیں۔

قارئین کو ان کے سوالوں کا جواب مل ہی چکا ———— ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا رشتہ قائم رہے گا۔ گفت و شنید کی محفل سرد نہیں پڑے گی۔ خادم جب تک زندہ رہے گا اپنی مسخرانہ حرکتوں سے آپ کو ہنساتا ہی رہے گا ————

جماعت میں کتنی رکعتیں ہو گئیں یہ یاد نہیں۔ اس روز ضرور یاد
ہے کہ آج قیام امام صاحب نے بہت طویل اور سجدے بہت
مختصر کئے تھے۔ سات قیام میں ایک بار تو نیند نے میرے قدم
لڑکھڑا ہی دیئے۔ بمشکل برابر والے صاحب کا سہارا لیکر سنبھلا تھا
اور ان صاحب نے نماز میں اگر کوکھ میں کہنی بھی رسید کر دی تھی
عام حالات میں میں ضرور فتویٰ دیتا کہ ان کی نماز فاسد ہو گئی
لیکن فی الحال تو اپنی نماز کے بارے میں فتویٰ زیر غور تھا کھڑے کھڑے
سونا مفسد نماز ہے یا نہیں یہ مسئلہ بہشتی زیور تک میں
نہیں ملا۔

سلام پھیر گیا تو آخری دو سنتوں کا نمبر تھا۔ ایڈیٹر صاحب کے
ساتھ ہی میں نے بھی نیت باندھ لی لیکن بجائے حمد و ثنا کے یہ سوال
ابھر کر سامنے آ گیا کہ اگر نارمل ہی رفتار سے سنتیں پڑھی گئیں تو
واپسی ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی ہوگی، پھر ظاہر ہے چپل کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ یہ بھی جی میں آئی کہ بغیر سنتوں کے بھاگ
چلوں لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ دیوبند کی ہوٹلوں کی بھٹیاں
گرمیوں کی دوپہر میں عموماً نیم مردہ ہی رہتی ہیں۔ جاتے ہی چائے
میسر آنی محال تھی ـــــ جب تک بھٹی گرم ہو کر چائے
پینے کی نوبت آتی ایڈیٹر صاحب مسجد سے واپس آ لیتے اور پھر
دفتر میں مجھے نہ پا کر چپراسی ہی کے ذریعہ طلبی ہوتی۔

بہتر یہی معلوم ہوا کہ پہلے ایڈیٹر صاحب کو رخصت ہو لینے
دیا جائے۔ اس صورت میں وہ یہی گمان فرما لیں گے کہ شاید نوافل
پڑھی جا رہی ہیں۔

وہ سنتوں سے فارغ ہو کر مڑے تو میں ابھی پہلی ہی
رکعت میں تھا۔ وہ ٹھٹکے۔ ٹھٹک کر دیوار کے سہارے کھڑے
ہو گئے۔ میں کنکھیوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار نظریں
چار بھی ہو گئیں تو ان کی آنکھوں میں محبت آشنائی کی جھلک نظر
آئی۔ میں سجدے میں گر گیا تقریباً اکتالیس بار تسبیح پڑھ کر
سر جو اٹھایا تو وہ اب بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ دوسرا سجدہ
میں نے تعداد میں سے اکہتر تک پہنچا دی لیکن وہ نہیں سرکے۔
جب تو دوسری رکعت کے قعدے میں بھی یہ تہیہ کر کے بیٹھ گیا
کہ جب تک وہ رخصت نہیں ہوں گے سلام نہیں پھیروں گا

آخر کار وہ چلے گئے اور میں تیر کی طرح مسجد سے نکلا۔ سنا ہے
تیر کمان سے نکل کر لوٹا نہیں کرتا۔ مگر ان کے معاملے میں یہ قول
بھی غلط ثابت ہوا۔ وہ تو دیوار کی آڑ سے ہی موجود تھے
میں نے جھلک دیکھی تو الٹے پیروں لوٹ گیا۔

الحاصل چائے مل ہی گئی۔ ٹھیک ساڑھے تین بج رہے
تھے۔ جب میں گردن لٹکائے دفتر میں داخل ہوا ہوں۔ یقین تھا
کہ آج نئی قسم کی خفگی کی گالیاں ضرور سننے کو ملیں گی۔ ہمارے
پیا آزردہ کہ ناک شدہ ۔۔۔۔ نہ تو یہ۔ یہ تماشہ رنگ آسماں
کیسے کیسے ۔۔۔ مگر یہ بھی نہیں ۔۔۔۔ ایسے موقع کے لئے شاعر
کہا تو ضرور ہے کوئی مصرعہ جو ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے
میں کلبلا رہا ہے۔ لیکن حافظے کی گرفت میں نہیں آ رہا۔

انھوں نے صرف ایک غلط انداز سی نظر مجھ پر ڈالی اور
اپنے کام میں لگے رہے۔ میرا خیال ہے یہ انھوں نے عقل مندی
ہی کی ورنہ اسٹاف کے سامنے صلواتیں سننے میں شاید ان سے
لڑ ہی جاتا۔ پھر دوسری عقل مندی یہ کہ شام کو غریب خانہ پر
تشریف لا کر پہلے تو دل کی بھڑاس نکالی پھر یہ رعایت دے
ہی دی جائے اور نماز دونوں سے فارغ ہو کر دفتر حاضر
ہوا کروں۔

دفتر میں میرے سپرد فی الحال پتے لکھنے کا کام ہوا تھا۔
ویسے تو خریداروں کے پتے چھپے ہوئے رہتے ہیں لیکن چار پانچ
سو پھر بھی ایسے باقی رہتے ہیں جن کے چھپنے کی نوبت فوری طور پر
نہیں آئی۔ یہ کام میرے لئے سخت بور کن تھا۔ نقل را چہ عقل
گویا ایک گدھے میں اور ابن العربی میں کوئی فرق نہیں رہ
گیا۔ میری تخلیقی صلاحیتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کبھی اپنے
مسودہ یا خط کی نقل کرنی پڑی ہے تو وہ بھی کبھی جوں کی توں
نہیں ہو سکی۔ ایک زمانے میں میں کاتب بھی تھا لیکن لوگوں
نے مجھے کام دینا اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کا خیال تھا میں دوران
میں حذف و اضافہ کر کے کتابت کرتا ہوں۔

آٹھ دن بڑی بیزاری کے ساتھ گزرے [illegible]
[illegible] ٹھیک ساڑھے [illegible]
[illegible] آواز سنائی [illegible]

آجائے تو حکیم نوازش علی کو حکیم نوش علی پڑھ لینا ایک قدرتی سا فعل ہے ..... وہ جیسے .....

بجر غیر --- آگے بڑھو --- "

اب تو آگے بھی پڑھ لیا۔ جہال کوٹ اور جہال گھونڈ کی مشابہت سے آپ انکار نہیں کرسکتے --- آخر ما نقطوں کو بھی تو مشابہ گننا ہے --- "

" بس چپکے اپنی جگہ بیٹھو۔ یہ پہلی شرارت معاف کرتا ہوں آئندہ معاف نہیں کیا جائے گا۔"

پھر انھوں نے منشی جی سے فرمایا " آپ منشی جی ان کے لکھے ہوئے پتے چیک کئے بغیر نہ جانے دیا کریں۔"

چوتھے روز پھر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ منشی جی نے عاجز کا لکھا ہوا ایک پتہ ایڈیٹر صاحب کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس طرح تھا:-

منشی باربردار علی عرف بابوجی۔ محلہ جہالی کتھہ۔

اس میں بھی میرا قصور نہیں تھا۔ رجسٹر لکھنے والے کا خط ہی ایسا تھا کہ مشابہ لگے اور پرلگے۔ اس نے شکستہ انداز میں میعار علی لکھا تھا مگر پڑھا وہ باربردار ہی جاتا تھا۔ میں شش و پنج میں تھا کہ یہ کیا نام ہوا مگر خیال ہوا کہ لوگ کلب علی اور غلام علی بھی نام رکھتے ہیں تو اضافت کے ساتھ باربردار علی کیوں نہ رکھیں گے۔ باربرداری گدھوں اور خچروں کا کام ہے گدھے اور خچر بھی کتوں سے بہرحال زیادہ ثقہ سمجھے گئے ہیں۔

رہا بابوجی تو با کا نقطہ ہی لکھنے والے نے ایسا گھسیٹ دیا تھا کہ با پڑھے بغیر چارہ نہ تھا اور توجیہہ یہ ذہن میں آئی کہ "باربرداری" ہی کے تعلق سے ان کی عرفیت بابوجی پڑگئی ہوگی --- کسی منشی کو لوگ بابوجی تو کہتے ہی رہے۔ محلہ کا قصہ ایسا ہے کہ دنیا میں سب طرح کے محلے ہوتے ہیں کٹ کٹیاں، بھاڑ، کوچہ کھوہ ندرتا تھ --- تو جہالی کتھہ تو یقیناً ان سے بہتر ہی ہے۔ اصل میں لکھا گیا تھا جہال کہنہ ہوگی وہاں کوئی پرانی جہال۔ اب دیکھ لیجئے مشتبہ تحریر میں جہال کہنہ کو جہالی کتھہ پڑھ لینا بڑی حد تک قرین قیاس ہی ہے۔

ایسے ہی مشابہات برابر سامنے آتے رہے۔ ایک مرتبہ ایک ڈاکخانہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے بہت غور کیا مگر ایک ہی لفظ بنتا نظر آیا --- " ملوشام کوٹ دماغ نے ایا بھی کیا کہ یہ کیسا نام ہوسکتا ہے مگر فوراً ہی یہ بھی یاد آگیا کہ اپنے قریب ہی ایک قصبہ " کھتولی " بھی تو ہے " کھاتولی " ہی کی طرح " ملوشام کو " بھی ایک فقرہ ہے۔ کیا بعید ہے کہ نام پڑ ہی گیا ہو۔

بعد میں ثابت ہوا کہ یہ اصل میں " میلوشارم " تھا

ایک مرتبہ غیاث الدین لکھنا پڑا۔ کیونکہ غیاث رجسٹر میں ٹھیک قیا لکھا ہوا تھا۔ اب اتنا جاہل تو میں بھی نہیں ہوں کہ قیاس کو شے سے مان لیتا۔ سوچا لکھنے والے سے چوک ہوگئی ہے، اصلاح میرا فرض ہے۔

ایک مرتبہ پاکستان کا ایک پتہ انگریزی میں درج تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ پاکستانی پتوں میں انگریزی کی ضرورت نہیں۔ میں نے شہر کا نام اردو میں ماڑدن لکھدیا۔ یہ فی الحقیقت مردان --- MAR DAN تھا۔

ایک ہی ماہ میں اس طرح کے جوق در جوق کارناموں سے تنگ آکر ایڈیٹر صاحب نے میری ڈیوٹی بدل دی --- ڈیوٹی کیا بدلدی کھڑے کھڑے گولی ماردی۔

(ملا زندہ صحبت باقی)

چند مفید کتابیں

نہایۃ التحقیق اردو شرح مسند ابوبکر صدیق

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب یکجا۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بڑے سائز کے (۴۷۵) صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف بائیس روپے ۲۲/-۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اردو خواں طبقے کے لئے فنِ حدیث کی باریکیوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ۔ فنِ حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ امید ہے شائقین اس تحفۂ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت مجلد ——— بائیس روپے ۲۲/-

قرآن اور حدیث

قرآن اور حدیث میں کیا رابطہ ہے؟ سنت کا مفہوم اور مقام کیا ہے؟ ضلالت کسے کہتے ہیں؟ ان ہی جیسے دسیوں سوالوں کا مدلل جواب۔ نیا ایڈیشن مع ڈسٹ کور۔

قیمت دو روپے ساٹھ پیسے (۲/۶۰)

سیلِ خیال

ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر فضیل ناصر بریلوی کا مجموعۂ کلام خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ۔ قیمت چھ روپے۔

دینی دعوت کے قرآنی اصول

مولانا قاری محمد طیب صاحب کی فکر انگیز کتاب جو دینی دعوت کے بنیادی اصولوں سے بحث کرتی ہے

قیمت پانچ روپے ۵/-

البلاغ المبین

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تصنیف جو بدعت و سنت کی تشریح کرتی ہے۔ شریعت قبوری کے مقابلہ میں شریعت حقہ کی تعلیمات ضرور پڑھئے۔ قیمت مجلد چھ روپے پچاس پیسے ۶/۵۰

ولی کامل

حضرت مولانا ذکریا شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور کی داستانِ زندگی مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے۔ قیمت مجلد ——— چھ روپے ۶/-۔

فلاحِ ملت

بدعتوں کے رد اور صحیح عقائد کے اثبات میں ایک عام فہم، دلچسپ اور مفید کتاب جس دور میں بدعتیں عام ہوں، ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہئے۔ قیمت پانچ روپے ۵/-۔

اسماءِ حسنیٰ کے برکات

تعویذ و عملیات کے سلسلے میں ایک عمدہ کتاب

قیمت مجلد ——— چار روپے ۴/-

مسجد سے میخانے تک

یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ملا ابن العرب مکی کے شہ پاروں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے پڑھنا بھی لطف سے خالی نہیں ان میں تبسم کی چاشنی اور طنز کی نمکینی ہی نہیں افادیت بھی [illegible] طنز اور مزاح برائے مزاح پر نہیں [illegible] اتنا [illegible] آپ کی توجہ منعطف کراتا ہے۔ حصہ اول [illegible]

حصہ دوم [illegible]

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مکتوباتِ خواجہ معصوم سرہندیؒ

معارف و اسرار ہدایات و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت۔ چھ روپے ۶/-

مناجاتِ مقبول کرمی عکسی

مولانا اشرف علیؒ کی مقبول اور مفید ترین کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔

قیمت چھ روپے ۶/- مجلد سات روپے

رمضان کیا ہے؟

مولانا محمد عبداللہ دہلوی کے رشحاتِ قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوب تر کتاب۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

حیاتِ عبدالحیؒ

مولانا علی میاں کے خامۂ زرنگار سے ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت کی ایک ایمان افروز سوانح۔

قیمت۔ تیرہ روپے ۵ پیسے ۱۳/۰۵

سیرتِ خلفائے راشدین

خلافتِ راشدہ کے خصائص و حقائق اور خلفائے راشدین کے تفصیلی حالات۔ مصنفہ: مولانا عبدالحیؒ رح۔ قیمت پانچ روپے ۵/-

منتخب تقریریں

مشہور عالم دین مولانا منظور نعمانی کی اصلاحی تقریریں۔ ہر ہر صفحہ سبق آموز اور ایمان پرور۔ قیمت مجلد چھ روپے ۶/-

پیامِ انسانیت

زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے انداز میں کوشش کرنے کی دعوت دینے والی مولانا ابوالحسن علی ندوی کی پانچ تقریریں۔ قیمت ڈھائی روپے ۲/۵۰

مقامِ انسانیت

یہ بھی مولانا موصوف کی پانچ تقریریں ہیں جن میں ضروری موضوعات پر مفکرانہ گفتگو کی گئی ہے۔ قیمت دو روپے ۲/-

کتاب	قیمت
مکارم اخلاق — میر ولی الدین	۱۲/-
اردو ہندی لغت	۶/۵۰
ہندی اردو لغت	۶/-
ضرورتِ دین	-/۶۰
قصص القرآن مکمل بلا جلد	۵۱/۲۵
مجلد	۶۵/۲۵
مسئلۂ خلافت (مولانا آزادؒ)	۸/-
مشکوٰۃ شریف صرف اردو مجلد	۲۵/-
ترمذی شریف "	۲۲/۵۰
مسلم شریف "	۱۵/-
تجرید بخاری	۱۴/-
انتخاب صحاح ستہ	۹/-
مشارق الانوار	۴/-
معجزات خیر الانام	۴/-
غیبی آواز	۴/۵۰
اردو کیسے پڑھیں (اسکولوں کے لئے مفید)	۵/-
دیوبند سے بریلی تک	۳/۵۰
افاداتِ وصیہ اردو مجلد	۱۴/-
کسبِ معاش کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے	۳/-
رضیہ کا شاہی دسترخوان	۴/۵۰
ریحانہ کا "	۴/-
کھانا پکانا	۵۰/-
مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد۔ مجلد	۹/-
تصوف کی حقیقت (شاہ ولی اللہ رح)	۶/-
تذکرہ شیخ الہندؒ۔ مجلد	۸/-
سپاسنامے (مولانا محمد طیب صاحب کو پیش کئے گئے)	۶/-
ایمان کیا ہے؟ مجلد	۹/-
مفتاح عملیات (یعنی عملیات کی کنجی)	۸/-
عرفانِ عارف (مولانا محمد طیب کا کلام منظوم)	۷/۵۰

ہیں پھر بھی آپ جیسے حضرات تحقیق کا حق ادا کرنے کی جدوجہد
فرمائیں۔

زلزلہ پر زلزلہ

دانش رائے پوری صاحب۔ صفحات ۴۴ ـــ
قیمت ۵۰ پیسے۔ ناشر: مدرسہ رئیس العلوم اہل سنت
والجماعت حنفی۔ رائے پور کھسی۔ ضلع لکھیم پور کھیری
(یوپی)

صفحہ اول پر کتابچہ کا موضوع یہ بتایا گیا ہے کہ یہ علامہ
ارشد القادری کی تصنیف " زلزلہ" پر علماء اہل سنت والجماعۃ
کی تنقیحات اور اہل بدعت کی " تردید" پر مشتمل ہے۔ ارشد
صاحب کے نام کے ساتھ "علامہ" کا لفظ واوین میں دیا گیا
ہے جس کا مفہوم "طنز" بھی ہو سکتا ہے اور مخالفت کے جذبات
کی غمازی بھی۔ لیکن کتاب میں بریلوی فکر کے بانیوں اور
ترجمانوں کا تذکرہ! احتجاج اور غم و غصہ کے جس درجہ
شدت کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے دل آزاری سے بچنے
والی نیت کی توقع نہیں کی جا سکتی ـــ ہاں
یہ ہو سکتا ہے اور وہ بھی کافی زہر خند بھرا طنز ـــ
کہ اگر کسی مکتب فکر کے لوگوں کی شخصیت پرستی ان
شخصیات کے بھاری بھرکم القاب کی کمی سے مجروح ہو تو
دل آزاری سے بچنے کی نیت سے یہ نام کا جز بن جانے
والے القاب حتی المقدور استعمال کر دیئے جائیں، کیونکہ
اہل سنت کو ہر معاملہ میں سنت رسول پر چلنا چاہئے اور
یہی سکھایا گیا ہے کہ شخصیات کے تذکرے میں اہل
سنت دل آزاری والے گوشوں سے بچ بچ کر حق کی تلقین
کی جائے۔ دوسرے یہ کہ مخاطب کو اس کے اپنے دل پسند
القاب سے خطاب کیا جائے۔ کتاب کے صفحہ اول پر پہلی سطر
میں ... المھلکۃ۔ اور اس کے نیچے
لکھا گیا۔

حق کی شوکت سے وہ آیا زلزلہ پر زلزلہ
[illegible] قصر [illegible] جس سے [illegible]

پہلی بات تا ممانعت کی غماز ہے مگر دوسرے
سستے قسم کے استہزاء اور طنز سے زیادہ کچھ نہیں۔

کتاب کے اندر جیسے جیسے آگے بڑھئے ناصحانہ متانت
کا پہلا رخ دبتا چلا جاتا ہے اور دوسرا جذبہ ابھرتا چلا آتا ہے
ارشد القادری صاحب نے جب یہ بات کہی کہ اہل دیوبند
ہمارے یہاں اولیاء اللہ کے علم غیب اور تصرفات کی باتوں
کو تو شرک قرار دیتے ہیں لیکن خود اپنے یہاں ان کے اپنے
بزرگوں کے سلسلہ میں فلاں فلاں کتابوں میں ٹھیک ایسے
واقعات اور اقوال موجود ہیں جن سے ان کے علم غیب اور
تصرفات کا اظہار ہوتا ہے۔ تو کہنا چاہئے کہ وہ دیوبند اور بریلی
کی پرانی مناظرہ بازی کی شراب ایک نئی بوتل میں پیش
کر رہے تھے ـــ آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا عامر عثمانی
مرحوم نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جارحیت کی اس
نئی ٹیکنک کے جواب میں کیسا خوبصورت اخلاقی معاملہ
کیا تھا اور وہ یہ کہ اس طرح کی باتیں ہر جگہ شرک ہیں۔ ہر جگہ
غلطی ہیں۔ خواہ آپ کے یہاں پائی جائیں یا اہل دیوبند کے
یہاں ـــ اس اخلاقی حسن اور حقیقت پسندی کا کیا
اثر اہل بریلی پر پڑا۔ ہمیں معلوم نہیں ـــ لیکن اہل دیوبند
کے ان حلقوں میں جو بریلی کی طرح بزرگوں سے اندھی محبت
اور کورانہ عقیدت کے اس قدر قائل ہیں کہ ان کے یہاں
کسی غلطی کا امکان ہی تسلیم نہیں کرتے۔ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی
جس کا حاصل یہ تھا کہ تم نے تو اس طرح اہل بریلی کے ہاتھ
مضبوط کر دیئے ـــ حالانکہ عامر صاحب مرحوم نے
دیوبندی مکتب فکر کے ہاتھ مضبوط کئے تھے اور بدعت و شرک
کی ریڑھ کی ہڈی پر وار کیا تھا۔ اس لئے کہ یہ بہت ہی کھلی
کے بجائے دیوبند کی حقیقت پسندی اور حق شناسی کا عملی
ثبوت تھا اور یہ تاثر پیدا کرتا تھا کہ اہل بدعت سے اہل
سنت کی یہ مخالفت ذاتیات کی بنیاد پر نہیں خالص علمی
انداز کی ہے اور وہ یہ کہ شرک اور شخصیت پرستی ایک ناقابل
معافی جرم ہے۔ اگر انہیں کی کتب میں ... کو یہاں
بھی اسی طرح [illegible] خطا ہے جس طرح [illegible]

کے یہاں ۔ اس دیوبندی ردعمل میں "زلزلہ" کے جواب میں احتجاجی خطوط ہی نہیں بلکہ سنت کی نئی کتابیں کتابچے اس انداز سے منظر عام پر آنے لگے کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اپنے یہاں کی غلطی کو مان کر عامر عثمانی مرحوم نے مایوس کن غلطی کی ہو اس لئے ہم اب خود ہی اس "زلزلہ" سے اپنے انداز سے نمٹتے ہیں۔ "زلزلہ پر زلزلہ" بھی اسی سلسلہ کی ایک نئی کڑی ہے افسوس کہ جس نے بھی اہل بریلی کا ستیاناس کر ڈالا ٹھیک وہی رنگ ہمیں زیر نظر کتاب کے صفحہ پر عکس فگن ملا۔ اور وہ ہے یہ بنیادی فارمولا کہ مخالف کبھی کوئی صحیح بات کہہ نہیں سکتا اور موافق کبھی کوئی غلطی کر نہیں سکتا ——

انا للہ وانا الیہ راجعون ! ۔

ارشد القادری صاحب نے جو اعتراض کیا تھا اور ہماری اپنی کتابوں کے حوالہ کے ساتھ ہماری کچھ کتابوں کی وہی دیومالائی انداز کی باتیں کی تھیں جن سے اہل بریلی کا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں دانش رائے پوری صاحب، اہل بریلی کی متعدد خرابیوں اور کمزوریوں کا تذکرہ کر ڈالا ہے۔ اگرچہ ان "بریلوی غلطیوں اور کمزوریوں" میں ہماری نظر کی حد تک غلط بیانی سے کام نہیں لیا گیا لیکن پھر بھی ایک مخصوص موضوع پر اصل مسئلہ سے ہٹ کر اس وقت ان کا تذکرہ "بے محل" اور اصولاً غلط ہے۔ جس معاملہ میں "زلزلہ" نے دیوبندی مکتب فکر کو للکارا ہے اسی معاملہ میں اس کے جواب میں گفتگو ہونی چاہئے اور عقل و عدل کے ساتھ بتانا چاہئے کہ ان کا یہ "حملہ" کہاں تک بجا اور بیجا ہے۔ [illegible] اہل حق اور اہل باطل کے جو بنیادی فرق ہونے چاہئے اور [illegible] ہے وہ یہاں بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے [illegible] قرآن [illegible] صفحات میں دیکھئے [illegible] کہ انسان نے [illegible] کے [illegible] کی حد یہ اور کس [illegible] اور [illegible] کے [illegible] ہیں۔ اور خدا نے اپنے [illegible] کس متانت کے [illegible] ذرا [illegible]

آہستگی کرو ہوں ہے جو فرعون وقت کی طرف فہمائش اور نصیحت کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں انشاء اللہ تم حضرت موسیٰ کو "قول لین" کی تاکید کرتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ "اس سے ذرا نرمی اور دلریشی سے بات کرنا کہ اس کے لئے ہدایت پانے کی امکانی صورت پیدا ہو سکے !

ذرا غور فرمائیے کہ اہل حق کے لئے۔ پھر یہ کہاں تک جائز ہوگا کہ اگر "باطل" ان کی طرف ایک "زلزلہ" بنکر آیا تو حق بھی "زلزلہ پر زلزلہ" بن کر جیسے کو تیسا بن جائے —— کاش ہمارے "بریلوی بھائی" بھی ہماری اس عرضداشت پر غور کریں اور دیوبندی ہم خیال دوست بھی ! —— کہ ایک دوسرے کو بدلنے کی فطری خواہش ہمارے دل میں ہے یا ایک دوسرے کو ہرانے یا مٹانے کی اس کا ثبوت ہمارے قول و عمل سے کہاں تک ملتا ہے ؟

ماں کی
محبت کے بعد!
ہمدرد
گرائپ واٹر
ہمدرد
یہ لیجیے
یا یہ!
شربت
روح افزا